

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

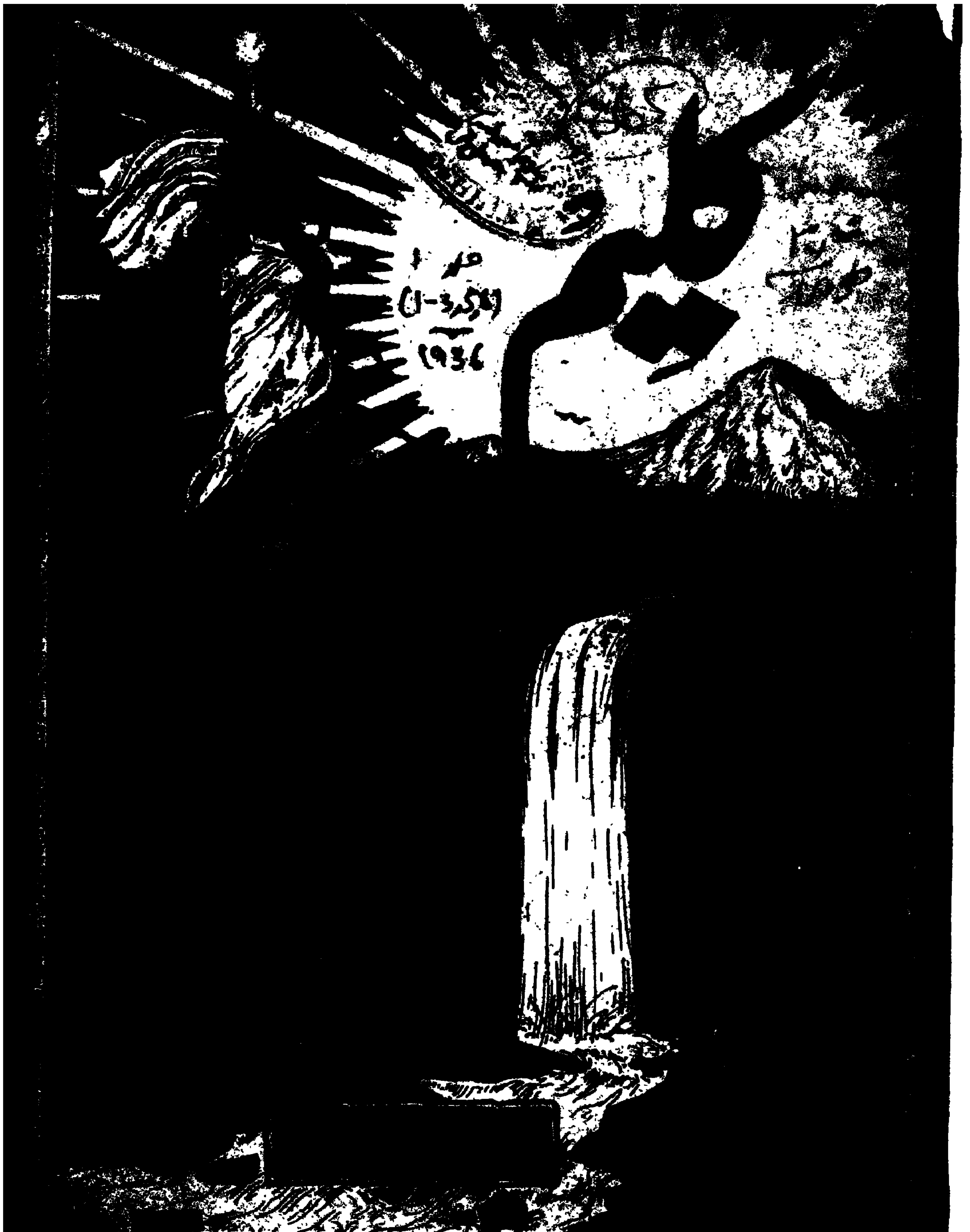
NEW DELHI

Please examine the book before taking it out. You will be responsible for damages to the book discovered while returning it.

DUE DATE

Cl. No. Acc. No.

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night book Re. 1/- per day.


1936



چیرمین: آنریبل سر ہومی مہتہ

جنرل منیجر: مسٹر ابرجی ہرجی



تحفظ

صدر مشاورۃ: مسٹر جی ایس مراٹھی
ایم۔ اے۔ اے۔ آئی۔ اے

ہیڈ آفس: اپالو سٹریٹ، ساؤتھ
فورٹ، بمبئی



خوشحالی

سکریٹری: مسٹر ایم۔ آئی۔ دلکشٹ
بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

سپرنٹنڈنٹ برانچیں: مسٹر بی۔ اے انصاری
کورونیشن ہوٹل بلڈنگ دہلی



دیانت داری



اعتماد

دی ایوری مین پالیسی نے

پبلک کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ اور ہندوستان بھر کی دنیا نے بیمہ میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے بجائے
بیماری کو کوئی چندہ دینا نہیں پڑتا۔ بلکہ ہر ماہ ایک معقول مقررہ رقم کمپنی سے بطور امداد ملتی ہے۔



ایک مطالعہ

Popular Press Delhi

(ادبیات و تنقیدیات)

(ماہنامہ)

مدیر:۔ جوش ملیح آبادی

نائب مدیر: آزاد انصاری

کلیم

اردو زبان کا ہر جہت سے سب سے زیادہ قیمتی ماہ نامہ

(مع تصویریں)

جلد ۱ | فہرست جنوری سنہ ۱۹۳۶ء | نمبر ۱

[illegible] میں جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے چھپوا کر دفتر کلیم [illegible] سے شائع کیا

صحافت کے ذریعے سے

ہندوستانی ذہنیت میں زبردست انقلاب پیدا کرنیکی اُردو زبان میں پہلی کوشش

ہر صاحب عقل ہندی کو جو عصرِ حاضر کے رجحانات سے واقف ہو، اسکا شدید احساس ہے کہ ہندوستانی زبان، ہندوستانی تہذیب، ہندوستانی معاشرت، ہندوستانی علم و ادب اور ہندوستانی زندگی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہندوستانی رُوح کو اسوقت صحیح رہنمائی اور زبردست انقلاب کی اسقدر شدید اور فوری ضرورت ہے کہ اب مزید تاخیر روا نہیں رکھی جاسکتی۔ تاریخ کے اوراق اُلٹیے اور وہ بتائیگی کہ اُسوقت تک کسی قوم میں بیداری زندگی پیدا نہیں ہوئی ہے جبتک اسکے ادبیات میں عظیم انقلاب پیدا نہیں کردیا گیا ہے چنانچہ اسی نقطۂ نگاہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے "کلیم" کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ اور ملک کے بہترین اربابِ فکر و نظر کی مستقل خدمات حاصل کرلی گئی ہیں۔ تاکہ کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ خدمات انجام دیجا سکے۔

فہرست اغراض و مقاصد

124353
25.7.95

(۱) اشارات۔ حیاتِ انسانی کے گوناگوں مسئلوں، اور ہندوستانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مختصر نوٹ۔ نیز مشرقی و مغربی مباحث علم و ادب پر بلیغ اشارات۔

(۲) افکار۔ حکیمانہ و محققانہ مقالات جنکے ذریعے سے ہندیوں کے باطنی ماخوذ کا مل ترتیب فکر کی نشو و نما ہو، اور ہندی عقل کی اسطرح تربیت کیجائے کہ وہ تہ خانوں سے نکلکر صاف ہوا میں سانس لینا سیکھ جائے۔ جو بطالت و اوہام، تقلید و جمود، اور تعصبات و تنگ نظری کو فنا کر کے ہندوستانی ذہنیت کو اس بلند سطح فکر تک لے آئیں۔ جہاں سے نوعِ انسانی کی دائمی نجات کا چشمہ پھوٹتا ہے تعلیم دیجائے کہ انسانیت، نسل، رنگ، معاشرت، رسوم، لباس، زبان، وطن، اور مذہب، سب سے بالاتر ہے۔

(۳) منتخبات۔ ادبی و عمرانی نقطۂ نگاہ سے دیگر زبانوں، اور دورِ جدید کے بلند پایہ صحائف کے تراجم۔

(۴) اَدَبیات۔ ادبی مضامین، نظمیں، افسانے، اور ڈرامے، صحیح ادب سیف، اور حقیقی شعریت کے معیار پر، نیز صرف وہ غزلیں جو فطری، اور مسلسل ہوں۔

(۵) مقالات۔ عام علمی، اقتصادی، زرعی، تجارتی، اور صنعتی مضامین، اور انکے دوش بدوش ایسے مقالے جو اہل ہند کو زندگی و بیداری خود شناسی و خودداری، آزادی و فراخی، معاملہ فہمی و رواداری کا درس دیں، اور جسمانی صحت، خرابیٔ سیرت، معاشری اصلاح، دماغی توازن اور سیاسی تدبر و تفکر کی اہلیت پیدا کریں۔ اور خصوصیت کیساتھ ہندو مسلم اتحاد کی ایسی زبردست سعی، اور یہ ہم تبلیغ کریں کہ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت کی ایسی مضبوط بنیاد پڑجائے کہ باہمی ازدواج ہونے لگے۔

(۶) لسانیات۔ زبان میں اصلاح و ارتقا۔ اجتہاد و وضع اصطلاحات۔ تہذیب و تدوین قواعد لغت۔ اور تصفیہ مسائل ادبی و لسانی نیز ایک ایسی مشترکہ انجمن کی تشکیل جو ہندوستان میں ایک مشترکہ زبان جاری کرسکے۔

(۷) نسائیات۔ ایسے مقالے جو میانہ روی پر مبنی ہوں، مشرقی خصوصیات کے تحت عورتوں کی تعلیم اور آزادی، قدامت پسنی اور شدید پردے کی شدید مخالفت کیساتھ اور عورتوں کے جائز مطالبات و حقوق کی حمایت میں۔

(۸) انتقادات۔ ادبیات سے قطعی طور پر کسر امجدید نظریات نقد و نظر کی روشنی میں مبنی طنز آمیز سنجیدہ ترین لہجے کیساتھ کہ لیۂ علمی و ادبی اسلوب پر۔

(۹) حیات و نشاط۔ ع خوش باش دمے کہ زندگانی این است۔ محکومی و مفلسی نے وطنِ عزیز میں جو ایک عام افسردہ دلی، اور نا روا سنجیدگی پیدا کر رکھی ہے۔ یہ باب اسکی بیخ کنی کیلئے قائم کیا گیا ہے۔ واضح رہے۔ جو مسکرا نہیں سکتا وہ مُردہ ہے

(۱۰) رفتارِ وقت۔ عصرِ حاضر کے اہم کوائف، اور اُن پر مختصر لیکن پُر مغز تبصرے ؛

اِشارات

اجرائے "کلیم" کے مقاصد کی تفصیلی فہرست آپ اس پرچے میں کہیں ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہاں ایک دوسرے نقطۂ نگاہ سے کچھ عرض کرنا ہے۔ افسوس کہ سوسائٹی ایسی غیر ضروری تشریحوں پر مجبور کرتی ہے، جنہیں طبیعت کسی طرح قبول نہیں کرتی۔ لیکن کیا کیا جائے گفتگو کے وقت خاموش رہنا بھی ایسا ہی بُرا ہے، جیسا خاموشی کے وقت گفتگو کرنا۔

"کلیم" کے اجراء سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ شہرت حاصل کروں۔ ہاں جب تک امردانہ ذہنیت غالب تھی، جی چاہتا تھا ہم کثرت سے چھپیں۔ "دنیا ہمیں بھی جانے، پہچانے، اور ہمارا بھی مشاہیر میں شمار ہونے لگے۔

لیکن اب تو دُعا ہے کہ خدا یا اپنے اس عطیۂ شہرت کو واپس لے لے جس نے میری تمام آزادیاں سلب کر رکھی ہیں۔ اور جس نے "اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں" کا اطمینان ہی مجھ سے چھین لیا ہے۔

کیا تجارت مقصود ہے؟

دُنیا کا آخری جاہل انسان تک جب تجارت میں اجتہادی سند حاصل کرلیگا اُس وقت اس فن میں شاید میری ابجد خوانی کا سوال اٹھایا جاسکے —— میں تجارت کے واسطے اس کرۂ ارض کا سب سے زیادہ نااہل وجود ہوں۔

لیکن میری اس میں کیا خطا ہے؟ بدقسمتی سے ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا جو دولت، ثروت، اور عزت کا مالک تھا" آنکھ کھولی تو ہر طرف لکشمی دیوی ہی کو متبسم پایا۔ جب دیکھا یہی دیکھا کہ ہمارے گھر سے ارباب حاجت پر زرپاشیاں ہورہی ہیں، ہمیں سب کے حاجت روا ہیں، اور ہم اپنی حاجتوں کے واسطے کسی کا مُنہ نہیں تکتے۔

اس کا قدرتی اثر جو مجھ پر ہونا چاہئے تھا وہی ہوا، یعنی روپے کی حقارت اور اسراف —— چنانچہ ہوش آتے ہی ان دونوں اوصاف، یا امراض میں گرفتار ہوگیا، اور بڑی حد تک اب بھی ہوں۔

جانتا ہوں روپیہ، عظیم الشان روپیہ، "ستار عیوب وقاضی حاجات" روپیہ، قندیل حیات مسجود خلایق روپیہ، کس قدر بزرگ ہے، برتر ہے عظیم ہے کبیر ہے —— جانتا ہوں یہ جلالت مآب دیوتا، دُنیا کا سب سے بڑا دیوتا، کتنی عدیم النظیر اہمیت اور کس درجہ ناقابل شرح کشش کا مرکز ہے، اور اس وجود بزرگ و برتر کی قوت خریداری کی کوئی انتہا نہیں ہے —— لیکن میں کیا کروں، میں علیل ہوں، میرا مُنہ تو بخار کا منہ ہے، جسے مٹھائی کڑوی معلوم ہوتی ہے —— میری جیب میں تو جس وقت روپیہ ہوتا ہے، برابر ڈنک مارتا رہتا ہے کہ مجھے جلد اس قید سے نکالو ——

آپ ہی فرمائیے، کیا اس مزاج کا آدمی روپے سے محبت کرسکتا ہے؟ کیا ایسا بیمار تجارت کے میدان میں دوڑ سکتا ہے؟

اس کے علاوہ مجھے تجارت کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے، میری آبائی جایداد میں بفضلہ ابھی اتنا دم باقی ہے کہ میں عزت وآرام سے زندگی بسر کرسکتا ہوں، اور اس کے ساتھ میرے تصانیف بھی ہیں۔ اور میری حیدرآباد کی پنشن بھی۔ اس سے زیادہ کی اب مجھے خواہش بھی نہیں۔ جتنی حسرتیں تھیں، سب نکال چکا ہوں، جتنی رنگینیاں تھیں، سب میں تا بہ لب غرق ہوچکا ہوں، اب نہ کوئی تازہ اُمنگ ہے، نہ نیا ولولہ، جس کے واسطے مزید دولت کی حاجت ہو —— اب وہ طوفانی دَور ختم ہوگیا، اور وہ ولولوں، اور اُمنگوں کا زمانہ باقی نہیں رہا۔

اب تو ؎ اک عُمر سے زہر پی رہا ہوں
اڑتیس برس سے جی رہا ہوں!

ہاں اس قدر ضرور چاہتا ہوں کہ رسالہ گھر سے اُٹھا کچھ نہ لے جائے، اور میری محدود آمدنی کے وسائل کو مجروح نہ کرسکے، اور اس سے اس قدر آمدنی ضرور ہوجائے کہ اس کے اخراجات اُس سے پورے ہوتے رہیں، —— یہ نہ سمجھئے گا کہ میں تنگدلی کے باعث رسالے سے اپنی ذاتی معاش کا دامن بچا رہا ہوں، آپ کو میری فطرت اور میرے خاندانی روایات کا حال معلوم نہیں، جن ہاتھوں نے لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہا دیا ہو، وہ تھوڑی سی رقم پھینک دینے سے نہیں رُک سکتا —— اگر میرے حالات نامساعد نہ ہوتے، اور آج میری جائداد کی وہی حالت ہوتی جو چند سال پیشتر تھی تو "کلیم" ہندوستان کا وہ پہلا شاندار پرچہ ہوتا جو تمام ملک میں مفت تقسیم کیا جاتا۔

اجرائے "کلیم" کے باب میں، ضمیر کی پوری شگفتگی کے ساتھ میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں اس پرچے کو ہندوستان، صرف ہندوستان کی خدمت کے واسطے نکال رہا ہوں! ہندوستان کی خدمت، دوسروں کے مقابلے میں مجھ پر زیادہ فرض ہے

---

(۲) ہمعصروں اور مدیران رسائل و اخبار کی خدمت میں عرض ہے کہ کسی خاص گروہ یا فرد کی طرف میرا روئے سخن نہیں، لیکن کیا کیا جائے کہ محکوم قوم کی یہ بھی ایک نمایاں خصوصیت ہوتی ہے کہ ہم پیشہ اور ہم مذاق، ایک دوسرے کے بدخواہ ہوا کرتے ہیں، کسی نئے اخبار یا رسالے کے جاری ہوتے ہی اُس کے باب میں چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں، اور نقصان رساں پروپگنڈا شروع کر دیا جاتا ہے۔

اور ادھر جب نئے رسالے یا اخبار کا مدیر اپنے پہلے پرچے کے "شذرات" کا آغاز کرتا ہے تو جو سب سے پہلی بات اپنا نصب العین بیان کرنے کے بعد کرتا ہے وہ موجودہ رسالوں، اور موجودہ مدیروں کی تحقیر و تذلیل پر مبنی ہوتی ہے، اور اس طرح ایک ایسی سوقیانہ "تو تو میں میں" کا بازار گرم ہو جاتا ہے کہ الٰہی توبہ۔

گویا ہر نیا اخبار یا رسالہ، گندی نالی میں اینٹ گرنے کے مثل ہوتا ہے، اور چھینٹیں اڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔

اس لئے میں نہایت عاجزانہ طور سے درخواست کرتا ہوں کہ از راہ کرم مجھے میدانِ کارزار کی طرف نہ کھینچا جائے، میں ایک خاموش اور بے ضرر مزدور کی طرح کام کرنا چاہتا ہوں، اور وعدہ کرتا ہوں کہ کسی سے آنکھ ملانے کی بھی جرأت نہ کروں گا۔

کسی دیوار پر "اس دیوار پر مت تھوکو" کی تختی لٹکانا، ہر چند خود ایک نوع کی بدتمیزی ہے، لیکن کیا کیا جائے، بعض اوقات بدتمیزیاں بھی "فرائض" میں داخل ہو کر دم لیتی ہیں، میری یہ چند سطریں بھی اسی زمرے میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔

ہاں ایک بات اور عرض کر دوں، میں اپنے اردو کے رسائل و اخبار اور ہمعصروں کے مطبوعات پر نہایت دقتِ نظر کے ساتھ انتقاد کرونگا، معنوی اور لسانی اغلاط ایک ایک کر کے گِنا ونگا، لیکن اس کا واحد مقصد ادبی اصلاح ہوگا، نہ کہ کسی فرد یا جماعت کی تحقیر ———

تمام دنیا جانتی ہے، زندہ قوموں کے طالب العلم تک واقف ہیں کہ انتقاد خالص ایک علمی و ادبی خدمت ہے، اس کا مقصود نہ کسی کی تذلیل ہوتا ہے، نہ توہین مگر بدقسمتی سے ایسی چھوٹی چھوٹی معروف باتوں کو بھی ہندوستان میں بچوں کی طرح کھول کھول کر سمجھانا پڑتا ہے۔

یہاں آئے دن "نقد و نظر" پر فریقین میں وہ ہنگامۂ عظیم برپا رہتا ہے کہ اللہ دے اور بندہ لے، گروہ بندیاں ہو جاتی ہیں، لوگ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو جاتے ہیں، اور یہاں تک تنہ داریاں بڑھ جاتی ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کے ذاتی معائب، اور خاندانی کمزوریوں کو گنانے لگتے ہیں۔

جب "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے دورِ نظم و نسق میں ہندوستانی تمام ذمہ دار عہدوں سے محروم کر دیئے گئے، تو خدا بھلا کرے ایک ڈائرکٹر کا، جس کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں رہے، اُس نے ولایت ایک بہت بڑی یادداشت بھیجی تھی جس میں یہ لکھا تھا کہ ہم ہندوستانیوں سے اچھا سلوک نہیں کر رہے ہیں، ہم نے انہیں تمام ذمہ دار عہدوں سے محروم کر دیا ہے، ہم نے اُن کا اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے، اور اس کا کچھ دن کے بعد نتیجہ یہ نکلے گا کہ پوری ہندوستانی قوم رفتہ رفتہ اس قدر پست خیال، زبوں ہمت، دروغ گو، مکار، کمینہ اور ذلیل ہو جائیگی کہ قیامت کے دن مسیح کے سامنے ہمیں اس کا جواب دینا پڑیگا۔

میرے عزیز دوستو! کیا اس شریف انگریز کی پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت نہیں ہوئی؟

اوروں کو چھوڑیے کیا ہمارا علمی طبقہ، جسے قوم کا دماغ کہنا چاہئے، اس قدر پست نہیں ہو گیا ہے کہ ذرا سا انتقاد برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اپنے متعلق ایک ادنیٰ سی گرفت پر بلبلا اٹھتا ہے؟

میں اپنے تمام ہمعصروں، اور ہمپیشوں کی خدمت میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ بھی نہایت بیباکی کے ساتھ "کلیم" پر تنقید کریں، اور میری طرف سے یقین رکھیں کہ میں نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اُن کا خیر مقدم کرونگا۔ "کلیم" ہی نہیں میں انہیں اپنے کلام پر بھی ہر طرح کی نکتہ چینی اور خوردہ گیری کی دعوت دیتا ہوں، میں کوئی خالص قسم کا احمق نہیں ہوں کہ اپنے کو اغلاط سے مبرا سمجھ لوں، میرا تو قول ہے کہ صرف حمقا ہی غلطی نہیں کیا کرتے۔

میں اپنے ناقدوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ "کلیم" کے ساتھ ساتھ میرے کلام کے معایب سے بھی مجھے مطلع فرماتے رہیں گے تو بُرا ماننا کیسا، میں ان کا احسانمند ہونگا، اور انہیں اپنا محسن خیال کرونگا۔

"اللہ اس شخص پر رحمت کرے جو مجھے میری غلطیوں پر ہدایت کرتا ہے"!

(۳) مشہور ادیبوں، اور غیر مشہور اہلِ علم کی خدمت میں گزارش ہے کہ "کلیم" اپنا معیار قائم کرنا چاہتا ہے، وہ طبقۂ اول کے اربابِ علم و ادب کے علاوہ، اور کسی کی دماغی پیداوار شائع نہیں کریگا، البتہ اس سے وہ جوان قلم طبقہ مستثنےٰ رہیگا، جو "می تافت ستارۂ بلندی" کا مصداق ہوگا۔

سب سے بڑی اور ہولناک دشواری یہ ہے کہ جو لوگ لکھنا نہیں جانتے وہ ہر گلی کوچے میں "مضمون نویسی کا کام" کی صدائیں بلند کرتے پھرتے ہیں، اور جو لکھنا جانتے ہیں، اُن سے فرمائش کیجئے تو وہ بھین بھین کرتے ہیں اور "بھلا میں کیا لکھ سکتا ہوں" کہکے انکسارِ بیجا پر اُتر آتے ہیں۔

یہ مزاج بھی محکومی ہی کا عطیہ ہے، لوگ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ "خاکساری" جو آج ہم میں پائی جاتی ہے اور جسے ہم اپنے زعم میں ایک اعلیٰ صفت سمجھے بیٹھے ہیں، اور دل ہی دل میں اپنی اس صفت پر ناز بھی کرتے ہیں، درحقیقت "خاکساری" نہیں ہے بلکہ ہمیں علم نہیں کہ محکومی نے ہمیں خود ہماری نظروں میں کس قدر حقیر کر دیا ہے، اور ہم اپنے کو سمندر سمجھنے کے عوض قطرہ خیال کرنے لگے ہیں۔

بعض اہلِ علم عدیم الفرصتی کا عذر فرماتے ہیں، یہ سچ ہے کہ فکرِ معاش اور ذاتی مشاغل نہایت اہم چیزیں ہیں، لیکن کیا خدمتِ وطن اتنی اہمیت بھی نہیں رکھتی کہ پورے تیس اکتیس روز میں ہم چند سطروں کا ایک مقالہ سپردِ قلم کر دیں؟

قومی خدمت کو فکرِ معاش اور ذاتی مشاغل کے مقابلے میں غیر اہم سمجھنا بھی غلام قوم کے خصوصیات میں سے ہے۔

میں صاف صاف عرض کرتا ہوں کہ "کلیم" کو میں نے ادبی چٹخاروں کی خاطر نہیں نکالا ہے، میں اپنی قوم یعنی ہندوستانیوں کی ذہنی تربیت چاہتا ہوں، یہ کام معمولی اہلِ ادب کے بس کا نہیں ہے، اگر معیاری اربابِ ادب نے مجھ سے مستقل تعاون نہ فرمایا تو چھ مہینے انتظار کرکے میں "کلیم" کو بند کر دونگا، اور خریداروں کی خدمت میں ان کا باقی چندہ واپس کرکے، پھر اسی حلقۂ رنگ و بو میں داخل ہو جاؤنگا، جسے ترک کرکے میں اس صحافتی میدان میں آیا ہوں، اور دنیا پھر ایک بار یہ نعرہ سُن لیگی کہ ؎

اس فصل میں اس درجہ رہا بیخود و سرشار
میخانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے!

---

(۴) سکندر آباد دکن میں میرے ایک نہایت عزیز دوست اسرٰئیل احمد خاں رہتے ہیں جن سے ملک کو ابھی روشناسی کی مسرت حاصل نہیں ہوئی ہے، یہ نہایت خلوت پسند، اور خاموش کام کرنیوالے واقع ہوئے ہیں، لکھتے کم ہیں سوچتے بہت زیادہ ہیں۔ یہ ایک خاص طرزِ نگارش کے مالک ہیں، اور ایک خاص اسلوبِ فکر کے حامل۔

کبھی یہ فلسفی سے زیادہ ادیب معلوم ہوتے ہیں کبھی ادیب سے زیادہ فلسفی۔ میں قارئین کرام کو خوشخبری سُناتا ہوں کہ میں نے اُن سے وعدہ لے لیا ہے کہ وہ کوتاہ قلمی کو ترک کرکے "کلیم" کے واسطے ہر ماہ کچھ نہ کچھ لکھا کرینگے، چنانچہ آیندہ نمبر سے اُن کا دکٹر ہیوگو کے ایک نہایت دلچسپ و سبق آموز ناول "لا فنگ مین" (   ) کا ترجمہ بہ افسانہ شائع ہونا شروع ہو جائیگا۔

(۵) (الف) ضرورت ہے کہ ملک میں ایک ادارہ "مفکرینِ آزاد خیال" کے نام سے قائم ہو جس کی بُنیاد خالص انسانیت پر ہو یعنی ہر صاحبِ فکر انسان اس کا رُکن ہو سکتا ہو۔

اور اس کے فرائض یہ ہوں کہ وہ تقلید و قدامت پرستی، اوہام و تنگ نظری کو دور کرکے ہندوستانی ذہنیت کو وسیع و بلند کرنے کی خاطر سال میں دو تین بار مختلف مقامات پر اجلاس کیا کرے۔

(ب) اور ملک کے مشاہیرِ علم و ادب کی ایک ایسی انجمن قائم ہو، جو ہندوستان کی مشترکہ زبان کے متعلق انتہائی خلوص و وسعتِ قلب کے ساتھ غور کرکے کوئی ایک قطعی فیصلہ کر دے۔

قارئین کرام کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ ان دونوں مسئلوں پر غور کرکے اپنے مشوروں سے مجھے جلد تر بہرہ مند فرمائیں، تاکہ ان دونوں سمتوں کی طرف قدم اٹھایا جائے۔

(۶) میں اس پرچے کی ترتیب کے باب میں شکرگزار ہوں اپنے مشہور فسانہ نگار دوست، ل، احمد صاحب کا، جن کے بغیر میری ناتجربہ کاریاں مجھے ہر قدم پر ٹھوکریں کھلاتیں۔

ل، احمد صاحب کا ذکر آگیا ہے تو کیوں نہ میں یہ مژدہ سُناؤں کہ اُن کے افسانوں کا مجموعہ "انشائے لطیف" کے نام سے اسی ہفتے میں شائع ہوا ہے، جس کے متعلق مختصراً یہ عرض کر سکتا ہوں کہ وہ اُردو میں ایک مبارک

اور نادر اضافہ ہے' وہ حضرات، جو سمجھتے ہیں کہ دُنیا کی تمام خوبیاں' انگریزی زبان میں سمٹ کر آ گئی ہیں، میں اُن کی خدمت میں عرض کرونگا کہ وہ "انشائے لطیف" کو ضرور دیکھیں' اور اندازہ لگائیں کہ ل' احمد کی انشا پردازی نے ہمیں کس حد تک انگریزی سے بے نیاز کر دیا ہے۔

اُسی کے دوش بدوش میرا یہ بھی فرض ہے کہ میں اُن تمام اخباروں' اور رسالوں کے "مدیروں" کا شکریہ ادا کروں' جنھوں نے اجرائے "کلیم" کی بابت میرا اعلان شائع فرما کر میری مدد فرمائی' جن میں "تیج" "ہند" "سرفراز" "ہمایوں" "نیرنگِ خیال" "زمانہ" "خلافت" اور "احسان" میرے شکریے کے زیادہ مستحق ہیں۔

اُسی کے ساتھ میں اپنے دوست لالہ دیش بندھو' محمود علی خاں صاحب اور حامد علی خاں صاحب مہتمم "مکتبہ جامعہ" کا بھی بیحد شکر گذار ہوں' لالہ جی نے تو اپنے زریں مشوروں اور اپنے اخبار سے میری مدد فرمائی' اور میرے مخلص دوست محمود علی خاں صاحب نے ہجوم مشاغل کے باوجود "کلیم" کے ڈیکلریشن و طباعت وغیرہ کے مراحل میں اس قدر سرگرمی سے کام کیا کہ میں ہی جانتا ہوں۔ اور حامد علی خاں صاحب نے کتابت کے مرحلوں کو طے فرما کر مجھے بڑی مصیبت سے نجات دلا دی۔ کاش کوئی انہیں جزائے خیر دے سکتا۔

اسی سلسلے میں میرے دوست حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبرآبادی بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک ایسا مرحلہ جلد طے کرا دیا' جو اُن کے بغیر بہت ہی صبر آزما ثابت ہوتا۔

آخر میں' لیکن نہایت ہی پرجوش انداز میں' اُن حضرات کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں' جنہوں نے اخبارات میں میرا اعلان پڑھ کر اپنا چندہ پیشگی روانہ فرما کر مجھے "کلیم" کے ابتدائی مراحل کے طے کرنے میں نہایت قیمتی مدد دی' اور یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان اربابِ نظر سے خالی نہیں ہے۔

(۷) "کلیم" کے چندے کے متعلق بعض حضرات کا خیال ہے کہ دس روپے بہت ہیں۔ بات یہ ہے کہ ابھی تک مفید مدوں میں روپیہ صرف کرنے کی ہماری قوم میں عادت ہی نہیں پڑی ہے۔ اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ، جو پرچہ بآسانی خرید سکتے ہیں' وہ بھی دوسروں سے پرچہ مانگ کر ہی پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ جو قوم شبِ برات کی آتشبازی کے برابر بھی اپنی صحافت کو دھ دینے پر طیار نہ ہو' اُس سے یہ شکوہ فضول ہے کہ وہ کسی رسالے کی قیمت کو محض اس بنا پر بہت زیادہ کہے کہ چار یا پانچ روپے کے عوض اس کا چندہ دس روپے ہے' اسے چھوڑیئے کہ "کلیم" کن مقاصد کے ساتھ شائع ہو رہا ہے' اور اس کے پیشِ نظر ملک کے کس قدر اہم خدمات ہیں' آپ تو صرف اس کے سائز' اس کی ضخامت' اور اس کی اعلیٰ تصویروں پر نگاہ فرمائیں' اور خود اندازہ کریں کہ آج جو رسالے چار چار' پانچ پانچ روپے سالانہ کے نکل رہے ہیں' کیا "کلیم" اُن سب کے مقابلے میں ہر اعتبار سے تگنا' چوگنا نہیں ہے؟

اسی سلسلے میں یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ "کلیم" کا ششماہی چندہ' رسمِ عام کے خلاف سالانہ چندے کا نصف ہی رہیگا' اور یہ اس لئے ہے کہ جو حضرات یکمشت دس روپے صرف نہیں کر سکتے ہیں' وہ دو مرتبہ پانچ پانچ روپے دیکر خریدار بن سکتے ہیں۔

(۸) میں نے "روحِ ادب" کے بعد سے لیکر اپنا اس وقت تک کا تمام کمال کلام چھ جلدوں میں مرتب کر لیا ہے' جس میں کا ایک حصہ سردست "نقش و نگار" کے نام سے زیرِ طبع ہے جو عنقریب شائع ہو جائیگا۔ اسی طرح تمام جلدیں یکے بعد دیگرے طبع ہوتی رہینگی' اور اسی سلسلے میں "روحِ ادب" کا دوسرا ایڈیشن بھی طبع ہو جائیگا' جن کی قیمتوں میں خریدارانِ کلیم سے خاص رعایت ملحوظ رکھی جائیگی۔

(۹) واضح ہو کہ یہ پرچہ جنوری کا پرچہ ہے' دوسرا پرچہ فروری کی دسویں تک شائع ہو جائیگا۔

(۱۰) قارئین کرام یہ سُنکر خوش ہونگے کہ کلیم میں عنقریب ہندوستانی موسیقی کی نادر تصویروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہونیوالا ہے۔

گوالیار کے قدیم محل میں آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے کسی جے پور کے صناع نے تمام راگ راگنیوں کو منقش کیا تھا جس کے نقوش آج بھی تازہ ہیں۔

میں نے گوالیار کے فاضل' اور ادب نواز لا ممبر پنڈت سر کیلاش نرائن ہاکسر کی خدمت میں درخواست کی تھی کہ وہ براہِ معارف نوازی کلیم کے واسطے اِن تصاویر کے بلاک بنوا دیں۔ چنانچہ انہوں نے میری اس ناچیز درخواست کو منظور فرما کر بلاکوں کی طیاری کا حکم دیدیا ہے' اور غالباً کلیم کے دوسرے نمبر سے ان نوادر کا سلسلہ شروع ہو جائیگا۔

صرف میں ہی نہیں، تصاویر دیکھ کر قارئین بھی کرنل ہاکسر صاحب کا شکریہ ادا کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

اسی سلسلے میں میں نے حبیب اللہ صاحب سے جو موسیقی کے بڑے ماہر ہیں، درخواست کی ہے کہ وہ ان تصاویر پر علمی حیثیت سے نوٹ طیار فرمائیں، اور میں شکر گذار ہوں کہ انہوں نے وعدہ فرمالیا ہے۔

(۱۱) مسائلِ حیات، یہ ایک کتاب "　　　" کا مولفانہ ترجمہ ہے، جس کے چند ابواب اس اشاعت میں حاضر کئے جا رہے ہیں، یہ سلسلہ بھی برابر طبع ہوتا رہے گا۔ جو امید ہے کہ ناظرین کے واسطے موجب دلچسپی سے زیادہ باعثِ اصلاحِ فکر ثابت ہوگا۔

(۱۲) دہلی کے مشہور و کامیاب آرٹسٹ سمیع صاحب نے وعدہ فرمایا ہے کہ آیندہ سے وہ مصوری کے متعلق "کلیم" میں اپنے گراں بہا مقالات کا سلسلہ شروع فرمائیں گے، جس کے واسطے میں صاحب موصوف کا شکر گزار ہوں۔

(۱۳) مجھ پر دلی شکریہ فرض ہے جناب قاضی سر عزیز الدین احمد صاحب دیوان ریاست دتیا، جناب اعزاز رسول صاحب تعلقدار سندیلہ، سر شاہ محمد سلیمان صاحب چیف جسٹس، الہ آباد۔ اور سر تیج بہادر سپرو کا، جنہوں نے کلیم کے دس دس پرچوں کی خریداری منظور فرماکر میری عزت افزائی فرمائی ہے، جن میں سے قاضی سر عزیز الدین احمد صاحب پندرہ پرچوں کے خریدار ہیں۔

اسی طرح میرے شکریے کے مستحق ہیں نواب سر لیاقت حیات خاں صاحب وزیر اعظم پٹیالہ، کرنل امیر احمد صاحب، کرنل پنڈت سر کیلاش نرائن صاحب ہاکسر ممبر گوالیار، پنڈت سر امرناتھ صاحب　　فنانس ممبر جے پور، اور خاندان سر سید مرحوم کے چشم و چراغ نواب سر راس مسعود وزیر تعلیمات بھوپال، جنہوں نے کلیم کی ہر ممکن سرپرستی کا وعدہ فرماکر میری قوتِ خدمتگزاری میں بجلی سی دوڑا دی ہے۔

(۱۴) اگر میں اس سلسلۂ تشکر و امتنان میں مسز سروجنی نائیڈو کا شکریہ نہ ادا کروں تو ایک بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہونگا، جن کے زریں مشوروں، اور امدادی مساعی نے مجھے سب سے پہلے اجرائے کلیم پر آمادہ کیا تھا۔

(۱۵) کلیم کے مقالہ نگار۔

وہ حضرات میرا والہانہ شکریہ قبول فرمائیں، جنہوں نے اپنے گرانقدر مقالوں سے کلیم کی عزت افزائی فرمائی ہے، اور اُس کے معیار کو تباہ ہونے سے بچا لیا ہے۔ اگر یہ حضرات میری امداد نہ فرماتے تو قیامت تک ممکن نہ تھا کہ میں رسالہ نکال سکتا۔

مجھے اُمید ہے کہ یہ باکمال ہستیاں مستقل طور سے میری ہمت افزائی فرماکر کلیم کو ایک ایسا معیاری و مفید رسالہ بنا دیں گی، جس کی مجھے آرزو ہے، اور میرے ملک کے یہ ارباب جوہر کبھی وہ وقتِ بد نہ آنے دیں گے کہ میں اپنے معیار کو قائم رکھنے کی خاطر کلیم کو بند کردوں۔

فہرستِ مضامین میں آپ کو ایک نیا نام ملیگا۔ ملک حبیب احمد بی اے آنرز کا، یہ میرے نزدیک اُن ہونہار نوجوانوں میں سے ہیں جو انشاءاللہ آگے چلکر ادب میں ایک ممتاز درجہ حاصل کرینگے۔ "حُزنیۂ محبت" کو آپ اسی پرچہ میں ملاحظہ فرمائینگے، حبیب صاحب کا یہ پہلا افسانہ ہے، اگر "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کی ضرب المثل صحیح ہے تو افسانے کے تیور کہہ رہے ہیں کہ اس قلم کی، جوانی کیا ہوگی۔

رباعی

(حضرتِ سیماب اکبرآبادی)

عشرت کو گناہِ زندگی سمجھا ہے　　تسکینِ طبیعت کو بدی سمجھا ہے
ہو جائے گا چھوٹی چھوٹی باتوں پہ خفا　　کیا تو نے خدا کو آدمی سمجھا ہے؟

صحیفۂ نَو

جوش

اے رُوحِ عصرِ حاضر و ہندوستانِ نَو
لایا ہے اک صحیفہ، سخنداں ترے لئے

اس مصحفِ عظیم کی اللہ ری وسعتیں
ہر مدّ ہے مشرقین بداماں ترے لئے

ہر منظرِ حیات کو دیکھا ہے غور سے
چھوڑا نہیں ہے ایک بھی عنواں ترے لئے

رُکتی ہے جس مقام پہ رُوح الامیں کی سانس
دل کو وہاں کیا ہے پَر افشاں ترے لئے

لایا ہوں بزم و رزم کی ارضِ تضاد سے
یہ طبلِ جنگ و سازِ شبستاں ترے لئے

کتنی شبوں کے طاق میں رکھ کر چراغِ دل
پرکھی ہے روحِ عالمِ امکاں ترے لئے

اس کی خبر بھی ہے، کہ بنایا گیا ہے لحن
کتنی شبوں کا گریۂ پنہاں ترے لئے؟

ڈھالے ہیں مرغزار و گلستاں کی شکل میں
کتنے مہیب و تیرہ بیاباں ترے لئے؟

گوندھی گئی ہے تارِ سخن میں، خبر بھی ہے،
کن مہوشوں کی زلفِ پریشاں ترے لئے؟

کس کو خبر، تراش کے کن ظلمتوں کا دل
لایا ہوں میں یہ چشمۂ حیواں ترے لئے؟

میں تجھ سے کیا کہوں کہ سخن میں کیا ہے حل
کس شوخ کا تبسمِ پنہاں ترے لئے

واقف بھی ہے کہ موجِ سخن میں ہوئی ہے صرف
کن انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں ترے لئے؟

لایا ہوں وزن و شعر کی منزل میں، کیا کہوں
کیونکر جراحتِ دلِ انساں ترے لئے؟

تعبیر کی ترازوئے رمز و نہفتہ میں
تولے ہیں کتنے خواب پریشاں ترے لئے

کیا پوچھتا ہے جوش کی بربادیوں کا حال
پرزے ہے کب سے جیب و گریباں ترے لئے

اُردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت

(از جوش ملیح آبادی)

نوعِ انسانی کے مُصلح بننے کا خیال، کسقدر مضحکہ خیز خیال ہے! انسان انسان کی اصلاح کر سکتا ہے؟ کیا یہ محض وہ واہمہ نہیں جو صرف بہکی ہوئی ذہنیت ہی کی پیداوار ہو سکتا ہے؟

میں پوچھتا ہوں، انسان خود اپنی اصلاح بھی کر سکتا ہے؟ اور کیا یہ ایک عریاں حقیقت نہیں ہے کہ انسان خود اپنی اصلاح کے باب میں بھی قطعی بے دست و پا ہے؟ اور اس بے دست و پائی کے باوجود، نوعِ انسانی کی اصلاح کے خواب دیکھنا مسخرگی نہیں تو اور کیا ہے؟

"تو بہ خویشتن چہ کردی، کہ بما کنی نظیری؟"

افسوس، اے مجبور، ناچار انسان! افسوس، کاش تو اپنی ہی اصلاح کر سکتا، لیکن —

"او نامراد تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا"

میں اربابِ عقل و عمل سے دریافت کرتا ہوں کہ اس مجبوری کے باوجود، اور اس بیچارگی کے باوصف، ہمارا انسانوں کے مصلح بننے کا تخیل، کیا عظیم الشان قدرت کی بارگاہ میں ایک احمقانہ اور ناقابلِ عفو گستاخی نہیں؟

انسان تو اس عظیم المرتبت کُرۂ ارض کا فرزند، اور اس عظمت آفریں نظامِ شمسی کا بچہ ہے، جو سنگ ریزوں کو جواہر پارہ دل، اور مادۂ بے حقیقت کو پیکرِ انسانی میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ قدرت، انسان کی دایہ ہے، وقت اُس کا مُعلّم ہے۔ طلوع و غروب اُسکی درسگاہیں اور ماہ و سال اسکے درسیات ہیں"

کیا وہ "ماہتاب اندر عنان و آفتاب اندر رکاب" قوت جو اس عظیم کارخانۂ عالم کو چلا رہی ہے۔ اسقدر ٹھنڈی اور کمزور واقع ہوئی ہے کہ کسی مصلح کی دخل اندازی، اور کسی بہ خود غلط راہبر کی گستاخی برداشت کر لیگی؟

کیا انسان، موجِ نفس پر تھرتھرانے والے حباب "انسان" کو یہ معلوم نہیں کہ اس پُر سطوت گردش کرنے والے کرۂ ارض میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ منشائے قدرت کے عین مطابق ہو رہا ہے؟

کیا جو جہاں بٹھا دیا گیا ہے۔ وہی اسکا بہترین مقام، اور جو حرکت اُسکی مقرر کر دی گئی ہے۔ وہی اُس کا وظیفۂ فطری نہیں ہے؟

ہم انسانوں کے اعمال، اور اشیائے عالم کے خواص پر "خیر" و "شر" کے لیبل لگانے والے کون ہوتے ہیں؟

اک مردِ حق آگاہ نظر آتا ہے جو اک کافرو گمراہ نظر آتا ہے
اس کہنہ سرا میں بد و نیک نہیں ہے مامورِ من اللہ نظر آتا ہے

میں پوچھتا ہوں اِس زمین کی، جو اپنی چھاتی پر پہاڑ اُٹھائے ہوئے ہے، ہر چھوٹی سی چھوٹی جنبش، اور اِس آسمان کی، جو تمام عالم کو ڈھانپے ہوئے ہے، ہر ادنیٰ سی ادنیٰ حرکت، کیا ایک پوشیدہ مگر مکمل قانون سے جکڑی ہوئی نہیں ہے؟

کیا وہ تمام سفاک و رحمدل، ہولناک و دلفریب، اور ناقابلِ تصوّر عظیم قوتیں، جو بپھرے ہوئے آوارہ مزاج و شریر عناصر کے دہانوں میں لگامیں دیئے ہوئے ہیں، انسان کی سی زمین پر رینگنے والی مخلوق کے کھوکھلے اصطلاحاتِ "زشت" و "خوب" کے روبرو سرِ تسلیم خم کرنے، اور انسانوں کی بنائی ہوئی بے مغز سوسائٹی کے مفروضات "اوامر" و "نواہی" کے سامنے سپر انداختہ ہو جانے پر آمادہ ہو سکتی ہیں؟

کیا وقت کا پہیا، جسکی نگرانی میں ماہ و سال کی پُر فن کمانیاں ایک مقررہ رفتار کے ساتھ کھلتی رہتی ہیں، اتنی بعید از قیاس

سرعت کے ساتھ نہیں گھوم رہا ہے کہ اسکی سُبک تیلیوں کو دنیا کی سب سے بڑی خوردبین بھی نہیں دیکھ سکتی؟ اور کیا وقت کی اس تند و تیز رو، اور آب روز و شب کے اس دریا کے ریلے میں دنیا کا ہر سفید و سیاہ، اور عالم کا ہر خشک و تر جس میں آدمی بھی ایک ہے، منشائے قدرت کے مختلف سانچوں میں برابر ڈھلتا نہیں چلا جا رہا ہے؟

کیا ہم اس سلسلۂ عمل کو چھو سکتے ہیں؟ --- کیا ہمارا جذبۂ اصلاح، اپنا پرجوش شنیدی کے نکیلے، دو گرم دندانوں کی گرفت سے انسان کو چھڑا لینے کی قوت رکھتا ہے؟

کیا ہم قدرت کی بلند اور اسرار کے گہرے پردوں میں چھپی ہوئی تربیت گاہ میں نقب لگا کر داخل ہو سکتے ہیں؟ اور کیا شہریار حیات یعنی وقت کے مکتب پنہاں سے ہم اسکے طلاب کا اغوا کر سکتے ہیں؟

مصلحین کے درمیان کون ایسا سورما ہے جو خم ٹھونک کر، اور غرور سے گردن کو کج کر کے سامنے آئے، اور جواب دے "ہاں، میں ایسا کر سکتا ہوں"؟

میں یہ آوازِ بلند پوچھتا ہوں، کسکی مجال ہے، اور کس میں یہ جرأت ہے کہ انسان کو آغوشِ قدرت سے چھین کر اپنی گود میں اٹھا لے؟

اگر کوئی ایسا ساونت ہے، میں اسے چیلنج دیتا ہوں، مردوں کی طرح سامنے آئے۔ یہ ہے بارگاہِ قدرت!

این است کہ دل بُردہ و خوں کردہ بسے را
بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را!

ہاں ایسی کوششیں کی جا چکی ہیں، دُنیا نے ایسے صدہا ناکام تجربے دیکھے ہوئے ہیں۔ دنیا کے عظیم ترین "مصلحوں" کے کارنامے دنیا کی میز پر کھلے ہوئے رکھے ہیں۔

تاریخ کے بوسیدہ قصر کا دروازہ کھولئے، اس کے خاک آلود دفتر پارینہ کی ورق گردانی کیجئے، اور دیکھ لیجئے کہ اکابرِ مصلحین کی نامرادیاں کسقدر جلی حروف میں لکھی ہوئی ہیں اور اُنکے نوشتوں کے سرورق پر لے کر بھرے ہوئے الفاظ میں درج ہے:

"سلام لے بعد ما آیندگان رفتنی + برشما نوش باد نا خوشہائے دنیائے دنی"

خدا رحمت کرے مُصلحین پر، ان نوعِ انسانی کے محسنوں کی وقتی کامیابیوں کی پرچھائیوں پر نہ جائیے۔ خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود کی کرشمہ سازیوں کو اہمیت نہ دیجئے۔ اور عقلمندوں کی طرح اس "روشنی" کو روشنی کیوں کہئے جو "برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم" کے مانند عارضی و ناپائیدار ہوا کرتی ہے؟

دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا ان مصلحوں نے نوعِ انسانی کی قلب ماہیت کر دی تھی؟ کیا یہ گروہ، فطرتِ انسانی پر قابو یافتہ ہو گیا تھا؟ اور کیا ان مصلحین نے انسان کو قدرت کے آغوش سے چھین کر اپنے سایۂ تربیت میں لے لیا تھا؟

اور کیا اس سوال کا جواب، اثبات میں دیکر ہم مجنونوں کی صف میں بیٹھنے کے قابل نہ ہو جائینگے؟ کیا اتنے مصلحوں اور ہادیوں کی سرگرمیوں کے باوصف، دنیا آجتک اسی روش پر قائم نہیں ہے جس روش پر فطرت اُسے چلا رہی ہے؟

کیا انسانیت اپنے نئے اور پرانے ہادیوں کی گرفت میں ہے؟

ہاں نوعِ بشر جیسی تھی جیسی ہے اب تک
انساں "رہِ راست" پر نہیں ہے اب تک
اللہ کو ہو مژدہ کہ "سرکش" بندہ
تھا روزِ ازل جہاں، وہیں ہے اب تک

زمانے کے ایوان، اور تاریخ کی محراب میں اب تک شکست خوردہ آوازیں گونج رہی ہیں، اُن غریب "مصلحین" کی جو نورانی چہروں، محیّر العقول قوتوں، فصیح خطبوں، مضبوط سیرتوں، مقدس ارادوں، شفا بخش کلموں اور اپنے معتقدین کے سرفروش لشکروں کے ساتھ، رشد و ہدایت کے آسمانی طبل پر چوبیں لگاتے ہوئے حیات کے افق پر ماہتاب در بغل، اور آفتاب بر کف، طالع ہوئے تھے --- لیکن،

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"!

آؤ میں تمہیں مصلحین کی روحوں کی آواز سناؤں"

دم بھر بھی ہیں صبر کا یارا نہوا + پورا کوئی ارمان ہمارا نہوا

اصلاح کی بہتیری تو بہت کی کوشش، لیکن تری حکمت کو گوارا نہوا

بتایا جا چکا ہے کہ انسان فطرت کا بچہ ہے، اور تمام انسانی گرفت سے بالاتر واقع ہوا ہے۔ بیچارے مصلحین، خدا انکی ہڈیوں کو محفوظ رکھے، زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتے ہیں کہ اپنی پیشانیوں سے ناکامی کو پسینہ پونچھ ڈالیں اور بس!

ہاں مشغلۂ جام و سبو جاری ہے
اب تک وہی رسمِ ہاؤ ہو جاری ہے
کمی ہے کچھ انسان سے ٹکر ایسی
ہر دین کے ماتھے سے لہو جاری ہے

فطرت کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے، فطرت کی حکمرانی ازل سے شروع ہوئی ہے، اور ابد تک جاری رہیگی۔

گُل پر ہیں نقوشِ دستِ باری اب تک
جنباں ہے دلِ بادِ بہاری اب تک
انساں کی پیمبری کا در ہے مسدود
فطرت کی پیمبری ہے جاری اب تک

ذرا "مصلحین" کے پیروؤں کے دفتروں کو کھول کر دیکھئے، جو روشنائی کے عوض، انسانی خون سے لکھے گئے ہیں۔ انسان کی بربادی، تباہی، دردمندی، اور ہلاکت کے واقعات ایک ایک کرکے۔ ٹھہر ٹھہر کر، صبر کے ساتھ پڑھئے، ایک ایک سُرخی، اور ایک ایک مد کو جانچئے، ہر اجمال پر تفصیلی نظر ڈالئے، اور پھر دریافت کیجئے کہ اتنی زبردست بربادیوں کے بعد اولادِ آدم کو ملا کیا؟

میں خود کچھ عرض نہ کرونگا۔ آپ خود اپنی قوتِ فیصلہ اور شعورِ استنباط سے پوچھئے۔ البتہ میری جانب سے اسقدر ضرور یقین دلایا جاسکتا ہے کہ اگر آپکی قوتِ فیصلہ وہم پرست عورتوں کی طرح سہمی ہوئی نہیں ہے، تو وہ آپ کو گمراہ کن جواب دینے کی جسارت ہرگز نہ کرسکے گی۔

اور اب جب کہ نوعِ انسانی کی اصلاح کے باب میں ہماری بیچارگی اسقدر نمایاں، اور ہمارا عجز اسقدر غیر مبہم طور سے ہمارے سامنے آچکا ہے، تو ہمیں اپنے دماغ کی تمام قوتوں کو یکجا کر کے غور کرنا ہے کہ ہمارے سامنے کونسا راستہ کھلا ہوا ہے۔ یعنی:

"چیست یارانِ طریقت! بعد ازیں تدبیر ما؟"

کیا ہم دنیا کے سب سے بڑے مغنی حافظ شیرازی کی "حدیث از مطرب و مے گو" پر کاربند ہو کر خاموش ہوجائیں؟ بے عملی پر قناعت کرلیں؟ — "حدیث از مطرب و مے گو" پر تو عمل کیا جاسکتا ہے، اور اسوقت بھی تندرست ذہن کے مالک عقلا کے حلقے میں اِس پر عمل ہوتا ہے۔ لیکن اِسکا دوسرا حصہ۔ یعنی "خاموش ہوجائیں"؟ بے عملی پر قناعت کرلیں؟ قطعی طور پر ناقابلِ عمل ہے۔

انسان سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن خاموش و بے عمل کبھی نہیں ہو سکتا — حرکت اُسکی زندگی ہے اور سکون موت — وہ تو روزِ ازل کی صبحِ صادق سے "حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز" کے ترانے گا رہا ہے، اور جب تک موت اُسے بظاہر خاموش نکردیگی وہ یہی ترانے گاتا رہیگا۔ "بظاہر" میں اس لئے کہتا ہوں، کہ کون کہہ سکتا ہے کہ ع خود موت بھی خواب ہے، کہ بیداری ہے؟ اور جبکہ سکون و اضمحلال، اور جمود و تعطل، انسان کے واسطے ناممکنات میں سے ہے، تو قرینِ دانشوری یہی ہے، یا یوں کہئے ہم اسیر مجبور ہیں کہ انسان کو مصروف و مشغول ہی رہنے کا مشورہ دیں، کیونکہ یہ مشورہ تو خود ہماری عین فطرت ہے۔

لیکن اِس منزل پر کیا ہم دنیا کی سب سے بڑی، سب سے زیادہ لاینحل، اور سب سے زیادہ قدیم مشکل سے دوچار نہیں ہوجاتے؟ یعنی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان، اب تک، اس لمحے تک اپنی غایتِ تخلیق ہی سے ناواقفِ محض ہے، تو پھر اس سادہ و ہموار صورتِ حال میں کیا ہم اُس کے سامنے واقعی کوئی ٹھوس اور حقیقی کام پیش بھی کر سکتے ہیں؟

صدیوں اور قرنوں سے اِس نیلے آسمان کی پُر رعب ڈاٹ کے نیچے "صنّاعِ مرا، بہر چہ آراست، مرا؟" کی آوازیں گونج رہی ہیں، "پیغامبر" خاموش ہیں۔ "صحائف" نقش بدیوار ہیں، اور فلاسفہ سر بہ در گلو — آخر کس سے دریافت کیا جائے؟ کس سے پوچھا جائے؟ کس ماں نے آجتک کسی جاننے والے کو جنا ہے؟ ہر طرف کامل

خاموشی، زبردست سکوت، اور اتھاہ سناٹا ہے — اور غریب انسان ـ بشریت کا سوتیلا بیٹا انسان "کہ سرگردہ بیابان تو دادہ مارا" کا رونا روتا ہوا تحقیق کی تاریک وناہموار وادیوں میں سر پھوڑتا پھر رہا ہے، اور ہر منزل، ہر قدم پر "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد" کی دردناک چیخ اُس کی زبان سے نکل جاتی ہے۔

وائے اے ذوقِ تحقیق! حیف اے دردمند انسانیت!!

یہ عقلِ زبوں، مٹا کے چھوڑے گی ہمیں
یہ آتشِ غم، جلا کے چھوڑے گی ہمیں
یہ راز کی پیاس، دل کا پی لیگی لہو
یہ علم کی بھوک، کھا کے چھوڑے گی ہمیں

خیر یہ تو ایک "جملہ معترضہ" تھا، یا دردمند دل کی آہ، جو منہ سے نکل گئی — اب دیکھنا یہ ہے کہ جب تک علتِ ایجاد کا پتا نہ چلیگا جسکی امید "ایں خیال است و محال است و جنوں" کی حد تک موہوم ہے، اُسوقت تک انسان اپنے زعم میں خواہ کوئی کتنا ہی ٹھوس اور سنجیدہ کام کیوں نہ اختیار کرے، لیکن حقیقت شناس طبقے میں اُس "ٹھوس" اور "سنجیدہ" کام کو "شغلِ بیکاری" سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ کہنے والے نے کہا ہے، اور سچ کہا ہے -

انسان کی جسقدر بھی طراری ہے
بس وقت گذارنے کی بیماری ہے
افسوس کہ بے معرفتِ رازِ حیات
جینا کتنی شدید بیکاری ہے

"شغلِ بیکاری" اور خلیفۂ ارض و وارثِ کائنات انسان"!
کتنا غیر مشفقانہ برتاؤ! کتنا دردناک کھیل!!

اور جب "شغلِ بیکاری" ہی کے نقطے پر ہمارے تمام اعمال کی گردش منحصر ہے، تو آئیے، زندگی کو بہلانے، اور بچے کے ہاتھ میں کھلونا دینے کی خاطر، دنیا کے ناقابلِ شمار، مشاغل میں سے کوئی ایسا شغل کیوں نہ منتخب کرلیں، جس پر ہم "بہترین شغل" کی مُہرِ تصدیق ثبت کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہوں؟

لیکن انفرادی و اجتماعی، دونوں جہتوں سے اِسکا کوئی ایک حل، یا ایک جواب بیحد دشوار معلوم ہوتا ہے — البتہ اس سلسلے میں بلاخوفِ تردید اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے، ممکن ہے میں غلطی پر ہوں، کہ جن جواں بخت، یا بدقسمت افراد کی سطحِ فکر کافی بلند، اور جنکے ذہن کی دھار کافی باریک اور تیز واقع ہوئی ہے، اُنکے واسطے کارخانۂ عالم میں تفکر و تدبّر سے بہتر کوئی دوسرا مشغلہ اسوقت تک انسانی حدودِ معلومات میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اور یہی وہ تنہا مشغلہ ہے، جس سے ہم خدمتِ انسانی کی بہترین آرزوؤں کو وابستہ کرسکتے ہیں۔

اس موقع پر یہ اعتراض قدرتی طور سے پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مان لیا گیا ہے کہ انسان کی اصلاح، انسان کے بس کا روگ نہیں ہے، تو پھر مشغلۂ تدبّر و تفکر سے "خدمتِ انسانی کی بہترین آرزوؤں" کی وابستگی کیا معنی رکھ سکتی ہے؟ -

سُنئے میں عرض کرتا ہوں — بات یہ ہے، اور اربابِ بصیرت، عقلی، اور زیادہ تر، وجدانی طور پر اِس سے بخوبی آگاہ ہیں، بلکہ تجربے بھی کرچکے ہیں کہ زمانہ اپنی مسلسل و پیہم گردش میں، چلتے چلتے خود بخود ایک ایسی موڑ پر آ جایا کرتا ہے، جہاں سے نوبہ نو انقلابات کے دروازے خود بخود کھلنے لگتے ہیں — اور مفکرین کے سینوں میں انکا عکس تھرتھرانے لگتا ہے — یعنی زمانے کی اِس موڑ کے معنی ہی یہ ہیں کہ اب قدرت خود اصلاح یا انقلاب پر تیار ہوچکی ہے، اور مفکرین کو تعاون پر آمادہ کررہی ہے۔

عوام اِن انقلابی آثار و قرائن کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، انکی موٹی نگاہ زمانے کو مُڑتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی، لیکن جسطرح آلات کے ذریعے ستاروں کی گردش، شمس و قمر کی رفتار، موسموں کے تغیرات، قحط و بارش کے آثار، آندھیوں، طوفانوں، اور زلزلوں کی آمد کا حال معلوم کرلیا جاتا ہے، ٹھیک اُسی طرح، اور اُسی انداز پر، مفکرین کی بصیرت، آنیوالے انقلابات کا پہلے ہی سے مشاہدہ کرلیتی ہے - وہ فضا میں انقلاب کو دیکھ، اور ہوا میں انقلاب کو سونگھ لیتے ہیں - اور جیسے ہی زمین سے خفیف سی بھاپ اُٹھنے لگتی ہے، وہ اہلِ خرمن کو آگاہ کردیتے

ہیں کہ برقِ خرمن سوز سے ہوشیار ـــــ اور جب آنے والے انقلابات
کے تیور پہچان کر وہ انکی افتاد و مزاج کا صحیح اندازہ لگا لیتے ہیں، تو
منشائے قدرت کے زیرِ سایہ، ہر ممکن عجلت کے ساتھ انقلابی
سرگرمیاں شروع کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں؛ اور اس شدت
کے ساتھ کہ سُست رفتار زمانے کی رَو میں، جو انقلاب ممکن سے
کل رونما ہوتا، وہ اُنکے مساعی کی بدولت آج ہی پیدا ہو رہا ہوتا ہے۔ اِبو
اس طور پر مفکرین، زمانے کو اُسکے عزائم میں مدد دیکر انسان کی بہترین
خدمت انجام دیتے ہیں، اور "مصلحین" کے خطاب سے سرفراز کئے
جاتے ہیں۔

اِسکو اِس مثال سے سمجھئے، فرض کیجئے زمانہ ایک مطلق العنان
بادشاہ ہے، اور مفکرین اُسکے مزاجداں مقربین میں سے ہیں ـــ
بادشاہ کے دل میں جیسے ہی کوئی انقلابی یا اصلاحی جذبہ پیدا ہوتا ہے
یہ فوراً اُسکے تیوروں سے پہچان جاتے ہیں، یا یوں کہئے بادشاہ
خود اپنے تیوروں سے اُنھیں پہچنوا دیتا ہے، اور گروہِ مفکرین اُن
آثار کو پاتے ہی ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس سرگرمی سے جدّ و جہد
شروع کر دیتا ہے، کہ بادشاہ کا عزم بہت ہی جلد عملی جامہ پہن
لیتا ہے، اور وہ انقلاب جو خدا جانے ضمیرِ شاہ میں کب تک پہلو
بدلتا رہتا، اُنکی مستعدی کی بدولت جلد تر رونما ہو جاتا ہے۔

اب آپ سمجھے کہ شغلِ تدبر و تفکر سے میں نے "خدمتِ انسانی
کی بہترین آرزوؤں" کو کیوں وابستہ کیا تھا؟

یہی حال آجکل ہندوستان کا ہے ـــ ممکن ہے کسی کو نظر
نہ آتا ہو، لیکن اربابِ نظر ہندوستان میں زمانے کو یوں مُڑتے
ہوئے دیکھ رہے ہیں، جیسے پیچ و خم کھاتی ہوئی پٹری پر ریل مُڑتی نظر
آتی ہے، اور اس صفائی کے ساتھ کہ گارڈ کے ڈبے سے انجن
نظر آنے لگتا ہے۔ ہاں۔

لذتِ سیرِ دگر چشمِ تماشا لیگی
ایک بار اور یہ دنیا ابھی پلٹا لیگی

لیکن ہندوستانیو! تمھاری سماعت کو کس طوفانی بجلی
کی کڑک اُچک لیگئی ہے؟ کیا واقعی تم نہیں سُنتے کہ ہندوستان
کی ہواؤں میں انقلاب سانس لے رہا ہے، سنسنا رہا ہے، راستے
کے موڑ پر ہندوستان کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے؟

اور کیا تمھیں نہیں معلوم کہ جب رات کا پُر اسرار
سنّاٹا، پہنائے عالم کا احاطہ کر لیتا ہے، تو نامعلوم سمتوں سے
"انقلاب" "انقلاب" کی دھیمی آوازیں صبح تک آتی رہتی ہیں۔

ہندوستانیو! تمھاری بصارت کو کسکی نظر کھا گئی ہے؟
کیا واقعی تم نہیں دیکھتے کہ ہندوستان کی دھوپ، اور چاندنی
میں انقلاب جھلجھلا رہا ہے؟

اور اے زمین کے عجیب ترین باشندو، اہلِ ہند!
تمھاری قوتِ شامہ کو کس زہر نے سُن کر دیا ہے؟ کیا تمھاری
سانس تمھیں خبر نہیں دیتی کہ ہندوستان کے گلزاروں میں انقلاب
بوئے گُل بنکر فضاؤں میں مچل رہا ہے؟

اور خدارا بتاؤ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ سینۂ
ہندوستان میں انقلاب کا جو سُرخ شعلہ آہستہ آہستہ تھرتھرا رہا
ہے، اُسے ہوا دینا شروع کر دیا جائے؟ ـــ انقلاب۔ انقلاب
ہر شے میں انقلاب۔ ہر جہت سے انقلاب۔ زندگی کے ہر شعبے
میں انقلاب۔ تہذیب و تمدن میں انقلاب۔ آداب و رسوم
میں انقلاب، نظریات و معتقدات میں انقلاب۔ مسلمات
و کلیات میں انقلاب ـ سیاسیات و مذہبیات میں
انقلاب۔ انقلاب۔ یکسر انقلاب ـ تمام تر انقلاب ـــ اور
مکمل انقلاب۔

لیکن آپ جانتے ہیں اِن تمام انقلابات کا سرچشمہ کہاں
ہے؟ ـ نفسیات سے پوچھئے، وہ جواب دیگی کہ انسان کے ذہن
و خیال اور صحیح فکر میں"

جب تک "ذہن و خیال" میں انقلاب نہ آئیگا، کسی
نوع کے انقلاب کی امید رکھنا ایک مہمل سی بات ہے۔

لیکن اِس "ذہنی" انقلاب کا سرچشمہ کہاں ہے؟ "دنیا کی
زندہ اور مُردہ قوموں کی تاریخ سے سوال کیجئے، وہ جواب دیگی
"قوموں کے ادبیات" میں!

اس لئے آئیے، اپنے ادبیات کا جائزہ لیں، اور دیکھیں اس مجموعے میں زندگی و بیداری پیدا کرنے کی صلاحیت کہاں تک پائی جاتی ہے؟

لیکن ایکبار کی دیکھی، جانچی اور پرکھی ہوئی چیز کا جائزہ کیوں لیجئے؟ ہمارے ادبیات میں ہے کیا؟ وہی روایتی، مصنوعی اور بے سمجھے بوجھے حسن و عشق کے چٹخارے۔ وہی نارو! قناعت اور ترکِ دنیا کے چبائے ہوئے نوالے۔ وہی "اگر شہ روز را گوید شب است ایں" کی غلامانہ تعلیم۔ وہی "ما تقیمان کوئے دلداریم" کی لوریاں۔ وہی "گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے" کی بزدلی۔ وہی "رات بھر لاشہ پڑا رکھا مسیحا نے مرا" کی کفن فروشیاں۔ وہی "یار کا سر چڑھ کے بوسہ لے لیا" کی بولی ٹھولی۔ وہی "ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا" کی کاہلانہ بے پروائیاں۔ وہی "لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی" کی بے غیرتیاں۔ وہی "ایسے میں کوئی چھم سے جو آ جائے تو کیا ہو" کی سوقیانہ بول چال۔ وہی "اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائینگے" کی دُون ہمتی۔ وہی "کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما" کی نوم آوردوائیں۔ اور وہی "بہت سعی کیجئے تو مر رہیئے میرؔ بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے" کی نسائی ناچاریاں۔

میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر جواب دیجئے کیا ہم اس رانڈوں کی طرح بین کرتی اور سوگوار بوڑھیوں کی طرح چھاتی پیٹتی ہوئی، جھوٹے آنسوؤں کی شاعری سے طوفانی سمندروں کے تڑپتے ہوئے سینوں پر جہاز چلا سکتے ہیں؟

جس شاعری کی ہڈیاں، زنداں کی زنجیروں سے کھرچ کھرچ کر نکالی جاتی ہوں، جس کی سفید آنکھیں ہمیشہ چھت سے لگی رہتی ہوں؛ جو حقیقی حُسن و عشق کی چاشنی سے بیگانہ ہو، جو اس زندگی اور اس کے تمام بے شمار پہلوؤں کے مطالعے اور اس عظیم الشان کرۂ ارض کے مشاہدے سے قاصر ہو، جسکے آشیاں پر آئے دن بجلیاں گرا کرتی ہوں، جسے ہر بازاری آدمی، اگر وہ رقیب کی صورت سے نمودار ہوا ہے، دھکے دیکر بزم سے نکال سکتا ہو جو دل کا جنازہ ہتیلی پر لئے پھرتی ہو، جسکی سانس سے شگفتگی کا جِگر اُتر جاتا ہو، جسکا ہر روز "عشرۂ محرم" اور جسکی ہر شب "شب شہادت" کے مانند ہو، اور جس کی تھرتھراتی ہوئی آواز ایسی ہو گویا آندھی کے وقت ٹوٹی ہوئی قبروں کے روزنوں سے ہوا گزر رہی ہے، کیا ایسی فاقوں کی ماری، اونگھتی، بلبلاتی، تھرتھراتی، گڑگڑاتی، کانپتی، روتی، پیٹتی، چیختی، چلاتی، سسکتی، بسورتی، بلکتی، اور لنگڑاتی ہوئی شاعری کے کاندھے پر ہات رکھ کر ہم زندگی کے پُر ہول و ناہموار میدانوں کے طے کرنے کا تصور بھی کر سکتے ہیں؟

ایکبار نہیں، ہزاروں مرتبہ، طویل راتوں کے سکون اور سناٹوں میں مینے اُردو شاعری کا مطالعہ کیا۔ مینے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے اساتذہ کے سینے کھولکر دیکھے، مینے پوری دیانت کے ساتھ اپنے شعراء کی نبضوں پر ہات رکھکر انکے ضربات کا شمار کیا، لیکن افسوس کہ مجھے انکے اندر زندگی، شعلہ فشاں زندگی، آگ اور بجلی سے کھیلنے والی زندگی، گرجتی گونجتی ہر قدم پر مچلتی، اور اُبھرتی ہوئی سُرخ خون والی زندگی کا کہیں نام و نشان تک نہ ملا۔

ہمارے کلیات، دواوین، ناول، اور افسانے، زہر کے کُرّے ہیں، جہاں حیات کا خون جم جاتا ہے اور ولولوں کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں۔

کہاں تک روؤں؟ کس کس بات کا ماتم کروں؟ ذرا اپنے "شعرائے کرام" کے تخلّص ہی ملاحظہ فرما لیجئے۔ اور کسی ماہر نفسیات سے دریافت فرمایئے کہ یہ تخلص کس نوع کی ذہنیت پیش کرتے ہیں، آپ جانتے ہیں اسکا جواب کیا ہوگا؟

وہ غیر مشتبہ الفاظ میں بتا دیگا کہ اس نوع کے تخلّص صرف وہی لوگ پسند اور اختیار کر سکتے ہیں جنکے دلوں کی کمریں ٹوٹ چکی اور جنکی ہمتوں کے منکے ڈھل چکے ہیں۔

سُنئے اور عبرت کے کانوں سے سُنئے۔

مجروح، شُفتہ، ملول، مسکین، درد، سوز، ذرہ، نخچیر، داغ، افسوس، حزیں، عدم، بیدم، بیدل، بسمل، کشتہ، الم، اشک، آہ، قلق، اور یاس وغیرہ!

اور لگے ہاتھوں اِن شعراء کے کلام سے متاثر ہونے والے

ادیبوں کے اُن سابقوں کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو وہ بالعموم خطوں میں اپنے ناموں کے ساتھ لکھتے ہیں۔

ناچیز، ذلیل، حقیر، فقیر، احقر، رُسوا، کمترین، فدوی، عبدِ ذلیل، ہیچ میرز، بندۂ بے نوا، کمترینِ خلائق، ذلِّ مخلوق، احقرالعباد، عاجز، ہیچمداں، گنّاہگار، عاصی، پُرمعاصی، رُوسیاہ وغیرہ!

کیا آپ اپنے شاعروں اور ادیبوں کی پست ذہنیت کے سمجھنے کے لئے اِس سے زیادہ کسی ثبوت یا شہادت کے طلبگار ہیں؟

آخر صاف صاف کیوں نہ کہدیا جائے کہ ہمارا ادب کمزور ہے، علیل ہے، خوابیدہ ہے، مُقلّد ہے، نقّال ہے، غیر فطری ہے، بے روح ہے۔ مدقوق کی طرح زرد، مبروص کی طرح داغدار، مفلوج کی طرح اپاہج، اور سڑی ہوئی لاش کی طرح متعفن ہے؟

ہاں میں آپکے سامنے شاعری ہی کے کیمپ سے آیا ہوں، نہ میں غدّار ہوں، نہ خدانخواستہ مغرب زدہ ــــ ایسا معلوم تو ضرور ہوتا ہے کہ کچھ شعر کہنا اور سمجھنا جانتا بھی ہوں۔ میری طرف سے اس وہم میں نہ پڑیئے کہ میری نظر میں اپنی شاعری کے اُن اثر آفریں اور نازک پہلوؤں پر نہیں ہیں جو دلوں میں اُتر جاتے ہیں۔ لیکن آپ کو غالبًا ایک شاعر کی زبان سے یہ سنکر بہت استعجاب ہوگا کہ میں سرِدست اپنی قوم میں یہ دیکھنا نہیں چاہتا کہ "دل" دماغ پر غلبہ حاصل کئے رہے۔

"دل" ایشیا کا بہت پُرانا اور ہردلعزیز فرمانروا ہے، لیکن حالاتِ موجودہ کی عمرانی اور سیاسی پیچیدگیوں، اور عصرِ حاضر کے مقتضیات پر نگاہ کرتے ہوئے میں ایشیا کے اس شیفتہ اور بوڑھے تاجدار کی خدمت میں عرض کرونگا کہ براہِ کرم خسروانہ، تھوڑے دن کے لئے، تاج و تخت سے اپنی دست برداری کا اعلان کردے۔

ہرچند یہ مشورہ دیتے ہوئے "دل را بدل رہیست" کے مطابق خود میرا دل بھی درد محسوس کرتا ہے، لیکن زندگی کی ضرورتیں جب ہٹ پر آجاتی ہیں، تو انکے قدموں پر دل و جان دونوں کو نچھاور کردینا پڑتا ہے۔ اور اِس وقت ہندوستانی زندگی کی ضرورتیں جان و دل ہی کی قربانی کے لئے مچلی ہوئی ہیں۔

میں حیران ہوں کیا واقعی آپ نہیں دیکھتے کہ ہندوستان ننگا اور بھوکا ہے، دانے دانے کو ترس رہا ہے؟

کیا آپ کے علم میں یہ اب تک نہیں آیا ہے کہ اکثر و بیشتر ہندوستانی مائیں۔ بھوک سے تنگ آکر اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو خود اپنے ہی ہاتوں سے ذبح کر ڈالتی ہیں؟

کیا آپ کو نہیں معلوم ہے کہ ہر سال آپکے کتنے گریجویٹ بے روزگاری سے گھبرا کر زہر کھا لیتے ہیں؟

کیا آپ نہیں دیکھتے، آپ کی عورتیں مدقوق۔ جاہل اور فنِ تربیتِ اولاد سے قطعی بیگانہ ہیں۔

کیا آپ کو نظر نہیں آتا ہے کہ آپکے نوجوانوں کے چہرے سُتے ہوئے ہیں، جن پر خون کی ایک چھینٹ بھی نہیں؟

اور کیا واقعی آپ کو اس حقیقتِ کبریٰ کی اِس لمحے تک خبر نہیں ہے کہ دوسری قومیں تو اجنبی اور غیر ممالک میں بھی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں، اور آپ ہیں کہ خود اپنے وطن، بلکہ اپنے گھر کے اندر اور اپنے بال بچوں کے سامنے جانوروں سے زیادہ حقیر و ذلیل ہیں؟

کیا یہ سچ ہے کہ آپ کو شرم نہیں آتی؟ کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ کی خودداری کا معیار عبرتناک حد تک پست ہے؟

اور کیا یہ خبر صحیح دی گئی ہے کہ آپ "با درد بساز و ہیچ درماں مطلب" پر عمل پیرا ہوکر اِن تمام تذلیلوں اور توہینوں سے مصالحت فرما چکے ہیں؟ خیر، یہ صحیح ہو، یا غلط ــ میں ایک مدت سے سنتا چلا آرہا ہوں کہ ہر قوم کے ادیب اور شاعر، انتہا درجے کے حسّاس، خوددار، اور غیور ہوا کرتے ہیں، اگر میرے ہندوستان میں بھی یہی ہے تو میں اپنے شاعروں اور ادیبوں کے سامنے دوزانو ہوکر گڑگڑاؤنگا کہ خدارا اپنے ادب میں عظیم انقلاب پیدا کرکے ہند کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو خونی گرداب کے خونآشام دانتوں سے چھڑا لیجئے، جلد

چھوڑ لیجئے ورنہ کشتی ڈوب جائے گی۔ اور شباب و محبت کا واسطہ اپنے ادبیات میں حیات و بیداری کا خون دوڑائیے، اور وطن عزیز کے لئے دلوں کی طرح دھڑکتے ہوئے زندہ الفاظ کو جوڑ کر ایک نیا باب الهند تیار کیجئے، جس کی سنہری اور بلند محراب کے نیچے سے زندہ کر دینے والے انقلابات کے نُقرئی جلوس، تو ج در فوج، اندر قطار اندر قطار ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔

یاد رکھئے ایک صحیح جنبشِ قلم شمشیر ہزار برہنہ تلوار وں کے مقابلے میں زیادہ کار آمد آلہ جنگ ہے۔

میں آخری بار پھر یہی کہونگا کہ جو کچھ کہنا ہے جلدی کہئے جو کچھ کرنا ہے جلدی کیجئے ورنہ :-

کی گئی نا وقت قربانی تو پھر کیا فائدہ؟
سر سے اونچا ہو گیا پانی تو پھر کیا فائدہ؟

جان آف آرک

(تصویر کے متعلق)

زیر نظر نمبر میں جان آف آرک کے مجسمہ کی تصویر شائع کی جا رہی ہے جس پر اس جگہ فنی اعتبار سے خامہ فرسائی کا خیال نہیں ہے۔ بلکہ سطور ذیل کا مقصد اصلی صرف اسقدر ہے کہ قارئین کرام کو جون آف آرک کی تاریخی شخصیت سے روشناس ہو جائیں۔

چارلس ششم شاہِ فرانس کی موت کے بعد ہنری ششم شاہِ انگلستان نے معاہدہ ٹرائیز ۱۴۲۲ء کی رو سے فرانس کے تخت پر اپنا حق ثابت کیا اور دعویدار ہوا۔ انگریز ایجنٹ ڈیوک آف بیڈ فورڈ کا حریف چارلس ڈیوفن آف فرانس تھا۔ انگریزی فوجوں نے فرانس کے تمام شمالی حصوں کو تاراج کر دیا یہاں تک کہ اورلینز کا شہر بھی جس پر چارلس ڈیوفن کا قبضہ تھا اس تیرہ بخت شہزادہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ڈیوفن کا چراغ اقبال حق تلفی اور استبداد کی آندھی کی تاب نہ لا کر بجھا ہی چاہتا ہے۔ جب ہر چہار جانب سیہ بختی کی گھٹائیں چھا رہی تھیں تو اورلینز کی ایک دہقانی الھڑ دوشیزہ جون آف آرک مقصد و عمل کو لیکر میدان کارزار میں کود پڑی اپنی کم حیثیت جھونپڑی میں رہتے ہوئے جون نے محسوس کیا کہ فرشتے اسے وطن عزیز کی محافظت کے لئے بلا رہے ہیں۔ قومیت کے جذبہ سے سرشار چارلس کے حضور میں آئی اور اپنا خواب بیان کیا۔ چارلس نے بادل نخواستہ اپنی فوجوں کی کمان جان آف آرک کے سپرد کر دی۔ جان کی قومیت، مقصد پرستی، اور قوت عمل نے سپاہ میں جاں نثاری کی روح پھونک دی اور یکے بعد دیگرے فرانس ہر میدان کارزار میں کامیاب رہا۔ آخر کار ریمز کے مقام پر ۱۴۲۹ء میں چارلس کی تاجپوشی کی رسم ادا کی گئی۔ انگریز جان آف آرک کو حراست میں لینے میں کامیاب ہو گئے اور راوئینز کے مقام پر جان کو "ساحرہ" ہونے کے الزام میں زندہ جلا دیا۔

"م - ح - ا"

مسائلِ حیات

یہ LIFE PROBLEMS کا مؤلفانہ ترجمہ ہے، جو گزشتہ سال ہی امریکہ سے شائع ہوئی ہے۔ مؤلفانہ ترجمہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اثنائے ترجمہ میں ایک ایک خیال سے کئی کئی خیال پیدا ہوتے رہے ہیں، اور میں نے ہر خیال کو ذہن میں اچھی طرح پختہ کر کے اسی ترجمے میں لکھ دیا ہے، بعض مقامات کی طوالت کو تراش دیا ہے، اور بعض مختصر امور میں کلموں کا اضافہ کر دیا ہے۔ گھٹایا کم ہے، بڑھایا زیادہ ہے۔

البتہ بڑی حد تک اس کا لحاظ رکھا ہے کہ "پیری کا طرزِ بیان" اور "شری یوگنندر" مصنفِ کتاب کا اسلوبِ نگارش اصل سے زیادہ دور نہ ہونے پائے۔ ممکن ہے اردو کے خالص طرزِ بیان کی رو سے احباب کو بعض مقامات زیادہ پسند نہ آئیں، لیکن میرے خیال میں اگر اردو میں مختلف زبانوں کے اسالیبِ بیان کی ماہرانہ طور سے آمیزش کر دی جائے تو ایک وسیع اور خوشگوار تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔

اس کتاب میں دلائل و براہین، اور تشریح و تفسیر سے کام نہیں لیا گیا ہے، صرف اتنا کیا گیا ہے کہ زندگی کے چند نہایت اہم مسائل کی طرف، جن سے نوعِ انسانی آئے دن دوچار ہوا کرتی ہے، چند پُرمغز اور حکیمانہ اشارات کر دیئے گئے ہیں، اور بس۔

مجھے خوف ہے کہ یہ اشارات، اُن افراد کے واسطے دلچسپ یا قابلِ فہم نہ ہوں گے، جن کا مطالعہ محدود، اور تفکر نارسیدہ ہے، البتہ وہ حضرات جو حکیمانہ مزاج رکھتے ہیں، جو کارخانۂ عالم میں تدبّر و تفکّر کیا کرتے ہیں، جو حقائقِ زندگی اور اشیائے عالم کے مختلف پہلوؤں کے دیکھنے کی سعی کر چکے ہیں اور جو ہر ایک ذرّے کو تمام دنیا کے پہاڑوں کے مقابلے میں مساوی اہمیت کے ساتھ تولنے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں، وہ حضرات ان اشارات کو دلچسپ بھی پائیں گے، اور خیال انگیز بھی۔

کیونکہ اربابِ علم ہی ہر قوم کے دماغ ہوا کرتے ہیں، اگر دماغ تندرست ہوتا ہے، تو تمام اعضا و جوارح بھی درست ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے میرے نزدیک ایسے مقالات کی بہت شدید ضرورت ہے جو قوم کے "دماغ" کی بیماریوں کا علاج کر سکیں۔

میں اہلِ نظر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ اس مقالے کو "مشغلۂ ادبی" کے طور پر نہیں، "ضرورتِ وقت" کے نقطۂ نظر سے ملاحظہ فرمائیں۔ ممکن ہے مقلّد و جامد، اور حریتِ فکر سے ڈرنے والی سوسائٹی میں کچھ روشنی پیدا ہو جائے۔

فہرستِ ابواب:-

جوش

---

(۱) نقّاد

(۱) اے نقّاد! تو اپنے نئے مہمان، یعنی اس پیغام کا، خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کیوں نہ کر؟ کسے معلوم کہ اس کے اندر شاید علم کے تخم ہوں، جن سے کوئی چٹیل میدان، گلشن میں تبدیل ہو جائے۔

(۲) کیا ہمیں اس قدر بے عقل ہونے کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی قوت اور وقت کو نکتہ چینیوں کے جوابات میں ضائع کر دیں؟ کیا ہمارے نقّادوں کو ہم سے اختلافِ رائے کا اُسی طرح حق نہیں ہے، جس طرح

انہیں ہم سے مختلف چہرے رکھنے کا حق حاصل ہے؟

(۳) کیا نقاد، نکتہ چینی، اور خوردہ گیری کی ہوس میں اکثر خود اپنی ہی فکر کا کھوکھلا پن، اور اپنی ہی نگاہ کی نارسائی کا پردہ نہیں چاک کر دیتا؟

(۴) کیا نقاد، نوعِ انسانی اور انسانیٔ عالم پر نقد کرتے ہوئے بسا اوقات خود اپنے ہی نقطۂ نظر کو رسوا نہیں کر دیتا؟

(۵) کیا نقاد کتاب کے بیّن اشارات سے آگے بڑھ سکتا ہے؟ کیا وہ مصنف کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے؟ اور کیا نقاد اُن تمام منزلوں سے بھی گزرتا ہے، جن منزلوں میں مصنف نے اپنی کتاب کا مسالہ جمع کیا ہے؟

طورِ معنی بینی اے نقاد! پڑھ سکتا ہے تو؟
کیا مصنف کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے تو؟

(۶) کیا نقاد، مصنف کی اُس وقت کی تمام دماغی، دلی، روحانی اور ذہنی کیفیتوں کو اپنے اوپر طاری کر لینے کی قدرت رکھتا ہے، جو اُس پر کتاب لکھتے وقت طاری تھیں؟

(۷) اس لئے آؤ ایسی فضا کیوں نہ پیدا کریں کہ ہر شخص کی آواز بہ اطمینان سُنی جا سکے؟

ہاں یہ دنیا بہت وسیع واقع ہوئی ہے، اور اس میں نئی نئی باتوں اور تازہ بہ تازہ مسائل کی گنجائش قیامت تک باقی رہیگی۔

متانت و رواداری سیکھو، شور نہ مچاؤ، اپنے خیالات کو اپنا معبود نہ سمجھو، اُس کی آواز بھی سُنو جو تمہارے خیالات کے خلاف صدا بلند کر رہا ہے، سوچو، غور کرو، بالغوں کی طرح سنجیدہ بنو ——— ممکن ہے وہ سچ کہہ رہا ہو۔ ممکن ہے تم غلطی پر ہو۔ ممکن ہے دونوں غلطی پر ہوں۔ ممکن ہے دونوں درست ہوں۔ — ممکن ہے کچھ وہ غلطی پر ہو، اور کچھ تم۔ کچھ وہ درست ہو کچھ تم۔ برافروختہ نہ ہو محقق بنو، سنو۔ اور غیر متعصب ہو کر فیصلہ کرو۔

(۲)

کتاب

(۱) اگر کتاب، کوئی عظیم حجت قائم کر کے اپنا لوہا منوا دے تو کیا وہ جنگ سے عظیم تر نہیں ہے؟

(۲) ایک صحیح کتاب، انسان کا درحقیقت سب سے بڑا شریفانہ کارنامہ ہے۔ لیکن کیا کوئی صحیح کتاب لکھنے کی جسارت بھی کر سکتا ہے؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارا تمدن اس ایمانداری کو برداشت کر سکے گا؟

افسوس بیشتر سخنہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

(۳) کتابوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے، جن میں وہ باتیں درج ہیں، جن پر خود اُن کے لکھنے والوں کو اعتقاد نہیں ہے۔ کیا ایسے مصنفینِ سالوس محض یہ ظاہر کرنے کی خاطر کتابیں نہیں لکھتے کہ وہ ریاکار نہیں ہیں؟

(۴) کیوں کسی مصنف کا اعتبار کرو محض اس بنا پر کہ بہت سے افراد اُسے معتبر سمجھتے ہیں؟ کیوں ایک ایسے مصنف کا اعتبار نہ کرو جو وہی بات لکھتا ہے جو خود اُس کے نزدیک معتبر ہے؟

(۵) بہت سے مصنفین کو فلسفہ طرازیوں کی اتنی لت ہوتی ہے کہ وہ یہی بھول جاتے ہیں کہ اُن کا موضوع کیا ہے۔ اور کیا اگر وہ مصنفین میں بیشتر افراد اُس موضوع کو سمجھتے بھی ہیں جس پر وہ خامہ فرسائی کرتے ہیں یا محض اس لئے لکھتے ہیں کہ لکھنا اُن کا ذریعۂ شہرت و معاش ہے؟

(۶) کتابوں کو تفریحی نقطۂ نظر سے زیادہ، اکتسابِ علم کی خاطر پڑھو۔ اگر کوئی کتاب تمہیں تفکر و تدبر کی جانب مائل کرنے میں ناکام رہتی ہے، تو بہتر یہی ہے کہ اُسے دُور پھینک دو۔

(۷) اپنے خیالات کو صاف ہوا، اور چمکتی ہوئی دھوپ میں سانس لینے کا موقع دو، ورنہ گندے اور مرطوب ہو جائیں گے، اور تمہارا دماغ علیل ہو جائے گا۔

(۸) اہلِ تقلید سے نہ ڈرو، اپنے خیالات کو ہر جہت اور ہر سمت سے اپنی رہبری کا موقع دو۔ خیالات تو تمہارے بچے ہیں، کیا تم اپنے بچوں سے لرزہ براندام ہو؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ یہی آزاد و تندرست خیالات جن کے اظہار سے آج تم جھجکتے ہو، آیندہ نسلوں کے عظیم مصنفوں کا سرمایۂ ادب بن جائیں؟

(۹) ہر وہ شئے جو طبع ہو جاتی ہے، پڑھنے کے قابل نہیں ہوتی، صرف وہ چیز پڑھو جو محض "پڑھ لئے جانے" سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہو۔

(۱۰) تم تھوڑا لکھ کر بھی بہت کچھ کہہ سکتے ہو، اس سے کیا فائدہ کہ لکھو تو بہت کچھ، اور کہو بہت کم؟

(۱۱) کتاب پڑھنے کا فن، کتاب سے کہیں زیادہ اُس کے مصنف کے دل کے پڑھ لینے کے فن پر مبنی ہوتا ہے۔ کیا تم اس فن سے واقف ہو؟

---:(۳):---

علم

(۱) اُس ہنگامے میں بھی جب ہم اپنی حیوانی ضرورتوں میں مصروف ہوں، ہمیں ذوقِ علم اور تفکر کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔

(۲) استدلال کی قوت، ایک بہت بڑی جوالانجی ہے، لیکن کیا تم میں سے اکثر اس سے بہرہ یاب ہیں؟

(۳) تم شمعِ علم کے دونوں سروں کو روشن کرکے کیوں نہ قدم اٹھاؤ۔

(۴) کیا علم کے "ذریعے" سے ہمیں کچھ تلاش کرنا ہے، یا "خود علم" ہی ہے جس کی تلاش ہم پر فرض کردی گئی ہے؟

(۵) یہ ایک غیر اہم بات ہے کہ فلاں کے علم کا مقصد کیا ہے، علم بجائے خود ایک مقصد ہے۔ ایک ذرہ اپنی جگہ اُسی طرح اسرار وعجائب سے معمور ہے جیسے پہاڑ۔ تم اپنے کو کیوں تلاش نہیں کرتے؟

(۶) مجھے "میں نہیں جانتا" کہنے میں اتنی شرم محسوس نہیں ہوتی جتنی "میں جانتا ہوں" کے دعوے میں، ہم حقیقت میں جانتے ہی کیا ہیں؟ اور جو بزعمِ خود ہم جانتے بھی ہیں، اُس پر کس قدر بھروسا کیا جاسکتا ہے؟ کیا اس حقیقت کے فراموش کردینے کی ہم جسارت کرسکتے ہیں کہ علم نامحدود ہے، اور ہماری جہالت کا دریا ناپیداکنار؟

(۷) "مکمل علم کا فقدان"، ہماری موروثی محرومیٔ قسمت ہے، جس سے آنی رسیدگی کی سعی کو ہم اپنی علمی ترقی سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس نام نہاد تمدن کی کامرانیوں کے باوصف، کیا یہ ہمارے واسطے مقدر نہیں کردیا گیا ہے کہ ہم تا ابد علم کی تلاش میں سرگرداں رہیں؟

(۸) یہ تو اس چیز کا ایک نہایت ہی قلیل حصہ ہے، جس کے متعلق ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اُسے "بحیثیتِ مجموعی" جانتے ہیں۔ تم اس چیز کے بزرگ تر حصے کے متعلق کیا کہہ سکتے ہو۔ جو ہمیشہ نامعلوم رہا کرتا ہے؟

(۹) جب ہم کسی شے کے متعلق کچھ جان لیں، تو ہمیں یہ محسوس کرنا چاہیے کہ ہم نے اس کے نہایت ہی مختصر سے حصے کا علم حاصل کیا ہے۔ کیا ہم اس کے نسبتہً لامحدود حصوں اور پہلوؤں کے علم کا تصور تک کرسکتے ہیں؟

(۱۰) جب تم ایک پرکاہ کا بھی علم حاصل کرلوگے، تو اس تمام کرۂ ارض کا علم تمہیں حاصل ہوجائیگا۔ کیا پانی کی بظاہر ایک حقیر سی بوند اتنی ہی مسئلہ خیز اور وسیع المعانی نہیں جتنا کہ بے کنار سمندر؟

(۱۱) اندھا اعتقاد تو محض ایک قبضِ مزمن ہے۔ "اندھا اعتقاد" اور "قبضِ مزمن" دونوں ایسے قدیم اور عام امراض ہیں جو ازل کے روز سے انسان کو ستا رہے ہیں۔ کیا تم اس مرض میں گرفتار ہو؟ کیا یہ تمہیں کراہ رہے ہو؟

(۱۲) اشاعتِ علوم کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ جو کچھ تم جانتے ہو دوسروں تک پہنچادو، اور جو تم نہیں جانتے، دوسروں سے حاصل کرو۔ کیا تم اس لین دین میں مصروف ہو؟

(۱۳) ہر شخص اپنے جسم کا بیرونی حصہ منقش کرسکتا ہے، لیکن علم تو باطنی آرائش کا نام ہے، تم نے اپنے کس رُخ کے آراستہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟

(۱۴) ذہانت، جب تک اس کی پشت پر قوت نہ ہو، ایک بیکار محض شے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ بعض اوقات "بجنہ ذہانت"، عبادت سے بھی زیادہ باعثِ تکلیف، اور جہالت، بعض حالات میں، علم سے زیادہ خوش آئند ثابت ہوتی ہے۔

فراوانیٔ علم کے دوش بدوش اگر ہماری قوت بھی برابر کی ترقی نہیں کررہی ہے، تو کیا ہماری حصولِ علم کی تمام کاوشیں، ضائع ہوجانے سے بھی بدتر نہیں ٹھہرائی جاسکتیں؟

(۱۵) عقلِ عمومی (Common Sense) سب سے زیادہ غیر معمولی عقل کے اقسام میں سے ہے۔ تعلیم ارزاں ہے، ذہانت قابلِ حصول ہے، لیکن عقلِ عمومی نوادر میں سے ہے۔ کیا ہم نوادر کے فقدان کی خانہ پری کرسکتے ہیں؟

(۱۶) ہماری آنکھیں فریب کھا سکتی ہیں، لیکن کیا ہم اپنے الہامات کو دھوکا دے سکتے ہیں؟ طبعی اور الہامی علوم، جو بدبختی سے آسانی حاصل نہیں ہوسکتے، ہمارے نفسی اور حیوانی علوم کے بالمقابل کہیں زیادہ قابلِ وثوق ہوتے ہیں۔ کیا اس محرومی کی ہماری مسخ شدہ فطرت ذمہ دار نہیں ہے؟

(۱۷) اپنے کو حصولِ مقاصد میں محو کردو، اور اس طرح تم استدلالِ محض کی منزل سے بلند ہوکر اس رفیع تر حلقے میں داخل ہوجاؤ گے جہاں "استدلال"

کے عوض "وجدان" رہبری کرتا ہے۔ لیکن کیا تم جانتے ہو کہ اس رفیع ترحلقے میں داخل ہونے، اور اس وجدانی علم کے ذوقِ حصول سے قریب رہنے کی خاطر تمہیں اپنے کو کس نقطے پر قائم رکھنا چاہیے؟

(۱۸) آخر میں یہ بھی غور کرنا ہے کہ محض "علم" قابلِ لحاظ ہے، یا علم کا "طریقِ استعمال"؟ کیا سارق کو یہ علم نہیں ہوتا کہ سرقہ فعلِ مذموم ہے، اور کیا اس علم کے باوجود وہ برابر سرقے کی مشق کئے ہی نہیں چلا جاتا۔ علم کیونکر مفید ہو سکتا ہے، اگر وہ ہضم ہو کر خونِ صالح نہ بن جائے؟ "جاننا" اور شئے ہے "طاری ہو جانا" دوسری چیز ہے۔ کیا تم صرف "جاننے" ہی تک رہنا چاہتے ہو؟

(۱۹) ذہنی جنون ذرا سا ہوتا ہے جس کے ایک طرف توازن اعتقاد ہوتا ہے، اور دوسری طرف عدم استدلال۔ کیا تم نے اس سے باہر، اور ان دونوں کے درمیان کوئی راستہ نکال لیا ہے؟

(۲۰) اس دُنیا میں دو طرح کے حمقا پائے جاتے ہیں۔ ایک سمجھتا ہے ہر شئے قابلِ فہم ہے، دوسرا سمجھتا ہے۔ ایک شئے بھی قابلِ فہم نہیں۔ تم کدھر ہو؟ کیا تم اِن میں سے کسی ایک جُرم کا ارتکاب کر چکے ہو؟

——— :(۴): ———

حق و راستی

(۱) حق، اس دُنیا میں صرف ایک ہی ہے، لیکن اس کی تاویلیں لاکھوں اور اس کے نفسے بےشمار ہیں۔

(۲) حق، خود آشکارا ہے۔ کیا یہ دکھانے کے لئے شمع کی ضرورت ہے کہ دیکھو یہ روشنی ہے۔

(۳) ثقافت (CULTURE) نے نہایت ہی غیر دانشمندانہ طور سے حق کو اوہام اور پروپگینڈے کے بادلوں میں چھپا دیا ہے، اور اس وقت جو کچھ بھی ہم دیکھ رہے ہیں وہ حق نہیں ہے، بلکہ اُس ابر کے مختلف رنگ ہیں۔ جو حق کو مستور کئے ہوئے ہے — حق کی یہ کتنی شاندار قدر افزائی ہے!

(۴) اگر مجھے بتا دیا جائے کہ دیکھو یہ حق و راستی ہے، تو میں مرتے دم تک اس کا اتّباع کرونگا۔ لیکن کیا حق و راستی کے متعلق، اکابرِ عقلا کے درمیان شدید و ناقابلِ تصوّر اختلافِ آرا و کا ہنگامہ برپا نہیں ہے؟ آخر میں کس کی تقلید کروں؟

(۵) جب ہم اس پروپگنڈے کے بے پایاں انبار کو دیکھتے ہیں جو ہمارے دماغوں پر لاد دیا گیا ہے، اور حق و راستی کی اس خفیف مقدار کو محسوس کرتے ہیں، جس پر ہم سے ایمان لانے کا مطالبہ، محض اس بناء پر کیا جاتا ہے کہ حق کی وہ خفیف سی مقدار ایک ذہنی وراثت کی طرح نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی چلی آرہی ہے، تو ہم اس درجہ سراسیمہ و بدحواس ہو جاتے ہیں کہ ہمیں خود اپنی ہستی مشکوک نظر آنے لگتی ہے؛ اور سوال یہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ آیا ہماری عقل اب تک درست ہے، یا ہم مجنوں ہو چکے ہیں؟

(۶) کوئی شخص دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے راستیٔ مطلق کو پا لیا ہے اس غریب نے جو کچھ بھی اپنے خیال میں پایا ہے وہ محض اسکے نقطۂ نظر سے راستیٔ مطلق کی تاویل ہے اور کچھ نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کسی تاویل و تعبیر کو اسقدر راہمیت و استواری کیوں دی جائے۔

(۷) اس کائنات کی پہنائیوں، اور وسعتوں کے مقابلے میں انسانیت اُس مینڈک یا چیونٹی کے مانند معلوم ہوتی ہے جو دلدل میں پھنسی ہوئی ہو۔ پھر بھی ہم میں سے بعض نہایت ہی شوخ چشمی کے ساتھ یہ دعویٰ کرنے کی جسارت کرتے ہیں کہ اُنہیں اُس حق و راستی کا علم حاصل ہو گیا ہے جو ایک بے پایاں وسعت ہے، اور جس کا صرف ایک رُخ، محض اُس مخصوص ذہنیت کے سامنے آسکتا ہے۔ جسے اُس رُخ کے ساتھ طبعی مناسبت ہو۔ مکمل حق ہمیشہ نامعلوم رہیگا، تو پھر یہ معلوم حق و راستی کیا ہے؟ جزو، یا کل؟

(۸) جب تم یہ محسوس کرنے لگو کہ تمہیں حق کا علم حاصل ہو گیا ہے تو آگاہ ہو کہ تم درحقیقت اپنے کو دھوکا دے رہے ہو۔ حق وہ نہیں ہے جسے تم حق سمجھ رہے ہو، وہ تو قطعی اور لازمی طور پر وہ شے ہے جس کے سمجھنے میں تم ناکام ہو چکے ہو۔

کیا تلاشِ حق کے راستے کی ناکامیاں اتنی مسخری ہیں کہ اپنی شکلوں پر حق کے چہرے لگا کر اپنا جلوس نکالتی ہیں؟

جب حق و راستی کی خیرہ کُن روشنی کی طرف تم نگاہ اُٹھاتے ہو، تو کیا تمہیں یقین نہیں ہوتا کہ تم اُس کے نسبتًہ غلط رُخ پر نگاہیں جمائے ہوئے ہو!

(۹) کسی چیز کے دونوں رُخ دیکھنے کی سعی کیوں نکرو، خواہ اس کاوش میں تمہیں ہزار بار گردن موڑنا، اور گردش کرنا ہی کیوں نہ پڑے؟ کسے معلوم کہ اُس شئے کا دوسرا رُخ زیادہ درست، اور زیادہ خوبصورت نہ ہوگا؟

(۱۰) اگر تم اُس حق و راستی پر قانع ہو جو تمہیں معلوم ہے، تو یاد رکھو

تم مرنے کے بعد بھی حق کو معلوم نہ کرسکو گے۔ کیا تم جانتے ہو کیوں؟

(۱۱) اگر کوئی حق کی جستجو کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے جھوٹی شرم اور بیجا تجحّر کو خیرباد کہہ دے، اور پھر جس طور سے جو بات محسوس کرے، اُسی طرح بے جھجکے دوسروں کو بھی محسوس کرادے، کیا تم میں اس قدر جرأت ہے؟

(۱۲) تنگ اور چھوٹے دماغوں میں وسیع حقائق کی گنجائش نہیں ہوتی۔ حق کو ان دماغوں میں داخل ہونے کے لئے سکڑنا اور سمٹنا پڑتا ہے، اور اس طرح سکڑنے اور سمٹنے کے باعث، حق، چھوٹے اور تنگ دماغوں میں مختصر و بےہیئت ہوکر ہی داخل ہوسکتا ہے۔

کیا ہمارے تمدّن کے کارخانوں میں آئے دن ایسے ہی ارزاں حق طیار نہیں ہوا کرتے، جو چھوٹے چھوٹے دماغوں میں داخل کرنے کیلئے بنائے جاتے ہیں اور ہر بڑی دوکان سے مل جاتے ہیں؟

(۱۳) اکثریت، حق کو ہمیشہ اپنی جلو میں نہیں رکھ سکتی۔ اور کیا حُمقا کے واسطے، عُقلا، کی پیروی کرنے کے عوض، یہ آسان نہیں ہے کہ وہ اکثریت کی تقلید کریں؟

(۱۴) بیشک تم حق پسند ہوسکتے ہو، لیکن اس کے یہ معنی تو کبھی ہو ہی نہیں سکتے کہ تم تلاش حق میں کامیاب و کامراں ہوکر ہی رہوگے۔ اس پرو پگنڈے کی دنیا میں حق، ایک ایسی زنِ بازاری ہے جس کے خدمات بہت آسانی کے ساتھ خریدے یا فروخت کئے جاسکتے ہیں۔ تو اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ ہم "حق" کی تلاش کریں، یا اُن "ذرائع" پر قابو پانے کی سعی کریں، جن سے حق خریدا جاسکتا ہے؟

(۱۵) میں حق کا نام کیوں لوں؟ کیا اس لئے کہ میں اس کی الوہیت پر اعتقاد رکھتا ہوں، یا ترجیحی طور پر محض اس لئے کہ اُس کا تذکرہ بہت ہی سادہ اور دلچسپ ہوا کرتا ہے؟

(۱۶) ہمارا عملی حق، "نظری مکروہات" سے، اور ہمارے عملی مکروہات "نظری مطمح نظر" سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ آہ یہ کس قدر مشکل ہے کہ ہم اشیا سے بالکل وہی سلوک کریں، جیسی کہ وہ درحقیقت واقع ہوئی ہیں، اور اس سے قطع نظر کرلیں کہ وہ اُس وقت کیسی معلوم ہوتی ہیں، جب حروف و الفاظ کے ذریعے سے انہیں پیش کیا جاتا ہے!

(۱۷) تم خواہ کتنی ہی حقّانیت و راستی سے کام کیوں نہ لو لیکن موقع، یا وقت اگر اُس کے خلاف ہے، تو کیا تمہاری وہی حقّانیت و راستی، بطالت و ناراستی کا کام نہیں کرجاتی؟

کتنے مواقع پر حق، نفس حق پر مبنی ہونے کے عوض، محض اس امر پر مبنی ہوتا ہے کہ ہم کسی نہ کسی سبب سے اس پر اعتبار کرنے کے واسطے رضامند ہوتے ہیں۔

---- (۵) ----

فطرت

(۱) فطرت، نفاست کے ساتھ خوبصورت ہے، اور کیا وہ اصل وہ اس سے بھی زیادہ خوبصورت نہ ہوتی اگر جاہل انسان کی فریب کاریوں نے اُسے بہت سی خوبیوں سے محروم نہ کردیا ہوتا؟

(۲) فطرت کی "بیماریوں" کے دور کرنے کے لئے ہمارے غیر فطری مساعی اس قابل ہیں کہ اُن کا مضحکہ اڑایا جائے۔ فطرت میں اضافے کی کوشش کرو، اور پھر دیکھو کیا تم خود قابل تمسخر نہیں بن گئے ہو؟

(۳) فطرت، انسانی حماقتوں کے واسطے کافی حاشیہ (گنجائش) چھوڑ دیا کرتی ہے، لیکن فریب خوردہ تجحّر انسانیت اسے تمدّن کی فتحمندی سے تعبیر کرتی ہے، کیا فطرت پر فتح یابی کا تخیّل، محض ایک فریب نہیں ہے؟

(۴) فطرت کے اصول ہیں تقریباً بے عُنصر استثنیٰ، اور انسان کے استثنیٰ ہیں، تقریباً بے عُنصر اصول۔

(۵) فطرت، گاہ گاہ مستثنیات کو ترجیح دے سکتی ہے، لیکن اُس کے قوانین و اصول اُنہیں برداشت کرنے سے قطعی انکار کردیتے ہیں۔

(۶) فطرت، اور تمدّن کی جنگ میں ہمیشہ فطرت ہی فتحیاب رہتی ہے، لیکن کیا اب تک تمدّن مایوس نہیں ہوا ہے؟

(۷) فطرت کے حدود سے نکل جاؤ، اور کیا اُس وقت وہ تیری تمام ناقابل دفاع قوّتوں سے حملہ نہ کردیگی؟ اور اگر اس سے صلح کرو تو کیا وہ اپنے تمام خزانے تمہارے قدموں پر نہ ڈال دیگی؟

(۸) فطرت مقروض نہیں ہے، وہ تمام مطالبات مع سود ادا کردیتی ہے، تم فطرت کو آسانی کے ساتھ دھوکا نہیں دے سکتے، اور اپنے افعال کو بے قیمت نہیں سمجھ سکتے، کیا فطرت انکی تمام قیمت ادا نہیں کردیتی؟

(۹) فطرت، بشدّتِ تمام "عملی" ہے، لیکن احمق انسان "نظریات" کے اعتبار سے اُس میں افزائش کی سعی کرتا ہے۔

(۱۰) جب ہمارے اہلِ سائنس، فطرت کے نہاں خانے سے کسی چیز کے چُرا لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، فطرت انسانی تخریب کی بعض چھوڑ دینے کی خاطر ہزاروں گھاتوں سے مسلح ہو کر کمینگاہ میں ہمارا انتظار کرتی رہتی ہے۔

(۱۱) ہمارے تمام قرنوں، اور صدیوں کے سائنس جمع ہو کر بھی فطرت کے ایک انچ کی بھی خانہ پری نہیں کر سکتی

(۱۲) تمدّن کی تمام تر کاوشیں صرف یہ ایک معمولی سا رقیبانہ امتیاز پیدا کرتی ہیں کہ یہ شئے "ساختۂ فطرت" ہے، وہ "ساختۂ تمدّن"۔

(۱۳) فطرت کے منہ میں لگام چڑھانا اُس وقت تک انسان کی قوّت سے باہر ہے، جب تک وہ خود اپنی رضامندی کا اظہار نہ کر دے۔ کیا اسے فتح یابی کہا جا سکتا ہے؟

(۱۴) فطرت سے جنگ کر کے انسان، ایک مستقل مایوسی کو دعوت دیتا ہے۔ خوشی عصری صنعتوں میں نہیں، فطرت سے قربت میں مضمر ہے۔

(۱۵) ہم فطرت کو اپنے موروثی نظریات کا مطیع بنانے کی سعی کرتے ہیں، اور جو زندگی یوں بسر کی جاتی ہے، کیا وہ ایک مصیبت کی زندگی بن کر نہیں رہ جاتی، اور کیا ہم اس طرح غیر فطری ہونے کے نتائج سے مجروح نہیں ہو جاتے ہیں؟

(۱۶) فطرت کے بدل کا تلاش کرنا امیدِ موہوم سے زیادہ نہیں۔ ہماری عصرِ حاضر کی اعلیٰ درجے کی مصنوعی زندگی نے صرف یہ کیا ہے کہ ہماری مصیبتیں اور بربادی ہیں، اور بس۔

(۱۷) اپنے انواع کی ترتیب میں فطرت، کسی کی جنبہ دار واقع نہیں ہوئی ہے، اور جب میں "فطرت کی طرف پلٹو" کا نعرہ بلند کرتا ہوں، تو اُس سے میرا یہ مقصود ہوتا ہے کہ ہم اُس مجلسی و اقتصادی مساوات کی سطح پر آ جائیں جو ہماری ہستی کے لئے ایک قدرتی چیز ہے۔ اور کیا اُس سطح پر آ جانے کے بعد ہم اُس پروپگنڈے سے نجات حاصل کرنے کی توقع نہیں کر سکتے، جو عدمِ مساوات نے پیدا کر رکھا ہے؟

(۱۸) ہر چند فطرت، پُر اسرار ہے، لیکن کیا وہ اپنے پرستاروں کے سامنے اپنے اسرار پیش نہیں کر دیتی؟

(۱۹) جو کمزور ہیں، وہ فطرت سے کمزوریاں حاصل کرتے ہیں، اور جو قوی و توانا ہیں، وہ توانائی، کون ملزم ہے، الزام کسے دیا جائے؟

(۲۰) تمدّن کی کامرانی اِس تناسب پر مبنی ہے کہ ہم نے فطرت سے علم کی کس قدر مقدار، اور خود فطرت سے کس قدر قربت حاصل کی ہے۔ کیا عصرِ حاضر کی مصنوعی زندگی سُن رہی ہے؟

(۲۱) فطرت کا بہاؤ نرم ہے، کیا ہماری تکلیفیں خود ہمارے ہی ایجادات کے نتائج نہیں ہیں؟

(۲۲) میں فطرت کے احکام کی پابندی کرتا ہوں، اور میرے افعال پر جو بھی تحسین و نفرین کی جائے، صرف فطرت ہی اُس کی تنہا مستحق ہے، میرے اعمال کی جو بھی مذمت یا تعریف کی جاتی ہے، اُس کا رُخ صرف فطرت کی طرف ہوتا ہے، یعنی فطرت ہی لائقِ مدح ہے، اور شایانِ مذمت، میں بیچ میں اپنی ٹانگ کیوں اڑاؤں؟ سوسائٹی مجھے کیوں نوچے ڈالتی ہے؟

(۲۳) کیا اس باب میں درحقیقت فطرت رقیق القلب و رحم دل نہیں ہے کہ وہ ہمارے معزز شہریوں کو یہ معلوم ہونے نہیں دیتی کہ وہ اس درجہ حقیر ہیں کہ اُن کے مرجانے کے بعد بھی کارخانۂ عالم اِسی رونق سے چلتا رہیگا جیسا کہ اُن کی حیات میں چل رہا ہے؟

(۲۴) ایک نہ ایک دن انسانیت، اپنے تمام شاندار و عظیم تمدّن و تہذیب اور اپنے تمام مقدس دیوتاؤں اور اوتاروں کے ساتھ صفحۂ ارض سے مٹ جائے گی، لیکن فطرت ہمیشہ باقی رہنے پر اَڑی رہیگی۔ اِس سے کسے خوف کھانا چاہیے۔ انسانیت کو، یا فطرت کو؟

اِنسانیت

(۱) آدمی "غیر معلوم" درخت کا "معلوم" پھل ہے۔

(۲) پہلے بچے کی پیدائش، انسانیت کو اپنے ساتھ لائی تھی۔

(۳) جب پہلے پہل دُنیا خلق کی گئی تھی، کیا خدا اپنی مخلوق سے خوش نہ تھا؟

(۴) اُس دن کو بھی کس قدر منحوس ہونا چاہیے، جب خدا نے نوعِ انسانی کو خلق فرمایا تھا، اُس نے انسانوں کو غالباً اپنے سے زیادہ دانشور پایا ہوگا، اِسی وجہ سے تو دُنیا کی حکومت، انسان کے سپرد کر کے اُس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

(۵) انسانیت کے سمجھنے کا بہترین اسلوب کیا ہے؟ کیوں نہ یہ سمجھا جائے کہ خدا انسانی شکل میں اپنی کم نظری کی معذرت کر رہا ہے؟ کیا انسان،

بحیثیتِ مجموعی، ایک کامل صانع کی ایک تمسخر آمیز صفت نہیں ہے؟

(۶) اس دنیا کا سب سے اہم مسئلہ "انسانیت" ہے، لیکن ہم میں سے کتنوں کو اس کا موقع دیا گیا ہے کہ اس کا صحت کے ساتھ مطالعہ کرسکیں، چونکہ ہم مطالعۂ انسانیت کے باب میں ناکام رہتے ہیں، اس لئے کیا ہم انسان کی حقیقی قدر و منزلت اور واقعی اہمیت کا اندازہ کرنے میں افراط و تفریط کے مرتکب نہیں ہو جاتے؟

(۷) "انسان" معارف و حقائق کا ایک لبریز خزینہ ہے اور خود بھی ایک ایسی حقیقت ہے، جو تمام خزائنِ معارف و حقائق کے مقابلے میں عظیم تر ہے۔

انسان کا معمہ خود انسان ہے، اور نوع انسانی کے علاوہ اس معمے کو حل کون کر سکتا ہے؟

(۸) ادھر آدمی ہیں، اُدھر آدمی ہیں، ہر طرف آدمی ہی آدمی ہیں، اور ہم اس کے سوا کیا جانتے ہیں کہ سب "آدمی" ہیں؛ بعض تو صحبت بہائم کی صحبت کے لئے موزوں ہیں، اور اکثر اس مرتبے سے بھی فروتر ہیں۔

اگر فطرت کے مردود و کمزور افراد کی اس باب میں امداد کی جائے کہ وہ جلد تر اس دنیا کو چھوڑ دیں، اور ہماری وہ قوتیں جو ناکارہ و کمزور افراد پر رحم کرنے میں برباد و ضائع ہو رہی ہیں، صرف قوی اور فطرت کے محبوب انسانوں کی تکمیل میں صرف ہونے لگیں، تو غور تو کرو انسانیت کے ارتقاء کی صورتیں کس قدر جلد پیدا ہو سکتی ہیں!

(۹) انسان کی فطرت اس درجہ مُسرف اور فضول خرچ واقع ہوئی ہے کہ صرف اسی چیز کو بچا سکتی ہے، جس کا برباد و ضائع کر دینا اُس کے امکان سے خارج ہوتا ہے۔

(۱۰) انسان کی فطرت تو یہ ہے کہ وہ کُتّوں کی طرح ہڈیوں پر لڑتا ہے، لیکن دکھاتا یہ ہے کہ میں فرشتوں سے بھی افضل ہوں، کتنی غیر فطری بات!

(۱۱) ہم آج بھی وہی زمانہ قدیم کے وحشی انسان ہیں، صرف اتنا ہوا ہے کہ انسانیت کے باب میں ہمارا نقطۂ نظر بدل گیا ہے۔ اور ہم نے اپنے غُراتے ہوئے چہروں پر تبسم و تمدن کی نقاب ڈال لی ہے۔

(۱۲) کیا بعض چند نفوس کی شرارتوں کی خاطر انسانوں کے ایک عظیم گروہ کو ابتلا میں گرفتار کر دینا، نوعِ انسانی کے غیر انسانیت آمیز ادراک کی علامت نہیں ہے؟

(۱۳) کیا "انسان" تمام روئے ارض پر اور تمام جانداروں میں سب سے زیادہ خطرناک جانور نہیں ہے؟ اسکے دائرہ حکومت میں کوئی شے بھی محفوظ نہیں ہے، نہ خود ہماری زندگی ہی، نہ یہ کرۂ ارض جس پر ہم آباد ہیں۔ سائنس نے خوفناک آلات ایجاد کرکے اس کی خوفناکیوں، اور درندگیوں کو اور بھی پُرہول بنا دیا ہے، اور آج سوال عتابِ الٰہی کا نہیں، بلکہ عتابِ انسانی کا ہے۔ اس استیلائے نوعِ انسانی کا آخر کب خاتمہ ہوگا؟

(۱۴) جب ہم سب اس طرح سے زندگی بسر کرنے سے نافر ہیں، جس پر زندگی کا موجودہ نظم ہمیں مجبور کر رہا ہے، تو حیرت ہے کہ اب تک انسانیت نے خودکشی کیوں نہ کر لی؟

اب بھی کچھ نہیں گیا ہے، اس منزل پر بھی اگر ہم سب ملکر کوشش کریں کہ یہ دنیا جنت بنجائے، تو کیا آدم کی اولاد اسکی صلاحیت نہیں رکھتی، صلاحیت ہے تو پھر انتظار کاہے کا ہے، آج ہی سے کام کا آغاز کیوں نہ کر دیا جائے؟ جھجکتے کیوں ہو؟ کیا تم بزدل ہو؟

———:(باقی آئندہ):———

رباعی

حضرت سیماب اکبرآبادی

پندار سے دل تباہ ہو جاتا ہے ۔۔۔ انساں یونہی روسیاہ ہو جاتا ہے

نیکی کے فرشتے، تجھے معلوم بھی ہے ۔۔۔ ہر سانس میں اک گناہ ہو جاتا ہے

خزینۂ محبت

میرے رونے کا جس میں قصہ ہے
عُمر کا بہترین حصہ ہے! (جوشؔ)

(ملک حبیب احمد - بی - اے - آنرز)

---- ۱ ----

لاہور
۱۰- جنوری ۱۹۳۶ء

انور- میں جانتا تھا کہ تمہارے فیض آباد جانے کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ بہرحال وہی ہوا، جس کا مجھے خدشہ تھا، تم وہی پیام لائے جس کو میں سُنتے سُنتے زِچ ہو چکا ہوں۔ تعجب ہے کہ تم بھی باوجود اپنی تعلیم اور خیالات کے مجھے شادی پر مجبور کرتے ہو۔ شادی کر لوں اور اپنی حیاتِ آزادی کا خاتمہ خود ہی کر لوں۔ "کسی" کی مرضی کا مقیّد ہو جاؤں، یہی چاہتے ہو نا، انور! اس سے زیادہ اور کچھ؟ . . . . میرے نزدیک "مرد" خلقت کی تفصیل نفسی ہے، "عورت" تفصیل تقابلی اور شیطان تفصیل کل۔ تم نے دیکھا کہ مرد، عورت کے قریب ہونے سے شیطان سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ اگر قدرت عورت کی تخلیق نہ کرتی تو ہماری تمہاری دنیا کا اور ہی رنگ ہوتا . . . . قناعت اور خوشی، خوشی اور نجات، سب ہمارے ہوتے، لیکن اب تک جو کچھ عورتیں مرد کو دے سکی ہیں، وہ ایک شرمناک داستان ہے۔ رقابت، غصہ، قتل، اور رسوائی کی، اور جن احمق مردوں نے اس سراب سے دھوکا کھا کر اس کو بھی گوارا کر لیا، تو عورت اس مرد کو بھی ناگن بنکر ملی جس نے اس محسن ہاتھ کو ڈسنے سے بھی دریغ نہ کیا جس نے اسے پالا تھا۔ تمہیں کہو کہ کیا کبھی کوئی عورت آیۂ رحمت و ملاطفت ثابت بھی ہوئی؟ حوّا کی آرزو، زلیخا کا عشق، ہیلن کی عشوہ سازیاں، کلوپٹرا کی فریب کاریاں، ایک ایک کر کے تاریخ کے صفحات پر خونی حروف میں لکھی ہوئی ہیں۔ تم ان کو دیکھنے سے انکار کر دو۔ انور، نہیں، میں تو جان بوجھکر آنکھوں پر پٹی نہیں باندھ سکتا۔

تم کہو گے، یہ سب فلسفیانہ موشگافیاں ہیں۔ لیکن میں تمہیں اس سے زیادہ اور کیا جواب دوں کہ عورت ابھی تک نہیں بھولی کہ وہ حوّا کی بیٹی ہے اور وہ اپنی اُن بیشمار بہنوں کے فسانے جانتی ہے۔ جن کی ناممکن الحصول آرزوؤں نے اس دُنیا کو کچھ دوزخ سے بھی بدتر چیز بنا دیا۔ سوچو، سوچو، انور کونسی خونریز جنگ ایسی تھی، جس کی تہ میں عورت نہ ہو۔ کونسا بھیانک فعل ایسا تھا۔ جس کے ارتکاب میں اس کی رضا نہ ہو، . . . . عورت سمجھتی ہے کہ وہ مرد کے دل و دماغ پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے، وہ اپنی اس خواہش، اس آرزو، اس تمنا، کا اعتراف خواہ صاف الفاظ میں نہ کرے۔ لیکن اس کا ہر فعل اس جذبے کے ماتحت ہے کہ وہ مرد کو اپنا بے عذر غلام بنا لے اور اس کی آزادانہ قوت عمل کو سلب کر دے۔ وہ جہانگیر کی غلامی اور نورجہاں کی حکومت سے واقف ہے، اور اسی لئے چاہتی ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو اس کی خاطر ایکبار پھر دہرائے . . . . . کنواری، بیاہی، بیوہ، — عورت آخر عورت ہے اور ہر وقت اپنے خیال اور ارادے کو تبدیل کر سکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت حسین ہے اور ہر حسین چیز اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہے لیکن اس پُرفن مخلوق نے اپنی مکاری اور حیلہ سازی کی بدولت صیادی میں کمال پیدا کیا ہے۔ تعجب ہے، مرد زیادہ عاقل اور زیادہ ہوشیار ہونے کے باوجود اس معاملے میں عقل سے کام نہیں لیتا۔ عورت کے حسن کی ضیا و ایک جہنمی بھٹی کی چمک ہے۔ جو مردوں کے معصوم تخیلے کو جھلس دینے کے لئے ہر وقت شعلے بھڑکاتی رہتی ہے۔ اس کا جسم ایک خطرناک بھنور ہے، جو حسین اور نظر فریب ہونے کے باوجود یقینی طور پر قعر دریا سے



ملک حسیب احمد بی اے آنرز -

Calcutta Art Press, Delhi

بھی کچھ آگے لے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کی خوبصورت آنکھیں تم شاعروں کے نزدیک، کیف و صہبا کے چھلکتے ہوئے پیمانے ہی کیوں نہ ہوں، لیکن مجھے ان میں رقصِ شیطانی نظر آتا ہے۔ جس چیز کو تم عورت کی معصومیت کہتے ہو میں اسے احمکی کند ذہنی اور حماقت خیال کرتا ہوں۔ تم اس کی نزاکت اور لچک کے قائل ہو، لیکن انور میں اسے نکما پن سمجھتا ہوں۔

شکسپیر کے تخلیق کردہ کرداروں کی رومانوی دنیا میں بسنے والے انور! جولیٹ محبت کا ایک افسانہ محض تھی۔ تم اسے خودغرض اور فریب کاری کی پروردگار عورتوں میں تلاش نہ کرو۔ ڈسڈیمونیا کی پاکیزگی اور محبت ان گناہ اور تاریکیوں کی شیشیوں میں نہ ملیگی۔ (روزالنڈ) کی وفاداری اور وقار شکسپیر کے صفحات تک ہی محدود ہیں۔ آدم کی پشیمانی، یوسف کی پاکدامانی، پرائم اور پیرس کی حسرتیں، جولیس سیزر کا خون، انٹونی کا زوال تم سے عقل کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

تمہارا

منور

—— (۲) ——

لکھنؤ

۳-۱اپریل ۱۹۳۵ء

انور! میری حورِ ارضی کے متعلق دریافت کرتے ہو؟ محمود نے تمہیں بتایا ہوگا کہ اس کیف آور شام کو —— باغ کی نکہت نواز فضا میں اس پیکرِ رنگ و بو کو دیکھ کر میری وارفتگی کا کیا عالم تھا۔ پروفیسر بوس کے الفاظ یاد کرو۔ جب انہوں نے ایک مرتبہ میرے متعلق ہنستے ہوئے کہے تھے "وہ عورت فاتحِ عظیم ہوگی جو منور کے دل پر حکمرانی کریگی" لیکن انور آج میں وہی منور ہوں جو ایک اِلٰہ الجمال کی تجلّی پاش نگاہوں کی تاب نہ لا کر اپنا دل، اپنا دماغ، اپنی تمام کائنات، بازنگاہے کی پرآرزو درخواست کے ساتھ اس کے ملکوتی قدموں پر نچھاور کر چکا۔ ہر مرد کی زندگی کے راستے میں ایک عورت آتی ہے جو اس کی تمام کائنات پر حاوی ہو جاتی ہے، اس کے افعال اور ارادوں پر چھا جاتی ہے۔ میں نے معلوم کر لیا۔ انور، اپنی موت و حیات کو پا لیا۔

کاش تم اسے دیکھ سکتے، ! میری تمناؤں اور آرزوؤں کو ایک ہی بار دیکھ لیتے۔ کاش! میں روز شام کو دن بھر کی سینہ کوبی کے بعد باغ میں جاتا ہوں، اور اپنے صبر و سکون کی نذر اس کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔

انور! روز بروز اس کی وحشی نگاہیں پرمحبت ہوتی جاتی ہیں۔ اس کی شرمیلی لیکن پھر بھی بیباک نگاہیں، مجھے دعوتِ بےخودی دیتی ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ اس کی زیبائی اور رعنائی کو الفاظ کی قید میں لا کر تمہارے لئے ایک مرقع بناؤں لیکن چاند کی ٹھنڈک اور نظر نواز چاندنی کو باکمال سے باکمال مصور کی رنگ آمیزی اور چابکدستی بھی صفحۂ تصویر پر ایسی دلاویزی کے ساتھ منقوش نہیں کر سکتی۔ میں خدائے حسن و جمال سے ہومر کی زبان اور شیلے کا تخیل مانگتا ہوں!

وہ شباب و شعر کا پیکرِ جمیل ہے، جو شاعر کے تخیل سے زیادہ اچھوتا، نغمے کی کیفیت سے زیادہ لطیف، تصویر کی رنگینی سے زیادہ خوش منظر ہے۔ اور وہ جانِ آرزو گلستانِ حیات کی سولھویں روش پر شباب کے وجد آفریں پھول کھلا رہی ہے۔ اس کے پُر وقار سینے کی گہرائیوں میں خدائے عشق ایک پُرخمار انگڑائی لیکر بیدار ہو رہا ہے۔ اس کے پیارے پیارے چہرے کی ساخت میں یونانی صنم گری کی رعنائی پنہاں ہے اور حسنِ خارین کی متوالی کیفیت۔ اس کی آنکھیں، ظالم آنکھیں، بڑی بڑی سیاہ اور سکر پاش آنکھیں، بدن سڈول، چھریرا، مرمریں اور ۔ ۔ ۔ ۔ کیسا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ کیسا انور؟ اس کی تشبیہ کی تلاش خیال کی گہرائی کے سوا اور کچھ نہیں۔

جی نہیں چاہتا کہ میں اس کے ذکرِ جمیل کو چھوڑ دوں لیکن دماغ میں ارتعاش پیدا ہو چکا ہے۔ اب رات کے دو بجے ہیں۔ وہ ساحرہ سو رہی ہے اور سوتے فتنے جگا رہی ہے۔ مجھ نامراد کی آرزوئیں۔ اس کی کافر ماجرا جوانی کو تھپک تھپک کر، جھلا جھلا کر سلا رہی ہیں۔ اچھا خدا حافظ! میں بھی ایک افسانے کے آغوش میں سو جانا چاہتا ہوں!

تمہارا

منور

—— (۳) ——

لکھنؤ

۱۹-۱اپریل ۱۹۳۵ء

انور! کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس سندرتا کی دیوی کا نام کیا ہے؟ تم نے کبھی سنا بھی نہ ہوگا جس طرح اس کی خوبصورتی اور لطافت تمہارے تخیل کے بس کی نہیں۔ اسی طرح اس کا پیارا پیارا نام بھی تمہارے خیال میں نہیں آ سکتا، دیکھو اس کا نام ہے۔ گلنار، جمالِ گلنار، سمجھے کس قدر

حسین و جمیل، اور شعریت سے پُر نام ہے۔ گلنار! گلنار! جانِ گلنار! ہزار بار کہوں گلنار! ہر بار نام لیتا ہوں اور جھوم جاتا ہوں۔ گلنار! میری زندگی! میری عافیت! میری جان! میری گلنار!

کل شام میری زندگی کی ایک مخصوص شام تھی۔ ایک ایسی شام تھی جس سے میرا مستقبل مرتب کیا جائے گا۔ وہ ایک رنگین شام تھی جو عشق کو حسن سے روشناس کر گئی! . . . . . میں "نشاط ٹاکیز" میں نرگس کا رقص دیکھ رہا تھا کہ یاسمین کی خوشبو نے میرے دماغ کو مسحور کر لیا۔ وقفے میں جب روشنی ہوئی تو دیکھا کہ برابر کی کرسیوں پر ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے ہیں۔ ایک تو جمیل تھے لیکن بھلا وہ عورت کون تھی؟ نہیں بتا سکتے انور! تو خیر وہ تھی میرے تخیل کی ملکہ، میری حیات کا مرکز، کون بھلا؟ گلنار! جمیل نے تعارف کروایا کہ میں مشہور شاعر منور ہوں۔ معلوم ہوا کہ گلنار کو بھی شعر سے دلچسپی ہے۔ کیوں اب تو تم غالب کو سروشِ غیب کہو گے نا؟ ؎

سیکھے ہیں مہ رخوں کیلئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

یوں ہی؟ تو لو میرا گلنار سے وعدہ ہو گیا کہ میں اسے اپنی بعض نظمیں بھیجوں گا۔ پرسوں صبح بادِ بہاری ادھر کو چلے گی۔ دیکھوں اس کا ابرِ کرم میری تہی دامنی کو کہاں تک بامراد کرتا ہے۔

ابھی سے انتظار کی لذت اور کاہش سے دوچار ہوں

تمہارا
منور

(۴)

لکھنؤ

۲۲۔ اپریل ۱۹۳۵ء

انور!

آج حالی بھی بلاتے ہیں انہیں گھر مہمان
دیکھئے آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت!

لیکن عشق باوجود اپنی بے مائگی کے حسن کا میزبان۔ گلنار مجھ سے باتیں کر رہی تھی، اور میں باہمہ اضطراب بالکل خموش تھا۔ وہ شعر کو خوب سمجھتی ہے، وہ خود بھی کسی نازک خیال شاعر کا ایک بدیع تخیل ہے۔ مجھ سے کہنے لگی۔ "دیکھئے نا، منور صاحب، تقریب کی ضرورت تھی۔ جب یہ ہو گئی تو ہم دونوں کے درمیان اب رسمیات کا پردہ حائل نہ ہونا چاہئے۔ آپ ہمارے ہاں آتے رہیں گے نا؟" انور! تم خود سمجھتے ہو کہ میں نے کیا جواب دیا ہوگا؟

انور! میں نے ابھی تک اپنی شاعری کا موضوع مناظرِ قدرت کو بنایا ہے۔ لیکن جب کبھی میں نے دوسرے شعراء کے اشعار میں عورت کو دیکھا تو ہمیشہ محسوس کیا کہ ان سخن سنجوں میں جمالیات کو سمجھنے کی ذرا بھی اہلیت نہیں ورنہ عورت سے بھدی اور بے گناہ ہستی کو معصوم اور حسین مناظر کے ماحول میں بھی نہ دکھلاتے۔ لیکن انور آج میرا اپنا نظریہ خطرے میں ہے۔ مری "کشمیر کی ایک شام" کو نقادوں نے میرا شاہکار مانا ہے۔ آج ——— آج گلنار سے مل لینے کے بعد بے کیف اور پھیکی نظر آتی ہے۔ مجھے اس نظم میں ایک کمی نظر آتی ہے۔ ایک بہت بڑی کمی، ایک عورت کی کمی، کاش میں پہلے ہی اس شام کے سلونے پن میں ایک عورت کا پیکر بھی دکھا سکتا۔ گلنار چشمے کے پانی میں اپنا عکس دیکھ کر، پانی میں ہاتھ ڈال کر، اس عکس کو معدوم کر رہی ہوتی، یہ کیفیت ہے جس کو نظم کرنے کی مجھے اس وقت آرزو ہے۔ میں مر جاؤں گا۔ میرے بعد بھی دنیا اس نظم کی تعریف کرے گی۔ لیکن کسی کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ میرے خیال میں یہ نظم ناقص ہے۔ نامکمل . . . .
ایک عورت کی غیر موجودگی نے اس میں ایک خلا پیدا کر دیا۔

میری اپنی زندگی بھی نامکمل ہے۔ کیا انور اسکی تکمیل ہو سکے گی؟
تمہیں کہو؟

تمہارا
منور

(۵)

لکھنؤ

۱۸۔ جولائی ۱۹۳۵ء

انور! میری تعلیم جیسی کچھ بھی ہے، جاری ہے۔ لیکن میں شاعری کو خیرباد کہہ چکا۔ اور کیا کرتا مجبور ہو گیا، مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔ میری تمام کائنات پر گلنار چھائی ہوئی ہے۔ اگر میں چاہتا ہوں کہ کوئی شعر کہوں تو سوائے گلنار کی صورت و خیال کے اور کوئی چہرہ یا خیال سامنے نہیں ہوتا۔ میرے تمام جذبات، خیالات، اور محسوسات گلنار کی ذات میں مرکوز ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ میری زندگی کا تنہا و عظیم خیال ہے۔ ایک ایسا خیال جس کی تمام شوکت، رنگینی، خوبی میری گلنار کے دم سے ہے۔

گو میں آزادی سے گلنار کے وہاں جا سکتا ہوں۔ جاتا بھی ہوں لیکن اپنے لئے نہیں۔ گلنار کے لئے۔ میں اپنے قیام کو طویل نہیں کر سکتا۔ میں وہاں تھوڑی دیر رہوں یا زیادہ دیر، میری نگاہ شوق نہایت غیر ارادی طور پر میرے عشق کا پیام رنگین بیان کرتی رہتی ہے۔ میں باوجود ہزار شوق کے بھی اپنا دل سے محو کسی اور جانب نہیں کر سکتا۔ اس حالت میں تم جانتے ہو "کسی" کی آرزو کب تک پردے میں رہیگی؟ گلنار بھی اس معاملے میں مجھ سے متفق ہے۔ میں ان کے پاس جاتا ہوں۔ مگر صرف ایک دفعہ کالج سے واپسی پر تھوڑی دیر بیٹھتا ہوں، اور اس کے والدین سے فراوانی کار کا عذر کر کے چلا آتا ہوں، اور پھر دوبارہ اس دیار سنگر موسیقی کی جانب روانہ ہو جاتا ہوں۔ رات ہو جاتی ہے! یکے بعد دیگرے بہت سی راتیں اسی طرح گذر گئیں کہ میں ان کی کوٹھی کے باہر چکر کاٹ رہا ہوں اور گلنار کو خبر تک نہیں۔ انور! گو یہ وقت نہایت تکلیف و اضطراب میں گذرتا ہے لیکن مجھے اس میں بھی ایک تسکین معلوم ہوتی ہے گلنار کا کمرہ سڑک کی جانب کھلتا ہے آج کل کی راتیں خنک، خنک بھیگی بھیگی راتیں ایک دیوانے کو دیکھتی ہیں جو دوسری کے پرشوکت درختوں کے قریب کھڑا رہتا ہے۔ کھڑکی کے قریب سے ایک سایہ گذر جاتا ہے اور وہ دیوانہ اس وقت معلوم نہیں اپنے دل سے کیا کیا باتیں کرتا ہے۔ خاموش اور ہولناک رات میں کوٹھی کے درخت دیو معلوم ہوتے ہیں۔ جو الف لیلہ کی کہانیوں سے نکلکر اپنی شہزادی کی محافظت کو کھڑے ہیں۔ جب تک روشنی گل نہیں ہو جاتی، میں کھڑا رہتا ہوں۔ کمرے میں ہر حرکت جس کا سایہ منور کھڑکی کے شیشوں اور پردے پر پڑتا ہے۔ میرے دل پر ایک نہ ایک ناول پا لیتا ہے۔ کبھی وہ کتاب بند کرتی ہے کبھی دوسری کتاب اٹھا لیتی ہے کبھی اپنے رخ پر بکھرنے والی گستاخ زلفوں کو جھنجھلا کر ہاتھوں سے ہٹا لیتی ہے۔ اس ارمان و حسرت کے جیتے جاگتے ڈرامے کا انجام ایک پرشباب انگڑائی ہوتی ہے جس کے بعد روشنی گل کر دی جاتی ہے، اور میں آرزو و حسرت سے ہم کنار اپنے خوابوں کی شہزادی کو ایک ساکت الوداع کہکر چل دیتا ہوں۔

انور! میں نے آج تک گلنار کو اپنی ہر روز کی آمد سے مطلع نہیں کیا۔ گلنار کو اس کے متعلق بتا کر میں اس چیز کی شعریت تباہ نہیں کر سکتا یقیناً حسن آگاہ عجیب چیز ہے۔ لیکن حسن بے خبر لطیف تر۔ تمہارے خطوں میں اب کافی دیر ہو جاتی ہے لیکن میری طرح . . . ؟ . . تمہارا منور

—:(۶):—

دارجلنگ

۱۸۔ اگست ۱۹۳۵ء

انور! کل رات کو سخت بارش ہوتی رہی۔ اور پھر پہاڑی مقامات پر بارش تھوڑی سی بھی ہو تو بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ دن بھر باہر جانا تو ممکن نہ ہوا لیکن میں گلنار کو غالب کے اشعار سناتا رہا۔ اچھے شعر پر گلنار جھوم جاتی تھی، اس کا تمام جسم جھوم جاتا تھا۔ اور اس پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی تھی، وہ کیا کیفیت تھی انور، میں خود الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھو کہ اس کے دونوں خوبصورت رخسار دفعۃً شباب سے تمتما اٹھتے تھے۔ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آجاتی تھی جیسے کوئی دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن جائے۔ اس کی سانس موزونیت سے تیز چلنے لگتی تھی گویا جوش جوانی ابھی نکلے گا۔ اور یہ حسین سیلاب دنیا کی تمام بدصورت چیزوں کو رنگین اور حسین کر دیگا۔

کوئی چار بجے ابر کھل گیا لیکن ہوا میں خنکی تھی۔ سکر آفریں ہوا، اور شباب کی رعنائیوں سے چور عورت کی معیت، ایک تمنائی سیر کے لئے کیسے ناممکن الحصول لوازمات ہیں۔ تم تصور نہیں کر سکتے؟ جوان ہو جاؤ انور! جوان!! سن و سال میں نہیں، جذبات میں جوان اور محسوس کرو کہ میں کیا کر رہا ہوں۔

ہم دونوں سیر کے لئے چل دیئے۔ صاف شفاف نیلا نیلا آسمان، شراب و شباب سے لدی ہوئی ہوا، پہاڑوں کے تنگ راستے، درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑ، ان کی چوٹیوں پر دھوئیں کی مانند بادل، ایک جانب ڈوبتے ہوئے سورج کی کئی منتشر کرنیں، اور پھر ان کے درمیان ایک حوروش دوشیزہ، جو گلابی ساری میں ملبوس، کالی کالی لٹیں ایک فیروزی ربن کے سوبات میں بندھی ہوئی، مگر اڑکر چاند کو بدلی میں چھپا لینے کیلئے فضا میں بے قرار! پہاڑی کھڈ، ان سے ڈرنا، سہمنا، جھجکنا، تھکنا، بیٹھ جانا، خود رو جھاڑیوں سے الجھنا، خود ہی جھنجھلانا، میری پرشوق نگاہوں کو دیکھنا، مسکرانا، جھینپنا، مجھ سے آگے بڑھ جانا۔ چار قدم جا کر پیچھے مڑ کر دیکھنا، متبسم ہونا، پھر چل دینا، چلتے چلتے لالۂ صحرائی کو توڑ لینا، سونگھنا، پنکھڑیاں نوچ کر ہوا میں بکھیر دینا، . . ان سب باتوں کو میں سمجھتا

ہوں: دیوانہ "پُر آرزو" سوالات سمجھے تو سمجھے، تم کیا سمجھو گے اور سمجھا ہو تو سینے کے اندر پہلے دل پیدا کرو!

سیر کرتے ہوئے بہت دور نکل گئے۔ سورج چھپ چکا تھا، تاریکی ہر سمت بڑھ رہی تھی، فضا میں سناٹا تھا گویا بوڑھی زمین اس طرح خاموش ہو گئی، جیسے لونڈیاں کسی شہزادی کے طلوع ہونے کے لئے اشارے تو کرتی ہیں لیکن باتیں نہیں کرتیں۔ تم جانتے ہو کہ سردیوں میں چاند گرمیوں سے زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ بشرطیکہ کوئی دیکھنے والا ہو۔ چشمے کے کنارے گلنار اس انداز سے بیٹھی تھی، گویا وہ رات کی پریوں کی ملکہ ہے اور تنہا اس لئے ہے کہ اس کی محافظ پریاں کوہستانی گلزار سے اس کے تاج کے لئے پھول چننے گئی ہیں۔ میں پھیکلے چاند کے تڑپتے ہوئے عکس کو بہتے ہوئے پانی میں دیکھ رہا تھا۔ بیخود ہو گیا۔ دور معلوم نہیں کہ کہاں تھا، کہ گلنار نے چلّو میں سرد پانی بھر کے میرے منہ پر مارا۔ اور ساتھ ہی ایک ملائم قہقہہ فضا میں حسن و موسیقی کو بکھیرتا ہوا تحلیل ہو گیا۔ جی چاہا کہ اس انداز کی داد گلنار سے لپٹ کر دوں لیکن حسن کا جلال عشق کی امنگ کو اکثر دبا دیتا ہے! ہم واپس چل دیئے! گلنار کا ہر ہر قدم ایک نغمۂ خموش ہے۔ جسے صرف ایک وارفتۂ محبت کا ہی دل سن سکتا ہے۔ چاند کے سیلاب سیمیں نے ہر برگ و گیاہ کو سیم تن بنا دیا تھا۔ چلتے چلتے گلنار راستے سے ذرا ہٹ کر ایک جنگلی گلاب کے سرخ پھول کو لینے کے لئے بڑھی، لیکن ایک پتھر پر سے پاؤں پھسل گیا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش میں پیچھے کی طرف گری اور میں نے اپنے ہاتھ سے سنبھال لیا۔ جیسے شبنم صبحگاہی کا قطرہ برگ گل پر تل رہا ہو معلوم نہیں یا بے خودی تھی یا احساس درد کہ میرے آغوش میں اپنے آپ کو محفوظ پا لینے کے بعد اس نے ایک ایسی چیخ ماری جیسے کوئی مطربہ اپنے نغمے کے تاثرات کی تاب نہ لا کر پورے جوش اور روانگی میں اپنے بربط کے سُریلے تاروں پر ایک دم سے ہاتھ مار دے اور دل سے ایک جھنکار نکل جائے۔ اس کی سانس تیز تھی، بہت تیز اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے گلنار کی سانس کو اپنے چہرے پر محسوس کیا اور اس کی حرارت سے لذت یاب ہوا۔

پہلے تو میں ایک نیم مردہ انسان تھا، احساسِ حسن سے متاثر تھا اور وفورِ عشق سے چکنا چور۔ میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ باوجود وفورِ محبت کے جب میں گلنار کے ساتھ اکیلا ہوتا ہوں تو سوا اس خواہش کے دل میں کچھ نہیں ہوتا کہ میں دو زانو ہو کر اس کو سجدہ کروں! وہ دیوی ہے، میرے خیالات کی دیوی!

اب چار بجے ہیں، ڈاک کا وقت نزدیک ہے۔ معلوم نہیں کیا کچھ لکھ گیا ہوں۔

لطیف بود حکایت دراز تر گفتم

گلنار اس وقت اپنی ایک سہیلی راحت سے ملنے گئی ہے۔ اب آہٹ پر اس کا منتظر ہوں۔

بیٹھا ہوا ہوں اُن کا تصور کئے ہوئے

تمہارا
منور

(۷)

دارجلنگ
۲۷۔ اگست ۱۹۳۵ء

اُف! جمعرات سے بارش ہو رہی ہے، موسلا دھار بارش! آج پیر ہے اور بارش ابھی تک ہو رہی ہے، گلنار کہتی ہے کہ اس بارش سے وہ تنگ آ گئی۔ لیکن میں اس کے اور طولانی ہونے کی دل ہی دل میں دعا کر رہا ہوں، خدا اس کی سنے گا یا میری؟ یقیناً "اللہ جمیل و یحب الجمال" کی صداقت قبول دعا میں بھی ظاہر ہو گی۔ دیکھیں!

گڑھے، گھاٹیاں، نالے، نالیاں، سبھی پانی سے لبریز ہیں، رات کی خوفناک تاریکی میں جب بجلی چمک اٹھتی ہے تو تاریک اور بھیانک فضا میں پانی جہاں تہاں بھرا ہوا ایسا دلفریب معلوم ہوتا ہے، جیسے کسی سبزہ رنگ حسینہ کے سیاہ دوپٹے پر ہیرے کی کنی کے لانبے آویزاں ہوں۔

کل میں بہت زیادہ رنجیدہ تھا۔ میں اپنے رنج کو بہت چھپاتا رہا۔ لیکن گلنار سمجھ گئی، اور وجہ دریافت کی۔ میں نے ٹالنا چاہا۔ اسے موسم کا اثر کہا، معدے کی خرابی بتایا، کم خوابی کا بہانہ کیا، لیکن وہ کسی عذر سے مطمئن نہ ہوئی۔ آخر میں نے ہمت کر کے وجہ بیان کر ہی دی۔ کہ مجھے اس سے کس درجہ محبت ہے!! اور اب جبکہ وہ چند دن کے بعد اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہے۔ اس مراجعت کا خیال مجھ پر کیا ستم ڈھا رہا ہے! میں نے اپنی آرزو بیان کر دی، کہہ دیا کہ وہ میری ہو جائے!! اور بیشتر اس سے کہ گلنار کچھ کہے میں اس خیال سے رو دیا کہ میری آرزو ایک ایسی بلند شے

کے لئے تھی، جس کا حاصل ہو جانا یقینی نہ تھا! گلنار نے بڑھ کر آنسو پونچھے، اور باوجود ضبط دو گرم گرم آنسو، اس کی آنکھوں سے اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ میں نے اس پھول کی مانند سر جھکا لیا۔ جس پر صبحدم شبنم کا ہر قطرہ اشکِ حسرت بن جاتا ہے۔ میں نے گلنار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا میرے بدن میں ایک بجلی سی دوڑ گئی، اور میں نے پھر اپنی آرزوئے شوق کا اعادہ کیا۔ بہت دیر کے بعد اس نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی سرمگیں آنکھوں کو اونچا کیا۔ کچھ کہنے کی ہمت کی لیکن پھر سر جھکا لیا۔ ہم دونوں بہت دیر تک خاموش رہے تھے! دفورِ غم سے بے حال ہو کر میں نے سر پیچھے کی طرف جھکا دیا معلوم نہیں کتنی دیر تک آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ یہاں تک کہ گلنار کے گرم اور نرم ہاتھ مجھے اپنے رخساروں پر محسوس ہوئے۔ اور اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ "میں آپ کی ہوں" اندازہ کرو، انور! میری حالت اس وقت کیا ہوئی ہوگی، قریب تھا کہ شادی مرگ ہو جاؤں۔ میں نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ لیکن میرے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ ان پیاں نواز ہونٹوں کا کھلنا اور ایک سرمدی پیام کے ذریعے کسی مردے کو جلا دینا! "میں آپ کی ہوں"! کیسے حسین الفاظ ہیں۔ تقویت دینے والے! انور! اب میں اپنے اندر کام کرنے کی قوت، ایک حوصلہ، ایک عزم پاتا ہوں، نظامِ کائنات کو درست کر دینے کی قابلیت کا احساس کر رہا ہوں! "کسی" کے لئے کر رہا ہوں تو کام بہت خوشگوار ہو جاتا ہے۔ اور کامیابی یقینی! میری تمام ہستی میری تمام متاعِ جان گلنار کے لئے ہے، اسی کے لئے زندہ ہوں، اور اسی کے لئے مرونگا!

خود ہی خیال کر لو کہ اس مژدۂ جاں بخش کے بعد میرا ذہن کن آرزوؤں اور امیدوں کے خواب دیکھنے میں گذر رہا ہوگا۔ دنیا امن و نعمت، راحت و مسرت کا گہوارہ معلوم ہوتی ہے! "میں آپ کی ہوں"! "میں آپ کی ہوں"! معلوم نہیں میں نے کتنی مرتبہ دہرایا، خوشی نہیں بے خودی کے عالم میں دہرایا! گلنار میری ہے۔ صرف میری ہے اور میں اپنی گلنار کا ہوں! اپنی بھابی کو مؤدب ہو کر آداب کرو! انور، ہاں ایسے!

رات ہو گئی، بارش زیادہ تیزی سے ہونے لگی، بجلی کڑکتی تھی، دل دہل جاتا تھا، ایک دفعہ اس زور سے بادل گرجا، کہ گلنار کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا، بجلی پھر کڑکی، گلنار بالکل غیر ارادی طور پر مجھ سے لپٹ گئی۔ بادل گرجتے اور بجلی کڑکتی رہی، اور گلنار خوفزدہ نظروں سے آسمان کو بار بار، اور باہر کی تاریکی کو دیکھتی اور ہر بار پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ چمٹ جاتی۔ میں اسے اپنے آغوش میں لئے ہوئے تھا اور اپنے ہاتھ اس کے نرم نرم بالوں پر پھیر رہا تھا ؎

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی
جس کے شانوں پہ تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

میں دعا کرتا رہا کہ خدا کرے بجلی یونہی کڑکتی رہے۔ دنوں، مہینوں، برسوں، مدتوں، یونہی کڑکتی رہے! مسلسل پیہم، لگاتار! اور گلنار مجھ سے اسی بہانے ہم کنار رہے!

میرے کمرے میں چاندنی اور قالینوں کا فرش ہے۔ اگر کی بتیاں اور شمعیں روشن ہیں۔ میرے قریب ہی ایک گاؤتکئے سے لگی ہوئی گلنار فیروزی دوشالہ اوڑھے جوانی کی نیند سو رہی ہے مجھے حسین عورت کا غصہ اور اسکی نیند دونوں بہت بھاتے ہیں۔ اور اس وقت تو سونے والی ہے افسانوں کی شہزادی جسے نیند کی پریاں آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔

میں آج بہت خوش ہوں، اگر آج تم یہاں ہوتے تو میں تمام رات تم سے باتیں کرتا لیکن نہیں ایسا نہ کرتا، ورنہ گلنار کی نیند میں خلل پڑتا۔ عشق حسن آزار تو نہیں ہوتا! کیوں ہوتا ہے؟

تمہارا
منور

———— (۸) ————

لکھنؤ
۱۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء

انور! میں آج شام کو جب باہر سے آیا تو کچھ جھٹ پٹے کا سا وقت تھا، آفتاب غروب ہو چکا تھا، آسمان پر شفق کے آثار باقی تھے، دن کی روشنی شام کی تاریکی سے گلے مل رہی تھی، میں سیدھا گول کمرے میں پہنچا تو گلنار ایک صوفے پر آرام کر رہی تھی، نظریں ملیں، اس کی نظریں اس وقت معلوم نہیں کیا کچھ کہہ رہی تھیں۔ غالباً میرے دیر سے آنے پر شکایت آمیز غصے کا اظہار تھا۔ یا رحم و کرم کی التجا حسن منتظر شکوہ کرے تو عشق بھی کیوں نثار نہ ہو جائے! میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ سوچتا تھا کہ کچھ کہوں لیکن جذبات گلوگیر ہو رہے تھے۔ شفق کی سرخی کھڑکی کے نیم وا پردے سے چھن چھن کر گلنار کے چہرے اور سامنے کی دیوار پر منعکس ہو رہی تھی۔

دھیمی دھیمی روشنی جو عشق کی تابش کی طرح چمکاتی تو ہے لیکن بھیانک نہیں!

افق پر رنگین سحاب پاروں کا رنگ کہیں کہیں پھیکا پڑ چکا تھا کہیں نارنجی تھا۔ اور کہیں ہلکا گلابی، لیکن یہ بھی ایک حسن تھا! دور کہیں بہت دور پورب کی جانب بگل کی آواز ہوا کے پروں پر سوار ہوکر آرہی تھی جس نے گلنار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دبا دیا۔ میری روح کو ایک پاکیزگی کا احساس ہوا، میرا احساس محبت وسرت سے بیدار ہوگیا۔ اور یہ معلوم ہونے لگا کہ میں اسی رنگ ونغمہ کی فضا میں اس محبت کی دیوی کے ہمراہ اڑا جارہا ہوں۔ ان نیلے نیلے سرخ بادلوں کی جانب، اس لامتناہی آسمان کی طرف اڑا جارہا ہوں ———— تمنا تھی کہ اس کیفیت میں غائب ہوجاؤں لیکن اتنے میں گلنار نے مچل کر ہاتھ چھڑا لئے اور دوسرے لمحے سامنے والے برآمدے میں جاکھڑی ہوئی، میں بھی وہاں پہنچا۔ لیکن اس نے میری طرف سے منہ موڑ لیا۔ میں نے ہاتھ پکڑنا چاہا تو میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر اپنی گلنار کو مضبوط گرفت میں لے لیا، ———— اور طویل اور خموش برآمدے کے دھندلکے میں دو روحیں لبوں کے ملنے سے متصل ہوگئیں۔ مولسری کی لانبی شاخوں نے جو اس برآمدے میں بھی گھس آئی تھیں، ہم دونوں کے سروں پر اپنا وہی راگ الاپا۔ جو محب ومحبوب کی ملاقات پر گانے کے لئے قدرت نے ان کو سکھایا تھا۔

گلنار نے میرے آغوش میں اپنی خوبصورت آنکھیں نیم وا کردیں جن کے اندر ڈبڈبائے آنسوؤں کی صورت میں ایک ناقابل بیان تمنا مرتعش تھی۔ ان ڈبڈبائی ہوئی حسین آنکھوں میں ایک چمک تھی، خیرہ کردینے والی چمک نہیں بلکہ ٹھنڈی ٹھنڈی سکون آمیز اور دل میں اپنا مستقل نقش چھوڑ جانے والی چمک! میں نے چاہا کہ گلنار کے چہرے کو اپنے پُرارمان بوسوں سے منقش کر دوں، لیکن کسی مورتی کا پجاری اپنی معبودہ کو پاش پاش کردینے کی کوشش نہیں کرتا! اس خیال کے آتے ہی اس کے قدموں پر گر پڑا، تاکہ اپنے متاع دل وجان کو اس کے تقدس اور وقار پر سے قربان کردوں لیکن انور، اس سے قبل کہ میں اس کے قدموں پر تڑپ تڑپ کر جان دیدوں اس پیکر حسن وخوبی نے مجھے اٹھا کر گلے لگا لیا، میں اس سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتا تھا کہ معلوم نہیں، ایسا کیوں ہوا؟

انور آج میں سمجھا کہ باد بہاری کیوں چلتی ہے؟ ننھی ننھی چڑیاں کیوں گاتی ہیں؟ خدا نے نور اور روشنی کو کیوں پیدا کیا ہے؟ یہ سب پرتو محبت وصداقت ہے! تم متفق ہو نا؟

تمہارا منور

———— (۹) ————

لکھنؤ

۳۰۔ جون ۱۹۳۶ء

انور! میں جہاں کہیں بھی ہوں، گلنار میرے ساتھ رہتی ہے۔ جسماً نہیں تو روحاً! گلنار نہیں تو گلنار کے محبت نامے میری تسکین قلب کا باعث ہیں۔ یہاں گیارہ بجے ڈاک آتی ہے لیکن میں صبح ہی سے بے قرار ہوجاتا ہوں۔ گیارہ بجنے میں ہی نہیں آتے، البتہ اوقات خود ڈاکخانے چلا جاتا ہوں تاکہ پیام روح جلد سے جلد مجھے مل جائے۔ دنیا کو تو تم جانتے ہی ہو نا؛ معلوم نہیں لوگ میرے اس معصوم فعل کو کیا سمجھیں، اس لئے اپنے چٹھی رساں سے اکثر کہہ دیتا ہوں۔ "شیخ جی میں ایک کام سے بازار جارہا ہوں سوچا کہ آپ سے بھی ملتا چلوں۔ کوئی خط ہے تو دیدیجئے" بوڑھے پوسٹ مین کی بوڑھی لیکن مشاق انگلیاں خطوں کے بنڈلوں میں سرعت سے میرے خط کو تلاش کرنے کی کوشش میں دوراں ہوجاتی ہیں۔ اور اگر میری نظر اسی رنگ کے لفافہ پر پڑجاتی ہے جس رنگ کا میری گلنار استعمال کرتی ہے تو میں خطوں کے بنڈل پر جھک جاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ "ٹھیرئیے یہ ہے میرا خط" لیکن اکثر اوقات وہ کسی اور کا نکلتا ہے۔ جب مجھے میرا خط مل جاتا ہے تو میں اکثر اپنے اضطراب کو چھپانے کی غرض سے چٹھی رساں سے دوچار منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرتا ہوں تاکہ اسے معلوم نہ ہوسکے کہ میں اس خاص خط کو پڑھنے کے لئے کس قدر بے قرار ہوں، خط پڑھتا ہوں کہ، ایک بار، دو، تین، چار، معلوم نہیں کتنی بار، چومتا ہوں، سینے سے لگا لیتا ہوں اور اس زور سے کہ میرا سینہ کھل جائے گا۔ اور میں اس امانت محبت، اس صحیفۂ عشق کو خود پرست دنیا کی نظروں سے پوشیدہ کرسکوں گا۔ گلنار کے لکھے ہوئے پیارے پیارے فقرے، دیوانوں کی طرح اپنے آپ سے مخاطب ہوکر باربار دہراتا ہوں۔ مجھے گلنار کے خط کے خط حفظ ہیں۔ ایک محبت نامے میں اس نے مجھے "چراغ زینت" دوسرے میں "نخل حیات" تیسرے میں "تمناؤں کی جان" چوتھے میں "پردیسی پریتم" لکھا۔ انور! کیا میں اپنی گلنار کے لئے واقعی "چراغ زینت" ہوں۔ کیا میں واقعی اس کی "جان آرزو" ہوں، پردیسی تو ضرور ہوں لیکن کیا میں سچ مچ گلنار کا پریتم بھی ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ میرے ایسے نصیب کہاں! لیکن نہیں نہیں، محبت سماجی تقسیم پر ہنستی ہے۔ صرف محبت ہی

وہ طاقت ہے، جو ایک بھکاری کو شہزادی کے قریب کر دیتی ہے!

میں اپنی گلنار سے کبھی کوئی بات نہیں چھپاتا۔ محبت کر کے آدمی جھوٹ بولنے پر قادر نہیں رہتا۔ جو کچھ میرے دل میں ہوتا ہے۔ انہیں جذبات کو من و عن بیان کر دیتا ہوں۔ اس کو خط لکھنا میرا اہم ترین فرض اور لذیذ ترین مشغلہ ہے۔ ایک ایسا فرض جس سے میرے ماضی کی دلکشی وابستہ ہے۔ میرے حال کی مسرتیں قائم اور میرے مستقبل کی تمنائیں پیدا ہیں۔ . . . ذرا سوچو تو سہی ایک طوفانی رات کو جب کمرے کے باہر زور کا جھکڑ چل رہا ہو۔ تم لیمپ کے قریب بیٹھے ہوئے اپنے پارہ ہائے دل کو کاغذ پر نقل کر رہے ہو۔ تمہارے گرد اگرد ایک خاموشی چھائی ہو، ایک ہولناک خاموشی، رات سائیں سائیں کر رہی ہو تم نامۂ محبت لکھتے چلے جاؤ، اور ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی احساس ہو کہ تمہارے گرد و پیش کی تمام کائنات سو رہی ہے۔ مدہوش ہے، لیکن تم نامۂ محبت لکھتے جاؤ، اس ڈراؤنی لیکن پرسکون خاموشی میں ایک ہوا کا جھونکا آیا اور دروازہ کھٹکھٹائے، تم ایک منٹ کے لئے اس جانب دیکھنے لگو، اور پھر نامۂ محبت لکھنے چلے جاؤ۔ بہت رات گئے تک لکھتے ہی چلے جاؤ۔ کیا یہ معصومیت اپنے اندر ایک دنیائے حسن و بےخودی نہیں رکھتی۔ خط صبح کے وقت بھی لکھا جا سکتا تھا۔ لیکن تم اسے شبستانِ محبت کی خلوتوں میں ہی لکھنا چاہتے ہو! ایسے میں معلوم نہیں انسان کیا کچھ لکھ جاتا ہے۔ وہ سرمدی پیام دنیا بھر میں ایک ہی ہستی کے ملکوتی کانوں کے لئے ہوتا ہے۔ اسے ایک ہی آنکھ دیکھ سکتی ہے اور اسی لئے وہ قاعدوں اور ضابطوں سے آزاد، ایک ایسی جاں بخش تحریر ہوتی ہے جس پر بڑے سے بڑے ادیب کی کاوشِ ذہن و دماغ لاکھوں کروڑوں بار قربان ہے!

میں اس حالت میں خط ہاتھ میں لئے ہوئے رات کی اوس سے بھیگے ہوئے اونچے سرخ لیٹر بکس کے قریب جا کھڑا ہوتا ہوں۔ خط اس کے اندر ڈال دیتا ہوں۔ اس کے گرنے پر اندر سے ایک آواز آتی ہے "کھٹ" اور دل بھی ساتھ ہی ساتھ دھڑکنے لگتا ہے۔ میں کہتا ہوں انور! اگر وہ تاروں بھری رات کا مالک خدا دنیا بھر کے لیٹر بکسوں کو زبان دیدے تو وہ محب و محبوب کے خطوں کی کیسی کیسی پُر ارمان اور حسرت زا داستانیں نہ کہہ ڈالیں گے؟ جب میرا اور گلنار کا نام آئے تو . . . ؟ لیٹر بکس اپنے قریب میرے کھڑے ہو کر رونے کی کہانی کو کتنی بار دہرائے گا؟ وہ یہ بھی بتائے گا کہ میں نے اس سرخ پیامی کو رات کے اندھیرے میں کس کس محبت اور کس گرمجوشی سے وارفتہ ہو ہو کر چوما ہے۔ ہاں یہ بھی کہے گا کہ میں نے کتنی دفعہ اس سے لپٹ کر اپنی گلنار کے متعلق سوال کئے ہیں، اور ہاں اس کے جواب نہ دینے پر کتنی دفعہ اسے جھنجھوڑا ہے۔ . . . . یہ لیٹر بکس جانتا ہے، اور کسی کے سننے کی بات نہیں۔

میں آئندہ مہینے میں گلنار کے پاس آگرے جا رہا ہوں۔ تمہارا

منور

———— (۱۰) ————

لکھنؤ

۱۵۔ دسمبر ۱۹۲۷ء

انور! یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ گلنار میرے عوض "کسی" اور کی ہوگی۔

انور! عورت کی فطرت نے ایک بار پھر کروٹ لی۔ اور ان تلخ اور حسرت زا خونیں داستانوں کو دہرایا جن کی وجہ سے ہزاروں، لاکھوں بے گناہ محبت کرنے والے مردوں کی زندگیاں تباہ ہو گئیں۔ میری مسرتیں اور امیدیں ایک ایک کر کے مجھ بدقسمت سے گلے ملیں اور مجھے حرمان و یاس کو سونپ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں۔ دل ابھی گلنار کی محبت کا دم بھرتا ہے اور فریب کھانا چاہتا ہے لیکن عقل اور آنکھیں اس خوش فہمی کا ماتم کرتی ہیں۔ میری نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی اور اگر مجھے بوڑھی ماں کی ضعیفی کا خیال نہ ہوتا تو آج ان سطروں کے قلمبند ہونے کی نوبت ہی نہ آتی۔ انسانی مجبوری! جس عورت کو میری تمناؤں اور میرے تخیل نے پروان چڑھایا وہ کسی اور کے پہلو میں ہو!

یہی تقدیر بھی اللہ غنی ہوتی ہے!

میں نے گلنار کے مانگنے پر اس کے تمام خطوط واپس کر دیئے۔ جو کچھ میرے پاس اس بےوفا کی یاد کا سرمایہ ہے، وہ مشتمل ہے دل کی ایک خلش اور جگر کی ایک ٹیس پر۔ رونا چاہتا ہوں لیکن آنسو نہیں۔ دل کے علاوہ میرے پاس گلنار کی ایک انگی نیلے رنگ کی ایک چوڑی کے چند ٹکڑے ہیں۔ جن کو آنکھوں سے لگاتا ہوں اور سینے سے متصل کر کے خوب دباتا ہوں اور بس! یہ ہے جو کچھ باقی ہے، اس عورت، اس محبوب ہستی کی یاد کا، جس نے روتے ہوئے کہا تھا کہ "میں آپ کی ہوں"۔ کسی دن یہاں چلے آؤ۔ تاکہ تمہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھوں کہ کیا

"کرموں کی گت ٹارے ناہیں ٹرے؟"

سوگوارِ ماضی

منور

—:(۱۱):—

لاہور

۱۲ مئی ۱۹۳۵ء

انور! میری بیچاری زندگی مسلسل داستان ہے۔ بدقسمتی اور بدنصیبی کی، گلنار کا شوہر (میں اور کو اس کا شوہر کہہ رہا ہوں!) میری ماتحتی میں تبدیل ہو کر آ گیا ہے۔ آدمی عمر اور صورت سے شریف معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اُسے بلا کر پوچھا کہ وہ ترقی پا کر دوسرے افسر کے ماتحت رہنا چاہتا ہے۔ جس کا جواب اس نے بدقسمتی سے نفی میں دیا۔

مکان پر جاتا ہوں تو گلنار کا خیال میرے ہمراہ رہتا ہے۔ گلنار کا خیال تو گلنار سے زیادہ باوفا ثابت ہوا! دفتر میں آتا ہوں تو گلنار کا شوہر پیش نظر رہتا ہے اور میں کام نہیں کر سکتا۔ تمام فضا پر ایک موت کی سی مُردنی چھائی رہتی ہے، رات ایک ناقابل بیان خواہش اور کرب میں گذر جاتی ہے۔ دن اسی طرح گذرتے ہیں، راتیں اسی طرح گذرتی ہیں۔ ہر روز، پہلے روز کی طرح سورج نکلتا، اور ڈوب جاتا ہے، ہر رات تارے اور چاند مجھے دیکھ کر سرگوشیاں کرتے ہیں، اور صبح ہوتے ہی وقت کی آغوش میں سونے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ بے کیف زندگی، قابل رحم زندگی، اُداس زندگی، بے مصرف زندگی! روتا ہوں انور! اور جب تک سانس باقی ہے روتا رہونگا۔

پرسوں گلنار کے شوہر کے ہمراہ دو بچے میرے ہاں آئے۔ یہ دونوں کون تھے؟ فرحت اور شہباز، گلنار کی آنکھوں کے تارے، اس کے دل کا سکون، اس کی بیوفائی کے دو زندہ، متحرک، اور خوبصورت مجسّمے! فرحت چار برس کی معصوم بچی ہے، ننھی سی گلنار ہے، بات کرتی ہے تو ماں کی طرح اُس کے گالوں میں بھی خوبصورت بھنور پڑتے ہیں۔ ناک، نقشہ، سب کچھ گلنار کا پایا ہے۔ لیکن خدا کرے ماں کی طرح دل تو وفا ناآشنا اور بے احساس نہ ملا ہو۔ شہباز کی طبیعت میں ماں کی فطرت کا شریر پہلو زیادہ نمایاں ہے، میں اس منظر کو برداشت نہ کر سکا، میں اپنے جذبات سے اس قدر مجبور ہو گیا کہ جلدی سے اُنہیں رخصت کر کے کمرہ میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اور معلوم نہیں کب تک روتا رہا۔ وہ گلنار کے بچے تھے، جنہیں کبھی میرے تخیل نے تخلیق کیا تھا لیکن وہ مجھے تو "ابا میاں" نہیں کہہ سکتے تھے، خدا کے لئے مجھے معاف کرو انور! میں معلوم نہیں، کیا کچھ کہہ رہا ہوں۔

کل صبح گلنار کا ایک دو حرفہ خط آیا جس میں لکھا تھا "افضل باغ" میں مجھ سے چند منٹ کے لئے مل لوں۔ کیا میں اس سے ملنے کے لئے گیا؟ کیا میں اس سے ملنے جاؤنگا؟ نہیں کبھی نہیں! اب میرا اس پر کوئی حق نہیں، وہ کسی اور کی ملکیت ہے، ایک شریف کی بیوی۔ اب ملکر کیا ہوگا؟ جب تمام امیدیں خاک میں مل ہی چکیں!

آخر شب، دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

موت کا منتظر
منور

—:(۱۲):—

دہلی

۱۴ نومبر ۱۹۳۵ء

انور! اسی دن شام کو جس دن میں نے تمہیں پچھلا خط لکھا تھا۔ اسمبلی سے "حقوق نسواں" پر تقریر کر کے واپس آ رہا تھا، کہ راستے میں مجھے چکر آ گیا اس خیال سے کہ تازہ ہوا، کچھ فائدہ دیگی میں موٹر سے اتر کر دلکشا باغ میں ٹہلنے لگا۔ معلوم نہیں کیوں میری بدقسمتی مجھے یہاں لے آئی تھی۔ سبزے پر ٹہلتا رہا۔ اور تھک کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا جس پر کوئی خاتون میری جانب پشت کئے ہوئے پہلے سے بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی چند سکنڈ کے بعد مڑ کر دیکھتا ہوں کہ وہ عورت گلنار تھی، اور میری جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی، دل پر ایک سانپ سا لوٹ گیا، اور میرے حواس مجھے خیر باد کہ گئے، ذرا سوچو تو انور، ایک تنہا باغ کا سبزہ زار اتفاق ایک ایسی عورت کو تمہارے سامنے پیش کر دیتا ہے، جس کو کبھی تم اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے، محبت کرتے تھے، اب بھی محبت کرتے ہو، لیکن وہ چیز نہیں، اس کا مالک کوئی دوسرا ہے! ایک ایسی عورت جس سے کبھی تم تنہائی میں مل چکے ہو، جس سے تم نے بارہا رازِ دل بیان کیا، جس نے اپنے ملکوتی ہونٹوں سے بارہا تمہارے لئے آب حیات کے قطرے ٹپکائے ہیں، ایسی عورت بالکل تنہا ہے، اور تم اس سے کچھ نہ کہہ سکو، کیونکہ وہ کسی دوسرے شخص کی بیوی ہے! تمہارے دل کی سلگتی ہوئی چنگاری کیا دہکتا ہوا شعلہ نہ بن جائے گی۔ جو اس جھوٹ اور فریب کی دنیا کو ایک پل بھر میں جلا کر خاکستر کر سکتی ہے۔ شرافت اور جذبات میں جنگ ہونیگی،

میں بہت سنبھلا، لیکن ایک بے خودی کے عالم میں، ایک پرزے پر لکھ کر وہاں چھوڑا اور اٹھ کر چلا آیا ؎

تم نہ دیکھو کہ میرے چہرے پر!
اک تمنا سی پائی جاتی ہے! (جوش)

گذری ہوئی دلچسپیاں، بیتے ہوئے دن عیش کے، "اک اک کر کے نگاہوں کے سامنے پھر گئے"۔ اُسی شام سے طبیعت زیادہ، بہت زیادہ خراب ہے، تیز بخار، اور حد درجہ کا ضعف، دل بیٹھا جاتا ہے، سینے میں کوئی چیز ہے جو رینگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، شاید میری مسرتیں اس مسافر خانے سے چلنے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ایک دورہ سا اٹھتا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر ایک کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے، اور بعض اوقات میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا سینہ پھٹ جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ ہیجان بھی ختم ہو جائے گا۔ کبھی کبھی کوئی چیز سینے کے اندر سے اٹھ کر گلے کی جانب آتی ہے، اور وہیں پھنس کر رہ جاتی ہے اور میں اس وقت سانس گھٹ جانے کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہوں لیکن ظلم یہ ہے کہ کبھی سانس پوری طرح نہیں گھٹتی، تاکہ اس بظاہر خوبصورت مگر باطن بھیانک جہان کو نہ دیکھوں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک بے وفا عورت کی یاد کو آخری بار گلے لگا کر آنکھیں بند کر لوں۔

اس وقت مجھ پر ہذیان کی سی کیفیت طاری ہے، جی چاہتا ہے کہ زور زور سے چیخوں۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخوں، اتنا چیخوں، کہ روح و جسم کا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، روزِ محشر تک کیلئے منقطع ہو جائے۔ گلنار! گلنار!! میری گلنار!!! میری اپنی گلنار!!! نہیں منور، گلنار میری نہیں گلنار میری اپنی نہیں، وہ کسی اور کی ہو چکی، تجھے تو اب اس کا نام لینے کا بھی حق نہیں رہا۔

آج میں سخت نڈھال ہو رہا ہوں، میرا سر چکرا رہا ہے، اور معلوم نہیں کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ "کسی" کی سڈول مرمریں بانہیں، میری گردن میں حائل ہو جائیں۔ کسی کی پیاری پیاری گوری گوری کلائیاں جن میں سونے کی چوڑیاں کھن کھن کر رہی ہوں، میرے سر کو سنبھال لیں میرا دل اچھلتا ہے، اور، ان چوڑیوں کی دلکش اور جانفزا آواز سننے کے لئے جس کو ہزاروں بار پہلے سن چکا ہوں، ان کا نغمہ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے، اُس موسیقی کو ایک بار پھر سننا چاہتا ہوں، شاید آخری مرتبہ!

عورت ایک خاص عورت میری بے کیف زندگی کا مرکزی تخئیل رہی ہے دنیا میں میں نے بڑے بڑے اعزاز حاصل کئے۔ میرے اشعار کی تعریف ہوئی میری تصانیف کو لوگوں نے آنکھوں پر رکھا۔ میری تقریروں نے ملک بھر میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ میری ڈاک میں ہر صبح سینکڑوں تعریفی خطوط آتے، لوگوں نے مجھے قیمتی سے قیمتی تحائف بھیجے، میرے لئے پھولوں کے ہار آتے رہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود مجھے سچی خوشی نصیب نہ ہوئی۔ اکثر میں اپنی دنیوی کامگاریوں سے مدہوش شام کو گھر واپس آتا ہوں، لیکن جونہی میں اندر قدم رکھتا ہوں تو وہ طلسم ہی جاتا رہتا ہے! اس کے عوض کہ میری بیوی . . . میری . . . گلنار دوڑ کر میرا استقبال کرتی، اور میں اُسے گلے سے لگا لیتا۔ مجسمہ بے کسی اور تنہائی نے میرے قدم لئے ہیں، دنیا کی نظروں میں کتنا خوش نصیب ہوں لیکن درحقیقت کتنا بڑا بدنصیب! جو کچھ میرے باورچی نے سامنے رکھ دیا، میں نے کھا لیا، لیکن ہر ہر لقمہ زہر بن کر گلے سے اُترا، اور میں گلنار کی محبت اور حسن انتظام کو رو دیا۔ میرا لباس باوجود نوکروں کی دیکھ بھال کے بیوی کی ——— گلنار کی محبت اور رکھ رکھاؤ کا محتاج رہا، میرے خدام میرے کمرے کو بہترین طریقے پر آراستہ کرتے ہیں لیکن یہ زیبائش عورت کے سلیقے کو ہمیشہ ترستی، میری ہر چیز، میرا ہر فعل، میری زندگی بھی، گلنار کے بغیر نامکمل رہی، وہی اس خلا کو پورا کر سکتی تھی لیکن اب تمنا ہے کہ کل سورج نکلتا ہوا نہ دیکھوں!

. . . .

یہ دیکھو میرا نوکر مجھے دوا پلانے کے لئے آ گیا۔ سفید سفید نیلی پیلی بوتلیں زہر اثر دوا، عشق ان کا مذاق اُڑاتا ہے، سفید، سفید، نیلی، پیلی، بوتلیں، گھر میں ہوٹل کی زندگی کا مزہ، ہر چار طرف کلرکوں، پیش کاروں، نوکروں کی آوازیں، فیشن نما روکھی پھیکی زندگی . . . ایک عورت کی آواز، . . . گلنار کی آواز نہیں! ٹھیرو، ٹھیرو، وہ بول رہی ہے۔ "میں آپ کی ہوں"! "میں آپ کی ہوں"۔ میرا دل . . .

. . . . .

واقعہ دہلی، ۵ ؍ نومبر ۱۹۴۷ء

ملک بھر کے اخبار صبح سیاہ سیاہ حاشیوں سے اپنے لیڈر کی موت میں سوگوار تھے۔ ہر اڈیٹر نے اپنی کاغذی لیاقت سے زیادہ آنسو بہائے کسی نے لکھا کہ آفتاب ادب غروب ہوگیا، کسی نے شیر دل لیڈر کا ماتم کیا، کوئی جادوئے بیان کے ختم ہونے پر اشکبار رہا۔ ملک بھر میں ایک سناٹا تھا دفتروں اور سرکاری عمارات کے جھنڈے سرنگوں ہو کر اس عظیم شخصیت کو آخری خراج دے رہے تھے، . . . تمام ملک ماتم کناں تھا . . . سرکاری نوجوانوں نے جاہ و حشم کے معزول دیوتا کو آخری سلام کیا . . . اس کی تحریر کے دیوانوں نے اس کی قبر پر پھولوں کے گلدستے اور ہار پیش کئے . . . . . . چار پانچ آدمیوں کے ایک مجمع میں ایک نے کہا "مرحوم نے مدتوں تک قوم، ملک اور ادب کی بے غرض اور شاندار خدمت کی، اس کی اولاد کو کچھ نہ کچھ صلہ ضرور ملنا چاہئے۔ گلنار کے شوہر نے جو شہباز کی انگلی پکڑے ہوئے تھا کہا، اس کا تو کوئی بچہ بھی نہیں، شہباز خالی خالی نظروں سے، ایک انسان کی موت سے متاثر نظروں سے ان کا منہ تک رہا تھا . . . .

. . . .

. . . کچھ دن کے بعد رات کی تاریکی میں ایک عورت قبرستان میں آئی۔ ہمیں معلوم نہیں وہ کون تھی، . . . . . وہ ایک تازہ قبر سے لپٹ کر روئی . . . بہت دیر تک روتی رہی۔ . . . معلوم نہیں اس کا کیا انجام ہوا . . .

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی
سُناتا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

شام

بڑھتی جاتی ہیں اُفق پر نرم زرد تاریکیاں — جُھکتا آتا ہے زمیں کی سمت نیلا آسماں
خار و خس پر ہے سکوتِ شام کا دلکش خمار — پڑ رہی ہے صحنِ گلشن میں ملاحت کی پھوار
تھم گئے دریا، ہواؤں میں لوچ پیدا ہو گیا — جھاڑیوں کا سایہ پانی سے لپٹ کر سو گیا
ایک غبارِ سرمہ گوں ہے خاک پر سایہ فگن — ہے فضاؤں میں ملائم تیرگی کا بانکپن
نقشِ باطل بن کے تاریکی میں یکسر مٹ گئے — سانپ کے مانند، میدانوں کے ٹیڑھے راستے
بجتے بجتے جس طرح خاموش ہو جاتا ہے ساز — پھر ہواؤں میں دیر تک رہتا ہے نغموں کا گداز
چھا رہا ہے ہر طرف ایسا ہی کچھ غمگیں سکوت — وجد آور، پُر اثر، خواب آفریں، شیریں سکوت
تیرتی ہے شام کی بھیگی ہوا میں تازگی — سانس کے ہمراہ کھنچ آتی ہے شبنم کی نمی
رفتہ رفتہ چھپتے جاتے ہیں نظر سے دشت و باغ — دُور کی آبادیوں میں ٹمٹماتے ہیں چراغ
ہے بلندی پر معلق تنگ شہروں کا دھواں — دھیمی دھیمی بج رہی ہیں مندروں کی گھنٹیاں

جھانکتے ہیں ایک دو تارے فلک کے بام پر
نُور کچھ کچھ چھن رہا ہے چرخِ نیلی فام پر

ذوقی



قومی اتحاد کیوں کر ہو سکتا ہے؟

از منشی پریم چند صاحب

ابتدا میں اس خیال سے گونہ تسلی ہوئی تھی کہ جیسے جیسے عوام پر تعلیم کا بیدار کن اثر ہوگا آپس کی یہ جاہلانہ منافرت اور فرقہ پروَرانہ کدورت دور ہو جائے گی لیکن گذشتہ پچیس سال میں تعلیم نے افلاس کی مناسبت ہی سے ترقی کی ہے طلبا کی تعداد سے اندازہ کیجئے تو کئی گنی نظر آتی ہے۔ ایک کی جگہ صوبۂ متحدہ میں پانچ پانچ یونیورسٹیاں ہیں جہاں بمشکل ہزار بارہ سو گریجویٹ امتحان میں شریک ہوتے تھے۔ اب ان کی تعداد بدرجہا زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لیکن اسی رفتار سے منافرت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے جہاں صرف گئوکشی اور قربانی ہی ہنگامے اور شر کا باعث ہوا کرتی تھی وہاں اب آرتی اور نماز اور باجے اور اذان اور سنکھ اور جلوس خاص بے شمار ایسے اسباب نکل آئے ہیں جن پر آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ اور جس زمانے کا خواب دیکھ کر قوم پرستوں کو تسلی ہوتی تھی وہ زمانہ دور ہوتے ہوتے اب شاید افق کے اس پار بھی کہیں نظر نہیں آتا، یہاں تک کہ جو کشمکش نوکریوں اور ممبریوں کے بھکاریوں تک محدود تھی عوام میں سرایت کرتی جاتی ہے۔ اور ہندوؤں سے کوئی چیز مت خریدو۔ مسلمانوں کی دوکان پر مت جاؤ۔ وغیرہ تحریکوں نے گویا آتش گیر مادے کو ایسا جمع کر دیا ہے کہ ذرا سی چنگاری عالم گیر تباہی کا باعث ہو سکتی ہے کبھی کبھی نوجوانوں کی طبیعت کا رنگ دیکھ کر امید ذرا دیر کے لئے لہلہا اٹھتی ہے۔ علی گڑھ سے یا کبھی کسی دوسری انجمن سے قوم پرورانہ جذبات کی کمزور سی آواز سن کر بھی خون میں ذرا حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور قومیت کا سرور دل پر طاری ہونے لگتا ہے کہ یکایک دوسری طرف سے مخالفانہ جذبات کی گھن گرج صدا کانوں میں آکر نشہ ہرن کر دیتی ہے۔ اور اب تو یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ ہندو مسلمانوں کے محلے میں رہتے ہوئے کانپتا ہے۔ اور مسلمان ہندوؤں کے محلوں میں رہتے ہوئے

مگر کیا اس سیاسی سرسام سے پہلے بھی یہی حالت تھی۔ کسی پرانی بستی کو دیکھئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دیواریں ملی ہوئی ہیں۔ اگر اس قسم کے خطرے ہوتے تو ہمسائیگی کا خیال ہی کیوں پیدا ہوتا۔ گاؤں گاؤں میں مکتب ہوتے تھے بالعموم مولوی صاحب لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ سید سالار کے مزار پر اور عزاداری کے موقعوں پر ہندو مسلمانوں کے شریک ہوتے تھے۔ اور ہولی کی تقریب میں مسلمان ہندوؤں کے شادی بیاہ میں بھی اس بھائی چارے کا نباہ کیا جاتا تھا۔ شادی اور غمی میں دونوں ایک دوسرے کے شریک حال رہتے تھے۔ اور آج کوئی ہندو چراغ جلنے کے بعد مسلمانوں کے محلے سے صحیح سلامت نکل جائے تو دیوتاؤں کو ڈنڈوت کرتا ہے اور شاید مسلمان بھی ہندوؤں کے سایے سے ڈرتا ہو۔ اور اگر ابھی خرید و فروخت یا عام انسانی تعلقات قائم بھی ہیں تو بدرجہ مجبوری یا رقابت کے جنون میں ہندو دوکان دار مسلمان پارچہ فروش ریشمی کپڑے اس لئے خریدتا ہے کہ ہندو کاریگر اسے میسر نہیں آتے۔ اور مسلم خریدار ہندو بساطی کی دوکان پر اس لئے جاتا ہے کہ کوئی مسلمان بساطی نظر نہیں آتا۔ ورنہ دلوں میں اس درجہ نفرت پیدا ہو گئی ہے کہ اگر ایک قوم دوسرے سے بے نیاز رہ سکتی تو اپنے معبود کا شکریہ ادا کرتی۔

پرانی تاریخ میں مجلسی تعلقات کا ذکر بہت کم ملتا ہے مسلمان فرماں رواؤں کے زمانے میں ہندوؤں کے ساتھ کہیں کہیں زیادتیاں کی گئی ہونگی۔ ہندوؤں نے بھی اپنی ہستی قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں سے لڑائیاں لڑی ہونگی مگر اب یہ امر شہادت کا محتاج نہیں ہے کہ ہندو مسلمان فرماں رواؤں کی لڑائیاں صلیبی یا جہادی نہیں ہوتی تھیں بلکہ محض ملک گیری کی ہوس یا ذاتی بدگمانی یا رقیبانہ شورید سری ان کی محرک ہوا کرتی تھی، ہاں ادبیات میں ہندوؤں کی کثرت اور ہندی فن شعر میں مسلمانوں کی طبع آزمائیاں دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے۔ کہ ان میں مجلسی تعلقات بھی تھے اور سطحی نہیں۔ بلکہ کافی گہرے تھے۔ کیوں کہ ادبی ارتباط بلا دوستانہ تعلقات کے ممکن نہیں۔ اور اگر مان بھی لیں کہ پہلے ہی باہمی منافرت موجود تھی اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے تو وہ جہالت اور سیاسی جمود اور بے خبری کا زمانہ تھا۔ ورنہ سلطنت ہی کیوں جاتی۔ اور تاجروں کی ایک چھوٹی سی جماعت اپنی ہمت اور تدبیر سے ایک برّاعظم پر تسلط کیوں کر پا لیتی؟ یہ دور تو بیداری اور روشنی کا ہے آج ایک بچہ بھی جتنی تاریخ جانتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال پر جس بیدار مغزی سے محاکمہ کر سکتا ہے اتنا ایک صدی قبل بڑے بڑے علماء کے لئے ناممکن القیاس تھا۔ جب لوگ پندرہ سو سال پہلے کی

دنیا میں بستے تھے ، اور حالانکہ آج بھی ہماری وہ قدامت اور جمود پرستی قائم ہے اور آج بھی ہم مجلسی اور سیاسی معاملات میں قدیم روایتوں سے الہام حاصل کرتے ہیں لیکن پھر بھی مقابلتہً ہم نے دورِ جدید کی ذہنیت بہت کچھ حاصل کر لی ہے۔ اب ہمیں معلوم ہے کہ قوم اپنے عیبوں اور اور خوبیوں کے ساتھ کیا چیز ہے. وہ کیوں کر بنتی ہے. کیوں کر منظم ہوتی ہے اور کن کن حالات میں منتشر ہوتی ہے اس کے ارکان کیا ہیں ۔ محرکِ اسباب کیا ہیں. ضروریات روزگار سے ہم کافی باخبر ہیں. چنانچہ اس دور میں بھی جب انتشار اور افتراق کے اسباب ہی روز بروز غالب آتے جاتے ہیں تو قدرتی طور پر ہمیں اپنا مستقبل تاریک اور مایوس کن نظر آنے لگتا ہے ۔ اور ایسا گمان ہوتا ہے کہ شاید ہم دنیا سے مٹ جانے کے لئے ہی ہیں شاید ازل تک ہمارا غلام رہنا ہی مشیتِ الٰہی ہے ۔ شاید اس زمانے میں جب حبشی قومیں بھی آزاد ہیں اور آزادی کی قیمت کرلی ہیں اور خون سے اس کی حفاظت کرنے کو آمادہ رہتی ہیں. ہمیں آزادی کے درشن ہوں گے ' اقتصادی کش مکش کے ساتھ جب دل پر مایوسی ہی غالب آجائے تو قوم میں زندگی کہاں سے آئے ۔ روح کہاں سے آئے ۔ طاقت اور تقویت تو امید سے آتی ہے ۔ ہمت تو بڑھتی ہے ۔ پودے کی ہری ہری پتیاں دیکھ کر ۔ جو پودا روز بروز خشک اور مردہ ہوتا جاتا ہو اس سے کیا توقع کی جائے۔

اس فریب سے ہم اپنے دل کو نہیں دھوکے میں ڈال سکتے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے جہلا کی کم نظری اور تعصب اور مذہبی جنون کے ماتحت ہو رہا ہے ۔ کاش ایسا ہوتا تو اصلاح کی امید قائم رہتی ۔ جہلا ہمیشہ جاہل نہیں رہ سکتے . اور ایک ایسے زمانے کا خواب دیکھا جاسکتا تھا ۔ جب جہلا جہلا نہ ہوں گے لیکن رونا تو یہی ہے کہ یہاں ہستیوں کی عنایتیں ہیں جو خدا کے فضل سے علم اور فضیلت اور عقل کی علم بردار ہیں ان میں قوم کا درد بھی ہے اپنی قوم کو پھر اسی عروج پر دیکھنے کی قابلِ ناز تمنا بھی ہے اور یہ کیسے کہا جائے کہ وہ گمراہ ہیں یا کسی تیسری طاقت کے ایما اور تحریک کے زیرِ اثر ہیں یا عروج اور وقار اور منصب کی دھن میں عمداً قوم کا گلا گھونٹ رہے ہیں ۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ جو قدم رکھتے ہیں پوری ذمہ داری کے ساتھ ضمیر کی تحریک سے ۔ کسی کو کسی کی نیت پر شبہ کرنے کا حق نہیں ہے تاہم یہ تحقیق کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں کہ جن دماغوں میں اتحاد مساوات اور اخوت کی اسپرٹ پیدا ہونی چاہئے تھی ان میں منافرت اور تعصب اور برادر کشی کے جذبات کیوں مشتعل ہو رہے ہیں ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں فرقوں میں کسی حد تک بدگمانی ہمیشہ رہی ہے ہندو کبھی یہ نہ بھول سکا کہ مسلمانوں نے اس پر فتح پائی ہے نہ مسلمان ہی یہ بھول سکے کہ وہ فاتح ہیں اور ہندو مفتوح ۔ فاتح مفتوح کو ہمیشہ ذلیل اور حقیر سمجھتا ہے اور اس کی معاشرت کے ہر ایک پہلو میں اسے عیب ہی عیب نظر آتے ہیں ۔ ہندوؤں نے فلسفہ اور علمیات میں کتنا ہی کمال کیوں نہ حاصل کیا ہو وہ ایک حملہ آور قوم سے اپنی حفاظت نہیں کرسکتے ۔ جب ان کا فلسفہ اور عمل اور تہذیبی اتحاد انہیں مسلمانوں سے نہیں بچا سکتا تو قدرتاً ہندوؤں کے ساتھ ان کا فلسفہ اور ان کے روحانی انکشافات بھی ذلت کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے کہیں کہیں ایک شاہ دارا شکوہ پیدا ہوگیا ہو ۔ لیکن مسلمانوں نے اسے مرتد سمجھا اور مسلم علما نے یہ فریب قائم رکھا کہ ہندو بت پرست اور باطل پرور اور توحید ناآشنا ہیں ۔ اور اس لحاظ سے مرتد اور ملحد سب کچھ ہیں ۔ آج انگریز بھی قائم ہیں ۔ مگر اس قوم کی بیدار مغزی دیکھئے کہ ہندو اور مسلمان اپنے مذاہب کے متعلق جو کچھ نہیں جانتا ۔ وہ یہ لوگ جانتے ہیں ۔ ہندو فلسفہ اور یوگ اور اپنشدوں پر جتنی عالمانہ تصانیف انھوں نے کی ہیں اتنی ہندوؤں نے نہیں کیں ۔ علیٰ ہذا مسلم تاریخ اور فلسفے پر بھی یورپینوں نے جتنے فاضلانہ انداز سے بحث کی ہے شاید یہ بھی کسی مسلمان نے کی ہو ۔ تمدنِ عرب ایک فرانسیسی تصنیف کا ترجمہ ہے اور میکسومہ ابھی تک ہندوستان میں پیدا نہیں ہو سکا ۔ چنانچہ وہ فاتح اور مفتوح کی بدگمانی برابر قائم رہی اور وہ ایک لازمی بات تھی ۔ مگر ہونا یہ چاہئے تھا ۔ کہ جب فاتح بھی مفتوح ہوگیا تو اسے مفتوحوں سے ہمدردی ہو اور بدگمانی کے بجائے اتحاد اور اتفاق رونما ہو ۔ اور دونوں متحد ہوکر حکمراں طاقت سے آزادی کے لئے مطالبہ کریں یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے . لیکن ہندوستان میں وہ نفسیاتی حقیقت باطل ہوئی جاتی ہے اور آج دونوں محکوم اور مظلوم اور مفلوج جماعتیں پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ نفرت اور بدگمانی کا شکار ہو رہی ہیں ۔ اگر مذہب فی الواقع جنگ و جدل ہی سکھاتا ہے تو وہ دنیا کے لئے برکت کا باعث نہیں ہو سکتا ۔ اگر خالق کا یہ منشا ہوتا کہ ہندوستان میں صرف ہندو یا صرف مسلمان رہیں تو وہ ان میں سے ایک کو فنا کر دیتا ۔ اس کے لئے یہ تو کوئی بہت مشکل بات نہ تھی مگر جب ایک ہزار سال تک اس ملک میں دونوں موجود ہیں تو خالق کا منشا کسی ایک کو فنا کرنا نہیں ، دونوں کو زندہ رکھنا ہے ۔ اور ایک دوسرے کو مٹانے کی کوشش کرنا خالق کے منشا کے خلاف علم ہے

اس لئے مذہب سے یہ فیصلہ ہٹتا ہے اور جو لوگ منافرت پھیلاتے ہیں وہ علم الٰہی سے انحراف کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص سچا اور دین دار ہے وہ غیر مذاہب کے پیرؤوں سے تو کیا ہر ایک ذی حیات سے محبت رکھتا ہے وہ ہر یک وجود میں اسی وحدت کا جلوہ دیکھتا ہے اور اس کی طبع روشن منافرت کی تاریکی کو اپنے اندر داخل نہیں ہونے دیتی۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے وہ لیڈر جو خاص حقوق اور خاص رعائیتوں اور تحفظات کے قدر دان ہیں وہ مذہب کے زیر اثر یہ عمل اختیار نہیں کرتے بلکہ ذاتی اور شخصی اعتبار سے سربرآوردگی کی ہوس تو ہر شخص میں ہوتی ہے اور جب وہ دیکھتا ہے کہ اتحاد کے حامیوں میں اس کی پرسش نہیں ہے اور اس کے برعکس افتراق کے مؤیدوں کی خوب پیٹھ ٹھونکی جاتی ہے اور انھیں منصب اور عہدے عطا ہوتے ہیں اور برگزیدوں کے طبقے میں اس کی قدر و منزلت کہیں زیادہ ہو جاتی ہے تو ایک جاہ پرست اور عروج پسند طبیعت کے لئے توازن قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے میرے لئے یہ باور کرنا محال ہے کہ خان عبد الغفار خاں یا شیخ مفتی کفایت اللہ یا حکیم اجمل خاں مرحوم کی سی برگزیدہ ہستیاں فرقہ پرست قائدوں کے مقابلے میں کم مسلمان ہیں، یا بھائی پرمانند جی، ڈاکٹر مونجے، مہاتما گاندھی اور سی راج گوپال چاری کے مقابلے میں زیادہ ہندو ہیں۔ مذہب کا یہاں مطلق سوال نہیں ہے۔ مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا۔ یہ محض حرص اور خود غرضی کا سوال ہے اور جتنی جلد ہم یہ حقیقت سمجھ لیں گے اتنی ہی جلد ہم ان نقلی رہنماؤں سے پرہیز کریں گے اور جب وقت بھی ایسا ماحول پیدا ہوگا۔ اس وقت اپنی قوم کو اپنی ذات پر قربان کرنے والوں کے لئے زندہ رہنا دشوار ہو جائے گا

مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد ہے جسے آج بھی یاد کرتا ہوں تو یہی جی چاہتا ہے کہ کاش وہ جہالت کا گذرا ہوا زمانہ پلٹ آتا، ہولی کا دن تھا۔ ہندو اہلکاروں کی ایک منظم جماعت رنگ اور پچکاریوں اور عبیر اور گلال سے مسلح ہو کر مسلمان تحصیل دار پر حملہ کرنے چلی، میں بھی اپنے والد مرحوم کے ساتھ اس جماعت کے ساتھ تھا۔ تحصیل دار صاحب بڑے دین دار بزرگ تھے روزہ نماز کے پابند۔ انھیں جیسے ان حملہ آوروں کی خبر ملی انھوں نے اپنا دیوان خانہ تو کھلا چھوڑ دیا۔ اور محل کے کمرے میں روپوش ہو کر دروازہ بند کر لیا، حملہ آوروں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ تحصیل دار صاحب بغل کے کمرے میں چھپے ہوئے ہیں۔ اب ادھر سے بار بار گذارش ہو رہی ہے کہ حضور باہر تشریف لائیں۔ ہم صرف سلام کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ کوئی حضور کے اوپر ایک قطرہ بھی رنگ نہ ڈالے گا۔ مگر حضور ہیں کہ خبر بھی نہیں ہوتے قسمیں کھائی جا رہی ہیں مگر تحصیل دار صاحب کو اعتبار ہی نہیں آتا۔ آخر محلے داروں نے ایک نئی ترکیب سوچی۔ دیوان خانے اور اس کمرے کے بیچ میں ایک پردے کی دیوار تھی جو چھت سے ڈیڑھ ڈھائی ہاتھ نیچے ہی ختم ہو گئی تھی۔ لوگوں نے ایک دمکلہ منگوایا اور اس میں رنگ بھر کر جو چھوڑا تو تحصیل دار صاحب سر سے پاؤں تک رنگ سے شرابور ہو گئے۔ اور آخر ایک انداز محبت کے ساتھ دروازہ کھول کر ہنستے ہوئے باہر نکل آئے۔ پھر تو ان کے جسم کا کوئی عضو نہ بچا، لوگوں نے داڑھی بھی رنگی، رخسارے بھی رنگے اور اس کے بعد عطر اور پان بھی پیش کیا۔ تحصیل دار صاحب ایسے خوش تھے کہ ان کا متبسم چہرہ آج ۴۵ سال کے بعد بھی میری نظر کے سامنے ہی ہے۔ اور جب میں کسی فرشتے کا خیال کرتا ہوں تو وہی نورانی صورت سامنے آجاتی ہے اور آج یہ لغویت پھیلی ہوئی ہے کہ رنگ کھیلنا کفر سے بدعت ہے اور کہیں کہیں ہولی کے زمانے میں رنگ کا چھینٹا پڑ جانے پر خون کے دریا بہ جاتے ہیں۔ اس بیداری کے زمانے سے تو وہ بے خبری کا زمانہ ہی غنیمت تھا۔ جب کہ لوگوں میں رواداری تھی۔ پاسداری تھی۔ شادی و غم میں شریک ہونے کی توفیق تھی۔ اگر مذہب ہمیں اتنا تنگ نظر بنا دیتا ہو تو میں ایسے مذہب کو دور سے سلام کروں گا۔ تو کیا تہذیبی اختلافات اس برادر کشی کے باعث ہیں۔ بے شک ہر ایک قوم اپنی تہذیب کی، اپنی کلچر کی حفاظت کرنا چاہتی ہے اور اس کا یہ مطالبہ حق بجانب ہے۔ اپنی زبان کی، رسم الخط کی، ادب کی، معاشرت کی۔ رسوم و آداب کی محبت ہر ایک باخبر انسان میں ہوتی ہے اور ہونی چاہئے۔ لیکن اس کی بھی حد ہے۔ سچی آزادی وہی ہے جو دوسروں کی آزادی کی بھی قدر کرے اگر ایک جماعت کو اپنی مسجد میں اذان دینے کا حق ہے دوسری جماعت کو اپنے گرجے میں گھنٹی بجانے کا تو تیسری جماعت کو اپنے مندر میں ناقوس بجانے کا حق کیوں نہ ہو بعض ہندو ریاستوں میں مسلم کلچر کی توہین کی جاتی ہے بعض مسلمان ریاستوں میں ہندو کلچر کی، دونوں کا ہی طرز عمل انصاف سے بعید ہے۔ ہر یک جماعت کے لیے آزادی کا ایک ہی معیار ہونا چاہئے۔ مگر یہاں آئے دن مسجدوں کے سامنے سے نکلتی ہوئی براتوں اور جلوسوں پہ حملے ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہندوؤں کی براتوں کے عوض کوئی سرکاری جلوس بینڈ بجاتا ہوا نکلے تو مسجد کے نمازی خاموشی سے نماز پڑھنے میں مصروف رہیں گے۔ لیکن ہندو باجہ حالانکہ اس کے بجانے والے

مسلمان ہوتے ہیں نماز میں مخل ہوجاتا ہے۔ اور دین داری کا جوش ابل پڑتا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ دنیا ہمت والوں کی ہے۔ اور یہاں وہی غالب آتا ہے جو اپنا اصول خوب زور سے پیش کر سکتا ہے۔ طاقتور حکومت کرتے ہیں۔ کمزور محکوم ہوتے ہیں۔ یہ اصول قانونِ قدرت ہے۔ انصاف اور مساوات وغیرہ اصول شاعروں اور اخلاقیات کے مصنفوں تک ہی محدود ہیں۔ جرمنی اور اٹلی میں آج کل یہی ذہنیت یہودیوں کو مٹانے پر تلی ہوئی ہے اور یہ ایک مسلّم اصول ہو گیا ہے کہ یورپ کی طاقتور قومیں ہی خدا کے گھر سے دنیا پر حکومت کرنے کے لئے نازل ہوئی ہیں۔ لیکن یہاں تو حکومت کوئی تیسری ہی طاقت کر رہی ہے۔ اور ایک جماعت اگر دوسری پر غالب بھی آجاوے تو بھی اسے اپنی فتح کا ثمرہ نہیں مل سکتا۔ اور اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کہ اس کی غلامی کی مدت دراز ہو جائے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ ہندوؤں کے چھوت چھات کے باعث دونوں فرقے آپس میں متحد نہیں ہو سکتے کیوں کہ جب تک دونوں ہم نوالہ اور ہم پیالہ نہ ہوں باہم خلوص کہاں اور اعتبار کہاں مگر اس خیال میں صداقت کا ایک جزو مانتے ہوئے بھی ہم اس کے قائل نہیں۔ پنجاب میں چھوت چھات کا نام نہیں۔ لباس بھی قریب قریب دونوں جماعتوں کا یکساں ہے زبان بھی ایک، رسم الخط بھی ایک، پھر بھی جتنی کشاکشی پنجاب میں ہے اتنی کسی اور صوبے میں نہیں ہے۔ اور کیا مسلمان مسلمان نہیں لڑتے یا عیسائی عیسائی نہیں لڑتے یا ہندو ہندو نہیں لڑتے ہم مذہب ہونا باہمی جنگ و جہد کو نہیں مٹا سکتا یہ خلوص اور رواداری تو سچی بیداری ہی سے پیدا ہو سکتی ہے جو مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی معیاروں اور تخیلات کو مناسب اور بے ضرر حدود کے اندر رکھ سکتی ہے۔ جب تک ہم میں یہ ذہنیت نہ زور دار ہوگی کہ مذہب سبھی منجانب خدا ہیں اور سب ہی مذاہب کو زندہ رہنے کا یکساں حق ہے۔ سب ضرورتوں اور حالات کے زیر اثر پیدا ہوئے ہیں۔ اور جب تک ان کی ضرورت رہے گی وہ زندہ رہیں گے۔ کوئی مذہب کوئی معاشرت کوئی عبادت کسی دوسرے پر فضیلت نہیں رکھتی اس وقت تک ملک میں سکون نہ ہوگا اور یہ مناقشے روز بروز زور پکڑتے جائیں گے اور ملک جہنم سے بدتر ہوتا جائے گا۔ میں ایک ہندو کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو کسی قسم کی اعانت، حفاظت، علیحدگی نہیں چاہتا وہ ہر ایک میدان میں آزادی سے مسلمانوں کے دوش بدوش چلنے کو تیار ہے وہ قوم کو متحد اور مضبوط بنانے کے لئے بسا اوقات اس حد تک دب جاتا ہے کہ اس پر بزدلی اور پست ہمتی کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے اور وہ کسی کے حقوق چھیننا نہیں چاہتا ملازمت میں، نیابت میں وہ اپنے حق سے ایک جو بھی زیادہ نہیں مانگتا۔ وہ مشترکہ نیابت کا حامی ہے مگر اس لئے نہیں کہ وہ اکثریت پاکر مسلمانوں کو ستائے، اور دبائے بلکہ اس لئے کہ اشتراکِ عمل سے قوم مضبوط ہوتی ہے۔ مگر یہ اس سے برداشت نہیں ہوتا۔ کہ ایک جماعت تاریخی، نسلی، معاشرتی، یا کسی بنا پر بھی دوسری جماعت سے تفوق اور ترجیح کی طالب ہو مساوات اور کامل مساوات کے سوا دونوں جماعتوں میں خلوص اور یک جہتی پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ کسی اسلامی مذہبی جلوس پر ہندو جماعت نے حملہ کیا ہو یا کسی مسلمان لڑکی یا عورت کی کسی ہندو کے ہاتھوں عصمت دری ہوئی ہو یا ملازمت میں مسلمانوں کے حصے پر کسی ہندو لیڈر نے اعتراض کیا ہو مگر اس کے برعکس مسلمانوں کی جانب سے اس قسم کی وارداتیں اور اعتراضات برابر ہوتے رہتے ہیں۔ ہندو اگر اعتراض کرتا ہے تو انگریزوں کے تناسب یا کثرت پر۔ مسلمانوں کی جانب سے انگریزوں پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا ان کی نگاہ ہندوؤں کے حقوق پر رہتی ہے۔ ہندوؤں کا یہ حلم خالص اور مصلحت یا تدبیر پر مبنی ہے ایسا کہنا غلط ہوگا۔ ہندو فرقوں میں کتنی ہی ایسی ذاتیں ہیں جو مذہبی جنگ و جدل سے دور رہنے کے باعث اب اس قدر پست ہمت ہوگئی ہیں۔ کہ ان میں اپنی حفاظت کرنے کی طاقت نہیں رہی اور کوئی بھی منظم جماعت چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان ہو یا عیسائی ہو یا محض مفسدوں کا گروہ ہو انھیں بڑی آسانی سے پامال اور ذلیل کر سکتا ہے۔ ہندو فرقے میں ایک بڑے حصے اور فرقے کی بے بسی اور کمزوری جس کے لئے ہندو دھرم کی سختیاں اور قیدیں ذمے دار ہیں۔ اس قسم کی بے حرمتی برداشت کرنے پر مجبور ہے اور شاید اسی کی کمزوری ہی دوسری جماعتوں کو اس پر حملہ کرنے کی تحریک کرتی ہو اور اگر آپس میں قومی اتحاد ہوتا ہے تو ہر دو فرقوں کے سربرآوردہ اصحاب کا فرض ہے کہ ان شرمناک وارداتوں کے انسداد کی کوشش کریں جب تک ہم ہر ایک معاملے کو چاہے وہ سیاسی ہو یا معاشرتی یا تمدنی قومی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادت نہ ڈالیں گے اور فرقہ وارانہ جذبات ہی ہمارے اوپر غالب رہیں گے۔ اس وقت تک اتحاد امر محال ہے۔ جب تک کسی غریب ہندو عورت کی بے حرمتی کو مسلمان لیڈر اسی غیر جانب داری کی نظر سے نہ دیکھیں گے جس سے وہ ایک غریب مسلمان عورت کی بے حرمتی کو دیکھتے ہیں اس وقت تک کانگریس اور جمعیۃ العلما کی کوششِ اتحاد کارگر نہ ہوگی۔ ہندو جماعت

سیاسی وجوہ سے مورد عتاب ہے اور تنگ نظر مسلم اصحاب اس ماحول سے فائدہ اٹھا کر اسلامی حقوق کی حمایت کے پردے میں ذاتی اغراض کی تکمیل پوری کرنے میں دریغ نہیں کر رہے ہیں۔ ذاتی وقار اور منفعت کے اعتبار سے تو ان کا یہ فعل سراسر حق بجانب ہے۔ لیکن قومی اعتبار سے اس طرز عمل کی کافی مذمت کی جا سکتی ہے کیونکہ یہ ہندوستان کی مستقبل حکومت کا ضامن ہو رہا ہے۔

کشمیر اور الور میں مسلمانوں پر بیجا سختیاں ہو رہی تھیں اسلامی ریاستیں ہی نہیں بلکہ یہ تو ہر ایک ریاست کا دستور ہے۔ عام رعایا پر ہر طرح کے مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ مسلم لیڈروں نے قابل تعریف حمیت قومی سے کام لے کر رعایا کو ان ریاستوں کے مظالم سے بچایا۔ سیاسی بیداری کے معنی یہی ہیں۔ کہ حریت استبداد کے قلعوں کو توڑ دے۔ فرقہ پرست ہندو لیڈروں کے سوا اور سب نے مسلمانوں کی اس جدوجہد کو احترام کی نظر سے دیکھا، ہاں اس کی شکایت ضرور رہی کہ اس کش مکش میں ہندو رعایا کی اقلیت گیہوں کے گھن کی طرح پس گئی۔ وہی کام اگر کمیونل اصول سے عام رعایا کے اعتبار سے ہوتا تو کسی کو شکایت کا موقع نہ رہتا۔ مگر یہ ہندوستان کی بدنصیبی ہے کہ یہاں ایک مقتدر جماعت ہر ایک مسئلے پر کمیونل پہلو ہی سے نگاہ ڈالتی ہے اور عام رعایا کے فلاح سے اسے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہاں بھی اس کی نظر تعلیم یافتہ طبقے تک ہی محدود رہتی ہے۔ نیچے طبقے کے انسان کس بری طرح پامال ہو رہے ہیں، اِدھر اس کی ہوا تک بھی آنکھیں نہیں اٹھتیں۔ کاشتکاروں اور مزدوروں میں بھی ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل ہیں۔ لیکن ان کی حمایت میں کوئی مسلم آواز نہیں اٹھتی۔ افلاس اور بیکاری اور تجارتی کساد بازاری اور سیاسی بے عنوانیوں کے ہاتھوں دونوں ہی جماعتیں یکساں پریشان ہیں۔ مگر ان امور پر فریاد کرنے کا بار غیر مسلم طبقے ہی پر ہے مسلمانوں کی یہ بے حسی بڑی حد تک تاریخی اسباب پر مبنی ہے۔ اگر ان میں یہ سیاسی جذبہ نہ آ جاتا تو ہندوستان پر دوسروں کا اقتدار ہی کیوں ہوتا، منصب اور وقار کا لالچ اور رسوخ اور حکام پرستی کے جنوں کا بھی تاریخ ہی سے تعلق ہے۔ آج حیدرآباد دکن اور دوسری اسلامی ریاستوں میں..... زیادہ تر عہدے مسلمانوں کے ہاتھوں ہی میں ہیں۔ شاہی زمانے میں بھی یہ ہی دستور تھا، وہ ہندو ذاتیں جو اس زمانے میں برسر اقتدار تھیں۔ مثلاً کشمیری اور کایستھ اصحاب ان میں بھی وہی تمکنت اور امارت کی بو سرایت کر گئی چنانچہ ایک آدمی کسی عہدے پر پہنچ جاتا تھا تو دور نزدیک کے مفت خورے، کاہل، نکمے رشتہ دار آ کر گھیر لیتے تھے اور اس کے بل پر زندگیاں پار کر دیتے تھے۔ اسی طرح عوام میں خوشامد سہل پسندی اور منعم پرستی کی عادت پڑ گئی اور رفتہ رفتہ یہی ان کی جبلت ہو گئی مگر اب اس زمانے میں وہ اقتدار و منصب کہاں، جہاں مسلمان ۹۰ فیصدی تھے وہاں اب انہیں ۳۰ فیصدی جگہیں بھی مشکل سے ملتی ہیں۔ اب تو تعداد شماری ہوتی ہے اور اس کے اعتبار سے نیابت اور ملازمت میں حصے ملتے ہیں سہل پسندی کے باعث ان سے مقابلے کی صلاحیت بھی غائب ہو گئی اور ذہنی انحطاط پیدا ہونے لگا۔ چنانچہ مسلم نوجوان آج بھی مقابلے سے گھبراتے ہیں اور تحابے کے دامن میں چھپ کر اپنی عافیت پسندی کا ثبوت دیتے ہیں مناسب یہ تھا اور دانشمندی اور دور بینی اس میں تھی کہ وہ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز کا ثبوت دیتے۔ اور بدلے ہوئے حالات روزگار سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرتے مگر وہ آج بھی اسی دور قدیم کے خواب دیکھ رہے ہیں اور اپنے کیرکٹر میں اس خامی کے باعث ملک کو تباہی کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ جو کچھ ذہنی استحکام سے حاصل کر سکتے تھے۔ وہ ایسے خوشامد اور تفرقات کی تحریک اور دیگر قابل اعتراض طریقوں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہیں یہ نعرے لگائے جاتے ہیں کہ ہم ہندوستان کے دربان ہیں کہیں یہ کہ ہم فرمانروایان قدیم کے نام لیوا ہیں کہیں کچھ اور مہمل صدائیں بلند کی جاتی ہیں اور اپنے وقار اور سطوت اور اولوالعزمی کا سکہ جمانے کے لئے عوام کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے سے بھی پرہیز نہیں کیا جاتا اور عوام تو عوام ہیں بھیڑوں کو جس طرف چاہے ہانک لے جاؤ، کسی کا ذرا بھی خیال نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا میری تحریر سے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ میں بھی ہندو ہوں اور فطرتاً ہندوؤں کی جانب داری کر رہا ہوں مجھے ہندو ہونے سے تو انکار نہیں ہے اور بہت ممکن ہے کہ ہندو ہونے کے باعث میں نے مسلمان بھائیوں کے ساتھ کچھ بے انصافی کی ہو لیکن میرا خیال ہے۔ میں متعصب ہندو نہیں ہوں اور جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ صداقت کے اظہار کے خیال ہی سے لکھا ہے۔ اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ ہم اپنے خیالات اور شکایتیں صاف صاف لکھیں اور ٹھنڈے دل سے ان پر بحث کر کے صورت حال میں اصلاح کر سکیں۔ خاموشی بعض حالتوں میں تریاق ہے تو اکثر حالتوں میں زہر قاتل ہے ہندوؤں کی قوم پرستی کا بین ثبوت کانگریس ہے جس نے فرقہ وارانہ معاملات کو ہمیشہ پس پشت ڈالنے کی کوشش کی ہے اور ہر ایک

مسئلے کو قومی پہلو ہی سے دیکھا ہے۔ اور یہ اس کی صداقت ہی ہے جس نے بیدار مغز مسلمانوں کو اس میں شریک کر دیا ہے۔ ہندو سبھا جیسی جماعت کو اس کے مقابلے میں فروغ حاصل نہیں ہوا۔ یہ ہندوؤں کی قوم پرستی کی دلیل ہے۔ لیکن جب فرقہ وارانہ رائیں اس قدر تند ہو جاتی ہیں کہ کانگریس کو اپنی جان بچانی مشکل ہو جاتی ہے تمام ہندوؤں کی ہمدردی اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور وہ ایک مفلوج جماعت بن کر رہ جاتی ہے۔ میں کتنے ہی ایسے قوم پرور ہندوؤں کو جانتا ہوں جو فیروز آباد کے حادثے سے بے حد متاثر ہوئے ہیں اور ہندوستان کی نجات کی طرف سے اب ان میں انہیں پوری مایوسی ہو گئی ہے۔ میں اسلامی اخوت اور مساوات کا معتقد ہوں اور ہندو تہذیب پر اسلامی تہذیب کا جو اثر ہوا اسے بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ مرا اعتقاد ہے کہ ہندوستان میں دونوں تہذیبیں پہلو بہ پہلو رہ کر ہی ترقی کر سکتی ہیں اور روز بروز اس میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ کانگریس کے اثر سے بہت سی بے معنی بندشیں ٹوٹ چکی ہیں اور آئندہ بھی ٹوٹتی جائیں گی۔ فطری رفتار قائم رہنے دی جائے مگر اس کے ساتھ میرا یہ بھی ایمان ہے کہ اتحاد خالص مساوات کے سوا اور کسی طرح ممکن نہیں۔ جب تک کسی طرف سے خاص حقوق کے مطالبے ہوتے رہیں گے اس وقت تک یہ کشمکش جاری رہے گی اب تمام امید قوم کے نوجوانوں سے ہے۔ انھیں کے ہاتھ میں قوم کی کشتی ہے اگر انھوں نے نئی روشنی اور نئی تہذیب اور سیاسیات کے زریں اصول کی پابندی کی اور مذہب کو اس کے صحیح معنوں میں سمجھا۔ تب تو مستقبل روشن ہوگا۔ ورنہ ایک دن وہ آئے گا کہ دونوں جماعتیں لڑ لڑ کر مر جائیں گی اس لیے کہ ایک میں بھی اتنی طاقت نہیں ہے کہ دوسری کو فنا کر کے خود زندہ رہے

رُباعیات

تقدیر کے لکھّے کو مٹانے والے　　گستاخ ہیں کتنے گڑگڑانے والے
خالق پہ ہے ایک اعتراضِ پنہاں　　کہتے ہیں جسے "دُعا" زمانے والے

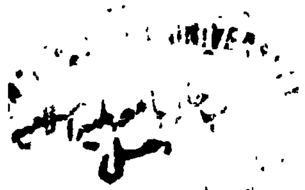
گُل پر ہیں نقوشِ دستِ باری اب تک　　جُنباں ہے دلِ بادِ بہاری اب تک
انساں کی پیمبری کا دَر ہے مسدود　　قدرت کی پیمبری ہے جاری اب تک

دُنیا معلوم، فکرِ دنیا معلوم　　عُقبیٰ معلوم، خوفِ عقبیٰ معلوم
پی بادہ کہ "حشر و نشر و میزانِ عمل"　　اِن سب سے میں واقف ہوں، تجھے کیا معلوم

انساں پہ ہے کس درجہ خرافات کا بار　　دن کا ہے کبھی وزن، کبھی رات کا بار
پیدا ہو بشر میں کیا حکیمانہ مزاج　　عقلوں پہ ہے صدیوں کے روایات کا بار

(جوش ملیح آبادی)

نیا شوالہ



ایک انسان اور مخصوص ایک عورت کی زندگی میں وہ وقت بھی آجاتا ہے جب قہرمانِ محبت اس کے دل کو مٹھی میں لے کر اس طرح دباتا ہے جیسے چڑیا پکڑ لی جائے اور وہ پھڑ پھڑا بھی نہ سکے۔ کامدیو کے روپ کی کرنیں اس عورت کی نگاہوں کو اس طرح چوندھیا دیتی ہیں کہ وہ اس مرد کی صورت کے عیب بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہتی؛ وہ بس ایک دیوتا معلوم ہوتا ہے جو تمام مردوں میں سربلند نظر آتا ہے۔

رکمنی بالا دیوی سرکار، اس قسم کے جذبے سے اُس وقت دوچار ہوئی جب اس کی عمر کم و بیش تیس سال کی تھی۔ اس کی حالت ایک ایسے شخص کی سی ہو گئی جس کے پاؤں تلے سے دریا کی مٹی کھسک جاتی اور پانی کا بہاؤ اسے چاروں خانے چت کر کے موجوں کا کھلونا بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے اس جذبے کی حیرت آفرینیوں میں گم تھی۔

جس کے متعلق تمام جاننے والے فیصلہ کر چکے تھے کہ اب وہ اپنی عمر کنوارپنے ہی میں گذارے گی۔ اس کا کسی ایسے شخص کی محبت میں دیوانہ وار مبتلا ہو جانا جسے وہ چند مہینوں کی مختصر مدت سے جانتی ہو، نہ صرف اوروں کے لئے بلکہ خود اُس کے لئے بھی قابلِ قبول بات نہ تھی۔ اور اس سے زیادہ دشوار یہ یقین تھا کہ وہ شخص اسی ولولہ و جوشِ محبت سے اس کی محبت کا جواب دے سکتا ہے۔ مگر رکمنی بالا اپنے جذبے کی شدت میں اس بات کا خیال بھی نہ کر سکی تھی گویا اس کی نظر میں یہ بات ایک فطری بات تھی۔

رکمنی سرکار کی سوانحِ حیات سے واقف ہو کر آپ خود کہنے لگیں گے کہ اس میں خود بینی کا تو شائبہ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسے پورا احساس تھا کہ وہ حسین نہ تھی، ہاں وہ مرگ نین ضرور تھی، اس کے علاوہ سڈول اور گداز بدن، جو رکمنی کو کمال کی حد تک حاصل تھا، حسن میں شمار کیا جا سکتا تھا لیکن بہرحال اس کا مدار تندرستی پر ہوتا ہے اور چونکہ وہ ہوش سنبھالتے ہی آفتوں اور مصیبتوں کا شکار ہو گئی تھی اس لئے آغازِ شباب کی لطافت و تازگی باقی نہ رہی تھی۔ بہرحال وہ یقین کر بیٹھی تھی کہ جو شخص اس کو محض اس کی ذات کے لئے چاہتا ہے ــــــ اس کی روح سے محبت کرتا ہے!

آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اس خیال سے مستحکم ہو جانا رکمنی کی نظر و خیال کے سامنے پریم نگر کی کیا کچھ چمن بندیاں پیش کر دی ہوں گی۔ وہ اپنی آئندہ زندگی کی فردوس نگاریوں میں کھو گئی تھی۔

رکمنی کی داستانِ زندگی بھی غیر معمولی تھی: چودہ سال کی عمر میں فالج نے اس کا ایک پاؤں بیکار کر دیا تھا؛ ورنہ وہ اپنی معذوری سے ہمیشہ صدمے کا احساس کرتی تھی، اس کا اندازہ ایک ایسی ہی لڑکی کو ہو سکتا ہے جو اپنے اندر رکمنی کی طرح زندگی کی طلب بھی رکھتی ہو ــــ اس چیز کی آرزومند ہو جو ایک نوجوان لڑکی کی زندگی کو پوری طرح مسرور و خنداں بنا دیتی ہے غرض رکمنی کی حالت اور اس کی آرزوئے شباب فطرت کی ستم ظریفی کا ایک شہ پارہ تھی۔

وہ اپنی ہم عمر اور ہم جماعت لڑکیوں کی طرح نہ تو اچھے کپڑے پہن سکتی تھی اور نہ اُن کے ساتھ کھیلوں اور جلسوں میں شریک ہو سکتی تھی۔ وہ ایک غریب اور یتیم لڑکی تھی۔ اس کے باپ نے معمولی پنشن کے باوجود رکمنی کو انٹرنس پاس کرا دیا تھا، اور جب اس کو ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے ڈھاکے سے کلکتے بھیجنے کی فکر کر رہا تھا، موت نے آ لیا۔ اور رکمنی اس دنیائے غرض و ہوس کے اندر یکہ و تنہا رہ گئی۔

کلکتے میں اس کا ایک دور کے رشتے کا ماموں رہتا تھا، مگر وہ بھی آسودہ حال نہ تھا۔ لیکن شاید اس کی غریبی ہی رکمنی کی سرپرستی قبول کر لینے کا سبب بن گئی ورنہ اگر وہ دولت مند ہوتا تو دور کے رشتہ کی بھانجی تو درکنار سگی بھانجی کے مسترد ہو جانے کا بھی غالب امکان تھا۔ غرض رکمنی نے جو خط اسے لکھا اس کا پر واز بتاتا تھا کہ وہ اس کو نہ صرف اپنا حقیقی ماموں سمجھتی ہے بلکہ اس سے بہتر دنیا میں کوئی ماموں ہو ہی نہ سکتا تھا۔

آپ نے سنا ہو گا کہ خوشامد سے خدا بھی خوش ہوتا ہے لیکن ذرا تامل و تفکر سے کام لیجئے گا تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ اس لفظ "خوشامد" کو نہایت غلط معنے میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ انسان اگر اپنی خوبیوں کو سنکر خوش ہوئے

تو لتعرّض ہونا چاہئے۔ لیکن یہ ظالم و جاہل تو ان باتوں کو اپنی ذات سے منسوب سنکر خوش ہولیتا ہے جن کو وہ بدرجۂ یقین جانتا ہے کہ اس میں موجود نہیں۔ اس لئے میں انسان کو خوشامد پسند ہونے کے عوض "فریبی" کہنا زیادہ موزوں سمجھتا ہوں کہ یہ سورکھ سب سے بڑا فریب خود اپنے آپ کو دیتا ہے اور ایسا کامیاب فریب دیتا ہے کہ اپنے متعلق جھوٹی باتوں کو بھی سچ سمجھ لیتا ہے۔

الحاصل رکمنی کے خط نے ماموں کو پرتیت لیا اور وہ کلکتے پہنچ گئی۔ وہ زمانے کی اونچ نیچ دیکھے تھا۔ جب یہ پہنچی تو اس نے ایک روز کہا:۔

"رکمنی ایک رشتہ دار کا جو فرض ہے میں اسے ادا کروں گا۔ اور تم سے جو ہو سکے کام کاج میں اپنی بوڑھی مامی کا ہاتھ بٹانا۔ کیونکہ ہم سے لوگ اگر روٹی کھانا چاہتے ہیں تو پھر دوسری حماقتوں کے لئے وقت نہیں نکل سکتا۔"

اس کی ممانی نے کہا کہ کہاری جو آتی ہے اسے الگ کر دیا جائے۔ دو روپے مہینا بچے گا۔ جھاڑو بہارو رکمنی کر لیا کرے گی۔ مگر رکمنی نے ان کو بتلایا کہ

"مامی! کام کاج کے لئے مجھے ذرا بھی عذر نہ ہوگا، لیکن ایک تو مجھ سے کچھ ہو نہ سکے گا اور دوسرے میں پڑھنا بھی چاہتی ہوں۔ اس لئے نوکرانی کو جواب نہ دیجئے۔ اس کی تنخواہ میں دیدیا کروں گی۔ میرے کھانے پینے کا بوجھ بھی آپ پہ نہ پڑے گا۔ باپو نے کچھ روپیہ بنک میں چھوڑا ہے، سو روپے سال وہاں سے ملتے ہیں، وہ سب میں آپ کو دیدیا کروں گی۔ اب آپ ہی میرے ماتا پتا ہیں۔ میں پڑھائی کے خرچ کے لئے کہیں "ٹیوشن" کر لوں گی۔"

ماموں ممانی کے دونوں کے تو کنول کھل گئے۔ انھیں یہ امید کب تھی؟ دونوں نے اس کو پیار کیا، کلیجے سے لگایا اور اس کے پڑھنے کے شوق کی بہت تعریف کی۔

رکمنی کی صبح زندگی یعنے سولھویں سال میں ایک عجیب ترین واقعہ رونما ہوا، اس معجزنما واقعے نے اس کی تاریک زندگی میں نور کی وہ شعاعیں پھیلا دیں جن کے خیال سے بعد کی زندگی میں بھی اس کی آنکھیں چمک جاتی تھیں۔

ابھی اسے کلکتے آئے ہوئے زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ وآئی ڈبلیو سی۔ اے میں ایک نامور و مشہور ڈاکٹر کا لکچر ہوا۔ اور یہ بھی ایک ہمسایہ لڑکی کے ساتھ وہاں گئی۔ تقریر کا موضوع "زنانہ حفظانِ صحت" تھا۔ ہرچند رکمنی کی نظر میں بحث نہایت غیر اہم تھا — کہ اس کا مفلوج پاؤں جسمانی صحت کی تمام صورتوں کو مایوس کر چکا تھا۔

مقرر نے ایک موقع پر کہا کہ:۔

"ہر عورت پر شکر واجب ہے کہ قدرت نے اس کو ایسا خوبصورت بدن عطا کیا ہے۔ اس بخشش و اکرام کے ساتھ تم پر یہ فرض خود بخود عائد ہو جاتا ہے کہ تم اپنے بدن کی نگہداشت و حفاظت کرو۔"

تقریر کے دوران میں مقرر کے بعض اشاروں اور فقروں نے رکمنی کے احساس قلب کو کافی سے زیادہ متاثر و المناک بنا دیا تھا۔ لیکن ان الفاظ کو سنکر تو وہ بے قابو ہو گئی اور ضبط نہ کر سکی۔ وہ زار زار رونے لگی۔ سارا مجمع اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس کی یہ حالت اضطرار اتنی شدید تھی کہ شاید رکمنی اپنی جان دیگر بھی قابو یافتہ نہ رہ سکتی تھی۔ اس کا دل دکھا ہوا تھا، اور احساس محرومی کا دریا نہ معلوم کب سے ضبط کے بند کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ بے حال ہو گئی۔ اور ایک دوسرے کمرے میں پہنچا دی گئی۔

"مجھ پر کس بات کا شکر واجب ہے؟ اس نے جذبات کی طوفانی حالت میں کہا۔ "میں بدرنگ ہوں، اپاہج ہوں، بیکس ہوں، لوگوں کے رحم یا نفرت کا موضوع ہوں —— ایسا رحم جو نفرت سے بدتر ہے! میں خدا کی مخلوق ہی نہیں؛ میں تو ہر شئے کے نعم البدل سے محروم رکھی گئی ہوں —— پھر شکریہ کس بات کا؟"

"تم پر تو شکریہ بدرجۂ اولےٰ واجب ہے: تمہاری اس ذکاوت حس کا سبب تمہارا ذہن ہے، اور ذہنی ذکاوت ہر بات کا نعم البدل ہے! قدرت کا یہ مطالبہ ہے کہ اس وسیع نظام میں تم اپنے ذہن و ذکاوت سے اس کی خدمت کرو!" ایک گہری اور سنجیدہ آواز رکمنی کے کانوں میں پہنچی۔ یہ اس مقرر ڈاکٹر کی آواز تھی۔

رکمنی نے نگاہیں اوپر کیں تو مشہور و معروف ڈاکٹر چیٹرجی کو اپنے برابر کھڑے دیکھا۔ اور اس کی روشن آنکھوں کی ڈوب جانے والی نگاہوں کو اپنے اوپر جما ہوا پایا۔ چیٹرجی ایک معمر شخص تھا۔ لیکن اس بوڑھے ڈاکٹر کی آنکھوں میں رکمنی نے جو کشش محسوس کی، وہ اس نے ساری عمر میں کسی دوسرے آدمی کے اندر نہ دیکھی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا، اور محض اس کی سیرت کی مخفی قوتوں سے رکمنی کی تسکین و تشفی ہونے لگی۔

پھر ڈاکٹر چیٹرجی نے اس کی بیماری کے متعلق مختلف سوال کئے۔ اور دوسرے دن اس کو اسپتال میں بلا کر نہایت دقتِ نظر سے اس کا معائنہ کیا

جب خوب دیکھ بھال چکا تو اس نے کہا کہ اگرچہ نہایت خفیف مگر امید باقی ضرور ہے، اور امکان ہے کہ رکمنی اپنی بیساکھی کو سلام کر سکے۔

رکمنی اسپتال میں داخل ہو گئی اور چیٹرجی نے کمال ہمدردی و دلسوزی کے ساتھ علاج کیا: قیمتی دوائیں جو اسپتال سے نہ مل سکتی تھیں خود اپنے پاس سے منگاتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک روز رکمنی ہنستی ہوئی اسپتال سے رخصت ہوئی اور اپنی بیساکھی کو وہیں چھوڑ دیا۔ اس روز رکمنی کی مسرت اور احساس احسان مندی کا اندازہ دنیا کے کسی پیمانے سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ڈاکٹر چیٹرجی ایک وقف کمیٹی کا صدر بھی تھا۔ اس نے کمیٹی کے فنڈ سے رکمنی کے لئے وظیفہ مقرر کرا دیا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ گانے کا علم حاصل کرے۔ کیونکہ رکمنی کی آواز کی گھلاوٹ اور اس کا سوز ڈاکٹر کی نظر میں فطرت کا مخصوص عطیہ تھا

اب ڈاکٹر چیٹرجی رکمنی کا صرف بہترین دوست ہی نہ تھا بلکہ کسی جنم کا نہایت شفیق باپ بھی تھا۔ وہ اسے دادا کہنے لگی تھی۔ اور وہ اکثر و بیشتر اپنے مصروف اوقات میں دو ایک گھنٹے نکال کر رکمنی کے پاس صرف کیا کرتا تھا۔ اس کی ان صحبتوں نے رکمنی کی طبیعت کے رقت و ترحم کو حکیمانہ سانچے میں ڈھال دیا اور معاشری و اخلاقی تعصبات کو بالکل ہی مٹا دیا۔ ایک روز جب چیٹرجی اس سے ملنے آئے تو رکمنی نے سوال کیا:-

"دادا، آپ نے اخبار میں دیکھا ہو گا کہ آرتی اور نماز کے جھگڑے میں آگرہ میں کئی آدمی قتل ہو گئے ہیں؟"

"ہاں بیٹی، میں نے پڑھا اور اپنی اوقات پہ ہزار ہزار لعنتیں کیں۔ کہ ایسے غیر انسانی ملک میں، ایسے ادھری ملک میں، پیدا ہوا اور جی بھی رہا ہوں۔ یہ کام حیوانوں کا ہے یا ان انسانوں کا جن کا کوئی دھرم نہیں ہے۔"

"مگر دادا، میری تو سمجھ میں نہیں آ سکا کہ کوئی خدا یا پرمیشور اپنی نماز یا پوجا میں دو چار منٹ کی دیر سویر ہو جانے سے خفا ہو سکتا ہے، اور اس کے ماننے والوں کا فرض انسانی خون بہا کر اس کو خوش کرنے ہی سے ادا ہو سکتا ہے!"

"رکمنی، تم انسانوں کی باتیں کر رہی ہو اس بد قسمت ملک میں تو درندوں سے بھی بدتر کوئی مخلوق بستی ہے۔ کیونکہ درندے کا گزند پہنچا دینا دنیا جانتی ہے لیکن یہ انسان درندے کس وقت بپھر جائیں کوئی نہیں جانتا۔ "جیو رکھشک"

ہیں اور "منش ہتیا" کر کے شدہ ہندو بنتے ہیں، "میرے بندوں کے دل میں گھر کر گئے تو میری جنتوں میں داخل ہو گئے" کی تلاوت کرتے اور دل آزاری کر کے طاہر مسلمان بنتے ہیں۔" ڈاکٹر نے گہرے محسوسات کرب کے ساتھ کہا۔

"پردادا، مقامی حکام بھی تو ان قضیوں کو بآسانی رفع کر سکتے ہیں؟" رکمنی نے پھر کہا۔

"بیٹی یہ اس کا سیاسی پہلو ہے، میں اس سوال کو مذہب و اخلاق کے اندر حل کرنا چاہتا ہوں، ہر چند وہ ختم سیاست ہی پر ہوتا ہے۔ ہم میں سے مذہب کی روح غائب ہو گئی اور صرف ڈھانچے کی پوجا ہو رہی ہے، اسی لئے مذہبی اقدار باقی نہیں رہیں۔ قصور کسی ایک کا نہیں دونوں ہی ملزم ہیں، لیکن میں ہندو ہوں اس لئے انھیں کو الزام دوں گا۔ ہندو دھرم پرم آتما اور اہنسا کی تعلیم دیتا ہے پھر کتنی بڑی جرأت کی بات ہے کہ ایک دھارمک ہندو کسی انسان کو نقصان پہنچائے! اس کی علت یہی ہے کہ بھگوان کی پوجا نہیں کی جاتی بلکہ قصے کہانیوں اور طور طریق یعنی پنڈت پروہتوں کی پوجا ہوتی ہے۔ ہمارے دیس میں لاکھوں پنڈت نکھٹو اور بیکار کر کے چھوڑ دیئے گئے ہیں اور وہ اپنے پالن کے لئے ڈھونگ گانٹھنے پر مجبور ہیں؛ اس لئے وہ غیروں یا مسلمانوں کو کچھ کہتے اور نفرت کی آگ بھڑکاتے ہیں۔"

"مگر ان جھگڑوں میں تو لالہ اور بابوؤں کے نام دیکھنے میں آتے ہیں۔" رکمنی نے دخل دیا۔

"ہاں بیٹا یہ ٹھیک ہے، یہ لالہ بابو، یہ خود فروش تیسرے درجے کے نیتا بھی تو پروہت ہی ہیں۔ ایسا پروہت بننے کے لئے وید اور شاستروں کا جاننا ضروری نہیں بلکہ دو چار الٹی سیدھی تقریریں یا ایک سڑا سا اخبار نکال کر سرٹیفکٹ مل جاتا ہے۔ زمانے کے ساتھ نام بدل گیا ہے کام وہی ہے۔ میرا خون تو اس وقت کھولنے لگتا ہے جب انھیں نیتاؤں کو یہ کہتے سنتا ہوں کہ "بھس میں چنگاری تو جمالو ڈالتی ہے" ——— بدبخت سمجھتے ہیں اور لڑوا دیتے ہیں"

"تو دادا، یہ بڑے بڑے نیتا کیا اتنا بھی نہیں سمجھتے؟"

"بیٹی سمجھتے سب ہیں مگر سچ کہنے کی ہمت نہیں کر سکتے ورنہ ان کا بڑا پن باقی نہیں رہ سکتا۔ وہ بھی مصلحتوں کے نیتا ہیں۔ ورنہ اگر یہ چھوٹے موٹے نیتا اور اخبار نویس ان کی برائی کریں تو جاتی کب مانے گی۔ اور جب جاتی ساتھ نہیں تو حکومت بھی نہ پوچھے گی۔ پھر ساری بڑائی غائب! میرے خیال میں

اس زمین پر تو ایک ہی سچا نیتا پیدا ہوا اور وہ اکبر بادشاہ تھا اس نے سچے دل سے چاہا تھا کہ ہندوستان میں ایک قومیت قائم ہو جائے۔ مگر ہمارا ملک ہمیشہ سے بدنصیب ہے۔ اکبر مہاراجہ کا مشن اس کے شاہی خاندان سے باہر تو مقبول ہوا، لیکن دکن کے بادشاہوں نے اُسے پورا کرنا شروع کیا تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں نے آپ کو ہندوستانی سمجھ لیا تھا اور ہندوؤں نے ان کو ہندوستانی مان لیا تھا۔ آپس میں شادی بیاہ معمولی بات ہو گئی تھی، مگر اورنگ زیب کی ملک گیری کی ہوس کا برا ہو کہ دکنی حکومتیں مٹ گئیں اور ہندوستانی قومیت کا ارادہ بھی ان کے ساتھ فنا ہو گیا۔ اس آخر زمانے میں کشب چندر سین اور رام موہن رائے کو بھی کوئی سچا جانشین نہ ملا کہ ہندو جاتی تو ایک ہو جاتی۔

"کاش وہ زمانہ پھر پلٹ آئے اور ایک سچا نیتا پیدا ہو کر ہندوستان کو ایک جاتی بنا دے، کہ بھارت میں پھر پریم کی مرلی بجنے لگے۔"

"میری تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کی بدنصیبیاں بہت پرانی ہیں۔ مسلمانوں کے وجود میں آنے سے بہت پہلے، چندر گپت نے سکندر سے اپنے بھائیوں کے خلاف ساز باز کر لی تھی۔ اور اس کی نحوست سے اس کی معنوی اولاد اب تک تڑپ رہی ہے۔ یہ خطابوں کے بھوکے نوکریوں کے غلام تنخواہوں کے بھکاری، چندر گپت ہی کی اولاد ہیں ـــــ اور یہ ہمارے نیتا ہیں!"

یہ تھا وہ پرواز تعلیم جس کے اثر میں رکمنی کے دماغ نے تربیت پائی اور جس نے اس کو بالغ نظر اور وسیع الخیال بنا دیا تھا۔

اسپتال چھوڑنے کے تین سال کے اندر بوڑھے کلاونت، پروفیسر کملاپت نے رکمنی کی خوش گلوئی سے خوش اور اس کے حال و شوق سے متاثر ہو کر اپنا فن اس کو گھول کر پلا دیا۔ بیس سال کی عمر میں رکمنی بالا دیوی ایک مشہور مغنیہ تھی اور اتنی ہی معزز بھی۔ گھنٹے آدھ گھنٹے کی نشست اور سیکڑوں روپے فیس! ریکارڈ، ریڈیو اور ٹاکی میں دو چار گانے اور ہزاروں روپے معاوضہ! مختصر یہ کہ چھبیس سال کی عمر میں رکمنی دیوی لاکھوں میں کھیل رہی تھی۔
ماموں اور ممانی گھر کے مالک تھے اور کبھی اس گھڑی کو نہ بھولے جب یہ لکشمی ان کے تنگ و تاریک گھر میں داخل ہوئی تھی۔

رکمنی کے ہاتھ میں جس روز اس کی پہلی آمدنی کے روپے آئے اس کے سارے جسم میں ایک سنسناہٹ اور آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک تھی۔ اس وقت اس نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اپنی ضروریات کے سوا ساری آمدنی اپاہج اور مصیبت زدہ لڑکیوں کی خبر گیری میں صرف کرے گی۔ چنانچہ اول اول تو وہ ہفتے میں دو بار زنانہ اسپتال جا کر مریضوں سے اچھی اچھی باتیں کرتی، ان کی بپتائیں سنتی اور انھیں دیتی، ان کی دوائیں اور راحت و آرام کی دوسری چیزیں مہیا کرتی رہتی۔ لیکن جب اس کی آمدنی بڑھی اور کافی سرمایہ جمع ہو گیا تو چٹرجی کے مشورے سے اسی اسپتال میں ایک زنانہ وارڈ کی تعمیر شروع کرا دی جس کا نام "رکمنی وارڈ" رکھا گیا۔ چٹرجی اس کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے صدر مقرر کئے گئے۔ اس کے پاس جتنا وقت بچتا وہ وارڈ کی نگرانی اور مصروفیت میں صرف کرتی تھی۔ ڈاکٹر چٹرجی کے توسط سے رکمنی کی ملاقات ڈاکٹر اشرف جمالی سے ہوئی اور بالآخر وہی اس وارڈ کا انچارج قرار پایا۔

"اشرف جمالی خود اپنا مطب کرتا تھا اور کلکتے کے چند نہایت مقبول اور کامیاب ڈاکٹروں میں سے تھا۔ اس نے اسپتال کو اپنے اہتمام میں کسی معاوضے کے بغیر لے لیا اور اپنا نصف وقت اس کے لئے وقف کر دیا تھا۔

الغرض رکمنی کی شدت ابتلا کے زمانے کے نازک ترین محسوسات ایک ایک کر کے، اس طرح پورے ہو رہے تھے جیسے سچے خوابوں کی تعبیر جوں کی توں نکلتی ہے۔ رکمنی وارڈ جب بن کر مکمل ہوا تو وہ پورے تیس سال کی ہو چکی تھی۔ اب اس کا حلقۂ تعارف وسیع تھا، اور کسی ایسی ہی صحبت میں اسے جوتیش کمار بوس سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ ایک دلکش جوان اور شائستہ انسان اور ایک بیرسٹر تھا۔ ان کی یہ ملاقات بہت جلد دوستی اور پھر محبت میں تبدیل ہو گئی۔

اب گویا رکمنی کے پر لگ گئے تھے اور وہ ہوا میں اڑ رہی تھی۔ جوتیش کی غلافی آنکھوں کی ایک نگاہ اس کو مستقل سنسنی بنا جاتی تھی، اس کے مونہہ کا ایک لفظ اس کے خون کی تھرتھراہٹ بجا تا تھا، اور اس کی انگلیوں کا ہلکا سا مس ہی اس کے ریشے ریشے کو کپکپا دیتا تھا۔
اور جس روز جوتیش نے اس کو شادی کا پیغام دیا تو وہ محسوس کرنے لگی

کہ درختوں پر چہچہاتی ہوئی چڑیاں دفعتاً خاموش ہوگئی ہیں، تاکہ وہ رکمنی کے دل کی دھڑکن کا ترانہ سن سکیں۔ ہوا چلتے چلتے رُک گئی ہے، تاکہ وہ رکمنی کے سانسوں کی موسیقیت کو سن سکے اور دنیا گھومتے گھومتے ٹھہر گئی ہے، تاکہ وہ رکمنی کو اپنے ساتھ لے لے! غرض رکمنی اپنے جذبات اور محسوسات کی گلزمین تا نیرنگیوں انجمین آسمان کی رعنائیوں میں گم ہوگئی تھی۔

ایک دن جوتیش آیا اور دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ رکمنی نے اس کو متبسم نہ دیکھا۔

"آج کیا بات ہے جوتیش؟ پورے پانچ منٹ ہوگئے، تمہارے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔" رکمنی نے سوال کیا۔

"رکو، میں تمہیں خیال کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں۔ تم سیاہ ساری نہ پہنا کرو،" اس نے بھی جواباً مسکرا کر کہا۔

"میں امید کرتی ہوں کہ تم مجھے ایک "فیشن ایبل" بیوی دیکھنا نہ چاہو گے" رکمنی ہنس دی اور کہنے لگی:۔

"مجھے لباس آرائی کی بالکل پروا نہیں، میری دلچسپی سنجیدہ باتوں میں ہے اور سیاہ رنگ تو مجھے مرغوب بھی ہے۔ ڈاکٹر جمالی کا خیال کہ یہ رنگ مجھ پر خوب کھلتا ہے۔

"رکمنی، مجھے یقین ہے کہ تم شادی کے بعد اپنی مصروفیتوں اور اپنے اوقات میں تبدیلی پیدا کرو گی۔ تم ہر وقت ایسی گندی اور مریض عورتوں میں گھسی رہتی ہو کہ کسی روز خود تمہارے بیمار ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اور جمالی کے ساتھ اس طرح کا میل جول سماج میں چرچے شروع ہو جانے کا موجب ہو سکتا ہے" اس کے لہجے میں تلخی کا ایک ایسا ڈورا تھا جس نے رکمنی کو ڈرا دیا۔

"مگر جوتیش، میرا خیال تھا کہ تم اس کو بخوبی جانتے ہو کہ میں مریض عورتوں کی خدمت عمر بھر ترک نہیں کروں گی۔" اس نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔ "میں اپنی زندگی، زندگی کی خوشیوں، اور خود تمہاری محبت کے لئے اسپتال ہی کی ممنون ہوں، میں خود بھی مریض تھی اور میرا کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ اس لئے میں جانتی ہوں کہ دکھ اور بیکسی کیا چیز ہے، اور اس ڈاکٹر جمالی کے اشارے کو ذرا واضح کرو، تمہارا کیا مطلب ہے؟ دوسروں کی چہ میگوئیاں مجھے متاثر نہیں کر سکتیں — کہ دوسروں کا مجھ پر کوئی حق نہیں۔ سماج نے میرے لئے کیا کیا جو مجھ پر تنقید کرے؟ میرے کرموں کی دیکھ بھال تو میرا ضمیر بہتر کر سکتا ہے! اور کیا بنگالی سوسائٹی اتنی تنگ خیال ہو گئی ہے؟"

"میں نے اس خیال سے کہا تھا کہ میرے موکل تمام مارواڑی ہیں، میرا سارا کام انھیں لوگوں میں ہے اور اس سال کونسل الیکشن میں بطور امیدوار کھڑا بھی ہو رہا ہوں،" جوتیش رکمنی کے لہجے میں تیزی محسوس کرکے اس کی انگلیاں اپنی ہتھیلی پر رکھ کر نرمی کے ساتھ ان کو تھپ تھپانے لگا تھا۔ اس کی آواز میں تغیر تھا اور لہجے میں خوف شامل تھا۔ "یہ دیکھ کر کہ تم ایک مسلمان سے اتنی گھلی ملی ہو یہ لوگ اسے اچھی نظر سے نہ دیکھیں گے، جس کا نتیجہ تم خود سمجھ سکتی ہو کہ میرے اور تمہارے لئے بھی کچھ مفید نہ ہوگا۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ تم اس سے ملنا بہت ہی کم کر دو۔"

"جوتیش میں تمہارے منہ سے یہ باتیں سن رہی ہوں؟ کیا تعلیم کا مقتضا تنگ ذہنی و پست خیالی ہے؟ میں یقین نہیں کرتی کہ مسلمانوں کے ساتھ میل جول رکھنا ہندو سماج کو پسند نہیں، ورنہ اس کا یہ "ہندوستانی قومیت" کا نعرہ مکاری و بزدلی سے عبارت ہوگا۔ مسلمانوں کو غیر سمجھنا سب سے بڑی نادانی ہے۔ وہ ہمارا ہی خون اور گوشت ہیں، تین چوتھائی سے بھی زیادہ ہیں۔ وہ اسی آب و ہوا کے پروردہ ہیں جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔ آٹھ سو سال سے اسلامی تہذیب ہمارے خون میں شامل ہو رہی ہے، اسی طرح ہماری معاشرت ان کے خون میں مل گئی ہے۔ اس اتحاد کو دنیا کی کوئی طاقت باطل نہیں کر سکتی، اور نہ کوئی مہذب و متمدن انسان ایسا ہو سکتا ہے جو اس اتحاد کی سچی قدر و قیمت سے چشم پوشی کرے۔ ایک تعلیم یافتہ محب وطن سے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس ممزوج کلچر کو زیادہ شدید کرنے کے عوض اس کو قطع کرے میرے خیال میں ایسا آدمی ملک کا دشمن تو ہے ہی، ہندو جاتی کا بھی دوست نہیں۔"

"مگر ہندو مسلمان ایک کیونکر ہو سکتے ہیں؟ مسلمان متعصب ہیں" وہ کھسیانا ہو کر کہنے لگا۔

"میں مایوس ہوئی جا رہی ہوں کہ تم ایسی لغو باتیں بھی کر سکتے ہو جن کو ذہن و عقل سے دور کا بھی لگاؤ نہیں، غور کرو مسلمانوں کو ہم سے کوئی پرہیز نہیں ہے اور ہم ہیں کہ اپنے بھائی بندوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ چھوت چھات کا مسئلہ موجود ہوتے ہوئے جس نے ہندوؤں سے اپنے بھائیوں کا بائیکاٹ کرا رکھا ہے مجھے حق نہیں کہ کسی کو بھی متعصب کہوں۔"

" یہ تم ڈاکٹر جبڑجی کے سبق دہرا رہی ہو۔ تم نے تاریخ نہیں پڑھی مسلمانوں کے مظالم ایسے نہیں جن کو کوئی ہندو بچہ بھلا سکے۔ مسلمانوں کے مذہب میں بت شکنی پہلا اصول ہے" جوتیش نے لہجے میں زور پیدا کرکے کہا "

" اس مرتبہ تم نے ایک سانس میں کئی غلط باتیں خلط ملط کر دیں، ان باتوں کو ان کی واقفاتی جڑ تک دیکھنا ایک تعلیم یافتہ انسان کا فرض ہے! اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے مذہبی اور اخلاقی ادب کا بغور مطالعہ کریں۔ اگر ایسا ہو تو یہ غلط فہمیاں رفع ہو سکتی ہیں۔ میں ان سب باتوں کو غلط فہمی پر مبنی سمجھتی ہوں۔ تاریخی مظالم اول تو خود سر بادشاہوں کے انفرادی افعال تھے دوسرے اُس زمانے میں سب ہی جگہ شخصی حکومتیں تھیں۔ اور دنیا بھر میں ایسے مظالم ہوئے ہیں۔ دور کیوں جاتے ہو خود ہندوستان کی تاریخ کو دیکھو مذہب کے نام سے بودھ کے بھکشوں کا خون ندی نالے بن کر بہا ہے۔ کنس نے کیا ظلم نہیں کیا اور کوروں نے کونسی بے ایمانی اٹھا رکھی، کیا اس کا الزام ہندو دھرم پر لگایا جائے گا۔ جب انہوں نے یہ کیا ہے تو صرف مسلمان کیوں قابلِ الزام ٹھیرے؟

" دوسری بات تم نے یہ کہی کہ مسلمانوں کے ظلم کوئی ہندو بچہ نہیں بھلا سکتا۔ لیکن پہلے یہ تو دیکھ لو کہ وہ مظالم کوئی تاریخی صداقت بھی رکھتے ہیں میں تو دیکھ رہی ہوں کہ آئے دن ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہ غلط کہانیاں غیروں نے اس لئے مرتب کی ہیں کہ دونوں آپس میں کبھی نہ مل سکیں اور بالفرض اگر یہ صحیح بھی ہوا اور ہندوان مظالم کو یاد رکھیں تو ہندو بچوں کو وہ سلوک اور احسانات بھی یاد کرانا شرافت اور انسانیت، ممنونیت و احسان مندی کا مقتضا ہے جو مسلمانوں نے اس ملک کے باشندوں پر ساتھ کئے، تہذیبِ نفس و تربیت دماغ کی خدمت مسلمانوں نے جس قدر اس ملک میں آکر کی وہ امٹ ہے۔

" اب رہ گئی بت شکنی، سو وہ نہ تو اسلام کا کوئی اصول ہے اور نہ اس کے اصول کی فرع۔ یہ تو شخصی خود نمائی کا ایک جذبہ تھا جو کسی خود مختار بادشاہ سے سرزد ہوا، یا کسی دوسرے نے اس کی تقلید کی۔ تحقیق و استدلال کی نظر میں اس سے زیادہ اس فعل کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے!"

" مسلمانوں کو اسی ملک پر قابض ہو جانے کا حق ہی نہ تھا" جوتیش نے پھر اعتراض کیا۔

" میں سمجھی، تم کسی بات پر خود کچھ غور کرنے کے عادی نہیں۔ جو سُن، پڑھ لیا وہی دُہرا دیا۔ ہمارے ملک کی جو حالت اُس وقت تھی وہ قومی جماعتوں کو ملانے کا ایک اعلان تھا یہ قدرت کا قانون ہے۔ خود ہم اس ملک میں کس استحقاق پر آئے تھے، اور کیا ہمارا یہ اعتراض بھیل اور گونڈ ہمارے منہ پر نہیں دُہرا سکتے؟ پھر جب مسلمانوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا اور یہیں رہ پڑے تو ہم اور وہ یکساں ہو گئے۔ یہ ملک جتنا ہمارا ہے اسی قدر انکا بھی ہے۔

" مگر میں تو ہندو جاتی کے خیالات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ تم مجھی پر برس پڑیں "

" جوتیش، مذہب کے نام سے تعصبات کو پھیلانا کسی محبِ وطن و انسان کا کام نہیں۔ اس کا کام حق کا اعلان اور شر کو مٹانا ہے۔ مذاہب سچے ہیں تو سب ورنہ کوئی نہیں۔ کوئی سچا مذہب کسی دوسرے کو جھوٹا نہ کہے گا۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ ایک مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کے پیرو کو جھوٹا کہہ رہا ہے اور نفرت پھیلا رہا ہے۔ ان سب خرابیوں کا صرف ایک علاج ہے اور وہ " انسانی برادری" کا قیام ہے —— ہر مذہب کی روح بھی ایک بات ہے دونوں فرقوں کے اہل علم و فراست اگر ذرا سی تکلیف گوارا کریں تو ان تمام شکایتوں کی توجیہیں آسانی سے مل سکتی ہیں جنہوں نے ہم کو جدا کر رکھا ہے اور صحیح عقل ہی ان شکایتوں کا سدباب کر سکتی ہے۔ خواص اگر اس طرح سمجھ لیں تو عوام کے متحد ہو جانے کی ضمانت ہو جاتی ہے۔

" یاد رکھو کہ ہندوستان کی نجات ان دونوں کے ملنے پر منحصر ہے، ورنہ بھارت ماتا غلامی کی لعنت سے کبھی آزاد نہ ہو سکے گی، اگر کسی کا خیال اس کے خلاف ہے تو وہ احمق اور جھوٹا ہے۔ اور یہ مقصد کلچر کے ممزوج ہونے سے ایک دوسرے کے ادب کے گہرے مطالعے سے، اور معاشرت کے متحد ہو جانے ہی سے پورا ہو سکتا ہے، ہم زبان، ہم لباس اور باہمی تزویج میں ہندوستان کی قومیت یعنی نجات مضمر ہے، جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ وطن و انسانیت کی خدمت کرتے ہیں اور آنے والی نسلیں اُن کے نام عزت و احترام سے لیں گی "

" یہ کلچر ہندو مسلم افتراق کو دور کرنے کے لئے تھا یا ڈاکٹر جمالی کی حمایت میں " جوتیش نے طنزاً کہا۔

" میں ڈاکٹر جمالی سے بخوبی واقف ہوں۔ وہ صحیح طور پر وطن دوست انسان ہے"۔ رکمنی نے اس کے لہجے کا غیر مخلصانہ انداز محسوس کرکے جواب دیا۔ لیکن غیر محسوس طریقہ پر اس سے کھنچی نظر آنے لگی اس نے گھڑی دیکھی اور کہنے لگی " چلو

میرے ساتھ چل کر رکمنی وارڈ دیکھو۔ تمہیں مکیں لڑکیوں کی طرف سے تمہارے خیالات اتنے خراب ہیں ان کو دیکھ کر یقیناً تمہارا زاویۂ نگاہ بدل جائے گا۔ وہاں ڈاکٹر جمالی سے بھی ملاقات ہو گی۔ اسوقت تم سمجھ سکو گے کہ انسانیت صرف کسی مذہب، جماعت، یا خاندان میں محدود نہیں۔ جمالی کو میں اپنا بہترین دوست سمجھتی ہوں۔

"سوئے اتفاق سے اس وقت ایک قرارداد ہے، لیکن ساڑھے چھ بجے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ کہیں چل کر ساتھ کھانا کھائیں گے۔" جوتیش نے رکمنی کی نگاہوں میں مایوسی دیکھ کر اور جمالی کی دوستی کے اعتراف کے اثر کو زائل کرنے کے خیال سے کہا۔

اس سے نہ صرف رکمنی کا افسوس رفع ہو گیا بلکہ وہ بہت خوش ہوئی۔ کیونکہ اسے پورا یقین تھا کہ ایک مرتبہ جوتیش وارڈ کو دیکھ کر اور جمالی سے مل کے خود اس کا پُرجوش مداح ہو جائے گا۔ چنانچہ اس کا دل پھر ایک بار مسرت بھرا گیت گنگنانے لگا۔

رکمنی کے پاس ایک چھوٹی سی موٹر تھی جسے وہ خود ہی چلایا کرتی تھی۔ یہ دونوں خوش خوش اس میں سوار ہوئے۔ اور رکمنی نے تو بازار اور چترنجن ایونیو کے چوراہے پر جوتیش کو اُتار دیا۔

"بھولو گے تو نہیں؟ دیکھنا ہم نے کتنا کام کیا ہے"۔ رکمنی نے جب یہ کہا تو اس کی معاشقانہ اور شکرانہ نگاہیں جوتیش کے چہرے اور خوش وضع لباس پر جم کر رہ گئیں اور تھوڑی دیر قبل جو ایک قسم کی مایوسی اس کی طرف سے محسوس ہوئی تھی نسیاً منسیا ہو گئی۔

جوتیش کا نیچے کا ہونٹ ذرا موٹا تھا اور بنگالی خلافی آنکھوں کے نیچے خفیف سے آماس کے علاوہ، وہ مردانہ حسن اور وجاہت کا ایک عمدہ نمونہ تھا۔ اور رکمنی دل میں خوش تھی کہ وہ ایسے خوش شکل و خوش قطع آدمی کی محبت حاصل کر سکی ہے۔

"نہیں، میں ٹھیک ساڑھے چھ بجے پہنچ جاؤں گا۔" جوتیش نے مسکراہٹ کے ساتھ اپنے وعدے کی تکرار کی۔

اسپتال کی عمارت وسیع اور شاندار تھی، اور بڑے احاطے میں سبزی کی طراوت اور جا بجا بڑے اور گھنے درختوں کا سایہ اپنی سکون خیزی محسوس کرا کے مئی کے مہینے کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ ساری فضا سکون سے معمور تھی۔ رکمنی کی گاڑی جب غلام گردش میں جا کر رکی تو اس کی آنکھیں اطمینان سے پیدا ہونے والے رقص میں مصروف معلوم ہوتی تھیں۔

ڈاکٹر اشرف جمالی رکمنی کو آتے دیکھ کر برآمدے جاتے جاتے رک گیا اور زینے کی بالائی سیڑھی پر ٹھہر گیا تھا۔ مگر جس وقت رکمنی موٹر سے اتر رہی تھی، وہ وہیں کھڑا نہ رہ سکا اور ہاتھ بڑھائے ہوئے شگفتہ چہرے کیساتھ نیچے اتر آیا۔ جمالی کی شخصیت میں کوئی خاص کشش اور موثر انداز تو نہ تھا لیکن دیکھنے والے کی نظر میں سب سے پہلے جو بات کھب جاتی تھی وہ اس کی تندرستی اور چہرے کی تازگی تھی۔ جو کسی وقت اس سے علیحدہ نہ ہوتی تھی۔ اس کے خط و خال کچھ بھدے تھے۔ لیکن ذہانت سے چمکنے والی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی، اور وہ دوسرے کے خیالات کو پڑھ لینے میں مشاق تھیں۔ اس کا ڈیل اپنی صحت و تناسب اور اس کے شانے قوی ہونے کے باعث نظر کو جذب کر لیتے تھے۔ غرض اس کی کچھ اس قسم کی شخصیت تھی کہ کہیں اور کسی موقع پر سب سے زیادہ نمایاں ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ اس کی عمر چالیس کے قریب تھی، اور کامل پانچ سال سے رکمنی کا قریبی دوست تھا۔

اس دن کی طرح جوتیش نے اس سے قبل بھی ان کی دوستی کے متعلق کئی بار اشارے کئے تھے۔ اور رکمنی ہنس ہنس دی۔ کیونکہ اس نے جوتیش کے جذبۂ رشک کو محسوس کر لیا تھا۔ اور وہ اس سے ایک گونہ خوش ہوئی تھی جمالی جب رکمنی کی طرف ہاتھ ملانے کو بڑھا تو رکمنی کو جوتیش کا وہ جذبہ یاد آیا اور اسے خیال ہوا کہ شادی ہو جانے کے بعد ان کی باصفا دوستی میں کاوٹ ضرور پیدا ہو گی۔ بلکہ ممکن ہے کہ اس بے لوث و پُرمسرت دوستی کی محض یاد باقی رہ جائے۔

"سب خیریت؟" رکمنی نے ہاتھ ملاتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں سب خیریت ہے،" جمالی نے جواب میں کہا۔ "تم نے جو ریڈیو بھیجا تھا وہ لگا دیا گیا۔ اور یہ سن کر یقیناً خوش ہو گی کہ اس سے تمام وارڈ والوں کو بہت خوشی ہوئی اور رکمنی دیوی کے جے کارے لگائے گئے۔"

اس خبر سے رکمنی کا دل بھی مسرت و فخر سے بھر گیا اور اس نے آس پاس پُرشوق نگاہیں ڈالیں۔ یہ اس کی دلی آرزو تھی کہ خود بھی دن رات اسپتال ہی میں قیام کر کے آلام زدہ انسانیت کے آلام میں کمی کرتی۔ پھر جب اس نے

نظریں اُٹھائیں تو حالی کی نگاہوں سے اس کی عزت کرتی ہوئی آنکھیں سے دوچار
ہوئیں جو مطالعہ کرتا نظر آیا۔ اس سے رکمنی کا خون رخساروں کی طرف دوڑنے
لگا۔ پانچ سال کی ملاقات میں اس وقت رکمنی کو محسوس ہوا اور جبلی طور پر محسوس
ہوا کہ وہ اس بے لوث و بے غرض انسان کی نگاہوں میں بے حد محبوب تھی۔
اس کی نظروں میں عزیز تھی جس کو لوگ ایک دفعہ جان کر محبت کرنے لگتے تھے۔

"چلو وارڈ میں ہو آئیں۔" رکمنی نے اس لمحے کو بھلا دینے کے لئے جلدی سے
تجویز کیا۔ اس کی آواز اٹکتی ہوئی نکلی۔

"تم سب سے پہلے غریب سکینہ کو دیکھو۔" ڈاکٹر حالی نے وارڈ کی طرف
بڑھتے ہوئے رُک کر تجویز کیا۔ "یاد ہے پچھلے ہفتے ہم اسے رُفیوجی سے لائے
تھے۔ فی الواقع وہ ہمارے ہاتھ میں دیر سے آئی۔ اب وہ بسرعت ختم ہو رہی
ہے۔ اس کا دل نہایت متاثر ہو چکا ہے۔"

"وہ ننھی سی لڑکی؟" رکمنی نے مغموم لہجے میں دریافت کیا۔ "غریب بچی! اچھا
میں پہلے اسی کے پاس چلتی ہوں۔"

رکمنی تیز تیز قدموں سے وسیع برآمدے میں ایک ستے اور مُرجھائے
ہوئے چہرے والی مریضہ کی طرف باتیں کرتی ہوئی۔ کونے کی طرف بڑھی اور
ایک اونچے سفید، روغن کے پلنگ کے پاس پہنچی جس پر ننھی سی لڑکی کا جسم
دراز تھا، اور جسے مشکل کہا جا سکتا تھا کہ اپنے بچپن کو رخصت کر چکی ہے۔
اس کے کالے اور چمکیلے بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے، سیاہ آنکھیں بیماری
میں زیادہ بڑی ہو گئی تھیں، اور اس کے نازک ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے۔
جیسے ہی رکمنی مسکراتی ہوتی اس کے پلنگ پر جھکی مریضہ کا چہرہ دمکنے لگا

"دیوی! آپ ہنستی ہوئی ہمیشہ کیسی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔" ہاتھ
جس پر نیلی رگوں کا جال نمایاں تھا۔ رکمنی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "آپ کی
ہر چیز برساتی چڑیوں کی طرح چونچال نظر آتی ہے۔"

شاید دوسروں کے مقابلے میں رکمنی کو اپنا سراہا جانا زیادہ خوش کرتا ہو۔
اس طرح خوش کرتا ہو جیسے سورج کی روشنی پھولوں کو خوش کرتی ہے غالباً
اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اوائلِ عمر میں وہ اس تعریف اور محبت سے بالکل محروم
رہی تھی۔

"اچھی سکینہ" رکمنی نے بڑی محبت سے جواب دیا۔ "آج میں واقعی بہت خوش
ہوں کاش میں اپنی اس خوشی میں سے دوسروں کو حصہ دے سکتی! کاش میں
تمہیں جلد اچھا کر سکتی کہ تم اُٹھ کر سورج کی روشنی میں چل پھر سکتیں ۔۔ سورج
کی روشنی تمہاری نوجوانی کا حق ہے۔"

"میری جوانی!" اس لڑکی نے نہایت ستم رسیدہ لہجے میں کہا "اسے تو میں اُس
جھونپڑی میں چھوڑ آئی جہاں میں پیدا ہوئی تھی، رکمنی دیوی! یہ میرا اٹھارہواں
سال ہے اور میں بڑھاپے کا سا احساس کر رہی ہوں۔ آپ اور ڈاکٹر
صاحب کے ملنے سے پہلے میرے نصیب میں کوئی پریم لکھا ہی نہ تھا۔"

رکمنی کی آنکھوں میں آنسوؤں کا دھندلکا پیدا ہو گیا۔ ایک کرسی سرکا کر
وہ اس کے پلنگ کے برابر بیٹھ گئی اور اس انسانی ایندھن پر جھک گئی جو اتنی
سرعت کے ساتھ جل کر خاکستر ہوا جا رہا تھا۔ مریضہ کی بخار سے دہکتی ہوئی
آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جیسی ستاروں کے ڈوبتے وقت ان میں نظر
آتی ہے۔

"تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟" رکمنی نے اس کے خیال کی رو کو بدلنے
کی غرض سے کہا "کوئی تکلیف تو نہیں؟"

"شریمتی، مجھ پر جو بیتنا پڑ چکی ہے" اس کے دیکھتے ہوئے "تو اب میں جنت
میں ہوں۔" اس نے ایسے جوشیلے لہجے میں جواب دیا جو اس کی نقاہت میں
ممکن ہو سکتا تھا۔ "مجھے بس ۔۔ بس ایک ڈر ستا رہا ہے کہ آپ میرا سارا حال
سن کر خفا ہو جائیں گی۔"

"غریب بچی" رکمنی نے نہایت پیار اور شفقت سے اس کی انگلیاں سہلاتے
ہوئے کہا "تمہاری کسی بات کا علم بھی مجھے بدگمان نہیں کر سکے گا۔"

"آپ سی دیوی کا ایک نصیبوں جلی، ایک بدچلن لڑکی کے ساتھ ایسے پریم
اور مہربانی کا برتاؤ دیویوں کا سا برتاؤ ہے!" وہ غم کی تلخیوں سے مملو لہجے میں
کہنے لگی۔

"سکینہ، تم ایسے لفظ اپنی زبان سے نہ نکالو۔" رکمنی نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

"دیوی" یہ میرا لقب ہے۔ مجھے دیا گیا ہے!" خشک اور استہزا آمیز ہنسی
کے ساتھ سکینہ نے کہا۔ "میں اس کو کیسے بھول سکتی ہوں؟ میری سی مصیبت والی
لڑکی کو کوئی سہارا نہیں رہتا۔ یہاں آنے سے پہلے میں یہ سوچ کر خوش تھی کہ
اب زیادہ نہ جیوں گی۔ پر آپ کی مہربانیوں نے اب جینے کا ارمان دلا دیا
ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ اچھی ہو کر یہاں سے آپ کے پاس سے چلا جانا پڑے گا
تو مجھے رنج ہوتا ہے۔"

رکمنی نے بڑی جدوجہد سے اپنی رو پڑنے کی زبردست خواہش کو دبایا۔ اور اس دم توڑتے وقت جینے کی خواہشمند لڑکی کو دیکھتی رہی جو اتنی کمسن، ایسی بیمار اور اتنی بیکس تھی: اسنے زندگی کے اس شعبدے کو ایک فلسفی کی نظر سے دیکھا۔ پھر اس نے خیال کیا کہ اگر یہ مشورہ کی کر پا ہوجاتی، جس پر اسے اکثر شبہ پیدا ہوچکا تھا، تو وہ بھی اسی طرح بے یار و مددگار اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتی ـــــ اگر دنیا میں کسی کے چاہنے والے اور احباب نہیں تو وہ بیکس ہے اور زندگی ایک سزائے مستقل ہے!

"شریمتی" آپ ایک مسلمان لڑکی سے اتنا پیار کیوں کرتی ہیں؟ آپ تو ہندو ہیں"۔

"سکینہ، تم انسان پہلے ہو اور مسلمان بعد میں ۔ ایسے ہی میں انسان پہلے ہوں اور ہندو بعد میں ہوں ۔ میں ہندو ہوں جب ہی تو تم سے اور ہر شخص سے پریم کرتی ہوں، یہ خیال تمہارے دل میں کیسے آیا؟"

"دیوی جی، میں نے اس لئے پوچھا کہ آج کل لڑائیاں ہورہی ہیں بڑے بازار میں میرے باڑی والے (مکاندار) کو ہنے جوگی کر چھوڑا تھا"۔

"یہ باتیں بنگالیوں میں نہیں ۔ پچھاں کے لوگ شرارت کرتے ہیں اور وہ کسی کے سکھلائے پڑھائے ہوتے ہیں ۔ تم ایسی بیہودہ باتوں کو اپنے دل میں کبھی جگہ نہ دو"۔ پھر اس نے سکینہ کے تکئے کے نیچے ہاتھ لیجا کر اسے آہستہ سے اٹھایا اور کہنے لگی:-

"دیکھو ڈوبتا ہوا سورج کیسا اچھا معلوم ہو رہا ہے! سنہرے اور اودے رنگ دریا کے پانی میں کیسے سندر معلوم ہوتے اور کیسی چندریاں لگ رہی ہیں"۔

سکینہ نے دروازے میں سے مغرب کی سمت دیکھا جہاں شام کے سورج کی طلائی کرنیں، درختوں میں سے چھن کر ہگلی کے نالے کے پانی پر دھنک کی شکل میں پڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر رکمنی کی طرف دیکھا اور ایک طرفہ نرم، اور ہلکی سی مسکراہٹ اس کے مضمحل و خمدار لبوں پر جھلکتی دکھائی دی۔

"رہا دریا کا پانی! ہنسی کی سی بات ہے۔ پر مجھے بہتے پانی سے ہمیشہ پریم رہا ہے۔ اگر آپ سننا چاہیں تو آپ کو اپنی بیتی سنانا چاہتی ہوں۔ میرے دل میں آپ کو دھوکا دینے کا کانٹا چبھ رہا ہے۔

"بچی، جو کچھ کہنا چاہتی ہوئے دھڑک کہو"۔ رکمنی نے جواب دیا۔ "تمہاری مرضی پوری کرکے مجھے خوشی ہوگی ـــــ کیا تم کسی سے ملنا چاہتی ہو؟ کوئی رشتہ دار۔ یا کوئی اور؟"

"رکمنی دیوی، دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے"۔ اس نے نہایت دردناک لہجے میں کہا۔ "میرا باپ ایک بڑی کوٹھی میں صاحب کا خانساماں ہے۔ میں اپنے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ برابر والی کوٹھی میں ایک بیرسٹر بابو رہتے ہیں انہوں نے مجھے دیکھا اور اپنے مالی کو میرے پاس بھیجا۔ اس نے کہا کہ بابو مجھے میم صاحب بنالیں گے۔ میں کوٹھی میں رہوں گی، موٹر میں چڑھوں گی، اچھی اچھی ساڑیاں پہنوں گی، اور جانے کیا کیا بلا بتر کہا۔ میں اس کی باتوں میں آگئی۔ اس نے جو کہا میں نے وہی کیا۔ میں اپنے باپ کے پاس سے چلی آئی۔ اور انھوں نے میرے لئے ایک چھوٹا سا مکان لے دیا۔ بابو کو میں بھی پہلے دیکھا کرتی تھی۔ وہ میرے پاس آئے اور مجھ سے ملے، اچھی اچھی باتیں کیں۔ آہ، شریمتی کیا آپ نے کسی کو اپنی جان سے زیادہ چاہا ہے؟" اس نے دفعتاً اپنی بیمار آنکھیں رکمنی کے چہرے پر قائم کرکے سوال کیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کہتی رہی۔ "میں اُن سے پریم کرنے لگی۔ وہ مجھے ننھی گڑیا کہا کرتے تھے۔ اُن دنوں میں بہت مگن رہتی تھی

"تھوڑے دن بعد میں نے بابو سے کہا کہ وہ مجھے اپنی پتنی کب بنائیں گے میں شدھ ہونے کو طیار تھی۔ بابو نے میرے ہاتھوں کو پیار سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور مجھ سے کہا خاندانی ملکیت کے خیال سے وہ میرے ساتھ تھوڑے دنوں شادی نہ کرسکیں گے۔ جب سب ٹھیک ٹھاک ہوجائے گا تو مجھے اپنی پتنی بنالیں گے۔ میں نے اس کی سب باتیں سچ مان لیں۔

"افوہ! اُن دنوں میں بہت خوش تھی، سونے کے لئے ایک پیچ کی مسہری اور نہانے کے لئے نل کا تازہ پانی، جن لوگوں کو یہ آرام نصیب نہ ہوے ہوں وہ کیا جانیں کہ وہ چھوٹا سا گھر میرے لئے کیسی جنت تھی! دیوی مجھے اپنے رویئے میں کوئی برائی دکھائی نہ دی۔ میری شادی ہونے برابر تھی میں کہیں اور تو جانے سے رہی مجھے اُن سے سچا پریم تھا۔ میں نے لکھنا پڑھنا بھی شروع کردیا تھا کہ میرے سبب سے بابو جی کو آنکھیں نیچی نہ کرنا پڑیں۔

"میں پڑھتی لکھتی رہتی یا اپنے گھر کو صاف ستھرا رکھنے میں لگی رہتی گلابی اور کسومی ساریاں بدل بدل کر پہنتی اور خوش ہوتی تھی۔ اس کو خوش کرنے کے لئے میں اپنے بال طرح طرح سے سنوارا کرتی تھی جنھیں اُنھوں نے کتی ہوئی رات کا نام دیا تھا

"وہ میرے پاس روز تو نہ آتا لیکن جب بھی آتا میں اپنے آپ کو دنیا بھر کی لڑکیوں سے زیادہ نصیبے والی سمجھتی تھی، میں اُس دن پہلے ہی سے جان جاتی کہ وہ آج آئے گا، اور جس رات وہ نہ آتا میں اُس کی لائی ہوئی کتابیں پڑھا کرتی۔ شریمتی میرے اوپر مصیبت کا پہاڑ اچانک آپڑا۔ میرا جی بُرا رہنے لگا، اور میں آپ ہی سمجھ گئی کہ میری بیماری کیا تھی، میں سفید پڑ گئی تھی۔ اس دفعہ وہ ایک ہفتے کے بعد آیا اور مجھسے بیسیوں باتیں پوچھ ڈالیں۔ میں اس کی گود میں جا بیٹھی اور اپنا بھید اس کے کان میں چپکے سے کہہ دیا۔ میں نے اُس سے کہا کہ اب شادی کی فکر جلد کرنا چاہئے۔ دیوی جی مجھے اپنی خوشی میں کسی بات کا خیال نہ رہا تھا۔ لیکن اب میں چاہتی تھی کہ میرا بچہ اپنے باپ کا بچہ ہو۔

"میرے اس کہنے پر اُس نے مجھے اپنی گود سے ڈھکیل دیا۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے پر سے غلاف اُترا ہوا معلوم ہوا۔ لیکن صورت سے بھید رد بھی نظر نہ آتا تھا! اس رات وہ زیادہ دیر تک نہ ٹھیرا۔ وہ چلا گیا، اور جاتے جاتے آنے کا وعدہ کر گیا۔ آہ، مگر شریمتی، وہ پھر واپس نہ آیا۔ ایک دفعہ بھی نہ آیا!"

یہاں پہنچ کر اُس کی آواز بہت ضعیف ہو گئی اور وہ بے حال ہو کر اپنے تکیے پر ڈھل گئی۔ رکمنی اس کے اوپر جھک گئی اور اس کی پیشانی پر سے بالوں کو ہٹانے لگی۔

"اب تم بولنے کی کوشش نہ کرو" میری بچی میں سمجھ گئی ہوں"۔ رکمنی نے اس کو تھپکتے ہوئے کہا۔

اس لڑکی کے تھکے ہوئے پپوٹے جھک گئے اور رکمنی اسے سوتی ہوئی سمجھا کی۔ لیکن یکایک اس نے آنکھیں کھولدیں، اور نہایت دھیمی مگر ہموار آواز میں کہنے لگی:-

"اس کے کوئی آٹھ روز بعد ایک خط آیا اور اس میں دو نوٹ بھی رکھے تھے، خط میں لکھا تھا کہ اپنی ماں کو لیکر دارجلنگ جانا ضروری تھا اس لئے وہ مجھ سے کچھ دن تک نہ مل سکے گا۔ تھوڑے دنوں تک تو مجھے زیادہ بُرا نہ معلوم ہوا، مگر اس کی یاد ستاتی رہی۔ میرے پاس خرچ کو بھی تھا اور دن بھر کچھ نہ کچھ کرتی دھرتی بھی رہتی تھی۔ مگر گرمیاں ختم ہو گئیں اور وہ نہ پلٹا ——— کبھی نہ آیا۔ میرے پاس روپے سب خرچ ہو گئے تھے۔ میں نے وہ مکان چھوڑ کر ایک چھوٹی سی کوٹھری کرائے پر لے لی تھی۔ میری خراب حالت دیکھ کر ایک کٹنی نے جال ڈالنا چاہا، مگر شریمتی آپ جھوٹ سمجھیں گی، میں نے اس مکارہ کو لاتیں مار کر نکال دیا۔

"اب میں ان تھوڑے سے داموں کو جو بچے تھے خرچ نہ کرنا چاہتی تھی ایک دن شام کے وقت میں گھر سے نکلی۔ دو وقت سے کچھ کھایا نہ تھا، میں بہت بھوکی تھی، آپ کیا جانیں کہ بھوک کسے کہتے ہیں؟ اور ایسے حال میں جب کوئی بیمار بھی ہو، بیکس بھی ہو——— پیسے کی آس نہ ہو! میں یہ سب کچھ تھی! میں نراس تھی اور آنے والی ہر گھڑی موت کی طرح ڈراؤنی تھی، پر موت ڈراونی نہ تھی!

"میں کالج اسکوئر ہی سے جارہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ جو چند آنے میرے پاس تھے اس میں سے کتنے پیسے خرچ کروں اور کیا کھاؤں؟ اسی سوچ بچار میں میں تو بازار تک جا پہنچی اور داہنی طرف مُڑ گئی۔ جب میں گرجے سے بڑھ کر چترنجن ایونیو کے چوراہے کے قریب پہنچی تو ایک بڑے گھر کے دروازے کے سامنے میں نے اس کو ایک دوسرے آدمی سے بات کرتے دیکھا۔ آپ تو اس بلڈنگ کو جانتی ہوں گی۔

رکمنی نے گردن کے اشارے سے بتایا کہ وہ سمجھ گئی ہے۔ وہ کئی مرتبہ جوتش کو "انڈین الیوسی ایشن" کی بلڈنگ کے برابر اس کے کلب میں پہنچانے یا لینے گئی تھی۔

"میں اس کی طرف لپکی۔ مجھے اس وقت کسی بات کا دھیان نہ رہا تھا۔ بس میرا حق تھا کہ مجھے مصیبت میں ڈال کر الگ نہ ہو جائے۔ میں نے اُس کا نام لیکر پکارا۔

"شریمتی، اُف، اُس نے جس نگاہ سے مجھے دیکھا وہ مرتے وقت تک میرے سامنے رہے گی۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے جانتا بھی نہ تھا، مجھے دھوکا ہوا تھا پھر میری نراسی کا حال نہ پوچھئے۔ میں ضرور پاگل ہو گئی تھی۔ ورنہ ایسا نہ کرتی۔

"جو..... تی! میں نے چیخ کر کہا "تم مجھے نہیں پہچانتے؟" میں نے اس کا کوٹ پکڑ لیا تھا۔ اس نے ایک ڈانٹ دی اور مجھ سے الگ ہو جانے کو کہا مجھے بیسوا کہا اور پولیس کی دھمکی دی، شریمتی! میں جانتی تھی کہ وہ مجھے بھولا نہیں ہے اور کوئی آواز میرے کان میں کہہ رہی تھی کہ وہ مجھے شروع سے دھوکا دے رہا تھا وہ برابر کلکتے ہی میں رہا۔ ایک وقت میں اس کی سُندری تھی۔ پر اس دن بیسوا ہو گئی تھی۔ کوئی منٹ بھر کے لئے سنسار تیزی کے ساتھ چکر کھانے لگا۔

اس نے مجھے جھٹک دیا۔ اور گر کر نڈھال ہوگئی۔ مجھے تھانے میں ہوش آیا اور وہاں سے میں "رفیوج" میں بھیجدی گئی۔ "رفیوج" ہی میں میرے لڑکی پیدا ہوئی شکر ہے وہ زندہ نہ رہی۔ دیوی جی، اس کا دھیان جب آجاتا ہے تو دل بیٹھ جاتا ہے!

"اس دن سے آج تک میں اپنے تئیں سنبھالے رکھنے کی فکر میں رہتی ہوں دو مہینے ہوئے مجھے بچہ کھلانے کی ایک نوکری مل گئی تھی۔ اس بچے سے میرا جی بہلنے لگا تھا۔ پھر میری کمزوری کو ان لوگوں نے دق کی بیماری سمجھا اور مجھے الگ کر دیا۔ کوئی سہارا تو تھا نہیں، میں پھر "رفیوج" میں جا پہنچی۔ منیجر صاحب نے بڑی مشکل سے میری حالت پر ترس کھا کر رکھ لیا اور مجھے بخار آنے لگا۔

"میں اپنی اس بپتا کے سنانے کے لئے بے چین تھی۔ آپ کو مجھ سے نفرت تو ہوگی اور ڈاکٹر صاحب کو بھی خیال ہوگا کہ مجھ سی بُری لڑکی پر رحم کیا' پر میں بھوکے میں آپ دونوں کی مہربانیاں سہار نہیں سکتی تھی"۔

سکینہ نے اپنی دردانگیز داستان ختم کرکے رکمنی پر کچھ اس نظر سے نظر ڈالی جو اگر کچھ تھی تو یکسر التجا و معذرت تھی۔ رکمنی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور رکمنی نے ان کو روکنے کی کوشش بھی نہ کی۔

"میری بچی' تم جلدی اچھی ہو جاؤ گی۔ میں تمہیں ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گی ......" رکمنی یکایک چپ ہوگئی اور تعجب سے سکینہ کو دیکھنے لگی۔ رکمنی کے لفظوں نے جادو سا کر دیا' کیونکہ سکینہ کے چہرے پر ایک عجیب تغیر نمایاں ہوگیا تھا ــــ ایک ایسی تبدیلی آگئی تھی کہ اس کا رنگ درخ تندرستی اور مسرت سے چمکنے لگا ــ وہ اُٹھ بیٹھی' اس کے بکھرے ہوئے بال نکھرے ہوئے چہرے کا ہالہ بن گئے۔ اس کی ہرنی کی سی آنکھوں میں ایک سماوی روشنی جھلکنے لگی۔ اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ پہلے آہستہ اور پھر باواز کہنے لگی۔

"جاتی! اوہ جوتی! تم آگئے' میرے پاس آگئے"! سکینہ نے نہایت صاف اور بجتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی نگاہیں رکمنی کے پس پشت جم کر رہ گئی تھیں اور اس کے بازو التجائے شوق بن کر کھل گئے تھے۔

رکمنی نے مڑ کر دیکھا اور اپنے پیچھے کھڑے ہوئے آدمی کو متحیرانہ تکنے لگی' پھر پلٹ کر سکینہ کو دیکھنے لگی۔ رکمنی کی رگوں میں خون جم کر رہ گیا' کہ اس پر ایک جاں گسل و روح فرسا حقیقت آشکارا ہو رہی تھی۔ وہ کھڑا ہوا شخص جس کی آنکھوں میں خوف و ہراس نے گھر بنا لیا تھا۔ جوتیش کمار بوس تھا۔

"جوتیش!" رکمنی نے کہا اور آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ پھر ایک مختصر وقفے کے انتشار و تذبذب کے بعد جس میں یہ تین ہستیاں بت بنگئی تھیں' رکمنی نے اپنے جذبات کو قابو میں لاکر سکینہ کو مخاطب کیا:۔

"سکینہ' کیا وہ آدمی یہی ہے' وہ ناپاک جانور یہی ہے جو تمہیں بکسی' بیماری اور فاقہ کشی میں چھوڑ گیا؟ بچی تم ڈرو مت' بتاؤ یہ وہی ہے"! رکمنی کی آواز بھرائی ہوئی تھی' وہ خود بھی اپنی آواز کو مشکل سے پہچان سکتی تھی۔

"رکمنی کے منہ سے اس کا نام سنتے ہی سکینہ کے چہرے پر سے وہ رنگ مسرت جو جوتیش کو دیکھ کر چھا گیا تھا غائب ہوگیا۔ اس نے جوتیش اور رکمنی کو حیران نگاہوں سے دیکھا۔ گردن جھکالی۔ اور پھر کچھ سمجھ کر ایک دبی ہوئی کراہ کے ساتھ اپنے تکئے پر گر گئی

"شریمتی' میں ...... مجھے دھوکا ہوا' یہ وہ ...... وہ نہیں ہے"! اس نے رُک رُک کر کہا اس کی آواز سرگوشی سے کچھ یونہی سی بلند تھی جس کو سننے کے لئے رکمنی کو جھکنا پڑا۔

جس وقت رکمنی جھکی ہوئی اس کے الفاظ سُننے کی کوشش کر رہی تھی' تو اس نے دیکھا کہ موت کا بے رحم ہاتھ سکینہ کے سُتے ہوئے چہرے کو ڈھانپ رہا ہے۔ رکمنی کے ذہن سے تھوڑی دیر کے لئے ہر خیال محو ہوگیا اور یہ ایک حقیقت باقی رہ گئی کہ طوفانِ زندگی اور طغیانِ مظالم کی ماری ہوئی سکینہ مر رہی ہے۔

رکمنی نے بجلی کی گھنٹی بجائی جس کی تیز آواز دور تک گونج گئی۔ دوسرے لمحے میں ڈاکٹر جالی اور دو نرسیں کمرے میں داخل ہوئے۔ رکمنی ان کی کوششوں کو انہماک کے ساتھ دیکھتی رہی' کہ وہ لڑکی ہوش میں آسکے۔ مگر وہ تو ہوش کو بھی غافل کر گئی تھی۔

رکمنی وہاں سے اٹھی سر جھکائے دفتر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوگئی۔ جوتیش اس کے پیچھے پیچھے لیا' اس کی آنکھوں میں ڈرپوک نگاہیں تھیں اور ہاتھوں کی رگیں اُبھر آئی تھیں۔

"رکمنی اس کے کیا معنے ہیں' اس لڑکی نے مجھے کون سمجھا!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں سوال کیا اور ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھدیا۔

رکمنی نے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے غضبناک نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہنے لگی۔

" اس کے پہچاننے میں کوئی غلطی نہ تھی، اس نے صحیح شناخت کی، اور ب وہ تمہیں بچانے کی فضول کوشش میں دم توڑ رہی ہے — تم قاتل ی ہو!"

جوتیش رکمنی کو اس حال میں دیکھ کر پیچھے ہٹا، زیرِ لب کچھ کہا بھی، اور رے سے نکل گیا۔

کامل ایک گھنٹے کے بعد جمالی نے رکمنی کو دفتر کے کمرے میں بیٹھے پایا۔ ب وہ بالکل سکون کی حالت میں تھی۔ رکمنی نے اس سے نگاہوں میں وال کیا۔

"وہ ختم ہوگئی! اس صدمے نے اسے اور بھی جلدی ختم کر دیا، ورنہ شاید چند گھنٹے، چند دن یا چند مہینے اور جی سکتی!" جمالی نے نرم لہجے میں جواب یا۔ "رکمنی میں نے سب کچھ سُن لیا ہے — مجھے سخت صدمہ ہے۔ ہمارے رنج کے اسباب مجھے بھی ملال پہنچاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ دفعتاً چپ ہوگیا۔

مگر اس الہامی لمحے میں رکمنی کو معلوم ہوگیا کہ جمالی سے متعلق اس کے سوساتِ رفتہ کی نوعیت کیا تھی۔ اور جوتیش کی ذہانت اور خوش قطع ضع ہونے کی خوش غلافی نے اسے کیسا گمراہ کر دیا تھا۔

رکمنی نے اپنے اہتمام سے سکینہ کی تجہیز و تکفین کرائی اور ڈاکٹر جمالی کے ساتھ قبرستان بھی گئی۔

تقریباً ایک مہینے کے بعد ایک روز چٹرجی اور جمالی رکمنی کے مکان بچائے پر مدعو تھے، چٹرجی ایک گھنٹہ ٹھہر کر رخصت ہوگیا اور جمالی نے وقع پاکر رکمنی سے کہا۔

" رکمنی" اس کی آواز لڑکھڑانے لگی" اجازت ہے کہ میں اپنی محبت کے بذبات کو تمہارے قدموں پر ڈال دوں جن کو میں نے مایوسی کی گود میں سلا دیا تھا"

رکمنی پر تو الہام اسی روز ہو چکا تھا جس روز جھوٹے سکے کا کھرا پن ظاہر ہوگیا تھا۔ وہ اُٹھی اور سیدھی جمالی کی آغوش میں پہنچ گئی۔ اس کا قلب پُر محبت دنیائے امن و مسرت کے ساتھ ہم آہنگ ہوگیا۔ تمتماتے رخساروں پر آنسو گلاب پر شبنم کی بوندیں معلوم ہونے لگے

" پیارے جمالی، میں بہت خوش ہوں کہ میں خود اپنے فریب سے بچ گئی، شکر ہے کہ بروقت آگاہ ہوسکی۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ مجھے تم سے اول روز ہی سے محبت تھی — اس دن سے پہلے میں اپنے جذبے کی نوعیت کو خود نہ پہچان سکی تھی۔

" زندگی بھی کیا معمہ ہے! ہماری مسرتوں کی تعمیر غریب سکینہ کی خاک قبر پر ہوئی ہے!" رکمنی نے نہایت متاسفانہ لہجے میں کہا:-

"خدا اس کی روح پر اپنی رحمت نازل کرے!"

زمانہ گلشنِ عیش کرا بہ یغما داد؟
کہ گل بدامنِ ما دستہ دستہ می آید

ڈاکٹر چٹرجی نے دونوں کے ہاتھ پکڑ کر مبارکباد دی اور ان کے ساتھ رجسٹری آفس تک گیا۔ وہاں سے جمالی اور رکمنی سیدھے سکینہ کی قبر پر پہنچے اور قبر کو بیچ میں لے کر ہاتھ ملائے اور اس طرح اپنی شادی، اور محبت کی مسرتوں کی تصدیق کی۔ پھول چڑھائے آنسو بہائے اور رخصت ہو آئے — کہ زندگی اسی کا نام ہے۔

دوسرے روز صبح کے اخباروں میں جمالی اور رکمنی کی تصویروں کے ساتھ یہ خبر نہایت جلی عنوان کے ساتھ شائع کی گئی کہ کلکتہ کے مشہور و معروف ڈاکٹر جمالی اور شریمتی رکمنی بالا دیوی سرکار کی شادی رجسٹری کے ذریعے سے ہوگئی اور ہر چند شادی رجسٹری سے ہوئی ہے مگر نوشہ و عروس اسی بات پر سختی کے ساتھ مصر ہیں کہ وہ اپنے آبائی عقائد مذہبی پر ہمیشہ قائم رہیں گے اور اس طرح ایک نئی برادری، ایک نئی قومیت، ایک نئے مذہب کی — انسانیت کے مذہب کی، محبت کے مذہب کی بنیاد ڈالیں گے۔ ایک " نیا شوالہ قائم کریں گے۔

ل۔ احمد

UNIVERSITY ... DELHI

اُردو کی تنظیم

(علامہ دتاتریہ کیفیؔ)

کئی مہینوں سے اُردو کے اکثر رسالوں، اور اخباروں میں اس کا چرچہ ہو رہا ہے، کہ اب وقت آگیا ہے، کہ اُردو کی تنظیم ہونی چاہئے۔ لکھنؤ میں ایک اور پنجاب میں دو نئی منظم جماعتیں اکیڈیمی یا کانفرنس کے نام سے قائم بھی ہو گئی ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اردو ایسی لکھی جا رہی ہے جس کے سمجھنے کے لئے فارسی اور عربی کی اچھی واقفیت کی ضرورت ہے۔ بعضوں کو اردو کی تصحیح اور توسیع کا نہیں، بلکہ اس کی توشیع کا خیال دامنگیر ہے۔ بعض اپنے صوبے کے خصوصیات کو ٹکسالی شان دنیا چاہتے ہیں۔ اوّل وہ طبقوں کا یہ خیال خواہ کسی نوعیت کا ہو، ہندی کی روز افزوں ترقی اور اشاعت سے پیدا ہوا۔ اُردو کے بہی خواہ، اُردو کی ترقی۔ اصلاح۔ توسیع اور توشیع سے غافل نہ تھے۔ برسوں ہوئے کہ راقم نے ایک تجویز انہیں امور اور ان سے متعلق طرز عمل کی بابت مولوی عبدالحق صاحب کے پاس بھیجی۔ تفصیلات کی بحث تک نوبت پہنچی۔ لیکن وہ تحریک عمل پذیر نہ ہونی تھی، نہ ہوئی۔ یہ یاس آگیں نتیجہ موصوف کے اور راقم کے بعض ذی رسوخ احباب کی سرد مہری سے ہوا۔ اب پچھلے سال "اُردو کی موجودہ ضروریات" کو موضوع قرار دے کر ایک مفصل لکچر میں نے لاہور میں دیا۔ نتیجہ صرف یہ ہوا کہ اردو ترسے کی تکمیل کی۔ ایک باضابطہ تحریک محبی مولوی عبدالحق صاحب کی تجویز سے شروع ہوئی جس کے متعلق ملک کے مختلف حصوں میں کام ہو رہا ہے۔

میں کئی بار توضیح سے بتا چکا ہوں کہ جب ایک زبان میں ضرورت، یا بے ضرورت دوسری زبانوں سے الفاظ یا مرکبات مستعار لینے کی عادت لوگوں کو پڑ جاتی ہے۔ تو وہ زبان تصریفی قوت اور توضیعی استعداد سے محروم اور نادار ہو جاتی ہے۔ غور۔ دفکر۔ عرض۔ نشوونما۔ اور مالا وغیرہ کو مذکر ماننا صحیح اور فصیح ہے یا مؤنث۔ لکھنؤ کا "کوشش کرنا پڑیگی" ٹھیک یا دہلی کا "کوشش کرنی پڑیگی"۔ منشی پریم چند جو فردوس خیال میں 'دھرم سالہ' کو مذکر لکھ گئے[2] یہ اُردو یا ہندی کے قاعدے کے مطابق درست ہے یا نہیں، یہ اور ایسی باتیں محض فروعی ہیں۔ اصول کی بات وہ ہے۔ جو میں اوپر کہہ آیا ہوں۔ "رنگ و روپ" "چوڑی دار" "گڈ مڈ گڈا"۔ جیب کترا۔ کی سی ترکیبوں سے بھی بحث فضول ہے۔ مجھے تو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ کہ پچھلے پچاس برس میں بعض اصطلاحوں سے قطع نظر ایک نیا لفظ۔ ایک نیا مرکب جو ٹھیٹ اُردو ہو۔ اُردو میں ایزاد نہیں ہوا۔ یہ حال ہمارے لسانیاتی افلاس اور ناداری کا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ نئے خیالات اپنے ساتھ نئی زبان یعنی نئے الفاظ لایا کرتے ہیں۔ اس سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اُردو میں نئے خیالات آرہے ہیں۔ اور زور شور سے آرہے ہیں۔ سوال اُٹھتا ہے کہ پھر کرنا کیا چاہئے

اس کا جواب ہی وہ شاہراہ ہے۔ جس کی نشاندہی اور جس پر چلنے کی اہلِ اُردو کو ضرورت ہے۔ وہ شاہراہ اگر دریافت ہو جائے تو دشوار گذار نہیں۔ سنیئے نئے اور انوکھے میں نوعیت کا بیّن فرق ہے۔ میری غرض یہاں نئے خیالات سے ہے۔ اور میں انہیں دو زمروں میں رکھتا ہوں یعنی داخلی اور خارجی۔ نیا خیال جو داخلی ہو۔ کسی قسم کی لسانیاتی دقّت پیش نہیں کرتا کیونکہ اس کا مولد آپ کا ذہن ہے۔ اور ذہن عموماً جانی پہچانی یعنی دیسی زبان کے ذریعہ سے تخیلہ کو روانی دیتا ہے۔ دقّت جو آکے پڑتی ہے وہ خارجی خیالات سے وابستہ ہے۔ وہ آپ کے ذہن کا مولود نہیں ہوتے۔ ان کا مولد دوسرے ذہن ہوتے ہیں جن کا وطن اور زبان بھی دوسری ہوتی ہے ترجمہ کا تو ذکر ہی کیا۔ پہلے جس طرح شعر کہتے وقت ذہن جامیؔ اور نظامیؔ۔ حافظؔ اور نظیریؔ کو دہرایا کرتا تھا۔ اسی طرح اب شیکسپیئر اور ورڈز ورتھ شیلےؔ اور اپنا قول فرانس وغیرہ کو دہراتا ہے۔ پہلے نظم نثر پر چھائی ہوئی تھی۔ اب دونوں ایک ہی پلڑے میں ہیں۔ وہ خارجی خیالات ہی ہیں جو زبان میں نیا پن اور کہیں کہیں انوکھا پن اور اوپرا پن پیدا کر رہے ہیں۔ ہر شخص کی نسبت یہ توقع کرنا کہ وہ اردو کا ماہرِ کامل اور قادر الکلام ہوگا

۱؎ منشورات ص ۲۶۱ ۲؎ ص ۱۰۱

ہے سو ایسا ہو یا نہ ہو۔ نئے الفاظ گھڑنے اور نئی ترکیبیں وضع کرنے کی
لائد ہے۔ پھر یہ ہونا چاہئے کہ جب ایسی ضرورت پیش آئے تو سب سے
معلومات کے مطابق اپنی زبان کا جائزہ لیا جائے۔ اس میں ناکامی ہو تو
دو لفظ کو نئے معنی پہنانے کی مناسبت اور معقولیت کی طرف رجوع کیا
۔ اس سے بھی کام نہ نکلے تو اردو کا نیا لفظ یا مرکب اختراع کیا جائے۔
بھی مطلب پورا نہ ہو تو غیر زبان کے لغات سے استفادہ کیا جائے۔ اگر ہم
ے اکثر اس اصول پر عامل ہوں تو اردو اپنی تصریفی قوت اور فعل اختراعی
روم نہ ہو گی۔

غیر زبانوں سے جو لغت لئے گئے۔ مان لیجئے کہ ضرورتاً لئے گئے لیکن یہ
اگیا کہ اس سے اور ضروری کلمے بھی بن سکیں گے یا نہیں۔ بلدیہ۔ وفد
یت۔ استعمار۔ اور سماج (سوسائٹی۔ جماعت) وغیرہ الفاظ جو اردو
اردو میں۔ ایسے ہیں کہ ان سے اور کلمے مثل۔ اسم فاعل، صفت، متعلق
وغیرہ نہیں بنائے گئے۔ یا یہ کہئے کہ اُردو میں نہیں لائے گئے۔ یہ کیوں ہوا
ہوا کہ اپنی زبان میں تلاش سے پہلو تہی کرکے باہر کا ایک لفظ لے کر موقع
ف دیا۔ وہ ضرورت حقیقی تھی یا غیر حقیقی پوری تو ہو گئی لیکن زبان اس
بہ تصرف نہ ہو سکی۔

انگریزی میں یہ سہل لٹکا ہے کہ ہر اسم سے پہلے to علامت مصدری لگا کر
ر بنا لیتے ہیں۔ جسے کوئی نہیں ٹوکتا۔ ٹوٹوٹ۔ ٹوابر (to ، ، ر ، ،)
کھئے۔ ہمارے ہاں بخشنا۔ بدلنا۔ گزرنا۔ بدلنا۔ گزرنا کھیلنا۔ آزمانا وغیرہ
مر ایک صدی کے قریب ہے تیس سال گزرے۔ میں نے تجویزنا گھڑا تھا۔
مولوی عبدالحق نے بر قانا۔ وضع کیا بس قصہ ختم۔

ہم میں ایک جماعت کو یہ ضد ہو گئی ہے کہ مصر اور دوسری جگہ کے عربی اور
ی جرائد وغیرہ میں جو اختراعات مستعمل ہو رہے ان کی بعینہٖ نقل کی جائے۔
لی چیزوں۔ اداروں کے نام اور اعلام تک کے لئے۔ حریت لسانی کے جذبے
محروم ہو کر غیر زبانوں کا رنگ اپنی زبان پر چڑھایا جاتا ہے۔ چڑیا گھر چھوڑ کر
ت الوحوش۔ پاگل خانہ کو چھوڑ کر بیت المجانین۔ بھوک ہڑتال سے دستبردار
ہ مقاطعہ جوعی کے سے عجیب و غریب مرکب استعمال کرنے کا لپکا پڑ گیا ہے۔
جب آپ کی زبان میں ٹ ہے اور ہے بھی تو ٹماٹا ئی کے بدلے تماشائی
ل لکھا جائے۔

ایک امر میں اور صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ اردو میں فارسی
اور عربی لفظ ابتدا سے داخل ہونے شروع ہوئے۔ اگرچہ اس کی انشاء کا ڈھانچ
اول سے ہندی یا پراکرت رہا۔ انگریزی سے سابقہ بہت بعد میں جاکر ہوا۔ اس لئے
اردو پر عربی کا حق انگریزی کے مقابلے میں فائق ہے۔ ایسا استدلال ہم کو لسانیاتی
خودکشی کے اقدام کا مرتکب ٹھیرائیگا۔ زبان کے معاملے میں جدی جائداد اور وراثت بازگشتی
کا اصول نہیں چل سکتا۔ سنیے اور غور سے سنیئے کہ زبان کا بڑا مقصد افہام و تفہیم ہے
اور یہ کہ اس زمانے میں ہمارے ثقات کی اکثریت انگریزی داں ہے۔ میں اپنے
بزرگوں کو فارسی میں خط لکھا کرتا اور فارسی ہی میں جواب آتے تھے۔ اب میرے اور
بندہ زادوں کے درمیان انگریزی میں خط و کتابت ہوتی ہے اور یہی حال شرفا میں
ننانوے فیصدی کا ہے۔ اردو کے تقریباً ہر رسالے اور ہر اخبار کا اڈیٹر انگریزی
جاننے والا ہوتا ہے۔ انگریزی میں مباحثے اور لکچر ہوتے ہیں۔ عربی فارسی یا سنسکرت
میں نہیں۔ اردو اور ہندی کے بعد انگریزی زندہ زبان بن گئی ہے۔ اگر آپ تھرمامیٹر
کہیں تو مجھے یقین ہے کہ سب سننے والے سمجھ جائینگے۔ مگر ان میں سے کئی شخص
ایسے ہونگے جو مقیاس الحرارت کو نہیں سمجھیں گے۔

علم معانی کے مدوّنوں نے جو غرابت۔ مخالفت قیاس لغوی اور اضمار قبل الذکر
وغیرہ کو فصاحت کے منافی قرار دیا ہے اس کی علت غائی یہی تھی کہ کلام کے سمجھنے
میں سامع یا قاری کو دقت نہ ہو۔

دیکھئے دو نئے لفظ یا ادارے حال میں ہمارے علم میں آئے ہیں ایک وائرلس
اور دوسرا ایئر مائنڈڈ۔ آپ اردو میں ان کی جگہ کیا کہیں گے۔ اول کی جگہ آپ
لاسلکی کا نام لیں گے تسلیم لیکن اس سے مصدر کیا بنائیگا۔ اگر آپ ایسا نہیں
کر سکتے تو اردو کے تمول میں ایزادی سے قاصر رہے۔ ایک جملے میں آپ اپنا مطلب
ادا کریں گے نتیجہ یہ کہ آپ اس لفظ کو اپنانے سے عاری رہے۔ میں کہتا ہوں کہ
اس سے ایک نیا مصدر لسلکانا کیوں نہ بنایا جائے۔ مرکبات میں ہمارا قدیم
دستور ہے کہ شروع سے دوسرا حرف حرف علت ہو تو مرکب بناتے وقت اسے
گرا دیتے ہیں۔ گال سے گل تکیہ۔ ناک سے نکسیر اور نکٹا۔ کان سے کن پھیڑ
اور کن رسیا۔ مونڈ سے منڈ بھیڑ۔ بھیک سے بھک منگا وغیرہ۔ اسی قیاس پر
لاسلکی سے الف اڑا دیا۔ اب یہ لفظ اپنا لیا گیا اور متدد ہو گیا۔ اب تک اجنبی
اور متداخل تھا۔ اب اردو والا بے تکلف لکھے گا کہ حملہ آور فوج کا کمانیر (تاریخ
وقت) لسلکاتا ہے کہ دشمن کی فوج —— ورنہ یہ لکھنا پڑتا —— بذریعہ

لاسلکی خبر دیتا ہے کہ ــــــ اب دوسرے لفظ ایرمانیڈ کو لیجئے یہی تو اس کی جگہ اردو میں ہواگیر کہونگا - اس سے ہواگیری وغیرہ آسانی سے بنائے جاسکتے ہیں۔ اگر آپ لسلکا نا کے حق میں نہیں تو لاسلکی سے ہاتھ اٹھایئے اور بے تار کی خبر سے کام چلایئے - اردو میں لاسلکی بھی قبول ہوگی جب اس مبتدا کی خبر بھی نکلے ورنہ یہ لفظ اجنبی اور ادیرا رہیگا - سبمرین کے لئے آبدوز نہایت موزوں اختراع ہے لیکن یہ اختراع اب تک مصدر اور افعال کے زیور سے عاری ہے ۱۹۱۵ء کے شروع مہینوں میں ایک اخباری تار کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے :- ــــــ "لوسی تینیا جہاز کو سارڈینیا کے نیچے آبدوزوں نے تباہ کردیا۔" کتنا اختصار ہوجاتا اگر یوں لکھ سکتے :- ــــــ "آبدوز اگیا" مطلب یہ کہ آبدوز سے آبدوزنا کیوں نہ بنایا جائے۔ ادہر گو اور ستے رخصت ہوئے - ادہر مرکب فعل کی جگہ اس نئے فعل نے لی۔ آزمانا ہچکچانا - تلملانا - جھپانانے سے کئی ٹکڑوں کے مصدر ہمارے ہاں پہلے سے موجود ہیں -

غیر ذی روح کلموں کی جنسیت کا قضیہ یہاں پیش نہیں کیا جائیگا جس سے متعلق عالم اردو میں اندرونی اختلاف پایا جاتا ہے کیونکہ اس سے مفصل بحث پہلے ایک جگہ آچکی ہے - وضع اصطلاحات پر بھی اردو میں اہل ادب کافی بحث سے کام لیچکے ہیں۔ مگر ایک اصول اس بارے میں نظرانداز ہوا ہے جس کا افسوس ہے یعنی اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا کہ اسم سے صفت بھی آسانی سے اور مدونہ قواعد کے تحت بن سکے مثال کے لئے مابعد الطبیعات ہی کو لیجئے یہ اتنا بڑا مرکب ہے کہ صفت کی توضیح کی اجازت نہیں دیتا۔ لواحق و روابط کی فہرست بھی ترمیم چاہتی ہے یہی حال استناد اور تصرف شخصی و لسانیاتی کا ہے۔

مختصر یہ کہ اگر کسی کا عندیہ صرف یہ اور اسی قدر ہو کہ ایک شاندار اور بارعب نثر یا ایک زوردار نظم اور اثرریز غزل لکھ دے اور بس تو میرا روئے سخن آس کی طرف نہیں - جن کا شعار اندھا دھند قدامت پرستی ہوگیا ہے۔ وہ بھی اس بحث سے خارج ہیں۔ وہ اپنی اُردو کی ملکیت پر نازو فخر کے ساتھ بیٹھے رہیں - اور اس کے مرثیے کی بحر اور صنف سوچتے رہیں - روئے سخن ان کی جانب ہے - جو اپنے تئیں اُردو کا مالک نہیں امین سمجھتے ہیں - جن کو اس مقدس کفالت کا احساس ہے - جن کی نظر ترقی کی اس شاہراہ پر پہنچتی ہے جس پر ملک کی اور زبانیں مستعدی سے چل رہی ہیں۔ اُن کا مطمح نظر ماضی نہیں بلکہ حال اور استقبال ہے . ان کا ذہن میر اور مرزا - قاموس اور برہان کے قلعوں میں محصور نہیں - وہ جانتے ہیں کہ ہمارے سخن اور ادب وانشاء کا میدان اسلاف کے میدان سے مختلف ہے - جن کی غائر نظر آنے والی دقتوں اور صفت خوانوں کا صحیح قیاس کرسکتی ہیں - جو نہ اردو کی نغزیت اور لوچ سے بے پروا ہیں - اور نہ جن کو فن کے معقول قواعد سے للّٰہی بغض ہے - وہ نہ ماخذ پرست ہیں نہ آثار عتیقہ کے دشمن -

جاننا چاہئے کہ اگر اُردو زندہ زبان ہے تو اس میں تبدیلیاں ہونگی - وہ اصلاح و ترمیم اور ترقی یا تنزل سے آزاد و مستغنی نہیں رہ سکتی - قدامت پرست ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ کیا وہ حضرات وہی زبان لکھتے اور بولتے ہیں جو اب سے دو صدی پہلے سو برس پہلے میں کہتا ہوں پچاس برس پہلے بولی جاتی تھی - متروکات کی لمبی فہرست کیا سبق سکھاتی ہے - جب آپ نے ناجی اور یکرنگ - ولی اور مظہر کی زبان چھوڑ دی اور اس میں تبدیلیاں اور ترقیاں کیں تو اب کہ متروکات جائز ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہی ہے کیا وجہ ہے کہ ناسخ اور آتش - غالب اور ذوق و مومن کی زبان میں ترمیم اور ترقی سے روکا جائے - ایک ترمیم دوسری ترمیم کے اور ایک ترقی مزید ترقی کے جواز کو مستحکم اور لابد قرار دیتی ہے - ہم کو آیندہ پر نظر رکھنی چاہئے - بزرگ کہ گئے ہیں

ع		مرد آخر بین مبارک بندہ الیست

رباعی

ایسا ہے کوئی جس سے ہوا ہو نہ گناہ؟		اعمال سے جس کے آشنا ہو نہ گناہ؟
وہ ترک گناہ کا سبق دے مجھ کو		جس نے کوئی دنیا میں کیا ہو نہ گناہ!
سیماب

---

[1] ملاحظہ ہو منشورات صہ ۸۲

غزل گوئی

میں آج ایک ایسا مسئلہ چھیڑ رہا ہوں جس کی مخالفت تو ہر طرف سے ہوگی۔ اور موافقت میں بمشکل دو چار سے زیادہ آوازیں بلند نہ ہوسکیں گی۔

کسی کلیۂ قدیم اور رواج عام کا توڑنا بچوں کا کھیل نہیں، اس کے لئے کافی جرأت اور طعن وتشنیع برداشت کرنے کی پوری قوت درکار ہے جرأت تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ اردو کی محبوب ترین چیز، یعنی غزل کے خلاف مضمون لکھ رہا ہوں، رہی طعن وتشنیع سننے کی قوت، سو اس کا بھی انشاء اللہ جلد اندازہ ہو جائے گا۔

میں سوال یہ اٹھانا چاہتا ہوں:-

(۱) کیا غزل "مصنوعی" اور جھوٹی شاعری کا آلۂ کار نہیں؟

(۲) کیا غزل گویوں کو صحیح معنی میں شاعر کہا جاسکتا ہے؟

ظاہر ہے اس سوال کا جواب دینے کی خاطر، پہلے ہمیں یہ طے کرنا پڑے گا کہ

(۱) شاعری کیا ہے؟

(۲) اور شاعر کسے کہتے ہیں۔

(۱) شاعری کیا ہے؟

یہ مسئلہ اس قدر طویل اور پیچیدہ ہے کہ دفتر کے دفتر سیاہ کرنے کے بعد بھی تسلی دشوار ہے۔ اس موضوع پر دنیا کی مختلف زبانوں میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ لیکن موضوع کی وسعت و نزاکت کے باعث کوئی ایک ایسی تعریف، جس پر کسی زمانے میں بھی اجماع ہوسکا ہو، اب تک معرض وجود میں نہیں آئی ہے

میں اس مقالے میں طوالت سے گریز کر کے مختصر راستہ اختیار کرنے ہی پر قناعت کروں گا۔ اس لئے اور بھی طوالت کو فضول سمجھتا ہوں کہ ظاہر ہے اس مقالے کو وہی حضرات دلچسپی سے پڑھیں گے، جن کا ادبی ذوق اچھی طرح ترقی یافتہ ہوگا۔ اور یہ یقین ہے کہ ان کے واسطے اشارات کے ذریعے سے عبارات کے تمام محذوفات و مفقودات تک پہنچ جانا دشوار نہ ہوگا

یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی میں آئے دن انسانی قلب پر جو اثرات پڑا کرتے ہیں۔ وہ شعوری و غیر شعوری طور پر نوع انسانی کے افعال، افکار اور اقوال کو مختلف سانچوں میں ڈھالا کرتے ہیں۔ لیکن جب شاعر کے قلب پر یہی اثرات پڑتے ہیں تو اُن کی کیفیت و شدت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ توپوں اور بادلوں کے گرجنے سے غیر شاعر پر وہ اثر نہیں پڑتا جو عینک کے تال پر ایک ذرے کے گرنے سے شاعر کے دل پر ہوتا ہے۔ ہر وہ جذبہ خواہ دیکھنے میں کتنا ہی حقیر ہو جو شاعر کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور ہر وہ اثر جو شاعر کے قلب پر پڑتا ہے وہ اس کے دل و دماغ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جنبش کرنے لگتا۔ اور اس کے خون میں شامل ہوکر اس کے ہر بن مو میں سرایت کر جاتا ہے۔ اور اس کے مشتعل سینے میں اس وقت تک برابر تڑپتا اور مچلتا رہتا ہے۔ جب تک کہ اپنے بہ احسن الوجوہ اظہار کے لئے مناسب الفاظ اور موزوں بحر انتخاب نہیں کرلیتا۔ اور مناسب الفاظ اور موزوں بحر، جیسے ہی اس کی گرفت میں آجاتی ہے وہ "شعر" بن کر شاعر کے قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔

میرا مدعا یہ ہے کہ شاعر جو کچھ دیکھتا اور سنتا، سونگھتا چھوتا اور چکھتا ہے۔ جو کچھ اس پر گذرتی یا وہ دوسروں پر گذرتے ہوئے دیکھتا ہے نیز جو کچھ بھی وہ سوچتا، سمجھتا اور غور کرتا ہے، یہ تمام چیزیں اس کے دل و دماغ میں کروٹیں لیتی رہتی ہیں اور جلد یا بدیر پختہ و رسیدہ ہوکر "شعر" کا لباس اختیار کرلیتی ہیں۔ کبھی تو یہ عمل بجلی کی سرعت کے ساتھ واقع ہوتا ہے۔ اور کبھی دیر لگ جاتی ہے۔ لیکن.............

قطعی ناممکن ہے کہ شاعر پر کوئی اثر پڑے اور وہ "شعر" بننے کے عوض خود اسی کے دماغ میں کھپ کر رہ جائے۔ اور اپنے پالنے ہی میں گھٹ کر مرجائے

شاعری جہاں آپ بیتی ہے۔ وہاں جگ بیتی بھی ہے۔ شاعری اگر داخلی ہے تو خارجی بھی ہے۔ اس لئے اگر ہم شاعری کو حیات کی مصوری اور زمانے کی تاریخ نویسی کا لقب دیں تو دراصل یہ لقب حقیقت سے بعید نہ ہوگا

اس بات کو ذہن میں رکھئے گا کہ میں نے شاعری کو "حیات کی مصوری" اور "زمانے کی تاریخ نویسی" کہا ہے۔

(۲) شاعر کسے کہتے ہیں؟

ہرچند یہ سوال اپنے پہلے سوال کے مقابلے میں آسان ہے لیکن اس کے متعلق بھی ارباب فن میں اختلاف آرا کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔

میں تو بہرحال مختصر ترین طور پر یہ عرض کر دوں گا کہ میرے نزدیک شاعر وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ حساس ہو۔ اس کے جذبات شدت کے ساتھ سریع الاشتعال ہوں اور وہ اپنے احساسات اور جذبات کو بہترین الفاظ میں ادا کر دینے کی قدرت بھی رکھتا ہو۔

یہ تو شاعری کی عمومی اور مختصر تعریف ہوئی۔ میں تشریح کی خاطر شاعر کی چند خصوصیتیں بھی عرض کر دوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

شاعر کی طبیعت یہ ہے کہ وہ کائنات کے ہر ذرے، حیات کے ہر تیور، حواس و ماورائے حواس کے ہر پہلو، احساسات کے ہر رخ اور جذبات کی ہر ادا کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس سے متاثر ہوتا ہے اور ان تاثرات کو موزوں ترین جامۂ الفاظ پہنانے کی صلاحیت و قدرت بھی رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ شاعر کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی ایک موضوع، کسی ایک مقصد، کسی ایک تعلیم، کسی ایک فلسفے اور حیات کے کسی ایک رخ کے اندر قید ہو کر نہیں رہ سکتا ہے۔ وہ تو قرآن کی زبان میں ہر آن نئی نئی وادیوں کی سیر کیا کرتا ہے۔ وہ تو ہواؤں کی طرح آوارہ ابر کی طرح بے پروا خرام۔ تصورات کی طرح بے قید و بند، اور اثیر کی طرح آزاد ہوتا ہے۔

وہ کہیں ٹھہر بھی کیوں کر سکتا ہے؟ اس کے کانوں میں تو ہر آن "جرس فریاد می دارد کہ بربندید محل ہا" کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں اس کے سپرد تو اتنے ناقابل شمار فرائض ہوتے ہیں کہ وہ کسی ایک منزل میں ٹھہر ہی نہیں سکتا اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ حالانکہ ہر منزل اس کی ہے اس کا کام تو آفتاب کی طرح ہر پست و بلند پر چمکنا اور ہواؤں کی طرح ہر خار و گل کا منہ چومنا ہے۔ وہ تو اپنے مشاغل کی فراوانی کے باعث گھبرایا گھبرایا سا رہتا ہے۔ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے، کس فریضے کو انجام دے اور کسے ملتوی کر دے، اسے تو ہر چھوٹے سے چھوٹا ذرہ دردناک لہجے میں آواز دیتا ہے کہ "اے شاعر! مجھے بھی شعر بنا تا جا!" وہ تو زمین اور آسمان کی طرف دیکھ کر "ہر بن موئے مرا با تو زبان است" کی آواز بلند کرتا رہتا ہے اور پھر قدرت کی طرف اشارہ کر کے چیخ اٹھتا ہے:۔

> در ہیچ مقامم نہ گذارد بدرنگے
> از بوئے ببوئے برد از رنگ برنگے

اس کے علاوہ عرض کیا جا چکا ہے، اور اس کے یاد رکھنے کی استدعا بھی کی جا چکی ہے کہ "شاعری حیات کی مصوری" اور "زمانے کی تاریخ نویسی" کا نام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شاعر کا ہر شعر اس کی سیاحت حیات کا اندازہ لگانے والوں کے لئے "ایک قدم" ہوا کرتا ہے۔ شاعر کے کلام سے آپ اس کے مزاج کی افتاد، اس کے احباب اور خاندان کا معیار، اس کی زندگی کے مختلف واقعات معلوم کر سکتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اس کا کلام اس کی ایک نوع کی بایوگرافی (سوانح عمری) ہوتا ہے۔ اور صرف یہیں تک نہیں۔ آپ کو اس کے کلام سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کے زمانے کی سوسائٹی کا کیا رنگ تھا۔ اس کے دور میں عام پبلک خیالات کی نوعیت کیا تھی، اس وقت کے معاشری، تمدنی مذہبی اور سیاسی اشعار کیا تھے اور اس کے ہم عصروں کی ذہنیتوں کا رخ بالعموم کس طرف تھا۔

اگر شاعری اور شعر کی یہ مختصر تعریفیں جو میں نے مجلا پیش کی ہیں درست ہیں تو آئیے اس روشنی میں اپنی "غزل" اور اپنے "غزل گویوں" پر نگاہ ڈالیں

ہماری غزل

شاعری کے باب میں عرض کر چکا ہوں کہ قلب پر جو اثرات پڑا کرتے ہیں وہ اپنے اظہار کے لئے موزوں بحر اور مناسب الفاظ تلاش کر کے شاعر کے قلم سے شعر بن کر ٹپک پڑتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہماری غزل اسی فطری سلسلۂ عمل کا نتیجہ ہوتی ہے؟ یعنی کیا پہلے غزل گو حضرات پر کسی نوع کا کوئی اثر پڑتا ہے۔ اس اثر سے ان کے جذبات میں ہیجان آ جاتا ہے اور اس کے بعد وہ اثر ان کے سینے میں اس وقت تک تڑپتا رہتا ہے جب تک اپنے اظہار کی خاطر موزوں بحر و مناسب الفاظ تلاش کر کے شعر کی صورت اختیار نہیں

کرلیتا؟ اگر ایسا نہیں ہے تو کیا سب سے پہلے ان کے پیش نظر چند ردایات اور چند الفاظ کا ایک مجموعہ ہوتا ہے جسے موزوں کر دینے کی خاطر وہ بعد کو اشعار پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں؟ اور آیا تحقیق اور سچی شاعری کی تعریف میں پہلی صورت درست ہے یا دوسری؟

اس کی تحقیقات کا سب سے آسان ذریعہ یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ آیا غزل کس طرح سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ غزل بالعموم مصرعِ طرح پر کہی جاتی ہے اگر مصرعِ طرح ہے

"اقرار کر لیا کبھی انکار کر دیا"

تو ہمارے غزل گو کیا کریں گے؟ بیمار، رفتار، گفتار، تلوار، اغیار، یہ تمام قوافی لکھ کر سامنے رکھ لیں گے، یا جو مشاق ہیں وہ ان تمام قوافی کو ایک خاص حصۂ دماغ میں جمع کرلیں گے یا انتہائے مشق کے باعث یہ تمام قوافی خود بخود ان کے دماغ میں یکے بعد دیگرے آتے جائیں گے۔ اور اس کے بعد انتہائی کد و کاوش اور دقتِ نظر کے ساتھ ہمارے شعرا غور فرمانے لگیں گے کہ "اقرار" پر کیا کہا جائے۔ "انکار" کو کس طرح نباہیں، اور "اغیار" کو کیوں کر "باندھا" جائے اس کے بعد دوسری منزل آئے گی "اقرار"، "انکار" اور "اغیار" کے بندھے گٹھے، یا کہے ہوئے مصرعوں پر مصرعے لگانے کی، اور بسا اوقات یہ ہوگا کہ پہلا مصرع دس دس بار کاٹنے پر بھی حسبِ مراد نہ لگ سکے گا۔

یہ ہے وہ سلسلۂ عمل جس سے غزل طیار کی جاتی ہے۔ میں دریافت کرتا ہوں کیا یہ سلسلۂ عمل حقیقی اور فطری ہے؟ یہ جذبات اور تاثرات کی سحر کاریاں ہیں؟ یا الفاظ کی بازی گریاں؟ کیا ایسے اشعار کو جنھیں محض چند الفاظ کی خاطر جذبات نے نہیں، مشاقی و موزونیٔ طبع نے پیدا کیا ہے الہامی اور حقیقی شعر کہا جا سکتا ہے؟

کیا یہ ناقابلِ انکار حد تک واقعہ نہیں ہے کہ ہمارے غزل گو حضرات تمام انسانی جذبوں کی گرفت سے بالاتر رہتے ہوئے محض الفاظ کو ٹٹولا نہیں کرتے اور محض چند قوافی کو "تابندہ" کر شاعری کو رسوا نہیں کیا کرتے ہیں؟ اور کیا یہ حقیقت اور ثابت شدہ امر نہیں کہ ہمارے "شعرا" الفاظ کے ذریعے سے اپنے اوپر وہ اثر یا کیفیت، طاری کرنے کی ناکام، غیر فطری اور قابلِ مضحکہ سعی نہیں کرتے جو حقیقی شعرا پر خاص حالت کے ماتحت قدرتاً طاری کیا کرتی ہے؟ اور کیا یہ سعی بالکل ایسی نہیں ہے کہ جیسے قطعی طور پر ہنسی نہ آرہی ہو۔ وہ بہ تکلف اور زور لگا کر ہنسنے کی کوشش کرے یا ہنسی کا منہ بنا لے۔

جذبے کے ذریعے سے الفاظ کا سیدھا اور فطری راستہ چھوڑ کر ہمارے غزل گوؤں نے "الفاظ کے ذریعے سے جذبے" کا غلط اور غیر فطری راستہ، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کیوں اختیار فرمایا ہے؟

کیا طرح بالکل ایسی صورت حال نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی عورت کو راستے سے پکڑ کر ہمارے سامنے لے آئے اور کہے اس پر عاشق ہو جایئے کیا ہم فوراً عاشق ہو جائیں گے۔ کیا عشق فرمائشی چیز ہو سکتا ہے کیا انسان فرمائشی عاشق بن سکتا ہے اور کیا اس کے یہ صاف و صریح معنی نہیں کہ ہم سے مسخرا پن کیا جا رہا ہے؟

فرض کیجیے "دوست کی خاطر ہم ایسی لائی ہوئی عورت سے اظہارِ عشق بھی کرنے لگیں۔ لیکن کیا وہ اظہار ہر جہت و ہر حیثیت سے فرضی و مصنوعی نہ ہوگا؟

اب رہیں طبع زاد غزلیں، سو اُن کی شان میں بھی کچھ سُن لیجیے۔

غزلوں کی نوعیت کے باب میں خواہ وہ طرحی ہوں یا طبع زاد، یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھیے گا کہ ان کا ہر شعر علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ یعنی ایک شعر کو دوسرے شعر سے قطعی کسی قسم کی معنوی یا لفظی مناسبت نہیں ہوا کرتی مطلعے میں اگر ہجر پر نالہ و شیون ہے تو عین مطلع کے بعد وصل پر اظہار شادمانی و کامرانی ہے اس کے بعد کوئی تصوف کا مسئلہ آ جاتا ہے۔ پھر معشوق کی شقاوتِ قلب کا رونا رو دیا جاتا ہے اس کے بعد فوراً زاہدوں سے ہاتھا پائی ہونے لگتی ہے کہ یکایک رقیب روسیاہ ظاہر ہوتا ہے اور شاعر صاحب کو دھکے دے کر بزمِ جاناں سے نکال دیتا ہے اور فوراً ہی اس کے بعد شاعر صاحب اپنے آبا و اجداد کی سو پشت کی مانی ہوئی سپہ گری کی قصیدہ خوانی شروع فرما دیتے ہیں —— یہی ہے نہ غزل، یا کچھ اور؟

اب ملاحظہ فرمایئے۔ بات تو نفسیات ہی کی ہے مگر اس قدر سادہ اور عام فہم کہ ہر شخص اتنا بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ کم سے کم نوعِ انسانی پر تو وقتِ واحد میں جذبۂ واحد ہی طاری ہو سکتا ہے ایسا تو ازل سے اس لمحے تک کبھی ہوا ہی

نہیں ہے اور نہ ہو ہی سکتا ہے کہ ہم ایک ہی لمحے میں مغموم بھی ہوں اور مسرور بھی ـــــ ایک ہی لمحے میں رو بھی رہے ہوں اور ہنستے بھی جاتے ہوں اور جب یہ شکل قطعی طور پر ناممکن ہے تو خدا را بتلائیے کہ پھر غزل میں اتنے متضاد جذبے کہاں سے آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ اور ہمارے شعرا پر اس قدر مختلف کیفیتیں ایک ہی وقت میں کیوں کر طاری ہو جاتی ہیں؟ کیا غزل کہتے وقت دنیا بھر کے تمام مختلف النوع اور متضاد جذبے اور اثرات ہمارے شعرا کے دل و دماغ کو ہارمونیم نواز کی انگلیوں کی طرح چھونے لگتے ہیں؟

کیا اب بھی یہ ثابت کرنے میں کسر باقی رہ گئی ہے کہ ہماری طرحی اور طبعزاد دونوں قسم کی غزلیں جذبے اور تاثر کے تحت نہیں۔ بلکہ محض الفاظ کی خاطر کہی جاتی ہیں؟

اگر کوئی غزل کسی خاص جذبے اور کسی خاص اثر کے تحت کہی جائے تو لازماً وہ شروع سے آخر تک ایک، اور صرف ایک ہی جذبہ و اثر کی حامل ہوگی اس میں کسی دوسرے جذبہ و اثر کی گنجائش کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

ہماری غزلیں تو محض الفاظ کی بازی گری، اور شاعری کی نقالی کے نمونے ہیں، اُن کو شعر و شاعری سمجھنا، اپنی سخن سنجی کو رسوا کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

اس کے علاوہ غزل کے دو بڑے عیب اور بھی ہیں۔ غزل بالعموم محفلوں میں ساز پر گائی جاتی ہے۔ فرض کیجئے کسی محفل میں رندانِ خوش دل کا اجتماع ہے اندھیری رات ہے۔ اور جھما جھم پانی برس رہا ہے۔ اس وقت ہر طبیعت چاہتی ہے کہ کوئی ایسی چیز گائی جائے جو خالص نشاطی اور ولولہ انگیز ہو، یا کسی محفل میں ہجر کے مارے ہوئے چند احباب جمع ہو گئے ہیں اور چاہتے ہیں کوئی ایسی چیز گائی جائے جس سے انھیں تسلی ہو۔ انھیں ٹھمریوں اور دادروں میں تو ایسی بے شمار چیزیں مل جائیں گی۔ لیکن نہیں ملے گی تو ہماری غزلوں میں کوئی ایسی چیز جو اُن کے جذبات کو آسودہ کرے۔ یہاں تو ہر غزل ایک ایسا "چوں چوں کا مربہ ہے" جس میں کسی جذبے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔

دوسرا عیب یہ ہے کہ تندرست ذہنیت کے سامع کو جو شروع سے آخر تک ایک خاص جذبے کا ایک مکمل مطالعہ چاہتا ہے غزل ایک شدید انتشارِ طبع میں مبتلا کر دیتی ہے

غزل کے اشعار دراصل ٹھوکریں ہوتے ہیں اور سامع کا دماغ فٹ بال

اسی کے دوش بدوش یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ غزل یا غزل کے مماثل کوئی صنف دنیا کی کسی زبان کی شاعری میں نہیں پائی جاتی۔ تمام دنیا کی زبانوں میں مسلسل نظموں کے علاوہ غزل کا کہیں نام تک نہیں ہے۔ اور اس نقطۂ نظر سے کیا یہ مان لیا جائے کہ فارسی کے علاوہ اردو جیسی کوئی چیز ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں آج تک کوئی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا ہے؟ کیا آپ اس کے ماننے پر تیار ہیں؟

بعض حضرات گھبرا کر انگریزی کے "سانٹ" پیش کر دیا کرتے ہیں۔ اور گھبراہٹ ہی ٹھہری۔ انھیں یہ خیال نہیں رہتا کہ سانٹ بھی ایک اور صرف ایک خیال ہی کی ترجمانی کرتے ہیں۔

بعض احباب فرماتے ہیں کہ ہم ایک نشست میں کب غزل کہتے ہیں کم سے کم دو چار نشستوں میں غزل پوری ہوتی ہے اور اس لئے اس کے اشعار میں اختلاف و تضاد ہوتا ہے۔

اول تو مشاق شعرا کے یہاں یہ ہوتا ہی نہیں، وہ اکثر و بیشتر ایک ہی سانس میں ایک نہیں دو دو تین تین غزلیں تیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ بھی مان لیا جائے تو کم سے کم ہر نشست کے شعر تو ایک ہی رنگ کے ہونا چاہئیں جن سے پتا چل جائے کہ اول نشست میں شاعر کے دل و دماغ کی یہ کیفیت تھی اور دوسری نشست میں وہ ان جذبات کا حامل تھا لیکن افسوس کہ ایسا بھی نہیں ہوتا۔ ہر شعر دوسرے سے جدا ہوتا ہے اور ہر نفس کہ فرومی رود محو زمیں، و چوں برمی آید مائل بہ آسماں" کے مانند اپنے اپنے ترانے الگ الاپتا ہے۔

بعض متغزلین کا یہ ارشاد ہے کہ ہم جذبات اور تاثرات سے خالی ہو کر کبھی شعر نہیں کہتے۔ ہماری زندگی کے تاثرات و تجربات کو تو قوافی جگا دیا کرتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر اتفاق سے "بیمار" کا قافیہ ہمارے پیش نظر ہے تو ہمیں کوئی اپنی بیماری یاد آ جاتی ہے اور اگر سرشار کا قافیہ سامنے ہے تو ہمیں اپنی یا کسی دوسرے کی سرشاری یاد آ جاتی ہے اور اس طرح حافظے کے بیدار ہوتے ہی ہمارے تاثرات اور جذبات بھی بیدار ہو جاتے ہیں اور اس کیفیت میں ہم جو شعر بھی کہتے ہیں وہ فطری ہوتا ہے۔ یہ الفاظ کے ذریعے سے بیتے ہوئے اور خوابیدہ واقعات کے اتفاقیہ طور پر جاگ اٹھنے کی کیفیت اس قدر "تیس تیسی" اور ناقابلِ اعتبار ہے کہ اس پر غور بھی نہ کرنا چاہئے الفا

کے ذریعے سے معانی اور حافظے کی وساطت سے جذبات تک رسائی خواہ کچھ بھی ہو، الہامی، درحقیقی شاعری تو ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تو بالکل ایسی چیز ہے جیسے مشین کے ذریعے سے انڈوں سے بچے نکالے جاتے ہیں۔

بعض حامیانِ غزل یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہم وسیع خیالات کو دبا اور بھینچ کر صرف دو مصرعوں میں ادا کر دیتے ہیں۔ کیا یہ کمال نہیں ؟ میں بھی اس کمال کا اسی طرح قائل ہوں جیسے سرکسوں کے مختلف کرتبوں کا۔ لیکن اگر وہ مجھ سے یہ مطالبہ بھی کریں کہ میں اس "کمال" کو "شعر" بھی تسلیم کر لوں تو کم سے کم میں تو اس پر ایک لمحے کے واسطے بھی طیّار نہیں ہو سکتا۔

یہاں تک تو غزل کا مسئلہ تھا۔ اب آئیے ذرا غزل گویوں کا بھی جائزہ لے لیں۔ عرض کر چکا ہوں کہ شاعر سب سے زیادہ حسّاس اور سریع الاشتعال جذبات کا حامل ہوتا ہے، وہ آفتاب کی طرح اس کرۂ ارض کے ذرّے ذرّے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ حیات کے کسی ایک خاص پہلو، اور کائنات کے کسی ایک خاص شعبے کا صیدِ زبوں ہو کر نہیں رہ جاتا اور اس کے کلام سے اس کے سوانح، اور اس کے عہد کے حالات مرتب و مدوّن ہو سکتے ہیں۔

اس تعریف کی روشنی میں ذرا اپنے "شعراء" کے خال و خط ملاحظہ فرمائیے تعریف کے ہر پہلو کو پیش نظر رکھئے اور دیکھئے آپ کے "شعراء" کہاں تک "شاعر" کے پیمبرانہ خطاب کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

قطب شاہیوں کے دور سے لے کر اس عہد تک کے شعراء کا کلام پڑھئے کیا یہی ایک حسن و عشق کا موضوع ہر جگہ نہیں پایا جاتا؟ شاعر اور صرف ایک موضوع۔ کتنی حیرت ناک بات ہے !

یہ سچ ہے کہ شاعری میں سب سے زیادہ دل کش موضوع حسن و عشق ہی کا ہے۔ لیکن شاعر کے لئے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ زندگی بھر ایک ہی موضوع سے وابستہ رہے اُسے اِس پورے کرۂ ارض کی کوئی دوسری شے تمام عمر متاثر ہی نہ کر سکے ؟

کیا ہمارے "شعرائے کرام" کی زندگیوں میں کبھی مست گھٹائیں جھوم کر نہ آتی تھیں کبھی پپیہا نہیں کوکتا تھا کبھی چاندنی کھیت نہیں کرتی تھی کبھی برستی اور جھومتی ہوئی راتیں بال نہیں بکھراتی تھیں کبھی پیچ و خم کھاتے ہوئے دریا اُن کے سامنے نہیں لہراتے تھے اور کبھی افق کا دریچہ کھول کر دوشیزہ سحر اُن کے روبرو نہیں مسکراتی تھی۔

اس کے علاوہ کیا اُن کی معاشرت و سیاست میں کبھی کوئی قابلِ ذکر انقلاب نہیں ہوا تھا کبھی اُن کی قوم پر کوئی دل ہلا دینے والی مصیبت نہیں آئی تھی۔ کبھی ان کا کوئی دوست نہیں بچھڑ گیا تھا کبھی کسی نے ان پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ کبھی انھوں نے کسی یتیم کا اُترا ہوا منہ، اور کسی نوجوان بیوہ کی اُجڑی ہوئی کاکلیں نہیں دیکھی تھیں ؟ اور کیا کبھی انھوں نے کسی ظالم و غاصب کو خدا کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے نہیں دیکھا تھا ؟

اور اگر انھوں نے یہ تمام مناظر و واقعات دیکھے تھے، اور ضرور دیکھے تھے۔ تو مروت و رعایت اور بزرگ پرستی کو بالائے طاق رکھ کر جواب دیجئے کہ کیا اس گروہ کو حسّاس ترین گروہ کہہ سکتے ہیں اور کیا یہ "شعراء" سریع الاشتعال جذبات کے حامل کہے جا سکتے ہیں ؟

حساس ہونا تو بڑی چیز ہے میں تو یہ پوچھوں گا کہ وجہ بتائیے میں انھیں قطعی طور پر بے حس، اور بے شرم کیوں نہ تسلیم کروں ؟ پھر یہ سوال کروں گا کہ اس بے پایاں حد کے بے حس اور بے شرم اشخاص کیا "شاعر" کے لقب سے پکارے جا سکتے ہیں ؟ کیا "شعراء" ایسے ہی ہوتے ہیں ؟ اور کیا "شاعر" اس پورے کرۂ ارض اور اس عظیم الشان حیات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے زندہ بھی رہ سکتا ہے ؟

اگر کوئی یہ کہے کہ صاحب آپ اس قدر تلخی نہ کریں یہ تو مغلوب الحال "عشاق" تھے، انھیں اپنے عشق اور معشوق سے فرصت ہی کب ملتی تھی۔ کہ دنیا کی کسی اور شے کو دیکھ سکتے۔

اس کا ایک جواب تو بہت ہی طوالت آمیز نفسیاتی بحث چاہتا ہے یعنی اس نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی جائے کہ عشاق کی ذہنیت کیا ہو جاتی ہے اور کیا اس ذہنیت کے پیدا ہو جانے سے ان میں اپنی قوم کی محبت، یا کسی یتیم پر ترس کھانے، یا کسی بیوہ پر رحم کرنے کا مادہ باقی رہ جاتا ہے کہ نہیں؟ اور عشاق پر آیا موسموں کے اثرات بھی مترتب ہوتے ہیں، یا وہ "موسم پروف" ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن طوالت کے خیال سے میں سرِ دست اس بحث میں پڑنا مناسب نہیں سمجھتا۔

میں تو اس بات کا کہ یہ حضرات عشاق تھے اور اس وجہ سے دنیا کی کسی اور شے کو دیکھ ہی نہیں سکتے تھے، یہ سیدھا سا جواب دوں گا، کہ آئیے اُن کے کلام پر نگاہ ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ یہ صحیح معنیٰ میں عشاق بھی

تھے کہ نہیں

میں نے تو جہاں تک ان "شعراء" کا کلام پڑھا ہے۔ روایتی اور موروثی عشق کی بجز اس کے علاوہ حقیقی اور عملی عشق کا تو مجھے کم سے کم ایک بار بھی پتہ نہیں چلا۔

واضح ہو کہ حقیقی، اور عملی عشق کے تیور ہی کچھ اور ہوا کرتے ہیں، اگر یہ حضرات واقعی جیتے جاگتے معشوقوں کے عاشق ہوتے تو لاکھوں اور ہزاروں میں کم سے کم دو چار معشوق تو ایسے بھی نکل آتے جو ان کے عشق کو قبول کر لیتے ان سے بھی محبت کرنے اور ان کے عشق میں بھی آہیں بھرتے۔ لیکن ایک ایک کر کے ان شعرا کے تمام ردیف وار کلیات و دواوین دیکھ جائیے۔ ہر جگہ آپ کو معشوق بے وفا، قاتل، خونی، اغیار پسند، رقیب نواز اور عاشق کش ہی ملے گا۔

آخر یہ کیا بات ہے؟ کیا ہمارے "شعرائے کرام" بغیر استثنار سب کے سب اس درجہ مکروہ صورت واقع ہوئے تھے کہ آج تک ان پر کسی معشوق کا دل آیا ہی نہیں؟ اور اس کے ساتھ اس پر بھی غور کیجئے کہ اگر یہ عملاً عشق پیشہ حضرات تھے تو کسی ایک خدا کے بندے کو تو اتنی توفیق ہوتی کہ وہ رقیب روسیاہ پر غالب آجاتا!

آخر یہ کیا معمہ ہے؟ کیا ہمارے "شعرائے کرام" بغیر استثنار سب کے سب اتنے بزدل تھے۔ کہ آج تک رقیبوں سے جیت ہی نہ سکے؟

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ اگر یہ حضرات واقعی شاعر و عاشق تھے تو ان کے کلام میں ان کی انفرادیت کیوں جھلکتی نظر نہیں آتی ہے؟

یہ سب کے سب تو ایک ہی طرح کی باتیں کر رہے ہیں کیا انکی شاعری پڑھی سکھائے ہوئے گواہوں کے بیانات کی طرح ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوئی نہیں ہے؟

اردو شاعری کے آغاز سے اس وقت تک ہندوستانی زندگی میں کتنے سیاسی و معاشرتی انقلابات ہو چکے ہیں لیکن ان کے دواوین میں اُن کا پتہ تک نہیں چلتا۔

کیا ان کی شاعری حیات کی مصوری، وہ زمانے کی تاریخ نگاری کہی جا سکتی ہے؟ کیا ان شعراء کو ہم "مصورِ حیات" اور "مورخِ عصر" کا خطاب دے سکتے ہیں؟

یہ چیزیں تو بہت بڑی ہیں ان غریبوں کے "کلامِ موزوں" سے تو پتہ تک نہیں چلتا۔ کہ یہ کس عہد میں پیدا ہوا اور وہ کس زمانے میں مرا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام شعراء ایک ہی زمانے میں موجود تھے ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ ایک ہی استاد کے شاگرد تھے۔ ایک ہی غسل خانے میں نہاتے اور ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔ ایک ہی کمرے میں اور ایک ہی لانبے سے تکیے پر سب کے سب سر رکھ کر سوتے تھے اور ایک ہی دن سب پیدا ہوئے تھے اور ایک ہی دن سب کے سب مر گئے تھے یہ ہیں ہمارے "مصورانِ حیات" یہ ہیں ہمارے "مورخانِ عصر" یعنی ہمارے شعرائے جلیل و کبیر!!

آہ کس سے یہ حقیقت بیان کی جائے اور اس دورِ خام و خام نوازی میں کون اس پر یقین لا سکیگا کہ ہر شاعر، موزوں طبع ہوتا ہے لیکن ہر موزوں طبع شاعر نہیں ہوتا! کیا میری قوم ایک لمحے کے لئے غور کرے گی کہ غزل کو باقی رکھنے میں کتنا ادبی نقصان اور کس قدر سیاسی خطرہ ہے؟

رباعی

ہر علم و یقین ہے اک [illegible] اے ساقی
ہر دین ہے اک [illegible] اے ساقی
اس وہم سرا ارض و سما کو للہ
اٹھا رطل گراں میں غرق کر دے ساقی

(جوش ملیح آبادی)

بالِ جبریل پر ایک نظر

(از جناب نواب جعفر علی خانصاحب اثر کلکٹر دیرہ دون)

بانگِ درا کے بعد ڈاکٹر سر محمد اقبال کی دوسری تصنیف اُردو میں بالِ جبریل کے نام سے شائع ہوئی ہے، عام خیال ہے کہ بالِ جبریل ہر اعتبار سے بانگ درا سے پست اور مایوس کُن کتاب ہے اس میں وہ جوش و ولولہ، وہ تڑپ، وہ دردِ قومی وہ جذبۂ ملّی نہیں ہے جو بانگ درا کا طرۂ امتیاز ہے۔ سطحی نظر جو چاہے فیصلہ کرے غائر بیں نگاہیں بالِ جبریل میں شاعر کے تخیلی ارتقاء کی بلند تر منزل دیکھتی ہیں۔ خیالات بانگ درا کی بہ نسبت زیادہ گہرے اور زیادہ دقیق حقائق پر مبنی ہیں جن پر عبور کے لئے دقت نظر درکار ہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ الفاظ کے تار و پود میں اُلجھکر حقیقت کی عقدہ کشائی سے معذور ہو چکے ہیں۔

دونوں کتابوں کے نام بھی اُنکے مطالب پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بانگِ درا میں مسلمانوں کے قافلے کو منزلِ مقصود تک پہونچانا شاعر کا مطمح نظر تھا۔ بیداری و آزادی و گرم روی کا پیام دیا، اسلاف کے گزشتہ شاندار کارنامے یاد دلائے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کے پردے میں پچھلی عظمت اور موجودہ پستی سے آگاہ کیا، جمود و تنزل کے اسباب گنائے۔ "دنیائے اسلام"، "طلوعِ اسلام" اور اسی نوع کی دوسری نظموں کے ذریعے سے تلقین کی کہ ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مگر نتیجہ کیا ہوا؟ مسلمان بدستور خوابِ غفلت میں مبتلا ہیں۔ گویا بانگِ درا صدا بصحرا ثابت ہوئی! اب غیور و خوددار اقبال ایسی مُردہ قوم سے تخاطب اپنی کسرِ شان سمجھتا ہے، مگر دل میں درد کی کسک باقی ہے لہذا فضائے ملکوتی میں بال کشا ہو کر جبریل کو دوبارہ "لب تشنۂ وحی" بناتا ہے اور اُن اسباب و علل پر غور کرتا ہے جو ایسی تیز حدی خوانی کے باوصف مسلمانوں کو برسرِ کار آنے سے مانع ہیں۔ وہی سوز و گداز جو بانگِ درا میں "شکوہ" بنکر زبان پر آیا بالِ جبریل میں اسلام کی تباہی پر آنسو نہیں بہاتا بلکہ خدا سے پوچھتا ہے ع زوالِ آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

اقبال کا خیال ہے اور بالکل درست ہے کہ ہم میں سچے رہنما یا لیڈر باقی نہیں رہے، لیڈر سے اُنکی مراد محض سیاسی مدبّر نہیں ہے بلکہ ایسا شخص جو اسلام کو صحیح معنی میں اسلام جانتا اور مانتا ہوا اور کاربند ہو کر ایک زندہ مثال اسلامی شعار و کردار کی دنیا کے سامنے پیش کرے ؎

منزلِ راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے ÷ کوئی اس قافلے میں قافلہ سالار بھی ہے!
بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن ÷ اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے؟

دل کے ٹکڑے ہیں جو شعر بن گئے ہیں۔

مگر دیکھتا ہے تو حیدرِ کرارِ ثانی کی جگہ نرے گھرے کٹھ ملّا لیڈری کے علمبردار ہیں، ٹھنڈی سانس بھر کے کہتا ہے ؎

میں جانتا ہوں انجام اُسکا ÷ جس معرکے میں مُلّا ہوں غازی

حالانکہ ؎

حقیقت ابدی ہے مقامِ شبیری ÷ بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

آنکھیں ایسے لیڈر کو ڈھونڈتی ہیں جس کی آواز یا پیام خون کے ہر قطرے کو رگوں میں ایک چنگاری بنا دے اور فتوائے کفر سے بے نیاز ہو کر ڈنکے کی چوٹ کہے کہ ؎

کوہ شگاف تیری ضرب، تجھ سے کشادِ شرق و غرب
تیغِ ہلال کی طرح عیشِ نیام سے گزر
تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر

پھر کہتے ہیں کہ ہمارے اسلاف جو کام کرتے تھے خلوص و یقین کی بنا پر لوجہ اللہ کرتے تھے اور ہم دنیوی اغراض و مصالح، دنیوی سود و

زیاں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس خیال کو اقبال نے اسقدر دلکش و موثر طریقے سے ادا کیا ہے کہ آدمی پڑھے اور جھومے اور حصولِ مقصد میں آگ کا دریا بھی حائل ہو تو کود پڑے اور پار کر جائے، ہم اسپر بھی پا بہ جے بنے رہیں تو شاعر کا کیا قصور۔ سُنئے ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن
من کی دنیا؟ من کی دنیا! سوز و مستی، جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا! سود و سودا، مکر و فن!
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھکو قلندر کی یہ بات
تو جُھکا جب غیر کے آگے، نہ من تیرا، نہ تن

ایک وجہ ادبار یہ بھی ہے کہ شکم پہ پتھر باندھ کے مجاہدہ کرنے کے عوض ہم بندۂ شکم بن گئے ؎

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم؟
اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ، مُلا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

پستی کا ایک اور سبب ہماری عصبیت اور عدم رواداری ہے، ہم میں خُلق نہیں رہا۔ ؎

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں + فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق

کیا در اصل ہمیں مومن کا خطاب زیبا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہمنے تقدیر کے آگے تدبیر کی سپر ڈال دی؟ ؎

کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری + مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا + مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں + مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

پھر حقارت آمیز لہجے میں کہتے ہیں ؎

سینے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک + دیرینہ ہے تیرا مرضِ کور نگاہی

ہمارے دل مرگئے ہیں ؎

وہ سجدہ، روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی + اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

اللہ اللہ! بے حسی کا یہ عالم ہے کہ بالِ جبریل کو جس میں ایسے ہزار دل دل ہلا دینے والے، قیامت برپا کرنے والے شعر ہیں پیام سرد خنک اور کلام نرم و نازک سے تعبیر کیا جاتا ہے!

رہنما کا فقدان، اس پر مصیبت آپس کا تفرقہ و نفاق ؎

میر سپاہ نا سزا، لشکریاں شکستہ صف + آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

بانگِ درا میں اقبال نے مزدوروں کی بہت کچھ حمایت کی تھی مگر تجربے نے سکھا دیا کہ ؎

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو، پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبال کو یہ شبہہ پیدا ہوا کہ مبادا انکو درویشی و عزلت گزینی کا موئد سمجھا جائے، لہذا اعلان کر دیا کہ انکا منشا ترک فقر سے کیا ہے ؎

کمالِ ترک نہیں آب و گل سے مہجوری + کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری
میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا + تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کیلئے + وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے + خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے
بتوں سے تجھکو امیدیں، خدا سے نومیدی + مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

مثنویات اسرارِ خودی و رموزِ بیخودی کی طرح بالِ جبریل میں بھی اقبال نے خودی کو خاص اہمیت دی ہے اور اس کا صحیح مفہوم بتا یا ہے ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا + کہاں سے آئے صدا، لا الٰہ الا اللہ

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیٔ افلاک + خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ
اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک + نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ

ہم اسقدر یورپ زدہ ہو گئے ہیں کہ اُسی کے قدم بقدم چلنا چاہتے ہیں، تقلید چاہتے ہیں، تقلید پرستے ہوتے ہیں اور اسی کو ترقی سمجھتے ہیں۔ اقبال تنبیہ کرتے اور توجہ دلاتے ہیں کہ تمکو جو نعمت اور جوہر عطا ہوا ہے یورپ میں کہاں؟ وہاں صرف سائنس کی شعبدہ بازی ہے جو دلیل و برہان کی محتاج ہے وہ لذتِ حضوری معلوم جو قلب و وجدان اور علم الیقین سے حاصل ہوتی ہے ؎

نہ کر افرنگ کا اندازہ اُسکی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی بُرّاقی

مجھے وہ درس فرنگ آج یاد آتے ہیں + کہاں حضور کی لذت، کہاں حجابِ دلیل
غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم + نہایت اسکی حسینؑ، ابتدا ہے اسماعیلؑ

یورپ زدگی نے ہمارا یہ حال کر دیا ؎

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا + دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بیباک

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے + مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق + کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

پھر کہتے ہیں ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے + وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج + یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

طارق کی زبان سے دعا کرتے ہیں ؎

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے + وہ بجلی کہ تھی نعرۂ "لاتذر" میں
عزائم کو سینے میں بیدار کر دے + نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

یورپ کی اصلی تصویر، ظاہری طمطراق اور سرمایہ داری کی مذمت ان شعروں میں دیکھئے ؎

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے + حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیٔ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں + گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے + سُود ایک کا، لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت + پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس + کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم + حد اسکے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت + احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں، کہ آخر + تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل + بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام + یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں + ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ + دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی + اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

واضح رہے کہ سرمایہ داری کے نقائص بیان کرنا اور اس کے مظالم و استبداد سے بیزاری کا اظہار مزدور کو سرمایہ دار بنا دینے کی تحریک سے بالکل علیحدہ چیز ہے اور اقبال کے اُن شعروں میں جو پہلے درج کئے گئے اور ان شعروں میں کوئی نقیض نہیں ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ بانگِ درا کا یہ مطلع ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

پورے بالِ جبریل پر بھاری ہے۔ جواب سُنئے ؎

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے + طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

اس کے مطالب، اسکی لطافتیں داد سے مستغنی ہیں ع

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!

بالِ جبریل کے شائع ہوتے ہی لوگوں نے اعتراضوں کی

بوچھار کردی۔ حیرت یہ ہے کہ بانگِ درا کو صرف پُرانے خیال کے لوگوں نے تختۂ مشق بنایا تھا جو الفاظ کے دروبست، مضمون کی صفائی کے دلدادہ اور نئی ترکیبوں، جدید تشبیہوں کے مخالف اور ہر اُپج کے جانی دشمن ہیں، نوجوان اور انگریزی داں طبقے نے اسکا خیر مقدم کیا تھا، مگر بالِ جبریل کی منقصت میں یہ جماعت بھی شامل ہے۔ ایک نے زبان و اسالیب بیان کی ناپسندیدگی پر بالِ جبریل کو ٹھکرا دیا تو دوسرے نے فقدانِ پیام کا فیصلہ صادر کیا اور جوش و علوئے تخیل سے معرا کہدیا۔ حالانکہ سر ورق پر جو مطلع ہے وہی ہزاروں پیاموں کا ایک پیام ہے ؎

اُٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں ✣ نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

پیام سرد کا الزام اس شعر کی پاداش میں لگایا گیا ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر ✣ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر!

حالانکہ شعر کے تیور کہہ رہے ہیں کہ خوش آیند صدائیں اور دلکش نغمے بانگ درا کے ساتھ رخصت ہوگئے، اُنکا اثر نہیں ہوا تو اب خارا شگاف نعرے سنو، بالِ جبریل میں برق و باد و صاعقہ برسرِ کار ہیں، تاب لا سکتے ہو تو منجملۂ طوفاں ہوجاؤ ورنہ کانوں میں اُنگلیاں دے کر کسی کوٹھری میں دُبک رہو۔

خشک پیامی کے ساتھ اقبال پر خدا کی جناب میں گستاخی و دریدہ دہنی کا اتہام بھی عائد کیا جاتا ہے۔ جو لوگ "شکوہ" کے مصنف سے گھٹ گھٹ کے رونے اور تضرع و زاری کی توقع رکھتے ہیں شیر سے ڈکارنے کے بجائے امین کلیان کی فرمائش کیوں نہیں کرتے، بجلی سے شعلے کی جگہ دودھ کی دھاریں کیوں نہیں مانگتے؟ شاید ان کا گمان ہے کہ خدا بھی انکی طرح اسلوبِ بیان کا دلدادہ اور تملق پسند ہے، لفظوں پر دھیان دیتا ہے اور نیت نہیں دیکھتا۔ ان سے کون کہے کہ مثنوی میں اُس چرواہے کا قصہ یاد کرو جو خدا کو دیکھنے اُسکے بالوں میں کنگھی کرنے، صاف ستھرے بستر پر بٹھانے اور بھیڑ کے دودھ کی کھیر پکا کر کھلانے کا متمنی تھا، حضرتِ موسیٰ نے سُن لیا اور چشم نمائی کی، بیچارہ گناہ کے احساس سے دیوانہ وار کسی طرف نکل گیا فوراً خطاب ہوا کہ موسیٰ تم نے ہمارے عاشق کو ہم سے جدا کر دیا ؎

تو برائے وصل کردن آمدی ✣ نے برائے فصل کردن آمدی

خود قرآنِ پاک میں حضرتِ خضر اور حضرتِ موسیٰ کا قصہ درج ہے۔ کشتی کے پیندے میں چھید کر کے اُسکو ڈبو دیا، دیوار گرا دی، کسی کو قتل کر ڈالا، یہ کیا وہ کیا اور ہر فعل مستحسن ٹھہرا کیونکہ بغاوت کے بدلے نیک نیتی پر مبنی اور مصلحت ایزدی کے تابع تھا۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے مگر اقبال کی مومنیت اور خلوص و عبودیت میں شبہ کی گنجائش نہیں، پہلو میں درد بھرا دل ہے اور جو کچھ کہتے ہیں قوم کی بہبود کے لئے کہتے ہیں۔ خدا کے سامنے غلامانہ لہجے میں نہیں گڑگڑاتے تو آپ ہوا خذہ کرنے والے کون۔ سب سے زیادہ جو نظم اس نقطۂ خیال سے مطعون کی گئی ہے وہ ہے جسکی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے ؎

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے، یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

ایک گروہ اقبال کو ٹکسالی اُردو سے ناواقف کہتا ہے، یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر اسکو اہمیت دینا ظلم ہے، ایک تو یوں ہی وہ اُردو پر فارسی کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اپنے پیام کو ہندوستان کے علاوہ دیگر بلادِ اسلامیہ میں پہونچانا چاہتے ہیں اور ایشیائی زبانوں میں سے یہ صلاحیت شاید فارسی ہی میں ہے۔ اعتراضوں کی یورش نے اور بھی اُردو سے دل برداشتہ کر دیا ہے۔ اگر اُنھوں نے اُردو میں سخن رانی ترک کر دی تو یہ ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ناممکن ہوگی اُردو میں دوسرا اقبال مجھے تو نظر نہیں آتا۔ میں نے آجتک سر اقبال کی صورت نہیں دیکھی نہ اُن سے تعارف ہے مگر اُنکے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان پر نکتہ چینی سے اسقدر بددل نہیں ہوتے جتنا اُس بد مذاقی سے جو اشعار کے مطالب تک رسائی سے محروم رہنے کے باوصف خاموش نہیں رہتی، غلط معنی پہناتی، غلط نتیجے نکالتی اور ستم پر ستم یہ کرتی ہے کہ اپنے ہذیانات کو منظرِ عام پر لاتی ہے۔ اقبال کی خودداری اور شانِ استغنا جواب کی طرف ملتفت نہیں ہوتی اور غلط فہمیاں پھیلتی جاتی ہیں۔ رسالہ شاعر کے صرف ایک نمبر میں تین

مضمون دیکھئے جن میں بالِ جبریل کو نشانہ بنایا گیا ہے ان میں سب سے زیادہ توجہ کے مستحق حضرتِ سیاب اکبرآبادی کے اعتراض ہیں کیونکہ جناب موصوف خود بھی ایک نامور و گراں پایہ شاعر اور "کارِ امروز" سی معرکہ آرا کتاب کے مصنف ہیں۔ ماہرِ فن ہیں، نقاد ہیں، محقق ہیں موصوف کے اعتراضوں کی نوعیت اور وقعت کا تجزیہ ہو جانے کے بعد باقی اعتراضوں کا بھرم خود بخود کھل جائیگا۔

رسالۂ شاعر بابت مئی۔ جون ۱۹۳۵ء:۔

اعتراض: ضمیر بغیر اسم، خطاب بہ خدا ؎

اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر
مجھے معلوم کیا؟ وہ راز داں تیرا ہے یا میرا

"اُسے" اشارہ ہے غالباً شیطان کی طرف جو شعر کے مفہوم سے ظاہر ہوتا ہے، لیکن کسی شعر ما قبل میں شیطان کا نام نہ لینا اور شعر "اُسے" سے شروع کر دینا، پھر دوسرے مصرع میں بھی "وہ" لکھکر اسم کا ذکر نہ کرنا ایک غلطی ہے جو غالباً کوئی مبتدی بھی تحریر یا تقریر میں نہیں کر سکتا۔

جواب: جب تسلیم کر لیا گیا کہ شعر کے مفہوم سے ضمیر کا اشارہ ظاہر ہوتا ہے، ضمیر کا منشا پورا ہو گیا۔

کسی کا مشہور مطلع ہے ؎

اک نقطہ میں ہی نہیں چاہنے والا تیرا جس نے پیدا کیا وہ بھی تو ہے شیدا تیرا

خدا یا رسول کسی کا نام نہیں لیا گیا مگر مطلب سمجھنے میں ذرا تکلف نہیں ہوتا، جب ایسی صورت ہو تو اسم کی جگہ ضمیر صرف کرنا عینِ فصاحت ہے۔

اعتراض: شعر دیکھئے ؎ عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو، یا مجھے آشکار کر +

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ پہلے مصرع سے دوسرے کا ربط کیا ہے؟ اگر ڈاکٹر اقبال کا مفہوم یہ ہے کہ حسن اور عشق دونوں کا حجاب میں رہنا مناسب نہیں تو پہلا مصرع اس مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر ہے۔

جواب: پہلے مصرع کا مفہوم وہی ہے جو حضرتِ معترض سمجھے۔ "ہے" کی جگہ "ہو" لانے سے اندازِ بیان میں استعجاب کا اضافہ ہو گیا۔

اعتراض: ؎ کیا عشق ایک زندگیِ مستعار کا
کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا

اس شعر میں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ پائدار کسے کہا ہے اور ناپائدار کسے ٹھہرایا ہے؟ پھر "ایک زندگیِ مستعار" کیا معنی؟ زندگی تعدد و حساب سے بالاتر ایک عالم ہے۔ اسکے علاوہ کیا عشق کی دونوں مصرعوں میں تکرار خلافِ فصاحت اور بے محل (نہیں) ہے؟

جواب: یہ ایک مسلسل نظم کا افتتاحیہ شعر ہے۔ پائدار ذات باری ہے اور ناپائدار انسان ہے۔

"زندگیِ مستعار" عام فقرہ ہے، سر اقبال نے اتنی جدت کی ہے کہ زندگیِ مستعار سے خود انسان کو تعبیر کیا ہے اور اس کی طرف توجہ دلانے کو لفظ ایک کا اضافہ کر دیا۔ "ایک زندگیِ مستعار" یعنی فانی انسان۔ جس طرح انسان کو ایک "مشتِ خاک" کہتے ہیں۔

کسی لفظ کی تکرار کو خلافِ فصاحت اور بے محل کہنا اُسوقت جائز ہے کہ حشو و زائد کی صفت میں آتی ہو۔ اگر نثر میں بھی لفظِ عشق کی تکرار ضروری ثابت ہو تو اعتراض بیجا ہے۔ شعر کی نثر یہ ہوئی:۔

ایک زندگیِ مستعار کا عشق کیا، پائدار سے ناپائدار کا عشق کیا۔ کہیں سے لفظِ عشق نکال دیجئے مطلب خبط ہو جائیگا۔

اعتراض: اس شعر میں ؎

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

پھر وہی مشکل نہ بن جائے خلافِ محاورہ ہے، پھر وہی مشکل نہ پیش آئے کہنا چاہئے۔

جواب: یہ عجیب مشکل ہے کہ مشکل کے ساتھ پیش آئے کے سوا اور کچھ نہ کہو، مشکل رونما نہ ہو، مشکل صورت پذیر نہ ہو۔ مشکل مترتب نہ ہو، کچھ نہ کہو خواہ مشکل پیش نہ آئے سے شاعر کا مافی الضمیر ادا ہو خواہ نہ ادا ہو۔ شاعر کا مدعا یہ ہے کہ میری خاک پریشان ہو کر دل کی صورت نہ اختیار کر لے اور جس مشکل سے نجات پانے کو میں خاک ہو گیا وہی مشکل خاک کے ذروں کے اجتماع

سے دوبارہ مترتب یا پیدا نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ مشکل پیش نہ آنا کہنے
میں یہ لطافت اور تنوع باقی نہ رہتا۔ جس طرح شعر نظم کیا گیا ہے
شکل پیش آ ہی نہیں سکتی، جب تک ترتیب نہ پائے، بنے
نہیں یا متشکل نہ ہو۔

اعتراض: ایک قطعے کے پہلے دو مصرع ملاحظہ فرمائیے ؎

وہی اصل مکان ولامکاں ہے + مکاں کیا شئی ہے؟ انداز بیاں ہے

پہلا مصرع تو خیر درست ہے مگر دوسرے مصرع کے بے تکے پن
کی کوئی حد ہی نہیں۔ اول تو مکان ولامکان کے بعد صرف مکان کی
تحقیر بے معنی، پھر مکان کی تفسیر و تصریح کرکے اُسے انداز بیان
سے تعبیر کرنا عجیب قسم کی تفسیر و تعبیر ہے۔ بھلا مکان کو ڈاکٹر
اقبال کے سوا "انداز بیان" اور کون کہہ سکتا ہے؟

جواب: حضرت معترض نے ابتدا میں لکھدیا ہے کہ یہ ایک
قطعے کے پہلے دو مصرع ملاحظہ فرمائیے قطعے کا مطلب اُس کے
سب شعروں کو ملاکر واضح ہوتا ہے نہ کہ پہلے دو مصرعوں سے۔
پورا قطعہ یہ ہے ؎

وہی اصلِ مکان ولامکاں ہے + مکاں کیا شئی ہے؟ اندازِ بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے، کیا بتائے + کہ ماہی تو پھر دریا کہاں ہے

نتیجہ ظاہر ہے کہ حضرتِ معترض مطلب سمجھنے سے قاصر رہے۔ اقبال
نے مکان کی تحقیر نہیں کی بلکہ سوال کیا کہ مکان کیا ہے اور خود ہی
جواب دیا کہ اندازِ بیان ہے یعنی اظہارِ خیال کا ایک ذریعہ ہے
اور بس۔ اگر خدا کو اصلِ مکان ولامکان کہنے کے بعد یہ طریقہ اختیار
نہ کیا جاتا تو ذاتِ بحت کو محدود ماننا پڑتا۔ اب یہ حاصل ہوا کہ
خدا قیدِ مکان سے مستثنیٰ ہے، صرف اُسکی لامکانیت ثابت
کرنے کو لفظ مکان استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی خیال کی مزید توضیح
دوسرے شعر میں ہے۔ ایک برگزیدہ پیغمبر حضرت خضر سے پوچھا
کہ تصورِ باری کے ذیل میں مکان کیا شئے ہے؟ وہ بھی فکر میں پڑ گئے اور
جواب نہ دے سکے کیونکہ اگر یوں سمجھانا چاہتے ہیں کہ مکان ولامکان
میں وہی نسبت ہے جو ماہی و دریا میں ہے تو اُسکی ذات کے مقابل
دریا بھی اندازِ بیان کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ سائل پوچھے گا دریا کیا
ہے؟ اور سوالوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا، ہر جواب تازہ سوال کی
بنیاد ہوگا۔

حاصل یہ ہوا کہ اگر وجودِ باری سے انکار کیا جائے تو ہر شئی
موہوم و بے بنیاد ہو جاتی ہے، لہٰذا مکان کا تخیل کسی اصل کا
محتاج ہے اور وہی اصل خدا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سر اقبال نے بارکلے کا پورا فلسفہ ایک
شاعرانہ اضافے کے ساتھ اس قطعے میں نظم کر دیا ہے۔ بارکلے نے
جو عالم کو ایک شخص مدرک کے تصور کا مرہون قرار دیکر استدلال
کیا، اقبال نے خود عالم کو اندازِ بیان کہکے وجودِ باری تعالیٰ کو ثابت
کر دیا۔

اعتراض: فرماتے ہیں ؎ کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو۔
"کدو" غزل میں کبھی استعمال نہیں ہوا، اس کی جگہ کشکول، کچکول،
کاسہ، پیالہ وغیرہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ کدو میں جو ایک تنافر
لفظی اور ایک ایہام گندہ ہے اُسکی بنا پہ ثقہ شعرا اس لفظ کو متروک
سمجھتے ہیں۔

جواب: خدا معلوم حضرتِ معترض نے کیوں فرض کر لیا کہ جس
نظم میں یہ مصرع واقع ہے وہ نظم نہیں غزل ہے۔ اُردو فارسی کی
قید نہیں لگائی۔ فارسی میں بیسے ہزار جگہ لفظ کدو غزلوں میں دیکھا
ہے۔ اُردو کے قدیم شاعروں نے بھی استعمال کیا ہے مگر لطف یہ
ہے کہ حضرت معترض کے اس ارشاد میں کہ لفظ کدو میں تنافر و ایہام
گندہ ہے اُنکا جواب اور لفظ کدو کے استعمال کا جواز پنہاں ہے
کیونکہ اسکے لانے سے شاعر کا جو منشا تھا یعنی صوفیوں کی تضحیک و تحقیر
وہ بخوبی حاصل ہو گیا۔ لفظ کدو (البتہ دال کی تشدید کے ساتھ) سر کے
معنی بھی دیتا ہے "کدو پھوٹ گیا" عام روزمرہ ہے۔ صوفیوں کے
کدو خالی ہونے کا یہ مطلب ہوا کہ سفیہ و جاہل و بے مغز ہیں۔

اعتراض: صفحہ ۲۵ پر ایک مصرع ہے۔

اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

پرہیز لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ مذکر بولا اور لکھا جاتا ہے۔
ڈاکٹر اقبال اہل زبان نہ سہی شاعری میں مرزا داغ دہلوی کے

شاگرد ہیں اس لئے انھیں فصحائے دہلی کا اتباع کرنا چاہئے۔ ہوا یہ ہے کہ توڑ دیا نہیں آیا تو تڑ دی لکھ دیا۔ زبان کے معاملے میں یہ اجتہاد کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا بلکہ شاعر کے عجزِ طبیعت کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔

جواب: سوال یہ ہے کہ پنجابی کس طرح بولتے ہیں اور اگر وہ لکھنؤ یا دہلی کا تتبع نہیں کرتے تو میرا یا آپ کا کیا اجارہ ہے؟ اور اقبال کو اتباع کی ہدایت کرنا تو آ ہوئے وحشی کو پکار کے پکڑنے کی کوشش کرنا ہے۔

اعتراض: فرماتے ہیں ؎

نہ چھین لذتِ آہِ سحر گہی مجھ سے، نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز

دوسرا مصرع سُست ہے جو ذرا سی فکر کے بعد چست ہو سکتا تھا۔ یعنی اسی مصرع کو اگر یوں پڑھیں "نہ کر نگاہِ تغافل کو التفات آمیز"

جواب: کیا اچھا ہوتا اگر حضرتِ معترض یہ بھی غور فرما لیتے کہ اصلاح کے بعد مصرع مہمل ہو گیا یا کچھ معنی رہ گئے۔ نگاہِ تغافل ہر حال میں نگاہِ تغافل ہے وہ التفات آمیز کیونکر ہو سکتی ہے۔ اسی ابہام کے بچانے کو اقبال نے مصرع یوں موزوں کیا ع

نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز

اب تغافل اور التفات دو مختلف کیفیتیں ہیں جنہیں معشوق نگہ کی وساطت سے آمیزش پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ عاشق کو آہِ سحر میں خالص تغافل کی وجہ سے جو لذت ملتی ہے اُسکو التفات کے شمول سے زائل کر دے۔ اب اس غریب کی جان کشمکش میں پڑ جائیگی تغافل آہ پر آمادہ کریگا التفاتِ عنان گیر ہوگا۔

اعتراض: صفحہ ۲ پر یہ شعر دیکھئے ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے

کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

پہلا مصرع بغیر سوچے سمجھے، ربط و بے ربطی، معنی و مفہوم، غرض کہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر بس کہدیا اور لگا دیا گیا ہے۔ امیرِ کارواں میں خوئے دلنوازی نہیں، اس لئے کوئی کارواں سے ٹوٹا۔ بالکل صحیح۔ مگر کوئی بدگمان حرم سے، کیا معنی؟ یعنی کارواں اور امیر کارواں کا ذکر ہے، حرم کا کیا ذکر؟ امیرِ کارواں میں اگر دلنوازی نہیں تو کارواں اپنی منزل سے بدگمان ہو سکتا ہے۔ حرم، دیر، کلیسا اور کنشت کا تعلق یہاں قطعاً بے معنی ہے، لفظِ منزل رکھ کر اس ان چاروں مقامات کا مفہوم پیدا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حرم کہکر منزل کا مفہوم پیدا کرنا غلط ہے +

جواب: حضرتِ معترض نے رعایت الفاظ کی دُھن میں کہ کارواں ہے تو منزل ضرور آئے یہ غور نہیں فرمایا کہ اقبال نے منزل کے بجائے لفظ حرم لا کر اس امر کا تعین کر دیا کہ اُنکی مراد صرف کاروانِ اسلام سے ہے۔ اعتراض کا جواب تو ہو گیا لیکن دل چاہتا ہے کہ اس شعر کا مفہوم بھی بیان کر دیا جائے تاکہ اقبال کا پیام شاید کسی دل میں جگہ کر لے اور اسلام میں جو فرقہ دارانہ اختلافات خطرناک صورت اختیار کر رہے ہیں مٹ نہ جائیں تو کم سے کم اُنکی رفتار دھیمی پڑ جائے۔ شعر میں لفظ کارواں کل جماعت اسلام کا مرادف ہے، حرم اپنے معمولی معنی دیتا ہے، کعبہ، امیرِ کارواں خدا یا نائب خدا ہمارے رسول کریم صلعم ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی یہ نوبت پہونچی ہے، ایمان اسقدر کمزور ہو گیا ہے، ایقان سے اتنے دور ہو گئے ہیں کہ جہاں کسی کی منہ مانگی مراد نہ ملی یا کوئی مصیبت یا مشکل پیش آئی اور وہ کارواں سے ٹوٹا (منحرف ہوا)، کسی نے خود حرم سے جو مرکزِ اسلام ہے بدگمانی کا اظہار کیا اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی۔ حج کو بیکار اور اجماع کو بے سود سمجھا، حالانکہ اسلام کی قوت و شوکت کا راز اسی اجماع و اتحاد و اخوت میں مضمر ہے، یہی جماعتِ اسلام کا شیرازہ بند ہے، یہی سفر، یہی پابندیاں مسلمانوں کو سادہ زندگی بسر کرنے اور سختیاں جھیلنے کا خوگر بناتی تھیں۔ سب سے زیادہ قابلِ افسوس یہ بات ہے کہ اس انحراف و بدگمانی کا ذمہ دار امیرِ کارواں کو بناتے اور اُسکے سر یہ الزام تھوپتے ہیں کہ اُس میں خوئے دلنوازی نہیں ہے، حالانکہ اُسکی ظاہری عدم التفاتی کا راز انکے جذبۂ ایمانی کے ضعف میں پنہاں ہے ورنہ بتلا کر استواریٔ ایمان کا امتحان سمجھ کر لبیک کہتے اور ہر مصیبت ہر دشواری کا سینہ تان کر مردانہ وار مقابلہ کرتے اُنھیں چاہئے کہ ع حدی را تیز تر

میخواں چو عمل راگراں بینی بر عمل پیرا ہوں اسکے عوض کوئی قافلے کو چھوڑ کے پچھلے پاؤں پلٹتا ہے، کوئی خود اسلام کو تقویم پارینہ اور موجودہ ضروریات پوری کرنے، سیاسی و اقتصادی گتھیاں سلجھانے میں ناکافی سمجھتا ہے حالانکہ ادبار کا سبب یہ ہے کہ ہم سچے مسلمان نہیں رہے ۔

اعتراض: صفحہ ۳۴ پر اس شعر میں ؎

مدت سے ہی آوارۂ افلاک مرا فکر + کر دے اسے اب چاند کی غاروں میں نظر بند

فکر کو مذکر اور غار کو مؤنث خلافِ مذہب فصحا نظم کیا گیا ہے، فکر مؤنث ہے اور غار مذکر ہے، کیا ڈاکٹر اقبال کو ابھی معمولی الفاظ کی تانیث و تذکیر کا بھی علم نہیں ؟

جواب: جیسا کہیں عرض کر چکا ہوں نزاعِ لفظی تذکیر و تانیث کی بحث اقبال کے کلام کے متعلق بیکار ہے۔ حضرتِ معترض کا ادعا ہے کہ فکر بلا استثنائے اختلاف مؤنث ہے، لکھنؤ میں ایسا ہی ہے مگر دہلی والے اب بھی فکر کو مذکر بولتے ہیں۔ غاروں کی تانیث بر بنائے کتابت لہذا ناقابلِ التفات ہے ۔

دوسرا مصرع خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ پہلے یہ عرض کر دوں کہ آج کل مسافرت اور بے اطمینانی کا عالم ہے ۔ کتابیں حوالے کو موجود نہیں، حافظے کی مدد سے لکھتا ہوں اگر واقعات میں گونہ اختلاف نکلے تو معاف کیا جاؤں البتہ نفسِ مطلب کی صحت کا ذمہ لیتا ہوں۔ غالباً ۱۹۳۶ء میں ایک جرمن سائنسداں (زیگ لر؟) نے دریافت کیا کہ چاند کی سطح روشن نہیں ہے بلکہ اس میں غار ہیں، اُن غاروں سے روشنی نکلتی، پھیلتی اور کل سطح کو منور کرتی ہے ۔

اب اقبال کا شعر پڑھیے ؎

مدت سے ہی آوارۂ افلاک مرا فکر + کر دے اسے اب چاند کی غاروں میں نظر بند

تاکہ وہاں سے اک لمعۂ نور بنکر نکل آئے اور تاریکیٔ شب (لوگوں کی جہالت) دور ہو جائے۔ آپ نے دیکھا ؟ اقبال ہماری زبان کے ذخیرۂ علم میں کیا کیا اضافہ کر رہے ہیں ۔

اعتراض: ذرا اس شعر کی عروضی شان دیکھیے ؎

یوں داد سخن مجکو دیتے ہیں عراق و پارس + کافرِ ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز

پہلا مصرع قیدِ بحر و وزن سے خارج ہے اور کچھ ایسا مبہم و مہمل ہے کہ باوجود کوشش اُسے صحیح بھی نہیں کیا جا سکتا یعنی "عراق و پارس" کسی طرح بھی اس مصرع میں نظم نہیں کئے جا سکتے ۔

جواب: اوپر اپنی مجبوریوں کا اظہار کر چکا ہوں۔ کوئی لغت کی کتاب ہمراہ نہیں، نہ دستیاب ہو سکتی ہے ۔ مگر میرا خیال ہے کہ شعر میں لفظ پارس میں ر متحرک نہیں بلکہ ساکن ہے اور پارس بروزن یافت ہے نہ کہ بروزن آمد۔ اگر میری عرضداشت بر بنائے لغت صحیح ہے تو مصرع قواعدِ عروض کے مطابق اور موزوں ہے ورنہ حافظ کے اس مصرع کو بھی جس کی بالکل یہی صورت ہے ناموزوں کہئے ؏ بدہ ساقی مئی باقی کہ در جنت نخواہی یافت ۔

اصل میں مصرع کو "نخواہی یا" پر ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ بدہ ساقی (مفاعیلن) مئی باقی (مفاعیلن) کہ در جنت (مفاعیلن) نخواہی یا (مفاعیلن)، مگر حروف مکتوبی غیر ملفوظی کی شق میں لاکر یافت تقطیع کے لئے یاف رہ گیا اور مفاعیلن مفاعیلان ہو گیا جو ہر طرح جائز ہے۔

اسی طرح اقبال کے مصرع میں جس کی بحر مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن ہے مندرجہ بالا عمل سے مفاعیلن مفاعیلان ہو گیا مگر یہ سب کچھ اُسی صورت میں درست ہے کہ پارس میں ر ساکن ہو اگر متحرک ہے تو بحث ختم ہو جاتی ہے اور مصرع ناموزوں ماننا پڑیگا۔ غالباً کتبِ لغات میں پارس کے دونوں تلفظ درج ہیں یعنی چاہے پارس بروزن آمد کہو چاہے پارس بروزن یافت لاؤ ۔

اعتراض: "خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں" اس مصرع میں "ہیں" کی جگہ "ہے" عیب الکاتب سے تعبیر کر کے ڈاکٹر صاحب کو اس الزام سے بری کیا جا سکتا ہے ۔

جواب: میں بادب عرض کرونگا کہ جسے ذرا بھی فصاحت سے مس ہے "خودی کی موت ہیں اندیشہ ہائے گوناگوں" نہ بولے گا کیونکہ زور لفظ موت پر ہے اور موت واحد ہے ۔

اعتراض ؎ برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح + اور

چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن +
رکھ گئی اور چمکاتی ہے: دو مختلف زمانے ایک ہی شعر میں نظم ہوگئے ہیں۔

جواب: ایک ہی شعر میں دو زمانے نظم ہونا کوئی گناہ نہیں اور یہاں تو اختلاف زمان نے معنویت میں اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ حقیقت سے مطابق کر دیا کیونکہ برگِ گل پر شبنم کے ورود اور سورج کی کرن پڑنے میں یقیناً فاصلۂ زمانی ہوتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ برگِ گل پر شبنم کا موتی آیا اور اسکو فوراً سورج کی کرن نے چمکایا۔ یہ صداقت تعریف کی مستحق ہے نہ کہ اعتراض کی آماجگاہ بنائی جائے۔

اعتراض: ؎ اک اضطرابِ مسلسل غیاب ہو کہ حضور + میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں۔
غیاب میں غرابت ہے اور شعر مہمل ہے، جو مفہوم و مقصدِ شاعر کے اظہار سے بے نیاز ہے۔

جواب: یہ تسلیم کہ غیاب میں غرابت ہے اور اداۓ مطلب کی اور صورتیں بھی ممکن تھیں مگر شعر مہمل ہرگز نہیں ہے، شاعر کہتا ہے کہ دوری ہو یا حضوری (معشوق یا خدا کی) مجھ پر ایک اضطرابِ مسلسل طاری رہتا ہے۔ میری داستان صرف اسقدر ہے، ظاہر ہے کہ جب اضطرابِ مسلسل پوری داستان ہے تو اسکو دراز نہیں کہہ سکتے۔ مگر یہی داستان دراز ہو جاتی ہے اگر اضطرابِ مسلسل کی شرح کیجائے اور اُسکے اسباب بتائے جائیں

اعتراضات مندرجہ رسالۂ شاعر بابت ماہ ستمبر ۳۵ء

اعتراض: ؎ گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند + میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں ؛

اس شعر کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ "اگرچہ میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند (معمور) ہے لیکن میری فغاں سے کعبہ و دیر میں قیامت برپا ہے"
جستجو نقشبند دیر و حرم ہے اور جستجو کرنے والے کی فغاں قیامت دیر و حرم ہے۔ اس مفہوم میں کوئی ربط و ہم آہنگی نظر نہیں آتی اور اگرچہ کے مقابلے میں لفظ صلہ نہ لانے سے شعر کی ترکیب میں جو اختلال پیدا ہوتا ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں اگر دو مصرعوں میں دو مقصد ظاہر کرنے تھے تو پھر یہ شعر اس طرح چست کیا جا سکتا تھا
میرا دماغ جستجو دیر و حرم کا نقشبند، میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

جواب: بات یہ ہے کہ جب شعر کا مطلب سمجھ میں نہ آئے تو اعتراض سے خاموشی بہتر ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ میری ہی تلاش حقیقت کا نتیجہ ہے کہ دیر و حرم کی بنیاد پڑی، معبد تعمیر ہوئے مگر سخت حیرت ہے کہ میں اظہارِ نارسائی میں جب فغاں کرتا ہوں اور اس طرح ظاہر کرتا ہوں کہ معرفت کی آخری منزل دیر یا حرم نہیں ہے، آگے بڑھو تو ان مقامات میں ایک ہنگامہ بپا ہوتا ہے اور وہاں کے ساکن کہتے ہیں کہ ہمارے معتقدات میں شبہہ کیوں ڈالتا ہے، جو کچھ پا گئے اُسی میں مگن رہنے دے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ یہ بھی صورت سے معنی کی طرف پھریں مگر نہیں مانتے۔

حضرت معترض کی اصلاح کے متعلق کیا کہا جائے۔ جہاں جستجو اور تگ و دو تھی اب وہاں دماغ بیٹھا ہوا کاغذ پر گل بوٹے بنا رہا ہے!

اعتراض: ؎
محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی ترا + مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا
یہ حرفِ شیریں میں "یہ" کا مشارٌ الیہ کون ہے؟ کون سا حرف شیریں؟ اسکے علاوہ شعر مفہوم سے قطعاً آزاد ہے۔

جواب: شعر سمجھ میں نہ آئے یہ اور بات ہے ورنہ مطلب صاف ہے۔ یہ کا مشارٌ الیہ کھلا کھلا پہلے مصرع میں لفظ قرآن ہے۔

یہ شعر ایک مسلسل نظم کا جزو ہے جو بالِ جبریل کے صفحے پر درج ہے۔ نظم کا خاکہ یہ ہے کہ شاعر زوالِ آدم کے مسئلے پر غور کرتا ہے اور اپنے شکوک خلاق عالم کے حضور میں پیش کرتا ہے۔ سوچتا ہے کہ ستاروں کی گردش خلاف ہے ؎
اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا + مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا
عرض کرتا ہے کہ ستارے بھی تیرے، آسمان بھی تیرا، جہان بھی تیرا، رکھا یا مٹا۔ مجھے امین اور خلیفہ بنا کر زمین پر کیوں بھیجا۔ اور بھیجا تھا تو ایسا

کمزور و ناچار کیوں بنایا۔ پھر دیکھتا ہے کہ وہ مردانِ عارف و باصفا نہیں رہ گئے جنکے نعرہائے شوق فضائے قدس و عالم لاہوت میں ہنگامہ برپا کر دیتے تھے، جنکے مقابلے میں کروبیوں کی تسبیح و تہلیل ماند پڑ جاتی تھی۔ عرض کرتا ہے۔ ؎

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی + خطا کسکی ہے یارب! لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

سخت ظلم ہوگا اگر دوسرے مصرع کے استفہام سے یہ مطلب نکالا جائے کہ معاذ اللہ خدا کو خطاوار ٹھہرایا جاتا ہے، صرف یہ سمجھنا چاہیئے کہ قائل کی سمجھ میں نہیں آتا کہ خطا کا تعین کسکے ساتھ کرے۔

شیطان یا عزازیل کی نافرمانی یاد آتی ہے، خیال ہوتا ہے کہ خرابی کی ابتدا وہیں سے ہوئی، خیر و شر کی بنیاد پڑی۔ فلسفیانہ دماغ اسپر قانع نہیں ہوتا اور پوچھتا ہے کہ عزازیل کو سجدۂ آدم سے انکار کی جرأت ہی کیونکر ہوئی جب حکمِ خداوندی ہو چکا تھا یہ راز سمجھ میں نہیں آتا۔ ؎

اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر + مجھے معلوم کیا؟ وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

خیر جو کچھ ہونا تھا ہوا۔ ختم المرسلین آیۂ رحمت بنکر مبعوث ہوئے۔ فساد کو مٹ جانا تھا مگر قائم ہے۔ وہ نہیں رہے مگر اُنکے ذریعے سے خدا کا کلام شیریں، رموزِ الٰہی کا ترجمان قرآن ہم تک پہونچا اور ہم میں موجود ہے لیکن انسان پھر بھی ظلوم و جہول ہے اس کی فطرت نہیں بدلی، یہ کیا معمّا ہے ؎

محمد بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا + مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

آخر میں کہتے ہیں کہ اے خدا انسان ہی سے جہاں کی رونق ہے اگر اس احسنِ تقویم کو مٹا دینا چاہتا ہے تو مٹا دے مگر اس طرح کسکا زیاں ہوگا؟ ؎

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن + زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

اعتراض: ؎

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل + آپ بھی شرمسار ہو، مجکو بھی شرمسار کر

ردیف کر صیغۂ امر ہے، امر کا تعلق ہمیشہ زمانۂ حال سے ہوتا ہے، پھر جب دفتر عمل پیش ہو کے ساتھ امر کا تعلق کیونکر ہو سکتا ہے کہنا یوں چاہیئے تھا کہ جب دفتر عمل روزِ حساب پیش ہو تو خود بھی شرمسار ہونا اور مجھے بھی شرمسار کرنا مگر کہہ گئے یوں۔ شعر ذرا سے غور کے بعد ہر پہلو سے اس طرح صحیح ہو سکتا تھا ؎

حشر میں دفتر عمل پیش ہوا سکو دیکھکر + آپ بھی شرمسار ہو مجکو بھی شرمسار کر

لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ مخاطب صحیح اس شعر میں کون ہے؟ محبوب مجازی یا خدا؟ اسی غزل کے پچھلے ۲ شعر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا مخاطب خدا ہے۔ تو پھر خدا سے یہ کہنا کہ آپ بھی شرمسار ہو عبودیت کا کتنا خوفناک تجاوز ہے!

جواب: یہ دعویٰ ہی بے دلیل ہے کہ امر کا تعلق ہمیشہ زمانۂ حال سے ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص دوسرے سے کوئی گزشتہ واقعہ کہتا ہے وہ شخص جواب دیتا ہے "تجھ سے کسنے کہا تھا کہ دخل در معقولات دے" کیا یہاں دے کی جگہ دینا کہینگے؟ کوئی فعل سرزد نہیں ہوا ہے مگر کہتے ہیں "کر تو کر نہیں تو خدا کے غضب سے ڈر" کہیں زمانۂ حال کا پتہ بھی نہیں۔ حضرت معترض کی اصلاح نے تو شعر کو غارت ہی کر دیا۔ حشر ہوا نہیں اور ہے، دفتر عمل پیش نہیں ہوا اور پیش ہے۔ پیش ہونے میں دیکھنے کا مفہوم شامل ہے، مگر پیش ہے اور دیکھ کر دونوں لاتے ہیں۔ روزِ حساب اور دفترِ عمل میں جو عمدہ ربط تھا فنا ہوگیا۔ دونوں مصرعوں کی ردیف "کر" ہوگئی جو مسلمہ طور پر اصولِ فصاحت کے خلاف ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ خدا کو شرمسار ہونے کی صلاح دینا عبودیت سے خوفناک تجاوز ہے۔ اگر یہ شعر ماقبل کے ساتھ اس شعر کو پڑھئے تو اقبال کی بغاوت اسقدر سنگین نہیں رہتی۔ ؎

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں + کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل + آپ بھی شرمسار ہو، مجکو بھی شرمسار کر

"انی جاعل فی الارض خلیفہ" مخاطب اور حشر کی بازپرس۔ ذرا سی لغزش اور بہشت سے محروم۔ اشعار کا مفہوم واضح کیا جائے اور انکے فلسفیانہ نکات بیان ہوں تو شاید میں اور اقبال دونوں کافر قرار پائیں ابھی تو صرف انھیں پر عبودیت سے متجاوز ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔

اعتراض ؎ دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر + حریمِ کبریا سے آشنا کر +

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے + اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

پہلے بیت میں خطاب انسان سے ہے اور دوسرے میں خدا سے' ایک ہی رباعی (قطعہ) میں یہ تضاد تخاطب فنی اعتبار سے ناروا' ناجائز اور قابلِ اعتراض ہے۔

جواب: جناب معترض لفظِ کبریا کے معنی نہیں سمجھے۔ خدا کے علاوہ اسکے اور بھی معنی ہیں اور یاد داشت سے کہتا ہوں (لغت موجود نہیں) کہ اس سے جلالتِ استغنا کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔ اسی سے عدم واقفیت کی بنا پر حضرت معترض سے تسامح ہوا ورنہ قطعہ میں "تضاد تخاطب" نہیں ہے۔

اعتراض: ۵

پہنائے خاک' یہ صرصر' یہ وسعتِ افلاک + کرم ہے یا کہ ستم تیری لذتِ ایجاد

دوسرے مصرع میں "یا کہ" خلاف فصاحت ہے اور "لذت ایجاد" خشک باگندہ بروزہ۔ شعر یوں ہونا چاہئے ؎

پہنائے خاک یہ صرصر یہ وسعتِ افلاک + کرم ہے یا ہے ستم تیرا شیوۂ ایجاد

جواب: مجھے حضرت معترض سے صرف یہاں تک اتفاق ہے کہ لذت ایجاد مبہم ترکیب ہے، خدا کو ایجاد میں لذت ملنا اور اُسکی لذت کو کرم یا ستم سمجھنا بعید از قیاس باتیں ہیں۔ مگر اصلاح میں لذت کی جگہ شیوہ خود حضرت معترض کی نقل کردہ مثل کا مصداق ہے۔ ایجاد جب شیوہ ہوگیا تو پھر کرم و ستم کے مابین اشتباہ کا پہلو نہیں رہ جاتا۔ سیاق عبارت سے کسی ایسی لفظ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس سے ایجاد میں انہماک کا مفہوم پیدا ہو۔ میں ایک لفظ تجویز کرسکتا ہوں مگر لہو لگا کے شہیدوں میں کیوں داخل ہوں۔

اعتراض: اسی طرح اس قطعے میں "نورِ بصیرت" بے محل ہے ؎

جوانوں کو مری آہ سحر دے + پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے + مرا نورِ بصیرت عام کردے

اگر چوتھا مصرع یوں ہوتا تو بہتر تھا ع

مرے ذوقِ طلب کو عام کردے

جواب: مجھے حضرت معترض سے اختلاف ہے۔ ذوقِ طلب پھر بھی صرف ذوق ہے جس میں کامرانی کا پہلو غائب ہے۔ اقبال کو نورِ بصیرت حاصل ہے اور دعا کرتے ہیں کہ قوم بھر میں عام ہو جائے۔

اعتراض: ۵

وہ عشق جسکی شمع بجھادے اجل کی پھونک + اُس میں مزہ نہیں تپش و انتظار کا

پہلا مصرع سُست ہے، اسے اس طرح چست کردینا چاہئے تھا: "وہ شمع عشق جسکو بجھادے اجل کی پھونک" بار بار کی کی کیا انداز کلام ہے۔

جواب: حضرت معترض نے سخت دھوکا کھایا۔ یہ نہ سوچے کہ شمع عشق کہنے کے بعد دوسرے مصرع میں "اُس" کا مشارٌ الیہ بجائے عشق شمع ہو جائیگی اور شمع کے متعلق کہنا کہ "اُس میں مزہ نہیں تپش و انتظار کا" بے تکی سی بات ہے۔ علاوہ بریں "شمع عشق" میں دو شین اور دو عین مع قاف اس بری طرح جمع ہوگئے ہیں کہ "کی کی" کی تکرار سے بدتر ہیں اگر اس تکرار میں تنافر مان بھی لیا جائے جو حضرت معترض کا وہم ہی وہم ہے' ورنہ اصل تنافر کا شائبہ بھی نہیں۔ دونوں "کی" نہ صرف ایک دوسرے سے فاصلے پر ہیں بلکہ انکی ی دبکے نکلتی ہے اور روانی میں مخل نہیں ہوتی۔

اعتراض: ۵

لا پھر اکبار وہی بادہ و جام اے ساقی + ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی

"ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام" محاورۂ اردو نہیں، پنجابی دستورِ گفتگو ہے۔ "مجھے میرا" فصحا نہیں بولتے، یہ مصرع یوں ہونا چاہئے۔

ع "نظر آجائے مجھے اپنا مقام اے ساقی"

جواب: منظور کہ اقبال کا مصرع دلکش نہیں مگر اصلاح تو عجیب و غریب ہے۔ "نظر آجائے مجھے اپنا مقام اے ساقی"! بھی اچھی! اس گندگی پر مزید قباحت یہ ہے کہ اصلاح نے شعر کو مہمل کردیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ بادہ و جام کا مل جانا اپنے منصب قدیم پر بحال ہوجانا ہے، منصبِ قدیم کا ہاتھ آجانا ہے مگر مقام نظر آجانا تو محض دور سے دیکھنا اور ترسنا ہے یا اپنے مرتبے سے واقف ہونا ہے، جو مطلب بھی لیجئے شعر کا ڈھانچا کا ڈھاک ہی

رہتا ہے۔

"مجھے میرا" کے باب میں فیصلۂ ناطق کر دینا کہ فصحا نہیں بولتے دانشمندی سے دور ہے۔ مثلاً ایک مصرع یوں ہے ع پھر عنایت ہو مجھے میرا مقام اے ساقی۔ دوسرا مصرع یوں ہے ع پھر عنایت ہو مجھے اپنا مقام اے ساقی دونوں مصرعوں کا مفہوم علیحدہ علیحدہ ہے۔ پہلے مصرع میں قائل اپنا مقام دوبارہ مانگتا ہے اور دوسرے مصرع کا یہ مطلب ہوگا کہ ساقی سے اُس کا مقام مانگتا ہے۔ اگر اس مصرع کو اقبال کے پہلے مصرع سے ربط دیدیجئے تو یوں بجا و درست ہوگا کہ ع پھر عنایت ہو مجھے میرا مقام اے ساقی۔ اسے اصلاح نہ سمجھا جائے بلکہ حضرت معترض کے اس قول کی تردید ہے کہ فصحا "مجھے میرا" نہیں بولتے۔

اعتراض: ؎

عشق کی تیغِ جگردار اڑا لی کس نے + علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

اوّل تو ساقی سے تیغ و نیام کے متعلق گفتگو ہی بے جوڑ ہے۔ دوسرے تیغِ جگردار کی ترکیب غلط ہے، جگردار کی صحت میں بھی ہمیں کلام ہے۔ "بے جگر" تو سنا ہے مگر جری یا مضبوط کے معنی میں جگردار کسی سے نہیں سُنا۔ تیغ کو جوہردار کہتے ہیں جگردار نہیں کہتے۔ یہ ترکیب ضعفِ تالیف کی تعریف میں آتی ہے۔

جواب: ساقی کے معنی ہیں تقسیم کرنے والا۔ شراب ہو یا اور کوئی شے ہو۔ خدا کو ساقیٔ بزمِ ازل کہتے ہیں۔ حضرت علی کو ساقیٔ کوثر کہتے ہیں۔ یہاں عشق کے ساقی سے خطاب ہے اور اسے بے جوڑ گفتگو کہنا غلط ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تیغ کی صفت جگردار بھی آئی ہے، کتابیں پاس نہ ہونے سے مثال پیش نہیں کر سکتا مگر تیغِ جگردار اُس تیغ کو کہتے ہیں جو ایک ہی وار میں سر سے جگر تک چاک کر دے۔ کلیجے میں اُتر جائے۔ جگردار کے معنی جری یا مضبوط سمجھنا افسوسناک غلطی ہے اور اس سے زیادہ افسوسناک امر "بے جگر" کو جری یا مضبوط کا مرادف جاننا ہے "بے جگر" کے معنی ہیں بودا، بزدل، کم ہمت۔ جری کے معنی میں پُرجگر آتا ہے۔

(کوئی اللہ کا بندہ کسی معتبر کتاب لغت یا بہارِ عجم کے حوالے سے میری تائید یا تردید کر دے۔ مضمون روکتا ہوں تو مدیر صاحب روٹھے جاتے ہیں اور یہ سانحہ میرے لئے قیامت سے کم نہ ہوگا، عجب خلفشار میں مبتلا ہوں)۔

اعتراض: ؎

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات + ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

دوسرے مصرع میں سخن کی تکرار غیر مستحسن اور کریہہ ہے اور مصرع ہے کا محتاج نظر آتا ہے، سخن کو بغیر دہرائے بھی مصرع یوں کہا جا سکتا تھا ع جو نہ روشن ہو تو ہے مرگِ دوام اے ساقی۔

جواب: اصلاح نے شعر کا مطلب مبہم کر دیا، کیا مرگِ دوام ہے؟ سینے کا نہ روشن ہونا، یا سخن؟ اسی اغلاق کے بچانے کو اقبال نے لفظ سخن کی تکرار کو جائز رکھا مگر "ہے" کے حذف سے مصرع ناقص اور کمزور رہ گیا۔

"شاعر" "میں باقی" درج ہے یعنی ابھی اعتراضوں کی قسط باقی ہے مگر میرا مضمون ختم سمجھئے۔

بالِ جبریل کا ایک ایک شعر حقائق سے لبریز اور درسِ عمل ہے، خودداری کی تعلیم ہے۔ اقبال کی پیشینگوئی یقیناً پوری ہو کے رہیگی ؎

اُلٹ جائینگی تدبیریں بدل جائینگی تقدیریں + حقیقت ہے نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی



دنیا سے بیزاری

(۱)

نشترِ غم کی خلش، پیکانِ حرماں کی کھٹک
مجھ سا پامالِ جفائے آسماں کوئی نہ ہو

آہ، میں وہ آشیاں برباد ہوں جس کے لئے
شہر و گلشن میں کہیں جائے اماں کوئی نہ ہو

رحم اس بیکس پہ فرماتے ہیں ابنائے زماں
برگ و سازِ زندگی جس کے یہاں کوئی نہ ہو

لطف یہ مجھ پر بھی ہوتا ہے مگر اس شان سے
جس سے بدتر صورتِ جورِ نہاں کوئی نہ ہو

یا الٰہی ایسا اک گوشہ کہیں ملتا جہاں
راز جو کوئی نہ ہو اور راز داں کوئی نہ ہو

جی میں آتا ہے کہ اب اس تنگ نائے دہر میں
رہئے بس ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

(۲)

بارِ منت سے گراں تر تو نہیں بارِ الم
شوقِ گل میں خار سے اُلجھاؤں دامن کس لئے

اقربا دادِ جراحت دیں گے اس امید میں
ہر نفس کے ساتھ کیوں انسان خونِ دل پیے

کی نہ بھولے سے بھی پروائے رفیق و رہنما
اہلِ دل نے زندگی کے راستے یوں طے کئے

کنجِ استغنائے تنہائی مجھے بھی ہے پسند
ظلمِ راہ و رسمِ ہمدردی سے بچنے کے لئے

محض ویرانی میں اب ڈھونڈھوں گا میں تسکینِ دل
کون یوں ہنگامہ زارِ دہر میں مضطر جیئے

اس کو وحشت ہی کوئی سمجھے مگر دل میں یہ ہے
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے

کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

(۳)

بس زمیں پر میں ہوں اور ہو میرے سر پر آسماں
یہ فضا شاید ہو روحِ مضطرب کو سازگار

یوں بسر ہو جتنی باقی رہ گئی ہے زندگی
کوئی مونس ہو نہ ہمدم ہو نہ کوئی غمگسار

چارہ سازی کیسی، کوئی پوچھنے والا نہ ہو
یعنی دردِ دل نہ ہو احسانِ درماں سے دوچار

تابشِ داغِ ستم جب نور پھیلانے لگے
ظلمتِ شامِ الم بن جائے اس کی پردہ دار

کوئی پہلو میں نہ ہو اور کوئی بالیں پر نہ ہو
کس مپرسی پر ہو مرگ و زندگی کا انحصار

ہو اگر صحت تو کوئی تہنیت فرما نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار

اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مانی۔ جائسی

دیہات کا کنواں

(از خان بہادر علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری ڈائرکٹر انفارمیشن بیورو شملہ)

جو لوگ شہروں کی گہما گہمی اور مصروفیتوں میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ دیہات کی سادہ، فطری اور مطمئن زندگی کی غیر تعجیلی سرگرمیوں کو قیاس میں نہیں لاسکتے۔ اسوقت چونکہ دیہاتی فلاح و ترقی کیطرف حکومت نے خاص طور پر توجہ کی ہے اور ملکی سیاسیات کا پلّہ اس بنا پر دیہاتوں کی طرف جھک گیا ہے، اس بات کی ضرورت ہے کہ دیہاتی معاشرت کا صحیح نقشہ شہر والوں کو سمجھا دیا جائے اور اس سلسلے میں آج میں اس زندگی کا ایک ممتاز پہلو واضح کرنا چاہتا ہوں، جس سے دیگر مصروفیتیں قیاس میں لائی جاسکتی ہیں، اور آیندہ انشاءاللہ تعالیٰ بشرطِ فرصت دیہاتی معاشرت کے دوسرے پہلو بھی نمایاں کرنے کی کوشش کرونگا۔

دیہات میں جہاں پانی کے نل اور آبپاشی کی نہریں نہیں ہیں کنوئیں کو ایک اہم ادارے کی حیثیت حاصل ہے جسے بڑی حد تک دیہات کی معاشی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز کہا جاسکتا ہے۔ یہی کنواں اہل دیہہ کے کھیتوں کی آبیاری کرتا ہے، اور اُنکے نہلانے دھونے اور پینے کے لئے پانی مہیا کرتا ہے، اور یہ چیزیں چونکہ زندگی کی اہم ترین ضروریات میں سے ہیں، اسلئے گاؤں کے ہر طبقے اور ہر عمر و جنس کے انسان کو کنوئیں پر آنا پڑتا ہے، اور جس کنوئیں کا پانی شیریں ہو وہاں بسا اوقات مردوں، عورتوں، بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کا قرار واقعی مجمع رہنا لازمی ہے۔ چنانچہ حضرت سعدی نے شیراز میں ہی بیٹھے بیٹھے یہی نقشہ دیکھا تھا اور فرما گئے ہیں ؎

ہر کجا چشمۂ بود شیریں
مردم و مور و مرغ گرد آیند

دیہاتی کنوئیں کی یہ قدرتی کشش ایک طرف تو کاشتکار کو کھینچ لاتی ہے جو اپنے بیوی بچوں سمیت ایک ایک چرسہ پانی کھینچتا ہے اور نالیاں بنا کر اپنے کھیت میں پہونچاتا ہے تو دوسری طرف پینے کا پانی بھر کر لیجانے والی عورتیں سر پر گھڑے رکھے ہوئے اور برتن صاف کرتی ہوئی عورتیں ریت لگا لگا کر ان برتنوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے، اور غسل کرنے والے مرد لٹیوں میں بھر بھر کر پانی سر پر ڈالتے ہوئے، اور راہگیر مسافر پیاس بجھاتے ہوئے اور سفر کی تکان کو دور کرنے کے لئے کھیت کی مینڈ پر بیٹھکر آرام کرتے ہوئے، اور کھیتوں کی نگہبانی کرنے والے حقّے کے کش لگاتے ہوئے اور آس پاس سے گزرنے والوں سے خوش گپیاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو آبپاشی کرنے والا کاشتکار رستہ کھینچنے والے بیلوں کو فرازسے نشیب کی طرف ہانکتے ہوئے دیہاتی ترنم کے ساتھ گیت گارہا ہے۔ اور کبھی کبھی بیلوں کو سہارا دینے کے لئے خود بھی اُچک کر رستے پر بیٹھ جاتا ہے تو دوسری طرف چرسے کو کھینچکر نالی میں پانی گرانے والا آدمی اسی ترنم آمیز لہجے میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد معین وقفوں کے ساتھ "رام لایو" کی صدا بلند کررہا ہے۔ ایک طرف دیہات کی تندرست اور پھرتیلی نوجوان لڑکیاں رنگ برنگ کپڑوں میں ملبوس کودتی پھاندتی کلیلیں کرتی اور سہیلیوں سے فلک شگاف قہقہوں کے ساتھ مذاق کرتی ہوئی نظر آتی ہیں تو دوسری طرف مضبوط ہاتھ پیر والے نوجوان لڑکے ایک دوسرے کو چھیڑتے اور چھلانگیں مار مار کر آس پاس کے کھیتوں کی کیاریوں میں دوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف ایک سنجیدہ مرد یا عورت نہایت ہی انہماک کے ساتھ کھیت کی کیاریوں میں پانی کی رفتار دیکھ رہی ہے، اور گیلی مٹی ادھر سے اُٹھا کر اُدھر رکھتی ہے تاکہ ایک کیاری پُر ہو جانے کے بعد پانی دوسری کیاری کی طرف چلا جائے تو دوسری طرف اسی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ نالی کے کنارے بیٹھی ہوئی

ایک عورت گھر کے برتنوں کو پوری قوت سے رگڑ کر چمکا رہی ہے۔ کچھ لوگ گردنوں میں دھاگے ڈالے ہوئے کنوئیں کے پاس نہا رہے ہیں اور پانی جسم پر پڑنے سے جو کپکپی پیدا ہوتی ہے، اس کے اظہار کو روکنے کے لئے سنسکرت اور ہندی کے الفاظ ایک خاص لہجے میں بڑبڑا رہے ہیں۔ دوسری طرف کچھ معمر عورتیں دیہاتی اور خانگی سیاسیات پر بحث کر رہی ہیں اور کسی بات پر اختلاف ہو جاتا ہے تو عریاں گالیوں کے وہ لغات استعمال کرتی ہیں جنہیں سنکر شہر کے لوگ لرزہ بر اندام ہو جائیں۔ کچھ تھکے ماندے مسافر پانی پینے اور سستانے کے بہانے سے کنوئیں کے پاس بیٹھ گئے ہیں اور سفری صعوبات، دھوپ کی شدت، وقت کی خرابی، فصل کی حالت بیان کرنے کے بعد اپنے گاؤں کا حال کہہ رہے ہیں اور اس سلسلے میں تھوڑی بہت مقامی اور غیر مقامی داخلی اور خارجی سیاسیات اور انکی مابعد الطبیعیات کی بحث بھی ہو جاتی ہے جو شہر والے سنیں تو ہکا بکا رہجائیں۔ اس تنوع اجتماع میں بڈھے نوجوانوں کو ڈانٹ پھٹکار کرتے ہوئے اور بچے بڑوں کی نقل کرتے ہوئے اور آپس میں کھیلتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ اور باہمی گفتگو میں خانہ جنگیوں کے تذکرے اور ایک دوسرے کی عیب جوئی کے ساتھ بہت سے خانگی معاملات اور مذہبی اور قانونی مسائل کے فیصلے بھی ہو جاتے ہیں۔

لیکن یہ تمام باتیں اسقدر سہل انکاری کی رفتار سے ہوتی ہیں اور انکا دائرۂ تخیل اتنا تنگ ہوتا ہے کہ زمانۂ حال کے تمدن کی ذرا سی بھی جھلک بھی نظر نہیں آتی، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیہات میں تمدن اور معاشرت کا آج بھی وہی معیار ہے جو مہا بھارت کے زمانے میں تھا۔ اس تخیل میں بلندی اور رفتار میں تیزی پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور دیہی فلاح و ترقی کی اسکیم کی تمام تنوع سرگرمیوں میں یہی مقصد پوشیدہ ہے۔ جو لوگ دیہی فلاح و ترقی کے کام میں حصہ لے رہے ہیں انہیں دیہی معاشرت کے اس پہلو کو ملحوظ رکھنا چاہیئے جو اس مضمون میں بیان کیا گیا ہے اور دیہات کی معاشی سرگرمیوں کے اس اہم مرکز کو ضروری اصلاح کے بعد کام میں لانا چاہیئے۔

رُباعیات

کیا شیخ ملیگا گُل فشانی کر کے　　تشریحِ مآلِ شادمانی کر کے
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے اُنھیں!　　جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

وہ رات گئے شراب ڈھلنا، ہے ہے　　وہ پچھلے پہر صبا کا چلنا، ہے ہے
معشوقۂ نوخیز کا وہ رہ رہ کر　　آنکھوں کو ہتیلیوں سے ملنا، ہے ہے

(جوش ملیح آبادی)

بدحواسیاں

(از مدیر)

میں اس دلچسپ سلسلے کو سب سے پہلے اپنی بدحواسیوں کے واقعات سے شروع کرتا ہوں۔ اور اسی کے ساتھ قارئین کرام سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ فرصت کے لمحوں میں اپنے اس قسم کے حالات و واقعات کو نوٹ کر کے "کلیم" میں اشاعت کے واسطے مرحمت فرما دیا کریں۔

میری قوم ناقابلِ برداشت حد تک سنجیدہ ہو چکی ہے حالانکہ کل کی بات ہے کہ ہماری زندہ دلی اور ہماری رنگینیاں ضرب المثل تھیں۔ آج بھیپھڑے کی پوری قوت کے ساتھ قہقہہ مارنا مرتبے سے گری ہوئی بات سمجھا جاتا ہے — کل تک ہماری ہولیوں کی پچکاریاں روئے زمین کو رنگین کر دیا کرتی تھیں، آج اگر کہیں رنگینی ہے تو صرف ہماری خونچکاں آنکھوں میں —

اے میرے ہندوستان! تیری زندہ دلیوں اور رنگینیوں کو کسکی نظر کھا گئی۔ ہنس اے دکھیا ہندوستان ہنس، پروا نہ کر مصائب و آلام کی، تو نے سنا ہے؟

ع غم، موجِ تبسم سے ترش جاتا ہے!

میں اپنے غمگین بھائیوں کو ہنسانا چاہتا ہوں، خواہ وہ مجھی پر کیوں نہ ہنسیں، لیکن ہنسیں تو، اُنکے اترے ہوئے چہرے دیکھکر میرے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں —

میں اپنی قوم کو ہنساؤنگا، ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔ ہاں تو سُنئے میری بدحواسیاں — لیکن آپ بھی اپنی بدحواسیاں بیان کیجئے گا، یہ نہو کہ آپ تو مجھ پر ہنس لیں، اور میں آپ پر ہنس نہ سکوں۔

میری بدحواسیاں

(۱) صبح کا وقت تھا، میں اپنے والدِ گرامی کے نہایت قابلِ قدر دوست، عمِ محترم جناب منشی التفات رسول صاحب مرحوم تعلقدار سندیلہ کے سالانہ مشاعرے میں شرکت کی غرض سے سندیلے گیا ہوا تھا۔ ایک روز اغلباً صبح کے وقت جی بہلانے کی خاطر اسٹیشن پر ٹہل رہا تھا، کہ اتنے میں گاڑی آئی، اور پلیٹ فارم پر آ کر رُک گئی۔ میں گاڑی کی سیر کرنے لگا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک فرسٹ کلاس میں میرے ایک نہایت محبوب دوست بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں ہمہ تن اشتیاق بنکر اُنکی طرف بڑھا، وہ بھی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ انکے چہرے سے بھی میری ملاقات کا کسقدر شوق ٹپک رہا تھا۔

لیکن جیسے ہی کھڑکی میں سر ڈالکر میں نے اُن سے ہاتھ ملانا چاہا، دفعتہً کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی، میرے ماتھے سے خون ٹپکنے لگا۔ اور وہ محبوب دوست یکایک غائب ہو گئے آپ سمجھے وہ میرے دوست کون تھے؟ کھڑکی کے بند شیشے میں خود میرا ہی عکس پڑ رہا تھا!

(۲) ایک نوجوان دوست کے ساتھ حیدرآباد کے دلفریب باغِ عامہ میں ٹہل رہا تھا کہ سامنے سے موٹر میں ایک پیر مرد گزرتے نظر آئے، مجھ سے اُن سے صاحب سلامت ہوئی موٹر گزر گیا۔ اور میں نے اپنے دوست سے جو میرے ساتھ ٹہل رہے تھے، بڑے دردناک انداز میں کہا "دیکھئے، زندگی میں کیسے کیسے حمقاء سے صاحب سلامت کرنا پڑتی ہے" اور یہ کہتے ہی میں نے دیکھا کہ یکایک اُنکا رنگ اُڑ گیا، اور یہ رنگ دیکھتے ہی مجھے فوراً یاد آ گیا کہ وہ تو ان کے باپ تھے!

(۳) ایک صاحب دفتر میں بڑے ہی تپاک سے آ کر گلے ملے، اور مجھے میرے لڑکپن کے نام "شبیر" سے مخاطب

کیا۔ لیکن مینے اُنھیں مطلق نہیں پہچانا۔ ہرچند انکی ہر بات کا انتہائی گرمجوشی اور بے تکلفی سے جواب دیتا رہا۔ لیکن دل ہی دل میں سوچتا جاتا تھا کہ یہ ہیں کون — اِتنے میں ایک سِن رسیدہ اور ثقہ دوست تشریف لے آئے جو پُرانی تہذیب کے حامل تھے، انھوں نے میرے ان دوست کے متعلق جنھیں میں پہچاننے کی انتہائی سعی کر رہا تھا۔ مجھ سے کہا:۔

"آپ کی تعریف"

اور خدا جانے یہ کیا معاملہ تھا کہ یکایک میرے مُنھ سے نکل گیا:۔

آپ کے شوہر!!!

(۴) میں اپنے ایک نہایت خاموش اور سنجیدہ دوست کے وہاں مہمان کے طور پر ٹھہرا ہوا تھا، جو ایک مشہور شاعر ہیں۔ رات کے وقت جب دسترخوان بچھا تو انھوں نے اپنی غزل سنانا شروع کی میں داد دیتا رہا۔ وہ شعر پڑھتے پڑھتے رک گئے اور کہنے لگے اب ایسا شعر سُناتا ہوں جو آپ کو بیحد پسند آئیگا۔ مینے کہا "ارشاد" انھوں نے ایک نہایت معمولی سا شعر سُنایا، اور میری زبان سے بیساختہ نکلگیا "کیا لغو شعر ہے"۔

میرے سنجیدہ دوست نے، جن سے مجھ سے کبھی ایک بار بھی مذاق نہیں ہوا تھا، اپنی عینک کے تاروں سے مجھے انتہائی حیرت کے ساتھ دیکھا۔ اور میرے واسطے اِسکے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ مینے انکے خدمتگار سے کہا "رمضانی! تھوڑا سا پانی"!

(۵) ایک روز دفتر جانے میں ذرا دیر ہوگئی تھی مینے جلدی جلدی کپڑے پہنے، اور بیگ اُٹھا کر باہر جانے لگا، کہ اتنے میں میری بیوی، اور انکے ساتھ بچوں کے فلک شگاف قہقہوں کی آواز نے مجھے وہیں روک دیا — اور اب کیا دیکھتا ہوں کہ میں پائجامے کے علاوہ پورا لباس پہنے ہوئے ہوں!

(۶) ایک مرتبہ میرا موٹر بگڑ گیا تھا۔ تانگے پر آمدورفت رہتی تھی، کارخانے والوں کی بدعہدیوں کے باعث دو ماہ تک مجھے تانگوں ہی میں بیٹھنا پڑا۔

دو مہینے کے بعد خدا خدا کرکے موٹر واپس ہوا، اور اُسی روز شام کو میں اپنے دوست حضرت ذوقی کو لیکر سیر کرنے نکلا، اور جیسے ہی تانگوں کے اڈے کے قریب پہونچا، موٹر روک کر ذوقی صاحب سے کہا بھئی دیکھو یہ سامنے والا تانگا بہت اچھا ہے، اِسے لے لو، ورنہ اِس سے بہتر تانگہ نہ مل سکیگا۔

اور جب ذوقی صاحب نے زور سے قہقہہ مارا، اسوقت معلوم ہوا کہ میں تو موٹر میں بیٹھا ہوا ہوں!

(۷) موٹر کے دو واقعے اور بھی ہیں۔

رات کو ٹہلنے نکلا، دو ایک احباب بھی ساتھ تھے، اتنے میں چوراہے سے پولیس کی سیٹی کی آواز آئی۔ میں فوراً ہی ٹھہر گیا اور ایک دوست سے کہا ذرا دیکھ لیجئے شاید پیچھے کی لائٹ گل ہوگئی ہے!

(۸) ایک روز سویرے سے چہل قدمی کرتا ہوا ایک چوراہے پر آنکلا، سامنے پولیس کا آدمی کھڑا تھا، اُسے دیکھتے ہی میں ٹھہر گیا، اور سیدھے ہات سے سائنڈ دینے لگا۔ وہ ہکا بکا ہوکر میرا مُنھ دیکھنے لگا، اور مجھے غصہ آنے لگا کہ یہ کمبخت میرے موٹر کو کیوں روکے ہوئے ہے، اور سائڈ کیوں نہیں دیتا۔

اتنے میں نہایت خشونت کے ساتھ مینے اپنا ہات ہلانا شروع کردیا، اور پولیس والا، مجھے اُسکی حیرت اور پریشانی اب تک یاد ہے، گھبرایا ہوا میری طرف آیا، اور اپنی مخصوص زبان میں کہنے لگا "صاحب! کیا ہوا؟" بس یہ سُنتے ہی مینے دیکھا کہ میں تو سڑک پر کھڑا ہوا ہوں — اور اسقدر تیزی سے روانہ ہوا کہ جب مینے مُڑ کے پولیس والے کو مُڑکر دیکھا تو وہ مجھے ایسی حیرت کے ساتھ دیکھ رہا تھا گویا میں قطعی طور پر مجنون ہوں۔

(۹) ایک روز اپنے ایک نہایت متین دوست کے وہاں اُنکی بیوی کی وفات پر تعزیت کی رسم ادا کرنے گیا۔ باتوں باتوں میں، تصاویر کا ذکر چھڑ گیا، اور وہ ایک البم مجھے دکھلانے لگے۔ ناگاہ ایک ورق جو پلٹتے ہیں تو ایک عجیب صورت کی تصویر نظر پڑی، مینے بیساختہ پوچھا، "نوابصاحب یہ کون جانور ہے"؟

اُنھوں نے سر جھکا کر جواب دیا میرے والد ہیں"!

جاپان کی قوت کا راز

از مسٹر چمن لال صاحب جرنلسٹ

(جاپانی ثقافت (culture) کے دس ستون)

کس طرح جاپان ایک ایسی عظیم طاقت بن گیا جو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے منہ آسکتا ہے؟ اس کے راز جاپانی سیرت کے اندر مستور ہیں۔

(۱) جاپانی ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں (۶) جاپانی سب سے زیادہ صاحب خلق و مدارات ہیں
(۲) جاپانی مناظر قدرت سے محبت کرتے ہیں (۷) جاپانی حیرتناک انتظامی قابلیت رکھتے ہیں
(۳) جاپانی سادہ معاشرت رکھتے ہیں (۸) جاپانی دیانت و خوش معاملگی کو بیحد محبوب رکھتے ہیں
(۴) جاپانی ثقافت کی بنا پائدار ہے (۹) جاپانی ضابطے کی نہایت سختی سے پابندی کرتے ہیں
(۵) جاپانی گھریلو زندگی پسند کرتے ہیں (۱۰) جاپانیوں کا اخلاقی معیار نہایت بلند ہوتا ہے

(۱) دائمی متبسم قوم

اصلی جاپان، اس کی گلشن آرائیاں، اور اس کے باشندوں کی عالمگیر شگفتگی و خوش مزاجی، اگر ہم وہاں کی مغربی نقالی کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں، جو خوردبین کے سامنے خودبخود نمایاں ہوجاتی ہے، ایک ایسی شئے ہے جو شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔

جاپانیوں کی یہ خصوصیت کہ وہ آپ کو ہر وقت خوش رکھنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ مغربی "امر واقعہ" ( ) لوگوں کو اچیرن ہوجاتی ہے، ان میں بعض تو یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ جاپانی کردار کا یہ رُخ، بالکل غیر فطری چیز ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔

جاپان دراصل "اکتسوشیا" بھی کہا جاتا ہے۔ "اکتسو" کے معنی ہیں "خوش و خرم" اور "شیما" جزیرے کو کہتے ہیں جس کے معنی ہوئے "جزیرۂ خوش دلان"

دیانت داری، اور ذکاوت، جاپانیوں کے ممتاز اوصاف ہیں۔ یہ لوگ ریشہ دوانیوں اور فریب کاریوں کو نہایت ذلیل و معیوب سمجھتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ قوم اپنے ہر وقت بشاش اور متبسم رہنے کے باعث بہت فائدہ اٹھاتی ہے۔

تبسم انہیں دولت دیتا ہے آپ خواہ کسی بڑے اسٹور میں جائیں، یا کسی "بس" میں سوار ہوں، کسی "لفٹ" پر چڑھیں، یا کسی "ریسٹوران" میں داخل ہوں، جاپانی خلق آپ کا ہر جگہ خیر مقدم کریگا، اور اس قدر کہ اجنبیت کا احساس آپ کے دل سے محو ہو جائیگا، اور کامل احتیاط و توجہ سے آپ کے احکام بجالائے جائیں گے۔

آپ جہاں بھی پہنچیں گے۔ ایک دلنواز تبسم سے آپ کی پذیرائی ہوگی۔ "خوش آمدید" کہا جائے گا۔ اور رخصت ہوتے وقت آپکی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا جائے گا۔

جاپان کی اس خصوصیت نے، سیاحوں کے لئے وہاں روپیہ صرف کرنے کو ایک ایک لذت و مسرت بنا دیا ہے، جس کے باعث وہاں کی تجارت کو خوب فروغ حاصل ہوتا ہے۔

جاپانیوں کے اس تبسم پیہم کے کئی اسباب ہیں، جن میں بعض تو فطری ہیں، اور بعض اکتسابی، لیکن اکتسابی بھی اتنے قرون در آغوش اسباب پر مبنی ہیں کہ اب وہ بھی فطری ہی ہوچکے ہیں۔

جاپانیوں کا یہ تبسم، جیسا کہ بعض شکی اور امتیاز سے عاری یورپی لوگوں کا خیال ہے۔ ہرگز "چہرے پر" ایک "مصنوعی چہرہ" یا "نقاب" نہیں ہے، بلکہ "شنتو" کے اولین اصول کی روشنی میں ان کا تبسم ایک آئینہ ہے، جس میں وہ اپنے عقیدے کے مطابق اپنی روح، اور علت العلل کے جمال سے دوچار ہوتے ہیں، اور ابدیت سے اپنا حصہ و انعام حاصل کرتے ہیں۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تبسم ان کا مذہبی و روحانی شعار ہے۔

گوشت پوست خواہ کتنی ہی بلاؤں کا ہدف رہے، لیکن بودھی ( ) روح، ان تمام بلاؤں کی گرفت سے بالا رہتے ہوئے مسکراتی رہتی ہے۔

میرے خیال میں دنیا کی کسی ایک قوم نے بھی جاپانیوں کی طرح اتنی طویل مدت تک ایسے قطعی اور غیر متزلزل ضابطے کی آجتک پابندی

نہیں کی ہے۔ اُنہوں نے اس ضابطے کو بھی آداب وتہذیب میں داخل کرلیا ہے۔

یہ ضابطے کی شدید پابندی، بلحاظ نوعیت اسپارٹا سے منسوب کی جاسکتی ہے لیکن اُس نے اشراقیین پیدا نہیں کئے۔

اس ضابطے سے معمولی سی روگردانی بھی شدید تعذیب، اور بعض حالات میں سزائے موت کا سبب بن جاتی تھی۔ اور اس سخت گیری نے جاپانیوں کو اس دُنیا کی سب سے زیادہ ثقافت یافتہ ... اور سب سے زیادہ ... قوم بنا دیا ہے۔

ایسی قوم کا سمجھنا، جو ضرورت سے زیادہ بامروّت و خلیق ہو، ہمارے لئے دشوار ہوجاتا ہے۔ ہم اس کی نیت اور اُس کے اغراض پر شک کرنے لگتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا تو حال یہ ہے کہ جب ہمیں غصہ آجاتا ہے، ہم دست و گریبان ہوجاتے ہیں۔ اگر کسی شخص سے نفرت کرتے ہیں، تو ہم اسے مکروہ طور پر ظاہر کردیتے ہیں، اور جب ہمیں کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو دھاڑیں مار مار کر رونے پیٹنے لگتے ہیں، لیکن ان تمام حالتوں میں جاپانی کیا کریگا؟ وہ اس وقت بھی مسکراتا نظر آئیگا۔ پھر بھی اس کا تبسّم، ریاکارانہ، یا تجارتی اقتضاء نہیں ہوتا، نہ اسے اشراقیت کا مظاہرہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جاپانی قوم ہر ابتلا کے برداشت کرنے، اور ہر مصیبت کے موقع پر مسکرانے والی قوم ہے۔ مسکرانا تو ان کے دین و ایمان کا ایک جزو، اور لاینفک جزو ہے،

جاپانی ایک حلیم، بُردبار، اور بشاش قوم کے افراد ہیں، جن کے پروازِ سرشت جذبات، مسکراہٹ، ہنسی، اور قہقہوں کے دوش پر اُڑانے کے لئے ہمیشہ طیار رہتے ہیں۔

(۲) مناظرِ قدرت کی محبّت

جاپانی مناظرِ قدرت کے سچے پرستار ہیں، اُن کی روایتی شوالہ پرستی کے ساتھ، اُن کی دائمی فطرت پرستی بھی وابستہ ہے۔

پہاڑیوں، وادیوں، سمندروں، دریاؤں، ندیوں، نالوں، جھیلوں، چشموں، درختوں، باغوں، پھولوں، یہاں تک کہ پتھروں اور سنگریزوں تک سے دنیا کے کسی ملک کے باشندوں کو اتنا شدید عشق نہیں ہے، جتنا کہ جاپانیوں میں پایا جاتا ہے۔

فطرت کے ساتھ ان کی یہ دیوانہ وار محبّت، ثقافتِ "زین" کا ایک ضروری جزو ہے۔

قدیم روایات کے تحت، اور قوم کے رجحان کے مطابق، جاپانی حکومت نے وسیع باغوں، اور لہلہاتے ہوئے مرغزاروں کا ایک نظام قائم کردیا ہے، جو بدرجۂ غایت قابلِ ستائش اقدام ہے، اور ہماری ہندوستان کی گورنمنٹ کے لئے قابلِ رشک و تقلید ہے۔

مُلک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظر فریب پارکوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ جہاں لوگ بکثرت جمع ہوتے ہیں۔ تفریح کرتے، اور مناظر کی لطافتوں، پھولوں کی مہکوں، اور اُمنگ پیدا کرنے والی ٹھنڈی ہواؤں سے حیات حاصل کرتے ہیں۔

کیا ہماری ہندوستان کی گورنمنٹ کے ذرایع اتنے وسیع نہیں ہیں کہ جاپان کی طرح ہندوستان کو بھی سامانِ حیات و نشاط سے بہرہ مند ہونے کا موقع دے سکے؟

(۳) خانگی زندگی کی سادگی

جاپانی طبائع کا سادگی پسند ہونا، اُن کے لئے ایک رحمت و برکت ہے۔

جاپان کی خانگی زندگی ایک غیر معمولی دلکش تصویر پیش کرتی ہے۔ ہرچند جاپانی معاشرت میں ایک نوع کی رسم پرستی ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن وہ اتنی نرم و نازک واقع ہوئی ہے کہ بُری معلوم ہونے کے عوض دلکش لگتی ہے،

ہر بزرگِ خاندان صبح بستر سے اُٹھتے ہی سُورج کی طرف رُخ کرکے گردن جھکا لیتا ہے۔ اور اس مبدائے حیات کے حضور سادہ لفظوں میں اپنی تہنیت پیش کرتا ہے:-

"اے متبرّک وجود! تجھے آج کا دن مُبارک ہو"

اس کے بعد خاندانی لوح کے سامنے کچھ زیرلب دُعا کرتا ہے۔

غروب کے وقت کام سے پلٹ کر گھر پہنچتا اور غُسل کرتا ہے۔ یہ غُسل کی عادت رسمِ عام کی صورت میں ادا ہوتی ہے۔ پانی کے ظروف باہر نکال لئے جاتے ہیں۔ اور غُسل کرنے میں باہم گرم "خوش گپیاں" اور خوش فعلیاں ہوتی رہتی ہیں،

جاپانیوں کے مکان رات کے وقت بالکل بند ہوجاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے، تو مکان کی کاغذی دیواروں کو پامال کرتا ہوا مکان میں داخل ہوسکتا ہے، لیکن یہ محض ایک خیال ہے، جاپان میں دوسری چیزوں کی طرح پہلی نظر میں تو دیواریں نازک اور کمزور معلوم ہوتی ہیں، لیکن دراصل ان کی تہ میں پتلے فولاد کی چادریں لگائی جاتی ہیں۔

مکانوں کے اندر فرنیچر تو بالکل ہوتا ہی نہیں، برائے نام ہوتا ہے، کوئی کرسی، کوچ یا جدید تمدن کی کوئی آرام دہ چیز نہیں ہوتی۔

موسم سرما میں ایک روغنی لکڑی کا گلڑا سا ہوتا ہے، جس کے گرد سب ... ایک "فیوتون" ( ) کے اندر بیٹھتے ہیں۔ کھانا اور سونا ایک ہی کمرے میں ہوتا ہے۔

امراء کے مکان بھی ایسے ہی ہوتے ہیں، میرے تجربے میں توشوگن ... کا محل بھی اسی طرز کا تھا۔

جہاں دیکھئے کفایت شعاری پر سختی کے ساتھ عمل درآمد نظر آتا ہے، لیکن جاپانیوں کے آداب، رسم و رواج، اور خاطر مدارات کی فراوانی میں یہ کفایت شعاری، جنبیوں کو محسوس نہیں ہوتی۔ اور صناعتہ، ثقافت، اور نسل کی قوت کا راز اسی میں مضمر ہے۔

ایک معمولی خاندان ایک خندق کے اندر زندگی بسر کرسکتا ہے۔ کا کیمیونو (؟)، ایک گلدان، ایک چوبی گگرا، ایک کیتلی، چابیالے اور برتن یہ تمام خانہ داری کی کائنات ہوتی ہے۔

جاپانی زندگی میں نمائش کا یہ فقدان، عدم شعور، افلاس یا ثقافت ( ) کی کمی کے باعث نہیں، بلکہ قطعاً ارادی ہوتا ہے۔

جاپان، دنیا کی سادہ ترین قوم ہے، اُن کی زندگی کا ہر پہلو سادہ ہوتا ہے، اُن کی سادگی محض قیاسی یا ذہنی نہیں ہوتی، وہ تو اپنی لطف اندوزیوں اور جذبات کے مظاہروں میں بھی سادہ نظر آتے ہیں۔

بیکاری، اور مادی انتفاع میں بھی جاپانیوں کا انہماک مذہبی خیالات کی بنا پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اُن کے شاہنشاہ، پیشوائے اعظم روحانی مقتدا، ہیروہیتو، نے "بازمانہ بساز" کا انہیں حکم دیا ہے۔

جاپانیوں کی اِس انتہائی سادگی، کو حیات و بارِ حیات کی طرف سے بیہمانہ بے تعلقی نہ سمجھنا چاہئے، یہ سادگی تو ان کی زندگی کا ایک زبردست لائحہ عمل ہے۔

یہ قانع و صابر لوگ جو کھیتوں کے اندر مشقت کرتے، یا اپنی چھوٹی چھوٹی صنعتوں اور پیشوں میں مصروف نظر آتے ہیں، درحقیقت زبردست ہیرو ہیں۔ جو قومی اغراض کے لئے، شخصی و انفرادی یا نمائشی جذبے کے بغیر، ہر ممکن قربانی کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں، یہ ہیں وہ تمام باتیں جو جاپان کی قومی اور انفرادی سیرت کے لازمی اجزا ہیں۔

(۴) سادگی جاپانیوں کا وصف

سرکاری عمارتوں اور استعمالی فرنیچر وغیرہ کے معاملے میں

جاپانی حکومت بھی نہایت اعتدال پسند واقع ہوئی ہے۔ وہ بھی ہر قدم پر انتہائی کفایت شعاری پیش نظر رکھتی ہے، لیکن ان کے مقابلے میں ایوانہائے تجارت، بینکیں، بیمے ادارے، شوور کی عمارتیں، اتنی عظیم اور دلکش ہیں، جتنی روپے کی طاقت سے کوئی عمارت طیار ہو سکتی ہے۔ ہر چند سرکاری عمارتیں بہت ہی سادہ، اور معمولی ہوتی ہیں۔

جاپان کی بری و بحری فوج میں بھی انتہائی سادگی و کفایت شعاری پائی جاتی ہے۔ اُن کی وردیاں قیمتی نہیں ہوتیں، اور زیادہ آرام و راحت کا فقدان اُن کے ادائے فرائض میں قطعاً حائل نہیں ہوتا ہے۔ جاپانی سپاہیوں کو ہمارے ہندوستانی سپاہیوں کے مقابلے میں بہت کم ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔

جاپانی بری و بحری فوج زنگار رنگ وردیوں، اور پیتل کے چمکتے ہوئے بٹنوں کے عوض، ایک ایسے اخلاقی نظام کا مظاہرہ کرتی ہے، کہ دنیا دنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔

جاپان میں بھی روپیہ خرچ کیا جاتا ہے، اور بعض اوقات دل کھول کر خرچ کیا جاتا ہے، مگر واقعی اور حقیقی ضرورتوں پر، حکومت چمکیلی اور بھڑکیلی چیزوں پر روپیہ برباد کرنے کو اپنے ملک سے غداری سمجھتی ہے۔

ان سب باتوں کے دوش بدوش جاپان کی سرکاری ملازمتوں کی جو خصوصیت اعلیٰ ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمام محکموں میں خدمت وطن کی وہ سچی روح کارفرما ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔

ملک کا ادنیٰ اور حقیر باشندہ بھی سرکاری ملازموں کے خدمات سے پوری طرح بہرہ یاب ہوتا ہے۔

ہر ملک کے سرکاری ملازموں، اور حاکموں میں جو رعونت، شیخی، نمائش حکومت، اور تبختر پایا جاتا ہے۔ وہ جاپان میں اس قدر مفقود ہے کہ کہیں نظر نہیں آتا۔

وہاں خدمتگزاری اور دستگیری کی روح سرکاری محکموں سے لیکر

معمولی دوکانوں اور ہوٹلوں تک دوڑی ہوئی ہے۔

جاپانی حکومت اپنی رعایا اور اپنی قوم کے ساتھ وہ کرتی ہے جس کا شائبہ تک کسی دوسری حکومت میں نہیں پایا جاتا۔

عام اہلِ جاپان کے جو کارنامے ہیں وہ دُنیا کے سامنے ہیں، اور اُن کارناموں ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کی حکومت خدمتِ خلق کی کس شدّت کے ساتھ پابند ہے۔

اگر آپ عمیق نظر ڈالیں گے تو جاپانیوں کی تجارت کا فروغ، صنعت کی وسعت، اور جاپانی مال کی عالمگیر مانگ سے خود اندازہ کرلیں گے کہ وہاں کی حکومت اپنی رعایا اور قوم کے ساتھ کیا قابلِ ستائش سلوک روا رکھتی ہے، اور اس سے جاپان کو کس قدر کثیر فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔

(۴) اساسِ ثقافت

صفحۂ ہستی پر جاپان ایک ایسی قوم ہے، جس کی معلومہ تاریخ مسلسل ہے، اور اس کے سلسلے میں کوئی وقفہ نظر نہیں آتا ہے۔ اور جہاں شاہنشاہوں کے ایک ہی خانوادے کی حکومت رہی ہے۔ جاپان کے اساسی قومی خصوصیات میں یہ وصف سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ وہ بادشاہ کے وفادار اور قومی روایات کے علمبردار ہوتے ہیں۔

جاپانی بادشاہ کی وفاداری، اور قومی روایات کی علمبرداری کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اُن کے یہاں یہ روایت ہے کہ آفتاب کے دیوتا، یعنی سلاطینِ جاپان کے آسمانی مورثِ اعلیٰ نے فیصلہ کردیا ہے کہ جاپان وہ مُلک ہے میرے وارث جہان کے دانا بادشاہ ہوا کریں گے۔ اور آئینِ حکومت کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ جاپانی شاہنشاہی ہمیشہ اُس خاندان میں رہیگی جو زمانہ قدیم سے حکومت کرتا چلا آرہا ہے۔

لیکن قدامت پرستی کی یہ عجیب وغریب رُوح، جاپانیوں کو مغربی تمدّن وثقافت سے بہرہ مند ہونے کے معاملے میں مانع نہ ہوسکی، بلکہ اس کے برعکس اُنہیں اس قابل کردیا کہ وہ نئے تجربوں اور جدید تمدّن کو اپنے اسلاف کے تجربوں کی ترازو میں تول لیں، اور اپنے بزرگوں کی روحوں سے مشورہ لیں۔

یہ مشورے محض برائے نام نہیں ہوتے، بادشاہ سے لیکر گدا تک، سب اپنے آباء و اجداد کے مقبروں میں جاتے ہیں، اور اُن کی قبروں کے سامنے ایسے مراسم ادا کرتے ہیں۔ گویا وہ اپنے خیالات کو اُن کی روحوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

جاپانیوں کی اہلی فطرت (　　　) کے متعلق ایک جاپانی کا عقیدہ ہے کہ ان کے نزدیک بادشاہ کی حیثیت تمام قوم کے شفیق باپ کی سی ہوتی ہے۔ اور سب اولاد درجے میں شریک ہے، نیز بادشاہ کا خاندان دیوتاؤں کی نسل سے ہے، اور اُن کا یہی عقیدہ بادشاہ کی مستقل وفاداری، اور وطن کی غیر متزلزل محبت کا سرچشمہ ہے۔ اور یہی وقتِ ضرورت اُنہیں مجبور کردیتا ہے کہ وہ مفادِ عامہ کے موقع پر اپنی منصبت قربان کردیں، اور خیرِ مشترک کے برکات زیادہ سے زیادہ مقدار میں حاصل کریں۔

بادشاہ، اور اسلاف، جاپان میں مقدس ہیں، اور اس نوع کی پرستش اس قوم کے اندر حیرتناک کارنامے انجام دیتی ہے۔

دوسرے مُلکوں کے قبرستانوں سے جاپانی قبرستان بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ وہاں وحشت وخوف کی کارفرمائی ہوتی ہے، یہاں زندہ اور مُردہ لوگوں کی رُوحوں میں ہم آہنگی وموانست کی فضا پائی جاتی ہے۔

اکثر مسلمان اپنے گورستانوں میں شب برات کے موقعے پر سال بھر میں ایک بار جاتے ہیں، لیکن جاپانی اپنے مقابر میں آئے دن جایا کرتے اور اُن کی آرائش کیا کرتے ہیں، اور اس طرح یہ مقابر، جن کو جاپانیوں کا شوالہ کہنا چاہئے، مرے ہوئے لوگوں کے کارناموں کو زندہ رکھتے ہیں۔

دیوتاؤں اور رُوحوں کی پرستش کا خیال ہندوستان سے جاپان میں پہنچا ہے۔

(۵) متاہلی زندگی

جاپانیوں کی زندگی کا، اُن کی قابلِ رشک خانگی زندگی کا ایک نمایاں پہلو ہے، جو باہمی فلاح کی خاطر اُنہیں تعاون وایثار کا سبق دیکر اُنہیں متحد رکھتی ہے۔

مشقّت کرنے والے جاپانی کاشتکار طبقے کے اندر جاپان کی رُوح اور اُس کے مقاصد جھلکتے نظر آتے ہیں۔

میاں، بیوی، اور بچے انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ محنت میں لگے رہتے ہیں، جو لوگ مزدور ہوتے ہیں، وہ نہایت قلیل اُجرت پر کام کرتے ہیں، لیکن وہ اس درجہ کفایت شعار ہیں کہ اس قلیل معاوضے میں سے بھی کچھ نہ کچھ

پس انداز کر لیتے ہیں۔

ناگاساکی کے جہاز پر سالہا سال سے لڑکیاں خلاصی کا کام کر رہی ہیں۔

پہاڑی علاقوں میں عورتیں بھاری بھاری بوجھ اٹھاتے دیکھی جاتی ہیں۔ اور یہ تمام مشقت عہد آغازِ آفرینش کے باقیات سے نہیں، بلکہ ان کے تمدن کا ایک جزو ہے۔

ہر کنبہ ایک جسم ہوتا ہے، جس کا کوئی عضو حقیر نہیں ہوتا۔ میں نے مہتروں تک کو دیکھا ہے کہ ان سے خوش خلقی اور عزت کا برتاؤ کیا جاتا ہے

جاپانی، اپنے ملازموں ہی کو نہیں، بلکہ کتوں تک کو "مسٹر" کے لقب سے پکارتے ہیں اور نوکر اپنے آقاؤں کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔

غور کرنا چاہئے، اور عبرت کے ساتھ غور کرنا چاہئے کہ ہم ہندوستانیوں کا برتاؤ اپنے نوکروں اور اپنے غرباء کے ساتھ کیا ہے۔ کیا انہیں جھوٹا کھانا اور اترن کا کپڑا نہیں دیا جاتا؟ اور کیا اس برتاؤ کے بعد ہمیں توقع رکھنا چاہئے کہ وہ ہمارے وفادار رہیں گے۔ اور خود اپنی نظروں میں حقیر نہ ہو جائیں گے؟

ہندوستان میں درزی، موچی، دھوبی، کاتب، اور اسی قسم کے کام کرنے والے اس بات کے لئے مشہور ہیں کہ ان کے وعدے کبھی ایفا نہیں ہوتے۔ لیکن جاپان میں آپ کو کوئی ایسا واقعہ کبھی پیش نہ آئیگا، اور کوئی ایسا وعدہ نہ ہوگا۔ جو وقت پر وفا نہ ہو جائے۔

(۶) دیانت کی حکومت

مجھے جاپانی تجارتی کمپنیوں کا تو تجربہ نہیں کہ غیر ممالک کے ساتھ ان کی معاملت کیسی ہے۔

لیکن جہاں تک عام جاپانی دیانت کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ انکا دیانت کا معیار بیحد بلند ہے۔ اور وہ ہر شعبۂ حیات میں دیانت و خوش معاملگی کے شدت سے پابند ہیں۔

جاپانی ملازم بھی بہت زیادہ متدین ہوتے ہیں، اور اپنے مالک کے مال کو ایک مقدس امانت سمجھتے ہیں۔

میں "ٹوکیو" میں اکثر ہفتوں مکان سے باہر رہتا تھا، میرے بکس اور میرا مکان غیر مقفل رہتا تھا، لیکن کبھی ایک بار بھی مجھے کوئی تلخ تجربہ نہیں ہوا۔

آپ نے سنا ہوگا کہ پہلے ہندوستان کی بھی یہی حالت تھی، لیکن اس سنی ہوئی بات کو آج آپ جاپان میں دیکھ سکتے ہیں۔ جاپان نے ہندوستان سے اس صفت کو لیا، اور قائم رکھا۔

(۷) پولیس

۱۹۲۷ء میں میں نے کوہستانِ ہمالہ کے اندر تقریباً ایک ہزار میل کا پیادہ سفر کیا، اور ایسے مقاموں کو بھی دیکھا۔ جہاں لوگ چوری سے قطعی بیگانہ تھے۔

میں نے وہاں کے گورنر سے سوال کیا کہ ایسے اہم مقامات میں بھی جو تجارت کے مرکز ہیں۔ پولیس کا نہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ گورنر نے مجھ سے کہا کہ ہمیں پولیس کی ضرورت نہیں یہاں جرائم نہیں ہوتے، پولیس کی شکل دیکھتے ہی مجرم کا ولولہ موجیں مارنے لگتا ہے۔

ہندوستان کے وسیع بر اعظم کی پولیس پر جو "یونین جیک" اٹھائے پھرتی ہے کتنی افسوسناک لیکن سچی چوٹ ہے!

لیکن غور کرو تو اس کا الزام پولیس پر نہیں، ہندوستان کے نظامِ حکومت پر ہے۔ جو سب سے زیادہ جاہل و غیر مہذب لوگوں کو پولیس میں بھرتی کرتا ہے تاکہ انہیں خود ہندوستانیوں پر گولی چلانے کے لئے آمادہ کیا جا سکے۔

جاپانی پولیس ہندوستانی پولیس سے قطعی مختلف چیز ہے۔ جاپان کی پولیس، اہلِ جاپان کی بہترین دوستانہ جماعت ہے، وہ مہذب ہے، تعلیم یافتہ ہے، خوش خلق ہے، اور دوست کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔

ان کی وردی ڈراؤنی نہیں ہوتی! وہ گرمیوں میں سفید، اور سردیوں میں نیلی ہوتی ہے۔ جاپانی پولیس کبھی نہیں چاہتی کہ رعیت دہشت زدہ رہے، اور اس سے چاندی کی آخری کیل تک چھین لی جائے۔

جاپان کی پولیس مقدمات ترتیب نہیں دیتی۔ مجرموں کی اصلاح میں سرگرم رہتی اور غریبوں کی دستگیری کو اپنا مذہبی فریضہ تصور کرتی ہے۔ یہاں تک ہر دلعزیز ہے کہ غرباء کے لئے جو چندہ جمع کیا جاتا ہے، وہ تقسیم کرنے کی خاطر پولیس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

(۸) احساسِ ذمہ داری

جاپان میں کسی ماتحت سے کوئی قابلِ ملامت فعل ہو جاتا ہے، تو اس کا افسرِ اعلیٰ اس وقت تک ملامتِ ضمیر کی آگ میں تپتا رہتا ہے، جب تک کہ وہ اپنا استعفیٰ نہ پیش کر دے۔ ایسے استعفے جاپان میں بہت عام ہیں، اور یہ استعفے کسی سوسائٹی کے دباؤ سے نہیں دیئے جاتے ہیں۔

ہمارے لائقِ پرستش "لیڈروں" میں سے کتنے ہیں جن کو صحیح طور پر احساسِ فرائض اور انضباطِ قومی سے سچی محبت ہے؟

یہاں تو معمولی سے اختلافِ رائے پر پارٹیاں بن جاتی ہیں، لوگ جنگ کھسُٹ گتھم گتھا ہوتے ہیں؛ اور خدا کے بندوں میں سے کسی کو احساس نہیں ہوتا کہ اس چھچھورے پن سے قومی وقار کو کس قدر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے؟ کس قدر عبرتناک صورتِ حال ہے؟

(۹) معیارِ اخلاق

"معیارِ اخلاق" کو میں جنسی اخلاقیات کے معنی میں استعمال نہیں کر رہا ہوں، جیساکہ بالعموم ہمارے ملک میں سمجھا جاتا ہے، اور نہ میں جاپانیوں کی کثرتِ مے نوشی اور فواحش پسندی ہی پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں؛ بلکہ میں جاپان کے اخلاقیات کے صحیح رخ پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ جاپانی معیارِ اخلاق بیحد بلند ہے۔ جاپانی زبان حیرتناک طرز پر اُن تمام لغات سے پاک ہے، جو گالی کا مفہوم رکھتے ہوں۔ جاپانی زبان میں گالی کے لئے ایک ہی لفظ ہے، اور وہ "باکا" ہے، جس کے معنی ہیں "بیوقوف"۔

اب ذرا اپنی زبان کے لغاتِ فواحش و دشنام سے اس صورتِ حال کا موازنہ فرمائیے۔ جہاں سنجیدہ گفتگو میں بھی گالیوں کے ہزاروں پہلو نکلتے رہتے ہیں۔

جاپانی جب اپنے بچوں کو ڈانٹتے ہیں تو صرف اتنا کہتے ہیں کہ "کیا تم جاپانی نہیں ہو؟" اور ہم جب کسی سے کوئی وعدہ لیتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ "ہندوستانی وعدہ نہ ہو" کتنا حسرتناک تضاد ہے!

(۱۰) پابندیٔ ضابطہ سنگِ بنیاد ہے

جاپان میں ضابطے کی بجاآوری تمام خوبیوں کی جڑ ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس بات میں دنیا کی کوئی قوم، حتیٰ کہ جرمنی تک جاپان کی نظیر نہیں پیش کر سکتا۔

جاپانی زندگی کے ہر پہلو میں ضابطہ بندی سب سے نمایاں نظر آتی ہے، بری و بحری فوج کی ضابطہ پرستی تو ہر ملک میں قانون کا درجہ رکھتی ہے، مگر جاپانی زندگی میں تو یہ ضابطہ ہر گوشے اور ہر شعبے کے اندر پایا جاتا ہے مدرسے ہوں یا کارخانے، سینما ہوں کہ ہوٹل، بازار ہوں کہ عبادتگاہیں ہوں کہ مندر؛ غرضکہ ہر جگہ ایک ایسا نمایاں ضابطہ ہے، جسے دیکھ کر عقل دنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔

آپ کو جاپان میں ہندوستان کی سی بدنظمی کہیں نظر نہ آئیگی کہ سینما ہے تو ایک ہنگامہ برپا ہے، اسٹیشن ہے تو ایک ہلچل مچی ہوتی ہے، اور میلہ ہے تو ایک قیامت کا غوغا ہے، وہاں نہ تو آپ گالیاں سنیں گے نہ یہ ٹکٹ گھروں پر گتھم گتھا اور دھکا پیل نظر آئیگی۔

اگر ہجوم کے اندر کسی کا شانہ آپ کے شانے سے مس ہو جائیگا، تو گردن آپ کے روبرو جھکادی جائیگی، اور تین مرتبہ معذرت کی جائیگی۔

ہزاروں عورتیں روز ٹرام وغیرہ میں بیٹھتی ہیں۔ مگر آج تک مردوں کی ناشائستگی کی ایک شکایت بھی سننے میں نہیں آئی۔

کیا ہندوستان میں یہ صورتِ حال ممکن ہے؟ کیا ہندوستانیوں کے لئے یہ ایک شرمناک ذلت نہیں ہے؟

کیا ہمارے لیڈروں نے اپنے نوجوانوں میں ضابطہ و تنظیم پیدا کرنے کی تکلیف کبھی گوارا فرمائی ہے؟ کیا ہمارے محترم لیڈر خود بھی ضابطے کے پابند ہیں؟

کیا ہماری لائق پولیس کبھی یہ زحمت بیجا پسند کرتی ہے کہ میلوں اور تماشاگاہوں میں ڈنڈوں کے علاوہ، زبان سے ضابطے کی تلقین فرمائیے؟

کیا ہم اپنی تماشاگاہوں، سڑکوں، ریلوں اور اسٹیشنوں کے غیرانسانی ہنگاموں کو رفع نہیں کر سکتے؟

کیا ہم نے کبھی غور کیا ہے کہ فقدانِ ضابطہ کے باعث، ہر سال ہم میں سے کتنی قیمتی جانیں ضائع ہوتی رہتی ہیں؟

میں نے خود کمبھ کے میلے میں یہ سانحہ دیکھا کہ ہجوم کی بے ترتیبی کے باعث چونتیس آدمی ایک دم سے کچل کر ہلاک ہوگئے۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایک بے ضابطہ قوم کو آزادی کے تصور کرنے کا بھی حق پہنچتا ہے؟

جاپانی، جب ایک طرزِ عمل طے کر لیتے ہیں تو ساری قوم ایک واحد جسم کی شکل میں حرکت شروع کر دیتی ہے، اور پھر ایک مخالف آواز بھی سننے میں نہیں آتی۔ یہ صحیح ہے کہ جاپان میں بھی داخلی سیاست کا عنصر موجود ہے، جس سے خودغرض افراد سامنے آجاتے ہیں، لیکن تھوڑی ہی مدت میں خود ان کی شرافت اور عالمگیر حبِ وطن انہیں مجبور کر کے مفادِ عامہ کی راہ پر لے آتی ہے۔

اور وہ اپنے ذاتی اغراض و مفاد کو ٹھکرا کر ملک کے وفادار ہو جاتے ہیں، اب جاپان کی وطن پرستی کے متعلق بھی مجملاً کچھ سن لیجئے، شاید

ہم کچھ سبق لے سکیں۔

(۱۲) انتہائی جذبۂ وطن پرستی

"دنیا جانتی ہے کہ روئے زمین پر کوئی قوم جاپانیوں کے برابر وطن پرست نہیں ہے۔ جب تک میں جاپان آیا نہ تھا۔ مجھے اس کا پوری طرح احساس نہ ہوا تھا۔ لیکن یہاں آکر میں نے ان کی وطن پرستی کو جیسا میں سمجھتا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ حیرت انگیز پایا۔

جب کبھی ان کے ملک کی بہبود و غیرت کا سوال پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی جانوں کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کرتے۔ یقیناً یہی وہ خصوصیت ہے جس نے جاپانیوں کو ایک عظیم الشان قوم بنادیا ہے۔"

آج روئے زمین پر سب سے زیادہ وطن پرست ملک دو ہیں۔ جاپان اور جرمنی۔ دنیا اس وطن پرستی پر جسے بعض لوگ قومی تنگ نظری سے تعبیر کرتے ہیں انہیں خواہ کتنا ہی برا کہے مگر یہ واقعہ ہے کہ اگر ان میں وطن پرستی کا یہ انتہائی جذبہ موجود نہ ہوتا تو ان دونوں ملکوں کا نام صفحۂ ہستی سے کبھی کا مٹ چکا ہوتا۔

اگر ہندوستان آزاد ہونا چاہتا ہے تو اسے اپنے مشرقی بھائی جاپان سے بہت کچھ سیکھنا چاہیے۔ کیونکہ وہ ہندوستان سے بہت سی باتوں میں ملتا جلتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر شیر زنے تحریر فرمایا ہے کہ "ہندوستان کے بغیر جاپان جاپان نہ ہوتا۔" اسی طرح میرا بھی خیال ہے کہ ہندوستان اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا۔ جب تک وطن پرستی کا سبق جاپان سے حاصل نہ کرے۔

وطن پرستی کوئی جرم نہیں ہے، البتہ یہ ان لوگوں کی نظر میں ضرور کھٹکتی ہے جن کے ذاتی اغراض میں یہ سدِّ راہ ہوتی ہے۔ بین الاقوامی تخیل کے جنم داتا سوویٹ بھی اب وطن پرستی کی ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں۔ وطن پرستی کا وہ جذبہ جو کسی زمانے میں روس میں ممنوع تھا، آج سرکاری طور پر اس کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔ تاکہ لوگ وطن پرست بن سکیں۔ اور ان میں مادرِ وطن کے ساتھ محبت اور وفاداری کا جذبہ پیدا ہو۔

ہمارے ان ہندوستانی بھائیوں کو جو بین الاقوامیت کے حامی ہونے کی وجہ سے سودیشی تحریک اور قومی سرگرمیوں کو ہمیشہ تنگ نظری سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، ان معدودے چند اشتراکیوں میں سے ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ بین الاقوامیت سے پہلے قومیت کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے۔ اس لئے جو لوگ ان کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انہیں پنڈت جی کی بنائی ہوئی بین الاقوامیت کی تعریف کو بھی سمجھنا اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔ دراصل پنڈت جواہر لال سچے اور بے غرض وطن پرستی کے پیکر ہیں۔ وہ اس خالص قوم پرستی کے علمبردار ہیں جس پر پنڈتوں، مولویوں، مہا سبھائیوں اور لیگیوں کے مشورے کا جو ملک کی ترقی کے راستے میں حائل ہیں۔ کوئی اثر نہیں ہوتا۔

جاپان کا ایک مختصر سا سفر بھی ہر سیاح کو اس جذبے سے معمور کر دیتا ہے۔ ہندوستان کے سرکاری افسر بھی وہاں کی اس سحر آفرینی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے،

جاپان میں تقریباً پانسو مذہب یا فرقے ہونگے لیکن وہاں کبھی آپ یہ نہ سنیں گے کہ مذہبی یا فرقہ وارانہ انجمنیں سیاسیات میں دخل دیتی ہوں۔ مذہب کو سیاست سے بالکل علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ اور تمام سرکاری اور امدادی مدارس میں اس کی سخت ممانعت ہے۔ میری جاپانی ٹائپسٹ جو ایک زنانہ کالج کی گریجویٹ ہیں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگیں کہ میرے والد بدھ مذہب کے پیرو ہیں، میری بہن عیسائی ہیں۔ میرے بھائی شنٹو یعنی شاہی مذہب کے معتقد ہیں۔ اور میں کسی مذہب یا خدا کو نہیں مانتی، لیکن ہم سب ایک ہی مکان میں ایک ہی خاندان کے افراد کی حیثیت سے ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ پھر آپ ہندوستان میں ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ انہیں یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ لیڈر اپنے ذاتی اغراض کے لئے مذہب کو آلۂ کار بناتے ہیں۔ کیونکہ ان کا اصل مذہب تو یونین جیک کی پرستش کرنا ہے لیکن مذہبی جنون رکھنے والوں کو اتنی عقل بھی نہیں ہوتی کہ وہ ان کے ذلیل مقاصد کو سمجھ سکیں۔

جاپانیوں میں اپنی عزت و وقار کا غیر معمولی پاس ہے۔ اور ملک کے ساتھ وفاداری کا انتہائی جذبہ موجود ہے۔ جس کا مختلف صورتوں میں اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے ملک والوں کو ان میں سے اکثر چیزیں بہت ہی عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ دراصل جاپانی وطن پرستی عام وطن پرستی سے بالاتر ہے۔ اور اسی کی وجہ سے حکومتِ جاپان کی انتہائی قومی پالیسی ہے، ترقی کے مدارج طے کرنے اور اعلیٰ سے اعلیٰ مقاصد حاصل کرنے میں ان کی حب الوطنی اور قوم پرستی کا بڑا ہاتھ ہے۔

چند شاندار مثالیں

جاپانیوں کی وطن پرستی کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں اور ملک و فرائضِ قومی کی قربان گاہ پر وطن پرستوں کی قربانیوں کے واقعات آئے دن ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

کسی چیز، اصول، دوست، عاشق، فرض یا ملک کے ساتھ وفاداری کی بنا پر خودکشی اور "ہراکیری" کا ایک نہ ایک واقعہ اخباروں میں روزانہ دیکھنے میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر چند واقعات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) جنرل حیاشی وزیر جنگ کو جب معلوم ہوا کہ اُن کے چھوٹے بھائی کو جو ٹوکیو کے نائب میئر تھے، بدعنوانیوں کے جرم میں سزا ہوگئی تو انہوں نے فوراً اپنا استعفےٰ داخل کردیا۔ بالآخر بڑی مشکل سے ان کو اس پر راضی کیا جاسکا کہ وہ استعفےٰ واپس لیں حالانکہ حکومت اور پبلک دونوں یہی رائے رکھتے تھے کہ اُن کے بھائی کے جرم اور اُن کے سرکاری فرائض میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن وہ یہی کہے جاتے تھے کہ اخلاقی طور پر میں اپنے چھوٹے بھائی کی تربیت کا ذمہ دار ہوں۔ اس لئے اس کے ساتھ مجھے بھی اس جرم کی کچھ نہ کچھ سزا ضرور بھگتنا چاہئے۔

(۲) جنرل نوگی روس و جاپان کی جنگ کے سلسلے میں بہت مشہور ہوئے ہیں انہوں نے اپنی بیوی سمیت خودکشی کرلی تھی۔ کیونکہ انہیں ہمیشہ یہی خیال رہتا تھا کہ پورٹ آرتھر کی شہرۂ آفاق فتح کے موقع پر میں نے اپنے ہم وطنوں کی بہت سی قیمتی جانیں ضائع کردی تھیں۔

(۳) ۱۹۳۲ء میں جب ایک نوجوان فوجی افسر کو منچوریا جانے کا حکم ملا تو اُس کی بیوی نے خودکشی کرلی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اپنے ملک کے ساتھ میری محبت کا تقاضہ یہی ہے کہ میں اپنے خاوند کی توجہ میدان جنگ سے ہٹا کر اپنی جانب تقسیم نہ کروں۔ اگر میں مرجاؤں گی تو میرا خاوند اچھی طرح لڑ سکے گا۔ اور پھر اُسے کسی چیز کی فکر نہ ہوگی دیکھئے قربانی کی کیسی شاندار مثال ہے۔

(۴) جاپانیوں کی وطن پرستی اور مادرِ وطن کی خاطر قربانیوں کی مثالیں اتنی کثرت سے ہیں کہ اگر انہیں لکھا جائے تو بڑی بڑی جلدیں بھر جائیں لیکن یہاں میں ایک قصہ اور لکھنے پر اکتفا کرونگا۔ یقین ہے کہ یہ قصہ ہر پیر و جوان کے دل میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کردیگا۔

تین انسانی بم

تین انسانی بم کیا ہیں؟ سنئے شنگھائی کے حملے کے تمام واقعات میں کروم ڈویژن کی سفر مینا پلٹن کے تین سپاہی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی بے مثل قربانی اور شجاعت ہر جاپانی کے دل میں ہمیشہ ہمیشہ جاگزیں رہے گی۔ جاپان کے دورِ جدید میں کسی واقعے نے قوم میں اتنا جوش و خروش پیدا نہیں کیا۔ جتنا ان تینوں کے انتہائی وطن پرستی کے کارنامے نے۔

۲۲ر فروری ۱۹۳۲ء کو علی الصبح جب سخت سردی پڑ رہی تھی سفر مینا پلٹن کے ان تین سکنڈ کلاس سپاہیوں نے اپنی جانیں اس لئے قربان کردیں کہ چینی محاذ مایو ہنگچن کے سامنے اُن کی فوج دشمن کے مقابلے میں پیش قدمی کرسکے ان تینوں کے نام کیبی اشتیا۔ جو سالو روکیتا گو۔ اور انوسو کے ساکوی تھے۔ جب محاذ کی دشوارگذار احاطہ بندی توڑنے کی تمام کوششیں بیکار ہوگئیں تو ایک آخری اور جانبازانہ کوشش کے طور پر یہ تینوں نوجوان ایک بارہ فٹ لمبا نل لیکر جس میں خطرناک مادۂ آتش بھرا ہوا تھا اور جس کا فیوز جل رہا تھا گولیوں کی بارش کے سامنے آگے بڑھے اور کانٹے دار جال کے اوپر بم کے ساتھ بے تحاشہ کود پڑے۔ بم پھٹا اور دشمنوں کی احاطہ بندی میں ایک خلا پیدا ہوگیا بس پھر کیا تھا۔ جاپانی فوج دوڑ پڑی اور چینیوں کو پسپا کردیا۔ لیکن یہ تین ہیرو پھر کبھی واپس نہ آئے۔

کیپٹن تاکی متسو شتیا نے جو اس سفر مینا کی کمان کر رہے تھے۔ سب سے پہلے اس کارنامے کا صحیح اور مفصل حال بیان کیا۔ انہوں نے اس روح کو گرما دینے والے واقعے کا حال اپنے ہیڈ کوارٹر سے چیاپے پر واپس آنے کے بعد فوراً ہی لکھ لیا تھا۔ جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

کروم ڈویژن کو حکم ملا تھا کہ ۲۲ر فروری کو ساڑھے پانچ بجے صبح مایو ہنگچن محاذ پر حملہ کرے۔ اور اس پر قبضہ کرے۔ سفر مینا پلٹن چونکہ میرے ماتحت تھی، اس لئے ایک دن قبل میں نے حکم دیا کہ تار کی احاطہ بندی کو توڑ کر راستہ بنانے کی طیاری کی جائے تاکہ ہماری پیدل فوج چینی خندقوں پر حملہ کرسکے۔

اس سلسلے میں ہم بانس کے بموں سے کام لیتے تھے۔ یہ بم اس طرح بنائے جاتے تھے کہ چار انچ موٹا اور بارہ فٹ لمبا بانس لیکر اس میں مادۂ آتش گیر بھر دیا جاتا تھا۔ اور فیوز لگا دیا جاتا تھا۔ کانٹے دار تار کو توڑنے کے لئے رضاکاروں کے دو گروہ بنائے گئے۔ پہلا گروہ تو بائیں جانب تار توڑ کر تیس فٹ چوڑا راستہ نکال لینے میں کامیاب ہوگیا۔ دوسرے گروہ کو کسی طرح کامیابی نہ ہوتی تھی۔ علی الصبح انہوں نے ایک آخری کوشش کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اور پیٹ کے بل رینگ کر اپنی خندقوں سے دشمن کی طرف روانہ ہوئے۔ تار کے پیچھے پانی سے بھری ہوئی

۱؎ ماخوذ از سالنامہ اوساکا مے نیچی۔

ایک خندق تھی۔ جو کئی گز چوڑی تھی، اس کے پیچھے چینی خندق تھی جس کے سامنے
بہت مضبوط فصیل بنی ہوئی تھی۔ خندقوں میں نشانہ باز موجود تھے تاکہ جو جاپانی
بڑھیں، انہیں نشانے پر رکھ لیں۔ اس کے علاوہ مشین گن بھی برابر گولہ باری
کر رہی تھی۔

کانٹے کے تار کو اڑانے کی تین مرتبہ کوشش کی گئی لیکن بیکار ثابت
ہوئی۔ وہ لوگ جو بانس کے بنے ہوئے بم لے کر بڑھتے تھے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے
سے پہلے یا تو کام آجاتے تھے، یا زخمی ہو جاتے تھے، اگر وہاں تک پہنچ بھی جاتے
تھے تو اتنا وقت نہ ملتا تھا کہ بم کو موقعے سے رکھ کر فیوز جلا دیں، اس سے بیشتر
ہی چینی ان کو نشانہ بنا لیتے تھے۔

ایک آخری جانبازانہ کوشش کے لئے تین نوجوانوں نے اپنے آپ کو پیش
کیا اور کہا کہ چاہے اس سلسلے میں ہم زخمی یا ہلاک ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ ہم یہ نل
فیوز جلا کر لیجانے کو طیار ہیں، تاکہ تار کسی نہ کسی طرح ضرور اڑا دیا جائے۔

وقت بہت تھوڑا تھا۔ اور پیدل فوج کی پیشقدمی کا وقت بہت
قریب آگیا تھا۔ ساری فوج کی اور اپنے دستے کی عزت اور ذلت کا سوال تھا۔
کیونکہ تاروں میں سے راستہ ملے بغیر چینی محاذ پر حملہ کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔

جب پو پھٹ رہی تھی، اور صبح کی پہلی کرن افق پر نمودار ہو رہی تھی یہ تینوں
نوجوان اپنی خندقوں سے نکلکر چینی محاذ کی طرف روانہ ہوئے۔ جگہ جگہ بم کے
گولوں سے بڑے بڑے گڑھے ہو گئے تھے۔ ان گڑھوں میں یکے بعد دیگرے پناہ
لیتے ہوئے یہ اپنے پُرخطر راستے پر بڑھ رہے تھے۔

جب تار تھوڑی دُور رہ گئے تو یہ تینوں نوجوان فیوز جلتا ہوا بم لئے
ایک دفعہ جان پر کھیل کر جھپٹ پڑے۔ اور قریب پہنچکر تاروں کی جڑ میں بم پھینک
دیا۔ فوراً ہی یہ نل ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ پھٹا۔ تار اڑ گیا اور اس
کے ساتھ ہی یہ تینوں بہادر بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئے۔

لیکن ان کی جانیں بیکار نہیں گئیں۔ کیونکہ تیس فٹ چوڑا راستہ نکل آیا
تھا جس میں سے جاپانی فوج نے فاتحانہ طور پر پیش قدمی کی گویا یہ "تین انسانی بم"
تھے جنہوں نے اپنے گوشت پوست سے ناکہ بندی کو توڑا۔ یہی وہ قابلِ قدر
جذبہ ہے جس نے جاپانی فوج کو سب سے ممتاز کر دیا ہے۔ اور یہی وہ خوبی ہے جس پر
بدقسمتی سے ہمیں زیادہ فخر کرنے کا موقع حاصل نہیں ہے۔

ان تینوں بہادروں کے کارنامے نے ساری قوم کے دل میں گھر کر لیا ہے۔
گولیوں کی بارش میں ان کی جانبازی در اصل جاپانی سپاہیوں کی غیر معمولی شجاعت
کی مظہر ہے۔ جب حملے کا وقتی ہنگامہ کم ہوا۔ تو قوم کی توجہ اور ہمدردی ان شہدائے
وطن کے والدین اور خاندانوں کی طرف ہوئی، اب تک محکمۂ جنگ نے یہ اصول
مقرر کر رکھا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے لئے چندہ نہ کرتا تھا۔ لیکن اب پہلی دفعہ
اس نے یہ اصول توڑا۔ چنانچہ جس دن جاپان میں یہ خبر آئی، اسی دن شام سے
پہلے پہلے محکمۂ جنگ میں ۴۲،۰۰۰ ین وصول ہو گئے۔ اخبار "اساکا مے نیچی" نے
ان کے خاندانوں کے لئے ایک ہزار ین دیئے۔ ہیروسیما کے ایک دیہاتی ماسٹر نے
ان تینوں سپاہیوں کے بچوں کو پرورش کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔
ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ اس کی دو لاکھ ین کی جائداد ان بچوں کی تعلیم کے لئے
وقف ہے۔

اس واقعے کے چند دن بعد شنگھائی سے ایک اطلاع موصول ہوئی کہ
ان کے تین کٹے ہوئے بازو ایسے جھلس گئے تھے کہ پہچانے نہ جاتے تھے۔ فتح کے
بعد تلاش کر کے حاصل کئے گئے۔ اور ساری فوج نے ان کی پرستش کی۔ ان تین
انسانی بموں کے اعضا ملجانے کے بعد سنیا سوٹو کی سرکردگی میں نئی عقیدتمندی
کے ساتھ ان کے کارنامے دہرائے گئے۔ ان کی مدح اور ثنا کے گیت گائے گئے
اور ان کی روحوں کے لئے دعا کی گئی۔

جب ان بہادروں کی جانبازی کا حال ہز مجسٹی شاہ جاپان کو معلوم
ہوا تو انہوں نے ان شہدائے وطن کی ماؤں کے لئے مالی امداد منظور فرمائی۔
اوساکا مے نیچی اور ٹوکیو نچی نچی کے زیر اہتمام ان تینوں بوڑھی ماؤں کو ان
کے مواضعات سے ٹوکیو بلایا گیا۔ اور لفٹنٹ جنرل سداؤ آراکی وزیر جنگ نے
انہیں اپنا مہمان بنایا۔ اس موقع پر انہوں نے فرمایا۔

"تمہارے لڑکوں کی بہادری کے کارنامے ہز مجسٹی شاہ جاپان کی
خدمت میں عرض کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ایسا اعزاز ہے۔ جو شاذ و نادر ہی کسی
کو حاصل ہوتا ہے۔ در اصل میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ ان نوجوانوں کے
اس شاندار کارنامے کی تعریف کر سکوں۔ انہوں نے جاپانیوں کی پوشیدہ
روح کا صحیح نمونہ پیش کیا۔ قابلِ رشک ہیں وہ مائیں جنہوں نے ایسے سپوتوں
کو جنم دیا۔"

بن راکو پپٹ شو تھیٹر اوساکا کا قدیم زمانے کا ایک نہایت ہی معزز اور
ممتاز تھیٹر ہے۔ جو ہمیشہ علمی اور ادبی تمثیلیں پیش کیا کرتا ہے۔ لیکن اس نے بھی

اپنے سابقہ رویئے کے خلاف ایک جدید کھیل طیّار کیا۔ جس میں مایوہنگچن کے یہ تینوں ہیرو دکھائے گئے تھے

۲۶۔ اپریل کو جب ان تینوں سپاہیوں کی ۔اکھ جاپان پہنچی تو جس شہر سے گذری لوگوں نے اس کا زبردست احترام کیا۔ اور جس وقت ٹوکیو کے نشی ہانگ وِنجی مندر میں وہ چڑھائی گئی تو ہزاروں آدمیوں نے اپنی آخری نذرِ عقیدت پیش کی۔

اس واقعے کے بعد ہی سارے جاپان کے بچّے اپنے کھیلوں میں اُن کی نقلیں کرنے لگے۔ ہر کھیل کے میدان میں چھوٹے چھوٹے بچّے مایوہنگچن کے ان تین "انسانی بھول" کا پارٹ ادا کرتے نظر آتے تھے۔ اور اس کارنامے کے گیت پر گیت طیّار ہوئے۔ اور اُن کے ریکارڈ کثرت سے فروخت ہوئے جس سے ان کی جاں نثاری کے اعتراف اور اُن کی غیر معمولی مقبولیت کا ثبوت ملتا ہے آج بھی ان گیتوں کے جملے اور مصرعے زبان زدِ خاص و عام ہیں اور "ابتک" مایوہنگچن کے سامنے خندقوں میں" والی نظم بکثرت گائی جاتی ہے۔

غزل (مسلسل)

(جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی)

رنگین خیالوں کا اِک باغ لگاتا ہے
آج اُن کے تصوّر کو پھولوں میں بساتا ہے

ہر برگ کی جنبش میں، ہر تار کی لرزش میں
گرداب کی گردش میں تیرا ہی ترانا ہے

ہر نغمۂ شیریں میں، ہر پردۂ رنگیں میں
چھپ چھپ کے تجھے اپنی آواز سُنانا ہے

ہر رنگ میں شامل ہے، ہر رنگ سے بیگانہ
سمجھے تو یہ سمجھے ہیں، جانا تو یہ جانا ہے

انوار ترے جلوے، اسرار ترے پردے
کیا جلوے ہیں، کیا پردے، سچ ہی کہ یگانا ہے

خورشید و مہ و انجم چلتے ہیں اشاروں پر
گردش سے نگاہوں کی گردش میں زمانا ہے

لیلائے تخیّل کا زیور ہے ترا پرتو
سلمائے معانی کا آئینہ ہے، شانا ہے

خمیازۂ رنگیں ہے تو صبحِ دمیدہ کا
صہبائے تجلّی سے عالم کو جھکانا ہے

شبنم کے بھی موتی ہیں، مظلوم کے آنسو بھی
یہ جوڑ کے رکھ لینا، وہ تجھکو لُٹانا ہے

بلبل کی ہوسِ شیوائی یا گُل کی ہوسِ رعنائی
افسانہ در افسانہ تیرا ہی فسانا ہے

پروانہ سوزاں ہو، یا شمعِ فروزاں ہو
جی تجھ پہ جلانا ہے، کو تجھ سے لگانا ہے

ہر شے میں ترا جلوہ، ہر شے ہے ترا جلوہ
پھر کس سے یہ پردا ہے، منہ کس سے چھپانا ہے

مشہود بھی، شاہد بھی، مستور بھی، ظاہر بھی
پانا تجھے کھونا ہے، کھونا تجھے پانا ہے

یہ نقش بنا ڈالا، وہ نقش مٹا ڈالا
ہر آن سنورنے کو اِک تازہ بہانا ہے

ہے عشق کے پردے میں آپ اپنا تماشائی
سو طرز سے اِک محفلِ امکاں کی سجانا ہے

اللہ ری محبوبی، اللہ ری محجوبی
نزدیکی و مہجوری شوخی کا ٹھکانا ہے

پھوٹیں گی اثر کرنیں، انوارِ حقیقت کی
اِس دِل کو مگر پہلے اِک نقطے پہ لانا ہے



"اور جب اس غلام شہر پر آفتاب کی پہلی کرنیں پھیلیں تو حسن مخمور ایرانیوں کی آغوش میں بیدار ہوا"
(متعلقہ "قربانگاہ آزادی")





[illegible] کان قہرمان، شباب کے بوجھ سے دبی ہوئی امنگوں،
بھری جوانی سے لبریز [illegible] کے [illegible]
گلے ملکر موت سے ہمکنار ہونیکو پا بجولاں [illegible]
آیئے ہم ان بیگناہ عورتوں کا تصور کریں جنہیں [illegible]
لے
([illegible] آزادی [illegible])

قربانگاہِ آزادی

تاریخ بابل کا ایک خونیں ورق

(از ملک حسیب احمد بی اے آنرز)

آیئے، حُسن وعشق کو شبستانِ محبّت کی خلوتوں میں مچلتے ہوئے چھوڑ کر، ہم آپ جگ بیتی کہیں۔ اور آج تاریخ کے صفحاتِ خونیں سے بابل کی داستان پڑھیں:-

کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے ——— تمدّنِ انسانی اپنی ابتدائی منزلوں میں تھا ——— ایشیا میں، ایک عظیم سلطنت، گہوارۂ تہذیب تھی۔ لازوال دولت کی مالک، جاہ وحشم کی پروردگار، خوش باش رعایا کا مامن۔ بابل اس سلطنت کا دارالخلافہ تھا۔ بابل کے مکانات خوبصورت اور عالیشان تھے۔ لوگوں کے پاس زروجواہر کی اتنی افراط تھی کہ زمانۂ قدیم کے لوگ بابل والوں کی امارت کی قسم کھایا کرتے تھے۔

بابل ——— جہاں لاکھوں انسان حیاتِ انسانی کی مصروفیتوں میں مشغول، زندگی کو ہمارے زیادہ مسرّت آفریں مانتے تھے۔

. . . . جہاں عشق کامگار تھا۔ اور حسن ظفر موج . . . !

یہ سب اس زمانے کی باتیں ہیں۔ جب سائنس نے انسانی زندگی کی شعریت کو تباہ نہ کیا تھا!

برسوں، صدیوں، مدّتوں، بابل والے امن وچین سے رہتے رہے، حتّٰے کہ ایرانی بادشاہ کیکاؤس کو حرص وآز نے اُکسایا اور وہ جذبۂ جہانداری کے نشے میں چور بابل پر چڑھ دوڑا۔ آن کی آن میں بابل کی آزادی، حملہ آور کے قدموں پر تڑپ تڑپ کر جان توڑ رہی تھی، بابل کچھ اس انداز سے فتح کیا گیا کہ عام لوگوں کو خبر تک نہ ہوئی کہ وہ اس قدر جلد ایران اور ایرانیوں کے غلام ہوگئے ہیں . . . رات کی تاریکی میں، جب دوشیزگانِ بابل جوانی کی نیند سو رہی تھیں اور شباب جہانبانی کے پُرشوکت خواب دیکھ رہا تھا، کیکاؤس نے فرات کا پانی بند کر دیا۔ تو بابل کے حکمرانوں نے ناامید ہوکر شہرپناہ کے دروازے کھول دیئے۔ . . . ایرانی سپاہ جوق در جوق اندر گھس آئی . . . . ایرانی سپاہیوں کو بابل کے مدہوش لوگوں نے شرابِ آتشیں کے چھلکتے ہوئے، جام رات کے دھندلکے میں پیش کئے۔ اور جب اس غلام شہر پر آفتاب کی پہلی کرنیں مچلیں تو حسنِ محمود ایرانیوں کی آغوش میں بیدار ہوا . . . !

. . . بابل تین ایرانی بادشاہوں کا یکے بعد دیگرے غلام رہا۔ یہاں تک کہ دارا کا آفتابِ تخت ایرانی پر طلوع ہوا۔ اور بابل والوں کا جذبۂ انتقام بھڑک اٹھا . . . مگر مقابلہ غلامی اور جہانگیری میں تھا . . . زیردستی اور زبردستی کی جنگ تھی . . .

لیکن اس پر بھی بابل والوں نے چپکے ہی چپکے ہر ممکن طیّاری کرلی۔ اسلحہ جاتِ جنگ جہیا کرلئے گئے، ہر تہ خانہ میگزین بن گیا۔ لاکھوں تیر بنائے اور جمع کرلئے گئے۔ لیکن سامانِ رسد تو پوشیدہ طور پر جمع نہ کیا جا سکتا تھا . . .

. . . یہ صحیح ہے کہ کیکاؤس نے ایک لاکھ یہودیوں کو شہر بدر کردیا تھا لیکن ابھی کھانے والے لاکھوں کی تعداد میں تھے، اور رسد کی ضرورت لابدّ اور شدید۔ اس پر بھی بغاوت کے سرغنہ موقعے کے بے صبری سے منتظر تھے۔

آخر کار وقت آگیا، اور بابل کا ہر باشندہ ایرانیوں پر ٹوٹ پڑا۔ شہرپناہ کے دروازے بند کردیئے گئے! فصیلوں پر بابل کی سپاہ تیر وکمان لیکر ہر اُس شخص کو ختم کردینے کو طیار تھی، جو اُن کی آزادی کو ختم کردینے کی کوشش کرے۔

دارا کی ہوسِ عالمگیری اس خبر کی تاب کیونکر لاتی؟ چند ہی دنوں میں بابل کی فصیلوں کے نیچے ایرانی شمشیر خون آشامی کے لئے بے نیام تھی! محاصرہ کئے ہوئے ایک مدّت گذر گئی، اور بابل والوں کی رسد کم ہونی شروع ہوئی۔ رسد جس قدر کم ہوتی گئی، تشویش بڑھتی گئی۔ شہر میں قحط پھیل گیا، اور لوگ بھوکے مرنے لگے . . . رسد تو زیادہ نہ کی جا سکتی تھی،

لیکن آبادی کا کم کر دینا ضرور ممکن تھا، بابل والوں نے فیصلہ کیا کہ آبادی سے بوڑھوں کا اخراج کر دیا جائے۔ بوڑھے مرد، بوڑھی عورتیں، اپنے گھروں اور گھروں سے زبردستی کھینچ کھینچ کر لائے گئے۔ اور انہیں شہر پناہ کے باہر بے خانماں چھوڑ دیا گیا کہ جہاں انہیں قسمت لے جائے چلے جائیں۔ ۔ ۔ ۔ !

دن گذرتے گئے رسد کم ہوتی گئی۔ آخر کار فیصلہ کیا گیا کہ آزادی کی خاطر صرف سپاہیوں کی سلامتی ہی مقدس اور عزیز ہے۔ فوراً اعلان کیا گیا کہ سب عورتوں کے گلے گھونٹ دیئے جائیں، مگر مورخ وقت ذکر نہیں کرتا کہ بچوں کی معصوم جانیں کیونکر لی گئیں۔ ہاں صرف اتنا معلوم ہے کہ ہر گھر ایک ماتم کدہ بن گیا۔ جہاں غلغلۂ عیش بلند ہوا کرتا تھا، وہاں موت کی ہچکیاں سنائی دیتی تھیں۔ ہر طبقے اور ہر عمر کی عورتیں، جوان، بوڑھی، کنواری بیاہی، بیوہ، دوشیزگانِ قمر جمال، شباب کے بوجھ سے دبی ہوئیں، امنگوں بھری جوانی سے بھرپور، فتوحاتِ حُسن کے زرین خوابوں سے آخری بار گلے مل کر موت سے ہمکنار ہونے کو پا بجولاں لے جائی جا رہی تھیں۔ ۔ ۔ ۔

اس قتلِ حُسن کے لئے شہر کے مخصوص مقامات پر انتظام کیا گیا۔ ہزاروں گورکن خوبصورتی کو دفن کرنے میں مشغول ہو گئے! آیئے، ہم ان بے گناہ عورتوں کا تصور کریں جنہیں نامحرم ہاتھ بازاروں میں گھسیٹے لئے جا رہے تھے، جو ظالموں سے چھٹنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں، جو جلادوں کے قدموں پر پچھاڑیں کھا کھا کر گر رہی تھیں۔ اور جن کی اٹھتی جوانی بے احساس انبوہ میں بے رحمی سے مسلی جا رہی تھی!

مورخ وقت نے بے گناہ مقتولوں کی تعداد نہیں لکھی۔ شاید اس کا خوفزدہ قلم صحیح تعداد لکھتے ہوئے کانپ گیا ہوگا!

محاصرہ جاری رہا۔ انیس ۱۹ ماہ گذر گئے۔ ۔ ۔ ایرانی سب جتن کر چکے، لیکن بابل فتح نہ ہوا، آخرش جب دارا بہت مایوس ہو گیا تو زدفرس اس کا سب سے بہادر اور چالاک جرنیل، بارگاہِ سلطانی میں آیا اور کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد واپس چلا گیا۔ زدفرس نے کہا کہ وہ اپنے تئیں غدار ظاہر کریگا اور بابل والوں سے کہے گا کہ اس کے مشورہ دینے پر کہ محاصرہ اٹھا لینا چاہیے دارا خشمگیں ہو گیا اور اس کو اس کے عہدے سے معزول کر کے نکال باہر کر دیا۔ زدفرس کا خیال تھا کہ وہ اس ترکیب سے بابل والوں کا اعتماد حاصل کر لیگا اور ایرانیوں کا قبضہ بابل پر آسانی سے ہو جائیگا۔ ۔ ۔ کچھ دیر بعد زدفرس دارا کے حضور میں آیا، ناک کٹی ہوئی، بال خاک میں اٹے ہوئے، زخمی کانوں سے خون جاری سپاہیانہ بدن پر کپڑے تار تار۔ دارا کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں، اور جھپٹ کر تخت سے نیچے اتر آیا۔ پوچھا کہ "زدفرس! یہ کیا ماجرا ہے؟ کون ہے جس نے یہ جرأت کی؟ کیا دارا کی بے پناہ قوت اور سخت انتقام کو دنیا بھول گئی؟" زدفرس نے دارا کے کان میں کچھ کہا، اور دارا نے زدفرس کو مستحسن نظروں سے دیکھتے ہوئے شاباش کہا۔

ایک دن علی الصبح، ابھی چڑیوں نے بسیرا بھی نہیں چھوڑا تھا، زدفرس بہ حالِ زبوں بابل کے سب سے بڑے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ شہر پناہ کے محافظوں کے پوچھنے پر زدفرس نے تمام ماجرا کہہ سنایا، اس کے لہجے میں سوز و درد تھا۔ بابل کے لوگوں کو اس پر رحم آیا۔ اور اور زدفرس کو اندر بلا لیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس قوم پرست لیکن دون فطرت جرنیل نے اس قدر اعتماد حاصل کر لیا کہ بابل والوں نے اس کو اپنا سپہ سالارِ اعظم مقرر کر دیا۔ اور غضب یہ کیا کہ شہر کے سب دروازوں کی چابیاں بھی اس کے حوالے کر دی گئیں۔

زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ ایرانیوں نے اپنی پوری طاقت سے حملہ کیا، اور زدفرس نے غنیم کے لئے سب دروازے کھول دیئے۔

فتح مندی کے بعد، جنگ و جدال سے اجڑے ہوئے دیار میں صلح و آشتی کی بنیادیں استوار ہونا شروع ہوئیں۔ شہر میں امن و چین تھا لیکن موسیقی، شعریت اور جذباتی محبت کا فقدان، عورت کی نرمی، لچک کی کمی، ۔ ۔ ۔ ۔ شہر بھر میں عورت ایک نہ تھی۔ ۔ ۔ دارا نے اطراف و اکناف کی سلطنتوں میں قاصد بھیجے اور درخواست کی کہ وہ جس قدر جوان اور تندرست عورتیں مہیا کر سکیں، بابل بھیجدیں۔

القصہ پچاس ہزار نوجوان عورتوں کے قافلے بابل کی جانب روانہ ہو گئے۔ جب یہ کاروانِ رنگ و بو بابل کے قریب پہنچے تو شہر پناہ کو افق سے نمودار ہوتے دیکھ کر ہر پری وش سوچنے لگی کہ معلوم نہیں، اس کی جوانی کس آغوش میں مچلے گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔

—— ٭ (تصاویر از ماتا نیا) ٭ ——

نعرۂ شباب

(فرسودہ لیڈروں کی انجمن میں)

ہوشیار! اپنی متاعِ رہبری سے ہوشیار
اے جنوں ناآشنا پیریِ وشیبِ ہرزہ کار!

اُڑ گیا رُوئے نگارِ آسماں سے رنگِ خواب
جھلملاتی شمع! رخصت ہو، کہ اُبھرا آفتاب

ہٹ، کہ اب سعی و عمل کی راہ میں آتا ہوں میں
خلق واقف ہے کہ جب آتا ہوں چھا جاتا ہوں میں

اے قدامت! یہ کھلی ہے سامنے راہِ فرار
بھاگ، وہ آیا نئی تہذیب کا پروردگار!

کام ہے میرا تغیّر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ "انقلاب" و "انقلاب" و "انقلاب"!

کوئی قوّت راہ سے مجھکو ہٹا سکتی نہیں
کوئی ضربت میری گردن کو جھکا سکتی نہیں

رنگ سُورج کا اُڑاتا ہے مرے سینے کا داغ
بادِ صرصر کا بدل دیتا ہے رُخ میرا چراغ

سنگ و آہن میں مری نظروں سے چبھ جاتی ہے پھانس
آندھیوں کی، میرے میداں میں اُکھڑ جاتی ہے سانس

دیکھکر میرے جنوں کو ناز فرماتے ہوئے
موت شرماتی ہے میرے سامنے آتے ہوئے

الاماں، کُبری، ریا آلودہ پیری! الاماں
اب کڑکتی ہے ترے سر پر جوانی کی کماں

یہ ستم کیا، اے کنیزِ "کفر و ایماں" کر دیا؟
بھائیوں کو گائے اور باجے پہ قرباں کر دیا!

کر دیا طولِ غلامی نے تجھے کوتہ خیال
جُھرّیاں ہیں یہ ترے مُنہ پر کہ غدّاری کا جال

دیکھتی ہے صرف اپنے ہی کو اپنی دُھندلی نگاہ
سَر بھڑک اُٹھا ہے، لیکن دل ابھی تک ہے سیاہ

پوپلے مُنہ! ختم کر یہ "عاقبت بینی" کا شور
دیکھ اب بُزدل! مری "ناعاقبت بینی" کا زور

چہرۂ "امروز" ہے میرے لئے ماہِ تمام
خوفِ "فردا" ہے مری رنگیں شریعت میں حرام

تیر جاتی ہے دلِ فولاد میں میری نظر
خون میرا خندہ زن رہتا ہے موجِ برق پر

اور تمنائیں ہیں تیری سسکیاں بھرتی ہوئی
اونگھتی، کڑھتی، بلکتی، کانپتی، ڈرتی ہوئی

تیری باتوں سے پڑی جاتی ہے کانوں میں خراش
"کفر وایماں"! "کفر وایماں" تا کجا خاموش باش!

حُبِ انساں، ذوقِ حق، خوفِ خدا، کچھ بھی نہیں
تیرا "ایماں" چند وہموں کے سوا کچھ بھی نہیں

تیرے جھوٹے "کفر وایماں" کو مٹا ڈالوں گا میں
ہڈیاں اس "کفر وایماں" کی چبا ڈالوں گا میں

ولولے میرے بڑھیں گے ناز فرماتے ہوئے
فرقہ بندی کا سرِ ناپاک ٹھکراتے ہوئے

ڈال دونگا طرحِ نو اجمیر اور پریاگ میں
جھونک دونگا "کفر وایماں" کو دہکتی آگ میں

کوثر و گنگا کو اک مرکز پہ لانے کے لئے
اک نیا سنگم بناؤں گا زمانے کے لئے

ایک دینِ نَو کی لکھوں گا کتابِ زرفشاں
ثبت ہوگا جس کی زریں جلد پر "ہندوستاں"!

اس نئے مذہب پہ سارے تفرقے وارونگا میں
تجھ پہ پھر گردن ہلا کر قہقہے ماروں گا میں

پھر اٹھونگا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا
گھومتا، گھِرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا

خون میں لتھڑی بساطِ "کفر و دیں" الٹے ہوئے
فخر سے سینے کو تانے، آستیں الٹے ہوئے

ولولوں سے برق کے مانند، لہرایا ہوا۔
موت کے سائے میں، رہکر موت پر چھایا ہوا!

(جوشؔ)

رباعی

(حضرتِ سیماب اکبر آبادی)

ہے کفر گناہ، اور اسلام گناہ — یہ کام گناہ، اور وہ کام گناہ
القصہ ہر اک چیز کا اس دنیا میں — اک نام کچھ اور ہے اور اک نام گناہ!

رفتارِ وقت

قضیۂ حبش و ایطالیہ

حبش و ایطالیہ کے قضیے سے جس عالمگیر جنگ کے چھڑ جانے کا اندیشہ کیا جاتا تھا۔ وہ ابھی تک پیش نہیں آیا۔ اور بدقسمتی سے ہمارے پاس وہ مسالہ بھی نہیں ہے، جس سے ہم صحیح طور پر پیش گوئی کر سکیں کہ آیا اب بھی یہ خطرہ باقی ہے یا جاتا رہا۔ اس قضیے کا آغاز اخبار بیں حضرات کو معلوم ہے کہ اٹلی اپنی فوجی قوت کے زعم میں مملکتِ حبشہ پر فاتحانہ قابض ہونا چاہتا ہے عذر یہ ہے کہ گذشتہ جنگِ عظیم میں دولِ اتحاد کو مالِ غنیمت میں قطعاتِ ملک مل گئے، اور برطانیہ و فرانس نے اپنے اپنے حصوں پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اٹلی اس سلسلے میں محروم رہی۔ اب سائینور مسولینی اطالوی قوم کے ترجمان کی حیثیت سے اس ناانصافی کی جو معاہدۂ ورسائی کی رو سے اطالوی قوم کے ساتھ کی گئی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ اس تلافی کے لئے ناطاقت حبشہ کی جانب نگاہ اٹھانا بالکل فطری تھا، کیونکہ

ابتر نہیں کوئی ناتواں سے بڑھکر — احقر نہیں کوئی ناتواں سے بڑھ کر
از روئے شریعتِ نظامِ کم و بیش — کافر نہیں کوئی ناتواں سے بڑھ کر

یہ تلافی بآسانی ہو بھی جاتی، اس لئے کہ حبشہ کمزور ہے، اور اٹلی طاقتور، اور جس طرح جاپان اپنی قوت کے زور میں چین کے قطعاتِ ملک ایک ایک کر کے ہضم کرتا چلا جا رہا ہے۔ اسی طرح اٹلی بھی مجلسِ اقوام کی چیخ پکار کے باوجود اپنا مقصد حاصل کر لیتی۔ لیکن دقت یہ آ پڑی کہ چین میں تو برطانیۂ عظمیٰ کا کوئی مفاد نہیں تھا۔ اور حبشہ سے اس کا مفاد وابستہ ہے۔ بات یہ ہے کہ دریائے نیل جو مصر و سوڈان کی جان ہے۔ اسی حبشہ کے ملک میں جھیل تسانا سے نکلتا ہے۔ اور اٹلی کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ وہ اس نکاس کا رُخ اپنے مقبوضہ ملک ایریٹیریا کی طرف پھیر دے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر اٹلی اس مقصد میں کامیاب ہو گئی، تو مصر و سوڈان جو برطانیہ کے زیرِ اقتدار ہیں، خشک و غیر آباد ہو کر رہ جائیں گے۔ یہی چیز تھی جس نے برطانیہ کو اٹلی کے جارحانہ مقاصد کی سختی سے مخالفت کرنے پر آمادہ کیا۔ اور چونکہ مجلسِ اقوام درحقیقت برطانیۂ عظمیٰ ہی کے بل بوتے پر قائم ہے۔ اس لئے اس نے بھی درشت رویّہ اختیار کیا۔ اور اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے اپنے آئین کے تعزیری دفعات کو اٹلی کے خلاف متحرک کیا۔ لیکن اس کے باوجود اٹلی اپنے ارادوں سے باز نہ آئی۔ اور موجودہ صورت یہ ہے کہ مجلسِ اقوام نے تعزیرات کے نفاذ کی تاریخ مقرر کر دی ہے۔ اور اطالوی فوجیں اس کی پروا کئے بغیر حبشہ میں جارحانہ اقدام کر رہی ہیں۔ سُنا اٹلی کیا کہہ رہی ہے؟

قانون نہیں ہے کوئی فطرت کے سوا — دنیا نہیں کچھ نمودِ طاقت کے سوا
قوت حاصل کر، اور مولےٰ بن جا — معبود نہیں ہے کوئی، قوت کے سوا

چنانچہ ایک تازہ تقریر میں تو سائینور مسولینی نے یہ بھی اعلان کر دیا ہے، کہ وہ مجلسِ اقوام کے تعزیرات کا کھلی مقابلہ کریگا۔

تعزیرات کی حیثیت سرِدست اقتصادی ہے یعنی اٹلی سے تجارتی اور اقتصادی تعلقات کا انقطاع، لیکن اگر ان تعزیرات سے مقصد نہ حاصل ہوا، تو از روئے آئین، مجلسِ اقوام کو حربی تعزیرات کا اعلان بھی کرنا پڑیگا اور وہی وقت ہوگا، جبکہ مختلف دولِ یورپ کے دعاوی کا عملی امتحان ہوگا۔ اور یہ معلوم ہو جائیگا کہ کون کون حکومتیں محض زبانی باتیں کرنے والی ہیں، اور کون واقعی طاقتور کے مقابلے میں کمزور کا ساتھ دیتی ہیں۔

خوش بود گر محکِ تجربہ آید بمیاں
تا سیہ روئے شود ہر کہ دروغش باشد

آئینِ نَو

ع مبارکباد مرگِ نَو بہ استاد!

ہندوستان کا نیا دستور جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نام سے شاہی منظوری حاصل کر چکا ہے۔ عنقریب اس ملک میں نافذالعمل ہو جائے گا۔ اور اس کے عملی نفاذ کے ابتدائی مراحل اس وقت طے ہو رہے ہیں۔ اس آئین کو اصولاً ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں مسترد کر چکی ہیں، اور جن معدودے چند جماعتوں نے اسے قبول کرنے پر آمادگی ظاہر

کی ہے، وہ بھی اسے بالکل ناقص اور نکما سمجھتی ہیں۔ اور انہوں نے اسے اس لئے قبول نہیں کیا ہے، کہ اس میں کوئی خوبی ہے، بلکہ اس لئے کہ ان کے لئے اس کے قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں ہے، لیکن ہندوستان کی بے بسی اور بے چارگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ جس چیز کو ہم ناقابلِ قبول سمجھتے ہیں، وہ ہمارے گلے میں پھندا بنا کر ڈالی جا رہی ہے، اور لطف یہ کہ ہمیں اتنا طفلِ نادان بتایا جاتا ہے کہ اپنا نفع نقصان سمجھنے کی اہلیت بھی ہم سے مفقود سمجھی جاتی ہے، اور ہمارے جذبات کے علی الرغم دنیا کو بتایا جاتا ہے کہ یہ آئینِ حکومت برطانیہ نے ہندوستانیوں کے نفع کے لئے نافذ کیا ہے۔ اور ہندوستانی اسے ناقابلِ قبول کہہ کر سخت ناسمجھی اور ناواقفیت کا اظہار کر رہے ہیں۔

نئے آئین کی رو سے صوبہ جات میں ایسے مجالسِ قانون ساز قائم ہونگے جن میں غیر سرکاری اراکین نہ ہونگے اور وزرا بھی منتخب شدہ اراکین میں سے ہونگے، اسی طرح مرکز میں فیڈرل اسمبلی ہوگی، جس میں غالب حصہ منتخب شدہ اراکین کا ہوگا۔ لیکن یہ انتخاب براہِ راست نہ ہوگا۔ جیسا آجکل لیجسلیٹو اسمبلی کا ہوتا ہے، بلکہ صوبہ جات کی مجالسِ قانون ساز کے اراکین ان اراکین کا انتخاب کریں گے۔ پھر زیادہ تر صوبوں میں ایک ایوانِ دوم بھی ہوگا۔ جس میں آجکل کی کونسل آف اسٹیٹ کی طرح اونچے طبقے کے لوگ ہونگے، اور اس کے باوجود گورنر کے اختیاراتِ امتیازی اتنے وسیع رکھے گئے ہیں کہ مجالسِ قانون ساز کی ذمہ دارانہ حیثیت سلب ہوگئی ہے۔ مرکز میں فیڈرل اسمبلی سرکاری اراکین سے تو تقریباً خالی ہوگی، لیکن ایک معتد بہ حصہ اس کا والیانِ ریاست کے نامزد کردہ اراکین پر مشتمل ہوگا۔ اور پھر اس کے سر پر بھی ایک ایوانِ دوم اور وائسرائے کے اختیاراتِ امتیازی مسلط ہوں گے۔ اس طرح اس آئین کے جمہوری عنصر کو چاروں طرف سے گھیر گھار کر مقید اور بے اثر کر دیا گیا ہے، اور اس آئین پر حضرت اکبر الہ آبادی کا یہ شعر پورے طور پر منطبق ہوتا ہے ؎

مہربانی سے مجھے گودام کی کنجی تو دی،

لیکن اب باقی نہیں گیہوں فقط گھن کو کیا کروں

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی شرمناک فرقہ وار کشمکش اس سے بہتر سلوک کی مستحق بھی نہ تھی۔ اور ہم اتنا اور اضافہ کر سکتے ہیں کہ اگر آج یہاں کے مختلف فرقے ناقوس و اذان کے ہنگاموں سے دستبردار ہو کر کسی ایک لائحۂ عمل پر متفق ہو جائیں تو اس ناقص آئین سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور اس میں موثر تبدیلیاں بھی کرا سکتے ہیں، لیکن یہاں تو

کیا ہات مرے پہنچینگے، دامانِ بتاں تک   اپنے ہی گریبان سے فرصت نہیں ملتی،

کا ہنگامہ برپا ہے۔ اللہ رحم کرے!

رباعی

حضرت سیماب اکبر آبادی

گھیرے ہوئے ہر طرف سے فطرت ہے مجھے   جو کام ہے، فطرت کی ودیعت ہے مجھے
ڈر کر نہیں کرتا میں کبھی کوئی گناہ   کر کے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے مجھے؟

میخانوں میں بہرِ میکشی جاتا ہوں   سرگشتۂ کیفِ بے خودی جاتا ہوں
جس آگ سے روز مانگتا ہے تو پناہ   بھر کر میں اسے جام میں پی جاتا ہوں

دُنیا کا پہلا افسانۂ محبّت

پہلا بوسہ

(سیّد فرید جعفری مجلی شہری مدیر نیرنگِ خیال ویکلی لاہور)

"جوش بھائی کی اُن چند رنگین راتوں کے نام جن کی کیفیات نے اُنہیں شاعرِ انقلاب بنادیا ہے" فرید

گرمی کی ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی، اور "آدم وحوّا" مزے سے لیکر "آفتابی غسل" کر رہے تھے، دن کے کھانے کے بعد یہ اُن کا معمول سا ہوگیا تھا۔

حوّا، آدم کے گالوں کو محبّت سے سہلا رہی تھیں، یکایک وہ بولیں تمہارے بال کس قدر سخت ہیں آدم! تمہارے بدن پر کوئی ملائم حصّہ نہیں معلوم ہوتا، مجھے دیکھو میں سراپا ملیح ہوں" حوّا نے بات ابھی ختم بھی نہ کی تھی کہ اُن کی اُنگلیاں آدم کے سونے ہونٹوں سے مَس ہوگئیں، اور خوشی سے چلا اُٹھیں "اے ہے پا نہ لیا آخر میں نے، کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے آدم" اور وہ اپنی ننھی اُنگلیوں سے آدم کے لبوں کو سہلانے لگیں۔

آدم کو بھی حوّا کی یہ حرکت بھائی، اُنہوں نے "ردِّ عمل" شروع کیا۔

"مگر تمہاری اُنگلیاں بھی کھُردری ہیں، میں بتاؤں، صرف تمہارے لب ہی تو نرم ہیں، ان سے تم میرے لبوں کو چھوؤ (مس کرو) تو شاید زیادہ اچھا معلوم ہو، کوشش تو کرو آدم، حوّا نے لجاتے ہوئے کہا۔

حوّا نے اپنے لب نزدیک کر دیئے۔ اور آدم نے اُن پر اپنے لب پیوست کر دیئے۔ لیکن ابھی وہ مس بھی نہ ہوئے تھے، کہ حوّا نے اپنا سر کھینچ لیا، اور کہنے لگیں۔ "تم بڑے خراب ہو جی، مونچھ کے بال چُبھ رہے ہیں تمہارے

آدم گھبرا کر دُور ہوگئے، مگر حوّا نے پھر نشیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "خیر کوئی حرج نہیں، اِس کا بھی انتظام کبھی ہو جائے گا، آؤ دوبارہ کوشش کریں"

پھر اُسی طرح حوّا نے اپنے لب سامنے کئے اور آدم نے اپنے لب پیوست کر دیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں سانس لینے کے لئے الگ ہوئے، اور دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، حوّا لجا گئیں۔ اور آدم نے اُنہیں کھینچکر اپنی آغوش میں لے لیا، اور پھر حوّا کے لبوں کو چوسنا شروع کیا، نتیجہ دونوں کے لئے ہیجان آفریں تھا، حوّا پسینے پسینے ہوگئیں، اور آخر بے اختیار ہو کر بولیں۔

"ہے ہے آدم، تم نے تو ہلکان کر دیا" حوّا کی آنکھیں آپ ہی آپ جھپک گئیں، اور انہوں نے ایک ذرا سی" انگڑائی لے لی۔

"سیب کی دو قاشیں، ایک دوسرے پر رکھی معلوم ہوتی ہیں حوّا" آدم نے اُس وقت کی زبان میں کہا۔

"کیسی سنسناہٹ سی پیدا ہوئی ہے آدم، جب میں نے لب ہٹائے ہیں جیسے" بوسہ۔" حوّا بولیں۔

"میں اِسے "بوسہ" ہی کہوں گا" آدم نے جواب دیا۔

لیکن آدم ابھی عورت کے جذبات کو اچھی طرح نہ سمجھ سکے تھے، اُنہیں بہت سی باتیں سیکھنی باقی تھیں، دوسری طرف حوّا اپنی جنس کی تمام حسیّاتِ خفیہ سے باخبر ہو کر پیدا کی گئی تھیں۔ اس لئے فطرتاً اُنہوں نے اپنے "رفیقِ کرخت" کو اپنے جذبات کے شعلوں سے گرمانا چاہا، پہلے مُسکرائیں، پھر زانو بدلے اور ایک مرتبہ پھر لجا گئیں، شعلے کی آنچ کی سی ایک چیز ان کے دل سے نکلی، آدم بیقرار ہوگئے، حوّا نے اُنہیں پلکوں کے گھونگھٹ سے دیکھا اور پھر شرم کے نقاب میں اپنے کو چھپا لیا، اِس طرح جیسے انہیں چوری کرتے پکڑ لیا گیا ہو، مگر آدم کچھ سوچ رہے تھے، اُنہوں نے کسی قدر سمجھ کر ٹال دینا چاہا، حوّا سے ضبط نہ ہوسکا، منہ سے ایک دبی ہوئی آہ نکل گئی۔ اور دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ بولیں۔ "پیارے کیسی دلچسپ بات ہم نے جان لی"۔ اور پھر اُنہوں نے آدم کے سینے کے ملائم بھورے ریشمیں بالوں پر اپنا سر رکھ دیا۔ اور آنکھیں بند کرلیں۔

"ہاں، بہت دلچسپ، پہلے معلوم نہ تھا؟" آدم نے حوّا کی گھنیری زلفوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"لیکن اب تو معلوم ہوگیا" سرگوشی کے لہجے میں حوّا بولیں، یہ گویا ایک سوال تھا، آدم سے۔ آپ ہی آپ وہ آدم کی گود میں گر گئیں، شوخی رخساروں پر دوڑ گئی، بند لب ذرا سے کھلے۔ آدم کے جذبات بھی چونکے، آدم نے ان کا بوسہ لے لیا۔

گو آدم ناتجربہ کار تھے، مگر رفتہ رفتہ حوّا نے انہیں عورت کی تمام خواہشیں بتادیں۔

اب بوسے کے لئے حوّا ہر وقت بیقرار رہنے لگیں، مگر چونکہ وہ عورت تھیں، اس لئے اپنی بیقراری آدم پر ظاہر نہ کرسکتی تھیں کہ اُن کی تمام باتیں آدم کو خوش کرنے کے لئے ہیں، اور بوسہ انہیں ایک نئے پھل کے انعام میں دیتی ہیں، اور ان کے بوسوں کو سیبوں کے معاوضے میں قبول کرتی ہیں۔

ایک دن دونوں مستی میں ایک درخت کی چھاؤں میں آرام کر رہے تھے کہ آدم بولے۔

"مرد کو چاہئے کہ عورت کا بوسہ سورج نکلنے سے پہلے اور سورج ڈوبنے کے بعد لیا کرے" حوّا نے سر ہلادیا۔ اور آدم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اور مرد کو یہ بھی چاہئے کہ عورت کا بوسہ باہر جاتے ہوئے یا باہر سے واپس آکر لیا کرے" حوّا نے اس مرتبہ بھی سر ہلا دیا۔ آدم نے حوّا کی خاموشی سے بڑھ کر کہا۔ "اور مرد کو عورت کا بوسہ اُس وقت بھی لینا چاہئے، جب اُس کے جذبات کے شعلے بھڑکنے شروع ہوں"

اب حوّا ضبط نہ کرسکیں، گہری سانس کھینچ کر آنکھیں آہستہ آہستہ بند کرتے کرتے بولیں "او خدایا"! اور حسبِ مطابق ہوتا رہا۔

غزل

حضرت سیماب اکبرآبادی

آہ کہ ہستی بے لب و بے گوش ہے تیرے بغیر
کائنات اک محشرِ خاموش ہے تیرے بغیر

تو نہیں تو رات ہے محرومِ نورِ زندگی
شام ہی سے چاندنی روپوش ہے تیرے بغیر

ایک تیرے حسن میں رقصاں ہیں لاکھوں میکدے
تشنۂ بادہ لبِ مے نوش ہے تیرے بغیر

آہ کہ پھر دل میں نہیں اٹھتی کوئی موجِ نشاط
سرد پانی، بادۂ سرجوش ہے تیرے بغیر

نیند آ کر اچٹ جاتی ہے تیری یاد میں
تارِ بستر، نشترِ آغوش ہے تیرے بغیر

جلوۂ ہر روز، جو ہر صبح کی قسمت میں تھا
اب وہ اک دھندلا سا خوابِ دوش ہی تیرے بغیر

زندگی تجھ سے عبارت تھی، مگر جب تو نہیں
زندگی کا اپنی کس کو ہوش ہے تیرے بغیر

زحمتِ تکیہ ترے زانو کو دیتا ہے خیال
سر پہ ہر پہلو وبالِ دوش ہے تیرے بغیر

بیٹھ کر بوندوں میں کس کے ساتھ دیکھوں گا بہار
ابر کی آمد، وداعِ ہوش ہے تیرے بغیر

آہ کہ موضوعِ غزل کو ڈھونڈتی ہے ہر نگاہ
نغمۂ مطرب بلائے گوش ہے تیرے بغیر

کیا خبر سیماب کب گھبرا کے دیدے اپنی جان
ضبط گو اب تک تحمل کوش ہے تیرے بغیر



پربھات فلم کمپنی کا بہترین پیشکش ہے۔
مہاتما
महात्मा
پربھات
کا نام اس کے بہترین ہونے
کی
کافی ضمانت ہے
प्रभात चित्र IT'S-PRABHAT
فیمس پکچرز ڈسٹری بیوٹرز چاندنی چوک دہلی۔ لاہور۔ کراچی

ایک منفرد مزاحیہ کہانی

اصغر علی محمد علی تاجران کتب


کلیم
مدیر: جوش ملیح آبادی



چیرمین۔ آنریبل سر ہومی مہتہ | **زینتھ لائف** | جنرل منیجر۔ مسٹر بہرام جی۔ ہرمزجی

تحفظ

مشاورة۔ مسٹر جی۔ ایس مراٹھی ایم۔ اے۔ آئی۔ اے | **انشورنس** | ہیڈ آفس۔ اپالو سٹریٹ۔ ساؤتھ فورٹ بمبئی

خوش معاملگی

سکرٹری۔ مسٹر ایم آئی ڈکشٹ بی اے ایل۔ ایل۔ بی | **کمپنی لمیٹڈ** | سپرنٹنڈنٹ برانچ۔ مسٹر بی اے انصاری کورونیشن ہوٹل بلڈنگ دہلی

دیانتداری

بیمہ

اعتماد

دی ایوری مین پالیسی

نے

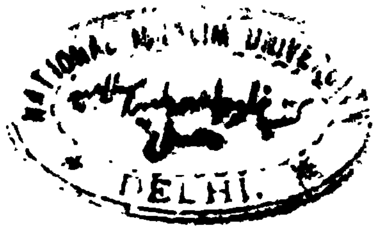
پبلک کی آنکھیں کھولدی ہیں اور ہندوستان بھر کی دنیائے بیمہ میں انقلاب عظیم پیدا کردیا ہے۔ بحالت بیماری کوئی چندہ دینا نہیں پڑتا بلکہ ہر ماہ ایک معقول مقررہ رقم بطور امداد ملتی ہے

کلیم دہلی



آندھی

Coronation Printing Works, Delhi



بنام قوت و حیات

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

کلیم

مدیر

جوش ملیح آبادی

سالانہ چندہ ۶؎

ششماہی چندہ ۳؎

قیمت فی پرچہ ۹؍

اردو زبان کا ہر جہت سے سب سے زیادہ قیمتی ماہنامہ

(پانچ نمبر)

جلد ۱ — فہرست ماہ فروری سنہ ۱۹۳۶ء — نمبر ۲

اشارات

(جوش ملیح آبادی)

"کلیم" کا دوسرا نمبر حاضر ہے۔ ملک نے جس گرمجوشی سے "کلیم" کا استقبال کیا ہے، وہ نہایت درجہ ہمت افزا ہے۔

"کلیم" کا پہلا نمبر بہت بڑی تعداد میں طبع کرایا گیا تھا جسے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا گیا ہے۔

شکر ہے کہ کشمیر سے لے کر راس کماری تک اور کراچی سے لے کر رنگون تک سے اُس کی فرمائشیں آ رہی ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ بہت سے خطوط ایسے بھی آئے جن میں قیمت کی زیادتی کا شکوہ تھا۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ قیمت میں کمی کر دوں چنانچہ آہ:

(۱) فروری نمبر کے ذریعے سے اعلان کیا جاتا ہے کہ اب کلیم کا چندہ دس روپیہ کے عوض چھ روپیہ سالانہ کر دیا گیا ہے۔ تاکہ اس کی اشاعت کافی ہو سکے۔ اور اس کے ذریعے سے جن خیالات کی تبلیغ مقصود ہے، وہ زیادہ افراد تک پہونچ سکیں۔

باوصف کمی چندہ کے کلیم کی ظاہری و معنوی خوبیوں میں کسی قسم کی کمی نہ کی جائے گی۔

وہ حضرات جو دس روپے ادا فرما چکے ہیں اُن کی خدمت میں گزارش ہے کہ سال آئندہ اُن کے نام صرف بتا یا روپیہ کا وی پی کیا جائے گا۔

(۲) جنوری نمبر میں اعلان کیا گیا تھا کہ فروری نمبر سے موسیقی کے متعلق ان تصویروں کی اشاعت شروع ہو جائے گی جو گوالیار کے راج محل میں موجود ہیں۔ اور جن کے بلاکوں کی طیاری کا ہندوستان کے مایۂ ناز فرزند پنڈت مسر کیلاش ناتھ ہاکسر ممبر گوالیار نے بکمال لطف و کرم وعدہ فرمایا ہے۔ لیکن محترم پنڈت جی نے یہ خدمت جن صاحب کے سپرد کی تھی وہ اپنے فرائض منصبی اور بالخصوص دوسرے کی مصروفیتوں کے باعث اس کام کو اب تک انجام نہیں دے سکے۔ قوی امید ہے کہ مارچ نمبر سے ان نوادر کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

(۳) لافنگ مین (Laughing man) کا ترجمہ، جیسا کہ جنوری نمبر میں اعلان کیا گیا تھا۔ اس نمبر سے طبع ہونا شروع ہو گیا ہے۔

امید ہے کہ یہ سلسلہ نہایت دلچسپ اور سبق آموز ثابت ہوگا اور اس سے یہ اندازہ کرنے میں مدد ملے گی کہ استبداد، نوعِ انسانی پر کیا کیا بے پناہ مظالم کرتا رہتا ہے۔

(۴) مجھے "کلیم" کے قارئین سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے میری اس تجویز پر کہ متفکرین آزاد خیال کی ایک انجمن بنائی جائے، اور اُسی کے ساتھ ایک ایسی جماعت طیار کی جائے جو ہندوستان کی مشترک زبان کے متعلق غور کرے، کوئی توجہ مبذول نہیں فرمائی۔

مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر ملک کے صاحبِ فکر اس سلسلے میں مجھے اپنی رایوں سے مطلع فرمائیں گے۔

اس اثنا میں لاہور سے ایک خط آیا ہے، جس سے یہ معلوم کر کے نہایت مسرت ہوئی کہ وہاں اس قسم کا ایک ادارہ قایم ہو چکا ہے جس کے تفصیلی حالات کا میں بےچینی کے ساتھ منتظر ہوں۔

(۵) جنوری نمبر میں میں نے اپنی چند بدحواسیاں سپردِ قلم کی تھیں، اور قارئین سے درخواست کی تھی کہ وہ بھی اپنی اپنی بدحواسیوں کو منظرِ عام پر لائیں، لیکن اب تک کسی نے اپنی بدحواسیاں قلمبند کرنے کی جرأت نہیں کی ہے۔ میرے نزدیک تو یہ ایک نہایت دلچسپ سلسلہ ہوگا۔ لیکن اس کا باقی رکھنا قدردانانِ کلیم کا کام ہے۔

آخر انھیں خدا کے بندوں میں کچھ تو بدحواس ہوں گے ہی۔ پھر کیوں قلم نہیں اُٹھایا جاتا؟

(۶) "قربان گاہِ آزادی" کے سلسلے میں جو دو تصویریں جنوری نمبر میں شائع کی گئی ہیں اُن کے باب میں علامہ سر عبداللہ یوسف علی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ ادبی رسائل میں ایسی تصویریں شائع نہ ہونا چاہئیں: اور میرے شہر پلیے دوست حضرت ہاشمی فرید آبادی نے تو مجھے یہ اطلاع دی ہے کہ انھوں نے وہ ورق ہی رسالے سے علیحدہ کر دیا ہے۔

میں اُن تصویروں کے متعلق صرف اس قدر عرض کروں گا کہ ان میں حسن عریاں نہیں۔ بلکہ حسنِ مظلوم پیش کیا گیا ہے۔ اُن کی اشاعت کا مقصود جوان آنکھوں کو غذا پہنچانا نہیں، بلکہ حساس دلوں پر چوٹ لگانا ہے، اور یہ سبق دینا ہے کہ آزادی کی خاطر غیرت مند قومیں کیا کیا کر چکی ہیں۔

(۷) میں اپنے اُن معاصرین کا نہایت شکر گزار ہوں جنھوں نے کمال کرم "کلیم" پر ریویو تحریر فرمائے ہیں اور مجھے اپنے مشوروں سے بہرہ مند ہونے کا موقع دیا ہے۔

میرے کان ہر وقت ہر مخالف و موافق آواز کا استقبال کرنے کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور میں مخالفت و موافقت دونوں سے مساوی استفادہ کرنے کے لیے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ہر لمحہ طیار رہتا ہوں۔

میری آرزو ہے کہ کلیم کے تمام عیوب ایک ایک کرکے سنائے جائیں، تاکہ میں اس پرچے کو ہر صورت اور ہر حیثیت سے مکمل بنانے میں کامیاب ہو سکوں۔

یقین فرمائیے میرا ضمیر ادارت تحسین اور نفرین دونوں سے بالا رہے گا۔ تحسین سے میں اپنے پرچے کو بے عیب سمجھنے کی غلطی کا ارتکاب نہ کروں گا۔ اور نفرین سے مجھ پر غیظ و غضب غلبہ نہ پا سکے گا۔ بلکہ ٹھنڈے دل سے بات کے ہر پہلو پر نگاہ کرکے اُس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کروں گا۔

(۸) میں نے کلیم کی توسیعِ اشاعت کے واسطے اس اثنا میں ایک مختصر سا دورہ کیا تھا میں اس سلسلے میں شکر گزار ہوں اپنے بھائی خان بہادر محمد یوسف خاں تعلقدار کسمنڈی، جناب اعزاز رسول صاحب تعلقدار سندیلہ، اور سید ضامن علی صاحب پروفیسر و صدر شعبۂ اردو و فارسی الہ آباد یونی ورسٹی کا کہ اُن کے مخلصانہ مساعی نے مجھے نہایت گراں قدر امداد دی۔

(۹) ہندوستانی ایکاڈمی کا جلسہ

میں بارہویں جنوری کو ہندوستانی ایکاڈمی کے سالانہ جلسے میں شرکت کی غرض سے الہ آباد گیا تھا۔

پہلے اجلاس کی کرسیٔ صدارت پر جناب سنہا صاحب جلوہ افروز تھے جن سے مجھے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے ہندوستانی زبان کے عوض انگریزی میں تقریر کی تھی۔

البتہ تمام ہوا خواہانِ ہندوستان کو علم و ادب کے حقیقی مربی و سرپرست رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ آپ کی تمام و کمال تقریر ہندوستانی زبان میں تھی، اور اس قدر شائستہ زبان میں کہ جب تک آپ تقریر کرتے رہے دل آپ کی طرف کھنچا رہا۔

اسی سلسلے میں اکاڈمی کی طرف سے ایک اردو ہندی مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا جو نہایت کامیاب رہا۔

المختصر اکاڈمی کے جلسے بہت کامیاب رہے۔ اور اس ادارے سے ہمیں توقع ہے کہ یہ ہماری زبان اور ہمارے ادبیات کو نہ صرف باقی رکھے گا بلکہ ایسا فروغ دے گا کہ آنے والی نسلیں فخر کے ساتھ یاد رکھیں گی۔

(۱۰) میں اپنے محترم بزرگ حضرت آغا شاعر دہلوی کے باب میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ فصیح الملک مرزا داغ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، اور علمی حیثیت سے بھی آپ کا پایہ نہایت بلند ہے۔

آپ نے بیس پچیس برس کی جگر کاریوں کے بعد قرآن مجید کے بائیس پاروں کا منظوم ترجمہ فرمایا ہے، جن میں سے صرف تین پارے اب تک طبع ہو سکے ہیں۔ میں اُن حضرات کی خدمت میں جو قرآن کریم سے عقیدت رکھتے ہیں، اور جو قرآنی تعلیم کے متعلق یہ تمنا رکھتے ہیں کہ اس کی تعلیم تمام عالم میں عام ہو جائے، بزور یہ استدعا کروں گا کہ وہ اس سلسلے میں حضرت افسر الشعرا آغا شاعر کی دل کھول کر امداد کریں اور اس کارِ خیر میں حصہ لے کر نہ صرف اپنی قوم کے آلام میں گھرے ہوئے ایک بوڑھے شاعر کو مصائب سے نجات دلائیں، بلکہ اپنی عاقبت سنوارنے کا بندوبست بھی کر لیں۔

خدا کے تین قہر

(۱) (۱) ہندوستانی ہونا۔

(۲) مسلمان ہونا۔

(۳) یو۔ پی کا باشندہ ہونا۔

میں اِن تینوں قہروں پر تین چھلتے ہوئے اشارے کروں گا۔ قارئین اپنے تخیل سے خانہ پُری فرمالیں۔

(الف) ہندوستانی ہونا:۔

جس نے بھی بدبخت ہندوستان کی عبرت انگیز تاریخ پڑھنے کی ایک مُدبر کی طرح تکلیف اٹھائی ہے، وہ انتہائی قلق کے ساتھ یہ ہمت شکن فیصلہ کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے کہ اِس نامراد ملک کی آب وہوا، حیات و کشمکش حیات کے حق میں سمِّ قاتل کا حکم رکھتی ہے۔

یعنی ہندوستان ایک ایسی مردانہ قوتوں کو نچوڑ لینے والی عورت ہے جو آئے دن نئے نئے شوہر تلاش کیا کرتی ہے، یہ ایک ایسی ابدی کلیوپٹرا ہے جس کی خوابگاہ تازہ بتازہ جوانیوں کی سانسوں سے مہکتی رہتی ہے۔

لیکن چند رنگین بہاروں کی معطر چاندنی راتیں گزارنے کے بعد شوہر کو ہڈیوں کا مالا بناکر اور اس کا تمام رس چوس کر آخر کار گھر سے باہر نکال دیا کرتی ہے۔

غور کیجئے ہندوستان کے قدیم باشندے گونڈ اور بھیل کتنے قوی، کس قدر مضبوط اور کس قدر بلا کے طاقتور تھے۔ انھیں ہندوستان کے چٹیل میدانوں، اور ہولناک صحراؤں نے اپنے آغوش میں پالا تھا، وہ شدید موسموں کے چہیتے بیٹے تھے، اُن کی ہڈیوں میں شاندار و سربلند ہمالیہ کی چٹانیں صرف ہوئی تھیں، اور گوشت پوست کے اعصاب کی جگہ اُن کی کھردری اور تابناک جلدوں کے نیچے تپائے ہوئے فولاد کے تار کھینچے ہوئے تھے۔

لیکن عروسِ ہند کا ذوقِ عیاشی دیکھئے کہ اِن شیر افگن جوانمردوں کو مفتوح بنانے کی خاطر آوارہ گرد آریوں کو ایک مختصر سا تھکا ہوا گروہ یکایک ہندوستان میں وارد ہوتا ہے، اور اِن فرزندانِ تیر و کماں اور گردانِ دلیر کو ایک ادنیٰ سی جدوجہد کے بعد چوپاؤں کی طرح جنگلوں اور پہاڑوں میں ہانک کر اپنی بادشاہی کے ڈنکے بجانے لگتا ہے۔

آریوں کی حکومتیں ملک کے ہر گوشے میں قایم ہو جاتی ہیں

راجپوتوں کی برچھیاں، برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں پر چلنے والی کرنوں کو شرمانے لگتی ہیں، اور اُن کی جھلکتی ہوئی تلواروں کا پانی، ہندوستان کی شاداب سرزمین پر گنگا جمنا بن کر بہنے لگتا ہے۔

لیکن عروسِ ہند کی دوسری کروٹ ملاحظہ فرمایئے کہ عین اُسی عالم میں جب کہ راجپوتوں کی تلواروں کی جھنکار سے دشت و جبل گونجے ہوئے تھے، گرجیں لگی ہوئی باگوں، اور پھٹی ہوئی نِندبوں کے ساتھ مٹھی بھر معدودے چند مسلمان اُن پر حملہ آور ہوتے ہیں، اور بیک گردشِ شمشیر اِن ارجن اور بھیم کے وارثوں کے پاؤں میں غلامی کی زنجیریں ڈال دیتے ہیں۔

اسلامی حکومت کا اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں کی گونج میں اعلان کیا جاتا ہے۔ پتھروں کے سینے تراش کر ہیبت آفریں قلعے اور قصر تعمیر کئے جاتے ہیں۔ شوکت و صولت دربار میں حاضر ہو کر مجرا بجالاتی ہے۔ طبل و علَم آستانۂ شاہی پر سر جھکا دیتے ہیں۔ دبدبہ اور طنطنہ مورچھل لیکر پشت پر آ کھڑا ہوتا ہے ذرّے ذرّے پر سطوتِ اسلام کا آفتاب چمکنے لگتا ہے، اور گنگا جمنا کے دھاروں پر کوثر و تسنیم کی موجیں انگڑائیوں پر انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہیں۔

لیکن عروسِ ہند تجدیدِ عشرت کے شوق میں پھر پھریری لیتی ہے، جماہی لیکر اور بکھری زلفوں کا جوڑا باندھ کر اپنی خوابگاہ کے زریں دریچے کے شیشے سے پھر کسی اٹھلا اٹھلا کر چلنے والے رس بھرے نوجوان کا راستہ دیکھنے لگتی ہے کہ اتنے میں پھیکے رنگ روپ والے سوداگروں کا ایک مختصر سا قافلہ، گربۂ مسکین کی طرح پنجوں کو بند کئے ہوئے اِس شیر کے کٹھرے یعنی کشورِ ہندوستان میں داخل ہوتا ہے، اور رفتہ رفتہ ہزاروں سادگیوں اور پُرکاریوں کے بعد مسلمانوں، صرصر و سموم کو چٹکیوں میں اُڑا دینے والے مسلمانوں، ریگستانوں کے شہریار مسلمانوں، آندھیوں کا رُخ بدل دینے والے، اور تیغوں کی چھاؤں میں پل کر پروان چڑھنے والے مسلمانوں کی گردنوں میں آہستہ سے محکومی کا طوق ڈال دیتا ہے، اور اپنی ٹھنڈی اور سفید پیشانی پر تیموری تاج کو کج کرکے اسلامی خون کی گرمی و سُرخی پر قہقہے مارتا نظر آتا ہے۔

یہ ہے اس بدبخت ملک کی سیاسی روداد، اور تاریخی سرگزشت!

جو کوئی آئے ہے، نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں!

اب رہا ہندوستان کا اخلاقی، معاشرتی۔ مذہبی، اور قومی معیار سو

اُس کے بیان کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیے، اور اُس پر ماتم کرنے کے لئے پتھر کا کلیجہ درکار ہے۔

خدا کے لئے ذرا غور تو کیجئے کہ جس کم بخت ملک میں ذرا ذرا سی باتوں پر خون کی ندیاں بہ جاتی ہوں، جہاں ایک ذرا سے اختلافِ رائے اور ایک معمولی سی نکتہ چینی پر لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہوں ـــــ جہاں نہ کوئی ایک مشترکہ لباس ہو، نہ ایک مشترک معاشرت۔ ـــــ نہ ایک مشترک زبان ہو ـــــ جہاں قوم کے معنی "شیخ"، "سید"، "برہمن" اور "کائستھ" ہوں ـــــ جہاں لوگ اپنے کو "ہندوستانی" کہنے کے عوض "ہندو"، "مسلمان" اور "سکھ" کہتے ہوں۔ جہاں اغیار کا لباس پہنکر فخر سے اکڑا جاتا ہو، اور بیگانوں کی زبان میں کلام کرکے اپنی شرافت کا ثبوت دیا جاتا ہو، جہاں اوہام و روایات کی بناء پر انسانیت کے گریبان کو تار تار کر دیا گیا ہو، اور جہاں اینٹ چُونے کے احاطوں اور گھاس پھُونس چرنے والے چوپاؤں پر انسانی خون بہا دیا جاتا ہو۔ وہاں زندگی اور قومیت پیدا ہو تو کیوں کر؟ وہاں "آزادی" و "حریت" کا خواب دیکھا جائے تو کس طرح؟

کیا ہات مرے پہنچیں گے دامانِ بتاں تک
اپنے ہی گریبان سے فرصت نہیں ملتی

(ب) دوسرا قہر۔ مسلمان ہونا۔

مُسلسل تموّل، اور مُسلسل افلاس، دونوں ابنِ آدم کے حق میں ساوی طور پر انتہائی خطرناک ہیں۔

پہلے تموّل و افلاس کے متعلق میری دو رباعیاں جو مجھے اس وقت یاد آگئی ہیں سُن لیجئے۔

تموّل۔
انسان کو رفتہ رفتہ حیوان کر دے
ہر نور کو، صد نار بداماں کر دے
دولت کہ فرشتوں سے بڑھا دیتی ہے
جم جائے اگر کہیں تو شیطاں کر دے

افلاس۔
ہر صاحبِ جوہر کو سُبک سر کر دے
فطرت کو زبوں کرکے زبوں تر کر دے
افلاس، کہ کھینچتا ہے ایماں کی طرف
کم بخت مُسلسل ہو تو کافر کر دے

مسلمان، اِن دونوں زہروں کو پئے ہوئے ہیں، اور ان دونوں سانپوں کے ڈسے ہوئے ہیں۔

اِس قوم نے کرۂ ارض کے ایک بہت بڑے حصہ پر صدیوں حکومت کی ہے۔ سونا چاندی پانی کی طرح بہایا ہے۔ عیش و عشرت کی موجوں میں ایک طویل مدّت تک شناور رہی ہے۔ اِس کے دن بھرے دربادوں میں، اور اِس کی راتیں جھکتی ہوئی زلفوں کے سائے میں گزری ہیں۔ اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اس قوم میں وہ تمام معائب آچکے ہیں، جنھیں مُسلسل تموّل پیدا کیا کرتا ہے۔

پھر تاج و تخت سے محروم ہو جانے کے بعد اس قوم پر ایک ایسی بے پایاں افسردگی، اور ایک ایسا غیر محدود جمود طاری ہو گیا کہ اس کا ہر فرد حرکت بھُول گیا، اور اس قدر مبہوت و معطّل ہو کر رہ گیا کہ تمام قوم پر مہولناک افلاس نے قبضہ کر لیا۔

اس پر بھی اِن خدا کے بندوں نے بانکپن نہ چھوڑا، اور اپنی طمطراق والی میرزائیت ترک نہ کی، اور اس رفعت آبی نے اُنھیں اور بھی خاک میں ملا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِس قوم پر وہ تمام لعنتیں مُسلط ہو گئیں جو مفلسی ہمیشہ اپنے ساتھ لایا کرتی ہے۔

اب مسلمانوں کے مخصوص عادات کی فہرست یوں شروع ہوتی ہے۔

حسد، رشک، بدگمانی، غیبت، کاہلی، تنگ نظری، دروغ گوئی، اسراف، لاف زنی، ناعاقبت اندیشی، اوہام پرستی، اور غدّاری:

اگر بزدوں کو چھوڑیئے کہ وہ تو زندہ قوم کے افراد ہیں۔ آپ ہندوستان ہی کے دوسرے فرقوں کو لے لیجئے۔ پارسی، بنگالی اور کسی حد تک ہندو، سب کے سب دن بھر کے سنجیدہ اُمور سے فراغت حاصل کرکے اپنا شام کا وقت کسی نہ کسی تفریحی مشغلے میں صرف کرتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے جس محلّے سے گزریئے، قبرستان کا سا سماں نظر آتا ہے۔ ہر برآمدے یا کمرے میں آپ دیکھیں گے کہ ٹمٹماتی ہوئی روشنی کے پھیکے دائرے میں مسلمان پسینے پسینے بیٹھے ہوئے ہیں۔ چہرے مئی جون کے آسمان کی طرح خشک ہیں۔ زور سے آمین کہنے نہ کہنے پر رُوکھی بحثیں چھڑی ہوئی ہیں۔ یا حقّے پی پی کر بھائیوں کے عیوب بیان کئے جا رہے ہیں۔

جس قوم میں سازش، غیبت اور مناظرے، شام کی تفریحوں میں شامل ہوں اُس قوم میں پیدا ہونا قہرِ خدا نہیں تو اور کیا ہے؟

امتحان پاس کرکے برِیٹنیا جہاز پر تعلیم کے لئے گئے۔ جہاں وہ سوا سات بجے صبح سے پونے دس بجے رات تک اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ جب اس جہاز پر ان کی تعلیم کی تکمیل ہوگئی تو اُنھیں دُنیا کے گرد سفر کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ جس سفر کے دوران میں وہ سوائے ہندوستان کے تقریباً سب انگریزی مقبوضات میں ہو آئے۔

جنوری ۱۸۹۲ء میں ڈیوک آف کلیرنس کا انتقال ہوگیا اور جنوری ۱۸۹۳ء میں شہزادہ جارج کو ڈیوک آف یارک بنایا گیا اور اس کے چھ مہینے کے بعد اُن کی شادی شہزادی وکٹوریہ میری آف ٹیک سے ہوئی جو قبل ازیں شاہ جارج کے بڑے بھائی ڈیوک آف کلیرنس سے منسوب تھیں۔

۱۹۰۱ء میں جب ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا تو شاہ ایڈورڈ ہفتم آنجہانی سریر آرائے سلطنت ہوئے اور شاہ جارج کو تخت کا وارث قرار دیا گیا اور وہ اسی سال آسٹریلیا کی پہلی مجلس عاملہ کا افتتاح کرنے کے لئے آسٹریلیا گئے۔ آسٹریلیا سے ہوکر ملک معظم آنجہانی نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ اور کنیڈا بھی تشریف لے گئے۔

۱۹۰۵ء میں ملک معظم مرحوم ملکہ معظمہ کی معیت میں ہندوستان بھی تشریف لائے اور ۹ر نومبر سے ۱۹ر مارچ تک ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کرتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں جب شاہ ایڈورڈ کی وفات ہوئی تو شہزادہ جارج ۶ر مئی ۱۹۱۰ء کو تخت پر بیٹھے۔

۱۹۰۶ء میں شاہ آنجہانی ہندوستان کو ساحل بمبئی سے خیرباد کہنے والے تھے تو ملکہ نے ایک ممتاز افسر سے کہا "آپ تو یہاں کبھی دوبارہ بھی آسکیں گے اور شاید میں کبھی نہ آؤں" اور یہ کہہ کر آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔ لیکن مشیت سن رہی تھی اور اُسے اس پرمحبت آرزو کی تکمیل منظور تھی چنانچہ ۱۹۱۱ء میں ملک معظم آنجہانی اور ملکہ معظمہ نے دوبارہ تاجپوشی کے لئے ہندوستان میں دوبارہ نزول اجلال فرمایا۔ دہلی میں دربار ہوا اور اس شان کا کہ دیکھنے والوں کے دلوں میں مغلوں کے زوقِ شوکت کی یاد تازہ ہوگئی۔

۱۹۱۴ء میں جب جنگ جرمن شروع ہوئی تو شہنشاہ آنجہانی نے قربانی اور ہمدردی کی عدیم المثال نظیر پیش کی۔ اس مجمل اور بے رنگ خاکہ میں ممکن نہیں کہ ان کے ۲۵ سالہ دورِ حکومت کی ترقیوں پر تبصرہ کیا جائے اور نہ اس دور کی سیاسی تبدیلیوں اور آویزشوں کا تذکرہ ہی ہوسکتا ہے۔

ملک معظم آنجہانی اس دور کے بلاشبہ عظیم شہنشاہ تھے۔ وہ عظیم تر انسان تھے۔ اپنے ممالک محروسہ کی رعایا سے اُنھیں سچی محبت اور ہمدردی تھی اور یہی چیز اُن کی بلند فطرتی کی لافانی یادگار ہے!

(ملک حبیب احمد۔ بی اے۔ آنرز)

کرسی سے بلند ہے نشیمن اپنی
فردوس پہ خندہ زن ہے گلشن اپنی
[illegible]
[illegible]

[illegible]

آدم کی سرشت [illegible]
[illegible]
محبوب ہو [illegible] حبیب ہیں
[illegible]

[illegible]



۰ ر‌حو، سنة ثار، پنجم

قومیت کا تخیل اور ہندو مسلمان

(از جوش ملیح آبادی)

آؤ، میں تم سے کچھ کہوں، اے اپنی تاریخی عظمت پر فخر کرنے والے تنگ نظر، جاہل و فاقہ مست مسلمانو! - اور اے اپنے مذہبی فلسفے کی قدامت پر اترانے والے تنگدل، وہم پرست و زبوں ہمت ہندوؤ! ہاں میں بدبخت تمہیں میں سے ہوں - اگر یہ صحیح ہے کہ خون کے رشتے کبھی منقطع نہیں ہوتے ہیں، تو میں تم سے کیونکر جُدا ہوسکتا ہوں؛ میں اس پر فخر کروں یا ماتم!

ہاں اے اپنوں کے مقابلے میں "ساونت" ہندوؤ! اور اے بھائیوں کے روبرو "صف شکن" مسلمانو! تم حیات کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکا، اور انسانیت کے جسم پر کوڑھ کا داغ ہو۔

عاقبت اندیش احباب مجھ سے کہتے ہیں رسالہ تو نکال رہے ہو، اور اپنی قوم کی ذہنی اصلاح پر تم نے کمر تو باندھی ہے، لیکن خدارا خطابت میں نرم لہجہ اختیار کرنا، ورنہ ہندو مسلمان تمہارے خلاف بھڑک اُٹھیں گے "کونین" دینا، مگر شکر میں لپیٹ کر، ورنہ لوگ مُنہ بنانے لگیں گے!

لیکن میں کیا کروں، میرا سینہ تو پھوڑے کی طرح پک رہا ہے، میرا دل تو انجن کی بھٹی کی طرح سنسنا رہا ہے، اور میری چھاتی تو آتش فشاں پہاڑوں کی طرح بھڑک کر شق ہوجانے کے لئے تُلی رہے ——— میں نرم لہجہ کہاں سے لاؤں؟

دیکھیو غالب مجھے اس تلخ نوازی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اے ہندوؤ! اور اے مسلمانو! اے بھارت ماتا کے سپوتو! تمہاری آئے دن کی خانہ جنگیوں نے تو مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ تمہارے دیر و حرم، اور ناقوس و اذان کے جھگڑوں نے تو مجھے کف در دہاں، اور آتش بجاں بنا دیا ہے۔ میں تو دیوانہ وار خود اپنی بوٹیاں نوچ رہا ہوں۔ خدا کے لئے بتاؤ میں نرم لہجہ کہاں سے لاؤں؟

وہ جو غصے کی شدت میں دانت پیس رہا ہو، کیونکر مسکرا سکتا ہے؟ اور کیا ایسے سنگین، اور دوزخ کی طرح بھڑکتے ہوئے موقع پر "مسکرانا" ایک انتہا درجے کا بُزدلانہ نفاق نہیں کہا جاسکتا؟

میں آج کی صحبت میں کھری کھری سُناؤں گا۔ جی کھول کر جلے دل کے پھپولے پھوڑوں گا، میں تو تمہاری صفوں میں سے آندھیوں کی طرح گزروں گا۔ تمہارے بے مغز سروں پر کڑی کمانوں کی طرح کڑکوں گا، اور طوفانی بادلوں کی طرح گرجونگا۔

اس وہم میں نہ پڑنا کہ تم سے ڈر جاؤں گا، سنو میں ایک ایسا کفن بردوش، اور سربکف انسان ہوں جو ہر سانس میں موت سے کھیلتا، اور فرشتۂ اجل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا رہتا ہے۔

ہندوستان کی اُس گزری ہوئی عظمت کی قسم، جو، اب گلیوں میں برہنہ ماری ماری پھر رہی ہے۔ اور جس کا واپس لانا ہر اُس ہندوستانی پر فرض ہے جو اپنی ماں کی عصمت پر فخر کرتا ہو، کہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مرنے سے ڈرنے والے صرف بُزدل ہی نہیں، احمق بھی ہیں۔ میں تو ایک مُدت سے پُکار پُکار کر کہہ رہا ہوں۔ ع

اے اہل دہر! موت سے ڈرنا حرام ہے

ایک مرتبہ میرے ایک "دوست" نے مجھ سے کہا تھا "خاں صاحب کھانے پینے میں اتنی بے ضابطگی نہ برتا کیجئے۔ ورنہ مر جائیگا" اور مجھے یاد ہے میں نے جواب میں کہا تھا " مجھے سب سے زیادہ گھٹیا قسم کی دھمکی نہ دیجئے ———

اب کوئی میرے لئے حدِّ ترقی نہ رہی
اک جھجک موت کی باقی تھی، سو وہ بھی نہ رہی

اے "بہادر" ہندوؤ، مسلمانو! کہہ چکا ہوں، اور پھر کہتا ہوں کہ میں موت سے نہیں ڈرتا ——— اچھا ہے مجھے تمہیں میں سے کوئی موت کے گھاٹ اُتار کر، مجھے ہندوستان کی اس بے حمیت زندگی کے پاپ سے چھڑا دے ——— میں تمہارے کھُردرے مردانہ ہاتھوں سے خون کا پیاسا قتل ہوجانے کو اس سے کہیں زیادہ پسند کروں گا کہ اغیار کی پری رخساروں کے نازک ہاتھوں سے آب حیات نوش کروں۔

ہاں میں تم پر بیحد برافروختہ ہوں، میں تم سے بدرجۂ اتم ناخوش ہوں تم

پر میرا غیظ و غضب بپھرے ہوئے دیوتاؤں کا غیظ و غضب ہے۔ کاش میں تم سے نفرت کرسکتا! کاش میں تم سے نفرت کرسکتا! کاش میں تم سے نفرت کرنے پر قادر ہوتا!!

یاد رکھو اے افلاطونو، اے بقراطو! اگر تم میں عقل ہو، اور تمہارا حافظہ عاقلانہ باتوں کے محفوظ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو یاد رکھو کہ وہ تلخ گفتاری جسکی تم میں امرت بھری لے رہا ہو، اُس شیریں کلامی سے کہیں بہتر ہے جس کے سبزے کے نیچے زہر ہلاہل بہہ رہا ہو۔

میں دریافت کرتا ہوں کہ وہ نعمت قابل قدر نہیں ہے جس کی بنیاد محبت پر قائم ہو؟

سُنو، اے سسکتے ہوئے پامال ہندوستان کے سماجنیس کرو رغلام سُور ماؤ! اے "گائے، باجے" پر حیات کی سی مقدس شئے، اور "ناقوس، اذان" پر بھائیوں کے خون کی سی متاع عزیز کو بھینٹ چڑھا دینے والے دو پاؤں کے جانورو! تم نے ہندوستان کو ذلیل کر ڈالا ہے، تم نے انسانیت کو رُسوا کر دیا ہے، تم نے آدمیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے، تم نے نوعِ انسانی کو پارہ پارہ کر دیا ہے، تم نے حبِ وطن کو کند چھری سے حلال کر ڈالا ہے۔

جامۂ انسانیت کے پُرزے ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں —— لباس وطنیت کی دھجیاں فضا میں رقص کر رہی ہیں۔ یہ ہیں تمہاری پتنگ بازیاں، یہ ہیں تمہارے لہراتے ہوئے پرچم!! اور اے میرے بہکے یا بہکائے ہوئے عزیزو! یہ ہیں تمہارے کرتوت!!!

کیا تم شرم سے سر جھکا لینے پر اب بھی آمادہ نہیں؟

تمام دُنیا کی برادری، اور قومیت کے تصور کا "وطن" اور "انسانیت" پر مدار ہوا کرتا ہے —— اور یہی عاقلانہ و فطری دستور بھی ہے۔

لیکن تمہاری برادری، اور قومیت کے تصور کی کس چیز پر بنیاد ہے؟ ٹھہرو، ذرا ٹھہرو —— غصّے کے مارے مجھے اپنے سینے سے تھرتھراتی ہوئی آنچ کی سنسناہٹ سُنائی دے رہی ہے۔

لیکن کیا سانس روک کر اور غُصّے کو ضبط کرکے مجھ نامراد و بدبخت کو یہ کہنا نہ پڑیگا کہ تمہارے برادری، اور قومیت کے تصور کو "وطن" اور "انسانیت" سے دُور کا بھی علاقہ نہیں ہے؟ —— اور "وطن" و "انسانیت" وہ الفاظ ہیں جو تمہاری فرہنگ میں درج ہی نہیں کئے گئے ہیں؟

ہاں اے عقل کے دشمنو! تمہاری برادری تو "عقائد" و "رسوم" کی برادری ہے، تمہاری قومیت تو "روایات" قادہام کی قومیت ہے۔

اگر میں ہندوستان سے باہر جاؤں، اور کوئی خدا کا بندہ خدا نا کردہ، مجھ سے سوال کر بیٹھے کہ تیرے ہندوستان میں قومیت کا تصور، اور برادری کا معیار کیا ہے، تو تمہیں بتاؤ، کیا میں شرم سے زمین میں گڑ نہ جاؤں گا؟

کیا میں اُس سے یہ کہنے کی جسارت کرکے زندہ بھی رہ سکتا ہوں کہ میرے مُلک میں "وطن" اور "انسانیت" کوئی معیار نہیں ہے، میرے مُلک میں کوئی اِس بنا پر بھائی نہیں ہوسکتا کہ وہ میرا ہموطن ہے، میری ہی طرح ایک انسان ہے، میرے ہندوؤں مسلمانوں کو تو اگر اجنبی شخص کے متعلق بھی یہ علم ہو جائے کہ وہ اُنھیں کی ترکیب کے مطابق برتن مانجھتا ہے، اُنھیں کے رسوم کے موافق ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر عبادت کرتا ہے، اُنھیں کی طرح ایک خاص گھوڑے کو سلام کرتا ہے۔ اور اُنھیں کے عقاید کی مطابقت کرتے ہوئے بندروں کی ایک خاص قسم کو اپنا پیشوا سمجھتا ہے، تو وہ دیوانہ وار نعرے لگاتے ہوئے اُس کی طرف دوڑیں گے، اُسے گلے لگائیں گے، اور اُس کے غلاموں تک کو اپنی برادری میں شامل کرلیں گے۔ لیکن "وطن" و "انسانیت" کے نام پر کسی کو بھائی نہ سمجھیں گے۔

اے میرے ہندوؤ، اور مسلمانو! ماتم ہی کرنے کی نہیں، مرجانے کی بات ہے کہ کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی شائستہ و شریف کیوں نہ ہو۔ اِس قدرتی اور فطری بُنیاد پر تمہارا بھائی نہیں ہوسکتا کہ وہ تمہارا ہموطن ہے، اور تمہاری ہی طرح ایک انسان ہے۔

تم تو اپنی قومیت، اور برادری کے حلقے میں صرف اُس شخص کو داخل کرسکتے ہو جو تمہارے عقائد و روایات کے مطابق ٹخنوں سے اُونچا پاجامہ پہنتا ہو، شانے پر چوخانے کا رُومال ڈالتا ہو، اُس کے ماتھے پر سیاہ دھبّا ہو۔ اُس کی مونچھیں تمہاری مرضی کے مطابق خوب کتری ہوئی ہوں، وہ ایک خاص انداز سے کچھ خاص کلمات ادا کرتا ہو، حلوؤں اور مٹھائیوں پر کچھ بڑبڑا بڑبڑا کر شیریں کام ہوتا ہو، اور ڈاڑھی اِتنی دراز رکھتا ہو کہ حریف اگر چاہے تو اُسے مٹھی میں پکڑ کر اپنے طمانچہ کو زیادہ شدت کے ساتھ کامیاب بنا سکتا ہو۔

تم تو اپنی برادری میں صرف اُس شخص کو داخل کرسکتے ہو جو گلے میں ایک ترچھا ڈورا ڈالتا ہو، جسے غسلخانہ میں کان سے لپیٹ لیا جاتا ہو، جو اپنے جسم پر بھبھوت ملتا ہو جس کی چاند پر بالوں کا ایک گچھا ہو، ایسا گچھا ہو کہ دشمن اگر اُسے گرفت میں لے لے تو جسم کو اُوپر اُٹھا کر گڑھے میں ڈال سکتا ہو، وہ ایک

خاص چوپائے کے فضلے پر بیٹھکر کھانا کھاتا ہو، وہ اپنے بھائی اور باپ تک کو نجس تصور کرتا ہو، اور اُن کے ہاتھ کی پکائی ہوئی چیز کا کھانا حرام سمجھتا ہو جس کا ایمان، پانی کی ایک بُوند سے پگھل جاتا ہو، اور جس کے ماتھے پر موٹی موٹی رنگین لکیریں اس طرح بنائی جاتی ہوں کہ ماتھا دیوالی کی کُلہیا سے ملنے لگے۔

تم تو اپنی برادری میں اُس شخص کو داخل کرسکتے ہو جو ہاتھ میں لوہے کا ایک کڑا پہنتا ہو، سر پر پگڑی باندھتا ہو، اتنا کوئی محض خوشبو سے قتل پر آمادہ ہو جاتا ہو، جس کے جسم کو قینچی یا اُسترا مرتے دم تک نہ چھو سکتا ہو۔ اور جس کا سر، منہ، ہونٹ، گلا، گُدی، گردن سب بالوں کے جھنڈ میں اس طرح چھپے ہوئے ہوں گویا اندھیرے میں ایک بڑا ناریل پڑا ہوا ہے۔

تمہارے حلقے میں تو صرف وہ شخص داخل ہوسکتا ہے جو کانوں میں انگلیاں دیکر عبادت کا آوازہ بلند کرتا ہو، یا گردن کی رگیں پھلا کر تونبیاں بجاتا ہو۔

تمہاری برادری میں تو صرف اُس شخص کو بار مل سکتا ہے جو تمہاری مرضی کے مطابق ایک خاص طرز کا لباس پہنتا ہو، ایک خاص سمت پاؤں نہ پھیلاتا ہو، اور ایک خاص طرف مُنھ کرکے کُلّی نہ کرتا ہو۔

اور اے صاحب عقل وحکمت ہندو، مسلمانو! تمہاری قومیت اور برادری کی مُہر تو صرف اُسی کی پیشانی پر ثبت کی جاسکتی ہے جو چھینک آتے ہی "الحمد للہ" کہتا ہو یا جمائی آتے ہی ناک کے پاس ہاتھ لیجاکر چٹکیاں بجانے لگتا ہو۔

اور اگر ان باتوں میں سے، کسی ایک ادنیٰ سی بات میں بھی، کوئی تمہارا ہموطن، جو فطری طور پر تمہارا بھائی ہے۔ زیادہ نہیں، ایک خفیف سا بھی تم سے اختلاف رکھتا ہو، تو تمہارا اللہ اور تمہارا پرمیشر تمہیں حکم دے دیتا ہے کہ تم اُسے گالیاں دو، کوڑے مارو۔ شہر بدر کردو۔ سُولی پر چڑھادو، قتل کرڈالو۔ جلادو، پھونک پھون ڈالو، بھسم کردو۔ اُس کے گھر میں آگ لگادو۔ اُس کے بال بچوں کو اُسے دکھا دکھا کر ایک ایک کرکے موت کے گھاٹ اُتار دو۔ اور اُس کی بہو بیٹیوں کی شارع عام پر اس طرح عصمت دری کرو کہ شیطان تک کے ماتھے سے غیرت کا پسینہ ٹپکنے لگے ـــــــ کیوں؟ یہی ہے نہ تمہاری برادری، تمہاری قومیت، اور تمہاری شرافت کا معیار؛ کیا تم سن رہے ہو؟ سچ مچ سن رہے؟ اور حیرت ہے کہ اب بھی شرم سے تمہاری آنکھیں نیچی نہیں ہیں!

تم آزادی کا مطالبہ کرتے ہو۔ حالانکہ تمہیں زندہ رہنے کا بھی حق نہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ غلامی کی رُوح کو بھی تم سے منسوب ہوتے ہوئے بے غیرتی محسوس ہوتی ہے۔ تم تو غلامی سے بھی پست تر ہو۔ میں تمہیں کیا خطاب دُوں؟

ہر ہاتھ میں تیغ خونچکاں ہے یارب ہر پاؤں میں زنجیر گراں ہے یارب
مذہب کی برادری سے دل تنگ نہیں انساں کی برادری کہاں ہے یارب

سُنو سُنو، شاعر کی دردناک آواز گنگا جمنا کے کناروں پر گونج رہی ہے:

قہر ہے کوئی، تو موجِ طوفاں کوئی خنجر ہے کوئی، تو تیغ بُرّاں کوئی:
انساں ہے کہاں؟ بحث کرتے ہیں گم ہے؟ یاں تو کوئی ہندو ہے، مسلماں کوئی!

اے مُورکھ ہندوو، اور اے نادان مسلمانو! کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے، کہ تم نے جو تفرقے کی چھپتیاں اپنے اپنے ماتھوں پر چپکا رکھی ہیں، انھیں کھُرچ کر جیبوں میں رکھ لو۔ اور اپنی ان فرضی اور جھوٹی قرابتداریوں کو اُس مقدس عظیم قرابت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دو جو حقیقی اور فطری ہے؟

"دین، دین" "دھرم، دھرم" کلیجہ پک گیا ہے ان تھوتھی اور کھوکھلی آوازوں سے، کانوں میں زخم پڑے جاتے ہیں ان مولویوں اور پنڈتوں کی نامراد صداؤں سے!

اے بھائیو! اے عقل و حکمت کے دشمن بھائیو! اے زمین پر فساد برپا کرنے والے بھائیو! تمہاری کس کس بات پر رُوؤں؟

اے دھوتی اور پاجامے کے گرد ہو! اے لوٹے اور بدھنے کی آبرو! اور اے داڑھی اور چُٹیا کے ادارو! تمہاری کس کس حماقت پر ماتم کروں؟

میں تمہارے جُنونِ خانہ جنگی، اور ذوقِ محکومی و کفش برداری کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اب تو خیر سے تمہارے پانی اور تمہاری چائے نے بھی دین اور دھرم کے ہاتھ پر بیعت کرلی ہے۔

بہ مکتب می رود طفلِ پری زاد
مبارک باد مرگِ نو بہ اُستاد

کیا تم ریلوے اسٹیشنوں پر "مسلمان پانی"، "ہندو چائے" کی ناپاک آوازیں نہیں سُنتے ہو۔ کیا تم اس قدر بے حیا ہو کہ ان آوازوں کی گونج میں بھی تم کھڑکی سے باہر سر نکالتے ہو، اور پلیٹ فارموں پر اُتر کر غیر دُنیا کو مُنھ دکھلانے کی جرأت کرتے ہو؟

اور کیا کبھی تم نے یہ مطالعہ نہیں کیا ہے کہ تمہارے "مسلمان پانی" اور "ہندو چائے" کے ذلیل نعروں کی گونج، اغیار کے چہروں پر سرخی بنکر کھیلنے لگتی ہے؟

اے میرے نادان دوستو! اے ہندوو، اور اے مسلمانو! خدا تمہیں انسان

بننے کی توفیق دے ——— اگر تم سب کو ایک ہی لباس میں ملبوس کرکے کسی وسیع میدان میں کھڑا کر دیا جائے۔ تو کیا تمہاری صورتیں دیکھکر کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ہندو ہے اور وہ مسلمان ؟

کیا تمہاری شکلیں، لہجے، آواز، چال ڈھال، رنگ روپ، قد و قامت، مزاج اور عادات و اطوار یہ تمام چیزیں بلا استثناء ایک دوسرے سے نہیں ملتی ہیں ؟

کیا تمہارا گوشت، پوست، خون اور ہڈیاں ایک نہیں ہیں ؟

کیا تم اسی خاک سے پیدا نہیں ہوئے ہو، اور اسی خاک میں نہ مل جاؤ گے ؟

جب موسم گرما چڑھ چڑھے اور بے مہر و مروّت موسم گرما کی تند خو ہواؤں کے جھکڑ چلتے ہیں، کیا تم دونوں کے چہروں پر ایک ہی قسم کی ترش پژمردگی نہیں پائی جاتی ؟

جب گلابی جاڑے، گلابی دھوپ دیواروں سے اترنے لگتی ہے، اور ہلکی پُروائیوں کی زلفوں میں لسی ہوئی خوشبو تمہارے دماغوں کو معطر کر دیتی ہے، کیا تم دونوں کے چہروں پر ایک ہی قسم کی میٹھی شگفتگی نہیں پائی جاتی ؟

جب بھری برسات کی چلتی اور برستی راتوں کی تاریکیوں میں دور کے باغ سے پپیہے کی صدا آنے لگتی ہے تو کیا تم دونوں کسی بچھڑے ہوئے کی یاد میں آنسو نہیں بہانے لگتے ہو ؟

سچ کہو کیا ایک ہی موسم کی ہوائیں تمہیں جھولا نہیں جھلاتیں ؟ کیا ایک ہی فضا میں تمہاری مسیں نہیں بھیگتیں۔ کیا تم پر ایک ہی قسم کے باغوں میں ہوا کھا کر جوانی نہیں آتی۔ کیا تم ہندوستان ہی کی مہ جبینوں سے دل نہیں لگاتے۔ کیا ایک ہی سرزمین کے پھول تمہارے سہروں میں نہیں مہکتے۔ اور کیا ایک ہی دلفریب انداز سے تمہاری دلہنیں نہیں شرماتیں ؟

اے ہندو مسلمانو! حیران ہوں، جنون کی حد تک حیران ہوں کہ اس مکمل یک جہتی و یک رنگی، اور اس زبردست ظاہری و باطنی وحدت کے باوصف تم ایک دوسرے کو غیر کہتے ہو، دشمن سمجھتے ہو۔ ایک دوسرے کا خون بہاتے ہو!!

اے ہندیو! اے اپنی "آسمانی" کتابوں اپنے "اوتاروں" "دیوتاؤں" اور "پیغمبروں" کو رسوا کرنے والے دیندار بے دینو! اور دھرمی اَدھرمیو! تم احمق بھی ہو، مسخرے بھی، تم بدبخت بھی ہو، اور درندے بھی۔

تمہارے منہ سے اپنے بھائیوں کے کچے گوشت کی بو آ رہی ہے، تمہارے پنجے خون سے رنگین ہو رہے ہیں۔

تمہیں نظر نہیں آتا، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے پنجے کھلے ہوئے ہیں۔ آنکھیں نفرت سے ابلی ہوئی ہیں۔ تمہاری زبان بار بار باہر نکل پڑتی ہے۔ تمہارے جبڑے ہل رہے ہیں۔ تم غرّا رہے ہو۔ تمہارے دانت باہر نکلے ہوئے ہیں۔ اور تم بس اب حملہ کیا ہی چاہتے ہو۔

اے بہکے یا بہکائے ہوئے ہندوستانیو! میں پوچھتا ہوں تمہاری کھوپڑیوں کے اندر بھیجا ہے کہ پگھل گیا، تمہارے دماغی خلیوں میں رطوبت باقی ہے کہ خشک ہو چکی!

میں کیونکر، اور کن آگ اور بجلی سے بنے ہوئے الفاظ میں تم سے کہوں کہ اے ازار اور دھوتیوں کے رسیو! آگاہ ہو کہ تمہارے دماغ اندھیرے اور گہرے غاروں میں گر چکے ہیں، تمہاری عقلیں گندے نالوں میں بہتی پھر رہی ہیں، تمہاری ذہنیت کے عقاب، سڑی ہوئی مردار لاشوں پر منڈلا رہے ہیں تمہاری بصیرت جلتی ہوئی ناپاک ہڈیوں کے دھوئیں میں گردش کر رہی ہے، اور تمہارا ایمان شیطان کے سب سے زیادہ تاریک کارخانے میں مزدوری کرکے اپنا پیٹ پال رہا ہے۔

میں تمہاری کس کس بات پر ماتم کروں اے بدبخت ہندوؤ۔ اور اے بدقسمت مسلمانو! تم اپنے راہبروں، اور لیڈروں کو پہچانتے ہو؟ کیا یہی تمہارے لیڈر ہیں ؟ کیا سچے راہبروں کی صورتیں ایسی ہی نورانی ہوا کرتی ہیں ؟ کیا مخلص لیڈروں کے چہرے چوروں، ڈاکوؤں، قزاقوں اور غداروں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں ؟ اور کیا ان کے اعمال و اقوال یہی ہوا کرتے ہیں جو تمہارے لیڈروں کے ہیں ؟

ہوشیار ہو، ہوشیار! یہ سچے لیڈر اور حقیقی وطن پرست نہیں ہیں یہ تو ڈاکو "محافظ" راہزن "راہبر" شیطان "اوتار" اور کافر "پیغامبر" ہیں — اگر تمہاری عقلوں پر پتھر نہ پڑ گئے ہوتے تو کیا تم ان بھیڑیوں کو گلّے کا نگہبان بنا سکتے تھے ؟

بچو، بچو، اپنے کانوں کو ان کے لبوں سے دور رکھو۔ ان کے الفاظ بچھو، بھورے بچھو کے ڈنک ہیں۔ جو کانوں کے پردوں میں اس طرح اتر جاتے ہیں کہ دفعتہً کھوپڑی شق ہو جاتی ہے۔

دیکھو اے ہندوؤ اور مسلمانو! اب بھی امید باقی [illegible] نہیں چڑھا ہے، اب بھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے، [illegible]

آپس میں اس طرح شیر و شکر ہو جاؤ کہ سائنس کا کوئی آلہ تمہیں ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے اور دنیا کی کوئی ضرب تمہاری محبت کے بہتے ہوئے پاک دھارے کو چاٹ نہ سکے۔

اور اگر، شیطان کے کان بہرے، تنے نصیب اعدا، اپنی متحدہ قومیت کا آوازہ جلد تر بلند کر دیا تو دیکھو، آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھو، بلندیوں سے ایک آرا اترتا ہوا چلا آ رہا ہے، وہ تمہیں عنقریب یوں کاٹ دیگا کہ تم میں سے ہر شخص کی لاش دو برابر کے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اور چونکہ زندگی میں تم ایک جگر نہیں، دو جگر۔ جینے پر مُصر ہو۔ مرنے کے بعد دو نہیں، چار ہو جاؤ گے۔ آج بھائی سے نہیں ملتے ہو، کل خود سے بھی نہ مل سکو گے۔ تمہاری لاش کا آدھا ٹکڑا مشرق میں ہوگا، آدھا مغرب میں!

ہوشیار اے ہندو! خبردار اے مسلمان!!

ہو چکے ہیں شورے جبری فضا کے واسطے
جاگ اُٹھ، اب بھی سویرا ہے خدا کے واسطے !!!

استقلال

چٹانوں کو دیکھا ہے میں نے یہ اکثر
تھپیڑے سمندر کے کھاتی ہیں جم کر
پڑے غار پر غار، جسموں کے اُوپر
مگر تو بہ تو بہ سر کتا ہے لنگر؟

وہ جس طرح قدموں کو گاڑے کھڑی ہیں   اُسی طرح پانی کو پچھاڑے کھڑی ہیں

(آغا شاعر قزلباش)

تجدیدِ شوق

وہ ہمیں اور ہم انھیں کل راہ میں پا ہی گئے
آنکھ ملنی تھی کہ حسن و عشق شرما ہی گئے

دیکھ کر وارفتۂ جلوہ وہ گھبرا ہی گئے
لاکھ کترائے، بچے، ہم سامنے آ ہی گئے

بَن کے وہ طوفاں مرے احساس پر چھا ہی گئے
لاکھ روکا، آنکھ میں آنسو مگر آ ہی گئے

قصّۂ پارینۂ ماضی کو دُوہرا ہی گئے
کُفر تھا احساسِ غم لیکن وہ تھرا ہی گئے

دِل کا ہر زخمِ کُہن، رِسنے لگا بہنے لگا
رات وہ ذوقِ جراحت تازہ فرما ہی گئے

وہ ہوائے سرد وہ گھرا اندھیرا الاماں!
ہنس کے وہ تاریکیِ قسمت کو چمکا ہی گئے

وہ ہوا کی ژالہ باری وہ فضا کی کپکپی
وہ بہ ایں موسم تمنّاؤں کو گرما ہی گئے

دیکھکر تاریکیِ شامِ زوال و انقلاب
دن عروجِ عاشقی کے ہم کو یاد آ ہی گئے

ساغر (نظامی)

انکار

(میکش اکبرآبادی)

وجود خیرِ محض ہے۔ شر عدمِ اضافی کا نام ہے۔ عدمِ حقیقی لاشئے محض ہے اس لئے بحث و اعتبار سے بھی خارج ہے۔ وجود واحد ہے اور وحدت، وجود، حسن، حق، خیر ایک شئے کے مختلف نام ہیں۔ خیر اپنے مرتبۂ ظہور میں اقرار اور شر انکار کی خواہشمند ہے۔ تمام خوبیاں وحدت میں ہیں (الحمد للّٰہ) اور تمام برائیوں کا محل کثرت ہے۔ کثرت عدمِ اضافی ہے یعنی عدمِ وحدت کا نام کثرت ہے، اگرچہ کثرت ایک جہت سے ترکیبِ وحدت ہی کا نام ہے۔ مگر مرکز سے بُعد اور حقیقت سے دوری کی وجہ سے نامحمود ہے۔

مادی حُسن بھی وحدت ہی کا مظہر ہے حسن اس وحدتِ تناسب کا نام ہے جو اشیاء میں باہم پائی جاتی ہے۔ یہ نسبت غیر مادی ہے مختلف اعضا میں جو وحدتِ تناسب پائی جاتی ہے اس کا نام حُسنِ صورت ہے اور مختلف آوازوں میں جو وحدتِ تناسب پائی جاتی ہے اس کا نام نغمۂ دل کش ہے اور مختلف قویٰ و ملکات میں جو وحدتِ تناسب پائی جاتی ہے اس کو عدل کہتے ہیں۔ کلام کے مختلف اجزا میں جو وحدتِ تناسب ہے اس کو فصاحت کہتے ہیں۔

انکار دو قسم کا ہے ایک انکار اس عدمِ اضافی کا جو نتیجے کے طور پر وحدت کا اقرار ہے یہ انکار محمود ہے جیسے لا الٰہ الا اللّٰہ میں لا الٰہ۔

دوسرا انکار اس وحدت کا ہے جو صراحتاً کثرت یا شر کا اقرار ہے۔ یہ انکار مذموم ہے جیسے انکارِ حق۔

ہر جگہ معبود حق ہی ہے، طرزِ عبادت کا فرق ہے بچہ باپ کی عبادت تعمیلِ احکام سے کرتا ہے اور باپ بچے کی عبادت تکمیلِ ضروریات و پرورش کی صورت میں۔ ہوس پرست اپنی صورت کی پرستش تکمیلِ ہوا و ہوس کی صورت میں اور ایک عارف اپنی حقیقت کی پرستش ترکِ ماسوا کے عنوان سے، مگر ہر چیز اعتبارات سے اوصاف حاصل کرتی ہے اور اعمال کے نتائج ارادوں پر مترتب ہوتے ہیں۔ باطل بھی بحیثیت اثباتِ حق ہی ہے۔ لیکن وہ اپنے ظہور میں انکار کا خواہشمند ہے۔ انکار ہی اس کے حق کو ادا کرتا ہے۔ اس کا انکار دوسری جہت سے حق کا اثبات ہے۔ سانپ اپنے ظہور میں مارے جانے کا خواہشمند ہے اور گلا ہوا عضو کاٹے جانے کا۔

اسی طرح تشبیہ جہاں بھی ہے عبدیت کی مقتضی ہے اور تنزیہ جس مقام پر بھی ہے معبودیت کی مستحق۔ ہر شئے کا اس کے مقتضیات کے مطابق حق ادا کرنا یہی عبادت ہے۔ لہٰذا اقرار اور انکار دونوں ایک جگہ حق ہیں۔ اور دوسری جگہ باطل ایک جگہ ایمان ہیں اور دوسری جگہ کفر۔ ایک جگہ حُسن ہیں اور دوسری جگہ قبح۔

تشبیہہ پرستار ہے اور تنزیہہ معبود، آقا سے رُوگردانی کر کے غلام کے سامنے سر جھکانا گمراہی اور محرومی ہے۔ گمراہی اور ہدایت دونوں حقیقت ہی کے مظاہر ہیں مگر خاک سے پیاس نہیں بجھ سکتی۔ صفات اور نام اپنی خواہشات اور طبائع میں مجبور ہیں۔

وہ شخص جو آگ کی گرمی سے انکار کرتا ہے اور وہ شخص جو متکلمین کی طرح غیر متیقن ہے آگ سے یکساں جلتے ہیں۔ اعتبار و فہم سے حقائق تبدیل نہیں ہوتے۔ البتہ یہ اعتبار و فہم خود اپنا ایک مستقل اثر فہم کرنے والے میں چھوڑ جاتے ہیں۔

تمام مذاہب وحدت کو پیش کرتے رہے ہیں اور جو موانع کہ اس راہ میں حائل ہوتے ہیں یا حائل ہونے کا امکان اپنے میں رکھتے ہیں ان سے روکتے ہیں اس کلیہ میں استثنا نہیں ہے اس لئے وہ سب ایک ہیں اور اس لئے وہ سب حق ہیں،

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ۔

اس کے برعکس مذاہب باطل افتراق سے شروع ہوتے ہیں، اسی لئے اُن کی بنیاد سوءِ ظن پر ہے اُن کی ہستی اُن کا وجود، اور ان کا امتیاز بغیر کسی کو بُرا کہے اور جانے ہوئے قایم بھی نہیں ہو سکتی۔ مذاہبِ حق اپنی تعلیمات کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔ اور مذاہبِ باطلہ کی ساری ہستیں شخصیتوں اور افراد پر ختم ہو جاتی ہیں۔ مذاہبِ حق کے پیرو بھی جب تعلیمات سے رُوگردانی کر کے اشخاص کے پیچھے پڑ جاتے ہیں تو ان میں بھی اختلاف رونما ہو جاتا ہے۔ وہ اختلاف نہیں جس کی تہ میں تلاشِ حق یا اثباتِ حق ہو۔ بلکہ وہ اختلاف دوسروں کی توہین اور اپنی بڑائی پر مبنی ہوتا ہے۔

"آدمِ نو کا ترانۂ سفر"

فریب کھائے ہیں رنگ و بُو کے سراب کو پوجتا رہا ہوں،
مگر نتیجوں کی روشنی میں خود اپنی منزل پہ آرہا ہوں

جو دل کی گہرائیوں میں صبحِ ظہورِ آدم سے سو رہی تھیں،
میں اپنی فطرت کی اُن خداداد قوتوں کو جگا رہا ہوں

میں سانس لیتا ہوں ہر قدم پر کہ بوجھ بھاری ہے زندگی کا
ٹھہر ذرا گرمِ روز مانے! کہ میں ترے ساتھ آرہا ہوں

جہاز رانوں کو بھی تعجب ہے میرے اس عزمِ مطمئن پر
کہ آندھیاں چل رہی ہیں تند اور میں اپنی کشتی چلا رہا ہوں

طلسمِ فطرت بھی مسکراتا ہے میری افسوں طرازیوں پر
بہت سے جادو جگا چکا ہوں، بہت سے جادو جگا رہا ہوں

یہ مہرِ تاباں سے کوئی کہدے کہ اپنی کرنوں کو گن کے رکھ لے
میں اپنے صحرا کے ذرّے ذرّے کو خود چمکنا سکھا رہا ہوں

مرا تخیّل مرے ارادے کریں گے فطرت پہ حکمرانی
جہاں فرشتوں کے پر ہیں لرزاں میں اُس بلندی پہ جا رہا ہوں

یہ وہ گھروندے ہیں جن پہ اک دن پڑے گی "بنیادِ قصرِ جنت"
نہ سمجھیں "سکانِ بزمِ عصمت" کہ میں گھروندے بنا رہا ہوں

یہ ناز پروردگانِ ساحل، ڈریں مری سعیٔ گرم رَو سے
کہ میں سمندر کی تُند موجوں کو روندتا پاس آرہا ہوں

اِس انجمن میں ہر ایک دل پر فضا کی افسردگی ہے طاری
جمیلؔ مدفن کی خاموشی میں اپنی بنسی بجا رہا ہوں،

جمیل مظہری (کلکتہ)



ہندوستان کا افلاس
فی کس آمدنی

از عبدالرحیم شبلی (بی۔ کام)

یہ تو ایک مُسلّمہ امر ہے کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے۔ لیکن چونکہ "افلاس" یا "امارت" نسبتی اصطلاحیں ہیں۔ اور اُن کو جانچنے کے لئے مختلف ممالک کے لئے مختلف اصول برتنے پڑتے ہیں۔ اس لئے یہ معلوم کرنا کہ کن وجوہ کی بنا پر، اور کن پہلوؤں کے لحاظ سے، ہمارا ملک دوسرے ممالک کی نسبت زیادہ غریب ہے، ایک نہایت ہی پیچیدہ اور تحقیق طلب مسئلہ ہے۔

معاشی حالت کو پرکھنے کے ذرائع

بالعموم کسی ملک کی بے زری یا امارت کے پرکھنے کے لئے ہمارے پاس تین ذرائع ہیں۔

(۱) اس ملک کے انکم ٹیکس کے اعداد و شمار اکٹھا کئے جائیں۔ اگر حیثیتی ٹیکس دینے والے زیادہ ہوں تو وہ ملک امیر ہوگا ورنہ غریب۔

(۲) پیشوں کے لحاظ سے اعداد و شمار جمع کئے جائیں اور دیکھا جائے کہ کون سے پیشے ملک کی امارت یا فلاکت کے ذمہ وار ہیں۔

(۳) ملک کی مجموعی پیداوار کا مقابلہ آبادی سے کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ اُس کے لئے کافی ہے یا نہیں۔

لیکن شومیٔ قسمت سے ہندوستان میں ایسے اعداد و شمار کے جمع کرنے کرنے کا تا حال کوئی منظم طریقہ رائج نہیں ہوا ہے، جو اعداد و شمار حکومت کی طرف سے جمع کئے جاتے ہیں وہ بالکل ادھورے اور ملک کی اقتصادی حالت کا اندازہ کرنے کے لئے قطعی ناکافی ہوتے ہیں۔ مثلاً انکم ٹیکس کے اعداد و شمار صرف اُن لوگوں تک محدود ہوتے ہیں جن کی سالانہ آمدنی دو ہزار روپیہ یا اُس سے زائد ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ ہندوستان میں صرف معدودے چند ہیں اور لاکھوں باشندے ایسے باقی رہ جاتے ہیں جن کی آمدنی پچاس روپے سالانہ بھی نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہندوستان میں ہزارہا چھوٹے چھوٹے پیشے ہیں جن کے متعلق کوئی اعداد و شمار ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ پیداوار کے لحاظ سے زراعت اور کان کنی کے متعلق اعداد و شمار قدرے مکمل ہیں۔ لیکن گھریلو مصنوعات اور چھوٹے چھوٹے پیشوں کی مجموعی آمدنی اور یافت وغیرہ کے متعلق کوئی اعداد و شمار جمع نہیں کئے جاتے۔ اور نہ ایسا کرنا ممکن ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے باشندے ابھی تہذیب کی اس منزل تک نہیں پہونچے کہ وہ صحیح صحیح تفصیل کا علم اپنی گورنمنٹ کو پہنچا سکیں۔

اس مضمون کی تیاری میں میں نے مندرجہ ذیل کتابوں کی امداد لی ہے۔

(۱) انڈین اکونامک انکوائری کمیٹی رپورٹ ۱۹۲۵ء
(۲) پاورٹی اینڈ آن برٹش رول اِن انڈیا دادابھائی نیروجی۔
(۳) ویلتھ اینڈ ٹیکسیبل کیپیسٹی شاہ اینڈ کھباتا۔
(۴) پراسپرس انڈیا ڈگبی
(۵) انڈین اکنامکس جتھار اینڈ بیری
(۶) سائنس آف پبلک فنانس فنڈلے شیراز (۸) واڈیا اینڈ جوشی

مثلاً اگر آپ کسی زمیندار سے اُس کی صحیح آمدنی یا اُس کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں تو وہ زیادہ ٹیکس کے خوف سے اپنی صحیح پوزیشن واضح نہیں کرے گا۔

پس ہمارے پاس کوئی ایسے سائنٹیفک اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جن کے ذریعے سے ہم ہندوستان کی اقتصادی حالت کا صحیح اندازہ لگا سکیں۔ تاہم مختلف زمانوں میں مختلف مفکرین نے اپنی توجہ اس طرف مبذول کی ہے اور انھوں نے اپنی اپنی تحقیقات کے متعلق مختلف اندازے لگائے ہیں جن کا تذکرہ ہمارے لئے اس تحقیقات کے لئے ضروری ہے۔

دادا بھائی نیروجی کی تحقیقات

سب سے پہلی تحقیقات ۱۸۷۶ء میں مسٹر دادا بھائی نیروجی نے کی جو اُن کی کتاب الموسومہ "فلاکت" اور ہندوستان میں برطانوی راج" Poverty & British Rule in India میں درج ہے۔ مسٹر دادا بھائی نے جن اصول پر اپنی تحقیقات مرتب کی وہ اُن کے اپنے الفاظ میں یہ ہے۔

"میں نے ہر صوبہ کی ایک دو منتخب پیداواریں لی ہیں پھر ہر ضلع کا کل زیر کاشت رقبہ لے کر فی ایکڑ پیداوار نکالی ہے اور اشیاء کی قیمتیں لیکر کل زراعتی پیداوار کی اوسط قیمت معلوم کی ہے۔" (صفحہ ۳۱)

اس طریق سے اُن کا اندازہ ہے کہ کل زرعی پیداوار کی قیمت ستائیس کروڑ ستر لاکھ پونڈ ہوتی ہے جس میں سے اگر چھ فی صدی بیجوں وغیرہ کی قیمت نکال دی جائے تو خالص پیداوار کی مجموعی قیمت چھبیس کروڑ پونڈ رہ جاتی ہے۔ جو ایک معتدل موسم میں ایک سال کے لئے انسانی خوراک کے لئے ہمارے پاس موجود ہے پھر اگر اس میں ایک کروڑ ستر لاکھ پونڈ نمک، افیون، کوئلہ اور ضاعت کا نفع ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ مصنوعات کی قیمت اتنے ہی پونڈ دودھ، گوشت مچھلی اور حیوانات کی پیداوار کے اور تین کروڑ پونڈ اتفاقیہ پیداوار کے جمع کرلئے جائیں تو یہ کل آمدنی جس کو National Income یا اجتماعی آمدنی کہتے ہیں چونتیس کروڑ پونڈ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اگر ہم اس رقم کو سترہ کروڑ باشندوں کی آبادی پر (جو مسٹر دادا بھائی کے زمانے میں تھی) تقسیم کریں تو برطانوی ہند کے لئے فی کس چالیس شلنگ یا بیس روپیہ سالانہ آمدنی ہوتی جو ظاہر ہے کہ کس قدر قابل تاسف اور اندوہناک ہے۔

یہ بیس روپے بھی مسٹر دادا بھائی کا خیال ہے کہ تمام باشندگان ہند پر مساوی طور سے تقسیم نہیں ہوتے کسی کو زیادہ حصہ ملتا ہے اور کسی کو کم غرضکہ ہندوستان کے لوگ گویا یہ کہ وہ تعیش کی اشیاء استعمال کریں خالص ضروریات زندگی سے بھی بے نیاز ہیں۔

فلاکت کے کرشمے

بعض لوگوں نے اس نتیجے کے خلاف یہ اعتراض کیا ہے کہ ہندوستان کے لوگ چونکہ زندہ و موجود ہیں اس لئے اُن کی خالص ضروریات زندگی ضرور پوری ہو جاتی ہوں گی۔ لیکن مسٹر دادا بھائی نے اس اعتراض کا یوں جواب دیا کہ جب لوگوں کی سالانہ آمدنی سارے سال کی ضروریات کے لئے مکتفی نہیں ہوتی تو وہ ملک کی اساسی دولت کے ذریعے سے اپنی ضروریات پورا کرتے ہیں اس سے ملک روز بروز قلاش ہو رہا ہے اور پیداوار کی قابلیت بھی کم سے کمتر ہو رہی ہے مطلب یہ کہ چونکہ ہندوستان کے لوگ زیادہ تر زراعت پیشہ ہیں اس لئے جب اُن کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو وہ اپنی زمینیں بیچنا شروع کر دیتے ہیں جو بہر حال قومی نقصان ہے اور پیداوار کے لئے ضرر رساں۔ پھر جو دیہاتی مقروضات جمع ہو گئے ہیں وہ بھی اسی فلاکت کے کرشمے ہیں۔

۱۸۷۵ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان بہت سے محققین نے ہندوستان کی فلاکت کا اندازہ لگایا جس کا مختصر طور پر تذکرہ ناکافی ہوگا۔

بیرنگ و باربر کا اندازہ

۱۸۸۲ء میں ارل کرومر (جو اُس وقت میجر ایولین بیرنگ تھا) اور سر (اُس وقت مسٹر) ڈیوڈ باربر نے جو تحقیقات کی اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُن کے نزدیک ہندوستان کی زرعی آمدنی تین ارب پچاس کروڑ روپیہ اور غیر زرعی آمدنی ایک ارب پچھتر کروڑ روپیہ تھی۔ گویا ہندوستان کی کل قومی آمدنی پانچ ارب پچیس کروڑ روپیہ ہوئی جو اگر اُس وقت کی اُنیس کروڑ پینتالیس لاکھ اُنتالیس ہزار لوگوں کی آبادی پر تقسیم کر دی جائے تو فی کس آمدنی ستائیس روپیہ ہوتی ہے۔

ڈگبی اور لارڈ کرزن

ڈگبی کے تخمینے سے ۱۸۹۸-۹۹ء میں ہندوستان کی زرعی آمدنی دو ارب

پچاسی کروڑ روپیہ تھی اور غیر زرعی آمدنی ایک ارب تینتالیس کروڑ روپیہ۔ گویا کل آمدنی چار ارب اٹھائیس کروڑ روپیہ تھی جو اگر سنہ ۱۹۰۱ء کی تئیس کروڑ آبادی پر تقسیم کر دی جائے تو فی کس آمدنی قریباً اٹھارہ روپیہ آٹھ آنے ہوتی ہے۔

لارڈ کرزن نے جو اُس وقت وائسرائے ہند تھا ان تمام بیانات کی تردید ایک علیحدہ تحقیقاتی کمیشن کے ذریعہ سے کرنی چاہی جو سنہ ۱۸۹۹ء میں قحط کی تحقیقات کرنے کے لئے بیٹھا تھا۔ اور جو فیمن کمیشن سنہ ۱۸۹۸ء کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس نے ثابت کیا کہ ہندوستان کی زرعی آمدنی چار ارب اسی کروڑ روپیہ سالانہ سے کم نہیں ہے۔ اس لئے سنہ ۱۹۰۰ء میں فی کس آمدنی بیس روپیہ ہونی چاہئے۔ جو سنہ ۱۸۸۲ء سے بقدر دو روپیہ زیادہ ہے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ غیر زرعی آمدنی بھی اسی نسبت سے بڑھی ہے تو سنہ ۱۹۰۱ء میں ہندوستان کی فی کس آمدنی تیس روپیہ ہونی چاہیئے۔ جو سنہ ۱۸۸۰ء کے مقابلے میں بقدر تین روپیہ زیادہ ہے لارڈ کرزن نے لکھا ہے کہ اگرچہ یہ ترقی کوئی قابلِ تشکر یا قابلِ ستائش نہیں ہے تاہم ترقی روز افزوں ہے۔ ترقی معکوس نہیں۔

ڈگبی نے اس کا جواب پھر ایک نئی تحقیقات کی بنا پر دیا جس کی رُو سے ہندوستان کی فی کس آمدنی سترہ روپے چار آنے ہوتی تھی۔ اور کہا کہ لارڈ کرزن نے خوش خیالی کا پہلو اختیار کیا ہے۔

فروری سنہ ۱۹۲۱ء میں آنریبل ای۔ ایم کک نے کونسل آف اسٹیٹ میں یہ بیان دیا کہ اگر ہم سنہ ۱۸۸۲ء اور سنہ ۱۹۰۱ء کی تحقیقات کو صحیح تسلیم کر لیں تو سنہ ۱۹۱۱ء میں فی کس آمدنی پچاس روپیہ تک بڑھ گئی تھی۔ لیکن اگر زیادہ سائنٹیفک طریق اختیار کیا جائے تو آمدنی اسی روپیہ سالانہ ہوتی ہے۔

(منقول از پلانی مصالہ)

وادیا اور جوشی کا تخمینہ

ان کے بعد سنہ ۱۹۱۳ء میں وادیا اور جوشی کی تحقیقات آتی ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

زرعی پیداوار	۸۵۸،۳۹،۹۴،۶۲۶
کان کنی	۱۱،۵۲،۷۹،۰۰۰
متفرق پیداوار اور صنائعین کی آمدنی	۱۵۴،۳۹،۵۸،۷۵۰
آمدنی از حیوانات	۱۴۵،۱۰،۳۲،۶۳۴
مصنوعات	۴۰،۹۵،۳۴،۰۰۰
	۱،۲۱۰،۲۷،۹۷،۰۱۰

اس بارہ ارب دس کروڑ کی آمدنی سے وہ اس رقم کو نکال دیتے ہیں جو ہمیں بطور اخراجات غیر ملکی Home Charges. (از قسم پنشن یافتہ افسروں کی تنخواہیں غیر ملکی سرمایہ اخراجات انڈیا آفس وغیرہ) انگلستان بھیجنے پڑتے ہیں۔ اگر یہ رقم بارہ کروڑ بھی فرض کر لی جائے تو ہماری خالص آمدنی دس ارب ستاسی کروڑ روپیہ رہ جاتی ہے اگر اس آمدنی کو چوبیس کروڑ لوگوں کی آبادی پر تقسیم کیا جائے تو فی کس آمدنی چوالیس روپیہ پانچ آنہ چھ پائی ہوتی ہے۔

کے ٹی شاہ کی تحقیقات

اسی طرح مسٹر کے ٹی شاہ اور کھمبٹا کے اندازے ہیں جو سنہ ۱۹۰۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۲۲ء تک اپنی تحقیقات کا خلاصہ یوں بیان کرتے ہیں۔

سنہ ۱۹۰۰ء سے لیکر سنہ ۱۹۱۴ء تک فی کس آمدنی ۳۶ روپیہ
سنہ ۱۹۱۴ء " سنہ ۱۹۲۲ء " " ۵۸ ۱/۲ "
سنہ ۱۹۰۰ء " سنہ ۱۹۲۲ء " " ۴۴ ۱/۳ "
سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۲۲ء میں " ۷۴ "

اس آمدنی سے مصنفین نے بطور اخراجاتِ غیر ملکی وغیرہ بہت سی رقم منہا کی ہے اور اُن کا اندازہ ہے کہ یہ رقم سات روپیہ فی کس ہوتی ہے۔ اس لئے سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء میں ہندوستان کی فی کس آمدنی سرسٹھ روپیہ تھی۔

فنڈلے شیراز

سب سے تازہ اندازہ مسٹر فنڈلے شیراز کا ہے جس نے سنہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کی فی کس آمدنی ۱۰۰ روپیہ اور سنہ ۱۹۲۲ء میں ۱۱۶ روپیہ قرار دی تھی۔ مسٹر شیراز نے اپنے اندازے میں غیر زرعی آمدنی بیجوں وغیرہ کی قیمت لگائے بغیر درج کی ہے جو گزشتہ تحقیقات سے مختلف طریقہ ہے۔ دوسرے اُس نے کئی نئے پیشے غیر زرعی آمدنی میں شامل کر لئے ہیں۔ اِس لئے اُس کا اندازہ غیر معمولی طور پر اونچا ہے۔

*

خلاصۂ بیانات

اب ہم قارئین کی سہولت کے لئے تمام تحقیقات کا خلاصہ پیش کئے دیتا ہوں تاکہ بیک نظر جانچا جاسکے کہ مختلف زمانوں میں مختلف مفکرین نے کیا اندازے لگائے ہیں۔

اندازہ کنندگان	سن عیسوی	آمدنی فی کس
دادا بھائی نوروجی	۱۸۷۰ء	بیس روپے
بیرنگ باربر	۱۸۸۲ء	ستائیس روپے
ڈگبی	۱۸۹۸-۹ء	اٹھارہ روپے ۹ آنے
لارڈ کرزن	۱۹۰۰-۱ء	تیس روپے
واڈیا جوشی	۱۹۱۳-۱۴ء	چوالیس روپیہ ۵ آنہ ۶ پائی
شاہ و کھمباتا	۱۹۲۱-۲۲ء	ستاسٹھ روپے
فنڈلے شیراز	۱۹۲۱	ایک سو سات روپیہ
فنڈلے شیراز	۱۹۲۲ء	ایک سو سولہ روپے

حکمی فیصلے کے لئے تحفظات

ان مختلف اندازوں سے ملک کی اقتصادی حالت کا جائزہ لینے کے لئے بہت سی احتیاطوں کی ضرورت ہے ورنہ بہت ممکن ہے کہ نتیجہ غلط ہو جائے۔

(۱) سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ اندازے مختلف زمانوں اور مختلف تاریخوں کے ہیں۔ اس لئے اس عرصے کی قیمتوں کا فرق معلوم کرنا بھی اشد ضروری ہے۔

مثلاً یہ کہنا سخت غلطی ہوگی کہ ۱۸۷۰ء کے لوگ ۱۹۲۲ء کے لوگوں سے غریب تھے۔ کیونکہ اُس زمانے کی قیمتیں بھی اِس زمانے سے اِتنی فیصدی کم تھیں۔

(۲) ہر محقق نے اپنی تحقیقات کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں مثلاً کسی نے برطانوی ہند کا رقبہ ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور کسی نے ہندوستانی ریاستیں بھی شامل کرلی ہیں۔ کسی نے غیر زرعی آمدنی سے بیجوں وغیرہ کی قیمت منہا کی ہے اور کسی نے نہیں کی ہے۔ پھر کسی نے غیر زرعی پیشوں میں ادنیٰ ملازمین کو شامل کیا ہے اور کسی نے نہیں کیا ہے۔ پس ہمیں صحیح اندازہ تک پہنچنے کے لئے ان تمام باتوں کا خیال رکھنا پڑے گا۔

(۳) اگر ہمیں فی کس آمدنی معلوم بھی ہو جائے تو پھر بھی ہم ملک کی خوشحالی یا پستی کے متعلق کوئی قطعی حکم نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ خصوصاً ہندوستان کے بارے میں ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ فی کس آمدنی کے جزئیات کیا ہیں اور اُن میں کمانے والی اشیاء کا کیا حصہ تھا۔

(۴) پھر ان تحقیقات کے متعلق یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ہر شخص کے تعصبات اور خاص مقاصد ہوتے ہیں جن کو لیکر وہ تحقیقات کرتا ہے۔ اور بعض ایک ماہر اعداد و شمار ہندسوں سے ہر کوئی اپنا برا بھلا مسئلہ ثابت کرسکتا ہے مثلاً اگر اُس وقت تحقیقات کی جائے جب قیمتیں گر رہی تھیں تو قدرتی طور پر ملک کی زبوں حالی ثابت کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اگر تحقیقات چڑھتی ہوئی قیمتوں کے زمانے میں کی جائے تو ملک غیر معمولی طور پر خوش حال ثابت کیا جاسکتا ہے۔

ایک انگریز کی یہی خواہش ہوگی کہ عہدِ سلف تاریک نظر آئے۔ اور موجودہ ایک نہایت روشن زمانہ ثابت ہو۔ پس ہمیں کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنے سے پہلے ان تمام باتوں کا بدرجۂ اتم خیال رکھنا پڑے گا۔

غیر مساوی تقسیمِ دولت

باوجودیکہ یہ سب تخمینے مختلف ہیں لیکن ایک بات جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا وہ یہ ہے کہ ہندوستان کے اکثر لوگ ضروریاتِ زندگی پورا کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ اگر ہم فنڈلے شیراز کا سب سے بڑا اندازہ بھی لے لیں تو بھی فی کس پانچ آنے روز کی آمدنی ثابت ہوتی ہے جس میں سے ایک اوسط درجے کے آدمی کو نہ صرف اپنی ضروریاتِ زندگی پورا کرنا ہوتی ہیں۔ بلکہ اپنے بیوی بچوں اور دوسرے متعلقین کا پیٹ بھی پالنا ہوتا ہے۔ پھر اسی میں سے کپڑے بنوانے ہوتے ہیں اور مکان پر بھی خرچ کرنا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ پانچ آنے بھی روزانہ ہر ایک کو نہیں ملتے جو بڑے بڑے زمیندار ہیں یا تاجر اور صناع اُن کو چھ آنے بھی روزانہ مل جاتے ہیں لیکن غریب مزدوروں کو تین آنے روزانہ بھی بعض اوقات دستیاب نہیں ہوتے۔ چنانچہ مسٹر شاہ

---

[1] منقول از انڈین اکونامکس مصنفہ جتھار اینڈ بیری جلد دوم صفحہ ۱۶۴

اور کمبا تا نے اندازہ لگایا ہے کہ ہندوستان میں دولت از حد غیر مساوی طور پر منقسم ہے۔ اُن کی تحقیقات کے مطابق اعداد و شمار مندرجہ ذیل ہیں۔

چھ ہزار باشندے جن کی سالانہ اوسط آمدنی ایک لاکھ روپیہ فی کس سے صرف تیس ہزار آدمیوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

دو لاکھ ستر ہزار باشندے جن کی سالانہ آمدنی پانچ ہزار روپیہ فی کس ہے تیرہ لاکھ پچاس ہزار آدمیوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

پچیس لاکھ باشندے جن کی سالانہ آمدنی صرف ایک ہزار روپیہ فی کس ہے بارہ کروڑ پانچ لاکھ آدمیوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

تین کروڑ پچاس لاکھ باشندے جن کی سالانہ آمدنی صرف دوسو روپیہ فی کس ہے دس کروڑ آدمیوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

باقی باشندے جن کی فی کس آمدنی پچاس روپیہ سالانہ سے زیادہ نہیں۔ بقیہ تمام آبادی کا پیٹ پالتے ہیں۔

دوسرے معنوں میں جتنی جتنی فی کس آمدنی کم ہوتی چلی جاتی ہے متوسلین اور متعلقین کا وجود زیادہ سے زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر یہ آمدنی بھی مساوی طور پر حصے میں نہیں آتی۔ بلکہ ملکی دولت کا قریباً ایک تہائی حصہ صرف ایک فی صدی حصۂ آبادی استعمال کرتا ہے یا اگر اُن کے متوسلین کو بھی شامل کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ پانچ فی صدی حصۂ آبادی ایک تہائی حصۂ دولت کو اپنے استعمال میں لاتا ہے۔ اور دوسرا تہائی حصہ آبادی کے پینتیس فی صدی لوگوں کے درمیان تقسیم ہوتا ہے۔ دولت کی بقیہ تہائی آبادی کے ساٹھ فی صدی لوگ استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں آبادی کا قریباً دو تہائی حصہ "ملعون" ہو کر ہندوستان میں بسا جاتا ہے اور صرف ایک تہائی حصہ "جنتی" قرار دیا جاتا ہے۔

بین الاقوامی موازنہ

اگر ہم ہندوستان کی فی کس آمدنی کا مقابلہ دیگر ممالک کی آمدنی سے کریں تو ہماری نا امیدی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن ایسا کرنے میں بہت سی باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً مختلف ممالک کی قیمتوں اور معیارِ زندگی میں فرق ہے جن کا مقابلے کے وقت خیال رکھنا چاہیئے۔ اگر ہندوستان کی فی کس آمدنی انگلستان سے کم ہے تو یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہندوستانیوں کا معیارِ زندگی بہت پست ہے اس لئے اُسی آمدنی میں اُن کے اخراجات پورے ہو سکتے ہیں۔ مگر اِن سب باتوں کا خیال رکھتے ہوئے بھی اگر ہم مختلف ممالک کی فی کس آمدنیوں کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان اِس معاملے میں سب سے زیادہ بدقسمت مُلک ہے۔

۱۹۱۴ء میں مختلف ممالک کی فی کس آمدنیاں مندرجہ ذیل تھیں۔[۱]

نام ملک	فی کس آمدنی ۱۹۱۴ء	
امریکہ متحدہ	۷۲	پونڈ
انگلستان	۵۰	〃
آسٹریلیا	۵۴	〃
کینیڈا	۴۰	〃
فرانس	۳۸	〃
جرمنی	۳۰	〃
اطالیہ	۲۲	〃
ہسپانیہ	۱۱	〃
جاپان	۶	〃
ہندوستان	۳	〃

۱۹۱۹ء میں مختلف ممالک کی فی کس آمدنی مندرجہ ذیل تھی۔[۲]

نام ملک	آمدنی فی کس (ڈالروں میں)	
امریکہ متحدہ	۵۶۱	ڈالر
برطانیہ عظمیٰ	۳۴۷	〃
فرانس	۳۰۰	〃
رُوس	۴۰	〃
اطالیہ	۲۰۸	〃
جاپان	۴۶	〃
پرتگال	۸۳	〃
یونان	۱۳	〃
رُومانیہ	۱۳	〃
جرمنی	۱۵۴	〃
آسٹریا ہنگری	۹۴	〃
بلگیریا	۸۴	〃

[۱] ووزا اسٹمپ بمنقول از مقاماتِ ہندبری [۲] معیارِ زندگی مصنفہ کرسیل بمنقول از جنتی راجیشوری

ٹرکی	۴۲	ڈالر
ہندوستان (مطابق شاہ اور کھمباتا)	۲۳	" (تقریباً)

۱۹۲۳ء میں امریکہ متحدہ کی آمدنی ۱۹۲۵ روپے فی کس تھی اور برطانیہ کی ایک ہزار روپیہ۔ آسٹریلیا اور کنیڈا کی ۵۰۰ روپیہ اور ہندوستان کی سب سے زیادہ اندازہ لگانے والے یعنی فنڈلے شیراز کے مطابق ۱۰۷ روپیہ سے زیادہ نہ تھی۔

کیا افلاس دُور ہو رہا ہے

اعداد و شمار کی رُو سے ہم یہ ثابت کرچکے ہیں کہ ہندوستان ایک بے حد غریب ملک ہے اور مالی طور پر اُس کی بین الاقوامی حیثیت نہایت کمزور بنیادوں پر کھڑی ہے۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ آیا اُس کی یہ غربت نئے زمانہ کی پیداوار ہے یا وہ ہمیشہ اسی طرح غریب چلا آرہا ہے۔ واڈیا اور جوشی جیسے معاشیین کا خیال ہے کہ ۱۸۶۰ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان لوگوں کی حالت بالکل یکساں رہی ہے اور اُس میں سر مو تجاوز نہیں ہوا۔ لیکن سرکاری بیان یہ ہے کہ اس عرصہ میں لوگوں کی معاشی حالت غیر معمولی طور پر روز افزوں رہی ہے چنانچہ "گذشتہ پچاس برس میں ہندوستانی نظامِ حکومت کے نتائج" میں لکھا ہے[1]:

"جس حد تک عام نشانیوں کا تعلق ہے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اوسط درجہ کا زمیندار۔ مزارع۔ تاجر یا صناع گزشتہ پچاس برس سے کہیں زیادہ خوش حال ہے۔ اُس کی نمک کی خوراک زیادہ ہوگئی ہے۔ چینی کی زیادہ ہوگئی ہے۔ تمباکو کی زیادہ ہوگئی ہے اور درآمدہ تعیش اور آسائش کی چیزوں کو وہ اپنی پہلی پشت سے کہیں زیادہ استعمال کرتا ہے جن مقامات پر مختلف گھرانوں کے متعلق تحقیقات کی گئی ہے اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اوسط درجہ کا دیہاتی اپنے آباؤ اجداد سے زیادہ خوراک کھاتا ہے۔ اور اُن سے بہتر گھر میں مکین ہے۔ مٹی کے بدنما برتنوں کی جگہ پیتل، تانبے اور دیگر دھاتوں کے برتنوں نے لے لی ہے۔ اور اس کے خاندان کے پاس پہلے سے زیادہ کپڑے اور پارچات ہیں۔"

اس بیان کی صداقت کو کئی غیر سرکاری مفکرین نے اپنی دلائل کی رُو سے رد کیا ہے۔ اور اُن کے نزدیک یہ بیان بعض جزئیات کے لحاظ سے بالکل غیر مصدقہ ہے۔ مثلاً اُن کا خیال ہے کہ یہ بات ایک اوسط درجہ کا دیہاتی اپنے آباؤ اجداد سے زیادہ کھاتا ہے بالکل واقعیت پر مبنی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ تعداد کے لحاظ سے اشیاء زیادہ استعمال کرتا ہوگا لیکن اُس کی خوراک کا معیار ابھی تک وہی دیرینہ ہے بلکہ بعض حالات میں بالکل گر گیا ہے۔ مثلاً پہلے وہ دودھ گھی اور مکھن وغیرہ بکثرت استعمال کیا کرتا تھا لیکن اب نفع حاصل کرنے کے شوق میں (جو ہم سمجھتے ہیں کہ مجبوری پر مبنی ہے) اُس نے ان اشیا کی فروخت کرنا شروع کردی ہے۔ اور اس سے اُس کی صحت پر بُرا اثر پڑ رہا ہے۔

دیگر ممالک سے مقابلہ

اگر ہم سرکاری بیان کو صحیح بھی تسلیم کرلیں تو بھی یہ قابلِ تصفیہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ آیا یہ ترقی دیگر ممالک کی حیرت انگیز خوش حالی سے مقابلہ کرسکتی ہے؟

دوسرے ملکوں میں افلاس (جس سے ہماری مراد وہ افلاس ہے جو انسان کو خطرناک جرائم کا مرتکب ہونے کے لئے مجبور کرتا ہے) بہت حد تک دُور ہوگیا ہے۔ غربت اور بیماری کی وجہ سے جو اموات ہوا کرتی تھیں اُن کی شرح میں خاطر خواہ کمی واقع ہوگئی ہے۔ مزدوروں کے معاوضہ میں گراں قدر اضافہ ہو چکا ہے۔ اوقاتِ کار کم ہوگئے ہیں۔ تعلیم و تربیت کی اشاعت پہلے سے زیادہ ہے۔ تفریح کے سامان لوگوں کو زیادہ میسّر ہیں اور وہ پہلے سے بہتر گھروں میں مکین اور پُر فضا شہروں میں آباد ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ صحیح طور پر زندگی کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔ لیکن کیا ہندوستان میں ابھی ان ترقیات کی بُو بھی آئی ہے؟ کیا حکومت نے ان مسائل میں سے کسی کو بھی درخورِ اعتنار سمجھا ہے؟ اور کیا وہ دل و جان سے لوگوں کی بہتری اور بہبودی کے لئے کوششیں عمل میں لارہی ہے؟ میں یہ نہیں کہتا کہ حکومت نے اس بارے میں کچھ بھی نہیں کیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اُس کی کوششیں وہی نتیجہ پیدا کررہی ہیں جو امریکہ میں روزولٹ کی، روس میں جوزف اسٹالین کی۔ اطالیہ میں مسولینی کی۔ جرمنی میں ہٹلر کی اور ترکیہ جمہوریہ میں مصطفیٰ کمال پاشا کی پیدا کر رہی ہیں؟

افلاس کی انتہا

ہمارا سر ندامت سے جھک جاتا ہے اور ہماری اُمید یکسر نا امیدی اور یاس سے بدل جاتی ہے جب ہم ان تمام سوالوں کا جواب صرف نفی میں پاتے ہیں۔

[1] پنجاب جرنل آف کامرس اینڈ اکنامکس ۔ ۲ وغیرہ

ہندوستان میں کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو دو وقت کھانا برابر مل جاتا ہے؟ کتنے ہیں جن کو محنت کم کرنا پڑتی ہے اور معاوضہ زیادہ مل جاتا ہے؟ کتنے ہیں جو آرام و آسائش سے ایک قابلِ رہائش مکان میں زندگی بسر کرتے ہیں؟ کتنے ہیں جن کو رفتارِ واقعات کا علم ہوتا رہتا ہے؟ کتنے ہیں جو باحت اور خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں؟

ناظرین یہ سُن کر حیران نہ ہوں کہ ہندوستان میں صرف دس فی صدی لوگ دونوں وقت کھانا کھاتے ہیں۔ باقی سب نانِ شبینہ کے بھی محتاج ہیں۔

صرف سات فی صدی تعلیم یافتہ طبقہ ہے اور ان میں سے بھی اکثر صرف الف بے ہی جانتے ہیں باقی سب جاہل اور علومِ جدیدہ سے بے خبر ہیں۔

شرحِ اموات کا یہ حال ہے کہ دنیا کے کسی حصّہ میں اس قدر اموات نہیں ہوتیں جتنی کہ یہاں ہوتی ہیں۔ محنت و مزدوری کا معاوضہ شاید دنیا بھر میں سب سے کم ہے۔ رہائش کا یہ عالم ہے کہ ایک انگریز سیاح کے الفاظ میں "یہاں کے مکانوں میں ایک یورپین اپنے جانور بھی رکھنا پسند نہیں کرے گا"۔

ان باتوں کے باوجود کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی حالت پہلے سے بہتر ہو رہی ہے؟

جس ملک کی آبادی خوراک کی نسبت زیادہ ترقی کر رہی ہو جس ملک میں بیماریوں اور وباؤں کا یہ حال ہو کہ ایک یورپین مفکر کے الفاظ میں لوگ کتوں اور مکھیوں کی طرح مرتے ہوں۔ جس ملک کے لوگ ۱۸-۱۸ گھنٹے روزانہ محنت کرتے ہوں اور پھر اُن کی مزدوری دس آنہ سے زیادہ نہ بڑھتی ہو۔ کیا وہ ملک امیر ہے۔ کیا وہ تمدن و عمرانیت کے لحاظ سے مہذب ممالک میں شمار ہو سکتا ہے؟

اعداد و شمار کا فقدان

ان تمام باتوں سے جو چیز زیادہ اندوہناک اور قابلِ تاسف ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایسے ٹھوس اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جن کے سہارے پر ہم اپنے دعوے کی بنیاد رکھ سکیں!

مختلف تحقیقات اور اپنے مشاہدہ کی بناء پر جو ہم کہہ سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان ایک انتہا درجہ غریب ملک ہے اور اس کے ثبوت میں ہم اس کے منکرین کو صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنی آنکھیں کھولو اور مشاہدہ کر لو۔ اعداد و شمار کا اس صاف اور بیّن بات کے ثبوت کے لئے پیش کرنا محض سورج کو چراغ دکھانا ہے[1]۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں اعداد و شمار کو جمع کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ایک تو ملک کی وسعت اس بارہ میں سخت حارج ہے۔ دوسرے آبادی زیادہ تر مختلف دیہاتوں میں پھیلی ہوئی ہے اور ایک جگہ چند شہروں اور قصبوں میں موجود نہیں ہے۔ تیسرے لوگ اس قدر جاہل اور علومِ جدیدہ سے ناواقف ہیں کہ برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک کی طرح یہاں تحریری سوالات سے کام نہیں بنتا۔ اُن ممالک میں تو یہ ہوتا ہے کہ تحریری سوالات مختلف اداروں اور لوگوں کو بھجوا دئے جاتے ہیں جن کے جواب اُن کو فی الفور مہیا ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہاں اس کام کی قدر و منزلت سمجھانے کے لئے بھی ایک عرصہ درکار ہے۔ چوتھے یہاں کے کاموں اور پیشوں میں کوئی تنظیم نہیں ہے جس کے ذریعہ سے ہم مختلف لوگوں کی معاشی حالت کا اندازہ لگا سکیں۔

اقتصادی تحقیقات کے ذرائع

لیکن ان سب باتوں کے باوجود "انڈین اکونامک کمیٹی رپورٹ" میں پروفیسر بونٹ ہرسٹ اور دیگر مفکرین کی طرف سے بعض ایسی مفید تجاویز کی گئی ہیں جن کو ہندوستان کے اعداد و شمار جمع کرنے کے لئے کافی حد تک زیرِ عمل لایا جا سکتا ہے۔ مثلاً رپورٹ کا خیال ہے کہ اگرچہ اجتماعی دولت اور آمدنی وغیرہ کے اندازے لگانے کا بھی اپنی جگہ پر فائدہ ضرور ہے لیکن کئی دوسرے طریقے بھی ہیں جن کے ذریعہ معاشی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً "معیارِ زندگی" ایک اہم ذریعہ ہے جس کو ہم استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اس کے لئے ہمیں وقتاً فوقتاً مختلف گھرانوں کے میزانئے معلوم کرنے چاہئیں۔ پھر کئی قسم کی مقامی اور خاص تفتیشیں ہیں جو ہم گھریلو مصنوعات، مزدور پیشہ لوگوں کی اقتصادی حالت۔ دیہاتی مقروضات اور صنعتی علاقہ جات کی حالتِ عمومی وغیرہ کے متعلق کر سکتے ہیں۔ بعض خاص دیہاتوں اور شہروں کے متعلق تفصیلی معلومات کا حاصل کرنا بھی مفید رہے گا۔ کیونکہ ان سے بعض اہم اور ضروری امور پر روشنی پڑتی ہے۔

اعداد و شمار جمع کرنے کے لئے کمیٹی نے کئی سفارشیں کی ہیں جن کا خلاصہ میں یہاں درج کر دیتا ہوں۔

---

[1] جیتھرا اینڈ بیری جلد دوم

(۱) ہر سال زراعتی پیداوار کے اعداد و شمار جمع کئے جائیں اور اُن پر ایک سالانہ تبصرہ کیا جائے۔

(۲) صنعتی پیداوار کی بھی ایک تفصیلی تفتیش ہر پانچ سال کے بعد کی جائے۔

(۳) تمام اعداد و شمار کا کام ایک مرکزی مجلس کے سپرد کیا جائے۔ تاکہ مقصد میں ہم رنگی اور یکسانیت پیدا ہو۔

(۴) ہر صوبہ میں ایک صوبجاتی دائرۂ اعداد و شمار قایم کیا جائے جس کا تعلق ایک مرکزی دائرۂ اعداد و شمار سے ہو تاکہ سب دریافت کردہ مسائل ایک صدر مقام پر جمع ہوتے رہیں۔

[illegible]ء میں حکومت کی طرف سے انگلستان کے دو مشہور ماہرین اعداد و شمار ہندوستان میں آئے تھے جن کا مقصد یہ بتایا گیا کہ وہ اعداد و شمار جمع کرنے کی ممکنات کا جائزہ لیں۔ اب انتظار ہے کہ حکومت اُن کی سفارشات پر کوئی عملی کارروائی کرے۔

افلاس کے اسباب

ہندوستان کے افلاس کا مسئلہ نہایت پیچیدہ اور ادق ہے اس لئے اُس کی وجوہات بھی اس قدر پیچیدہ ہیں کہ ہم ان کا تجزیہ نہیں کرسکتے۔ تاہم موٹی موٹی وجوہات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) مذہبی اور معاشرتی رسومات جن کی وجہ سے لوگوں کا نظریہ مادی ترقی کی طرف سے متشائم ہو گیا ہے۔ مثلاً تَرکُ بالدُّنیا اور ترکِ بالذّات کے مسائل لوگوں کو دنیا سے بے پرواہ کر دینے کے ذمہ دار ہیں اور وہ عاقبت کے سہانے خوابوں کے تصور میں اس قدر مستغرق ہیں کہ اُن کو دنیاوی خوش حالی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ پھر معاشرتی رسومات ہیں صغر سنی کی شادی۔ پردہ (جو میرے نزدیک حجاب اور شرم سے بالکل مختلف ہے) ذات پات۔ قوانین وراثت۔ اشتراکِ خاندانی۔ وغیرہ جو سوسائٹی کی بیخ کنی کر رہی ہیں۔ اور جن کا ایک تفصیلی تذکرہ ایک علیحدہ مضمون میں آئے گا۔

(۲) ہندوستان کے جملہ اقتصادی شعبہ جات مثلاً زراعت، صنعت، حفظانِ صحت۔ مالیات۔ بنکنگ وغیرہ سب غیر ترقی یافتہ ہیں۔ اس لئے پیداوار آبادی کی نسبت کم ہے جس کی وجہ سے تقسیم دولت غیر مساوی ہے اور ہندوستان کے لوگ غریب ہیں۔

(۳) حکومت کا نقطۂ نظر ہندوستان کی طرف کوئی ہمدردانہ اور ملکی نہیں ہے جس کی وجہ سے ملک ابھی اُس جادۂ ترقی پر گامزن نہیں ہو سکا جس پر کہ دیگر ممالک مثلاً روس۔ امریکہ اور جاپان وغیرہ ہیں۔ ہندوستان کو ہر سال کروڑوں روپیہ صرف پنشن یافتہ افسروں اور وائٹ ہال کی جیبوں کو گرم کرنے کے لئے بھیجنا پڑتا ہے۔ جو اگر محض ملک کے اندر صرف ہو تو ہماری دولت میں گرانقدر اضافہ ہو سکتا ہے۔

(۴) ہندوستان کا طریقۂ تعلیم نہایت ناقص ہے اور ایک گریجویٹ جب اپنی یونیورسٹی سے نکلتا ہے تو جس طرح مغرب میں ایک نوجوان لڑکی کو شادی کی درخواست کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہاں کرے یا نہ اسی طرح وہ بھی اپنے مستقبل کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے عاجز ہوتا ہے۔[1]

یہ میں نے مختصر طور پر چند باتیں عرض کی ہیں ورنہ ان کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے اور خدا نے چاہا تو ہم آئندہ کی اشاعتوں میں ان میں سے بعض اہم مسائل پر روشنی ڈالیں گے۔ وَمَا تَوفِیقِی اِلّا بِاللہ۔

---

[1] پنجاب جرنل آف کامرس اینڈ اکونامکس۔ پروفیسر کپور۔

حضرت جگر مرادآبادی کے کلیات

شعلۂ طور

کی سول ایجنسی مکتبۂ جامعہ دہلی کو مل گئی ہے

اس لئے

شائقین وہیں سے طلب فرما سکتے ہیں قیمت ۳؎

نفسِ انسانی

مضمون مندرجۂ ذیل میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہ اس اعتبار سے بہت دلچسپ اور اہم ہے کہ جبر و اختیار۔ اور بقائے روح کے مسئلوں پر روشنی ڈالتا ہے اور یہ دونوں مسئلے مذہب و دہریت رُوحانیت اور مادّہ پرستی کی جان ہیں۔ اگرچہ اس بحث کے نتائج بالکل فیصلہ کُن نہیں ہیں تاہم اُن علمی مذاق کے لوگوں کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں جن کو حقائقِ اشیاء کی کُرید اور جستجو ہوتی ہے۔ اور باوجود نامکمل ہونے کے اس قابل ضرور ہے کہ غور و فکر کو تلاشِ حق میں ایک صحیح راستے پر لگادے جو آگے چل کر قیمتی نتائج پیدا کرسکے۔ اِس میدان میں ابتک جس قدر جدّ و جہد کی گئی ہو وہ مجاہدین کے طبعی رجحان اور تعصّب کے اثر سے بری نہیں ہے لیکن یہ مضمون کسی خاص نقطۂ نظر سے نہیں لکھا گیا ہے بلکہ علم النفس کی تحقیقات کے سلسلے کا ایک جزو ہے۔ اِس لئے ایسے مضرت رساں اثرات سے پاک ہے جو علمی تحقیقات کے لئے بہت حارج ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ علمی اصطلاحات سے صاف کرکے طرزِ بیان کو عام فہم کردیا جائے تاکہ عوام کے لئے بھی کارآمد و دلچسپ ثابت ہو۔ (النوری)

نفس سے مُراد عرفِ عام میں خواہشات سے لی جاتی ہے۔ علمی اصطلاح میں اس سے مراد انسانی دماغ کی اُس قوت سے ہے جو جملہ قوائے مدرکہ کی حاکم اور ان کو متحد کرنے والی ہے۔ بعض دفعہ عقل پر اور بعض دفعہ روح پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے لیکن صحیح معنی وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ انسانی دماغ مدّت سے فلسفیانہ غور و فکر کا تختۂ مشق رہا ہے۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ انسان بیرونی عالم کے ساتھ کس قسم کا تعلق رکھتا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے کن قوانین کے بموجب متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارے خیالات ہمارے مادّی جسم پر کس قسم کا اثر ڈالتے ہیں اور آیا حقیقت میں کوئی اثر ڈال بھی سکتے ہیں یا یہ محض ایک دھوکا ہے۔

ہمارے عام عقائد کے اعتبار سے دماغ ایک مادی چیز ہے اور نفس کوئی ایسی شے ہے جو روحانی ہے یا کم از کم مادّی نہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے پر برابر اپنا اپنا اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اگر دماغ پریشان و متفکر ہو تو جسمانی اضمحلال کا باعث ہوتا ہے اور اگر بدن کو بھوکا پیاسا رکھا جائے تو روحانی پژمردگی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہی جسم اور نفس ہماری ذات کے دو جزو ہیں۔ ان دونوں میں نفس جسم پر فائق معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہم اپنی گفتگو میں "اپنے تئیں" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا اشارہ ہمارے جسم کی طرف اس قدر نہیں ہوتا جس قدر نفس کی طرف ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک عام خیال ہے کہ رنج و راحت کا تعلق جسم سے اس قدر نہیں ہے جس قدر دل یعنی نفس سے ہے اس عقیدہ میں بھی نفس کی فوقیت مضمر ہے۔

یہاں تک تو عام معتقدات کا ذکر تھا لیکن انسانی دماغ کے مطالعہ کے لئے سائنس نے اپنی جملہ تحقیقات اور انکشافات کے اسلحہ سے مسلح ہو کر جو کیا ہے جس کا نتیجہ درج کرنے سے پہلے ہم دو چار باتیں اور بیان کردینی چاہتے ہیں جن کا جاننا اس سلسلے میں ضروری ہے۔

سائنس کی تحقیقات ہم کو یہ بتاتی ہے کہ ساری کائنات کا خلاصہ دو چیزیں ہیں۔ مادّہ اور قوت۔ مادّہ کے متعلق اب سے کچھ عرصہ قبل تک یہ خیال تھا کہ اسکی اصلیت ساٹھ یا ستّر عناصر ہیں اور انہی موجوداتِ بسیط کی مختلف ترکیبوں سے سارا مادّی عالم تشکل پذیر ہے۔ تاہم عقل کا مقتضی یہ تھا کہ ساری کائنات کا سلسلہ کسی منبعِ واحد سے ملنا چاہیئے اور عناصر کی اس قدر کثرت و ہجوم دماغ کو پریشان کرنے والا تھا۔ ریڈیم کے انکشاف کا خدا بھلا کرے کہ اُس نے اس خواہشِ عقلی کو ایک حد تک پورا کردیا۔ اور اب کائنات کی بدایت برقِ منفی کے ذرّات سے سمجھی جاتی ہے۔ قوت کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ ایک صورت سے دوسری صورت میں منتقل ہوتی رہتی ہے بجلی سے حرارت کی صورت میں اور پھر اس سے برق کی صورت میں۔ وغیرہ وغیرہ لیکن ان انقلابات کے دوران میں اسکی

معینہ مقدار میں کمی بیشی نہیں ہوتی یعنی عالم میں جو قوت کی مقدار ہے وہ معینہ ہے مادہ کے متعلق بھی ایسی ہی رائے ہے کہ وہ غیر فانی ہے یہ مادہ ہمیشہ حرکت میں ہے اور اسی سے گوناگوں تغیرات ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ حرکت کی نوعیت یا اصلیت سمجھنے کے لئے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ وہ مسلسل ہے یعنی گذشتہ سے پیوستہ۔ گویا ہر ایک تغیر جو عمل میں آتا ہے وہ خود بخود پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ نتیجہ ہوتا ہے تغیرات ما سبق کا اور وہ تغیرات ماسبق بجائے خود نتیجہ ہوتے ہیں دیگر گذشتہ تغیرات کے۔ اسی طرح ساری کائنات ایک تسلسل ضروری ہے جس کی ہر ایک کڑی دوسری کڑی سے علت و معلول کے قانون کے ساتھ مربوط ہے جس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ کوئی واقعہ اپنی ذات سے منفرد اور اتفاقیہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اسی تسلسل ضروری کی ایک کڑی ہے جو لازم بھی ہے اور ملزوم بھی ہے۔ علت بھی ہے معلول بھی ہے۔ اس اعتقاد کے مطابق جملہ امور پہلے سے مقدر ہو چکے ہیں (PREDETERMINED) جس میں مافوق الفطرت مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔ انسانی ارادے اور اس کی قوت مداخلت تغیرات یا واقعات کے سلسلے کو روک نہیں سکتی اور نہ اس سمت کو بدل سکتی ہے جو ان واقعات نے اختیار کر رکھی ہے بلکہ اس کی قوت مداخلت خود اسی تسلسل ضروری یا حرکت کے ماتحت ہے جو از خود پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ بعض تغیرات ماسبق نے اس کو پیدا کر دیا ہے۔

اب ذرا انسان کی بناوٹ پر غور کیجیے۔ علم تشریح الاعضا نے اس کو بیسیوں حصوں میں تقسیم کیا ہے مگر ہم کو سر دست ان سب سے بحث نہیں ہے۔ دو بڑے حصے جسم اور دماغ ہیں ان میں پانچ قوائے حسیہ ہیں جو مادی عالم کا پانچ طرح سے ادراک کرتے ہیں جسم میں دو طرح کے اعصاب ہیں ایک وہ جو محسوسات کو دماغ تک پہنچاتے ہیں اور ایک وہ جو دماغ کے ہیڈ آفس سے احکامات کو اعضا تک پہنچا کر ان کو حرکت میں لاتے ہیں۔ دماغ میں دو قسم کا گودا ہوتا ہے ایک سفید رنگ کا اور ایک بھورے رنگ کا۔ اس بھورے رنگ کی ترکیب میں تیس کروڑ ذرات ابتک معلوم ہو سکے ہیں اور ہر ایک ذرہ ایک پیچیدہ اور باریک نظام کا مظہر ہے۔ یہ دماغ گویا جسم کے سارے کارخانہ کا ہیڈ آفس ہے جو نفس کا مقام ہے۔ وہ تمام خیالات و جذبات و حرکات جو حیات کا ثبوت دینے والے ہیں اس جگہ عمل میں آتے ہیں۔

انسانی دماغ کے عمل کے تین پہلو یا حصہ ہیں اول خیال۔ دوم جذبات سوم فعل۔ حواس خمسہ کے ذریعہ سے محسوسات دماغ تک پہنچتے ہیں جس سے خیال پیدا ہوتا ہے خیال کی ہمیشہ دو صفتیں ہوتی ہیں مسرت بخش یا تکلیف دہ اسی کا نام جذبہ ہے گویا خیال سے جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس جذبہ کی نوعیت کے لحاظ سے فعل عمل میں آتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ انسانی دماغ بھی اسی مادہ کا ایک ٹکڑا ہے جس سے اور کائنات مرکب ہے لہٰذا جس طرح مادی عالم طبعی قوانین کے ماتحت ہے اسی طرح دماغ انسانی بھی اُن کا پابند ہے اور جس طرح مادی عالم میں یکسانیت پائی جاتی ہے یعنی ایک ہی قسم کے حالات میں ہمیشہ ایک ہی قسم کے نتائج کا پیدا ہونا۔ وہی خصوصیت انسانی دماغ کا بھی ہونا چاہیئے اور جس طرح ہم مادی عالم میں اسباب کے مطالعہ سے مستقبل کے متعلق اکثر پیشین گوئی کر سکتے ہیں اسی طرح اس عالم صغیر میں بھی جس کا نام دماغ ہے۔ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا دماغ کے جملہ افعال کی توجیہہ مادہ متحرک کے نظریہ کے مطابق ہونی چاہیئے۔ چنانچہ سترہویں صدی کے فلسفہ دانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جانور کی جملہ حرکات و افعال ایک متحرک مشین سے زیادہ وقیع نہیں۔ ان میں خواہش و اندیشے۔ نفرت و محبت کے جذبات کے وجود سے انکار کیا گیا۔ ان کی چیخ و پکار کو پہیہ کی رگڑ کی آوازوں سے تشبیہہ دی گئی۔ یہ خیال رفتہ رفتہ اس قدر دلنشین ہوتا گیا کہ انسانی افعال کو بھی اسی قانون کے تحت میں لانے کی کوشش کی گئی جس طریقے سے اس کی توجیہہ کی گئی ہے وہ بظاہر دور از فہم معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے حامیان جس وجہ سے اس کے ماننے پر مجبور ہیں وہ یہ ہے کہ ساری کائنات میں مادہ متحرک یا تسلسل لازمی کا قانون جاری و ساری ہے اور اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ انسانی افعال کو اس سے مستثنیٰ کیا جاوے۔ مثال کے طور پر روزمرہ کے کسی معمولی سے فعل پر غور کیجئے۔ مثلاً انسان جب دھوپ میں چلتے چلتے چھتری لگاتا ہے تو متذکرہ بالا قانون کا عمل اس طرح پر ہوتا ہے کہ سورج کی شعاعیں انسان کے جسم کے بیرونی حصہ پر پڑتی ہیں جس کا اثر اعصاب کے ذریعہ سے دماغ تک پہنچتا ہے۔ دماغ میں ایک ہیجان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ناگوار کیفیت کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ بعض متعلق جسمانی قوا سکڑتے ہیں اور چھتری کھل جاتی ہے۔ یہ تاویل جس قدر کھینچ تان کے کی گئی ہے اس سے صاف عیاں ہے۔ مدعیان نے حرکت کے قانون کو محض نباہنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کسی قانون کا ایسی جگہ پر اطلاق کرنا چاہئے

کما حقہٗ اس کی تصدیق نہیں ہوئی ہے، بڑی غلطی ہے اور سائنس جب ایسے ناروا تحکم سے کام لینے لگے تو وہ سائنس کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔ بہر حال یہ تعمیم ابھی قبل از وقت ہے۔ اگر بالفرض اس کو صحیح مان بھی لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسانی افعال ایک مشین کی حرکت سے زیادہ وقیع نہیں تو یہ کیفیت شعوری کہاں سے اور کیوں کر پیدا ہو گئی۔ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ دماغ کی حرکت مادی جب ایک خاص حد تک شدید ہو جاتی ہے تو اس میں شعور کی شان پیدا ہو جاتی ہے جس طرح چقمق کی شدید رگڑ سے شعلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق کیفیت شعوری ایک زائد اور فاضل یا فضول شے ہے۔ کیونکہ انسانی افعال و حرکات مثل دیگر تغیرات عالم کے پہلے سے مقدر ہیں۔ اور وہ اپنے اسی ڈھرے پر چلے جائیں گے جو کہ ہر ایک واقعہ ماسبق واقعہ مابعد کے لئے معین کر دیتا ہے۔ کیفیت شعوری کا عدم وجود برابر ہے۔ تاہم علم الحیات ہم کو یہ بتاتا ہے کہ ذی روح اجسام میں کوئی شے وجود میں نہیں آتی تاوقتیکہ اس کی ضرورت اور مصرف نہ ہو اگر یہ کہا جائے کہ یہ کیفیت شعوری حرکت دماغی کا ایک قدرتی خاصہ ہے تو یہ ایک ایسی آڑ کے پیچھے پناہ لینی ہے جس کا توڑنا محال ہے یا کم از کم یہ ماننا پڑیگا کہ یہ حرکت دماغی اس عام حرکت سے مختلف اور جداگانہ ہے جو بیرونی عالم میں ہم ابتک دیکھتے چلے آئے ہیں۔ لیکن یہ امر قانون حرکت کی اس عمومیت میں خلل انداز ہوتا ہے جس کے نباہنے کے لئے اس قدر تاویلیں کی گئی ہیں۔

انسانی افعال کی مشین کی حرکت کی بنا پر توجیہہ کرنے میں جو اور دقتیں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ اس صورت میں حق و باطل کی تمیز فرض اور ذمہ داری کا احساس یہ سب الفاظ بالکل بے معنی ٹھہرتے ہیں۔ چونکہ انسانی افعال ایک خاص معین اور مقرر نہج پر واقع ہوتے چلے جاتے ہیں جو پہلے سے مقرر ہیں۔ اس میں اخلاقی محرکات کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ کسی قسم کی مداخلت تسلسل ضروری میں ناممکن ہے حالانکہ ہم سب کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ بعض محرکات پر عمل کرے اور بعض کو قصداً نظر انداز کر دے۔ اس کے سامنے مختلف راہ عمل کھلی ہیں وہ ان میں سے چاہے جس پر قدم زن ہو۔ کوئی سا مسلک اختیار کرے۔ مختصر یہ کہ وہ اپنا کیرکٹر بنانے کا مختار اور ذمہ دار ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ وہی راہ اختیار کرتا ہے جس کو تغیرات ماسبق نے پہلے سے مقدر کر دیا ہے تو اس کا حل بجز اس صورت کے نہیں ہو سکتا کہ تجربے کیلئے کائنات کے گردش کرنے والے پہیوں کو اُلٹی حرکت دی جائے اور ہم پھر اس جگہ جا کھڑے ہوں جہاں سے چلے تھے۔ اور وہ راستہ اختیار کریں جو پہلے چھوڑ دیا تھا۔ اور دیکھیں کہ آیا اُسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں یا نہیں۔ یہ عقیدہ کہ انسان کو اپنے افعال کا اختیار ہے معترضین کے نزدیک محض دھوکہ ہے۔ لیکن یہ دھوکہ کیونکر لاحق ہوا؟ اس کا کوئی جواب نہیں۔ الغرض اس حرکت سالمی کے قانون نے مادہ کے اقتدار قائم کرنے میں اس قدر کوشش کی ہے کہ بیرونی عالم سے نفس کے ہر قسم کے تعلقات کو بے حقیقت اور دھوکہ پر مبنی بتایا ہے۔ مگر کیا مزے کی بات ہے کہ یہ مغرور سالمہ جہاں تک ہمارے علم میں ہیں اور مادہ پرستوں کے علم میں بھی ایک خیالی ہستی سے سوا نہیں جو اس غریب نفس کے منجملہ کرشموں میں سے ایک کرشمہ ہے۔

اصل میں دماغ کا رجحان جب کسی خاص طرف زیادہ بڑھ جاتا ہے تو تمام خیالات اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں اسی کا نام عصبیت ہے۔ مادہ پرستی کی تند ہوا نے ہمارے بعض نہایت قابل دماغوں کو اس قدر پریشان کیا ہے کہ ان کو خیال کے مقابلہ میں مالیکیول MOLICULE جذبے کے مقابلہ میں کیمیکل ایکویشن CHEMICAL EQUATION اور قوت ارادی کے مقابلہ میں اٹامک انرجی Atomic ENERGY زیادہ وقیع اور زیادہ پُرحقیقت نظر آتے ہیں۔ حالانکہ تمام وہ نظریات جو دنیائے سائنس میں آئے وہ قائم ہوتے رہتے ہیں اور جن میں ہر نیا سوچنے والا تغیر و تبدل کر جاتا ہے۔ اسی بیچارے نفس کی قوت متخیلہ کا ظہور ہیں۔ اسی بنا پر ہم حرکت سالمی حامیان کو جواب دیتے ہیں کہ یہ حرکت سالمی نہیں ہے بلکہ انسانی تخیل ہے۔

نفس انسانی چونکہ اپنے وجود کے لئے محتاج ہے دماغ کا۔ اور دماغ مادہ کا ایک جزو ہے، اس لئے اس میں شک نہیں کہ طبعی قوانین کو انسانی افعال سے ایک حد تک تعلق ضرور ہے۔ چنانچہ اکثر انسانی افعال میکانیکل ہوتے ہیں۔ ہمارے دماغ میں خیالات کا ایک تسلسل ہوتا ہے جس میں ایک خیال دوسرے کی مدد سے پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی بات ذہن سے اُتر جاتی ہے تو اس کو یاد کرنے کے لئے ہم اسی خیالی تسلسل سے مدد لیتے ہیں۔ دماغ جب کمزور ہو جاتا ہے تو اس میں یہ میکانیکل عنصر غالب آجاتا ہے۔ چنانچہ بعض آدمیوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جو خیال دل میں آیا وہ منہ سے نکل گیا۔ یا معمولی سے معمولی محرکات

پر وہ عمل کر بیٹھتے ہیں بعض آدمی باوجود کسی دوسرے کام میں مصروف و منہمک ہونے کے خاص سمجھ کی باتیں کرتے چلے جاتے ہیں اور بہت روانی کے ساتھ کرتے ہیں برخلاف اس کے جن لوگوں کے دماغ کمزور نہیں ہوتے وہ ہر خیال کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ گفتگو بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں بعض نامناسب خیالات کو دبا جاتے ہیں اور مناسب کو بیان کر دیتے ہیں۔ زیادہ بکواس کے عادی نہیں ہوتے۔ گویا میکانیکل عنصر ان میں بہت کم ہوتے ہیں۔ بعض محرکات پر وہ عمل کرتے ہیں اور بعض کو قصداً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایسے مواقع پر انسانی افعال میکانیکل نہیں ہوتے بلکہ ارادی ہوتے ہیں۔ کیونکہ میکانیکل افعال کے لئے ضروری ہے کہ وہ تغیرات ماسبق کا نتیجہ ہوں اور بلا ارادہ یکے بعد دیگرے سرزد ہوتے چلے جائیں جو تسلسل لازمی کا مقتضی ہے۔ افعالِ ارادی میں اختیار عنصر ہوتا ہے۔ ان کے محرکات ماضی میں نہیں ہوتے جیسے تغیرات ماسبق۔ بلکہ مستقبل میں ہوتے ہیں افعال ارادی ایک مقصد پیشِ نظر کے پیچھے پیچھے ہوتے ہیں اور میکانیکل افعال تغیرات گذشتہ کے آگے آگے۔

چونکہ نفسِ انسانی مادی دماغ سے وابستہ ہے اس لئے نفس کے جملہ کیفیات و افعال کے ساتھ دماغ میں بھی تغیرات واقع ہوتے ہیں جو اول الذکر کا عکس ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں جس قدر بحث کی گئی ہے اس کا مقصد یہ دریافت کرنا ہے کہ ان دونوں حالتوں میں مقدم کون ہے اور مؤخر کون ہے علت کونسی ہے اور معلول کونسی ہے۔ نفسی کیفیات، دماغی کیفیات کی مسبب ہیں یا نتیجہ ہیں۔ ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں متوازی ہیں یعنی نہ علت نہ معلول۔ یعنی ایک ہی تصویر کے دو پہلو ہیں۔ اس میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ تصویر کونسی ہے۔ اس کا کوئی جواب نہیں۔ اگر تصویر کے خیال کو نظر انداز کر دیا جائے تو ان دونوں میں توازن قایم نہیں رہتا۔ یعنی قدرتی طور پر ایک کی طرف زیادہ رجحان ہوتا ہے بہ نسبت دوسرے کے۔ اگر دماغی پہلو پر زور دیا جائے یعنی اس کو علت گردانا جائے تو وہی حرکت مادی کا نظریہ قائم ہو جاتا ہے جس کے قابلِ اطمینان توجہ ہونے میں اوپر اعتراض ہو چکے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر یہ کہا جائے کہ نفسی کیفیات سبب ہوتی ہیں دماغی کیفیات کا اور یہ اس وجہ سے کہ نفسِ انسانی مادی دماغ سے اس طرح وابستہ ہے کہ اس کا کوئی فعل دماغ میں تغیر پیدا کئے بغیر عمل میں نہیں آتا۔ تو یہ ایک حد تک قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے بیرونی عالم میں جس قدر تغیرات ہوتے ہیں اُن کو ہم مادہ اور حرکت کی اصطلاح میں ظاہر کرتے ہیں چونکہ ہمارے حواس اُن کا اسی صورت میں ادراک کرتے ہیں لیکن جو تغیرات ہماری کیفیتِ شعوری میں ہوتے رہتے ہیں اُن کو ہم قدرتی طور پر خیالات و جذبات و خواہشات کے تغیرات سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ یہ تغیرات خود ہمارے ہی اندر پیدا ہوتے ہیں اس لئے اُن کی اصلیت سے ہم خود بہ نسبت ایک ظاہر بین شخص کے زیادہ واقف ہیں۔ رہا دوسرا پہلو یعنی دماغی تغیرات وہ گویا اسی باطنی اصلیت کی محض صورت ظاہری ہے اور وہ کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ بجز سائنس کے جس کو محض عالمِ محسوس ہی سے غرض و تعلق ہے۔

علاوہ ازیں اگر نفس محض مختلف محسوسات کا مجموعہ ہوتا تو ہم کو مخالفین کی رائے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔ لیکن نفسِ انسانی کی بڑی خصوصیت جو ہے وہ محض یہی نہیں کہ محسوسات کا ادراک کرتا ہے بلکہ مختلف اور پریشان محسوسات کو جمع کر کے اُن کو متحد کر دیتا ہے تاکہ شئے محسوس کی شناخت اور اس کی دیگر اشیاء سے تمیز ہو سکے۔ مثال کے طور پر دو ایک قسم کے پھلوں کو لیجئے، مثلاً نارنگی۔ آم۔ کیلا وغیرہ۔

ان میں سے ہر ایک پھل کو ہم مختلف حسیات کے ذریعہ سے معلوم کرتے ہیں، خاص قسم کا رنگ جو قوتِ باصرہ محسوس کرتی ہے، خاص قسم کی خوشبو جو قوتِ شامہ محسوس کرتی ہے خاص قسم کا مزہ جو قوتِ ذائقہ محسوس کرتی ہے اور خاص قسم کی نرمی اور سختی جو قوتِ لامسہ محسوس کرتی ہے یہ سب محسوسات مختلف طور پر مادی اعصاب کے ذریعہ سے دماغ میں پہنچتے ہیں۔ اب نفس کا کام یہ ہے کہ وہ ان سب محسوسات کو متحد کر کے اُن کا ایک ذہنی تصور قایم کرلے جس کا سہولتِ اظہار کے لئے ایک خاص نام رکھ لیا جاتا ہے۔

یہ متحد کرنے کا فعل خاص نفس کا حصہ ہے۔ دماغ کا نہیں، کیونکہ دماغ میں تقسیم افعال کے لئے جس قدر خانے ہیں اُن میں سے اس خاص فعل کے لئے کوئی بھی نہیں، اس متحد کرنے والی قوت کو روح کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس خیال کے حامیان کے نزدیک انسان اس مادی عالم میں تصرف کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ وہ طبعی قوانین کے ہاتھوں میں دیگر مادی اشیاء کی طرح کھلونا نہیں ہے بلکہ وہ ارادہ اور اختیار رکھتا ہے اس کے افعال تغیرات ماسبق کے تحت میں پہلے سے مقدر (PREDETERMINEI) نہیں ہوتے بلکہ خاص مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کے (self determined) ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اُس کا فرض اور ذمہ داری کا احساس محض دھوکہ اور غلط فہمی نہیں ہے بلکہ بالکل اصلی اور حقیقی شے ہے۔ اس ضمن میں ایک اعتراض اور باقی رہ گیا ہے جو یہاں قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ اگر انسان کو صحیح معنوں میں فاعل سمجھا جائے تو مقدارِ قوت کے قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے جس کی ابتدائے مضمون میں تشریح کی جاچکی ہے۔ مگر اوّل تو اس کا اطلاق انسان پر کرنا غلطی ہے۔ کیونکہ انسان کے متعلق اس کے صحیح ہونے کا اب تک کوئی ثبوت نہیں دوسرے یہ کہ اگر بالفرض اس کو صحیح مان بھی لیا جائے اور فرض کر لیا جائے کہ انسان جس قدر قوت غذا کے ذریعہ سے قدرت کے خزانۂ نادرہ سے حاصل کرتا ہے وہ مختلف افعال کی صورتوں میں خارج کر دیتا ہے۔ تب بھی یہ قانون محض مقدار کے متعلق ہے انسان کا یہ اختیار کہ وہ اس معینہ مقدارِ قوت کو چاہے جس سمت میں لگا دے اس قانون کی رُو سے شکست نہیں ہوتا۔ جب تک اندر جانے والی قوت اور باہر آنے والی قوت برابر ہے اس قانون کی شرائط پوری ہوجاتی ہیں۔ اس قوت کی سمت اخراج کے متعلق یہ قانون کچھ نہیں کہتا اور زیرِ بحث یہی بات ہے کہ انسان مختلف راہوں میں سے خواہ کوئی سی راہ اختیار کرے تسلسل لازمی کے قانون کے تحت میں وہ اپنے افعال میں دیگر مادی عالم کی طرح مجبور اور بے اختیار نہیں۔ اگر کسی نفس کا وجود اس مادی دماغ کی وساطت کے بغیر ممکن ہو تو وہ ان طبعی قوانین کے اثر سے بالکل بری ہو جن کا وہ دماغی تعلق کی وجہ سے ایک حد تک پابند ہے اور جس مادی تعلق کی وجہ سے اس کی قوت ارادی اور اختیار بالکل آزاد اور مطلق العنان نہیں ہے۔ مادہ طبعی قوانین کا بالکل پابند ہے اور نفس ان سے بالکل آزاد ہے۔ اب نفسِ انسانی چونکہ مادی دماغ کے ساتھ وابستہ ہے اس لئے اس کی حالت جبر و اختیار کے درمیان ہے۔ نہ مجبورِ محض ہے نہ مختارِ محض۔ لیکن اگر کوئی نفس بلا دماغ کے ہو تو اسکی قوت ارادی کُنْ فَیَکُوْنُ سے کیا کم ہوسکتی ہے۔

(سید انور علی صاحب انوری فرید آبادی)

کہاں آئے ہو تم قبریں ہیں دِل سینوں میں ہلتے ہیں
گھنا جنگل ہے تاریکی ہے، دونوں وقت ملتے ہیں

مجھے بیساختہ تیرا تبسم یاد آتا ہے
لبِ دریا شبِ مہتاب میں جب پھول کھِلتے ہیں

(انتخاب از روحِ ادب مصنفہ جوش ملیح آبادی)

رازِ حُسن

نمودِ صبح نے عالم کو یہ پیام دیا — کہ خوابِ ناز سے چونکی ہے ایک حورِ لقا

نسیمِ خلد سے صحنِ چمن میں آئی ہے — نویدِ شوق پیامِ سرور لائی ہے

طیورِ صبح کے نغمے چمن میں سنتی ہے — گلوں کی رُوح چنبیلی کے پھول چنتی ہے

کلی کلی کی دعا ہے کہ مجھ کو ہاتھ لگائے — جسے چھُوا اُسے یہ آرزو کہ ہار بنائے

نظر جھُکائے تو غنچوں پہ نیند سی چھائے — نظر اُٹھائے تو پھولوں میں تازگی آئے

خرامِ ناز میں انگڑائیاں جو لیتی ہے — تو کائنات کو لرزش کا حکم دیتی ہے

رُخِ صبیح میں جاگی ہوئی لطافتِ نور — کنارِ چشم میں سوئی ہوئی امانتِ طور

سرور رنگ میں محلول نزہتِ سحری — وجودِ پاک میں محصور طلعتِ قمری

شعاعِ مہر کی دوشیزگی کی اک تصویر — جبیں پہ عصمتِ ماہ مبیں اقامت گیر

ہلالِ لب پہ درخشاں تبسمِ خوبی — عذارِ نرم پہ اک خال حرزِ محبوبی

بیاضِ دوش پہ بکھرے ہوئے سیہ گیسو — سوادِ شام میں پنہاں طلسمِ نکہت و بُو

کسی ادائے تغافل میں شانِ لیلائی — کسی نگاہِ تلطف میں طرحِ عذرائی

فروغِ حُسن سے آئینۂ جمالِ حیات — شبابِ تُند سے افسانۂ جلالِ حیات

شرابِ تند میں یہ آتشیں خواص نہیں — ایاغِ چشم میں جو ہے ہلاہلِ شیریں

مزاجِ قطرۂ شبنم سرور بوئے نسیم — خنک لطافتِ گلُ موجِ کوثر و تسنیم

دلِ خراب کی نکلی ہوئی دعائے صمیم — گدا کے حال سے ناآشنا نگاہِ کریم

وہ شمع جس کی ضیا صوفیوں میں عرفاں ہے — وہ نُور جس کی جھلک مومنوں کا ایماں ہے

الم فروش، تپش آفریں، ستم پرداز — سکوں کے نام کی دشمن، خلش کی محرمِ راز

وہ اضطراب رگِ تاک جس کی اصل شراب — وہ التہاب دلِ خاک جس کی شکل گلاب
وہ آگہی کہ پگھل جائے جس سے کانِ جمود — وہ شوقِ قلبِ تجلّی کہ جس کا نام شہود
وہ جوش جس نے دلِ سنگ کو رُخام کیا — وہ مس جس نے سدا کیمیا کا کام کیا
وہ رنگ جس کی شعاعوں کو چمن گلخن — تپاکِ خاک کے ذروں کو کر گئی کندن
ضیائے مہر ہے جس کی دمک دو ذرّہ نشیں — قمر میں جس کی جھلک بس کے رہ گئی وہ نگیں
نمودِ منظرِ تسکینِ پیام و غنچ مضمار — کلیدِ گنجِ نوا ہیں مخزنِ اسرار
شبابِ نو کے تقاضائے دلبری کا وفور — شبِ وصال کی بیخواب انکھڑیوں کا سرور
وہ ضو کہ پیکرِ رعنا ہے جس کی قسمت میں — وہ برق، دل پہ جو گرتی ہو قد کی صورت میں
ازل میں جس کو مشکّل کیا وہ رازِ جمال — جہاں کو جس نے مسخر کیا وہ سحرِ حلال
نظر کے سامنے اللہ کیا تماشہ تھا — کہ اس کو دیکھ کے پھر کچھ نظر نہ آتا تھا
قرارِ جاں سے ہوا، اعتمادِ قلب سے دُور — خودی کی شب میں ہوا صبحِ بیخودی کا ظہور
وفورِ شوق میں آخر جب اور بس نہ چلا — جبیں زمین پہ رکھدی، خدا کا نام لیا
عجب مقام پہ تھی روحِ انبساط قریں — کہ کائنات نظر آ رہی تھی زیرِ نگیں!
اسی مقام کو کہتے ہیں ماورائے حواس — یہیں حرام ہے اپنے وجود کا احساس
یہ حال تھا کہ درِ قدس سے صدا آئی — کہ اے جمالِ خلش آفریں کے شیدائی
غمِ حیات کو جز عجز کچھ نہیں زیبا — کہ بندگی سے حسیں تر نہیں ہے کوئی ادا
بلند عرشِ بریں سے ہے یہ وہ پستی ہے — تری یہ گم شدگی عینِ حق پرستی ہے
کمالِ زیست ہے دنیا میں اس شرف کا حصول — کیا ہے ہم نے ترا سجدۂ نیاز قبول
نہ سر اٹھا کہ تجھے آج دل کی بات سنائیں — جہاں سے جس کو چھپایا تجھے وہ راز بتائیں
شکستِ عرضِ محبت سے دل ملول نہ ہو — ہو نہ رو جو تری آرزو قبول نہ ہو

جمالِ رُخ میں نہ ابروئے بے پناہ میں ہے
جہانِ حسن کا مرکز تری نگاہ میں ہے

مخمورؔ۔ اکبرآبادی

اَدبِ لطیف

سازش

ایک ناجائز طور سے حاملہ عورت ۔ چہرہ وحشتناک اختلاج میں غرق ۔ حمل پوشیدہ رکھنے کے خبط میں دیوانی ۔۔۔۔۔۔۔

ہرچند بشاش بننا چاہتی ہے ۔ مگر رگ رگ میں اُترا ہوا خوف پژمردہ ہی رکھتا ہے اور دھڑکتا ہوا دل مطمئن ہونے نہیں دیتا ۔

وہ ایک مطلق خاموشی، ایک کامل سناٹے کی جویا رہتی ہے ۔ اُس کی روح تاریک گوشوں اور پوشیدگیوں سے لبریز خلوتوں کی تشنہ رہتی ہے ۔

ہر صدا خواہ وہ نغمۂ شادی ہی کیوں نہ ہو، اُسے اس قدر پریشان کردیتی ہے جس طرح دیہاتی چوکیداروں کی بھیانک اور گرجتی ہوئی آوازیں آدھی رات کے وقت شیرخوار بچوں کو، روزِ روشن اُسے اس طرح ڈراؤنا معلوم ہوتا ہے جیسا بھوتوں کے قائل کو بھری برسات کی سیاہ رات میں گھنا جنگل ۔

رفتہ رفتہ اس کا خوف اس درجہ ترقی کرجاتا ہے کہ ایک شب جبکہ وہ خیالات میں غرق اپنے بستر پر لیٹی ہوتی ہے کہ اُسے دفعتہً "کھانسی" آتی ہے، کھانسی آتے ہی اس کا رنگ متغیر ہوجاتا ہے اور یہ خیال کرکے کہ محلہ میں اس کی آواز سُن لی گئی ۔ ایک چیخ مارتی ہے اور بیہوش ہوجاتی ہے ۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔"

(انتخاب از "روحِ ادب" مصنفہ جوش ملیح آبادی)

عِلمِ تخیل

چھٹکے ہوئے تاروں سے ایک روشنی چلی فضا کو ملاتی ہوئی آئی اور میرے سینے میں جذب ہوگئی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

صبح ہوتے ہی وہ روشنی میرے سینے سے باہر آئی، بلند ہوئی اور آفتاب کی کرنوں میں پیوست ہوگئی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کرنوں سے چلی اور دریا کی لہروں میں نہانے لگی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ دریا سے باہر آئی باغ میں گئی" اور نازک نازک کلیوں میں چھپ گئی ۔ کلیاں مُسکرانے لگیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کلیوں کو چٹکاتی ہوئی پھر میرے نزدیک آئی اور میری رُوح کو آہستہ سے چھوکر تمام کائنات میں پھیل گئی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔"

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھ میں اور مظاہرِ قدرت میں صرف ایک ہی روح ہے ۔ جو دورہ کیا کرتی ہے ۔ میں کائنات میں جذب ہوں اور کائنات مجھ میں"

یہ عجیب بات ہے کہ کشتی دریا میں غرق ہے اور دریا کشتی میں ڈوبا ہوا ہے !!!

(انتخاب از "روحِ ادب" مصنفہ جوش ملیح آبادی)



ہندو مسلم اتحاد

(جناب حکیم محمد یوسف حسن صاحب لاہور)

حضرت جوش کے اصرار پر مجھے اُن کے رسالے کے لئے ایک پامال عنوان پر مضمون لکھنا پڑا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد پر بارہا لکھا جا چکا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ عنوان ہنوز تشنہ ہے اور تشنہ رہے گا۔ اس لئے اگر میں کچھ عرض کروں اور وہ کسی طرح مفید ثابت ہوا تو سمجھوں گا کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔

ایشیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا ہلکا سا خاکہ نیرنگِ خیال کے مشرق نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ ہندوستان ایشیا کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس میں تینتیس کروڑ انسان بستے ہیں، جو اگر متحد و منظم ہو جائیں تو اپنی دیرینہ روایاتِ جرأت و شجاعت کے بل پر وہ ایشیا بھر میں ممتاز ترین حکومت کے وارث بن سکتے ہیں۔ جاپان ایشیائی روس اور چین ان تینوں میں سے کوئی سلطنت بھی اتنی طاقتور نہیں بن سکتی جتنا آزاد اور منظم ہندوستان بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس لئے ہندوستانیوں کو اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر لینی چاہیئے کہ باہمی خانہ جنگی سے وہ نہ صرف اپنے ملک کی آزادی کا گلا گھونٹ رہے ہیں بلکہ ایشیا کی ترقی اور آزادی کے راستہ میں بھی روڑا اٹکا رہے ہیں۔

ہندو مسلم اتحاد پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ہمیں جن ذیلی عنوانات پر کچھ لکھنا پڑیگا وہ یہ ہیں۔ (۱) مذہبی اتحاد (۲) سیاسی اتحاد۔ (۳) معاشرتی اتحاد۔ (۴) لسانی اتحاد۔ (۵) اخباری اتحاد۔

سب سے اہم مسئلہ مذہبی اتحاد ہے۔ ہندوؤں کے اندر مذہبی تعصب مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ ہندو آپس میں مذہبی اصولوں کی بنا پر منتشر و متفرق ہو گئے ہیں۔ ہندوؤں میں ذاتوں کی تقسیم اور چھوت چھات کی سوجھ بوجھ انھیں اپنوں سے بھی بیگانہ بنانے کے لئے کافی ہے۔ گو مسلمانوں سے میل جول اور انگریزی تعلیم کے اثر سے اس میں کچھ نہ کچھ کمی پیدا ہو چکی ہے۔ مگر جو قوم اپنے ہی بھائی ہندوؤں سے ایسا خلافِ انسانیت سلوک روا رکھتی ہو اُن سے مسلمان زیادہ توقع نہیں رکھ سکتے۔ مسلمانوں کے بھی فرقے ہیں۔ اُن میں بھی انتشار و تفریق ہے۔ لیکن وہ اس قسم کا نہیں جیسا ہندو قوم میں پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی باہمی اخوت ہمیشہ ذاتوں اور فرقوں کی تفریق پر چھا جاتی ہے اور مسلمان اس معاملہ میں ہندوؤں کی نسبت بہت زیادہ محفوظ ہیں۔

مسلمانوں کی روش ہندوؤں سے متعلق قابلِ اصلاح ہے۔ مسلمانوں کو اس معاملہ میں قرآن مجید سے استنباط کرنا چاہیئے جس میں صاف اور واضح احکام موجود ہیں۔ اللہ پاک نے ہر قوم اور ہر ملک کی طرف ہدایت اور ہادی بھیجے ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان جیسا پرانا اور وسیع ملک اس سے محروم رہا ہو۔ یقیناً ہندوستان میں بھی خدا کا پیغام اور شریعت ضرور نازل ہوئی ہوگی۔ یہاں بھی پیغمبر آئے ہونگے۔ مسلمانوں نے تیرہ سو سال میں قرآن مجید کو تو نہیں بدلا اور نہ بدل سکتے ہیں لیکن شریعت کے دوسرے اصولوں میں اس قدر افراط و تفریط سے کام لیا ہے کہ حقیقت کی تلاش میں الجھن ہونے لگتی ہے۔ اس لئے اگر ہندوؤں نے دین الٰہی میں ہم سے چار گن یا دس گنا زیادہ وقت میں ہم سے کئی گنا زیادہ تحریف کر لی ہو تو بینا ممکن نہیں نہ معلوم ہندوؤں کا اصل مذہب کیا ہوگا اور اب اس کی مسخ شدہ صورت کیا رہ گئی ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم ہندوؤں کو "بے دین" یا "کافر" کہیں۔ ہندو بھی اللہ کی ایک قوم اور اس کے پیغمبر کی امت ہیں۔ اگر انھوں نے خدا کے آخری احکام یعنی اسلام کو قبول نہیں کیا۔ تب بھی وہ خدا کے پیدا کردہ انسان اور خدا کی ایک پرانی اُمت تو ضرور ہیں۔ قرآن مجید میں ہے۔

"یہ تمہاری جماعت دراصل ایک ہی جماعت ہے اور میں
تم سب کا پروردگار ہوں۔ اس لئے صرف مجھ سے ڈرو۔ مگر
لوگ ایک دوسرے سے کٹ کر الگ ہوگئے اور انھوں نے
نئے نئے مذہب بنا لئے۔ اب ہر ٹولی کے پاس جو کچھ ہے اُسی
میں مگن ہے۔ (المومنون ع ۴)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

جس قوم کے پاس آسمانی کتاب ہو اُس سے جھگڑا نہ کرو۔ مگر
ہاں بہت اچھے طریقے سے اس قوم میں وہ لوگ مستثنیٰ ہیں
جو ظالم ہیں اور اُن سے کہو کہ جو احکام ہمارے اور تمہارے
لئے نازل ہوئے اُن پر ہمارا یقین ہے۔
ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ ہم سب اسی کے سامنے
جھکنے والے ہیں۔ (عنکبوت۔ ع ۵)

تیسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

سب لوگ ایک ہی مذہب و طریقہ پر تھے۔ بعد میں اختلاف
پیدا کر لیا۔ (یونس ع ۲)

چوتھی جگہ حکم فرمایا ہے۔

اے ایمان والو کسی قوم پر نہ ہنسو۔ ممکن ہے اس میں نیک
آدمی ہوں۔ اسی طرح عورتوں پر بھی نہ ہنسو ممکن ہے اُن
میں بھی نیک ہوں۔ (الحجرات ع ۲)

گویا نیک اور پارسا مرد یا عورتیں صرف مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ دوسری قوموں
میں بھی ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ دوسری قومیں مسلمان نہیں تھیں۔

پانچویں جگہ لکھا ہے۔

کہو ہم اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور ہماری طرف جو قرآن نازل
ہوا اُس پر اور جو کچھ ابراہیم۔ اسمٰعیل۔ اسحٰق۔ یعقوب اور اولادِ
یعقوب پر نازل ہوا اس پر یقین رکھتے ہیں اور موسیٰ عیسیٰ
اور دوسرے تمام پیغمبروں کے پاس جو احکام ان کے پروردگار
کی طرف سے آئے ان پر یقین ہے۔ ہم ان میں سے کسی کو جدا
نہیں سمجھتے۔ (البقرہ ع ۲)

گویا ہمیں ان الہامی کتابوں اور پیغمبروں پر بھی یقین رکھنا چاہئیے جنھوں نے خدائے واحد
کی عبادت کی طرف بلایا۔ گو اُن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں کیا گیا۔

چھٹی جگہ فرمایا ہے۔

ہر ایک قوم کے لئے ایک رہنما ہوتا رہا ہے۔ (رعد ع ۱)

ساتویں جگہ ارشاد ہوا۔

کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہ آیا ہو۔
(فاطر ع ۳)

آٹھویں جگہ لکھا ہے۔

ہم نے ہر رسول کو اُس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ احکام
الٰہی بہتر طرح بیان کرے۔ (ابراہیم ع ۱)

گویا خدا کی الہامی زبان صرف عربی نہیں ہے بلکہ جس قوم کے پاس پیغام بھیجا گیا
اس کی زبان میں بھیجا گیا تاکہ وہ لوگ سمجھنے میں تکلیف نہ پائیں۔ ہندوستان میں
جو پیغام بھیجا گیا ہوگا وہ اِس ملک کے باشندوں کی زبان میں بھیجا گیا ہوگا۔

نویں جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

اور بیشک ہم نے ہر قوم یا ہر جماعت میں ایک رسول بھیجا،
اور اُس کے ذریعہ سے یہی حکم دیا کہ صرف اللہ کی عبادت
کرو اور سرکش اور شیطانی قوتوں سے بچو۔ (نحل ع ۵)

دسویں جگہ لکھا ہے۔

اور کئی رسول ہیں جن کے حالات ہم نے تجھے پہلے ہی سنا دیئے
اور کئی رسول ہیں جن کے حالات نہیں سنائے۔ (نساء ع ۲۴)

مندرجہ دس احکام قرآن مجید کی مختلف آیتوں سے لئے گئے ہیں۔ جو تمام کے تمام
واضح ہیں۔ اِن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ

(۱) تمام قومیں ایک ہی جماعت کی مختلف شاخیں ہیں (۲) ہر قوم میں عبادت
صرف خدائے واحد کی مقصود تھی۔ (۳) ہر قوم میں نیک مرد اور نیک عورتیں ہوتی
ہیں۔ (۴) دنیا کے تمام پیغمبروں کو سچا سمجھو اور ان کی عزت کرو (۵) خدا نے ہر قوم
میں رہنما اور پیغمبر بھیجے ہیں (۶) خدا نے پیغمبروں کو صرف عربی زبان ہی میں پیغام
نہیں دیا بلکہ ہر اُس زبان میں پیغام دیا جس قوم میں خدا کا حکم نازل ہوا (۷) قرآن مجید
میں بہت سے پیغمبروں کا ذکر موجود ہے اور بہت کا ذکر نہیں بھی کیا گیا۔

ان واضح احکام کی روشنی میں مسلمانوں کو سوچنا چاہئے کہ گو اُن کے پاس
آخری پیغام اور دنیا کا مکمل ترین مذہب ہے۔ ان کے پاس خدا کی بھیجی ہوئی ایک

ایسی کتاب ہے جو ابتدا سے لیکر آج تک جوں کی توں موجود ہے جس سے ایک حرف اور ایک نقطہ بھی کم نہیں ہوا. لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خدا کے دوسرے مذاہب کا مذاق اُڑائیں. اگر ہزاروں برس کی دست بردسے دیگر مذاہب کی صورت مسخ ہو گئی ہو پھر بھی مسلمانوں پر واجب نہیں ہے کہ دوسروں کی تحقیر کریں. اللہ پاک نے قرآن مجید میں ایک جگہ یہ بھی فرمایا ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں ہوئے اُن سے ان کے دینوں کے مطابق حساب کتاب ہوگا جن پر وہ باپ دادا کے وقت سے قایم چلے آتے ہیں. گویا اللہ پاک نے غیر مسلموں سے بھی اپنا الہامی اور دینی تعلق کسی نہ کسی صورت میں قایم رہنے دیا ہے.

جب صورتِ حال یہ ہو جو اوپر بیان کی گئی ہے تو مسلمانوں سے براہِ راست سوال کرنا پڑتا ہے کہ اگر وہ دوسرے مذاہب کے متعلق ایسی نفرت و حقارت نہ پھیلائیں جس کے وہ مستحق نہیں ہیں تو اس سے اسلام اور مسلمانوں کو کتنا فائدہ پہنچتا. ہندوستان میں تبلیغِ اسلام میں کتنی آسانیاں پیدا ہو جائیں. دوسرے مذاہب والے کشادہ دلی سے اسلام کا مطالعہ کرتے. اور جب دیکھتے کہ اسلام تو صرف پہلے دینوں کا مُصدِق ہے اور خدا کے ان احکام کو مفصلاً و مجملاً حالت میں پہنچانے والا ہے جو ہزار ہا سال کے عرصہ میں انسانوں کی دست برد و ذاتی اغراض سے مستور ہو چکے تھے تو اس سے خدا کے آخری پیغام کی نشر و اشاعت میں زیادہ آسانیاں پیدا ہوتیں. مسلمان علماء نے کافر کافر اور مشرک مشرک کا نعرہ بلند کر کے خدا کے دو دینوں کو ایک جگہ جمع ہونے سے روک دیا. کیا مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد علانیہ شرک میں مبتلا نہیں. کیا قبروں. گنبدوں. معبدوں. کپڑوں اور پیروں فقیروں سے وہی کچھ نہیں مانگا جا رہا اور اُن کی ویسی ہی پرستش نہیں کی جا رہی جیسی خدا کی کی جاتی ہے. جب مسلمان شرک کرنے لگیں اور خدائے قدیر کے نام کو پسِ پشت ڈال کر غیر حق کے سامنے جھکیں. اسی طرح اگر ہندوؤں نے اپنے بزرگوں کی مورتیاں اور تصویریں بنانے میں ٹھوکر کھائی ہو اور ان کے وسیلہ سے پرمیشور تک رسائی چاہتے ہوں یا وسیلہ کے لئے رب کو قربان کر چکے ہوں تو انصاف سے بتلایئے کہ ہندو مشرکوں اور مسلمان مشرکوں میں خدا کے نزدیک کچھ زیادہ فرق رہ جائے گا یا دونوں اُس کی نظر میں یکساں مجرم ہوں گے. میرے خیال میں تو مسلمان مشرکوں کو ہندو مشرکوں سے شاید زیادہ ہی سزا ملے.

اللہ کا دین ایک ہے. خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی سب اللہ کے بندے اور بچے ہیں ان میں سے جو فطرت کے قوانین کی زیادہ پابندی کرتا ہے وہ عروج اور ترقی پاتا ہے. حد سے بڑھنے اور اعمالِ بد کی سزا سب کو یکساں ملتی ہے. مسلمان خدا کے آخری پیغام کے حامل ہیں. اس لئے ان کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں اُنھیں قولاً و فعلاً قرآن کے احکام پر عمل کرنے کی ضرورت ہے. ہندوؤں میں جو مذہبی تعصب ہے ہندو جو مسلمانوں کے خلاف زہر اُگلتے ہیں یہ تمام کا تمام بے اثر رہ جاتا ہے. اگر مسلمان قرآن مجید کے احکام کی متابعت میں ہندوؤں اور دوسری قوموں سے مصافحہ کریں اور خدا کے احکام محبت سے اُنھیں سنایا کریں.

سیاسی اتحاد

ہندوستان کے سیاسی اتحاد میں ہندو بہ حیثیت ایک وطن پرست اور مسلمان بہ حیثیت ایک اسلام پرست کے پیش کیا جاتا ہے. حالانکہ وطن پرستی کے سلسلہ میں مسلمان ہندوؤں سے کبھی پیچھے نہیں رہے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں جو حقائق اعداد و شمار کے شرمندۂ احسان ہیں. اُن سے مسلمانوں کی برتری ظاہر ہوتی ہے. والنٹیروں کو قید کرانا یا بڑے بڑے لیڈروں کا ایثار اور قید و بند کی تکالیف اٹھانے میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے کبھی کم نہیں رہی. کانگرس کی تحریک میں مسلمانوں کی تعداد کبھی قابلِ افسوس نہیں ہوئی. ہندوؤں میں کئی فرقے اور جماعتیں ایسی ہیں جو کانگریس میں شامل نہیں ہوئیں. مگر بدنام ہیں تو مسلمان. یہ ہمیں قبول ہے کہ مسلمانوں کی وہ جماعت بہت قوی اور مضبوط ہے جو کانگرس کے خلاف اپنا علیحدہ پلیٹ فارم بنائے ہوئے ہیں. اگر یہ جماعت کمزور یا ناقابلِ توجہ ہوتی تو مسلمانوں پر علیحدگی کا الزام نہ لگتا.

ہندو اور مسلمان دونوں انفرادی گفتگو میں ہمیشہ اتحاد اتحاد پکارتے اور اُس کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں. لیکن عملی زندگی میں وہ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے سے گریز کرتے ہیں. ہندو مسلم اتحاد میں سب سے بڑی رُکاوٹ سیاسی اتحاد ہے. ہندوستان کی موجودہ سیاسی حالت حکمران طبقہ کے غور و فکر کا نتیجہ ہے. برٹش حکومت اپنی ہوائی اور بحری جہازوں یا بری کثیر فوجوں کے بل بوتے پر دنیا کے ۱/۴ حصہ پر حکومت نہیں کر رہی بلکہ یہ برٹش ڈپلومیسی ہے جو سلطنت برطانیہ کی طاقت کا راز ہے جس دن برٹش ڈپلومیسی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اُسی دن یورپ کی کوئی ہم پلہ طاقت اس کا تیا پانچا کر ڈالے گی. اس لئے ہندوستانیوں کو حکمران جماعت کی جنگی قوت کا مقابلہ نہیں کرنا بلکہ اصل قوت اس کی ڈپلومیسی کا مقابلہ مقصود ہے.

برطانیہ کے دشمن کہا کرتے ہیں کہ تقسیم کرو اور حکومت کرو۔ اس کا مطمح نظر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اصول تو شاید ہر حکومت کا پہلا قانون ہوتا ہے خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی۔ مگر اس کے ذہنی اثرات اُس کے عملی تاثرات سے زیادہ خوفناک ہوتے ہیں۔ ہندوستانیوں کا فرض ہے کہ وہ ان زہریلے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی تجویز سوچیں۔

ہندوستان کا سیاسی دنگل سالہا سال سے قایم ہے، اور سیاسی مداری برابر شعبدہ بازی سے کام لے رہا ہے۔ نت نئے تماشے وہ اپنے پُراسرار تھیلے سے نکال کر تماشبینوں کے سامنے پھینک دیتا ہے جس کی نیرنگیوں میں وہ گم ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کے قابل ترین دماغ بھی ہندوستان کی تعمیر سیاسی آج تک نہ کرسکے۔ جب کبھی تقسیم کا سوال پیدا ہوتا ہے تو حقوق کی حفاظت کے لئے سب قومیں کٹ مرنے تو تیار ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان کی دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ ہندو بمثل بڑے بھائی کے ہیں۔ اور چونکہ انگریزوں نے ہندوستان کی سلطنت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لئے وہ کم از کم نصف صدی تک راندہ بارگاہ رہے اس عرصہ میں ہندو قوم بہت آگے نکل گئی۔ اگر مسلمانوں کو اب قدم اٹھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو محض اپنی مٹتی ہوئی ہستی کو بچانے کے لئے یا حکمران طبقہ چاہتا ہے کہ ہندوؤں کے مقابل ایک دوسری قوت بھی لا کھڑی کرے۔ یہ ضرورتیں یا اصول مسلمانوں کو سیاسی میدان میں کھینچ لائے ہیں۔ اس صورت میں ہندوؤں کو سوچنا چاہئے کہ ایک طرف تو حکومت کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کو دبانا اُن کا اصول ہے تو اس دوہری جنگ میں کیا کبھی وہ کامیاب بھی ہو سکیں گے۔

ہندو چونکہ آبادی میں، ترقی میں، تعلیم میں اور روپیہ میں مسلمانوں سے آگے نکل چکے ہیں اس لئے قربانی اُنھیں ہی کرنی پڑے گی۔ جو جگہیں وہ مسلمانوں کے لئے خالی کریں گے وہ گویا اپنی ملکیت کا حق کھو رہے ہیں۔ اصولاً اگر مسلمانوں کو ساتھ ملانے اور مادرِ وطن کو آزاد کرانے کے لئے ہندوؤں کو کچھ گرہ سے بھی دینا پڑے تو اُنھیں احتراز نہ کرنا چاہئے۔ گو مسلمان اپنے جائز قانونی حقوق سے ذرہ برابر بھی زیادہ نہیں چاہتے۔ لیکن ہندو کو اُنھیں وہ چیز واپس دیتے ہوئے دکھ ہوتا ہے جو اُن کی ملکیت قرار دی جاچکی تھی۔ یہ ہے سیاسی حقوق کی جنگ میں فساد کی جڑ۔ مگر ہندوؤں کو سوچنا چاہئے کہ اگر ملکی قوانین، اصلاحات اور حکمران جماعت کی وہ پالیسی جس سے وہ رعایا کی قوتوں میں توازن رکھنا چاہتی ہے۔ آہستہ آہستہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر لے آئی۔ تو اس صورت میں ہندوؤں کے پاس مسلمانوں کو دینے کے لئے کیا چیز رہ جائے گی۔ ہندو آج سے پچاس سال بعد اس وقت کو یاد کرکے افسوس کریں گے جب مسلمانوں پر منت کرم داشتن کی شل وہ احسان عظیم کر سکتے تھے۔

بعض پولیٹیکل رہنما کہا کرتے ہیں کہ پہلے غیر ملکی حکومت کو باہر نکالو پھر حقوق کی تقسیم کر لینا۔ یہ خیال نہ صرف عیارانہ ہے بلکہ احمقانہ بھی ہے۔ ایسے لوگ دنیا کی سیاسیات اور قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ سے بے بہرہ ہیں۔ اُنہیں معلوم ہونا چاہئیے کہ عراق اور عرب نے ترکوں کے خلاف اس وقت تک بغاوت نہیں کی جب تک انہیں کامل آزادی کا پروانہ نہیں دے دیا گیا تھا۔ مصریوں نے برطانوی گرفت کو ڈھیلا کرانے میں اُس وقت تک کامیابی حاصل نہیں کی جب تک مصری مسلمانوں نے مصری عیسائیوں کو زاید حقوق دے کر ساتھ نہیں ملا لیا۔ اب مصر کے عیسائی عیسائی حکومت سے نبرد آزما ہونے کو تیار ہیں اور مصری مسلمانوں کے پسینے پر خون بہاتے ہیں۔ کیا مصریوں نے بھی عیسائیوں سے یہ کہا تھا کہ پہلے انگریزوں کو نکالو اور پھر حقوق کی تقسیم کر لینا؟ سیاسیات میں ہمیشہ حقوق کا مسئلہ اول طے کر لیا جاتا ہے تاکہ مخالف قوت کبھی وقت پر رعایا کے مختلف طبقوں میں سے بعض کو توڑ نہ لے۔

میں اس مضمون میں مسلمانوں کی وکالت نہیں کر رہا۔ ہندو بڑے بھائی ہیں۔ وہ ترقی کی رفتار میں پچاس سال آگے ہیں۔ اس لئے وہ ملک کی حکومت اور ترقی میں زیادہ حصہ پائے ہوئے ہیں۔ اگر اُنھیں چھوٹے بھائی کو اُس کے تعلیم یافتہ اور جوان ہو جانے پر کچھ دینا پڑے تو خنداں پیشانی سے دینا چاہئیے۔ اگر ہندو خنداں پیشانی سے نہیں دیں گے تو آج نہیں تو پچاس سال بعد بھی مسلمانوں کو اُن کا حق مل جائیگا۔ پھر کیوں نہ ہندو اس وقت تھوڑی سی قربانی کرکے مسلمانوں کو احسان مند بنا لیں اور اتحاد کی چٹان قایم کر لیں جو آئندہ سیاسی جنگ میں ہندوستان کی آزادی کی ضامن ہوگی۔ اگر ہندوؤں نے آج یہ موقع کھو دیا تو پھر آئندہ نہ اس کا کوئی موقعہ آئے گا اور نہ ہی پھر اس کا کچھ اثر ہوگا۔

حقوق کی تقسیم کا مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں ہے جتنا سیاسی مشکرین ڈپلومیٹوں نے اسے بنا رکھا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں جو تقسیم نشستوں کی جاری ہے وہ محض دھوکہ اور فریب اور ہمیشہ کی جنگ کا ذریعہ ہے۔ ہر قوم یہ چاہنے لگی

ہے کہ کوئی دوسری قوم اس پر حکومت نہ کرے۔ اس کے صرف دو علاج ہیں۔

اوّل یہ ہے نشستوں کی تقسیم آبادی کے اصول کے مطابق کی جائے یعنی جہاں ہندو جس تعداد میں ہوں اسی تعداد میں انھیں نشستیں دی جائیں اور مسلمان جس تعداد میں ہوں انھیں اتنی ہی نشستیں ملیں جن کے وہ حقدار ہوں۔ ویٹج سسٹم کو قطعاً سامنے نہ لایا جائے۔ اس اصول پر اگر ہندوستان میں نشستوں کی تقسیم ہو تو چار صوبوں بنگال۔ پنجاب۔ صوبہ سرحد اور سندھ پر مسلمانوں کی حکومت قایم ہو جاتی ہے اور بمبئی۔ مدراس۔ آسام۔ صوبہ متوسط۔ صوبہ متحدہ۔ دہلی وغیرہ باقی صوبوں پر ہندوؤں کی حکومت ہوگی۔ اگر سات صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت گوارا کی جاسکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ چار صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت کیوں برداشت نہ کی جائے۔ پھر ایک لطف اور ہے کہ صوبہ سرحد اور صوبہ سندھ پر تو مسلمانوں کی اکثریت برداشت کی جاتی ہے۔ لیکن پنجاب پر یہ ظلم گوارا نہیں کیا جاتا۔ یہ کیا صریحاً واضح اصولوں سے انحراف نہیں ہے؟

دوسرا علاج یہ ہے کہ کسی بھی صوبہ میں کسی قوم کی اکثریت نہ رہے۔ مثلاً مدراس میں ہندو اکثریت اقلیت میں بدل دی جائے اور صوبہ سرحد کی مسلمان اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دیا جائے۔ وہی اصول کارفرما ہو سکتے ہیں جب تک ان دونوں میں سے ایک اصول کو تسلیم کرکے اُس پر عمل نہیں کیا جائیگا۔ نشستوں کی جنگ کبھی بھی ختم نہ ہوگی۔

تیسری صورت ایک اور بھی ہے اس کا بھی تذکرہ کر دیا جائے۔ وہ یہ ہے کہ کسی جگہ بھی جہاں کسی قوم کو اکثریت حاصل ہے۔ ۵ فی صدی سے زیادہ حقوق نہ دئے جائیں اور باقی نشستیں اقلیتوں کو دیدی جائیں۔ بہرحال جو اصول بھی ہو وہ سب جگہ کے لئے ایک ہی ہونا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ پنجاب اور بنگال اس سے مستثنیٰ رکھے جائیں۔

نشستوں کے حقوق کے بعد ملازمتوں کا سوال ہے۔ بعض محکمے ایسے ہیں کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے مگر بیشتر محکموں میں ہندو زیادہ ہیں۔ اس کا باعث وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ یعنی مسلمان انگریزوں کو سلطنت دینے کے بعد پچاس سال تک راندۂ بارگاہ بنا رہا۔ اور ہندو انگریزوں کا چہیتا بیٹا۔ ہندو تعلیم میں بڑھتے چلے گئے اور مسلمان حجرہ نشین رہے۔ اس لئے ہندوؤں کا لازماً تمام عہدوں پر قبضہ کر لینا فطری تھا۔ اب جب مسلمانوں کو ملازمتیں دینے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو ہندو بھائی قابلیت قابلیت پکارتے ہیں۔ اگر قابلیت سے مراد کسی مقررہ امتحان کی سند یونیورسٹی سے حاصل کرنا ہے تو یہ صحیح معیار ہے لیکن اگر اس سے مراد مقابلہ کا امتحان ہے تو یہ لفظی جنگ ہے جس محکمہ پر ہندو قابض ہیں۔ وہاں مقابلہ کے امتحان میں کسی مسلمان کا کامیاب ہو جانا محال ہے اور جہاں مسلمان قابض ہیں وہ ہندو کو کبھی بھی قریب نہ پھٹکنے دیں گے۔ اس لئے عہدوں کی تقسیم آبادی کے لحاظ سے ہونی چاہئے۔ تاکہ بے انصافی نہ ہو اور قابلیت کا معیار یونیورسٹی کی سندیں ہوں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ نالائق مسلمان لے جائیں۔

معاشرتی اتحاد

قوموں کے میل ملاپ اور دلی کدورتوں کو دور کرنے کے لئے معاشرتی اتحاد کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں ہمارے ملک نے بھی کسی قدر ترقی ضرور کی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے طرزِ معاشرت اور لباس و خوراک میں ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اور ایک دوسرے کے قریب ہونے کی کوشش کی ہے۔ آج سے سو سال بعد لباس و طرزِ معاشرت شکل و صورت میں دونوں میں بہت کم فرق رہ جائیگا۔ اور شاید ہندو اور مسلمانوں کو شناخت کرنے کے لئے نام پوچھنے کی ضرورت پیش آیا کرے گی۔

یہ یک جہتی بھی ملکی ترقی کے لئے لازمی ہے۔ لیکن اس مسئلہ کو مرورِ ایام کے سپرد کر دینا مناسب نہیں۔ اب بھی دونوں قوموں کا فرض ہے کہ وہ مناسب پیش قدمی کرتی رہیں۔ ہندو مسلمانوں کے درمیان سب سے بڑی معاشرتی تفریق ہندوستان کے ریلوے اسٹیشنوں پر نظر آتی ہے جہاں مسلمان پانی اور ہندو پانی کے آوازے دن میں کئی بار سنائی دیتے ہیں۔ یہ منظم اور مسلسل اور مؤثر پروپگنڈا ہے جو ہندوؤں کو مسلمانوں سے جدا کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ خدا کی زمین پر خدا کا پیدا کیا ہوا پوتر جل دونوں قوموں کے لئے سرچشمۂ علیحدگی اور چھوت چھات کا ذریعہ بن گیا ہے۔

جب تک ہندوستان سے چھوت چھات دُور نہ ہو گی ہندوستانی کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ جو قومیں مُردار خوار گندے اور ناپاک اچھوتوں کو سیاسی وجوہ پر گلے لگانا چاہتی ہیں وہ صاف ستھرے۔ خوش پوش۔ خوش جمال مسلمانوں کو گلے لگانے سے گریز کرتی ہے؟ کیا وہ خدا کی نظروں میں کبھی سرخرو ہو سکتی ہیں۔ اور اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب ہو سکیں گی؟

معاشرتی اتحاد کے لئے ہر شہر میں ہندو مسلمانوں کے مشترکہ کلب کھولے

جائیں جہاں دونوں قوموں کے سپوت کھانے پینے میں یک جائی اور یک رنگی کا منظر پیش کریں۔ یہی چیز اتحاد کا سنگ بنیاد بن جائیگی۔

اخباری اتحاد

ہندو مسلم اتحاد کے لئے اخباری اتحاد کی بھی اشد ضرورت ہے۔ دونوں قوموں میں نفاق کی آگ کو ہوا دینے میں اخبارات نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ مذہبی اور سیاسی لیڈروں کی نفاق انگیز تقریریں تو کبھی کبھی ہوا کرتی ہیں مگر اخبارات ہر روز تازہ ترین زہر ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیتے ہیں۔ اس لئے جو لوگ چاہتے ہیں کہ ملک میں اتحاد قایم ہو اُنھیں چاہئے کہ ملک کے اخبارات میں بھی اتحاد کرائیں۔ اس غرض کے لئے اخبار نویسوں کی ایک کانفرنس ہونی چاہیئے جس میں اس مسئلہ پر شرح و بسط سے بحث کی جائے اور وہ قواعد وضع کئے جائیں جن کے ماتحت چل کر وہ اتحاد کے لئے مفید بن سکتے ہیں۔ "ایک ہندو دیوی کا فرار" کی جگہ "ایک عورت کا فرار" اور "ایک مسلمان بد معاش کی گرفتاری" کی جگہ "ایک بد معاش کی گرفتاری" لکھنے سے اخبار نویسی میں کچھ کمی نہیں رہجاتی۔

اگر مسجد کے آگے باجا بجانے کا حق مانگنا ہندوؤں کا پیدائشی حق اور قانونی حق ہے۔ تو کبھی ہندو مسلمان ہمسایوں کے حق ہمسائیگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر مسجد کے آگے سے گزرتے وقت نماز کے وقت میں صرف دو منٹ کے لئے باجہ بند کردیں گے تو انھیں نقصان تو نہیں ہوگا۔ اگر مسلمان گائے کشی میں ہندوؤں کے جذبات کا احترام کریں، گاؤکشی ترک کردیں تو ان کے حق گاؤکشی کو نقصان تو نہیں پہنچتا۔ اللہ پاک نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

"تم میں سے ہر ایک گروہ کے لئے خاص طور و طریقہ اور دستور العمل ہم نے بنا دیا ہے۔ ہر قوم اور ہر جماعت کے لئے ہم نے ایک خاص طریق عبادت مقرر کردیا ہے جس کے مطابق وہ عبادت کرتے ہیں۔ پس لوگ اس امر خاص میں تجھ سے نزاع نہ کریں اور تو اپنے پروردگار کی طرف بُلاتا رہ۔ بیشک تو سیدھے راستے پر ہے۔"

اسلام کی یہ رواداری بے مثال ہے۔ اگر مسلمان قرآن کی تعلیم کو پس پشت ڈال دیں گے تو دین اور دنیا دونوں میں پریشان ہوں گے۔ قرآن مجید میں بتوں تک کو گالی دینے سے منع کیا ہے۔ تاکہ غیر قومیں تمہارے خدا کو گالی نہ دیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں سر پھٹول کرانے والی باتیں بالکل سطحی اور سرسری ہیں۔ جھٹکہ۔ اذان۔ باجا۔ آرتی۔ نماز۔ گائے کشی۔ پیپل کا درخت محرم اور دسہرہ کے جلوس۔ معمولی معمولی باتوں پر دونوں قومیں ہمیشہ برسر جنگ ہوجاتی ہیں۔ اُن کا علاج یہ ہے کہ مسلمانوں کے تہواروں پر شہر کا انتظام ہندو والنٹیروں کے سپرد ہو۔ اور ہندو تہواروں پر انتظام کی ذمہ داری مسلمان لیں تو یہ جنگ تو ہمیشہ کے لئے ختم ہوجاتی ہے۔ گائے کشی۔ نماز اور باجا کے لئے اصول وضع کیلئے جائیں جن پر ہندوستان کے ہر حصہ میں عمل کیا جائے۔

لسانی اتحاد

کوئی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک اس میں لسانی اتحاد نہ ہو۔ اگر ہندوستان میں مدراسی کی بات پنجابی نہ سمجھے تو بتلائے کہ ہمارا ملک کہاں اور ہم کہاں۔ ہم ہندوستانی نہ ہوئے۔ افریقی اور روسی ہوئے جو ایک دوسرے کی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔ حالانکہ ہمارا رشتہ وطن کا رشتہ ہے جو خون کے رشتہ سے بھی قوی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسی زبان ہو۔ جسے ہندوستانی سمجھ سکیں اور بول سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایسی زبان انگریزی ہوگی یا ہو رہی ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے ہندوستان میں پڑھے لکھوں کی تعداد ماشاء اللہ صرف سات فیصدی ہے۔ گویا سو میں سے ۹۳ کورے ہیں۔ اور ان سات پڑھے لکھوں میں تین انگریزی جانتے ہیں اور چار اپنی لوکل زبانیں۔ اب بتلائے کہ ۹۷ فیصدی لوگ انگریزی نہیں سمجھ سکتے تو اُسے ہندوستان کی لنگا فرینکا بننے کا حق کیسے پہونچ سکتا ہے۔ انگریزی تو حکمران قوم کی نشانی ہے جس طرح سے مسلمانوں کی حکومت کی نشانی فارسی زبان تھی۔ انگریزی زیادہ رائج ہے اور فارسی اب مٹتی جاتی ہے۔ باقی دو اور زبانیں ہیں جنھیں بہت احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ سنسکرت اور عربی ہیں۔ سنسکرت ہندوؤں کی مذہبی زبان ہے۔ اور عربی مسلمانوں کی۔ اس سے زیادہ انھیں ہندوستان میں اہمیت حاصل نہیں۔

ہندوستان میں لسانی اتحاد کی اشد ضرورت ہے۔ مگر اس کے لئے کسی کوشش کی ضرورت نہیں۔ یہ زبان کا مسئلہ ہے اور خود بخود طے ہوجایا کرتا ہے۔ بنگالی زبان بنگال میں بولی جاتی ہے۔ مرہٹی اور گجراتی صوبہ بمبئی میں۔ تامل اور تلنگو جنوبی ہند اور مدراس میں۔ ہندی صوبہ متحدہ میں۔ پنجاب میں

پنجابی ہے یہ تو بولنے کی زبانیں ہوئیں۔ علمی حیثیت سے بنگالی سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ پھر گجراتی کا نمبر ہے۔ پھر ہندی کا اور آخر میں اردو کا۔

لیکن اردو کو ایک اور خصوصیت بھی حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اُسے سارے ہندوستان میں بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ ہمارا ملک مثل ایک براعظم کے ہے جس میں ۳۰ کروڑ آدمی بستے اور کوئی دوسو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس میں اگر کسی ایک زبان سے کام چلایا جا سکتا ہے تو وہ صرف اردو ہے۔ مدراسی اور بنگالی جو تلنگو اور پنجابی بولنے کے عادی ہیں، اردو کے ذریعہ سے ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے ہیں۔ یہ طاقت اور کسی زبان کو نہ حاصل ہے نہ ہوگی۔

اردو ہندی کی جنگ کا مسئلہ بھی یار لوگوں نے منافرت کا ایک ذریعہ بنالیا ہے۔ اردو ہندی کی کوئی جنگ نہیں۔ اور اگر ہے تو صرف ایک صوبہ تک محدود ہے۔ وہ صوبہ متحدہ ہے۔ جہاں اُردو ہندی دوش بدوش چل رہی ہیں۔ اردو ہندی غلبہ پائے ہوئے ہے۔ ہندی کا مسئلہ آل انڈیا مسئلہ نہیں ہے۔

ذرا ہندی بمبئی میں قدم تو جا کر دکھائے! گجراتی زبان اُسے دھکے مار کر باہر نکال دیگی۔ بنگال کا رُخ کرے گی تو بنگالی اُس کی آنکھیں نکال لے گی۔ پنجاب کی طرف قدم اٹھائے گی تو وہاں سے اردو نکال جائے گی۔ ہندی کے لئے ملک کے کسی صوبہ میں گنجائش نہیں ہر صوبے کی اپنی زبان زیادہ قوی ہے۔ بنگالی۔ گجراتی اور تامل کا مقابلہ ہندی زبان کبھی نہ کر سکے گی نہ اُن کی جگہ لے سکیگی۔ اس لئے ہندی کا مسئلہ آل انڈیا مسئلہ نہیں ہے۔

اُردو نہ ہندوؤں کی ہے نہ مسلمانوں کی ہے۔ یہ زبان ہندوستان کی متحدہ زبان ہے جس کو جانتے ہوئے ہم ہندوستان بھر کا سفر کر سکتے اور ایک دوسرے کی زبان کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور جب کبھی ہندوستان کی قوموں میں اتحاد کرائے گی تو یہی زبان کرائے گی۔ اس لئے ہندو مسلم اتحاد کے حامیوں کو اردو کی جے کا نعرہ ہمیشہ بلند کرنا چاہیئے۔

پھر شمع کو شمع طور کر دے ساقی
ظلمات شب کو نور کر دے ساقی
جنت کی دوری سے ہے دنیا میں بہار
زمین کو جنت سے دور کر دے ساقی

ساقی قدح بادہ گلگوں دے
حلقہ میں لئے ہوئے ہے دل کو شب ماہ
ہم اور تصور بہشت و کوثر
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

ایک تقابُل

مال کا وہ درجہ جس میں ریل کے مزدُور تھے! — آکے ٹھہرا دوسرے درجے کے بالکل سامنے

اُس طرف ناپاکیاں تھیں، خاک کا انبار تھا — اِس طرف ہر ذرّہ گویا مصر کا بازار تھا

اُس طرف وہ درجہ کیا، اِک دیدۂ بے نُور تھا — اِس طرف تقدیر سے روشن چراغِ طُور تھا

اُس طرف جورِ خزاں تھا، اِس طرف لُطفِ بہار — اُس طرف مزدُور تھا، اور اِس طرف سرمایہ دار

اُس طرف جانِ حزیں تھی، موسمی جلوؤں سے دُور — اِس طرف تھا سایۂ ابرِ خراماں کا سُرُور

اُس طرف سامانِ دل تنگی تھا چُولھے کا دُھواں — اِس طرف چہروں پہ تھیں ٹھنڈی ہوا کی سُرخیاں

اُس طرف ہر آنکھ میں غلطیدہ تھی فکرِ معاش — اِس طرف چہرے تھے روشن، اور سینے بے خراش

اُس طرف سرگشتہ تھا بے برگ و باری کا شعُور — اِس طرف اُٹھلا رہا تھا ساز و ساماں کا غرُور

چیتھڑوں میں اُس طرف لپٹی ہوئی تھی زندگی، — اِس طرف تھی مخمل و سنجاب کی رخشندگی،

اُس طرف ہمت کا سر رکھا ہُوا تھا خاک پر — اِس طرف تھے ولولوں کے نقشِ پا افلاک پر

اُس طرف موجِ نفس، اک نالۂ بیتاب بھی — اِس طرف تارِ سکُوں پر ذہن کی مضراب تھی

آہ اِن دونوں میں اک شے مشترک جوہر نہ تھی — اِن کے جوتوں پر چمک تھی، اُن کے چہروں پر نہ تھی

اُس طرف دردِ زیاں تھا، اِس طرف تمکینِ سُود — ہو رہی تھی آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ گُفت و شُنُود

اللہ اللہ اِس قدر عدل و تناسُب کی کمی! — اُس طرف بھی آدمی تھے، اِس طرف بھی آدمی

کوئی محرُوم، اور کوئی رحمتوں سے بہرہ مند — آدمی، اور آدمی میں اِس قدر پست و بُلند

آہ اِس منزل سے بے ماتم گزر سکتا ہے کون؟
جُز خُدا اِس ظُلم کو برداشت کر سکتا ہے کون؟

(جوشؔ)

مردِ مضحک

وکٹر ہیوگو کے ناول "لافنگ مین" کا ایک باب
قومِ کاپرشیکو کا تعارف

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

(از جناب اسرائیل احمد صاحب سکندرآباد دکن)

(۱)

اِس وقت کون ہے جو لفظِ "کاپرشیکو" کو جانتا ہو، یا اُس کے معنی بیان کرسکتا ہو؟

تاہم کاپرشیکو تاریخ یورپ کے ایک دَور میں روشناس برِاعظم اور آشوبِ عالم رہ چکے ہیں۔

کاپرشیکو آوارہ گرد لوگوں کی ایک جماعت تھی جن کے چہرے بڑے مہیب تھے اور جن کے خدوخال کا مرقع کھینچنا قلم کے اِمکان سے باہر ہے: اِس گروہِ یاجوج وماجوج نے سترھویں صدی عیسوی میں خروج کیا، اٹھارہویں صدی میں پردۂ گمنامی میں چلے گئے، اور انیسویں صدی میں مفقود الخبر ہوگئے۔ قوم کاپرشیکو تاریخ یورپ کے ماضی وحال کے مابین ایک برزخی رشتۂ اتصال ہے، اور عہدِ قدیم کی ہیئت اجتماعیہ کی ایک خصوصیتِ خاصہ کی حامل! وہ ماضیٔ بعید کے بدنما چہرۂ انسانیت کا ایک داغ ہیں! تاریخ کی دقت پیما آنکھ کو جو ہر چیز کا ایک نظارۂ طائرہ کرنا چاہتی ہے، کاپرشیکو لوگ غلامی کی ہولناک ترین صورت کے شواہد کے زمرے میں نظر آتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کی اپنے بھائیوں کے ہاتھوں بیع کا واقعہ اُنہی کی تاریخ کہنہ کا ایک بابِ پارینہ ہے! ہسپانیہ اور انگلستان کے قدیم مجموعہ ہائے تعزیرات کے صفحات میں اُن کے مجرمانہ نقوشِ قدم دیکھے جاسکتے ہیں۔ صحرا میں کسی وحشی انسان کے نشانِ پا کی طرح قوم کاپرشیکو کے خوفناک وجود کے آثار انگریز قوم کی گوناگوں اور رنگارنگ کتابِ آئین میں جابجا نظر آتے ہیں۔ کاپرشیکو ہسپانوی لغت کا ایک مرکب لفظ ہے جس کے معنی ہیں "بچہ فروش لوگ":——

چنانچہ کاپرشیکو لوگ بچوں کی تجارت کیا کرتے تھے۔ وہ بچوں کی خرید وفروخت کرتے تھے۔ لیکن وہ بچوں کو چُراتے نہ تھے! بچوں کا سرقہ واغوا اسی قسم کے کاروبار کا ایک دوسرا شعبہ تھا!

اچھا، تو وہ اِن بچوں کا کیا کیا کرتے تھے؟

وہ اُن سے عجیب الہیئت انسانوں کی "تخلیق جدید" کیا کرتے تھے!

یہ کیوں؟

صرف ہنسنے ہنسانے کے لئے!

لوگوں کو آخر ہنسی دل لگی کی ضرورت ہوتی ہی ہے۔ بادشاہوں کے لئے یہ تفریح وتفنن لازمی ہے: جس طرح ایک تماشا گر سرکس کی دلچسپی کا سامان ہوا کرتا ہے اسی طرح ایک مسخرہ شاہی دربار کی خوش طبعی وشگفتگی کی جان ہوتا ہے! بعض اوقات عام لوگ اپنی ضیافتِ طبع کے لئے جو کوششیں اور کاوشیں کیا کرتے ہیں وہ ایک حکیم کے لئے بھی دعوتِ نظر ہوا کرتی ہیں۔ ان چند تعارفی صفحات میں ہم کس چیز کا خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں؟—— ایک ایسی چیز کا جس کے ذکر سے تاریخ کے اوراق تاریک ہیں، اور خوش باش وتفریح باز دولتمندوں کے مردم آزارانہ اعمالنامے رنگین!

(۲)

"بچہ بحیثیتِ بازیچہ": ایسی چیز کا تاریخ میں وجود ہے:—— ایسی چیز آج بھی معرضِ وجود میں ہے: معشرِ انسانی کے ابتدائی دَور میں، جبکہ بنی آدم عالمِ وحشت وبدویت میں زندگی بسر کرتے تھے، یہ چیز اک مستقل صنفِ تجارت تھی بعض دور میں

صدی تاریخِ بشری کے اِسی دَور کا نشان رہا ہے! یہ ایسا زمانہ تھا جو بازنطینی عہد کے سارے خصوصیات اپنے اندر رکھتا تھا۔ وہ سادگی و بدکاری، لطافت و وحشت کے اجتماعِ متضادین کا مظہر تھا؛ تہذیبِ انسانی کے عناصرِ مختلفہ کا یہ ایک طرفہ معجون مرکب تھا! اُس کی تشبیہ اک ایسے درندے سے دی جاسکتی ہے جو اپنے خون آلودہ ہاتھ پر ایک سوچ تبسم بھی رکھتا ہو! اُس عہد کے مصنفین اِس قسم کے مناظر کا مرقع کھینچتے ہیں الغرض اس سترھویں صدی کے لوگ بچوں کی جنس کے بڑے بڑے تاک التجار تھے؛ شاہی درباروں کے بعض خوشامدی مورخین نے اِن خونی حوادث کا اخفا کیا ہے لیکن دوسرے ضمنی اذکار میں نادانستہ اپنا راز طشت از بام کر گئے ہیں!

جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

ایک "انسانی کھلونے" (انسانی بچے) کو پورا ساختہ پرداختہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کی تربیت ابتدائے عمر ہی سے شروع کر دی جائے۔ اگر ایک بچے کو بونا بنانا ہے تو اُس کے قد و قامت کے نشوونما پر بچپن ہی سے گرفت قایم کر دینی چاہئے۔ ہم بچوں کے مجسمہ معصومیت بچپنے کو اپنے بیدردانہ لہو و لعب کا کیسا آماجگاہ بناتے ہیں! ایک صحیح و سالم جسم کا بچہ ہمارے لئے کوئی دلچسپ آلۂ تفریح نہیں ہوتا۔

ہمارا ذوقِ تماشا اک کوزہ پُشت معصوم کو چاہتا ہے نرخ

طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم!

پس اِس طرح ایک فن "ظہور میں آگیا تھا، ایسے "ماہرینِ فن" پیدا ہو گئے تھے جو ایک صحیح الاعضاء انسان کو لیتے تھے اور اُس کی ہیئت بدنی بالکل مسخ کر دیا کرتے تھے؛ وہ ایک چہرے کو لیتے اور اُس پر "سُیکا" لگا دیتے! جسم کے مختلف حصوں کی نمو کو حسبِ ضرورت روک کر خشک کر دیتے! وہ انسانوں کے خط و خال کی نوک پلک بالکل اک ہیولیٰ میں تبدیل کر دیتے۔ اور پھر اِس خمیر سے نئی شکلیں ڈھالتے!! یہ نسخ و تشکیل، خرق و التیام کا فن اپنے مقررہ اصول و قواعد، شرائط و ضوابط رکھتا تھا! سارے مدارجِ ارتقا سے گزر کر اُسے ایک "مستقل سائنس" بنا دیا گیا تھا! "تغییر خلق اللہ" کے اس ملعونانہ "عمل الشیطان" کے "گندہ ہگر ایجاد بندہ" کاروبار کی تفصیلات کو کس کس طرح بیان کیا جائے؟! صناعِ ازل نے حسین و رجبین چہرے بنائے تھے، مگر انھوں نے اُن کی آنکھوں میں اک کجی سی پیدا کر دی تھی! مصورِ حقیقی نے تمام خط و خال میں خوش قطعی و ہم آہنگی کا التزام کیا تھا، مگر انھوں نے حُسن و جمال کے اِن سارے لوازم کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا تھا اور بالکل ان کے برعکس جدید پیکر پیدا کر دیے تھے؛ خالقِ بیچوں و چگوں نے اک ایسا مکمل مجسمۂ حُسن بنایا تھا جس میں کہیں انگلی رکھنے کی جگہ نہ تھی، مگر اِن گدھوں نے بزعمِ خود اِصلاح اُس کی صورت گری کی تھی:—

لطف یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ کے اِن مُبصرین کے فتووں کی بنا پر قابلِ ترجیح نمونہ یہ آخر الذکر چیز ہی ہوتی تھی! ؎

حجام ہر دو دست ترا قطع لازم است

اصلاح می دہی خطِ پروردگار را!

(۳)

چہروں کے فسخ و تخریب کی صنعت کا وسیع پیمانے پر دور دورہ تھا۔ فنون کے بہت سے شعبے پیدا ہو گئے تھے۔

سلطانِ ترکی اور پاپائے روما ہر دو کو یکساں طور پر ان کی ضرورت ہوا کرتی تھی: مقدم الذکر کو اپنی حرمسرا کی حفاظت کے لئے۔ اور موخر الذکر کو کلیسا کے اندر بعض فرائضِ عبادت کی ادائی کے لئے! جس نوع کے مسخ انسانوں کی بھرتی اِن محلوں میں ہُوا کرتی تھی۔ وہ ایسے عجیب الخلقت و غریب الہیئت ہوتے تھے کہ اک نہایت چابکدست مصور کا موقلم بھی اُن کی شبیہ پیش کرنے سے عاجز ہے! بمشکل اُن پر نوعِ انسانی کے افراد کا اطلاق ہو سکتا تھا! سلطانِ عثمان کے محلات اور پاپائے اعظم کے معابد میں اِن خلقا جدیدہ کے الگ الگ نمونے استعمال ہوا کرتے تھے۔

کیتھرائن ثانی کی خود نوشت روزنامچہ کے اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں جس کو بمشکل سو برس کا عرصہ گذرا ہوگا پایۂ تخت سینٹ پیٹرسبرگ میں جب کبھی زار یا زارینہ کا عتابِ شاہی خاندان کے کسی رُکن پر نازل ہوتا تو اُسے قصر کے اندرونی بندیخانے میں چونا لوکر کے چھوڑ دیا جاتا تھا، جہاں وہ اس ہیئت کذائی مسلسل کئی کئی شبانہ روز رہتا! یہاں اُس کو بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرنا پڑتا۔ اک کڑک مرغی کی آواز سے کٹ کٹ کرنا ہوتا۔ اور اک مرغی ہی کی طرح زمین سے اپنی غذا بذریعۂ منقارِ دہن اٹھانا پڑتا!!

ملوکیت کی یہ خلاقانہ جدت نوازیاں اب باقی نہیں۔ لیکن اُس حد تک اُن کا استیصال بھی نہیں ہوا ہے جتنا لوگوں کا خیال ہوگا! آج بھی درباری لوگ اپنے آقائے ولی نعمت کی خوشنودیٔ مزاج کے لئے اُس آواز سے تھوڑا ہی مختلف لب لہجہ اختیار کیا کرتے ہیں جو معتوبینِ زار کی "ماکیاں نوائی" میں ہوا کرتی تھی!! اور بہت سے ننگِ انسانیت وابستگانِ دامنِ دولت اب بھی (اگر کچھڑے نہیں تو) خاکِ ذلت سے ضرور اپنے رزقِ مقسوم کے دانے چُنتے ہیں!!

خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ ذاتِ شاہانہ غلطی و غلط کاری سے مبرّا و منزّہ

ہوا کرتی ہے پس اُن کی مطلق العنانیوں اور خوش فعلیوں کا بُرا ماننے کی ضرورت نہیں : بدمزگی کا جو کچھ راز ہے وہ اک غلط فہمی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ع

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

بادشاہ سلامت کا منطق ہمایونی بھی تناقض بیانی سے بالاتر ہوا کرتا ہے اس لئے یہ تنبیہہ حرفاً حرفاً صحیح ہے کہ ؎

اگر شہ روز را گوید شب است

بباید گفت اینک ماہ و پرویں !

الغرض ع

ہمیں تو فخر ہے وہ جو کچھ کہیں بجا کہئے !

یہ بلاتمیز ہمنوائی ہمیشہ ہم آہنگ مصلحت ہوا کرتی ہے :

تاہم شہنشاہ لوئی چہارم اپنے قصر وارسائی میں کسی شہزادے یا امیر کو مرغا مرغی بنانا اپنے لئے زیبا نہ سمجھتا تھا : جو چیز روس یا انگلستان میں شاہی آداب مجلس میں شمار ہوتی تھی اس کو فرانسیسی "لوئی اعظم" مقدس سینٹ لوئی کے تاج کی تقدیس کے منافی خیال کرتا تھا : ہمیں وہ ماجرا یاد ہے کہ جب مادام ہینریٹ اپنے درباری تعلق کے ادب و وقار کو ایسا بھول گئی کہ (اگرچہ خواب ہی میں سہی) اُس کو ایک مرغی نظر آئی تو شہنشاہ کیسا برافروختہ ہوا ہے : حقیقتہً اک درباری خاتون کی پانگاہِ بلند ہے۔ یہ بات بہت ہی فروتر ہے کہ اُسے ایسی حقارت انگیزی اور پست فطرتی کے مناظر دکھائی دیں : بارگاہِ سلطانی کی فضائے قدس میں رہ کر مرغی خانے کے غلیظ صحن کا خواب دیکھنا واقعی کتنی رکیک حرکت ہے۔

بایہمہ عامیانہ، تاریخی روایات نے لوئی کو بُری طرح ملعون کیا ہے، لوئی کی طرح ماسوبیٹ بھی اسی تاریخی ناانصافی کا شکار رہا ہے۔

(۴)

الغرض سترہویں صدی میں تمام براعظم یورپ کے اندر کاپرشیکو لوگوں کی طرف سے بچوں کی تجارت کا بازار گرم تھا۔ وہ بچوں کو خریدتے تھے فطرت کی اس خام جنس پر اپنی قلمکاری کرتے تھے اور خدا کی صناعی کو اپنی کاریگری کے نمونے بنا بنا کر دوبارہ بیچ ڈالتے تھے مدت دراز تک قوم کاپرشیکو نے اپنی ہستی اور اپنے مخصوص مشاغل کو صیغۂ راز میں رکھنے کی چنداں پرواہ نہ کی۔ بعض اوقات نظامِ اجتماعی کے بعض آداب و رسوم ایسے ہوتے ہیں جو اس قسم کے ظالمانہ کاروبار پر ایک پردہ پوشانہ نقاب ڈال دیا کرتے ہیں جس کے زیرِ سایہ یہ مکروہ اعمال بے غل وغش سرسبز ہوتے رہتے ہیں۔ خود ہمارے زمانہ میں بھی ایک ایسی نظیر موجود ہے۔ ہمارا روئے سخن ہسپانیہ کی اُس جماعت کی طرف ہے جس کا بانی اور سرغنہ مشہور بدمعاش ریان سیلے تھا۔ اس تحریک کا دورِ حیات ۱۸۳۴ء سے ۱۸۶۹ء تک ہے۔ یہ ملک کے پورے تین صوبوں. بلنشیہ۔ الیکانٹے۔ مرسیہ پر مسلط ہوگئی تھی، اور مسلسل تیس سال تک اُس نے اس وسیع خطے کی آبادی کو لرزہ براندام رکھا۔

انگلستان میں بھی خاندان اسٹوارٹ کے تاجداروں کے عہد میں کاپرشیکو کے تعلقات دربار کے ساتھ کچھ غیر خوشگوار نہ تھے۔ بعض اوقات تو خود حکومت کو اپنی خاص اغراض کے لئے ان لوگوں سے کام لینے کی ضرورت ہوا کرتی تھی، اور جیمس ثانی کے دورِ حکومت میں تو وہ دربار کا ایک مستقل آلۂ کار بن گئے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ اُن خاندانوں کو جو حکومت کے ساتھ کسی قسم کی سرتابی کیا کرتے تھے، یا کسی اور طرح سرکاری کارروائیوں میں حائل یا حارج ہوا کرتے تھے۔ منتشر کر دیا جاتا تھا۔ بعض دفعہ ان کی نسل ہی منقطع کر دی جاتی تھی۔ کبھی اُن کے ورثار اور پسماندگان کو محجوب الارث قرار دیدیا جاتا تھا۔ نیز وقتاً فوقتاً شجرِ خاندان کی ایک شاخ کو دوسری شاخ سے دست وگریباں کرکے خراب کر دیا جاتا تھا! کاپرشیکو انسانی چہروں کو نسخ و مسخ کرنے کے فن میں جو دستگاہِ کامل رکھتے تھے اُس نے اِن لوگوں کو حکومت کے اک خاص مصرف کے لئے بہت کارآمد بنا دیا تھا۔ وارثوں کی صورتوں کو بدل دینا اُن کی صورتوں کو پیوندِ زمین کر دینے سے زیادہ اچھا سمجھا گیا : اِس میں شک نہیں کہ اِس وقت وہ "آہنی نقاب" والا دستور بھی موجود تھا، لیکن ظاہر کہ یہ بہت ہی متشددانہ طریق کار تھا، متمدن زمانہ یورپ کو آہنی نقاب پوشوں کا ملک نہ بنایا جا سکتا تھا۔ لیکن مسخ شدہ اعضا کے لوگ بلاتکلف بازاروں میں قلابازیاں کھاتے ہوئے چلے جاتے تھے : اور مطلق کسی پر دہشت طاری نہ ہوتی تھی : قطع نظر اس سے آہنی نقاب کو ہٹایا بھی جا سکتا تھا، لیکن چہروں کے گوشت و پوست میں جو نیا نقشہ مُہر کر دیا جاتا تھا اُس سے گلو خلاصی حاصل کرنا ممکن نہ تھا! یہ مصنوعی خط وخال انسان کے خطِ تقدیر کی طرح ناقابلِ تغیر ہوتے تھے : اِس سے بڑھکر اک آدمی کے شخص کو مشتبہ، اور وجود کو مُبدّل کر دینے کی کون سی کم خرچ بالانشین تدبیر ہو سکتی تھی ؟ کاپرشیکو لوگ انسانی چہروں کو اپنی دستکاری کا ایک ہی تختۂ مشق بناتے تھے جیسا کہ اہلِ چین اپنی صنعتکاری کے لئے درختوں کو منتخب کیا کرتے ہیں ! اِس فن کے مخصوص قواعد و

ضوابط بھی تھے، لیکن یہ سارے اسرار و رموز ان ہی لوگوں کے سینہ بسینہ رہ کر اپنے بانیانِ فن کے ساتھ مفقود ہوگئے! اُن کے ناشدنی ہاتھ کی ہنرمندی سے مسخ ہو کر اک زندہ و شگفتہ صورت اک خشک و چوبین چیز ہو کر رہ جاتی تھی: وہ قہقہہ آور بھی ہوتی تھی اور گریہ آور بھی: وہ اک ننھے معصوم بچے کی کچھ اس طرح قلبِ ماہیت کر دیا کرتے تھے۔ پھر اُس کے والدین کا بھی اپنے لختِ جگر کو پہچاننا دشوار ہوتا تھا! ایک فرانسیسی مصنف ریتین نے اپنے مخصوص اسلوبِ بیان میں اس اصل و نقل کے "تفاوتِ ز" کو خوب واضح کیا ہے۔ بعض اوقات وہ اپنے معمول کی پُشت کی ہڈی وغیرہ سے کچھ تعرض نہ کرتے تھے۔ اور صرف چہرے کی "نشاۃ الثانیہ" پر اکتفا کیا کرتے تھے! وہ اپنے بنائے ہوئے چہروں پر اپنا "عمل" ظاہر کرنے کے لئے اس طرح اپنے مخصوص نشان بنا دیا کرتے تھے۔ جس طرح سے دستی رومال پر بیل بوٹے کاڑھنے کے بعد سوزن کار اپنے مرموز دستخط کر دیا کرتا ہے! جن بچوں کو قلاباز بنانے کے لئے تیار کرنا ہوتا تھا ان کے جوڑوں اور ہڈیوں کو کچھ ایسے "استادانہ کمال" سے درہم برہم کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ اُنھوں نے اِن بچوں کے جسم کے اندر اک "جدید نظامِ استخوانی" کو قایم کر دیا ہے: اسی طریق سے جمناسٹک کے گرہ باز بھی بنائے جاتے تھے!

جماعتِ کاپرشیکو کے "صناعانِ جنسِ انسانی" اپنے زیرِ عمل بچے سے اُسکا چہرہ ہی نہیں لیا کرتے تھے۔ بلکہ اُسکو اُس کے حافظے سے بھی محروم کر دیا کرتے تھے! کم ازکم وہ اُس کی دنیائے دماغ میں جتنا انقلاب ممکن ہو سکتا تھا کر دیا کرتے تھے! بچے کو اپنے اعضا و جوارح کی قطع و برید اور نسخ و مسخ کئے جانے کا کوئی شعور باقی نہ رہتا تھا! یہ ہولناک سرجری (عمل جراحی) اپنے چابکدست نشتر کے صرف نقوشِ قدم ضرور چھوڑ جاتی تھی، لیکن بچوں کی لوحِ دماغ اِن عذاب ناکیوں کی یادداشت سے بالکل سادہ رہتی تھی! زیادہ سے زیادہ اِک ایسے بچے کے ذخیرۂ حافظہ میں جو واقعہ باقی رہ جاتا تھا وہ صرف اتنا ہوتا تھا کہ ایک دن اُسکو کچھ مردانِ غیب نے پکڑ لیا تھا، اور پھر اُس پر اک نیند طاری ہوگئی تھی، اور تھوڑی دیر کے بعد اُس کا علاج مکمل ہوگیا تھا! لیکن علاج کس مرض کا؟ —— غریب بچہ اس مرض کی تشخیص کی فہم سے قاصر تھا! گندھک سے داغ جانے اور لوہے کی گرم گرم سلاخوں سے چرکے کھانے، اِن ساری سرگزشتوں میں سے کوئی بات بھی اُس کے ذہن میں نہ رہتی تھی! کاپرشیکو جراح حواس کو معطل کر دینے والے ایک سفوف سے بچے کے اعصاب کو اک عارضی موت سے ہمکنار کر دیتے تھے۔ اِس سفوف کو وہ "خاکِ اعجاز" کی اصطلاح سے تعبیر کیا کرتے تھے! خاکم بدہن اِس خاکِ اعجاز کی اعجاز نما تاثیر کا اتنا قائل ضرور ہونا پڑیگا کہ اُس سے بچے پر یہ مرحلۂ صعب آسان ہو جاتا تھا۔

(۵)

اوباشوں اور آوارہ گردوں کے بارے میں انگلستان کے قوانین ہمیشہ سے بہت سخت رہے ہیں۔ عہدِ گاتھک کے انگلستان میں جو دفترِ آئین و قوانین مُدوّن ہوا ہے اُس میں اک سخت گیرانہ روح جاری و ساری نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس تشدد پسند آرڈر کی کتابِ آئین کے ایک قانون کا فتویٰ یہ ہے کہ "جن لوگوں کا کوئی گھر در نہیں وہ صحرائی جانوروں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں!" اک مدتِ دراز تک انگلستان "بھیبوں" (عہدِ گزشتہ و موجودہ کی ایک رسوائے عالم و جہاں گرد قوم) کا تدارک کرنے میں بیحد کد و کاوش کرتا رہا۔ ان لوگوں کا وہ اس طرح قلع قمع کر دینا چاہتا تھا جس طرح کہ اُس نے اپنی سرزمین کو بھیڑیوں سے پاک کر دیا تھا۔ آئرستان کے لوگ اس معاملے میں انگریز قوم سے کتنا مختلف مذاق رکھتے تھے! چنانچہ اُس زمانے میں اُن کی یہ کیفیت تھی کہ وہ اپنے وطن کے جنگلی جانوروں کی صحت کے لئے اپنے اولیاء اللہ سے دُعائیں مانگا کرتے تھے! اور بھیڑیئے کو تو وہ "اپنا مذہبی باپ" کہا کرتے تھے! حضرتِ گرگ پورے "بزرگ" بنے ہوئے تھے۔

تاہم انگریزی قانون بھی باوجود اپنی ساری سختی و درشتی کے بھیڑیے کے وجود کو چشم پوشی کی نظر سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ اس جانور کو عام طور پر پالا جاتا تھا۔ اور اُس کو اس درجہ مانوس بنایا جاتا تھا کہ وہ بالکل ایک اہلی جانور میں تبدیل ہو جاتا تھا: بالفاظِ دیگر کہہ سکتے ہیں کہ اُس زمانے میں بھیڑیا بھی اک قسم کا پالتو کتا ہوگیا تھا۔ انگریزی قانون کے محتسب۔ نیم حکیم کی سربازار خطبہ خوانی و دوا فروشی، پھیری کرنے والے حجام کی سیر و گردش، سڑکوں پر چلتے پھرتے سودا بیچنے والے بساطیوں کی داد و ستد، نیز آسمان کی سقفِ نیلی فام والے وسیع ہال میں نشرِ علم کرنے والے عالموں کی معارف پاشی اِن میں کسی سے بھی کچھ تعرض نہ کرتے تھے! قانون اِس بات سے مطمئن تھا کہ اِن سب لوگوں کا کوئی نہ کوئی پیشہ یا حیلہ ہے اور حصولِ معاش کے لئے وہ کسی قانون شکنی پر مجبور ہونے والے لوگ نہیں ہیں! لیکن ایک آوارہ گرد کی "شتر بے مہاری" سے بیحد خوف و دہشت کا اظہار کیا جاتا تھا! ایک بے معاش و بے مشغلہ کوچہ گرد قانون کی نظر میں مخدوش ترین [illegible] مشتبہ

صورت وہیئت کا آدمی نظر آیا اور اُس کی دارو گیر شروع ہوئی؛ جرائم پیشہ لوگوں کا مشکوک رنگ، ڈھنگ کسی جامع و مانع طریق سے بیان نہیں کیا جاسکتا لیکن پھر بھی وہ اک ایسی حقیقت ہے جس سے ہر شخص آشنا ہے، اور اپنی فراست سے بآسانی اُسے محسوس کر سکتا ہے؛ چنانچہ پولس کی گرفت کے لئے یہ وجدانی شعور کافی ہوتا تھا، تم کہاں رہتے ہو؟ تمہارا ذریعۂ معاش کیا ہے؟ ——— اور اسی نوع کے گوناگوں سوالات تھے جو اک مجہول الحال اجنبی سے کئے جاتے تھے اور اگر وہ تشفی بخش جواب دینے سے ——— یا خود ارباب پولس تشفی قبول کرنے سے ——— قاصر رہتے تو قانون کی شدید ترین سزاؤں کا مستوجب قرار پاتا، چنانچہ آوارہ گرد لوگوں کو داغ دیا جاتا تھا؛ اور "آہن و آتش" کا یہ استعمال ضابطۂ تعزیرات میں بہت عام تھا؛

الغرض انگریزی قانون نے ایسے لوگوں کے خلاف اک جہادِ عام جاری کر دیا تھا، اور ارباب حل و عقد کی نظر میں یہ گروہ بدترین باغیوں کے زمرے میں داخل تھا؛ اسی سلوک کا آماجگاہ جپسی لوگوں کو بنایا گیا جن کا اخراج اتنا ہی مہتم بالشان اور ثواب عظیم سمجھا گیا تھا جتنا کہ ہسپانیہ کے عربوں اور یہودیوں، اور فرانس کے نوزائیدہ مسیحی فرقہ پروٹیسٹنٹ (احتجاجیہ) کی جلاوطنی کو؛ لیکن حق یہ ہے کہ ایک آئینی جنگ کو پرستارانِ قانون کی ان تعزیروں اور مجذوبانِ مذہب کی ایسی تعذیبوں سے مخلوط کرنا ظلم ہے!

کاپرشیکو اور جپسیوں کے مابین وجہ مشابہت اور قدر مشترک کے طور پر کوئی چیز نہ تھی جپسی اک قوم تھے۔ درآنحالیکہ جماعتِ کاپرشیکو بشمار اقوام و جماعات کے عناصر کا اک معجون مرکب تھی، جن میں ہر قسم کے کثیف و غلیظ اجزا کا اختلاط تھا۔ کاپرشیکو کے پاس بخلاف جپسیوں کے اپنی کوئی مخصوص زبان بھی نہ تھی، وہ متعدد زبانوں کا اک ملغوبہ سا بولتے تھے، جس میں انواع و اقسام کے تلفظ و مخرج اور گوناگوں لب و لہجہ داخل تھے؛ اپنے دیس بدیس کی آوارگی کے مابہ الامتیاز مشغلے کی بنا پر اُن پر ایک قوم کا غلط اطلاق ہونے لگا تھا۔ لیکن قومیت کے مقررہ شرائط سے وہ عاری تھے۔ اُن کی وحدتِ قومی کا سنگِ بنیاد ان کی ہم شغلی و ہم مشربی، اور اُن کا باہمی ربط و ضبط تھا؛ ورنہ کوئی ایک نسلی خون اُن کا سرچشمہ نہ تھا تاریخ عالم کے تمام ادوار میں انسانیت کے بحرِ ذخار کے اندر جابجا ایسے متبائن دھارے بیچ بیچ سے چلتے ہوئے نظر آتے ہیں جو اپنے گرد و پیش کے آبِ مصفا میں غلاظت و کثافت کی آمیزش کرتے جاتے ہیں، قوم کاپرشیکو کی تاریخی تعبیر انہی الفاظ میں کی جاسکتی ہے۔ الغرض جپسی لوگ علانیہ اک قوم تھے، اور قومیت کے لوازم عمومی سے آراستہ۔ مگر یہ کمبخت کاپرشیکو تو اک قسم کے فری میسن "معمارانِ آزاد" تھے؛ لیکن فری میسن بھی ایسے جن کے پاس کوئی اعلیٰ و ارفع مقصد نہ تھا۔ بلکہ اک غائت درجہ شنیع و ملعون قسم کی حرفت و تجارت مزید برآں ان دونوں قوموں میں مذہبی اختلاف بھی تھا۔ جپسی لوگ قریباً بیدین و کافر تھے۔ مگر کاپرشیکو ماشاء اللہ مسیحی تھے: اور بہت مقدس قسم کے مسیحی؛ جیسا کہ ایک ایسی جماعت کے شایان شان بھی تھا۔ جس میں گو دوسری نیرنگیاں اور بوقلمونیاں تھیں۔ لیکن جس کی پیدائش کا اولین گہوارہ یادش بخیر وہ خدا پرست و خدا ترس ملک تھا جسے اسپین کہتے ہیں۔

چشم بد دور کاپرشیکو مسیحی ہی نہ تھے، بلکہ مسیحیوں سے بھی کچھ زیادہ، یعنی کیتھالک، اور نہ صرف کیتھالک، بلکہ رومن کیتھالک، جن کا دین ایسا چھوئی مُوئی تھا اور جن کے وجود ایسے پاکیزہ، منزہ واقع ہوئے تھے کہ وہ اہل ہنگری کے ساتھ ہم پیالہ و ہم نوالہ ہونے سے سخت پرہیز و گریز کرتے تھے: آسٹریا کے ان بدوی لوگوں کا مقتدا ایک بڈھا شخص تھا جس کے ہاتھ میں پادریوں کے عصا کے بجائے اک لکڑی رہا کرتی تھی جس کی موٹھ ایک گیند کی شکل کی ہوتی تھی، اور جس پر ملک، کا مخصوص نشانِ قومی یعنی "دوسر اعقاب" بنا ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہنگری کی یہ عیسائی جماعت روافض و خوارج کا سا ایک مذہبی گروہ تھا جن کے جہل و ضلالت کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے "رفع الی السماء" کی تقریب کی یادگار کو بجائے اصل دن کے ۲۹ اگست کی تاریخ کو منایا کرتے تھے؛

انگلستان میں جب تک کہ تاجدارانِ اسٹوارٹ کا دور رہا کامپرشیکو کے حقوق پر اک خاص حد تک نگرانی قایم رہی جیمس ثانی اگرچہ ایک مذہبی آدمی تھا ——— چنانچہ اُس نے یہودیوں کو سخت عذاب دیا تھا اور جپسیوں کو بھی بیدردی سے ملک بدر کر دیا تھا؛ ——— مگر وہ کامپرشیکو کے حق میں بڑا فیاض شہریار ثابت ہوا۔ کامپرشیکو پر اس نوازش کی وجہ خاص یہ تھی کہ یہ لوگ جس جنسِ انسانی کے گاہک تھے شاہ جیمس اُس کی تجارت کیا کرتا تھا؛ وہ چہروں کے مسخ کرنے کے کام میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور اس صنعت کی بعض اوقات حکومت کو اپنی مخصوص اغراض کے لئے ضرورت ہوا کرتی تھی۔ ملک کی کسی جاگیر کا ایسا نابالغ وارث جو دربار کے لئے تکلیف دہ ثابت ہونے والا ہو، اُس کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے اُس کو کامپرشیکو کے حوالے کر دیا جاتا تھا جو اس سے

اُس کی شکل وشمائل چھین لیا کرتے تھے؛ اس طرح ضبطی جائیداد و خطابات کا کام آسان ہو جاتا تھا؛ اور شاہ کے منظورِ نظر ان لاوارث انعامات و اکرامات کے مورد بنائے جاتے تھے! کا پرسٹیکو بہت ہی دور اندیش اور رازدار لوگ تھے۔ وہ اپنے عہد کا پورا پاس رکھتے تھے۔ ہر راز اُن کے سینوں کے دفینوں میں اک راز سربستہ بن جاتا تھا! سلطنت کی سازشوں اور کارستانیوں میں یہ چیز از بس ضروری ہے: اُن کی ساری تاریخ میں شاید ہی کوئی نظیر افشائے راز کی ہو! خود اُن کی مصلحتیں بھی اسی امانتداری سے وابستہ تھیں؛ اگر وہ کبھی بداعتمادی کا ثبوت دیتے تو اُن کی جان کی خیر نہ ہوتی: پس اس طرح سیاسی مصالح کی خاطر وہ ایک خاص بامعرفت گروہ بن گئے تھے

۱۶۸۸ء میں انگلستان کا تخت و تاج ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہوا۔ خاندان اسٹوارٹ کا وارث خانوادۂ آرینج بنا؛ اور ولیم ثالث نے انگریزی تخت پر جیمس ثانی کو بے دخل کیا۔

معزول شاہ جیمس ملک بدر کیا گیا۔ اور اسی عالمِ جلاوطنی میں اُس نے سفرِ آخرت کیا۔ اُس کا مقبرہ خوارقِ عادات و معجزات کی جلوہ گاہ بن گیا! چنانچہ اُس کی تربتِ پاک کی خاکِ شفا نے لشب آف آتون کو اک سخت مرض سے نجات بخشی: یہ امر شاہ موصوف کی خاص انتخاص مسیحایانہ صفات کا اک شایانِ شان مظہر تھا۔

شاہ ولیم نہ جیمس کے سے خیالات و جذبات کا آدمی تھا، نہ اس کے یہ اعمال و افعال تھے۔ چنانچہ اُس نے فی الفور کا پرسٹیکو کی سرکوبی شروع کر دی اور ملک کو ان زہریلے جراثیم سے پاک کر دینے کی کوشش و کاوش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

ولیم کے دَورِ جہانبانی کے اولین قانون نے "بچہ فروش" کا پرسٹیکو کی جماعت پر کاری ضرب لگائی۔ کا پرسٹیکو بالکل پامال ہو گئے۔ قانون مذکور کی دفعات کے تحت اُن سے یہ سلوک کیا گیا کہ ان کو پہلے تو گرفتار کیا گیا، اور پھر ہر اک کو اُن کے کیفرِ کردار کو پہنچا دیا گیا۔ اک سرخ گرم آہنی سلاخ سے اس نیک محضر جماعت کے ہر فرد و فرید کے شانے پر "ب" کا حرف داغ دیا گیا جس کے معنی تھے کہ "بدمعاش"! بائیں ہاتھ پر "س" کا نشان نقش کر دیا گیا جس سے مقصود تھا کہ "سارق"! داہنے ہاتھ کو حرف "ق" سے منقوش کیا گیا جس سے مراد تھی کہ "قاتل"!

اُن کے سرغنہ چونکہ دولتمند لوگ تھے،—— اگرچہ اُنہوں نے بھی لباس و وضع فقیرانہ ہی بنا رکھی تھی؛—— اِس لئے اُن کو یہ سزا دی گئی کہ اُن کا سارا مال و زر ضبط کر لیا گیا، پھر اک شکنجے میں اُن کے جسموں کو کس کر اُن کو اپنے جانگسل کرتوتوں کا مزہ چکھایا گیا، اور بعد ازاں اُن کی عین پیشانیوں پر اُن کی حقیقت کو واشگاف کرنے والے طغرا ہائے امتیاز "آہن و آتش" سے ثبت کئے گئے؛ جن لوگوں نے اُن کی رازداری یا پناہ دہی کی اُن کے اخفائے جرم و مجرم کی پاداش میں اُن کی جائدادیں چھین لی گئیں اور اُنہیں ساری عمر کے لئے جیل خانوں میں ڈال دیا گیا!

افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

اتفاق ۔ جب نپولین ثالث بحیثیت فاتح بورڈو میں داخل ہوا تو اس کے واسطے ایک استقبالی پھاٹک بنایا گیا تھا جس پر پھولوں کی ایک محراب کے اوپر ایک تاج بنایا گیا تھا جس کے نیچے یہ الفاظ بڑے بڑے حروف سے لکھے ہوئے تھے "تم اس کے مستحق ہو" اتفاق سے آندھی بہت زور سے آئی جس سے وہ محراب اور تاج سب ٹوٹ پھوٹ گئے صرف ایک گول رسی کا حلقہ باقی رہ گیا جو لٹک رہا تھا اور اس کے نیچے وہی جملہ تھا "تم اس کے مستحق ہو"

جب نپولین کی سواری پھاٹک کے نیچے پہونچی تو جمہوریت پسند جماعت نے بادشاہ کو اس کے نیچے نکلتے ہوئے دیکھکر بہت زور سے تالیاں بجائیں اور خوشی کے نعرے مارے۔

مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری دونوں بزرگ اورنٹیل کالج لاہور میں برسر خدمت تھے۔ مگر دونوں میں کچھ شکر رنجی تھی۔ جب مولانا فیض الحسن مولانا آزاد کے کمرہ کی طرف سے گذرتے تو اُدھر منہ کرکے کھنکار کر تھوک دیتے۔ جب دو ایک مرتبہ یہ حرکت ہوئی اور آزاد سمجھ گئے کہ یہ اتفاقی نہیں بلکہ ارادی ہے تو ایک مرتبہ جب مولوی فیض الحسن اُدھر سے گزرنے لگے آزاد اپنے کمرے کے دروازے پر آ کر منہ بنا کر کہنے لگے ارے میں تو تھوکتا بھی نہیں۔

جلوس

گشت میں ہے کانگریسوں کا گروہِ مختصر
لب پہ افسردہ ترانہ سوگ میں ڈوبی نظر

آگے آگے پرچم سہ رنگ لہراتا ہوا
لیڈروں کے قول کے مانند بل کھاتا ہوا

پیچھے پیچھے دست و پا رُخ پر فلاکت کا غبار
ننگی آنکھوں سے فاقوں کے شدائد آشکار

جسم تھرائے ہوئے آواز بھرائی ہوئی
دل کی اُلجھن مضمحل چہروں تلک آئی ہوئی

اُن سے یہ کہہ دو یہ ہیں جن سربلندوں کے مکاں
اُن کو فریادوں کے سننے کی بھلا فرصت کہاں

سائے میں سنگین، دیواروں کے فریادیں عبث
وہم کے خاکوں پہ مستقبل کی بُنیادیں عبث

بے محل بے وقت یہ بے رُوح تقریریں فضول
جن کے نقشے ہیں ہوا پر ہوں وہ تعمیریں فضول

بُجھ نہیں سکتا ہے آنکھوں سے شقاوت کا چراغ
پھونک کر محفل کو ہنستا ہے امارت کا چراغ

موسوی لطف و عطا ممکن نہیں شدّاد میں
لوچ ہرگز آ نہیں سکتا دلِ فولاد میں

دھات کے تودوں میں تقریریں سما سکتی نہیں
عجز کی آنچیں چٹانوں کو گلا سکتی نہیں

یہ مکاں آہ و فغاں کو جذب کر سکتے نہیں
نالے شیشے کے دریچوں سے گزر سکتے نہیں

فطرتِ زردار میں لطف و عطا شامل کہاں
پیچ و خم کھائی ہوئی گلیوں میں اہلِ دل کہاں

اُن کو کیا معلوم بیواؤں کے دل کی واردات
سانس لیتی ہیں جو رکھ کر سینۂ غمگیں پہ ہات

اِن کو کیا تقدیر کے ہاروں کی باتوں کی خبر
اُن کو کیا افلاس کے ماروں کی راتوں کی خبر

اِن لئیموں کو بھلا کیا فاقہ مستوں سے غرض؟
زر کے اندھے ظالموں کو تنگدستوں سے غرض؟

اہلِ نخوت کو کسانوں کی زبوں حالی سے کام؟ — آسماں جاہوں کو مزدوروں کی پامالی سے کام؟

ہو جہاں تعداد سکوں کی ضرورت سے زیاد — اس جگہ ہوتی ہے بارِ گوش غم کی روئیداد

چھوڑ دو اِن تن کے اُجلے من کے گندوں سے اُمید — قطع کر دو قطع اِن عشرت پسندوں سے اُمید

اُن کو چونکاؤ جو سر سے پاؤں تک فریاد ہیں — جھونپڑوں میں حاشیے پر گاؤں کے آباد ہیں

تم حقیقت میں ہو صرف اُن کو جگانے کے لئے — ٹمٹماتے ہیں جہاں راتوں کو مٹی کے دیئے

جن کے دل ہیں اہلِ سرمایہ کے جھڑکوں سے دونیم — جن کی بالیں پر جنوں بردار رہتی ہے نسیم

چند میلے چیتھڑے ہیں جن کا سامانِ حیات — موت دیتی ہے لقب جن کو پریشانِ حیات

جھونپڑی پر رات بھر روتا ہے جن کی ماہتاب — کھینچتا ہے جن کے بستر پر لکیریں آفتاب

گھٹ رہا ہے جن کے سینوں میں فلاکت کا دھواں — آپ بیتی کے لئے کھلتی نہیں جن کی زباں!

جانتے ہیں جن کو منعم زندگی کا بارِ دوش — عورتیں تک جن کی سو رہتی ہیں فاقے سے خموش

جن کی پلکوں پر نمی رہتی ہے لب خاموش ہیں — جن کے سر پر قرض کی چھت پاؤں بے پاپوش ہیں

زمزمے جن کے تڑپتے ہیں الم کے ساز پر — رحمتیں جھکتی ہیں جن کے شعلۂ آواز پر

جو بیاں جا کر کہیں حالِ زبوں کرتے نہیں — بھوک سے معصوم بچے جن کے چوں کرتے نہیں

بنتے ہیں جن کی کمائی سے امیروں کے محل — جن کا حصہ ہے خدائی میں فقط بیل اور ہل

جسم ہو جاتے ہیں جن کے محنتوں سے چور چور — جن کے ہل سے ٹوٹ جاتا ہے زمینوں کا غرور

یہ اگر چاہیں تو چمکے قسمتِ ہندوستاں — ورنہ آزادی خیالِ خام، آزادی کہاں؟

گردنیں خم اُن کے احسانوں سے ہیں اصنام کی — دل ملا اُن کو فرشتوں کا نظر ضرغام کی!

اُن کے سینوں میں زمیں کی کروٹوں کے راز ہیں — التجا پر اُن کی عرشی گوش برآواز ہیں

تُل رہا ہے چرخ ظلمِ ناروا کے واسطے
اِن اسد زادوں کو چونکاؤ خدا کے واسطے

(احسان بن دانش)



اخبارِ اُردو

(از مُلّا رموزی)

اُردو والوں کے لئے یوں تو ہمیشہ سے اُردو کی حمایت، حفاظت اور اشاعت کا فرض نہایت اہم فرض رہا ہے لیکن جدید دستورِ حکمرانی کے نفاذ و اجرا سے یہ فرض اور بھی اہم ہو جاتا ہے جبکہ سیاسی اور کارکن جماعتوں نے کوشش شروع کر دی ہے کہ سارے ہندوستان کی سرکاری زبان کس زبان کو قرار دیا جائے، ہندی یا اردو؟

لیکن مجھے یہ کہنے میں نہ تکلف نہ کسی کا خوف کہ اس مسئلہ میں سب سے زائد سُست کاہل اور بے خبر جماعت اُردو والوں کی ہے جن کے ہاں آج تک اردو کے لئے کوئی ایک ایسی جماعت موجود نہیں۔ جسے تمام ہندوستان کی "مرکزی مجلس" کہا جائے، شبہ نہیں کہ بے شمار انجمنیں ہیں جو اُردو کے نام سے قایم ہیں مگر جہاں تک زبان کی حفاظت اور اشاعت کا فرض ہے ایک بھی ایسی نہیں ہے جسے صحیح معنیٰ میں ناشر و محافظ جماعت کہا جاسکے اور یہ اصل خرابی ہے۔ مسلمانوں میں "تقسیم" کے فقدان کی، جبکہ آج تک ایک شخص بھی نہیں جو سارے ہندوستان میں صرف اُردو کے حق میں ہوائی جہاز بنا چکر لگاتا رہے اور جبتک کہ کوئی "گشتی مبلغ" اُردو کے لئے پیدا نہ ہوگا یہ مختلف مقامی انجمنیں اُردو کے لئے کچھ نہیں کرسکتی ہیں۔

یاد ش بخیر وہ اپنے حضرت خواجہ حسن نظامی پچھلے سال اُردو کے حق میں قدرے پُر جوش ہوگئے تھے تو ایک شور بھی ہوا تھا اور ایک ہنگامہ بھی، لیکن اب جو ممدوح، "میلادی جنتری" وغیرہ قسم کے کاموں میں پھر مصروف ہوگئے تو وہ تحریک پھر بحق حکومت خموش ہو چکی۔

البتہ اس عرصہ میں اردو کے لئے قابلِ اعتنا تحریکات میں سے دو تحریکیں ہیں ایک وہ جو امرتسر پنجاب میں تمام ہندوستان کی نمائندہ مجلس اردو کے نام سے اجلاس کرنے والی ہے۔ دوسری تحریک شہر لکھنؤ کی ہے جہاں ایک عظیم الشان مجلس مستقلہ منعقد ہونے والی ہے جس کا نصف اردو اور نصف انگریزی نام "اردو اکاڈیمی" ہے۔ یہ دونوں تحریکیں اپنے اپنے شہر اور کارکنوں کے لحاظ سے یقیناً لائقِ وقعت ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ مجلسیں کب منعقد ہوں گی اور کیا کر کے دکھائیں گی اس کا جواب متعلق ہے حکیم عامل کریم الدین صاحب نجومی لاہوری سے:

مسلمانوں یا اردو والوں کے اس "ادھورے پن" کا راز ظاہر یہی ہے کہ ان میں عملی استقلال کے ساتھ ہی زرِ نقد بھی نہیں۔ لہٰذا سوال ہو سکتا ہے کہ اگر ملا رموزی ہی اُردو کی تبلیغ و تشہیر اور تشویق کے لئے گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے وعظ کہتا پھرے تو آخر وہ اپنے وقت کا نہ سر آغا خاں ہے نہ کہیں کا راجہ یا نواب جو مصارف کے معاملہ سے مستغنی ہو اس لئے اگر اردو کا معاملہ ہنوز روزِ اوّل بنا ہوا ہے تو اب ایک ہی چیز ہے اور وہ مسلمانوں کے تمام تعلیمی ادارے ہیں جو اپنی اپنی تحویل سے اُردو کی حفاظت اور اُس کی ترقی کے لئے خاصی رقم دے سکتے ہیں اور یہ اس لئے کہ خود اُن کو جو رقم قوم کی جانب سے دی جا رہی ہے وہ علم اور تعلیم ہی کے نام سے دی جا رہی ہے اور ظاہر ہے کہ زبان کا مسئلہ بھی علمی و تعلیمی ہے اس لئے ہونا چاہیئے کہ اگر اس عرصہ میں اُردو کے لئے کوئی مرکزی تحریک ہو تو اُس کی امداد کے لئے انجمن حمایت اسلام لاہور، مسلم یونیورسٹی، انجمن اسلامیہ جبل پور سے نقد امداد لی جائے جبکہ یہ تینوں مجلسیں بحمد اللہ خاصے سرمایہ کی مالک ہیں۔ اب سوال ہے ایسے آدمی کا جو صرف زبانِ اُردو کا "قائد اعظم" بن کر ہندوستان کے چپّہ چپّہ پر "اُردو" کے جلوس نکلواتا پھرے، اُردو کی انجمنیں بناتا پھرے اور اردو کی ترقی کے وسائل بہم پہنچاتا رہے اور جب تک یہ نہ ہوگا اُس وقت تک اپنے اپنے شہر میں ایک ایک "بزم اردو"

اور "بزم ادب" بنا کر بیٹھے، مشاعرے منعقد فرماتے رہنا کام نہ آئیگا۔

۱۹۱۸ء کے بعد سے یعنی یورپ کی بڑی لڑائی کے ختم ہونے کے بعد سے ایشیائی اقوام میں اپنی قومیت کی اصلاح و ترقی کا جو احساس بیدار ہوا ہے اُس میں ایک جوش اپنی اپنی مادری اور ملکی زبانوں کی تخلیص کا بھی ہے یعنی ۱۹۲۳ء میں سب سے پہلے شہر سمرنا میں فیلڈ مارشل کاظم قرہ بکر پاشا فاتح آرمینیہ کی صدارت میں نوجوان ترکوں کی جو عظیم الشان مجلس منعقد ہوئی تھی اُس نے طے کیا تھا کہ ترکی زبان کو تمام غیر ترکی زبانوں سے پاک و صاف کیا جائے اور اُسی کے بعد سے انگورہ میں علامہ احمد اوغلو بے کی صدارت میں سرکاری طور پر یہ کام شروع ہو گیا۔ اس تحریک نے نہ فقط ایشیا میں ایک حس پیدا کی بلکہ آج یورپ کی سب سے بلند اور متمدن اقوام یعنی جرمنی اور اٹلی بھی ترکوں کی اس تحریک پر عامل ہو رہی ہیں چنانچہ ہوا کہ ترکی کے بعد عراق اور ایران نے اعلان کیا کہ حدود ایران میں فارسی اور عراق میں عربی ہی عربی میں ہر کام کیا جائے۔ دوکانوں کے تختوں پر بجز فارسی کے دوسری زبان کی عبارت نہ ہو اور اطلاعی تار دئے جائیں تو اُنکی زبان انگریزی کے عوض عربی ہو۔

اب آخری اطلاع یہ ہے کہ حکومت اٹلی نے حکم دیا ہے کہ اٹلی میں جانوروں کے نام بھی خالص اطالوی زبان میں رکھے جائیں۔

ظاہر ہے کہ تلخیص زبان کی اس ترکی تحریک میں جو حکیمانہ راز ہے اُسی کی طاقت تھی کہ جرمن اور اطالوی ایسی متعصب و مغرور اقوام نے اس کی تقلید کی اور وہ راز یہ ہے کہ جو قوم صرف اپنی ہی چیزوں سے مانوس رہتی ہے وہ کبھی کسی غیر ملکی چیز کو برداشت نہیں کر سکتی مثلاً غیر ملکی غنیم کا حملہ وغیرہ۔

بارے یہ محل نہیں کہ میں زبان کو خالص ملکی الفاظ سے سنوارنے کے فوائد سے طویل بحث کر سکوں۔ البتہ اگر غیر ملکی زبانوں سے کسی ملکی زبان کا پاک کرنا غیر ضروری ہے تو بتائیے کہ دنیا کی اتنی بلند اقوام نے ایسا کیوں کیا؟

اب رہا ہندوستان غفران مکان تو جس طرح یہاں کی اقوام کی سیاسی روح ہنوز مفلوج و مضمحل ہے اُسی طرح یہاں کی زبانوں کی زندگی بھی بیمار۔ البتہ کچھ دن سے اردو والوں کی ایک پُرجوش جماعت اس امر پر متوجہ ہوئی ہے کہ اُردو کو سارے ہندوستان کی زبان بنانے کے لئے اس میں سنسکرت اور عربی فارسی کے بے ضرورت الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔ بلکہ ہوسکے تو ہندوستان ہی سے نئے الفاظ گھڑ لئے جائیں مگر استعمال نہ ہوں تو سنسکرت اور عربی کے الفاظ جیسا کہ ادارۂ اردو الہ آباد نے اپنے سہ ماہی رسالے کو "تماہی" لکھنا شروع کر دیا تھا جو اسی جذبے کا ہندوستانی نمونہ تھا۔

شک نہیں کہ اُردو کی مقبولیت اُس کی ترقی اور اس کے عام فہم ہو کر سارے ہندوستان میں پھیل جانے کی یہ ایک لائق تعریف کوشش ہے اور اہل قلم حضرات کو اس پر شدت سے عمل کرنا چاہئیے۔ لیکن زبان اردو کے خالص وطنی ذخیرۂ ادب و الفاظ کے حق میں یا اردو کی ادبی رگوں میں جو زہر بھرا جا رہا ہے وہ اردو میں انگریزی الفاظ کی بھرتی ہے۔

لیکن حیدرآباد کے علاوہ ہندوستان میں کوئی علاقہ نہیں جہاں کے اردو والے اس عظیم الشان وبا کے دور کرنے پر مستعد ہوئے ہوں جس نے اردو کے جسم اور اُس کی روح کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر آج اخباروں کی اردو کو سب سے زیادہ علمی اور ادبی زبان تسلیم کیا جائے تو اس میں ۹۹ فیصدی انگریزی کے الفاظ بتائیں گے کہ یہ اُردو نہیں بلکہ نو مسلم سی انگریزی ہے جس کا نام خواہ مخواہ اُردو رکھ لیا ہے۔

اب فرمائیے کہ اُودھر تو دنیا کی متمدن قومیں اپنی ملکی اور مادری زبان کو غیر ملکی زبانوں کے الفاظ سے اس حد تک صاف کر رہی ہیں کہ خبر کا تار بھی اپنی ملکی زبان میں دیتی ہیں اور اِدھر ہندوستان کے اُردو والے ہیں جن کے باہمی خطوط بھی انگریزی میں ہوتے ہیں خطوط کی پیشانی کی عبارت شہر اور محلہ یہاں تک کہ دستخط بھی انگریزی میں ہوتے ہیں۔ حد ہو گئی کہ جو مجلسیں اور جماعتیں اُردو کی خالص علمی و ادبی مجلسیں کہی جاتی ہیں اُن کے ہاں بھی ۹۹ فیصدی انگریزی الفاظ استعمال ہو رہے ہیں۔ البتہ اس معاملہ میں برادران ہنود بیدار ہو گئے ہیں اور آج ہندو بھائیوں کا ہر کام ہندی یا اُن کی قومی زبان میں ہوتا ہے اور اس حد تک خالص ہندی میں کہ باید و شاید، چنانچہ سارے مسلمانان ہند نے جب اپنی سب سے اونچی نمایندہ مجلس بنائی تو اس کا نام رکھا "مسلم لیگ" اور ہندو بھائیوں نے جب اسی قسم کی انجمن بنائی تو اس کا نام رکھا "ہندو مہا سبھا"۔

اُردو میں انگریزی الفاظ کا استعمال اصل میں اُس تعلیمی نصاب کا منشہ ہے جو حکیمانہ محبوبیت کے ساتھ ذہن و دماغ کو قومیت یا قومی خصائص سے بیگانہ وبے خبر بناتا ہے یہی راز ہے کہ آج سب سے پہلے غلط کار درس گاہوں کے اُستاد نظر آتے ہیں اور بعد میں اُن کے شاگرد، چنانچہ یہ ایسی درسگاہوں کے اساتذہ ہی ہیں جن کے پاس نہ اُن کا قومی لباس ہے نہ اُن کی قومی اور وطنی شکل وصورت اور نہ اُن کے پاس اُن کی قومی زبان لہٰذا جب استاد ہی ہر تحریر میں انگریزی میں دستخط کرتا ہے تو شاگرد کو عمر بھر ہوش ہی نہیں آتا کہ وہ اردو کی تحریروں میں انگریزی میں کس قاعدہ سے دستخط کرتا ہے۔ اللہ ری بے ہوشی!!!

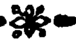
پس اگر اردو "غیر اُردو الفاظ سے تباہ ہو رہی ہے اور اس کا ذخیرۂ افہام وتفہیم تک اس کا ذاتی نہیں جو ایک شرمناک داغ ہے قوم کی لسانی زندگی پر تو مان لیجے کہ اس گھناؤنے گناہ کے مرتکب سب سے پہلے موجودہ درس گاہوں کے ہندوستانی اساتذہ ہیں جو اپنی زندگی کے ہر حصہ میں غیر ہندوستانی زبانوں کو رواج دے رہے ہیں۔

ان کے بعد اردو کو تباہ کرنے میں حصہ لے رہے ہیں ہندوستان کے امرا ور ؤسا جن کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہی یورپ اور یورپ کی زبانیں ہیں، ان کے ہاں زبان اردو کو افریقہ کے وحشیوں کی زبان سمجھا گیا ہے اور آج وہ اپنی مادری زبان اردو میں گفتگو تک پر قادر نہیں گویا اُن کی قومی غیرت اور ذمہ داری اس حد تک مسخ ومفلوج ہو چکی ہے کہ ان کے ہاں اخبارات و رسالے کتابیں اور جملہ خط وکتابت انگریزی کی ملیگی اور اردو بولتے ملیں گے ان کے غلام اور چاکر، اللہ ری بے حسی!!!



امرا ورؤسائے ہند کے بعد اُردو کے خالص وطنی ذخیرۂ ادب کو تباہ کرنے میں جو جماعت بے انتہا اندھے پن سے کام لے رہی ہے وہ جماعت ہے اردو کے اخبار نویسوں کی جسے اُردو کا سب سے بڑا محافظ ہونا چاہیئے تھا مگر بدقسمتی سے یہ اخبار نویس جماعت بھی اُسی درسگاہ کی ماری ہوئی ہے جس کا اُوپر تذکرہ ہوا، اس لئے اس کے بس کی بات بھی نہیں کہ وہ اپنے اخباروں میں بجز اردو کے انگریزی کے الفاظ کو استعمال نہ کرے کیونکہ اُردو کے موجودہ اخبار نویسوں اور انشا پردازوں میں بہت کم ہوں گے جنھیں عربی اور فارسی میں کافی دستگاہ حاصل ہوگی ورنہ ان کا مبلغ انشا رہی جب اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ ہے تو پھر یہ غریب انگریزی الفاظ کو جا اور بے جا استعمال نہ کریں تو کیا مولوی ابوالکلام آزاد کریں گے؟ یہی وجہ ہے کہ آپ چاہیں اُردو کے جس اخبار کو ملاحظہ فرمائیں بغیر انگریزی دانی کے محال ہوگا جو اخبار کا ایک صفحہ بھی آپ صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ سکیں حالانکہ اخبار کہنے کو اردو کا ہوگا، بس حد ہوگئی کہ اردو کے ایک اخبار نہیں دس اخباروں کے نام تک انگریزی میں رکھے گئے ہیں جیسے "مسلم گزٹ" کلکتہ۔ "جنرل نیوز دہلی" "کانفرنس گزٹ علی گڈھ" "میونسپل گزٹ لاہور"۔

اب ان بھائیوں سے آتنا ہی سوال ہے کہ اردو کے اخباروں کے آخر یہ انگریزی نام کس طرح مفید اور ضروری ہوسکتے ہیں؟ بہرحال آج اگر اُردو کا لسانی ذخیرہ یا خالص زبان برباد ہو رہی ہے تو اُس میں اردو کے اخباروں کو کافی سے زیادہ دخل ہے جن کا نا اہل عملہ آنکھ بند کئے اردو میں انگریزی الفاظ کو رواج دے رہا ہے۔



اِن کے بعد اردو میں انگریزی الفاظ کو رواج دینے والے ہندوستانی تاجر ہیں۔ اگرچہ یہ طبقہ "علمیات" سے دُور رہنے کے باعث قدرے معذور بھی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اتنا معصوم بھی نہیں۔ چنانچہ آج ہندوستانی تاجروں کے اشتہارات پڑھ لیا کیجے ہر اشتہار میں تہر کا پتہ انگریزی میں ہوگا مثلاً۔ "کلاتھ مرچنٹ" "پرفیومری ایجنٹ" "جنرل مرچنٹ" "فارمیسی" اور "بکڈپو" وغیرہ حالانکہ یہ اور ایسے کتنے الفاظ ہیں جن کے معروف عام الفاظ قدیم سے اردو میں چلے آرہے ہیں اور جن کو ہندوستان کے کسان تک پڑھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ مگر غلامی کے عہد کے فطری مرغوبات کہئے کہ ہر حال میں انگریزی الفاظ ہی سے شرح غلامی شاد محسوس ہوتی ہے اور تو اور نائی صاحبان بھی جب اپنی دوکان پر تختہ لٹکاتے ہیں تو بجائے عام فہم لفظ "نائی کی دوکان" کے "ہیر کٹنگ سیلون" ارقام فرماتے ہیں اور مشکل تو یہ ہے کہ ایسے تمام الفاظ اور جملے کے جملے اردو کی املا میں ہوتے ہیں جنھیں غیر انگریزی داں لوگ صحت کے ساتھ پڑھ بھی نہیں سکتے؛

اس قسم کے الفاظ سے حضرات علماء کرام کا طبقہ بھی بہت خاصا مرعوب ہوا ہے جیسا کہ بعض گزرے ہوئے مولویوں کی تصنیفات میں ۲۵ فیصدی انگریزی کے الفاظ ملتے ہیں اسی طرح آج کل مجلس علماء ہند دہلی کے ترجمان اخبار "الجمعیتہ دہلی" میں ایک کتب خانے کا پتہ یہ ہے "الجمعیتہ بکڈپو، گلی قاسم جان دہلی"

اس عبارت میں عربی کا یہ زور کہ جمعیتہ پر ایک الف کا اضافہ ہے بیچ میں "بلڈ پو" اور آخر میں خالص اُردو کی گلی قاسم جان موجود ہے۔

ان کے بعد وہ مسلمان ہیں جنہوں نے اپنے معروف سے ناموں کو انگریزی حروف سے خفیف کیا ہے جیسے "عبدالغفور خاں کے" اے جی۔ خاں "حاجی محمد سلیمان" کے عوض "ایچ۔ ایم سلیمان" اگر ان ناموں کو اسی طرح زبان سے ادا کیجے تو محسوس ہوگا کہ کسی جرمنی سے بھاگے ہوئے یہودی کا نام ہے، ہمارے اُردو کے ذخیرۂ وطنی میں اس قسم کے ناموں کا رواج بھی مادری زبان کی بربادی ہے۔

اسی طرح اردو میں انگریزی الفاظ کو رواج دینے والے مالکان مطابع بھی ہیں جن کے ہاں انگریزی الفاظ کو اردو میں خاصا رواج دیا جا رہا ہے یہاں تک کہ اچھے خاصے مشہور اور عام فہم لفظ مطبع کے عوض "پریس" کہا جاتا ہے اور وہ بھی "مسلم پرنٹنگ پریس" یا "الیکٹرک پریس" پھر مہتمم و منصرم ایسے مشہور الفاظ کے عوض منیجر یا ناشر و طابع کے عوض "پرنٹر اور پبلشر" یا "پروپرائٹر" ایسے ثقیل الفاظ مالکان مطابع ہی اُردو میں ٹھونس رہے ہیں۔

بہرحال ایسے ۵۰ فیصدی انگریزی الفاظ اردو میں داخل ہو رہے ہیں، جن کے خالص اُردو کے بدل موجود ہیں۔ لیکن انگریزی زدہ طبقہ اس اعتراض کا جواب یہ دیتا ہے کہ زبان کی وسعت چاہتی ہے کہ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو رائج کیا جائے۔ مگر یہ جواب اصل میں انگریزی زدہ طبقہ کی نااہلیت ہے جبکہ وہ خالص اردو یا اردو کے قدیم ماخذ سے اپنے دماغ میں کوئی ذخیرہ نہیں رکھتا ورنہ اُسے معلوم ہوتا کہ جو الفاظ اردو میں قدیم ہیں اور مشہور عام و خاص آخر اُن کی جگہ انگریزی کے الفاظ کی کیا ضرورت ہے؛ مگر آخر کار غلامانہ ذہنیت بھی کوئی بلا ہے یا نہیں؟ اسی لئے خود حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ بڑے شوق سے "لٹریچر" اور "کانفرنس" وغیرہ لکھتے ہیں!!!

گویا فاتح قوم نے مفتوح قوم کے منہ تک کا مزا بدل دیا ہے۔

زیادہ صد ادب۔

جبر

جبر کو اختیار کون کرے؟ — تم سے ظالم کو پیار کون کرے؟

زندگی ہے بحرِ غم کا نام — اس سمندر کو پار کون کرے؟

آپ کا وعدہ آپ کا دیدار — حشر تک انتظار کون کرے؟

اپنا دل جب ہو جان کا دشمن — غیر کا اعتبار کون کرے؟

ہم جِلائے گئے ہیں مرنے کو — اس کرم کی سہار کون کرے؟

آدمی بلبلہ ہے پانی کا
زیست کا اعتبار کون کرے

آغا شاعر قزلباش دہلوی



مسائل حیات



(گذشتہ سے پیوستہ)

(جوش ملیح آبادی)

تاریخ

(۱) کون صدیوں اور قرنوں سے جی رہا ہے کہ وہ مورخوں کی ہرزہ اندیشیوں کی تصدیق کرنے ہمارے سامنے آئے۔

(۲) ہمارا علم دراصل اُن واقعات کے مقابلہ میں جو اب تک نامعلوم ہیں حقیقت ہی کیا رکھتا ہے کہ ہم ایک صحیح تاریخ کی تدوین کر سکیں۔

(۳) ہم تاریخ کے متعلق صرف اتنا جانتے ہیں جتنا ہم سے بیان کیا گیا ہے، اور اس کے سوا ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ اب اگر تاریخ نے تمام مشتبہ اندازوں، قیاس آرائیوں اور نیم درست مسائل کو خارج کر دو تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے؟ فقدان تاریخ!

(۴) تاریخ ایک ایسی کھونٹی ہے جس پر ہماری طبعی تاریخ کا لبادہ لٹکایا جا سکتا ہے۔ تاریخ اس استعجاب و تفحص کو برانگیختہ کرتی ہے جو مُردوں کے لئے بے فائدہ ہے۔ اور زندوں کے حق میں اذیت رساں۔

(۵) اگر یہ دنیا کتاب ہے، انسان اُس کی فہرست مضامین۔ تاریخ کا مقصد تو ایک صحیح انسان کو تفصیل کے ساتھ دکھا دینا ہے اور بس۔

(۶) تاریخ کیا ہے؟ کیا ہم تاریخ پر اعتماد کر سکتے ہیں؟ کیا یہ فاتحین کا پروپیگنڈا نہیں ہے؟

(۷) صحیح تاریخ ایک قفل زدہ تہ خانہ ہے جو قیامت تک نہ کھل سکیگا۔

(۸) تاریخ اُس وقت مکمل نمائندگی کر سکتی ہے جب وہ واقعات کے پس پردہ واقعات ہمارے سامنے لے آئے۔ کیا ہم کبھی اُن پس پردہ واقعات کے جاننے کی امید کر سکتے ہیں؟

(۹) عصر حاضر کی تاریخ واقعاتِ عالم کو ان قابو یافتہ لوگوں کی خرد برد کے اغراض و مقاصد سے ہم آہنگ کرنے کی خاطر دیدہ و دانستہ توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی محض ایک سازش ہے جو اس وقت اس چھوٹی سی دنیا کے والی بنے ہوئے ہیں۔ صرف اتنا کرو کہ واقعات کی تاویلوں کے دونوں پہلوؤں کا عمیق نظر سے مقابلہ و موازنہ کرو اور تم پر ثابت ہو جائے گا کہ ہماری تاریخ قابلِ اعتبار نہیں ہے۔

(۱۰) صرف یہی ایک بات کہ جب تاریخ اپنے کو دوہراتی ہے تو ہمیں اُس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔ تاریخ کے کھوکھلا ہونے کا روشن ثبوت ہے۔

کیا ہم نے ابھی تک اپنے سبق نہیں پڑھے ہیں؟

تمدّن

(۱) تمدّن انسان اور فطرت کی قوتوں سے فائدہ اٹھانے کا نام ہے۔

(۲) شکار کرنا ہر شکاری پرندے کی سرشت میں داخل ہے، انسان نے صرف اتنا کیا ہے کہ اپنی اس سرشت کو ترقی دیکر ایک باقاعدہ سائنس بنا دیا ہے۔

(۳) نکمّے دماغ شرارت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ فرحت یافتہ دماغ تہذیب سے کھیلتے ہیں۔ اور مصروف دماغ صرف اپنے پر غور کیا کرتے ہیں۔

(۴) اگر گدھے پر بوجھ نہ لادا جائے تو اس کے پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔ یہ کہاوت صرف بہکے ہوئے گدھوں پر صادق آتی ہے تو پھر بہکی ہوئی انسانیت کے لئے کیا کہا جائے گا؟

یہ ایک عام تجربہ ہے کہ اگر آدمیوں کے واسطے مسلسل آرام مہیا نہ کئے جائیں تو وہ تھک اور گھبرا جاتے ہیں۔ کیا ہماری تہذیب آرام کو دعوت دیکر مصائب سے بچانے کا ایک مستقل سلسلۂ عمل نہیں ہے؟

(۵) تہذیب کے مقدس نکیلی پردے کے پیچھے سوسائٹی، قانون اور مذہب

اپنے پرگناہ دائرۂ عمل میں گیگیا شیطنتیں کرتے رہتے ہیں اور اس وقت بھی جب سوسائٹی، قانون اور مذہب کے اعمال مکروہ بالکل ہمارے سامنے ہوتے ہیں کیا ہم انھیں انسانوں کو دوبربریت سے نجات دلانے والا نہیں کہتے اور ان کا احترام نہیں کرتے ہیں؟

(۶) انسان کی بنائی ہوئی سوسائٹی میں انسانیت کا سب سے بڑا مُربّی و سرپرست قانون اور مذہب ہے۔ جس کا محض یہ کام ہے کہ انسان کے فطری شعور کو خیر و شر کے مشتعل اور شرارت آمیز پروپیگنڈے کے ذریعہ سے کلیتہً فنا کر دے اور دنیا کا تمدن اب صرف اس صورت میں باقی ہے کہ وہ ارذل ترین ریاکاری کا بازار بنی ہوئی ہے۔ ایسا ہی ہے؟ یا ایسا نہیں ہے؟

(۷) تہذیب انسان کی زندگی کی تو حفاظت ضرور کرتی ہے، مگر اس کی روح کو کچل دیتی ہے۔ تہذیب سے میرا مقصد قائم شدہ مذاہب، قوانین، اخلاق، سوسائٹیاں اور سیاست ہے، اور روح سے میرا مقصد وہ انسان ہے جو خود اپنے سے سچا ہو۔

(۸) مسیح کو سُولی پر چڑھا دیا گیا تھا، سقراط کو زہر پلا دیا گیا تھا، اور منصور کو خاک میں ملا دیا گیا تھا۔ اور یہ سب اس خطا پر کہ وہ اپنے ذاتی عقائد میں استوار تھے۔ اور آج بھی ہماری اس تہذیب یافتہ دنیا میں لاکھوں آدمی اس لئے سولی پر چڑھا دئے جاتے ہیں کہ وہ صرف اپنے ہی اعتقادات پر ایمان رکھتے ہیں اور خدا کے لئے بتاؤ کیا اپنے ذاتی معتقدات پر ایمان رکھنا کوئی جرم ہے، گناہ ہے؟ کیا ہمیں تقلید پر مجبور کیا جا رہا ہے، کیا دنیا ہم سے زندہ رہنے کے لئے ریاکاری کا مطالبہ کرتی ہے۔

اور کیا اب بھی ہم میں اتنا شعور نہیں پیدا ہوا ہے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی دراصل غلامی کی ترقی ہے۔

(۹) اگر غلاموں کو زندہ کہا جا سکتا ہے تو پھر مُردے کیا ہیں؟ کیا یہ دنیا سماجی، سیاسی اور مذہبی غلاموں کا قید خانہ نہیں ہے؟ اور پھر بھی مُردے زندہ ہیں، سانس لیتے ہیں اور غلامی ہماری ترقی تہذیب کے ہاتھوں اور بھی مضبوط ہوتی چلی جا رہی ہے؟ آزادی! آزادی! آزادی! تو کس گوشے میں چھپی ہوئی ہے!

(۱۰) کامل دو ہزار برس سے ہم پر مختلف قسم کے اصلاحی آداب، ملکی قوانین، مقدس جماعت، اور آسمانی مذاہب کے لشکر ٹوٹ رہے ہیں، اور ان سب نے ہمیں صرف اتنی مدد دی ہے کہ ہم اپنے گناہوں کو بڑھاتے چلے جا رہے ہیں اور ان بڑھتے ہوئے گناہوں کے چہروں پر اخلاق، دینداری اور خدمتِ خلق کی نقابیں ڈالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ کیا ہمیں ان سب کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

(۱۱) عصری تہذیب اب ہمیں اس نقطے پر لے آئی ہے جہاں یہی نہیں ہے کہ ہم آپس میں ایک دوسرے سے لرزہ براندام ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو ہمیں خود اپنے سے ڈر لگنے لگتا ہے۔

کیا اب اس سے بھی زیادہ کوئی مصیبت آنے کو باقی ہے؟

(۱۲) فطرت اپنے قوانین کو بزور ہم سے منوا دینا چاہتی ہے اور ہم اپنے قوانین کو فطرت سے بزور منوا دینا چاہتے ہیں۔ اور یہی ہے وہ مسلسل جنگ جو تہذیب نے چھیڑ رکھی ہے۔ کون مصیبت جھیل رہا ہے اور کون فتح یاب ہو؟

(۱۳) ہم اکثر یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ تمدن محض کاہلی کے بروز (تدریجی ترقی) کا دوسرا نام ہے۔ ہمارے تازہ ترین اخبار و اکتشافات چبائے ہوئے لقموں کا کامیابی کے ساتھ تجارت کرنے سے زیادہ نہیں۔ اور ہمارے ہوٹلوں میں ان کھانوں کا بیوپار ہوتا ہے جو معدوں میں پہونچ کر ہضم ہو چکے ہیں۔ کیا اس آسمان کے نیچے کوئی نئی چیز نہیں مل سکتی ہے؟

(۱۴) روز بروز غیر فطری عادات و خیالات کے لقمے ہمارے منہ میں ٹھونسے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ ہمارا معدہ جواب دینے لگا ہے اور اب اپنی روحوں کو بچا لینے کا ایک راستہ ہمارے سامنے کھلا ہوا ہے کہ ہم ان تمام نوالوں کو اُگل دیں۔ اور فطرت کی طرف واپس جائیں۔ لیکن صحت و شفایابی کے حدود سے ہم کتنے ناامیدانہ طور سے باہر ہو چکے ہیں۔

(۱۵) یہ مسلّم ہے کہ غیر مصروف دماغ شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔ اور بعض افراد کے دماغوں میں بالعموم شیطان سب سے زیادہ مصروفِ کار پایا جاتا ہے۔

(۱۶) ہمارے تمام ادارے دراصل کمندیں ہیں جو ہماری ذہانتوں نے انسانی شعور کو پھانس لینے کے لئے پھینکی ہیں۔ اور اب جبکہ ان کے حلقے سخت ہو چکے ہیں، پھر بھی صرف ناخنِ ذہانت ہی کا کام ہے کہ اس کے کھولنے کی راہ پیدا کرے۔ یہ ہے انسانی ذہانت

(۱۷) فطرت کی تمام چیزوں میں سے جو شے غیر فطری ہے وہ حضرتِ انسان کی تہذیب گزیدہ فطرت ہے۔ اور بس۔

(۱۹) تہذیب اپنی مخصوص مسرتیں اور غم اپنے ساتھ لائی ہے یہ محض انتخاب کا معاملہ تھا لیکن ہمارے اجداد نے فطری مسرتوں اور فطری غموں کے مقابلہ میں مہذب مسرتوں اور مہذب غموں کا انتخاب پسند فرمایا۔

(۲۰) عصری سائنس اور اس کے تمام جدید ترین ارتقائی منازل اور اُس قدیم سوسائٹی، قانون اور مذہب کے مطالعہ میں کس قدر تقابل و تخالف نظر آتے ہیں جو صرف اُن پرانی کرم خوردہ کتابوں کی اوراق گردانی پر منحصر تھا جن کے مصنفوں نے گرجتے ہوئے بادلوں کے طوفان کے علاوہ برقی روشنی کبھی نہ دیکھی تھی اور جنھیں بانس کے سہارے کے علاوہ کسی پل کے عبور کرنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔

(۲۱) عصری تہذیب کی چمک دمک پر فریفتہ ہونے سے بچنے کے لئے نہایت دور اندیشی اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات تہذیب کی خوبصورت پریاں اخلاق اور رقص کرتی ہوئی اس قدر قریب آجاتی ہیں کہ شدید ترغیب و تحریص یہ فریب دینے لگتی ہے کہ ان کے ساتھ تھوڑے سے اختلاط و التفات سے بھلا کیا نقصان پہونچ سکتا ہے، اور افسوس کہ جو نقصان پہونچ جاتا ہے وہ اُس وقت معلوم ہوتا ہے جب نقصان پہونچے ہوئے بہت دیر گزر جاتی ہے۔ اس لئے خبردار! پھونک پھونک کر قدم اٹھاؤ نہایت ہی استواری اور دلیری کے ساتھ ہر پہلو پر نگاہ رکھو۔ اور تہذیب کو اپنے سے تحفظ آمیز فاصلے پر رہنے دو۔

اگر تم فریب میں آجانے کی صلاحیت رکھتے ہو اور زندگی کے مختلف متنوع پہلوؤں پر تمہاری نگاہ نہیں ہے تو تہذیب کے پیچ و خم تمہیں اپنی شکنوں کے اندر پیس ڈالیں گے اور پھر؟ تمہارے سلامت بچ نکلنے کی بہت کم امید باقی رہے گی۔

(۲۲) کیا اسے دلیل کہا جا سکتا ہے کہ اگر پردے کی رسم اٹھا دی گئی تو پردہ نشین خواتین بداخلاق ہو جائیں گی؟ کیا ایسی بیشمار عورتیں اس وقت موجود نہیں ہیں جو پردے کے باہر اور پردے کے اندر بھی بداخلاق ہیں؟

ہمیں اس کا خوف کیوں کرنا چاہئے کہ اگر ہم نے رسوم اُٹھا دئے تو خلقت بے لگام اور دیوانی ہو جائے گی؟

خدارا بتاؤ کہ ان تمام رسوم و ضوابط کی موجودگی میں بھی جنھیں انسان نے ہر ممکنہ سعی سے وضع کیا ہے کیا انسانیت ہزاروں بے پناہ جرائم اور بداخلاقیوں میں مبتلا نہیں ہے؟

تو پھر ان نمائشی رسوم و ضوابط کو محض عادت کی بنا پر کیوں قایم رکھا جائے!

(۲۳) غور کرو اگر ہم سب مل کر انسان کی نجات کی راہ نکالنے پر غور کرنا شروع کر دیں تو ہماری یہ سعی تہذیب کی فتح ہوگی یا موت؟

محبت

(۱) شعرا عشق و محبت کا نام لیتے ہیں اور فطرت اسے ہوائے نفس سے منسوب کرتی ہے اور ہر چند اس مباحثے میں صدیاں گزر چکی ہیں کیا ابتک ہم فیصلہ کر سکے ہیں کہ دونوں میں سچا کون ہے؟

(۲) عشق و محبت کو ہوائے نفس کہنا نظری طور سے ناخوشگوار ہو سکتا ہے لیکن کیا یہ عملی طور پر صحیح نہیں ہے کہ بے شائبہ محبت بھی ہوائے نفس کا وجود ہو سکتا ہے، درآنحالیکہ کوئی محبت ایسی نہیں ہو سکتی جو بے شائبہ ہوائے نفس وجود پذیر ہو۔

(۳) اگر ہم محبت کے باب میں ضرورت سے زیادہ روحانی تصورات سے باز آجائیں تو محبت ہی دراصل اس دنیا کا حقیقی فلسفہ کہا جا سکتا ہے۔

محبت روزمرہ کی زندگی کی حقیقی عملی قوت کا نام ہے کیونکہ یہ وہ قوت ہے جو مہمات سر کرتی ہے اور وہ طاقت ہے جو بالآخر کامراں ہو کر رہتی ہے۔

(۴) محبت ایک بہت بڑی بدبختی ہے، اور محبت کا مزہ نہ چکھنا اس سے بھی زیادہ بدبختی ہے اور سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ بے صرفہ محبت کی جائے۔

(۵) محبت، آلام کو دعوت دیتی ہے۔ بعض اسے قربانی کہتے ہیں بعض اسے نشاط سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور بعض اسے کمزوری سمجھتے ہیں۔ کیا محبت ان میں سے کوئی چیز نہیں ہے؟ کیا محبت یہ سب کچھ ہے؟

(۶) حیات کی برومندی کو محبت کے رنگین نقوش سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ جب تم محبت شروع کر دیتے ہو، کیا اُسی وقت سے تم زندگی شروع نہیں کرتے؟

(۷) اگر تمہاری محبت سچی ہے تو سُود و زیاں کا شمار چھوڑ دو۔ خود غرضانہ محبت تو نفرت سے بھی بدتر ہے۔

(۸) یہ نہ دریافت کرو کہ محبت کیا شے ہے؟ کیونکہ اس کا جنون مسرت،

گونگے کا خواب بنا ہوا ہے۔ الفاظ سے باہر۔ بیان کی دسترس سے دُور۔

محبّت کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے جس نے اِس کا مزا چکھا ہے۔

(۹) سچّی محبّت کی سب سے بڑی کسوٹی یہ ہے کہ اس کے آلام بھی دنیا کی عظیم ترین مسرّتوں سے زیادہ شیریں معلوم ہوتے ہیں۔

اس سے محبت کرو جس کے متعلق تمہیں یقین کامل ہو کہ اُس سے تم نفرت کر ہی نہیں سکتے ہو۔

(۱۰) یا وہ خوران میکدۂ محبت کی نگاہ میں یہ کائنات اور اُس کا تمام طمطراق کس قدر حقیر ہے! اور دنیا کی نظر میں؟

(۱۱) محبّت خود اندھے پن سے بھی زیادہ اندھی ہے۔

(۱۲) حقیقی مکان وہ نہیں ہے جہاں انسان سکونت رکھتا ہے۔ وہ دراصل ایک ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں سے ہمارے قدم تو باہر نکل سکتے ہیں۔ مگر دل نہیں نکل سکتا۔ کیا تمہارا ایسا کوئی مکان ہے؟

(۱۳) انسان کی پوشیدہ ترین آرزوئیں صرف خالص محبّت ہی سے آسودہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن کتنے بار ہم جادۂ صحیح سے دھکا دیکر دُور پھینک دئے جاتے ہیں۔

(۱۴) بہت سے دل تشنہ ہیں۔ بہت سے ضرورت سے زیادہ سیراب، کیوں ہم ایک دوسرے کو آپس میں حصے تقسیم کرکے مدد نہ دیں۔

حیات

(۱) تمہیں ہمیشہ دو قسم کی کشمکشوں کا سامنا رہتا ہے۔ ایک تو زندگی میں داخل ہونے کی اور دوسری اس سے باہر نکلنے کی۔ کیا تم مؤخر الذّکر کے واسطے تیار ہو؟

(۲) ہم گھبرا گھبرا کر جی رہے ہیں گویا ہم اپنے وجود کو خزینۂ فطرت سے چُرا لائے ہیں۔

آخر یہ بوکھلاہٹ اور بے اعتباری کس بات کی ہے؟

(۳) زندہ رہنا نہایت ہی خوب ہے بشرطیکہ جس طرح تم زندہ رہنا چاہتے ہو دوسرے لوگ اُسی طرح اجازت بھی دیدیں لیکن کیا وہ ایسا کریں گے؟

(۴) سب سے بڑی مہم زندگی سے مقابلہ کرنا ہے اور جو اس مقابلے سے جی چُراتا ہے، مستحق ہے کہ ناامیدی کا منہ دیکھے۔

کیا تم زندگی کا مقابلہ کر رہے ہو؟

(۵) عصرِ حاضر کی سوسائٹی۔ قانون اور مذہب کے تم از روئے فتاویٰ متدن غلام ہو۔ اور حقیقی دشواری یہ ہے کہ تم اس سے واقف ہی نہیں ہو کیا آخر کار تم نے اسے معلوم کر لیا ہے؟

(۶) کیا ہم زندگی کے مزے اُڑا رہے ہیں، یا ایک دوسرے سے مسرّتوں کی نوچ کھسوٹ میں مصروف ہیں؟

(۷) ہم حقیقت میں مبالغہ کرتے ہیں اور صرف یہی مبالغہ ہے جس کے ذریعے سے ہم میں زندہ رہنے کی ترغیب و تحریص پیدا ہوتی ہے۔ کتنا دردناک کھیل ہے۔

(۸) زندگی شروع کرنے سے پیشتر اپنی نجات کے تخیل کو زمانہ خوردہ مذہبی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی قوانین سے آزاد کر لو۔

عملی زندگی میں اس سے بڑی اور کیا نجات ہو سکتی ہے کہ اس فاسد دائرے سے روح کو آزادی مل جائے۔

(۹) میں جو کرنا چاہتا ہوں نہیں کر سکتا کیونکہ سفید سر کی سوسائٹی کہتی ہے کہ یہ سوسائٹی کے "اداب" کے خلاف ہے۔ مغرور خاتونِ کہتی ہے کہ یہ قانون کے خلاف ہے۔ اور مقدس مذہب ریش دراز پر ہاتھ پھیر کر کہتا ہے کہ یہ مذہب کے خلاف ہے اور پھر یہ تینوں سوسائٹی، قانون اور مذہب، باہمی طور پر فیصلہ کرکے مجھے بتاتے ہیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں، اور میرا دل کہتا ہے کہ یہی وہ چیز ہے جسے میں کرنا نہیں چاہتا تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

(۱۰) اگر تم اُس اسلوب پر زندگی نہیں گزار سکتے جس اسلوب پر زندگی گزارنے کا سوسائٹی تم سے مطالبہ کرتی ہے، تو سوسائٹی تمہیں اُس اسلوب پر زندگی گزارنے نہ دے گی جس اسلوب پر تم زندگی گزارنا چاہتے ہو۔ اور صرف ایک چارۂ کار جو تمہارے واسطے باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ تم زبوں حالی میں عمر گزارو اور جب دونوں طریقوں سے تمہاری زبوں حالی یقینی ہے تو پھر اُس اسلوب پر زندگی کیوں نہ گزارو جو تمہیں خود پسند ہے۔

(۱۱) زندگی کے ہر موضوع پر اس قدر شدید اختلاف آراء کا انبار ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی کا حصر اسی پر کر دے کہ وہ سب سے مشورہ کر لینے کے بعد کوئی کام شروع کرے گا تو شاید نزع کے وقت تک وہ مباحث ہی سنتا رہے گا۔

تو پھر اپنی ہوس مشورہ طلبی میں کافی اعتدال پیدا کرکے تدبّر و تفکر کے ساتھ اپنے [illegible]



حالی کی مصلحانہ شاعری

(خواجہ غلام السیدین صاحب)

ہمارے ملک میں کچھ عرصے سے یہ خیال پھیلتا جاتا ہے کہ فنونِ لطیفہ کا مقصد محض ذوقِ حسن کی تسکین ہے اور انھیں کسی دوسرے مقصد کا تابع کرنے سے اُن کی لطافت جاتی رہتی ہے۔ چونکہ شاعری ایک فنِ لطیف ہے اس لئے اخلاق کی اصلاح سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان لوگوں کے خیال کے مطابق شاعر اور مصلح کا میدان بالکل الگ الگ ہے۔ ایک کا مقصد ذوقِ جمال کی تشفی ہے دوسرے کا کام اخلاق کی درستی۔ وہ مذاقِ لطیف کو اپنا مخاطب بناتا ہے۔ یہ خدا کا خوف اور دنیا کی شرم دلاتا ہے۔ شاعر کی چوٹ دل پر پڑتی ہے مصلح دماغ کو سلجھانے اور سنوارنے کی فکر کرتا ہے۔ شاعر کے لئے دل آئینۂ حسن ہے اور مصلح کے لئے حسن آئینۂ حق۔ لہٰذا آرٹ کا پرستار ایک نیم مستہزی انداز میں یہ سوال کرتا ہے کہ ان دو مختلف ہستیوں کو، جن کی ترکیب متضاد عناصر سے ہوئی ہے ایک ساتھ وابستہ کرنے سے کیا حاصل ؛ اخلاقی مضامین کو نظم میں بیان کر دینے سے شاعری پیدا نہیں ہوتی !

حالی کی مصلحانہ حیثیت پر بحث کرنے سے قبل اس اعتراض کا مختصر سا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آج حالی کا شاعرانہ کمال اس درجہ مسلّم ہو چکا ہے کہ اُس کو ثابت کرنے کے لئے کسی طویل ثبوت کی ضرورت نہیں۔ ابتدا میں تعصب اور تنگ نظری نے بہت گرد اڑائی اور ان کی روشنی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی لیکن جب زمانے نے اس گرد و غبار کو اُڑا دیا تو معلوم ہوا کہ حالی نہ صرف ایک حقیقی شاعر ہیں بلکہ شاعری کی دنیا میں ایک انقلابِ عظیم کے بانی ہیں اور انھوں نے زبان اور مضمون کے اعتبار سے اُسے ایک نئی اور معنی خیز وسعت سے آشنا کر دیا ہے۔

ان معترضین کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر جن جذبات اور خیالات کو شعر میں ادا کرتا ہے وہ خود بخود بغیر کسی شعوری تحریک کے اس کے نفس کی گہرائیوں سے پھوٹ نکلتے ہیں اور ان کی سوتیں گرد و پیش کی زندگی میں ڈھونڈھنا بیکار ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ ادب، شاعری، مصوّری بلکہ انسانی قوتِ تخلیق کے تمام مظاہر دراصل زندگی سے وابستہ اور اس کے دست نگر ہیں۔ اور ان سب کا اعلیٰ ترین مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی کے احساس کو زیادہ مستحکم، اس کی معنویت کو زیادہ گہرا اور اس کے امکانات کو زیادہ وسیع بنائیں۔ اگر ان کا رشتہ زندگی سے قائم نہ رہے تو ان میں تصنع، رسمیت اور تنگ نظری راہ پا جاتی ہے۔ یہ مانا کہ شاعر جن جذبات اور خیالات کو حسین الفاظ کا جامہ پہناتا ہے انھیں اپنے دل کی گہرائیوں سے ڈھونڈ کر لاتا ہے لیکن آخر دل میں وہ کہاں سے آتے ہیں ؟ وہ اس کے تجربوں اور مشاہدوں، اس کی گذری ہوئی مسرتوں، اس کے سہتے ہوئے دکھ درد کا ثمر ہوتے ہیں۔ بیشک شاعری خالی خولی شاعری کا نام نہیں۔ اگر جوش، موعظت شاعری کی روح پر غالب آ جائے تو شعر شعر نہیں رہتا۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ شاعری محض الفاظ کے اُتار چڑھاؤ، بندش کی چستی، ترکیبوں کی خوبی سے عبارت نہیں بازی گر کی طرح الفاظ سے کھیلنا اور چیز ہے اور الفاظ کو دل کا ترجمان بنا کر آپ بیتی اور جگ بیتی کو دل لگتے انداز میں بیان کرنا اور چیز۔ جن شاعروں کی قسمت میں حیاتِ دوام آئی ہے ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان کی خودی وسیع ہو کر سارے جہان پر محیط ہو گئی تھی یعنی قطرے نے دریا میں فنا ہو کر عشرتِ ابدی حاصل کر لی تھی۔ انھیں اپنے ابنائے جنس کی خوشی سے خوشی اور ان کے غم سے غم ہوتا تھا وہ ان کے عروج پر فخر اور اُن کے زوال میں ندامت محسوس کرتے تھے۔

چیست انسانی تپیدن از تبِ ہمسائگاں
از سموم نجد در باغ عدن پژماں شدن

شاعر ہونے کے لئے یہ "انسانیت" ضروری ہے اور تجدد و عدن کا امتیاز بننا لازم۔ اس کی بدولت اثر آفرینی، سوز و گداز، خلوص اور درد کے وہ خزانے ہاتھ آتے ہیں جو بے جان الفاظ میں روح ڈالتے اور انھیں قوتِ پرواز بخشتے ہیں۔ جو شاعر اس تڑپ اور احساس سے محروم ہے جس کا دل اپنے زمانے کی خرابیوں اور نا انصافیوں پر نہیں دکھتا، جو صداقت اور شرافت کی طرف سعی نہیں کرتا جس کا خون حق و باطل کی جنگ کو دیکھکر تیز تیز حرکت نہیں کرنے لگتا، ممکن ہے ایسا شاعر اپنے کلام میں محاورے اور روزمرہ کا کمال دکھائے لیکن نگاہِ حقیقت بین میں اس کی وقعت بازی گر کے کرتبوں سے زیادہ نہیں۔

اب حالی کی طرف آئیے۔ حالی کو حساس اور دردآشنا دل ملا تھا اور حق پسندی اور حق گوئی کا جوہر عطا ہوا تھا۔ تربیت نے دینداری کو ان کی طبیعت میں راسخ کر دیا تھا۔ جب انھوں نے ہوش سنبھالا اور اپنے ماحول پر نظر ڈالی تو ایک عبرت خیز اور دردناک نقشہ نظر آیا۔ عہدِ مغلیہ میں جس تہذیب و تمدن نے نشو و نما پائی تھی اور معاشرتی اور ذہنی زندگی کے جو سانچے بن کر تیار ہوئے تھے وہ سب حرفِ غلط کی طرح مٹ چکے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت آنکھوں کے سامنے گذری تھی۔ مسلمانوں کا آفتابِ اقبال ایسا گہن میں آیا کہ نہ صرف اُن کی بساطِ حکومت الٹ گئی بلکہ علوم و فنون، اخلاق و معاشرت، عزت و ثروت سب ہاتھ سے جاتے رہے۔ اس بربادی کو دیکھکر اُن کے دل پر چوٹ لگی اور اس کا مرثیہ ان الفاظ میں اُن کی زبان پر آیا۔

"قوم کی حالت تباہ ہے عزیز ذلیل ہوگئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں تعصب کی گنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امرا جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل اور بے پروا ہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔"

یہی نقشہ تھا جس کو حالی کے خونچکاں قلم نے مسدس میں اس طرح کھینچا ہے۔

پھر اک باغ دیکھے گا اجڑا سراسر جہاں خاک اُڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر

نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں زہر کا کام کرتا تھا باراں جہاں آکے دیتا تھا اُڑ دا بہاراں
تر و دستے جو اور ہوتا تھا ویراں نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں

یہ آواز پیہم وہاں آرہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

کیا حالی کے لئے ممکن تھا کہ وہ ملتِ اسلامیہ کے اس اجڑے ہوئے باغ کا نظارہ دیکھنے کے بعد گل و بلبل کی شاعری میں نازک خیالیاں دکھاتے؟ بیشک ایسے شعرائے کرام بھی اس زمانے میں گذرے جن کے پاس آنکھیں تھیں، لیکن انھوں نے دیکھا نہیں۔ کان تھے لیکن سنا نہیں۔ دل تھا لیکن کچھ محسوس نہیں کیا۔ قوم کا گھر جلتا رہا اور وہ روم کے شہنشاہ نیرو کی طرح بیٹھے بانسری بجایا کئے۔ لیکن حالی کے دل و دماغ پر اس آگ کا دھواں چھا گیا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک پڑا۔ حالی کی شاعری ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کی فریاد ہے۔ مگر کس کے دل کی؟ وہ ایک فردِ واحد الطاف حسین حالی کا دل نہیں بلکہ ایک قوم و ملت کا، ایک تہذیب و تمدن کا دل ہے جو اپنی وسعت میں ایک جہانِ درد و آرزو لئے ہوئے ہے۔ حالی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ محض اُن کے اپنے جذبات اور وارداتِ قلب کا آئینہ نہیں بلکہ ایک پوری قوم کی داستانِ عروج و زوال ہے۔

اس کی دوسری اہم خصوصیت شاعر کی نظر کی رسائی اور رائے کی اصابت ہے۔ اس نے قوم کی نبض پر ہاتھ ہی نہیں رکھا۔ بلکہ مرض کی صحیح تشخیص کر کے مناسب دوا بھی تجویز کی۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا، کیونکہ اس دورِ آشوب میں بڑوں بڑوں کی عقلیں جواب دے چکی تھیں۔ لوگ افراط و تفریط میں گرفتار تھے۔ بعض قدامت پرستی کے بندے، ماضی کے نشے میں سرشار۔ یہ چاہتے تھے کہ جدید علوم و تمدن کو بالکل مسترد کر دیں۔ بعض تہذیبِ مغرب سے مسحور ہو کر اپنی قومی روایات اور خصوصیات کو اس پر قربان کرنے کے لئے تیار تھے۔ اس نازک موقع پر حالی کی عقلِ سلیم نے شمعِ ہدایت کا کام دیا۔ انھوں نے ایک طرف مسدس میں مسلمانوں کو ان کے عروج کی داستان سنائی۔ اُن کی خودداری اور عزتِ نفس

کو ابھارا اور انھیں اسلام کے بھولے ہوئے اصول یاد دلائے۔ اور دوسری طرف مغربی تہذیب و تمدن کا جائزہ لیکر اس کی ان خصوصیات کی طرف توجہ دلائی جو مغربی اقوام کی ترقی اور فروغ کا باعث ہوئی ہیں۔ ان کی حق پسندی نے اپنے تمدن کی برائیوں پر پردہ ڈالنا گوارا نہیں کیا اور نہ دوسروں کی خوبیوں کے اعتراف میں کوتاہی کی۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک ہم اپنے آپ کو جدید ذہنی ہتھیاروں سے مسلح نہیں کریں گے کارزارِ حیات میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کا سارا کلام خصوصاً مسدس جہاں دردآشنا کے لئے ایک مرثیہ کا حکم رکھتی ہے وہاں عقلِ سلیم کے لئے دعوتِ فکر اور سرچشمۂ ہدایت ہے۔

غدر کے بعد مسلمانوں کے زوال کی سب سے بڑی علامت یہ تھی کہ ان کی قومی سیرت مسخ ہو گئی تھی اور ان تمام صفات کے بجائے جو ان کی ترقی کا باعث ہوئی تھیں، ان پر تعصب، پست ہمتی، غلامی، جھوٹ اور ریاکاری مسلط تھی اور ستم یہ تھا کہ متاعِ کارواں، کے ساتھ "احساسِ زیاں" بھی زائل ہو گیا تھا۔ اس وقت کوئی تعمیری تحریک ایسی نہ تھی جو دوبارہ مسلمانوں کی تنظیم کرے۔ خدا بھلا کرے سرسید کا جنھوں نے اس نازک وقت میں علیگڈھ تحریک کی بنا ڈالی اور تمدن، تعلیم اور علم و ادب میں ایک نشاۃِ ثانیہ کا آغاز کیا۔ یہ تحریک محدود معنی میں صرف تعلیمی تحریک نہ تھی بلکہ اس کا مقصد قوم میں ایک عام بیداری پیدا کرنا تھا تاکہ اس کا جمود، افسردگی اور ناامیدی دور ہو جائے اور وہ دوبارہ اجتماعی معاملات میں تخلیقی جدوجہد کر سکے۔ اس تحریک کی زبان حالی تھے جنھوں نے اس کے اثر کو تعلیم یافتہ طبقہ کے تنگ دائرے سے باہر نکال کر ملک اور قوم میں عام کر دیا اور اس کا ذریعہ ان کا شہرۂ آفاق "مسدس" تھا جس کی تصنیف سرسید کی فرمائش سے ہوئی تھی۔

اصلاحی نقطۂ نظر سے سب سے اہم مسدس کا وہ حصہ ہے جس میں شاعر نے قوم کے ہر گروہ اور ہر طبقے کی حالت کو اپنی بے پناہ اور دردناک تنقید کے ذریعہ بے نقاب کیا ہے۔ جس کے ہر شعر میں انھوں نے سوسائٹی کی کسی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا ہے۔ پوری مسدس کا تو کیا ذکر ہے۔ اس کے آخر میں محسنِ سرورِ کائنات کی بارگاہ میں عرضِ حال کرتے ہوئے انھوں نے چند اشعار میں وہ حقائق بیان کر دئے ہیں جن پر مورخین، معلمینِ اخلاق اور مصلحینِ معاشرت مدتوں سر دھنیں گے۔ اس دردِ بھری اور دلدوز نظم میں سے کوئی کیا سنائے اور کیا چھوڑے؟ مثال کے طور پر چند شعر سن لیجے۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے　　اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے　　اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آکے ملائے　　اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے
جو دین کہ ہمدردیِ نوعِ بشر تھا　　اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی　　اس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے
عالم ہے سو بے عقل ہے، جاہل ہے سو وحشی　　منعم ہے سو مغرور ہے مفلس سو گدا ہے
چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں　　پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے
دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے　　اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے

صرف اسی ایک نظم کی تنگ زمین میں حالی نے ان "مقامات" کو بیان کر دیا ہے، جہاں مذہب و فلسفہ کے بڑے بڑے مدعی نہیں پہنچ سکے۔ اسلام کی تعلیم کے رخِ روشن پر زمانے کے تعصب، مخالفوں کی غلط بیانی اور خود مسلمانوں کی بے راہ روی کی وجہ سے پردہ پڑ گیا تھا۔ حالی نے اس پردہ کو اٹھا کر دکھایا کہ اسلام ایک مذہبِ امن ہے جو دنیا میں سلوک اور محبت کی حکومت قایم کرنے آیا تھا۔ اسلام کا مقصد قوموں اور جماعتوں کے اختلاف اور تعصب کو مٹانا اور ان میں ایک عالمگیر اخوت قایم کرنا تھا۔ اس نے فقر میں خودداری اور جدوجہد اور ثروت میں فیاضی، خداترسی اور حق شناسی سکھائی تھی۔ اس نے علم و حکمت کو مومن کی کھوئی ہوئی پونجی سے تعبیر کیا تھا۔ اسی کی برکت سے مسلمانوں نے دنیائے فکر و عمل کو مسخر کر لیا تھا۔ لیکن اب خود ملتِ اسلامیہ میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور افراد اور جماعتوں نے تعلقات میں حسنِ مراعات کا نام تک باقی نہیں رہا۔ عمل کی سرگرمی کی جگہ جمود اور بے حسی کا دور دورہ ہے۔ منعم اپنی دولت میں مست ہیں اور مفلس خودداری کو چھوڑ کر ہر ایک کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ نہ ان میں قوتِ عمل باقی رہی ہے نہ ان میں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ خدا کے یہاں انصاف ہے۔ پاسداری نہیں۔ جو قوم اس کے احکام اور قوانین کی پیروی نہیں کرے گی وہ اس کا خمیازہ اٹھائے گی۔ اس میں تقدیر کا گلہ کرنا اپنے نفس کو فریب دینا اور حقیقت کی تلخی سے گریز کرنا ہے۔

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلہ ہے،

تمدن اور معاشرت کے تمام مختلف فیہ مسائل میں حالی ادھر ہوتے ہیں جو عدل، انسانیت اور انصاف کا راستہ ہے۔ وہ حق پرستی، انصاف پسندی، خودداری، جرأت، بلند حوصلگی، اور رواداری کے حامی ہیں اور وقت کی قدر کرنا،

محنت کی عزت کرنا۔ ابنائے جنس کے حقوق کی پاسداری کرنا اور مفاد ملی کے لئے ذاتی اغراض کو قربان کرنا سکھاتے ہیں۔ ان کی تعلیم میں ایک انقلاب عظیم کا امکان پوشیدہ ہے، جس کو ان لوگوں نے بھی پوری طرح نہیں سمجھا جو ان کے کلام پر سر دھنتے ہیں اور ان کا قومی مرثیہ پڑھکر آنسو بہاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں نہ صرف قوم کا دل دھڑکتا ہے بلکہ اس کے بلند ترین جذبات اور اعلیٰ ترین مقاصد کی ترجمانی موجود ہے۔ اقبال نے شیکسپیر کی شان میں جو شعر لکھا ہے اس کا اطلاق بدرجۂ کمال حالی پر ہوتا ہے۔

حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن
دلِ انساں کو ترا حُسنِ کلام آئینہ

حالی کی مصلحانہ حیثیت کی سچی قدر شناسی کے لئے ان کی بلند اور پاکیزہ سیرت کو سمجھنا ضروری ہے۔ دنیا میں بہت سے بڑے بڑے آدمی گذرے ہیں جن کا نام لوگوں کی یاد اور تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ لیکن باوجود ان کے بڑے بڑے کارناموں کے ان میں کم ایسے ہوئے ہیں جن کا ظاہر و باطن، قول و فعل، اصول اور عمل، زندگی اور تعلیم بالکل ایک ہوں۔ حالی کی کامیابی اور اثر آفرینی کی ایک بڑی وجہ ان کا خلوص ہے۔ ان کی شاعری میں بھی وہی خالص سونا دمکتا ہے جس سے ان کی فطرت کا خمیر تیار ہوا تھا۔ ان میں تصنع اور تکلف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا لفظ جو دل سے نکلتا ہے، بجلی بن کر دل پر گرتا ہے۔

سر سید کے حلقۂ احباب اور رفقاء میں جو بڑے بڑے مشاہیر اور قابل احترام لوگوں پر مشتمل تھا، حالی کی سیرت سب سے برتر اور بلند تھی جس پر تبصرہ کرتے ہوئے خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے عصر جدید میں لکھا تھا: "بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا یونانی خیالات کی رو سے ایک معتدل اور متوسط انسان اور صوفیہ خیالات کی رُو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔"

اس کی تائید میں جسٹس سید محمود کا وہ جملہ بھی سن لیجے جس کے ناقل سر سید راس مسعود ہیں اور جو انھوں نے اپنے والد سر سید کے سامنے کہا تھا۔

"ابا جان اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے ان میں سے کوئی ایسا ہے جس کی پرستش کرنے کے لئے تیرا دل تیار ہے تو میرے پاس جواب حاضر ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالی ہے۔"

سید محمود جس زبردست دل و دماغ کے شخص تھے وہ محتاج بیان نہیں انھوں نے ایسی آزاد طبیعت پائی تھی کہ ان کا سر نیاز کسی بڑی سے بڑی بارگاہ میں بھی خم نہیں ہوا۔ ان کا یہ کہنا کہ تمام انسانوں میں حالی قابل پرستش ہیں اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتا ہے۔

ان ذاتی اوصاف اور باطنی کمالات کا تذکرہ غیر متعلق یا خارج از بحث نہیں۔ کیونکہ حالی کی ذات اب انفرادیت کی حدود کو توڑکر ہماری تہذیب و تمدن اور ہماری تاریخ و ادب کے سرمایۂ عزیز میں سما گئی ہے۔ اس لئے ان کی شاعری کی قدر شناسی کے لئے ان نفسی خصوصیات اور محرکاتِ عمل کو پہچاننا ضروری ہے جنھوں نے حالی کو حالی بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلاح کا جذبہ اور خدمت خلق کا شوق ان کی زندگی اور عمل کے ہر پہلو پر محیط تھا۔ اس نے ان کو غم عشق اور غم روزگار دونوں سے آزاد کرکے قوم کے غم اور قوم کے عشق میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہی جذبۂ اصلاح تھا جس نے اُن کی زندگی کی ابتدا سے رہنمائی کی۔ اسی کی بدولت انھیں مسدس کے مضامین کا الہام ہوا۔ اسی کا یہ تقاضا تھا جس نے پُرانی شاعری کے فرسودہ سانچوں کو توڑ کر ان کی خلاق طبیعت کے لئے نئے سانچے تیار کئے۔ اور ایک شاعری پر ہی کیا منحصر ہے؟ ادب کی کونسی صنف تھی جس کی تہذیب اور اصلاح انھوں نے نہ کی ہو، اور اس میں چار چاند نہ لگا دئے ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ حالی نے جس طرح دنیائے عمل میں تمام عمر جھوٹ، مبالغہ اور ریاکاری کے خلاف جہاد کیا اسی طرح دنیائے فکر میں بھی ان چیزوں کو روا نہیں رکھا۔ ان کی ہر تصنیف میں وہی سچائی، سادگی اور ہمدردی جھلکتی ہے جو ان کی سیرت میں کارفرما تھی۔ اور اس کی بدولت ان کے لئے نہ صرف شعرائے عالم کی صفِ اوّل میں جگہ مخصوص ہے بلکہ اہلِ نظر کے نزدیک ان کا شمار خاصانِ خدا میں ہے۔ کیونکہ انھیں خدا کی مخلوق سے محبت تھی اور اُس کی خدمت کا ذوق اور ولولہ تھا۔

آج جو لوگ قومی خدمت کی راہ میں گامزن ہیں حالی کی سیرت اور شاعری ہر قدم پر اُن کی رہنمائی کرتی ہے۔ اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے



انقلابِ رُوس

از جناب کشن پرشاد صاحب کول لکھنؤ

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم نے جو قیامت خیز ہنگامہ اطرافِ عالم میں بالعموم اور سرزمین یورپ میں بالخصوص برپا کیا اُس نے نہ معلوم کتنے تاجداروں کو خانماں برباد کر کے قعرِ گمنامی میں ڈھکیل دیا جن قوموں اور ملکوں کی شہرت اور دبدبہ کے آگے دنیا زانوئے ادب تہ کرتی تھی وہ آج بےکسی اور بےحیائی کی زندگی بسر کر رہی ہیں اور ان میں سے بعض کا تو نام و نشان تک صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ہے۔ میدانِ سیاست میں ایسے ایسے حیرت انگیز انقلاب دیکھنے میں آئے اور جمہورِ عالم پر مصائب و آلام کے وہ پہاڑ ٹوٹے کہ خلقت آج بھی ان سے سہمی ہوئی ہے۔ مگر یہ حادثے ایسے نہیں کہ جن کا اثر دیرپا ہو۔ دنیا اُن کو بہت جلد بھُلا دیگی اور یہ قصۂ پارینہ ہو کر رہجائینگے۔ مگر رُوس کے انقلاب نے اُس ملک کی جیسی کچھ کایا پلٹ کی ہے اور جن تو توں اور اصولوں کو عملی جامہ پہنا کر بساطِ سیاست پر برسرِ پیکار لا کر کھڑا کیا ہے اور مغربی تہذیب و تمدّن کو جو پیغامِ جنگ وہ آج دے رہے ہیں یہ دنیا کی آنے والی نسلوں کو مدّت مدید تک نچلا اور چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ اِس تلاطم کی موجیں ابھی عرصۂ دراز تک تمدّنِ انسانی کے ساحل سے ٹکرایا کریں گی۔ بولشوی انقلاب کی یہ تعبیر کہ اُس نے زارِ رُوس کی سی عظیم الشان ہستی کو مٹا کر حکومت کا تختہ پلٹ دیا ناکافی ہے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس انقلاب کے آغوش میں زمانہ نے ایک اور کروٹ بدلی ہے۔ بہرحال دنیا کی تاریخ میں فرانسیسی انقلاب کے بعد سے کوئی حادثہ یا واقعہ ایسا نہیں گزرا ہے جس کی اہمیت کا مقابلہ بولشوی انقلاب سے کیا جائے۔ بولشوی تہذیب و طرزِ معاشرت اور مغربی تمدن کے باہمی کشاکش میں کون بالآخر بازی لے جائیگا یا اگر بولشوی دورِ انقلاب کا سکہ رُوس کی طرح دنیا پر بیٹھتا گیا تو خلائقِ عالم کے لئے یہ رحمت و برکت یا زحمت و مصیبت ثابت ہوگا اس کے متعلق قطعی فیصلہ صادر کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ یہ منصب تو زمانۂ آئندہ کے ہی کسی نسل کے مورخ کو حاصل ہو سکتا ہے۔ ایسے معاملہ میں پیشین گوئیاں کرنا فعل عبث ہے۔ البتہ صورتِ حال کا سمجھنا اور جو کچھ ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ لگانا ہر صاحب رائے کا حق اور فرض ہے۔

بولشوی انقلاب نے قطعی نئے عقیدے اور ایمان کی تلقین شروع کی ہے۔ جیسا کہ ایسی صورتوں میں بالعموم ہوتا ہے اس کے پیرو نئی زمین، دنیا، آسمان پیدا کرنے کے دعویدار ہیں اُن کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے رُوس کے سے ملک میں جو عام رعایا کے لئے نارِ جہنم ہو رہا تھا جنت کی سی فضا پیدا کر دی ہے اور اگر یہی لیل و نہار رہا تو وہ زمانہ دُور نہیں کہ وہ تمام دنیا کو فردوس بریں کا نمونہ بنا کر دکھا دیں گے بخلاف اس کے اُن کے دشمن اور مخالف اُن کے اوپر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے تمام مُلک کو تباہ و برباد کر دیا ہے اور وہاں کے باشندوں پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے ہیں کہ جو نہ اب تک دیکھے تھے نہ سُنے تھے۔ نہ صرف یہی بلکہ بولشوزم کو ایک ایسا ہوا بنا کر دکھایا جاتا ہے کہ جس سے نہ صرف بچے بلکہ جوان اور بُوڑھے بھی خائف نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں حقیقت حال کا پتہ چلانا آسان کام نہیں اور وہ بھی ہزاروں میل کے فاصلہ سے۔ پھر وہ تمام مسالا جو ہر ایسے معاملہ کی چھان بنان کے لئے ضروری ہوتا ہے اس ملک میں آسانی سے بہم نہیں ہو سکتا۔ بعض کتابوں کا تو ملک میں آنا ہی ممنوع ہے۔ جو کتابیں انقلابِ روس پر بالعموم دستیاب ہوتی ہیں اُن میں حد سے زیادہ رنگ آمیزی پائی جاتی ہے۔ تاہم معدودے چند وقائع نگاروں نے حتی الامکان غیر جانب داری اور بےلوثی سے کام لے کر صورتِ حال کے انکشاف میں سعی بلیغ کی ہے۔ یوں تو اپنی اپنی جگہ اکثر مصنفین نے مسئلہ کے کسی نہ کسی پہلو پر بڑی قابلیت اور صفائی سے روشنی ڈالی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی مبیلڈن گیسٹ

maurice Aindu مورس ہینڈس Haden Guest
رینی فلپ ملر Rane Fullup mullaer اور امریکن ٹریڈ
یونین ڈیلیگیشن American Trade union delegaion
کا مرتبہ اس فہرست میں خاص طور سے ممتاز ہے۔ ان مصنفین نے ایسی چھان بین سے کام لیا ہے اور اس بے لوثی سے واقعات کا انکشاف کیا ہے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ نظر آتا ہے۔ اس مسئلہ کا مطالعہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا کہ جب تک ان مصنفین کی تصنیفات پر کامل توجہ نہ کی جائے۔ اس مختصر سے مضمون میں انقلاب روس کی روداد کا بیان کرنا یا بولشوی حکومت نے جو کچھ کارنمایاں کئے ہیں اُس کا خاکہ کھینچنا نہ ممکن ہے نہ مقصود ہے۔ یہاں صرف چند منتشر خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے اور بولشوزم کے دو ایک بنیادی اصولوں سے اس غرض سے بحث کی جاتی ہے کہ ناظرین میں سے جن احباب کو اس مسئلہ کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو تو ان کو اس کے حل کرنے میں شاید اس بحث سے کچھ مدد ملے۔

بولشوی لیڈر اور بولشوی پارٹی کا عقیدہ اور مسلک یہ ہے کہ ذاتی ملکیت کے دستور کو قطعی مٹا کر ایسی حکومت کی بنیادیں مستحکم کی جائیں جس پر ادنیٰ طبقے کی رعیت کو پورا اختیار اور کامل قدرت حاصل ہو۔ اگر اس عقیدے اور مسلک کے آگے سر جھکا دیا جائے تو روس میں بولشوی پارٹی جو کچھ کر رہی ہے وہ بے معنی نہیں کہا جاسکتا۔ اس اعتراض کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے کہ اُن کے دعوؤں اور طریق کار میں منطق کی کمی ہے، نہ اُن کے پروگرام پر یہ اعتراض واجب آسکتا ہے کہ عملی پہلو سے یہ سب باتیں دور از کار اور محض بڑ ہی ہیں۔ بخلاف اس کے اُنکی منطق لاجواب اور اُن کے پروگرام ایسے نپے تلے اور کیل کانٹے سے درست معلوم ہوتے ہیں کہ ان میں نقص نکالنا کارے دارد۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ حضرت انسان بھی ایک چیز ہیں۔ عقل۔ دلیل اور منطق کا جادو ان پر چلتا ہے لیکن اُسی وقت تک جب تک کہ ان کے حسیات وجذبات کو اس سے ٹھیس نہیں لگتی۔ اپنی ازلی عریانی کو انھوں نے تہذیب وشائستگی کے جامہ سے ڈھانپ ضرور لیا ہے اور دیکھنے میں خاصے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن برتنے سے قلعی کھل جاتی ہے اور حرص۔ خودی اور حیوانیت کا ازلی جوش چھلکنے لگتا ہے۔ ارتقا، تہذیب وتمدن کی مختلف منزلیں طے کرکے انسان نے انسانیت کا درجہ اس معنی میں حاصل کرلیا ہے کہ اُس کا دماغ تعلیم وتربیت کی روشنی کا اثر قبول کرتا ہے۔ وہ اپنے دماغ کی قوت سے آسمان کے تارے توڑ لاتا ہے۔ اس کے تخیل کی بلند پروازی اُس کو چرخ ہفتمین سے پرے پہونچا دیتی ہے اور اس کے عقل ودانش کے کرشمے بعض اوقات ہم کو حیرت میں ڈالدیتے ہیں۔ لیکن چونکہ ابھی تک حسیات وجذبات میں لطافت وپاکیزگی کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی ہے اور اخلاق وروحانیت کا وہ عنصر جس کو انسانیت کہتے ہیں بہت کمیاب ہے۔ دُنیا واجب طور سے دار المحن کہلاتی ہے۔ اچھا ہے یا بُرا۔ اس سے بحث نہیں اصلیت یہ ہے کہ خودی اور حرص انسان کی ازلی سرشت ہے۔ دنیا میں اگر اپنے قدم جمانا۔ گھر بار بسانا ملکیت اور دولت پیدا کرنا۔ مرتبہ اور اختیار حاصل کرنا انسان کی ایسی سرشت اور خصلت ہے جو عارضی حوادثات کا اثر نہیں بلکہ اُس کے رگ وریشے اور خون وپوست میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ پیغمبران دین اور مصلحان قوم نے فقر وفاقہ کا وعظ دیا۔ ارتقار، تہذیب وتمدن کے دور نے شائستگی کے ساتھ ہی ساتھ سادگی کی زندگی کا معیار پیش کیا۔ تعلیم وتربیت نے انسان میں صلاحیت کا مادہ پیدا کیا اور دنیا نے پچھلے سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس کے زمانہ میں ترقی کے کئی مدارج طے کئے لیکن انسان ابھی اپنی ازلی سرشت کو بھولا نہیں ہے۔ پرانے زمانے میں عیسیٰ مسیحؑ اور گوتم بدھ اور موجودہ عہد میں ٹالسٹائی اور گاندھی کی سی ایسی برگزیدہ ہستیاں ضرور پیدا ہوئیں کہ جنھوں نے یہ باور کرایا کہ انسان کے لئے فرشتہ ہوجانا حیطۂ امکان کے باہر نہیں اور بھی بہت سے لوگ گمنامی کے پردے میں ایسے پڑے ہوں گے جن کے لئے انسان اور سراپا انسانیت کا لقب بجا طور سے استعمال کیا جاسکتا ہے مگر کروڑوں مخلوق میں کتنے؛ تعلیم۔ تربیت۔ اخلاق۔ معاشرت۔ تہذیب وتمدن۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں دنیا جس رفتار سے ترقی کر رہی ہے اور شائستگی کا دور جس طرح سے ہماری جہالت اور حیوانیت پر قابو واختیار پاتا جاتا ہے اس سے بعید نہیں معلوم ہوتا کہ چند صدیوں بعد یہ دنیا اصلی معنے میں انسانوں کی بستی ہوجائے۔ ممکن ہے کہ کبھی وہ زمانہ بھی آئے کہ انسان اگر فرشتہ نہیں تو فرشتہ کا ہمسر بن جائے۔ لیکن یہ ارمان ابھی خواب کی سی باتیں ہیں۔ بایں ہمہ بولشوی پارٹی کے لیڈر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ انسان کی اس ازلی سرشت کو بدل کر چھوڑیں گے۔ اور یہ معجزہ اسی دور اور اسی نسل میں کرکے دکھائیں گے۔ انکا عقیدہ ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلتا۔ پیغمبران دین اور مصلحان قوم کے وعظ سے جو نہوا وہ زور حکومت

اور قانون کی زبردستی سے ہو کر رہے گا۔ مانا کہ دنیا کا کام زیادہ تر یوں ہی چلتا ہے۔ آخر فرانسیسی انقلاب نے بھی تو زمانہ کی کروٹ بدلوانے میں سہارا دیا تھا۔ ٹھیک ہے۔ لیکن فرانسیسی انقلاب اور بولشوی انقلاب میں بڑا فرق ہے فرانسیسی انقلاب نے جس دورِ تمدن کو رواج دیا اور پچھلے ڈیڑھ سو برس میں دنیا جن اصولوں اور خیالات پر کاربند ہوئی اُن کا ماحصل یہ تھا کہ دنیا کی نعمت و دولت۔ حکومت و ثروت۔ حقوق و اختیارات صرف معدودے چند مجہول۔ کاہل اور عیش پسند لوگوں کے لیے جن کا شمار رؤسا کے طبقے میں ہوتا تھا مخصوص نہیں۔ بلکہ دنیا میں ہر طبقہ اور ہر درجہ کے افراد کو خواہ وہ کیسے ہی حقیر و ادنیٰ کیوں نہ ہوں یہ موقع حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے بل بوتے۔ اپنی قابلیت اور کیرکٹر کے مطابق اپنی ہمت اور کوشش سے اپنا وقار اور مرتبہ دنیا میں قایم کر سکیں۔ بولشوی انقلاب نے جس فلسفہ اور اصولوں کو اپنا پشت پناہ بنایا ہے وہ اُس کے بالکل برعکس ہیں۔ بولشوی حکومت ہر طبقہ۔ ہر گروہ اور ہر رائے کے افراد کے لئے مساوی موقع اور مساوی حقوق نہیں قایم کرتی، بلکہ اس کے اصول اور اس کے عمل کے مطابق تمام حقوق اور رعائتیں اُن افراد کیلئے مخصوص ہیں جو بولشوی عقائد اور اصولوں کے پیرو ہیں اور جن میں زیادہ تر کسان اور مزدور پیشہ لوگ ہیں۔ اُمرا، اور رؤسا کے لئے یا متوسط طبقہ کے واسطے جس کو بولشوسٹ بورژوئی BOLSHEVIsts کہتے ہیں اس سوشل نظام میں کوئی گنجائش نہیں۔ فرانس میں قبل از انقلاب دنیا کی تمام نعمت و دولت۔ حکومت و ثروت صرف رؤسا کے طبقے کے لئے مخصوص تھی۔ روس میں بعد از انقلاب ملک کی تمام دولت و ثروت مزدور پیشہ طبقے کی کائنات ہے۔ دونوں صورتوں میں اصول اور عقیدے کا کوئی فرق نہیں صرف اکثریت و اقلیت کا فرق ہے۔

بولشوی لیڈر اس صورت کو یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ جس نظامِ معاشرت کی داغ بیل ڈال رہے ہیں اُس میں تمام مخلوق مساوی درجہ رکھیگی۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کا فرق مٹ جائیگا۔ ہر شخص معمولی حیثیت سے آرام کے ساتھ زندگی بسر کریگا۔ اور جو لوگ حوصلہ و ارمان رکھتے ہیں اور جنھوں نے دل و دماغ بھی پایا ہے وہ بنی نوع انسان کی خدمت اور اپنے ملک کی ترقی و بہبودی کی کوشش میں نام روشن کریں گے اور اس طرح اُن کا وقار و مرتبہ اعلیٰ قرار پائیگا۔ اسی خیال کو کروپوٹکن نے اپنی کتاب CONQUEST OF BREED میں بڑی وضاحت و خوبی سے یوں بیان کیا ہے کہ دنیا میں اس وقت اس قدر وافر زر و زمین موجود ہے کہ اگر انسان اپنے حرص و حسد۔ خودی و انانیت اور ازلی جوشِ حیوانیت سے اندھا نہ ہو کر اس سب کو حصہ رسدی طریقے سے تقسیم کرے تو دنیا میں ہر فرد آرام و اطمینان سے زندگی بسر کر سکتا ہے اور اگر سائنس کے اُن نئے طریقوں کو احتیاط اور توجہ سے کام میں لایا جائے جو کاشت و صنعت و حرفت میں دُگنی بلکہ چوگنی ترقی کرکے دکھا سکتے ہیں تو ضروریاتِ زندگی کا سامان اس قدر وافر مہیا ہو جائیگا کہ جس طرح اس وقت پانی میسر ہے کہ کام میں بھی آتا ہے اور بہتا اور ضائع بھی ہوتا رہتا ہے۔ کوئی اسکی پروا نہیں کرتا۔ اسی طرح کھانے پینے اوڑھنے پہننے اور رہنے سہنے کا سامان بافراط ہو جائیگا۔ ہر شخص آرام سے زندگی بسر کر سکیگا اور بچ کر ضائع بھی ہوتا رہیگا لیکن اس کو کیا کیجیے کہ انسان کی خود غرضی۔ حرص و حسد اور ازلی سرشت حیوانیت منطقی اور فلسفی دماغوں کی اچھی سے اچھی اور سُلجھی ہوئی سے سلجھی ہوئی تجاویز کو روبکار نہیں ہونے دیتی۔ اور بنا بنایا گھروندا ڈھے جاتا ہے۔ بولشوی انقلاب زورِ حکومت اور نفاذِ قانون سے اس ازلی سرشت حیوانیت کو کس طرح آناً فاناً بدل دیگا اور انسان چولا بدل کر دفعتہً فرشتہ کیسے ہو جائیگا یہ آسانی سے باور نہیں آتا۔ لیکن بولشوی عقیدے اور ایمان کے حامی و مدعی کہتے ہیں اور باصرار کہتے ہیں کہ ہم نے رُوس میں یہ معجزہ کرکے دکھا دیا ہے۔ یہ دعویٰ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس کے متعلق بھی دو ایک باتیں غور طلب ہیں۔ جہاں تک بولشوی اُمت کا تعلق ہے یہ دعویٰ غلط نہیں۔ اُس کا حوصلہ و ایثار۔ اُس کا فقر و قناعت۔ اُنکی انسانی ہمدردی اور جوشِ اخلاق انسانیت کے ایسے جوہر ہیں کہ جن کی داد نہ دینا بدتر از کفر ہوگا۔ لیکن بولشوی اُمت روس کی کروروں کی آبادی میں دو چار لاکھ سے زیادہ نہیں اور بقیہ کثیر آبادی کے متعلق یہ دعویٰ صحیح نہیں۔ پھر یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر عقیدے اور مذہب کے پیروکاروں میں جو ہمت و جوش شروع شروع میں ظاہر ہوتا ہے وہ کچھ عرصہ بعد قایم نہیں رہتا۔ یہ تاریخی واقعہ ہے۔ کون جانتا ہے کہ جو جوش اور دھن بولشوی اُمت اور اُس کے پیشواؤں میں آج نظر آتی ہے وہ نسل در نسل بعد بھی باقی رہے گی اور یہ نیا تجربہ جو کیا جا رہا ہے بالآخر کامیاب ثابت ہوگا۔

تہذیب و تمدن کے دورِ حاضرہ نے دُنیا کی مخلوق کو جس دولت و نعمت سے مالا مال کیا ہے وہ انسان کی شخصی آزادی ہے۔ ہر وہ حکومت اور سوسائٹی جس کو مہذب ہونے کا دعویٰ ہے اس اصول کو تسلیم کرتی اور اس حق کا تحفظ کرتی ہے اور ضرورتاً جب رعیت کی شخصی آزادی سلب کی جاتی ہے خواہ جا یا بیجا

تو حکومت کو عذر خواہ ہونا پڑتا ہے۔ آزادی کے اصول سے کبھی انحراف نہیں کیا جاتا بخلاف اس کے بولشوی حکومت کا عقیدہ، اصول ہی اس سے مختلف ہے اُس کے اصول کے لحاظ سے حکومت اور سوسائٹی محض رعیت کے امن و تحفظ کے لئے نہیں بلکہ گویا رعیت اور مخلوق ہی انشیٹ اور حکومت کے بقا اور استحکام کے لئے پیدا کی گئی ہے لہٰذا شخصی آزادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بالشوی عقیدے کا یہ نظریہ حق سیاسی یا اقتصادی شعبوں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں حتیٰ کہ فنون لطیفہ مثل نقاشی۔ موسیقی۔ سنگتراشی۔ تھیئٹر۔ سنیما وغیرہ تک میں اسکو کام میں لیا جاتا ہے، اور ایک ہی طرز و قماش کو رواج دیا جاتا ہے اور وہ طرز و قماش بھی ادنیٰ قسم کا۔ اس سے اختلاف کرنا داخل کفر ہے یوں سمجھئے کہ ایک قسم کی وردی بنوادی گئی ہے جس پر سرکاری مہر لگی ہے۔ ہر جوان۔ بوڑھے اور بچے پر اُس کا پہننا لازم ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ چھوٹی ہوتی ہے یا بڑی، تنگ ہوتی ہے یا ڈھیلی۔ یا تو اُسے پہنو یا ننگے ناچو۔ یہ ممکن نہیں کہ تم دوسری پوشاک بنوا کر زیب تن کر سکو جس تہذیب و حکومت میں شخصی آزادی کو حکومت یا سوسائٹی کے استحکام و بقا کے لئے اس طرح سلب کیا جاتا ہے اُس میں ارتقاءِ تمدن کا نشو و نما پانا معلوم؛ یہ بات دوسری ہے کہ نشو و نما پانے کے معنی ہی بدل دیے جائیں۔ راقم الحروف کو اس بالشوی عقیدے سے قطعی اختلاف ہے۔ یہ لازم نہیں کہ ناظرین اس رائے سے جس کا اظہار یہاں کیا گیا ہے اتفاق کریں۔ ہر شخص کو اپنی رائے قایم کرنے کا اختیار ہے لیکن بولشوی انقلاب کے مسئلہ کے سمجھنے اور اُس پر سنجیدگی سے صائب رائے قایم کرنے کا خیال ہے تو بہنا گریز ہے کہ مسئلہ کے ان پہلوؤں پر بھی جن کا تذکرہ اس مضمون میں کیا گیا ہے غور و فکر کے ساتھ نظر ڈالی جائے۔ اگر ناظرین میں سے چند نے بھی اس عرضداشت پر توجہ کی تو راقم الحروف اپنی محنت کو رائیگاں نہ سمجھے گا۔

احساس

پپیہا جب تڑپتا ہے گھٹا میں "پی کہاں" کہہ کر
ہماری رُوح سوزِ عشق سے اس طرح جلتی ہے
تلاشِ تربتِ عاشق میں کوئی نازنیں جیسے
بَلا کی دھوپ میں پتھر پہ ننگے پاؤں چلتی ہے

اندھیرا کرنے والے دن کو ساون کے سیہ بادل
سمندر کی طرح لبریز ہیں جس طرح پانی سے
یوں ہی دوشیزگی کے جوش سے اے فتنۂ محشر
تری آنکھیں چھلکتی ہیں شرابِ ارغوانی سے

(انتخاب از روحِ ادب مصنفہ جوش ملیح آبادی)

ہندوستان میں جذبۂ قربانی کی موت

(از سید مُطلبی فرید آبادی)

یہ مضمون ۱۹۳۳ء میں لکھا گیا تھا۔ اس لئے ممکن ہے کہ بادی النظر میں یہ قصۂ گذشتہ معلوم ہو۔ لیکن ہندوستان کے حالات میں تین سال کے اندر جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق ہے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے اب بھی اسے قصۂ ایامِ گذشتہ نہیں کہہ سکتے۔ ممکن ہے کہ یہ مضمون ناظرینِ کلیم کے دل میں وہ بیکلی پیدا کر سکے جو ہندوستان کی فلاح کے لئے ضروری ہے۔

ہر میرا سادہ آدمی جو ۱۹۲۴ء کے بعد برطانوی ہند سے چلا گیا ہو، آج اس ملک میں واپس آئے۔ اور موجودہ سیاسی جماعتوں کی حقیقت سے آشنا ہو تو اس کے دل کو ایسا ہی صدمہ پہنچے گا جیسا میرے دل کو پہنچا ہے۔ جب وہ دیکھے گا کہ آج جو سیاسی قربانیاں کی جاتی ہیں، لوگ جیل خانوں میں جاتے ہیں، جن کی شجاعت اور وطن پرستی کا اخبار میں بڑا بھاری اشتہار دیا جاتا ہے، وہ سب محض غلامانہ خود غرضیوں کا نام ہے، اور صرف ایک مقررہ تنخواہ یا اسی قسم کا دوسرا معاوضہ، ہندوستانی نوجوانوں کو اُس "فقید المثال" قربانی کے واسطے اُبھارتا ہے جسے قید کہتے ہیں۔ جن کے لئے قومی اخبارات مطالبے کرتے ہیں کہ عمدہ غذا سے ان سورماؤں کی آؤ بھگت کی جائے، تو یقیناً اُس کا سر اگر وہ غیرت مند ہے تو شرم سے جُھک جانا چاہیئے۔

راقم الحروف ۵-۶ سال سے برطانی ہند سے باہر تھا، سوائے اخبارات میں قومی سرگرمیوں کا حال پڑھ لینے کے جو درحقیقت صرف اشتہار بازی تھی، سیاسی جماعتوں کے اندرونی حالات سے بالکل بے خبر رہا۔ لیکن اب جبکہ وطن میں واپس آکر قومی تحریکات اور مجالس کا بنظرِ غور مطالعہ کرنے کا موقع ملا، تو اس ناگوار حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اِن اشتہار زدہ تحریکات نے جن کے نام سوراج۔ آزادی۔ حصول ڈومینین اسٹیٹس، عدم تعاون، سول نافرمانی وغیرہ ہیں، ہندوستانیوں کو سچی قربانی سے بہت دُور پھینک دیا ہے۔ اور اُن کی قربانیاں تمام و کمال دادو ستد پر موقوف ہو گئی ہیں۔

گو تمام دنیا نہایت تیزی سے ایک دورِ انقلاب سے گزر رہی ہے لیکن یہ بات دل کسی طرح ماننے کو تیار نہیں کہ قربانی جو محض ایک بے لوث، مخلصانہ جذبے کا نام ہے۔ اس وقت بھی قربانی کہی جائے گی، جبکہ نام نہاد قربانی کرنے والے کو اس کی پوری پوری مزدوری ادا کر دی جائے یقیناً ہم اس دورِ انقلاب میں جذبۂ قربانی کے معنے اور کیفیت کے بدلنے سے قاصر ہیں وہ وہی رہے گا۔ جو ہمیشہ سے رہا ہے اُس کو امتدادِ زمانہ کسی طرح بھی تبدیل کرنے سے قاصر ہے۔

اگر کوئی بالغ النظر ہندوستانی سیاست اور سیاسی مجالس کا بغور مطالعہ کرے تو اس کو آج کل صرف دو قوتیں برسرِ پیکار نظر آئیں گی۔ ایک طرف تو یورپ کا سرمایہ دار تاجِ حکمرانی پہنے کشور کشایانہ جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ فرما نظر آئے گا۔ دوسری طرف ہندوستانی سرمایہ دار تمام ہتھیاروں سے مسلح نظر آئے گا۔

ہندوستانی سیٹھ جس حکومت برطانیہ سے سلطنت چھین کر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہ حکومت نہیں ہے جو سابق اسلامی فرماں رواؤں کی طرح ہندوستان پر صرف حکومت کرنا چاہتی ہو۔ بلکہ وہ اپنی تجارت کا فروغ اپنی حکومت کا سب سے ضروری جزو سمجھتی ہے۔ چنانچہ جس وقت ہندوستان کی تحریکِ مقاطعہ کے سبب سے لنکا شائر کے مال کی کھپت خطرے میں پڑتی ہے تو اُن کی چیخ و پکار سے ایوانِ حکومت لرز جاتا ہے

درحقیقت حکمرانی برائے تجارت' گو آج کی متمدن دنیا کا ایک عام اصول ہے۔ لیکن اس کے باعث محکوم ملک کبھی مفلوک الحالی سے نجات نہیں پا سکیں گے۔ اور اسی سبب سے وہ ہمیشہ اپنے اجنبی حکمرانوں سے منحرف اور اُن کے دشمن بنے رہیں گے۔

لیکن دوسرا گروہ یعنی ہندوستانی سرمایہ دار ابھی تک اُس درجہ بے نقاب نہیں ہے۔ یہ بگلا بھگت جماعت کچھ غیر سرمایہ دار لوگوں کو بہ طریقہ ہائے مختلف اپنے ساتھ ملائے ہوئے اور چہرہ پر وطن پرستی کی نقاب ڈالے، برابر انگریزی حکومت کی جڑیں کھودنے اور بنیاد راج استوار کرنے میں مصروف ہے۔ اس کا نام کانگریس ہے اس کی شاخیں لاانتہا ہیں، جمعیتہ العلمار ہند۔ آل انڈیا ہندو مہاسبھا، آریہ سماج، مسلم نیشنلسٹ، لبرل فیڈریشن، اچھوت ادھار منڈل، سکھ لیگ۔ اور ہندو اسی قسم کی دوسری جماعتیں۔ یہ سب اُسی ایک پیکر کی مختلف رخوں کی تصویریں ہیں۔ یہ سب یا ہندو جماعتیں ہیں، یا اُن کی ساختہ پرداختہ مجالس ہیں۔ ہندو سے مراد آج کل سیاسی طور پر صرف سرمایہ دار ہیں۔ جنھوں نے غیر سرمایہ دار ہندوؤں کو اس درجہ مرعوب کر لیا ہے کہ وہ بچارے ان کے اشاروں پر کٹ پتلیوں کی طرح بالکل اس طرح گردش کرتے ہیں، جس طرح مسلم نیشنلسٹ کانگریس کے اشارے پر، جو درحقیقت اس وقت سرمایہ دار ہندوؤں کی مرکزی قوت ہے۔

ان نام نہاد وطن پرست، یا ہندو مہاسبھا کی طرح فرقہ پرست جماعتوں کے علاوہ ملک میں "خالص اسلامی" جماعتیں بھی ہیں، مثلاً مسلم لیگ، جمعیتہ العلمار کانپور اور اسی قسم کی دوسری مجالس جن کے ارکان اس درجہ حکومت سے ارتباط رکھتے ہیں کہ اُنھیں "جی حضوری" کہنے میں لوگ حق بجانب ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اس وقت بدنصیب ہندوستان، دو سرمایہ داروں کی کشمکش کا جولانگاہ بنا ہوا ہے۔ اور ہندوستانی نوجوان جس سے دونوں ایجنسیوں کو کام لینا پڑتا ہے ان کا زرخرید غلام بنا ہوا ہے جس کے باعث قربانی کا جذبہ معدوم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ جذبۂ خودغرضی کارفرما ہے۔

جذبۂ قربانی نے جب کبھی اپنا مظاہرہ کیا ہے تو وہ ہمیشہ ذاتی اغراض کو پس پشت ڈال کر خلق خدا کے فائدے یا خدائی احکام کی تعمیل کے لئے کیا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر اُن جماعتوں کا جو سرمایہ پرستی سے دُور کا بھی واسطہ رکھتی ہوں اس سے تعلق ہونا ہی نہیں چاہیئے۔ تاہم اگر کبھی بھی ایسا دعویٰ کیا گیا تو اُس کی تہ میں ہمیشہ ذاتی یا جماعتی اغراض پوشیدہ نظر آئیں۔ اگر ہندوستان کے اس دورِ سیاسی میں، جس کے آغاز کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے، آپ صحیح قربانی دیکھنا چاہتے ہیں تو مسجد کانپور کے واقعہ کو دیکھئے۔ جہاں مسلمانوں نے قربانی کا سب سے پہلا مظاہرہ کیا۔ اور اس کے بعد جنگِ طرابلس و بلقان کے ایّام میں بھی وہ مسلسل قربانیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ اور پھر تحریکِ خلافت میں جو جو مصائب مسلمانانِ ہند نے برداشت کئے وہ صحیح قربانی کہلانے کے سزاوار ہیں۔

اسی طرح تحریک عدم تعاون میں مسلمانوں کا گاندھی جی کے ایک اشارے پر علی گڑھ یونیورسٹی کو ویران کرنا۔ لڑکوں کا مدرسے چھوڑ چھوڑ کر تعلیم سے ہاتھ اٹھانا ملازمتیں چھوڑنا اور جیل خانوں کو آباد کرنا یہ سب واقعات بھی قربانی کی داستانوں سے معمور ہیں۔

ہندوؤں نے بھی، جو تحریکِ عدم تعاون کے درحقیقت اصلی محرک تھے۔ اس وقت ہندوستان کی تاریخ میں نہایت شاندار قربانیوں کا مظاہرہ کیا۔ لیکن ہندو یونیورسٹی سے کاواکاٹ کر نکل گئے۔ ملازمتیں اگر چھوڑیں تو دکانیں سنبھال لیں۔ وکالتوں کو اگر ترک کیا تو اس کا بھی نعم البدل حاصل کر لیا۔ لیکن مسلمان ملازمین اور وکلا کی طرح نان و نمک کے مصائب برداشت کرنے کا انھوں نے اقدام نہیں کیا۔

پھر بھی ہندوؤں کی سی قوم کے لئے جو صدیوں سے نہیں ہزاروں سال سے رسم ورواج اور ذات پات کی غلامی کے نیچے دبی پڑی تھی یہ بھی بہت تھا جو اس نے کیا۔

ان قربانیوں اور فداکاریوں کے کیا کیا اسباب تھے؟ ہندوؤں اور مسلمانوں نے یہ قربانیاں کیوں کیں؟ اگر یہ بات کھول کر نہ بیان کی جائے تو مضمون تشنہ رہ جائے گا۔

ہندو یقین رکھتے تھے کہ بقول مہاتما گاندھی سوراج ایک سال میں حاصل ہو جائے گا۔ انگریزی حکومت کا تختہ الٹ جائے گا۔ اور مسلمان اپنی اقلیت کے باعث خواہ بہ طیب خاطر خواہ بہ جبر، اُن کی اکثریت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔ وہ تمام منافعہ جو بیرونی سرمایہ دار ہندوستان سے کما کر لے جاتے ہیں۔ ہندوستانی سرمایہ داروں کے پاس رہے گا۔ (جو بیشتر ہندو ہی ہیں) نظام حکومت خواہ جمہوری ہو خواہ دستوری، اسی حق رائے دہندگی کے اصول سے منتخب شدہ ممبروں کے ہاتھ میں ہوگا جو اس وقت رائج ہے۔ جس کا نتیجہ ہندوستانی یا ہندو سرمایہ دار کی حکومت کی صورت میں نکلے گا۔ اور تین اکتیس کروڑ مقروض بھوکے ہندوستانی ہر وقت ہندوستانی سوراجیہ کی شان قایم کرنے کے لئے اُن کے اشاروں پر قربان ہو جایا کریں گے۔

لیکن مسلمانوں کے سامنے صرف ایک مقصد تھا، اور وہ یہ کہ انگریزی حکومت سے جس نے ترکوں کو تباہ کیا۔ تمام اسلامی ممالک کی آزادیاں سلب کیں اور قسطنطنیہ پر

قبضہ جمائے بیٹھی ہے، انتقام لیا جائے۔ اُن کو سمجھایا گیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی تمام ممالک اسلامیہ کی آزادی کے مرادف ہے۔ کیونکہ ہندوستانی روپیہ اور ہندوستانی آدمی ہی اُن کی وہ اصل قوت ہے جو اُن کو ہر جگہ کامیاب بناتی ہے۔ مسلمانوں کی آرزو تھی کہ کسی طرح ترکی انگریزی گرفت سے نکل سکے۔ ہندوستان کی آزادی، ورنہ سوراج یہ سب ضمنی چیزیں تھیں۔ محض اس کے لئے کسی مسلمان نے قربانی نہیں کی۔ تحریک معاملہ میں بھی مسلمانوں کی شرکت محض رسمی اور ہندوؤں کے ساتھ وضع داری نباہنے کے لئے تھی ورنہ تجارتی دباؤ سے حریف کو پریشان کرنا یہ بات نہ کسی مسلمان کے دماغ میں کبھی پہلے آتی تھی اور نہ آج ہی یہ اُن کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ درحقیقت وہ اپنی فلاح اور بہبود سے زیادہ اسلام اور محافظان اسلام (ترکوں) کی بہبود اور فلاح کے خواہاں تھے۔ اس لئے اُن کی قربانیاں نہایت بلند معیار رکھتی ہیں۔ اور وہی "قربانی" کہلانے کی مستحق ہیں۔ ہندوؤں نے بھی جو مصائب اس وقت اٹھائے وہ سب سچی قربانیوں کے واقعات ہی ہیں، مگر اُن میں وہ بلندی نہیں ہے جس کا مظاہرہ مسلمانوں نے کیا۔

مذکورہ قربانیاں کرنے والے نہ تنخواہیں لے لے کر جیلوں میں جاتے تھے اور نہ فرضی طور پر بیمار پڑ پڑ کر اے۔ بی کلاس کے دعاوی کرتے تھے۔ اُس دور میں بہت بڑی تعداد اُن مجاہدین کی تھی جو خود تو جیلوں میں بند ہوتے تھے اور اُن کے بیوی بچے فاقے کرتے تھے۔ یا کسی قسم کی امداد اُن کو نہ ملا کرتی تھی۔ اور ایسے بھی تھے جو سارے ہندوستان کے دورے اپنی ہی گاڑھی کمائی سے کیا کرتے تھے۔

لیکن کیا آج بھی وہی حالت ہے؟ یا کیا آج ہندوستان کا کوئی بھی بڑے سے بڑا لیڈر وہی قربانی کر رہا ہے جو اُس زمانے میں بعض نے نہیں عام طور پر سب لوگوں نے کی تھی۔ افسوس ہے کہ ایسا بندۂ خدا اب نکلنا مشکل ہے۔ وہ لوگ یا تو مر گئے یا اشتہار زدہ تحریکات سے بددل ہو کر گوشہ گیر ہو گئے۔

جب ہم مسلمانوں کے طبی وفد کو دہلی سے ترکی کے لئے روانہ ہونے کا منظر یاد کرتے ہیں، اور جب ہم لاہور کی شاہی مسجد کا وہ تاریخی منظر یاد کرتے ہیں جس میں کھڑے ہو کر اقبال نے درگاہ الٰہی میں طرابلس شہداء کے خون کی نذر گزرانی تھی تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ لیکن جب اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے زعمائے والاشان سرمایہ داروں کے دسترخوان کے چند ٹکڑوں کی خاطر "سچا" اور "درست" کہہ کر اپنی زندگی گزار رہے ہیں تو وہی سر خاک مذلت پر گر پڑتا ہے اور ہمت نہیں ہوتی کہ اُسے قیامت تک بلند کیا جائے۔

آخر اس ترقیٔ معکوس کے کیا وجوہ ہیں؟ کہ آج کوئی ہندو یا مسلمان خدمت وطن یا خدمت قوم و ملت کے لئے بغیر معاوضہ آمادہ نہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ کہ ایک مسلمان مسلمانوں کے اعلیٰ ترین مقصد کے خلاف جد و جہد کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور وہ کوئی معمولی مسلمان نہیں ہوتا بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک مسلّم لیڈر ہوتا ہے جس کی گذشتہ قربانیوں کی طویل داستان پیش کی جا سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں تبدیلی کی صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی مہاجن بھائیوں کی ایک دوکان یعنی تجارتی کوٹھی بن کر رہ گئی ہے۔ جہاں سے ہر نور اللہ، اور جگدیش چندر کو ملازم رکھا جا سکتا ہے۔ اور وہ پیٹ اور پوزیشن کی خاطر اپنا ایمان اپنی عزت سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ انگریزی سرمایہ دار کی دوکان کی تباہی کے لئے جس سے ہندوستانی سرمایہ دار کی دوکان فروغ پکڑ سکتی ہے یہ جماعت معقول سرمایہ لگاتی رہی ہے۔ جو کانگریس کی سب کمیٹیوں یعنی مختلف نام نہاد مجالس کے توسط سے لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ وہ انگریزی مال پر پکٹنگ کریں، اور سول نافرمانی کر کے جیل میں جائیں۔ اخباروں کو روپیہ دیا جاتا ہے کہ وہ سوئی کا بھاؤڑہ بنائیں، اور مقابل کی دکان کی ساکھ بگاڑیں۔ نیز ہندوستانی دوکان کے لئے اعتماد پیدا کریں۔ غرض ایک تجارتی مقابلہ ہے جس میں ہندوستانی نوجوان قیمت دے کر خریدا جاتا ہے۔ اور اس سوداگرانہ جنگ آزادی کا ہی یہ انجام ہے کہ کوئی نوجوان آزادیٔ وطن یا فلاحِ ملت کے لئے، بغیر معاوضہ کوئی خدمت انجام دینے کے لئے تیار نہیں، اور اگر کوئی بدنصیب کارکن ایسا پیدا بھی ہو جائے تو شک آمیز نظریں، اور طعن انگیز فقرے اُس کو قربانی سے علیحدہ رکھتے ہیں، اور وہ گوشہ گیر ہو جاتا ہے۔ اُس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور ایسے کارکن منظر عام پر رہ جاتے ہیں۔ جو محض اپنی غرض کے لئے ہر خدمت کی انجام دہی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کبھی وہ ہندوستانی دوکان کے ایجنٹ ہوتے ہیں اور کبھی انگریزی دوکان کے۔

ہندوؤں کی تمام نام نہاد قومی مجالس سرمایہ داروں کے ہاتھوں سے چلتی ہیں۔ اس لئے اُن کے آمد و خرچ کا پتہ لگنا یا مشتہر ہونا ناممکن ہے، کیونکہ اگر صحیح حالات کا پتہ عوام کو ہو جائے تو خواہ وہ کیسے ہی زہر آلود ہو چکے ہوں۔ لیکن مجلس (دوکان) کی ہوا اکھڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایسا ہو بھی چکا ہے۔ لیکن اسلامی مجالس یعنی اُن دوکانوں کے واقعات (جو ہندوستانی یا انگریزی سرمائے سے چلتی ہیں) اکثر دنیا کے سامنے آتے رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عامۃ المسلمین کا ہر رکن کو بلا امتیاز و تحقیق، ہر وقت بے ایمان، لٹیرا، ہندو سرمایہ دار کا غلام یا

انگریزی حکومت کا دلّال سمجھے بیٹھے ہیں۔ اکثر اسلامی سیاسی مجالس جو قوم پرستی یا وطن پرستی کا دعویٰ کرتی ہیں ایسی ہیں، جو کثیر اخراجات اپنے ذمّہ رکھتی ہیں۔ اُن کے دفاتر بھی ہیں۔ دفاتر کا خرچ بھی ہے۔ اُن کے کارکن ریلوں اور موٹروں میں دورے بھی کرتے ہیں۔ بعض ہیں کہ جو رضا کاروں کو معاوضے دے دے کر جیل بھی بھجواتی ہیں۔ ایک کے سوا سب ایسی ہیں جن کو کئی سال سے کوئی امداد مسلم طبقے سے نہیں ملی ہے یا خود انھوں نے کوئی چندہ بھی نہیں کیا ہے۔ پھر آخر یہ چلتی کس طرح ہیں؟ اس کا جواب اُن کی طرف سے ملنا مشکل ہے۔ اسی لئے وہ عوام کا اعتماد کھو چکی ہیں اور دنیا نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ ہندوستانی سرمایہ داروں کی جماعت مرکزیہ کی چھوٹی بڑی شاخیں ہیں اور کچھ نہیں۔

اب رہیں وہ مجالسِ اسلامی جن کا کام صرف قرار دادیں پاس کرنا ہے اور بس۔ وہ عموماً وزرائے حکومت کی ساختہ پرداختہ ہیں۔ یا اُن کے اثرات کے قایم کرنے کے لئے قایم ہیں۔ نہ اُن کو قوم کی نمائندگی حاصل ہے اور نہ اُنھیں کوئی مسلمان مخلص ہی سمجھتا ہے۔ حکومت کی نظروں میں رسوخ حاصل کرنا اُن کے ارکان کی سب سے بلند آرزو ہے۔ جس کے لئے وہ برابر ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ اور وہ شرمناک حرکات کی جاتی ہیں جو ہر قوم کے لئے باعثِ عبرت ہیں۔ چنانچہ گزشتہ سال جو مسلم لیگ کے ممبروں نے تماشے دکھائے ہیں وہ کچھ کم قابلِ افسوس نہیں ہیں۔

کانگریس کمیٹی کی مرکزی جماعت یا صوبہ واری مجالس میں گو چند غیر سرمایہ دار شخصیتیں آپ کو نظر آ سکتی ہیں، جو سرمایہ داروں کی ہاں میں ہاں ملانے اور کانگریس کو ملک کی نمائندہ جماعت قرار دینے کے لئے ہیں۔ لیکن اگر آپ تفصیل میں جائیں اور اضلاع کی کمیٹیوں اور اُن کے کارندوں کو دیکھیں تو آپ کو ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا جس کے متعلق دعویٰ کیا جا سکے کہ وہ غیر سرمایہ دار ہے یا وہ سرمایہ داروں کے زیرِ اثر نہیں ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ ہر تحصیل اور ضلع کی مجلسِ تجارت، اور کانگریس کے ارکان اکثر مشترک ہوتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے متعلق محض اس واسطے تصفیہ نہیں ہوتا کہ یہ بات سرمایہ داروں کے اغراض کے منافی ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ فرقہ وارانہ دو رنگی کے ہوتے ہوئے جو ہندو، ہندو سرمایہ داروں سے اور مسلمان مسلمان سرمایہ داروں سے لپٹے رہتے ہیں۔ علیحدہ ہو کر سرمایہ داری کی کسی مخالف تحریک میں نہ شامل ہو جائیں، جن سے سرمایہ داروں کی قوت ختم ہو سکتی ہے چنانچہ تحریک شدھی کی علم برداری اور مخالفت کے لئے یہی جماعت برسرِ کار نظر آتی ہے۔

اور یہ سب کانگریسی ہی ہوتے ہیں، ان تحریکات میں بھی روپیہ اپنی خدائی دکھاتا ہے۔ اور جس وقت وہ ختم ہو جاتا ہے تو سارے جہاشے اور مولانا اپنے گھروں کا راستہ لیتے ہیں۔ کسی کے ہاں تعمیرِ جدید کا پھیلا ڈ پھیل جاتا ہے اس لئے وہ معذوری ظاہر کرتے ہیں۔ کسی کی اماں جان بے وقت داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیتی ہیں۔ اور وہ بسورتے ہوئے اُس عظیم الشان مقصد کو خیرباد کہتے ہیں۔ غرض بالکل وہی حال ہوتا ہے جو کانگریس کا حال ہی میں ہوا کہ جب ہندوستانی مالکانِ کارخانہ ہائے پارچہ بافی نے انگریزی سوداگروں سے سمجھوتہ کر لیا۔ اور وہ گراں قدر رقومات جو وہ کانگریس کو ملکی کپڑے کی ترویج کی خاطر دیتے تھے بند ہو گئیں۔ تو سارا کانگریسی نظام بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔

غرض ہندوستانی نوجوان کو خود غرض اور طامع بنانے میں کانگریس کمیٹی نے گزشتہ چند برسوں میں وہ عظیم الشان کام انجام دیا ہے جس کو ہندوستان کی غیر ملکی حکومت شاید دو سو سال میں بھی انجام نہ دے سکتی۔ گو یہ کہنا بھی بہت حد تک صحیح ہے کہ وہ تمدن اور تہذیب جس کی لہریں اُمنڈ اُمنڈ کر یورپ کے سمندروں سے آتی ہیں۔ ہندوستان میں خود غرضانہ جذبات کے رواج دینے میں اور قربانی اور فداکاری کا خاتمہ کرنے میں مدت سے لگی ہوئی تھی، اور اس نے اپنا بہت بڑا اثر پیدا کیا ہے۔ لیکن جس سرعت کے ساتھ اور جس وسیع پیمانے پر کانگریس کے طریق کار نے ہندوستانی نوجوان کی فدائیت کو فنا کیا ہے اس کا مقابلہ یورپ کے اثرات سے کرنا مضحکہ خیز ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اِس زہرباد کا جو ہندوستان کی رگوں میں سرایت کر گیا ہے کس طرح ازالہ کیا جا سکتا ہے، اور اُس غلامانہ خود غرضی کو کس طرح دفع کیا جا سکتا ہے۔ جو ہندوستان میں کانگریس کمیٹی کی شاخوں نیز اُس کی مخالف جماعتوں کے تصادم کی یادگار ہے۔ کیونکہ وہ تصادم اب ختم ہوتے نظر آ رہے ہیں، اور کانگریسی جماعت عنقریب حیرت انگیز کروٹ لینے کی طیاری کر رہی ہے جس کے بعد اس کا کسی سے تصادم ممکن ہے کہ ممکن ہی نہ رہے۔ تاہم وہ اثرات جو مرتب ہو چکے ہیں موجود ہیں، اور ہندوستان کی ساری روزمرّہ کی زندگی میں تباہ کاری پھیلا رہے ہیں۔؟؟

شاعری میں درسِ عمل کی تلاش

یہ نظم میرے نہایت عزیز اور محبوب دوست حضرت آغر لکھنوی کی فکرِ گہربار کا نتیجہ ہے جہاں تک زبان، بندش اور شاعرانہ خوبیوں کا تعلق ہے اس کی داد نہ دینا سراسر ظلم اور بے انصافی ہے، لیکن یہ نظم جس رُوح کی حامل ہے اُس سے مجھے قطعی اختلاف ہے، جسے کسی قدر مجمل طور سے اس نظم کے آخر میں ظاہر کر دیا گیا ہے:

رُوحِ الہام مدد، ذہنِ پُر اسرار مدد
کلکِ خوش کار مدد، فکرِ گہربار مدد
جوہرِ نطق مدد، طبعِ فسوں کار مدد
مرحلہ سخت ہے اے دیدۂ بیدار مدد

نقش جو ہے مرے دل پر وہی تحریر کروں
صدق سے کذب کو بھولے سے نہ تعبیر کروں

شاعری کیا ہے؟ وہ فطرت کی زبانِ شیریں
سیکھنے اور سکھانے سے جو آتی ہی نہیں
اُس طرف سے جو نہ ہو بارشِ دُرہائے ثمیں
نوکِ خامہ سے نہ ٹپکے کبھی شعرِ رنگیں

مشغلے اور ہیں، کر قصد نہ اِس وادی کا
شاعری نام نہیں وقت کی بربادی کا

میں نے مانا کہ تجھے نظم کی قدرت بھی ہے
یہ تو کہہ طبع میں رفعت بھی ہے، جدّت بھی ہے؟
تربیت یافتۂ دامنِ فطرت بھی ہے؟
دل ترا خلوتیِ رازِ حقیقت بھی ہے؟

یہ نہیں ہے تو پھر اشعار میں تاثیر کہاں!
آتشِ تیز کہاں، شعلۂ تصویر کہاں!

شاعری اصل میں کیفیتِ وجدانی ہے
تو سمجھتا ہے فقط لذتِ نفسانی ہے!

یا گدایانہ امیروں کی ثناخوانی ہے — یاد رکھ، یاد رکھ، انجام پشیمانی ہے
فکرِ شہرت ہے اگر، اور ندامت ہوگی
اپنی اوقات سے اک دن تجھے نفرت ہوگی
درحقیقت ہے اگر شعر کا جوہر تجھ میں — شکر کر، جلوۂ صد رنگ ہے مضمر تجھ میں
محو ہے نورِ سحر، تابشِ اختر تجھ میں — بستے ہیں حُسن کے انفاس معطر تجھ میں
معجزہ ہوگا ترا شعر مسیحائی کا
رُوح کو دے گا جو پیغام توانائی کا



شاعری ہدیۂ فطرت ہے، مگر فن بھی ہے — کچھ اصول ایسے ہیں جن پر اسے قدغن بھی ہے
باغبانی کے لئے حاجتِ گلشن بھی ہے — طائرِ قدس کو درکار نشیمن بھی ہے
ابتدا ہوتی ہے اس جا سے زباں دانی کی
لفظ و تخئیل نے مل کر ہی جہاں بانی کی
برمحل صرف ہو الفاظ کا، تخئیل بلند — استعارے جو دل آویز ہوں، تمثیل بلند
لفظ و معنی کے توازن سے ہو تکمیل بلند — خسروِ شعر کے ہو فرق پہ اکلیل بلند
کچھ تصنّع کو ہو دخل اور نہ آورد کو دخل،
مئے سرجوش میں جس طرح نہیں دُرد کو دخل
کوئی خامی نہ ہو انداز کی شیوائی میں — نقص رہ جائے نہ مضمون کی رعنائی میں
خونِ تخئیل نہ ہو قافیہ پیمائی میں — رنگ بھرتا ہے کوئی لالۂ صحرائی میں

سادگی وہ ہو، پھبی جائے نزاکت جس پر
تازگی وہ ہو کہ گُل کھائے لطافت جس پر

جن کی خواہش ہے کہ ہر شعر ہو پیغامِ عمل　　اُن کی مشکل ہے عجب عقدۂ مالاینحل
دولتِ ہمت کا ہو الفاظ سے کیا خاکِ بدل　　گرم اشعار سے کُھلتا ہے کہیں پنجۂ شل

کام کرنا ہے جنھیں کام کیا کرتے ہیں؟
مکتبِ شعر میں یا درس لیا کرتے ہیں؟

پیش کرتے ہیں مثالیں عرب و یوناں کی　　جیسے اُن میں بھی نہ تھا جذبۂ قومی باقی:
جیسے اُن میں بھی تھی مضبوط اِرادوں کی کمی　　جیسے اُن کی بھی طبیعت میں تھی راحت طلبی:

کلفتِ دل کا سبب قید تھی دیواروں کی
ماں کی لوری اُنھیں جھنکار تھی تلواروں کی

جو ہوں سادت وہ اور رُوں کے اُبھارے سے لڑیں:　　نغمۂ چنگ و دَف و نے کے سہارے سے لڑیں!
جو صفیں اُلٹیں، وہ عورت کے پکارے سے لڑیں:　　دھنی تلوار کے ابرو کے اشارے سے لڑیں!

بندہ پرور یہ حقیقت ہے تو بُزدل تھے عرب
ورنہ کیوں عورتوں سے جوش کے سائل تھے عرب

وہ جَری تھے، زن و فرزند بھی تھے اُن کے جَری　　کوئی غیرت اُنھیں دلوائے، ضرورت ہی نہ تھی
ایک دل، ایک زباں، ایک ہی منزل سب کی　　سَیل کی طرح بڑھے، سیدھ جدھر کی باندھی

مشغلہ یہ بھی دمِ جنگ رہا کرتا تھا،
کوئی گاتا تھا، رجز کوئی پڑھا کرتا تھا،

سنئے یونان کی اب ایک لڑائی کا حال اہلِ فارس سے ہوا گرم جو میدانِ جدال
فتح فارس کی ہوئی، اُن کو ہوا سخت ملال کیوں کہ جرأت میں تھا اسپارٹا آپ اپنی مثال

لکھا ایتھنس کو سامان نہ لشکر بھیجو،
ہم کو لڑوائے جو ترتیب سے افسر، بھیجو،

ٹرٹئس شہرۂ آفاق جو شاعر تھا، گیا وہ اپاہج تھا، لڑائی سے اُسے مس ہی نہ تھا
ہوکے آزردہ و مایوس، یہ آپس میں کہا ہم نے مُنہ پھوڑ کے کیا مانگا تھا اور کیا پایا

طیش کھاتے رہے، بکتے رہے، خاموش ہوئے
جنگ ورزش تھی، یہ صدمے فراموش ہوئے

آخرِ کار لڑائی کا جو ہنگام آیا؛ نظم پڑھ کر اُنھیں شاعر نے اُبھارا ایسا
صاعقہ بن کے ہر اک فوجِ مخالف پہ گرا، فتح جب تک نہ ہوئی مُڑ کے نہ پیچھے دیکھا

ہاتھ میدان رہا، خرم و دلشاد پھرے
جن کو اندیشہ غلامی کا تھا، آزاد پھرے

ملک کے واسطے مرنے سے نہ ڈرتا تھا کوئی تیغ کے گھاٹ اُترنے پہ تلے آمادہ سبھی
شاعری کی جو کرامات تھی بس اتنی تھی اُن میں تنظیم کی خامی تھی، وہ پوری کردی

اپنے کس بل پہ جو اُن کو نہ بھروسا ہوتا
فوج کی فوج، کہ اک شخص نہ لایا ہوتا؟

حالی و اکبر و اقبال نے کیا کیا نہ کہا، نوحے کا، طعنے کا، شکوے کا اثر کچھ بھی ہوا؟
جوش نے نعرۂ مستانہ سنایا تو کیا؟ بے حسی ہے وہی، انداز وہی غفلت کا

آپ تو شعر سے کھوئی ہوئی عظمت مانگیں
دو گھڑی کو بھی نہ ہم غم سے فراغت مانگیں

آثر لکھنوی

اثر صاحب فرماتے ہیں شعر قوموں کو اُبھارنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لیکن پھر خود ہی عرب اور یونان کے اُن واقعات کا ذکر فرماتے ہیں، جن سے تاریخی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ شاعری قوموں کو کیوں کر زندگی کا پیام بخشا کرتی ہے۔

اثر صاحب اس کی توجیہ یوں فرماتے ہیں کہ عرب اور یونان جو افسردہ تھے اسی لئے شعر نے انھیں اُبھار دیا۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ یہاں تک تو اثر صاحب درپردہ یا غیر ارادی طور پر میرے ساتھ ہیں کہ اگر کوئی قوم مردہ اور غنودہ رہے تو شعر اُسے اُبھار سکتا ہے۔ لیکن اُن کی نظم کا عام لہجہ اس کی بھی نفی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے، اور یہ نظم اجتماعِ ضدّین کا ایک نمونہ بن کر رہ گئی ہے۔

میرے نزدیک شاعری سے زیادہ قوموں میں زندگی پیدا کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے، اور ہندوستان اس نقطۂ نظر سے کہ جہاں وبا کا زور ہو وہیں سب سے زیادہ طبیب کی ضرورت ہے، اور جہاں ہر طرف خزاں نے ہی خزانے بوئے وہیں سب سے زیادہ نالۂ جرس کی احتیاج ہوتی ہے، اِس وقت اس کا سب سے زیادہ محتاج ہے کہ یہاں کے شعرا گل و بلبل چھوڑ کر قوم کے بیدار کرنے میں مصروف ہو جائیں۔

شعر سب سے زیادہ اثر انگیز چیز ہے، اور جب ایک لکھی ہوئی بات کا طل پر اثر ہوتا ہے تو شعر کا کیوں نہ ہوگا۔ شعر تو وہ چیز ہے کہ:

چاہے تو زہر سے اُڑنے لگیں شرار
گلبرگِ تر کے بطن سے پیدا ہو ذوالفقار
آہن کے جوہروں سے ٹپکنے لگے شراب
پیری کی ہڈیوں میں چٹکنے لگے شباب
خود موت سے حیات کے چشمے اُبل پڑیں
قبروں سے سر کو پیٹ کے مُردے نکل پڑیں

بلاِستان

یہ جا کر کوئی کہہ دے مغربی کشور کشاؤں سے | کہ ہے بے سُود اُلجھنا ربِ اکبر کی قضاؤں سے
بہا لے جا چکی ہے بارہا باطِل کو رَو جس کی | وہ دریا پھر برسنے کو ہے بطحا کی گھٹاؤں سے
نجاشی کے وطن پر سایۂ لطفِ پیمبرؐ ہے | نہ ٹکراؤ بلاِستان کی کالی بلاؤں سے
اثر پھر چھننے والا ہے محمدؐ کی دُعاؤں کا | "عدووا" کی طرح "ادیس ابابا" کی فضاؤں سے
ہلا دی تھیں جنھوں نے رُومتہ الکبریٰ کی بُنیادیں | مسولینی کی ٹکر ہے پھر اُن تیغ آزماؤں سے
زمیں کر دی گئی تھی تنگ جن کی ترکتازی پر | اماں اب مانگی جاتی ہے انھیں کوتہ قباؤں سے
عرب کا اور عجم کا رشتہ ربِ کعبہ نے جوڑا | بغل گیر آشنا پھر ہو رہے ہیں آشناؤں سے
گدا نے شاہ کو ہر مرتبہ نیچا دکھایا ہے | ہوئی ہے جب کبھی شاہوں کی آویزش گداؤں سے
سلیقہ سیکھنا ہو بم گرانے کا نہتوں پر | تو جا کر سیکھ لو یورپ کے جنگی دیوتاؤں سے

وہ نافرجام بیڑا ڈوبنے سے بچ نہیں سکتا
خدا کا ساتھ چھوٹا جس کے خود بیں ناخداؤں سے

"احسان"

(مولانا) ظفر علی خان

نغمۂ بیداری!

دیوانہ مصطفیٰ آبادی

اے مسافر! جاگ
اپنے خوابِ غفلت سے ہوشیار ہو جا
دیکھ، ریل گاڑی کے آنے کا وقت قریب آگیا
اور سُن، اسٹیشن کے قریب بجنے والی سیٹی کی آواز آرہی ہے
اس سرد و پتھریلی زمین سے اُٹھنے کا وقت ہو گیا۔
اس زمین کی ٹھنڈی چادر کے بدن کپکپا دینے والے سایے سے باہر نکل آ،
اے مسافر، جاگ
گاڑی اسٹیشن پر آگئی۔ کاہل نہ بن
اُٹھ، اور بھاگ، کہ گیا وقت ہاتھ نہیں آتا
جاگ، کہ یہ وقت ہے بیداری کا!!

اے پرستیدۂ مذہب بیدار
اپنے مذہب کو اپنے تک محدود رکھ
تو اپنی راہ چل، دوسرے کو اپنی راہ جانے دے۔
اُس کی طرف ہاتھ بڑھا، لیکن اُس کو اپنے راستہ پر کھینچنے کی سعی ہنگامہ خیز نہ کر،
اپنے جیسے انسانوں سے محبت کر
کہ مذہب آپس میں بَیر رکھنا نہیں سکھاتا۔ پھر خدا تجھ سے محبت کرے گا،
اے پرستیدۂ مذہب بیدار
اختلافات کے ختم کرنے کا وقت آگیا، متعصب نہ بن۔
ہند کا شکوہ و آرام، آزادی و بیداری تیرے بے معنی تعصب کا شکار
ہو رہی ہے۔
رواداری و اتحاد سے کام کر،
بیدار، کہ یہ زمانہ ہے رواداری کا،

اے مردِ جوان، ہوشیار
کام کرنے اور غلامی سے نجات پانے کا وقت آگیا
کامیابی کا پھریرا دُور فضا میں لہرا رہا ہے
سماج کے بندھنوں کو توڑ دے، دلِ محبت طلب کے کہے پر نہ جا۔
قوم تیری راہ تک رہی ہے
اپنے شبستانِ راحت سے ایک ہندی جوان کے عزمِ آہنی کا زرہ بکتر پہنے باہر نکل آ۔
اور آزادی کے اس سنہرے جھنڈے کو ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں پر نصب کر دے۔
اے ہندی جواں مرد، ہوشیار
کہ سونے کا وقت ختم ہو چکا، بزدل نہ بن
عمل کر، کہ زرّیں موقعے بار بار نہیں آیا کرتے
ہوشیار، کہ یہ عالم ہے بیداری کا۔

(طبعزاد)

انشائے لطیف پر ایک نظر

(از اثر لکھنوی)

حضرت لطیف الدین احمد یا آل احمد اکبر آبادی اُن گنتی کے لوگوں میں ہیں جنھوں نے مغربی ادبیات سے متاثر ہو کر نثرِ اُردو میں دلکشی و رعنائی قائم رکھتے ہوئے غلامانہ و کورانہ تقلید کے بجائے شانِ انفرادیت پیدا کی ہے، اور زبان کی حدوں میں رہنے کے باوصف ذخیرۂ خیالات میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ اُنھوں نے محض نئے نئے خیالات کے پودے اُردو کے باغ میں خوش سلیقگی سے نصب نہیں کئے بلکہ اُسے جھاڑ جھنکاڑ سے بھی پاک صاف کیا۔ مزید مسرت کا باعث یہ امر ہے کہ تراش خراش، نفاست اور البیلا پن صرف زبان اور اسالیبِ بیان پر ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ میدانِ تخیل میں بھی کارفرما ہے، اور یہاں بھی سلاستِ مذاق و جودتِ طبع نے وہی گل کھلائے ہیں۔

ہمارا ذوق ابھی اتنا وسیع نہیں ہوا ہے کہ عشق و محبت کے علاوہ انسانی جذبات و محسوسات کے دوسرے بے شمار مظاہروں اور رجحانات کا تجزیہ افسانے کی صورت میں پیش کریں یا انسان کے ماسوا دوسری ذی حیات مخلوق کی زندگی کا مطالعہ کر کے دلکش رومان میں منتقل کر دیں۔ بڑی ہمت کی تو انگریزی افسانوں پر چھاپہ مارا۔ اس کی ٹانگ توڑ دی اُس کی گردن مروڑ دی۔ چلئے ایک جاسوسی کا افسانہ ترتیب پا گیا اور شستہ سے "اوریجنل" کہہ کے شائع کر دیا گیا! پبلک میں اتنی بیداری پیدا نہیں ہوئی ہے کہ اُن افسانوں کی قدر کرے اور بنظرِ استحسان دیکھے جن میں کردار کی تخلیق یا نفسیاتی تحلیل و تعبیر ہے۔ اس شاہراہ میں بھی آلِ احمد صاحب نے قدم اُٹھایا ہے اور ایک حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ موصوف کے اُن افسانوں کا مجموعہ جو ۱۹۲۲ء و ۱۹۲۵ء کے مابین لکھے گئے "انشائے لطیف" کے نام شائع ہوا ہے۔ اُن کی تعداد ۱۵ ہے جس میں گیارہ طبعزاد اور چار ایسے ہیں جنھیں لطیف صاحب نے "مختارہ" کہا ہے۔ یعنی اُن کے پلاٹ کا کوئی جزو مستعار ہے۔

ناقد کی حیثیت سے کہنا پڑتا ہے کہ بیشتر افسانے ایسے ہیں جن میں آرٹ کی تکمیل میں کوئی نہ کوئی خامی رہ گئی ہے۔ غالباً اس کی یہ وجہ ہے کہ افسانے مصنف کی ابتدائی مشق کا نمونہ ہیں۔ جب خیال میں پختگی اور طرزِ تحریر میں اعتمادی و اجتہادی شان پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کا احساس مصنف کو بھی ہے اور "معروضہ" کے تحت میں فرماتے ہیں کہ

"ان بارہ تیرہ سال کی تحریروں میں میں نے لفظی تصحیح کے علاوہ کوئی خاص تبدیلی نہیں کی ہے کیونکہ میرے خیال میں ادبی دیانت کا مقتضا یہی ہے"

دل چاہتا ہے کہ اس مجموعے کے تمام افسانوں پر مسلسل نقد و تبصرہ کیا جائے مضمون کی ابتدا پہلے "مختارہ" افسانے یعنی "سمنستان کی شہزادی" سے کرتا ہوں۔

افسانے کی نوعیت ایسی ہے جس کو انگریزی میں فین ٹے سی (PHANTASY) کہتے ہیں اُس کے لئے کوئی اردو لفظ اس وقت ذہن میں نہیں آتا مگر مفہوم یہ ہے کہ ایسا افسانہ جس کا پلاٹ عجیب اور ایک گونہ مافوق الفطرت ہو۔ قصّے کا خاکہ بس اتنا ہے کہ ایک بادشاہ کے محل میں ایک حسین لڑکی تولد ہوتی ہے ایک بدنفس عورت جو دوسرے ملک کی شہزادی ہے پیشینگوئی کر کے خوشی پر پانی پھیر دیتی ہے کہ لڑکی ایک باغبان زادے کے گھر جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر دراصل باغبان زادے کے بھیس میں ایک جلیل القدر شہزادہ ہے۔ آپ نے ملاحظہ کیا پلاٹ کچھ بھی نہیں ہے اور گھڑے

جاہیئے تو صرف اس قدر رہ جاتا ہے کہ علی الصباح چنبیلی کا پھول کھلا! مگر عبارت کی دلکشی و نزاکت و نزہت نے افسانے کو لٹریچر کی "ملکۂ سمنبر" بنا دیا ہے۔ بخوفِ طوا صرف ایک دو اقتباس پیش کروں گا۔ کہتا یہ ہے کہ شہزادی صبح صادق کے وقت پیدا ہوئی

"اس ساعت میں جب گلاب کی پنکھڑیاں کھلنے لگتی ہیں، اُس
لمحے میں جب کلیاں ایک جرعۂ نسیم کے عوض اپنا جامۂ احرام
اُتار ڈالتی ہیں۔ اور ٹھیک اُس وقت جب ستارے اس
محشر رنگ و نور کا تماشا دیکھکر آخری کرنیں نچھاور کرتے
ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں شہزادی سمنبر نے اس
عالم میں قدم رکھا تھا"

اگر یہ عبارت محض ترجمہ ہے تو مترجم کامیاب ترجمے پر تحسین کے مستحق ہیں اور اگر خود اُنھیں کے صناع دماغ کی پیداوار ہے تو قلم و اُردو کی ہر فرد کو اس "ملکۂ ادب" کی تخلیق پر اُن کو مبارکباد دینا چاہیئے کیونکہ عبارت کی لطافت و رنگینی کے علاوہ حاصل اس قدر اُچھوتا ہے کہ زبان تعریف سے قاصر ہے۔ گلاب کی شگفتگی، کلیوں کی بانکی اور بے ساختہ جامہ زیبی، پھر مستانہ جامہ دری اور نجوم سحر کی نور بیزی کو صبح کے دھندلکے میں فطرت کے جادوگر نے امتزاج دے کر ایک شنگرف مرقع حسن و جمال و نزاکت ترتیب دیا جس کا نام "ملکۂ سمنبر" ہوا! آرٹ کا کمال یہ ہے کہ تصویر دھندلی ہے خطوط غیر متعین ہیں، تاہم نقش اس قدر شوخ رنگین اور پُر کیف ہے کہ آدمی بغیر جھومے نہیں رہ سکتا۔

واقعہ کے مناسب ماحول بھی قایم کر دیا گیا تو ایسی شہزادی کی پیدائش باعثِ حیرت نہیں رہتی۔

"یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تمام ولائت سمنستان میں
کوئی متنفس کام نہ کرتا تھا اور وہاں کے باشندے صفحۂ عالم
پر سب سے زیادہ خوش باش اور عشرت پرست تھے۔ سیر و
تماشا اُن کا مقصودِ زندگی اور کچھ نہ کرنا ہی اُن کا کام تھا
اُن کا بس یہی شغلہ تھا کہ باغوں میں جا کر (اور سمنستان کا
چپہ چپہ باغ تھا) رقص کرتے اور جب خستہ و مضمحل ہو جاتے
تو گلاب کے بچھے ہوئے پھولوں پر گر پڑتے، اپنی گودوں
کو اُن سے بھر لیتے اور پھر تازہ دم ہو کر صرف رقص ہونے لگتے"

"یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے" ایسا شوخ مگر معصوم جھوٹ ہے جسے انگریزی میں "نئیو ویٹ" (NAIVETE) کہتے ہیں۔ عبارت کا آخری جملہ "پھر تازہ دم ہو کر صرف رقص ہونے لگتے" ایک لحاظ سے محلِ نظر ہے اور ایک لحاظ سے اُس احتیاط و کاوش کا پتہ دیتا ہے جو لطیف صاحب نے انتخاب الفاظ میں کی ہے۔ بادی النظر میں اس کی جگہ "پھر تازہ دم ہو کر مصروفِ رقص ہوتے" بہتر معلوم ہوتا ہے مگر جب یہ مقصد ادا کرنا ہو کہ رقص میں جان کھپاتے، ہلکان ہوتے تو جس طرح تحریر ہے بالکل درست ہے۔ سیاقِ عبارت بھی موخر الذکر مفہوم کی تائید کرتا ہے۔

لطیف صاحب نے ایک جگہ "پاؤں، پاؤں، صندل کے پاؤں" لکھا ہے، خبر نہیں کہ اکبر آباد کا روزمرہ کیا ہے مگر لکھنؤ میں عورتیں اس موقع پر "مِیئوں، مِیئوں، صندل کی مِیئوں" بولتی ہیں[1]۔

پلاٹ صرف ایک جگہ کمزور نظر آیا اور غور کرنے پر بھی کوئی توجیہ سمجھ میں نہ آئی۔ یہ مقام وہ ہے جہاں دایہ نے بھوزے کے مارنے کو دربارِ شاہی کی تاریخ اٹھائی مگر بھوزے کی طرف پھینکنے کے بجائے پڑھنا شروع کر دیا۔ اول تو ایسی اہم کتاب کا الماری یا کتب خانے یا خزانے کے بجائے میز پر رکھا ہونا ہی خلاف قرینہ ہے، پھر اس کتاب کو اُٹھاتے ہوئے بھوزے پر کھینچ مارنا بھی عام طرزِ عمل کے خلاف ہے۔ علاوہ بریں ایسے ملک میں جہاں کے باشندے رقص مسلسل میں بسر کریں، تاریخ سے گھبرائیں کسی دایہ کا پڑھا لکھا ہونا کچھ لگتی ہوئی بات نہیں۔ اسی طرح جس وقت دایہ باغبان کے لڑکے کو شہزادی کی موجودگی میں نکال باہر کرتی ہے شہزادی کی خاموشی فطرت کے مطابق نہیں معلوم ہوتی شہزادی کم سن ہے اُسے ضد کرنا، رونا، مچلنا چاہیئے تھا کہ باغبان کا لڑکا نکالا نہ جائے۔ غرضکہ شہزادی کی موجودگی میں باغبان زادے کا اس طرح دُتکار دیا جانا اور شہزادی کا کچھ نہ بولنا افسانے کی دلکشی اور خوبیٔ تعمیر میں حارج ہے۔ انتظام کیا جاتا ہے کہ باغبان زادے کے بجائے کوئی شہزادہ کھیلنے کو روزمرہ آیا کرے شہزادی باغبان زادے کی جُدائی پر آنسو بہاتی ہے۔ مگر کچھ وقت گزر جانے کے بعد۔ کم سے کم جس طرح افسانے کی ترتیب ہے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔

ایک جگہ لطیف صاحب نے لکھا ہے کہ

"شہزادی کے گلاب آسا رخساروں پر آنسوؤں کے آبدار
موتی بکھرنے لگے"

[1] مگر دلی میں پاؤں پاؤں صندل کے پاؤں بولا جاتا ہے۔

گلاب آسا کے معنی ہوئے گلاب کے مثل جس میں رنگ کے علاوہ گلاب کی ساخت بھی شامل ہے۔ یہ منظور کہ چہرے کو گلاب سے تشبیہ دیتے ہیں مگر یہاں گلاب آسا کے بجائے "گلابی" مناسب لفظ تھا کیونکہ اس طرح ذہن صرف رخسار کے رنگ کی طرف متبادر ہوتا اور گلابی چہرے پر آنسوؤں کے آبدار موتیوں کا بکھرنا پوری قوت سے اپیل کرتا۔ موجودہ صورت میں خیال گلاب آسا کی ترکیب میں اُلجھ کر معنوی لطافت سے فی الفور لطف اندوز نہیں ہوتا اور موتیوں پر گلابی رنگ کی چھوٹ سے جو ذہنی دعوت نظر ہوتی اُس سے محروم کر دیتا ہے۔

ذیل کی عبارت میں لفظ "ہی" کی تکرار گراں ہے۔

"لوگ اس طرح آئے اور جمع ہوگئے گویا کہیں چھپے ہوئے
اس گھڑی کا انتظار ہی کر رہے تھے اور اس کے سوا انہیں
اور کام ہی نہ تھا"

پہلا "ہی" بیکار ہے۔

اسی طرح اس جملے میں۔

"چنانچہ اس نے اس کا تجربہ ٹھیک اُس وقت کیا جب کہ
ہمنستان کی طرف روانہ ہو رہا ہے"

"روانہ ہو رہا تھا" کی جگہ "روانہ ہونے والا" یا "روانہ ہونے کو تھا" چاہیئے روانہ کے ساتھ "ہو رہا تھا" کا استعمال نادرست ہے۔

یہ میرے ایک دوست کے فسانے پر میرے ہی ایک دوست کا تبصرہ ہے۔ افسانہ لطیف کا ہے، اور تبصرہ نگار ہیں اثر۔ اور یہ دونوں اُردو ادب میں ایک خاص نوک پلک کے لوگوں میں سے ہیں۔

جیسا لطیف صاحب کا افسانہ ہے، ویسا ہی حضرتِ اثر کا تبصرہ ہے، اگر افسانہ لاجواب ہے تو تبصرہ بھی بے نظیر ہے۔

لیکن بعض مقامات پر مجھے اپنے دوست حضرتِ اثر سے اختلاف ہے، جسے ظاہر کئے دیتا ہوں۔

اثر صاحب نے دربار شاہی کی کتاب کے متعلق یہ اعتراض فرمایا ہے کہ الماری، یا خزانۂ شاہی کے عوض، ایسی نادر کتاب میز پر کیوں پڑی تھی۔

میں عرض کروں گا کہ ہو سکتا ہے شاہی خاندان کے افراد میں سے کسی نے مطالعے کی غرض سے یہ کتاب طلب کی ہو۔ اور اُسی سلسلے میں وہ میز پر رکھی ہوئی ہو۔ اس میں عدم امکان کا کوئی پہلو نکلتا ہو تو معلوم نہیں ہوتا۔

دوسرا اعتراض ہے کہ دایہ نے اس کتاب کو اُڑتے ہوئے بھونرے کو مارنے کے لئے کیوں اُٹھایا۔ یہ بھی ایک معمولی اور روزمرہ پیش آنے والی بات ہے اور بالخصوص جب اس کا صدور کسی عورت سے ہو۔ کیونکہ جب آدمی گھبرا جاتا ہے تو اپنے دماغ کی خاطر جو شے ہاتھ آجاتی ہے اُسے استعمال کرنے پر قدرتی طور پر مجبور ہو جاتا ہے۔

تیسرا اعتراض ہے کہ اُس گروہ میں رہنے والی دایہ کو جو رقصِ پیہم میں مصروف رہتا ہے لکھنے پڑھنے کا شوق کیونکر پیدا ہوا۔ میں عرض کروں گا کہ کیا رقص و سرود، نوشت و خواند سے یکسر بیگانگی کا نام ہے؟

چوتھا اعتراض ہے کہ پاسبان زادے کے نکالے جانے کے وقت شاہزادی نے احتجاج کیوں نہ کیا، میرے نزدیک تو بعض ناخوشگوار واقعات کچھ اس طرح یکایک پیش آجاتے ہیں کہ آدمی فرطِ حیرت سے مُنھ دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اور یہی واقعہ شاہزادی کے ساتھ بھی پیش آیا اور اس شدت کے ساتھ وہ احتجاج کر ہی نہ سکی۔

پانچواں اعتراض ہے کہ گلابی کہنے کے عوض شاہزادی کے چہرے کو گلاب آسا کیوں لکھا، کیونکہ "گلاب آسا" کی ترکیب میں گلاب کے رنگ کے علاوہ اُسی کی ساخت بھی شامل ہے۔

میں حضرتِ جلیل مانک پوری کا ایک مطلع پیش کرتا ہوں۔

یہ عارضوں کا رنگ، یہ عالم نقاب کا　　　　دامن میں تم تو پھول لئے ہو گلاب کا

کیا اس مطلع میں رنگ کے علاوہ گلاب کی ساخت کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے؟ اگر نہیں تو "گلاب آسا" کی ترکیب سے ساخت کی طرف کیوں خیال جانے لگا۔ البتہ اس قدر ہے کہ اگر چہرے کو صرف گلابی کہا جاتا تو حضرتِ اثر کے بقول معنوی لطافت اور بڑھ جاتی۔

چھٹا اعتراض ہے "ہی" کے استعمال کے متعلق کہ یہاں اس کا صرف بیکار ہے میرے نزدیک "گویا" کے بعد اس موقعے پر اگر "ہی" نہ لکھا جاتا تو جملہ کچھ بے ربط سا ہو جاتا اور زور باقی نہ رہتا۔ آخری اعتراض ہے "روانہ" کے ساتھ "ہو رہا تھا" کے باب میں حضرتِ اثر فرماتے ہیں کہ "روانہ" کے ساتھ "ہو رہا تھا" کا استعمال نادرست ہے۔

میں کیا عرض کروں، میں تو ایسے مواقع پر یوں ہی بولتا ہوں، اور اب تک اسی طرح سُنا بھی ہے۔ کوئی شعر تو اس وقت ذہن میں نہیں ہے اور نہ اس وقت اتنی فرصت ہی ہے کہ تلاش کروں، بہرحال میں اثر صاحب کی خدمت میں عرض کروں گا کہ براہِ کرم اس کے عدم جواز کی کوئی دلیل پیش فرمائیں۔ پھر میں بھی کچھ عرض کروں گا۔

جوش



گلبانگِ نوشانوش

اُٹھا ساغر کہ بیداری وبالِ ہوش ہے ساقی
زمانہ تیغ در دست و کفن بر دوش ہے ساقی

مرے آزادہ مشرب وزہ خواروں کی تمنا میں
ہلالِ عید اک کھلتا ہوا آغوش ہے ساقی

زمانہ رقص میں ہے بج رہی ہے وقت کی چھاگل
چمن میں آج وہ گلبانگ نوشانوش ہے ساقی

پسینہ آگیا ہے خلد میں حوروں کے ماتھے پر
حسینوں کی جوانی آج یوں گل پوش ہے ساقی

اگر اک بوند ٹپکا دوں تو لَو دینے لگے دُنیا
مرے ساغر میں ایسا بادۂ سرجوش ہے ساقی

زمیں کے آبگینے کو کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے
ترے رندوں کو مستی میں بھی اتنا ہوش ہے ساقی

اُٹھا لے جامِ زر اس کو پلا جامِ سفالیں میں
کہ یہ کونین کا ٹھکرانے والا جوشؔ ہے ساقی

جوشؔ ملیح آبادی

خوابِ جوانی



گلنار کے روزنامچہ کے چند اوراق

(از ملک حسیب احمد، بی اے، آنرز)

(بجواب "خزینۂ محبت" مطبوعہ رسالہ کلیم، جنوری ۱۹۳۶ء)

۶ جنوری ۱۹۳۴ء ——————

معاذ اللہ! آج کا دن تو میرے لئے نزعِ مسلسل ہو کر رہ گیا۔ احمقوں کی انجمن یاد کرتی ہوں تو غصہ آتا ہے۔ کاش مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ بلا کی ٹی پارٹی میں "عشق" کے سوا دوسرا موضوع نہ ہوگا تو کبھی بھولے سے بھی وہاں جا کر نہ جھانکتی۔ ایک محمود پر مرتی ہے تو دوسری منظور پر جان دیتی ہے۔ کسی کو جہندر پسند آگیا تو کوئی نوازش کو دل دے چکی۔ میں بھی چپکی بیٹھی سنتی رہی اور اُن کی حماقت کی داد دیتی رہی۔ کہا ناچیا عشق، سرمایۂ دین و دنیا عشق، عشق، عشق، عشق، اُن کی ہستی عشق، اُن کی دنیا عشق، اُن کی کائنات عشق۔ بھولی، معصوم، احمق لڑکیاں! بھاگی جا رہی ہیں اس جہنم کی جانب۔ کچھ اس میں کود چکیں، کچھ کود دیں گی، شاید ہی کوئی سلامت رہے۔ جلیں گی سب!

نزہت نے تو کمال ہی کر دیا۔ بیگم رونے بیٹھ گئیں۔ اگر کوئی سنے تو ہنسے بے اختیار اُن کے احمق پن پر۔ بات یہ ہوئی کہ سب کے اصرار کرنے پر الماس گانے بیٹھیں تو وہی پرانی چیز "پیا بن نا ہیں آوت چین" گائی۔ معلوم نہیں نزہت کو ہوا کیا خوب روئی، اور بھی بھر کے روئی۔ ڈورا کہنے لگی کہ "پیا" کی یاد میں روتی ہے۔ بیوقوف کہیں کی! میں کہتی ہوں کہ ایسی عورتوں نے تو موئے شکسپیر سے کہلوایا تھا کہ "کمزوری تیرا نام عورت ہے" —————— مٹی جاتی ہیں، مرد کی غلامی کے لئے۔ مری جاتی ہیں، کوئی مرد انہیں شکار کرے۔ جب کوئی مرد انہیں معصوم، بھولی اور نازک کہہ دیتا ہے پھولی نہیں سماتیں، گویا کل کائنات اُن کے قدموں پر جھکی ہوئی انہیں خراجِ عقیدت ادا کر رہی ہے۔ نہیں سمجھتیں کہ مرد کے نزدیک تم سب میں وہی سب سے زیادہ معصوم ہے جس کو ہوس ران مرد بغیر کسی وقت کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں دھکیل سکتا ہے۔ وہی سب سے زیادہ بھولی ہے جو اُس کی پُرفریب باتوں کو صحیفۂ آسمانی سمجھ کر جلد تر اُن پر ایمان لے آئے۔ مرد کی لغت میں نازک کی تعریف یہ ہے کہ چینی اور بلور کی ایسی مورت جس سے مرد کی ہوس کچھ دیر کھیلے، اور بعد ازاں اس کا وحشی پن اُسے آنِ واحد میں توڑ ڈالے۔ درحقیقت مرد کے نزدیک "حسن" وہ تحریک ہے جس سے اس کے جذبات خوابیدہ اپنی پوری قوتوں سے بیدار ہو جائیں، اور خون اپنی پوری سرعت سے اس کی ناپاک شریانوں میں دوڑنے لگے۔ مرد کی محبت آندھی کے اس تیز و تند جھونکے کی مانند ہے جو صحنِ چمن میں صرف اسی غرض سے آتا ہے کہ نازک پنکھڑیوں کو فضا میں آوارہ کر دے۔ ہر مرد کا سانس تپتے ہوئے صحرا میں چلنے والی بیرحم بادِ سموم ہے جو نزاکت کی قاتل اور رنگ آفرینی کی دشمنِ جان ہے!

اگر قدرت عورت کی تخلیق نہ کرتی تو! —————— یہ دنیا کسی آہنگر کی دہکتی ہوئی بھٹی کی مانند ہوتی، جس کا ہر ذرۂ لرزاں کسی جائے سکون کی تلاش میں دیوانہ وار فضائے بسیط میں رقصاں نظر آتا ہے۔ اگر عورت نہ ہوتی تو ساون کی مد بھری راتوں میں کوکنے والی برہ کی ماری کوئل، پچھلے پہر سسکیاں لے کر ڈوبنے والے تارے، گاتے ہوئے چشمے، چٹکنے والی معصوم دوشیزہ کلیاں، عطر بیز ہوائیں، اُودی گھٹائیں، نغمہ کی لطافت، شفقِ زریں، خندۂ صبح یہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ شاعری، موسیقی، مصوری، دنیا کی ہر لطیف شے محتاجِ عنوان ہوتی۔ عورت سرنامۂ حیات ہے اور اس حسین دنیا کا پاکیزہ موضوع —————— اور اگر مرد ہی مرد ہوتا تو وہ روزِ اولین کی طرح آج بھی نکیلے پتھر لیے جنگلی جانوروں کے تعاقب میں

رُوح کی بلندیوں سے بے خبر بھاگا پھرتا۔ تہذیب و آسائش کے نام سے آشنا بھی نہ ہوتا رُوح میں پاکیزگی خیالات میں رفعت، عزم میں بلندی، زبان میں شیرینی سب مفقود ہوتے۔ قدرت نے عورت کی تخلیق کرکے مرد کو انسان بنا دیا اور پھر احسان فراموش کہتا ہے کہ عورت اُسے قعرِ ذلت کی جانب لئے جاتی ہے۔ کون اُن سے پوچھے کہ سیتا جی نے راون کو، پدمنی نے علاء الدین کو، انارکلی نے جہانگیر کو، کس دن دعوتِ گناہ دی؟————

———— ہمیں حوا کی بیٹیاں کہا جاتا ہے: اچھا اگر حوا نے آدم کو دانۂ گندم کھانے کو کہا تو آدم نے خود گرہ کی عقل سے کام کیوں نہ لیا؟ نہ کھاتے، اور انجام پر نظر رکھتے لیکن وہ تو بات یوں ہوئی کہ مرد کی آتشِ گرسنگی، بھڑک اُٹھی۔ حوا تیز فہم نہ تھیں، اُنھیں سمجھایا ہوتا مگر نہیں اُنھیں ٹھہرایا گیا گنہ گار۔ اچھا مان لو وہ گنہ گار سہی، مگر گنہ کا پرور دگار کون تھا؟ آدم۔ اور کون؟ اِس لئے کہ حوا تو اُنھیں کی پسلی سے پیدا کی گئی تھیں ———— مرد اپنے دعوے کی دلیل ہمیشہ تاریخ سے دیا کرتے ہیں۔ مگر "قلم درکفِ دشمن است" جو چاہیں لکھ ڈالیں۔ کہتے ہیں کہ پرائم اور پیرس کی تباہ حالی، جولیس سیزر کے خون اور انٹونی کے زوال کا باعث عورت تھی، حالانکہ واقعہ اسی قدر ہے کہ یہاں مرد کی شبِ وصل کسی قدر دراز ہوگئی اور وہ اپنے کمزور حسین کھلونے کو چکنا چور کرنے میں اس قدر منہمک ہوا کہ جاہ و حشم کے رقیب موقعہ پاکر چال چل گئے۔

انھیں مردوں کی لکھی ہوئی تاریخ شاہد ہے کہ روزِ ازل سے آج تک مرد کی سب سے بڑی خواہش یہ رہی کہ عورت کو تقاضائے فطرت کے خلاف عقلیت سے محروم کرکے ایک نادار لونڈی بنائے تاکہ جب وہ جاہ و جلال کا مظاہرہ کرے تو یہ بے زبان مخلوق اُسے مورچھل ہلائے۔ جب وہ مظلوموں کے ٹھوکریں مار مار کر تھک جائے تو یہ سراپا نزاکت سراپا کی طویل راتوں میں ایک لمحہ بھی آنکھ جھپکائے بغیر اس کے پاؤں دبایا کرے، جب اُسے جمعیت خاطر ہو تو یہ اس کی محفلِ نشاط میں عریاں رقص کیا کرے اور جب اس کی فطری درندگی اپنی وقتی نیند سے چونک کر آمادۂ خوں ریزی ہو تو بغیر کسی حجت کے اس کی شکار ہو جائے۔

کوئی ان بیوقوف عورتوں سے کہے کہ مرد کی چیرہ دستیوں کی خونین داستان اس بوڑھے آفتاب سے سنیں جو بازار بردہ فروشی کے حیاسوز مناظر کی تاب نہ لاکر لاکھوں بار آغوشِ شام میں شرم کے مارے چھپ چھپ گیا، پاک دامن عورتوں کی بے بسی کے قصے ان تاروں سے سنیں جو سرِ شام سے صبح تک ان لرزہ خیز مناظر کو ٹکٹک دیکھا کئے، مظلومیت اور بیچارگی کی داستان، ہاں عورتو ان کنجہائے چمن سے پوچھو جنھوں نے تمہاری جنس کی برہنگی کی ستر پوشی کی!———— اپنی جنس کی بے بسی کی پُرالم کہانی اس شمعِ محفل سے پوچھو جس کے سامنے مرد نے تمہاری ہم جنسوں کو بارہا تادیب کی کہ ساقی گری کی خدمات انجام دیتے ہوئے شراب ارغوانی کے ساتھ ساتھ مینائے شباب کو بھی چھلکاتی جاؤ————!

رقابت، قتل اور رسوائی ———— شرمناک داستانیں————

اور تم اب بھی مرد کا اعتبار کرتی ہو؟

وہ تمہاری سادگی کو اب بھی ذوقِ شکست سمجھتا ہے————

کاش تمام دنیا کے مرد سمجھ لیں کہ عورت صرف اسی لئے طالبِ شکست ہے کہ فطرت نے اُسے رحم و کرم کے علاوہ اور کچھ ودیعت کیا ہی نہیں: وہ شکست جو دلفریبیوں سے معمور ہو اس فتح سے برگزیدہ تر ہے جو لطافتوں سے محروم رہے!————

مرد سے خوف کھاتی ہوں، کانپتی ہوں، نفرت کرتی ہوں اور اگر کبھی بدقسمتی سے ایسی محفل میں جانا ہی پڑ جاتا ہے تو واپس آکر اپنے لباس کو دیوانہ وار جھٹکتی ہوں کہ مبادا کوئی تارِ نگاہ اب تک لباس میں الجھی ہوئی نہ ہو!————

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۴ء————

کوئی تین مہینے سے زندگی کچھ عجیب سی ہو رہی ہے۔ دنیا پہلی سی دنیا نہیں رہی۔ جہاں یکسر بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کیا سچ مچ ایسا ہی ہے، یا میں کچھ بدل گئی ہوں۔ کہتے ہیں ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے لیکن مجھے تو کوئی چیز ایسی سجھائی ہی نہیں دیتی جس نے میرے دل و دماغ کی کیفیات کو بدل دیا ہو۔ سوچتی ہوں کہ اگر مجھے کسی سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع ملے تو وہ ملکی ہے کہ وہ اس کو میری اپنی ہی ذہنیت پر محمول کرے۔ لیکن ایسا بھی کیا اندھیر ہے کہ اتنی بڑی "تبدیلی" ہو جائے اور مجھے خبر بھی نہ ہو————

دنیا کی ہر چیز حسین معلوم ہوتی ہے اگر کبھی سیر کے لئے نکلتی ہوں تو وہ مناظر جن سے کبھی مجھے ذرا سی بھی دل بستگی نہ ہوئی تھی، آج مجھے، میری تمام ہستی کو، ہاں مجھے اور میرے تمام ماحول کو جذب کر لینے کے لئے بیقرار نظر آتے ہیں۔ وہی فطرت جسے میں کبھی قہر بار خیال کرتی تھی اب تمام تر زر نگار نظر آتی ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز بھدّی بھانڈی اور غیر اصولی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اب جب سوچتی ہوں تو .... ہمیشہ اس نتیجہ پر پہنچتی ہوں کہ اس آئینہ خانہ کے سوارنے میں کسی سلیقہ مند اور بلند ترین ذوقِ جمالیات رکھنے والی قوت کا دخل ہے————

جب چمن چمن میں پھول مسکراتے ہیں، بلبل گاتی ہے، قمری بولتی ہے، اور نیلے نیلے شفاف بادل پہنائے آسمان میں کسی نامعلوم شے کی تلاش میں اِدھر سے اُدھر دوڑتے ہیں، جب کالی کالی اور اُودی گھٹائیں جھوم جھوم آتی ہیں اور ساون کی بوندیوں میں ننھے ننھے پرند بادلے ہو ہو کر کسی نامعلوم مخاطب سے اپنی کہتے ہیں اور اس کی سنتے ہیں تو معلوم نہیں میں کیوں اُداس ہو جاتی ہوں میں بھی اپنی کہنا چاہتی ہوں اور "اس" کی سننے کی تمنا دل میں پیدا ہوتی ہے۔ لیکن وہ کون ہے جو میری سنے اور اپنی کہے۔ کالی اور ڈراؤنی رات کی گہری تاریکیوں میں جسم کو یہیں چھوڑ کر روح کے ہمراہ اس فضائے بسیط میں اُڑتی ہوں اور تلاش کرتی ہوں۔ ایک ایسے مغنّی کو جو میرے سازِ دل پر قومی نغمے گائے اور مجھے مدہوش کر دے، جو میری ہستی کو مجھ سے چھین لے اور صرف رازِ ہستی بتا دے ——

سوچتی ہوں کہ کہیں میں مرد کی جانب تو کھنچی نہیں جا رہی ——

نہیں نہیں گلنار مرد کی تمام فریب کاریاں تجھے اس خونخوار وحشی اور بھوے جانور کے معبودِ جنگل میں نہیں لا سکتیں۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے اور شاید جتنا میں مرد کو سمجھتی ہوں اور کوئی نہ سمجھتی ہوگی۔ میں جانتی ہوں وہ دغا باز ہے، فریب کار ہے، سست پیماں ہے، درندہ ہے! تو پھر اس کے کیا معنی کہ میں اس کی شکار ہو جاؤں۔ میرے دل میں مرد کے لئے سوائے نفرت اور حقارت کے کسی اور جذبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ محبت اور کشش اور مرد کے لئے، خوب، یہ ایک دلکش خواب ضرور ہے لیکن واقعاتی دنیا کے کس قدر خلاف، اور خدا کرے یہ خواب کبھی تشنۂ تعبیر نہ ہو —— مرد فطرت کا بھدا مذاق ہے، قدرت کی ایک عظیم ستم ظریفی۔ میں یہ سب کچھ جانتی ہوں، مگر یہ خیال دل میں پیدا ہی کیوں ہوا کہ شاید میں مرد کی جانب کھنچی جاتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اس بھرے جہان میں کوئی مرد باوفا ہو، اس تمام دنیا میں صرف ایک مرد پر محبت —— اور میں اُسے حکایت ہر دو فاستا کر اپنا لوں" —— مگر میں بھی بیوقوف بن جاتی ہوں۔ آخر حقیقت کیوں نظر انداز ہوئی جاتی ہے کہ عقاب بلبل کی طرح گا نہیں سکتا، شیر کی آنکھوں میں ہرنی کا رحم کبھی نہ جھلکے گا۔ نظامِ قدرت کو میں نہیں بدل سکتی، کوئی عورت بھی بدل نہیں سکتی تو یہ آنکھوں دیکھی کھائی میں کودنا کیسا؟ —— نہیں میں مرد سے ہمیشہ نفرت کروں گی، اس جنگلی مخلوق سے ہمیشہ دور رہوں گی اور شاید —— شاید کچھ نہیں —— مگر بفرضِ محال کبھی اس سے قریب ہوئی تو —— صرف اس پر تھوکنے کے لئے، ٹھکرا کر ذلیل کرنے کو۔ انتقام لینے کو، خون آشامی کے لئے ——!

—— مگر یہ سب کچھ سہی اس آگ کو کیا کروں، جو مجھ سے یہ سب کچھ لکھوا رہی ہے، کیا کروں کہ یہ لپکتے ہوئے شعلے یکسر گلزار ہو جائیں، یہ ذوقِ تلاش کیا ہے؟ کسے ڈھونڈھ رہی ہوں؟ اماں اور ابا کی محبت بھری باتیں دل کو سکون سے آشنا نہیں کرتیں، سہیلیوں سے کہنا چاہتی ہوں لیکن کہا نہیں جاتا۔ ہزار بہانوں سے دل بہلاتی ہوں مگر کون جانے دل بہلتا کیوں نہیں؟

—— نت نیا رنگ ہوتا ہے —— آج دن چڑھے بیدار ہوئی تو بے اختیار آئینہ کے سامنے پہنچی جیسے کسی نے زبردستی آئینہ کے روبرو کھڑا کر دیا ہو۔ رنگ بھی پہلے سے زیادہ نکھرا ہوا معلوم ہوا، اور دل کہتا ہے کہ ایک نامعلوم شے اگر مجھے حاصل ہو جائے تو یہ اور بھی نکھر جائے گا۔ آنکھوں میں ہلکے گلابی ڈورے دکھائی دیتے ہیں، اور دل کہتا ہے کہ یہ سرخ تشنیں بھی ہو سکتے ہیں۔ آئینہ کے سامنے تن تن کر کھڑی ہوئی، معلوم ہوا کہ قد سرو ہو گیا۔ مگر دل کہتا ہے کہ یہ سرو چل بھی لا سکتا ہے، لانبے لانبے گھنیرے بال مجھے وجد میں لے آئے مگر دل کہتا ہے کہ میرے سوا اور بھی وجد میں لائے جا سکتے ہیں۔ کیا ہے یہ سب کچھ؟ کون بتائے؟ کون پوچھے؟ —— جی کیوں چاہتا ہے گلنار کہ کوئی آئے اور تیری تمام ہستی کو تجھ سے چھین لے۔ تیرا تمام سکون تجھ سے چھین لے اور تجھے اضطراب دیدے —— چاہتی ہوں کہ اپنے کو مٹا دوں لیکن کس کے لئے؟ میں خود نہیں جانتی: جاننا چاہتی ہوں لیکن بتاتا کوئی نہیں: خدا کرے موت ہی آجائے۔ لیکن یہ آرزو میری خواہش کی صحیح ترجمانی نہیں کرتی —— میں تو کچھ اور چاہتی ہوں اور نہیں جانتی کہ کیا چاہتی ہوں!

۳ر اپریل ۱۹۳۵ء

آج کا دن میری سولہ سالہ زندگی میں شاید ایک پہاڑی آبشار کی مانند تھا جو اپنے شدّت بہاؤ میں مجھ قوی دل کو بھی بہا لیجانا چاہتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمین پاؤں تلے سے نکلی جا رہی ہے۔ دل کہتا ہے کہ میری کتابِ زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز ہونے والا ہے بلکہ زیادہ درست یوں ہے کہ آغاز آج ہی ہوا ہے ——

ہوا یہ کہ مسرّت کو ہمراہ لے کر —— باغ میں ٹہلنے گئی۔ ٹاؤن ہال کے عقب پر مدن بان کی جو روشیں ہیں انہیں دیکھ رہی تھی کہ ایک سائیکل سوار

نوجوان قریب سے ہوکر نکلا۔ شام کا وقت تھا، صورت اچھی طرح سے نہ دیکھ سکی گو دماغ میں اس طرح ایک ارتعاش سا پیدا ہوگیا۔ جس طرح اندھیری رات میں بجلی کے کوندنے سے فضا ایک لمحہ کے لئے منور ہوجاتی ہے۔ نکلنے کو تو وہ نوجوان قریب سے ہوکر نکل گیا لیکن ایسا معلوم ہوا کہ اس کی تمام ہستی میری روح میں جذب ہوگئی یا وہ جاتا ہوا میرے خیالات کے سکون کو ابدی اضطراب سے بدل گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ نوجوان اپنی دھن میں نکل گیا ہوگا۔ لیکن پیچھے مڑکر جو دیکھتی ہوں تو چار قدم پر رُک کر وہ بھی میری جانب دیکھ رہا تھا۔ دھندلکے میں میری نظروں نے اُس کی نگاہوں کو ڈھونڈھ لیا۔ اِدھر میں کچھ مجبور سی ہوئی اُدھر شائد اُسے بھی "وقار" نے مجبور کیا کہ وہ اپنی نظروں کو میرے "نظارہ" میں ضائع نہ کرے۔ وہ چلدیا ——— کچھ رُکا ——— پھر مڑکر دیکھا اور ——— پھر چلدیا ——— اب میری نگاہیں اُسے ڈھونڈھ رہی تھیں۔ لیکن وہ اندھیرے میں گم تھا۔

میں بھی مسرت کو لئے اسی جانب چل دی۔ گو دماغ نے بہتیرا سمجھایا کہ میں اس جذبہ سے مجبور ہوگئی ہوں جسے دنیا عورت کی کمزوری سے تعبیر کرتی ہے۔ لیکن پھر بھی دل تھا کہ اسی جانب چلنے کے لئے مچل رہا تھا۔ دماغ نے دل کو سمجھانے کے لئے تمام اس فلسفہ سے کام لیا جو میں نے مردذات کے متعلق ترتیب دے رکھا تھا، لیکن دل اثر قبول کرنے سے انکاری ہوچکا تھا۔ اس وقت جو جذبہ میری تمام کائنات پر چھایا ہوا تھا صرف اس مرد کا خیال تھا۔ جی چاہتا تھا کہ میں یہاں کھڑی رہوں اور وہ نوجوان ایک بار پھر میرے قریب سے گزر جائے۔ آج تمام رات یہیں رہوں اور وہ بار بار میرے قریب سے گزرتا رہے۔ دنوں، ہفتوں، مہینوں، سالوں، صدیوں یہی ہوتا رہے اور ہر بار جب وہ میرے قریب سے گزرے تو میں اپنے متاعِ دل وجان کو اس پر نثار کرتی رہوں۔ صدقہ کرتی رہوں۔ نچھاور کرتی رہوں اور اسی "گل بازی" میں قیامت آجائے اور شفق زریں کا پروردگار ہم دونوں کو یہی کھیل کھیلنے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قادر کردے۔

آگے بڑھی ——— اس طرف جس جانب وہ گیا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد دیکھا کہ بجلی کی روشنی کے نیچے وہ کنارِ حوض کھڑا ہے۔ فوارہ چھوٹ رہا تھا ——— وہ ایک دیوتا معلوم ہوتا تھا جس کے قدموں میں فوارہ کی باریک ونازک دھاریں یوں لوٹ رہی تھیں جس طرح تمام دنیا کی لطافتیں سیال ہوکر دیوتا کو غسل دینے کے لئے تڑپ رہی ہوں ——— پہلے تو میں ٹھٹکی ——— دو تین قدم پر رُکی ——— پھر آگے بڑھی

——— اور اب میں بھی حوض کے قریب تھی۔ میں اس کے خوبصورت چہرے کو اس طرح تک رہی تھی جیسے کوئی مایوس دیوی کے سامنے دوسرے پجاریوں کی موجودگی میں افشائے عشق کے خیال سے صرف آنکھوں ہی آنکھوں میں رحم وکرم کی درخواست کرے ——— اس نے میری جانب دیکھا ——— صرف ایک لمحہ ——— اور میں نے محسوس کیا کہ میری تمام کائنات مجھ سے چھین لی گئی ——— ہاتھ پاؤں میں ہلکا سا رعشہ محسوس ہو رہا تھا اور میں دل وجان سے اپنا سب کچھ اس کے سپرد کرچکی تھی۔ اس نے پھر دیکھا ——— میں دیوانی ہوگئی ——— مجھے حوض کے پانی میں کنول یوں معلوم ہوتے تھے کہ روشن ہوگئے ——— نرگس نے پُرخمار آنکھیں کھول دیں ——— سورج مکھی جو آفتاب کے آغوشِ شام میں سوجانے کے بعد سر جھکا چکی تھی حیران معلوم ہوتی تھی کہ یہ بے وقت آفتاب کیوں کر طلوع ہوگیا؟ ——— میں اس کی ہوچکی تھی ——— زیادہ دیر تک وہاں رُک نہ سکتی تھی، آگے بڑھی، گو دل چاہتا تھا کہ اپنی تمام زندگی بھر یہیں کھڑی رہوں اور اس خدائے حُسن کا نظارہ کرتی رہوں ——— لیکن شرم شائد عورت ہی کے لئے بنائی گئی ہے، چنانچہ مجھے ہی سبقت کرنا پڑی۔ ہر قدم جو آگے کو جا رہا تھا واپس جاتا ہوا معلوم ہوتا تھا، سوچ رہی تھی کہ ہر گام پر اپنی آرزو کو نقشِ پا کے ساتھ ساتھ دفن کر رہی ہوں ——— سبزہ سے نکل کر جب سڑک پر ہولی تو وہی کافر میرے قریب سے ہوکر نکلا ——— سیدھا گیا ——— اور معلوم نہیں کیوں بے اختیار اس کی سائیکل مولسری کے ایک پیڑ سے ٹکرائی اور وہ گر گیا ———

میں ہوش وحواس میں تو اغلب ہے کہ یہ جرأت نہ کرتی مگر اس وقت اس طرح اس کی جانب لپکی جس طرح کسی آتش زدہ مکان کا مکین دیوانہ ہو ہو کر اپنی متاعِ حیات کو شعلوں کی لپیٹ سے محفوظ کرنے کے لئے بے اختیار دوڑے ———

میں اس کے قریب پہنچی ہی تھی کہ وہ زمین سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے جب دیکھا کہ وہ محفوظ ہے تو مجھے اپنی موجودگی سے حجاب آنے لگا۔ بہرحال سنبھلی، اور جب اس نے شکریہ ادا کیا تو باوجود ذوقِ تکلم کے خاموش رہی ——— اور کیا کرتی ——— معلوم ہوتا تھا کہ کسی نامعلوم طاقت نے قوتِ گفتار سلب کردی

وائے فریاد کہ آج گفتار بھی ایک مرد کے قدموں میں تڑپ تڑپ کر جان دیدینا چاہتی ہے!

۱۸ر اپریل ۱۹۳۵ء

کتنا سُندر ہے اس کا نام، کتنا منوہر! سیراسن موہن! کون؟ منور۔ اور کون؟ منور، منور، کتنا پیارا نام ہے، کتنا دل کش، منور میرے سیہ خانۂ دل کا نور، میری شمع حیات کی ضو، میری قندیل زندگی کی روشنی، اپنی گلنار کا "بالم" منور۔ — اپنی پجارن کا صنم منور، اپنی بھکارن کا داتا منور، منور، منور، کام و دہن کی شیرینی — دنیا کی تمام لطافتیں اس نام میں ہیں —

آج شام ایسی شام شاید آج کے بعد پھر کبھی نہ آئے گی —

ایک ایسی شام جس میں زندگی کی دلفریبیاں، طالع بلند، دولت بیدار سب کچھ سمٹ کر آگیا ہو۔ قسمت نے مجھے اس کے قریب کر ہی دیا اور وہ یوں کہ میں جمیل کے ہمراہ "نشاط نا کیز" میں نرگس کا رقص دیکھ رہی تھی کہ مجھے معلوم ہوا کہ برابر کی کرسی پر بیٹھنے والے مرد کا سانس میری ہستی کا ماحول ہے اور یہ کہ میں ہزار کوشش کروں لیکن اس سے آزادی نصیب نہیں ہو سکتی، اور اگر آزادی مل جائے بھی تو شاید میں خود ہی ایسی بے کیف آزادیوں کو لاکھوں بار ذوقِ اسیری پر سے قربان کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی ماحول کی پابند ہو جاؤں۔ اس کی شخصیت میرے حواس پر چھائے جا رہی تھی اور میں معلوم نہیں کیوں اپنے اور اس کے درمیان ایک رشتۂ لطیف کا تصور کئے جا رہی تھی۔ وقفے میں جب روشنی ہوئی تو خوشی اور حیرت سے میں نے معلوم کیا کہ "وہ" منور تھا — میرے خوابِ جوانی کی پُرشعریت تعبیر —

میرے خوابوں کے مندر کا پُرشوکت، حسین دیوتا —

تعارف ہوا، وعدہ ہو گیا کہ وہ پرسوں یہاں آئیں گے —

خزاں کے دن گئے، گلنار، بہار آنے کو ہے، لیکن کیسی کیسی رنگینیاں لئے ہوئے خدا جانے! ڈر بھی رہی ہوں — خوش بھی ہوں: وہ آنے کو ہے!

۲۲ر اپریل ۱۹۳۵ء

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!

آخوش وہ آئے۔ میں اُن سے باتیں کر رہی تھی، لیکن معلوم نہیں وہ کیوں خاموش تھے۔ بس۔ وال۔ ایک خامشی تیری سب کے جواب میں، وہ اپنے اشعار سنانے لگے۔ میں ہمہ تن گوش تھی۔ کتنے حسین و جمیل اشعار تھے، معلوم نہیں کیوں میرا دل چاہنے لگا کہ میں اس کے اشعار کی موضوع بن جاؤں —

میں جھوم رہی تھی اور اپنے خیال میں ایک ایسی دنیا میں پہونچ گئی جہاں کا ماحول تعبیر کی رنگینی سے زیادہ خوش منظر ہے، جہاں سازِ جوانی پر گائے ہوئے نغموں کی بارش ہوتی ہے، جہاں مادیت کا نام نہیں، روح ہی روح، اور روح بھی کیسی پاکیزہ، حسین، دوشیزہ — جب کبھی منور کی آواز کانوں میں آتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ اس رنگ و بُو کی دنیا میں معصوم فرشتے اپنے زرّیں پروں کو قوس و قزح کے راستے پر تولے ہوئے پریم بھرے گیت گا رہے ہیں۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی اور کئی بار، کہ منور کا ترنم مجھے اپنے ساتھ اسی دنیا میں لے جائے، جس نگر کا وہ "باسی" ہے۔ جب سنتی تھی کہ اپنے اشعار میں منور نے کسی کو مخاطب کیا ہے تو چاہتی تھی کہ اس کی مخاطب میں بن جاؤں — گو میں اس لائق نہیں، لیکن گنہگار کے دل میں بھی تو رحمتِ خدا کبھی دیا جلا ہی دیتی ہے۔

آج سمجھتی ہوں کہ میری زندگی محتاجِ عنوان ہے! سر باب کچھ لکھا ہی نہیں گیا۔ ممکن ہے کہ مشیت نے منور کا نام لکھ دیا ہو! کاش مجھے معلوم ہو جائے! —

۲۶ر جولائی ۱۹۳۵ء

اب منور روزانہ آتے ہیں، شام کے وقت — صبح سے اُٹھ کر انتظار کی کاہش اور لذت سے دوچار ہو جاتی ہوں، کام کچھ بھی نہیں کر سکتی، گھریلو زندگی میں میری حیثیت ایک عضوِ معطل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ سودائیوں کی طرح ایک کمرہ میں جاتی ہوں اور چل پھر کر نکل آتی ہوں۔ ذہن ماؤف ہو چکا، منور اور منور کے خیال کے علاوہ ذہن میں اور کچھ آتا ہی نہیں۔ دن پہاڑ سا معلوم ہوتا ہے اور آنکھ دروازے پر لگی رہتی اور ہر لحہ سوچتی ہوں کہ شباب و شعر کا وہ پیکر حسین ابرِ کرم بن کر اس پیاسی دھرتی پر کب اُمنڈ کر آئے گا۔ تمام دن انتظار کرتی ہوں اور شام کا تصور اس طرح رہتا ہے جیسے درماندہ مسافر کو منزل کا خیال —
لیکن وہ نہیں آتے اور میں اس انہماک سے اُن کا انتظار کرتی ہوں جیسے کسی خزینۂ تمثیل میں ناظرین ہیرو اور ہیروئن کے وصال کی آرزو کریں —

میں اور منور ابھی تنہائی میں زیادہ دیر تک نہیں مل سکتے۔ وہ ابّا کے پاس آتے ہیں اور میں کسی بہانہ سے اُن کے پاس جا کر بیٹھ جاتی ہوں، لیکن زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکتی اس لئے کہ جانتی ہوں ع

چھپتی نہیں ہے نگۂ شوق ہم نشیں

جب وہ رات کو چلے جاتے ہیں تو میں بجا طور پر خیال کرتی ہوں کہ میری حیات کی تمام رنگینیاں اُس کے ساتھ ہی رخصت ہو گئیں۔ جب رات کی آسائش آفریں

سالوٹی پریاں تمام دنیا کو سکوتِ شب میں تھپک تھپک کر سلا دیتی ہیں، جب ناداری جہانگیری کے جبر و اکراہ سے کچھ دیر کے لئے غافل ہو جاتی ہے۔ جب گنہ گار فکرِ عذاب سے بے خبر اور دین دار آرزوئے فردوس سے بری ہو جاتے ہیں تو سائیں سائیں کرتی ہوئی رات میں آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں سے پوچھنے کے لئے کہ میرا پریتم مجھ سے کب ملے گا۔ کوٹھی کے پائیں باغ میں چلی جاتی ہوں۔ سنسناتی ہوئی ہوا سے بسیرا کرنے والے طیور سے، سوتے ہوئے پھولوں سے، دیو قد درختوں سے، کائنات کی خاموشی سے سوال کرتی ہوں ——— کوئی جواب نہیں دیتا ———

——— واپس آ جاتی ہوں کمرہ میں۔ اور اپنے سنگار میز کی دراز سے اپنے من موہن کی تصویر لے کر باتیں کرتی ہوں۔ چومتی ہوں۔ گلے لگا لیتی ہوں بھینچتی ہوں اور اس زور سے کہ شاید میں اور یہ کاغذی پیکر ایک دوسرے میں جذب ہو کر حسن و عشق کا ایک مشترک مجسمہ ہو جائیں۔

جانی! اگر تو اس وقت آ جائے تو کیا ہو؟ ——— اگر تو آ جائے تو میں دوڑ کر تیرے قدموں سے لپٹ جاؤں تاکہ تو مجھے پاؤں تلے روند ڈالے۔ تیرے قدموں میں اس وقت تک تڑپا کروں جب تک کہ میری رُوح میرے جسم کی کثافتوں کو تج کر آزادانہ تیرے گرد طواف نہ کرنے لگے ———

——— لیکن آہ تو نہیں آئے گا۔ کیا میں یوں ہی تڑپتی رہوں گی۔ دیکھ لے بالم اس برہن کو جو چپکے چپکے ہی جلی جا رہی ہے اس سوکھی لکڑی کی مانند جو بن میں اکیلی سلگ سلگ کر راکھ ہو جاتی ہے!

۱۸ر دسمبر ۱۹۳۶ء ———

آج میری اور منور کی حیاتِ رنگین کو کچھ اوپر دو برس ہوتے ہیں۔ آج جب میں اس مشترک ماضی کو دیکھتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک داستانِ مسلسل ہے عیش و بیفکری کی۔ یہ طویل مدت تو گزرتے معلوم ہی نہ دی۔ ایک مسلسل آزاد قہقہہ ہے جو ان سالوں پر پھیلا ہوا ہے۔ وقت آنکھ جھپکاتے گزرا اور ہنوز وہ ساعت نہ آئی ———

——— شادی کی گھڑی ——— اچھا ہوا نہ آئی، ورنہ منور کی تباہی پر مہر توثیق ثبت ہو گئی ہوتی ——— میں کل ایک عظیم قربانی کرنے والی ہوں ——— محبت کی قربانی جو صرف ایک عورت ہی سے ممکن ہے ———

——— شاید اگر مرد چاہیں بھی تو ان سے نہ ہو ——— کل میں اپنے تئیں منور کے زریں آئندہ اور شاندار مستقبل پر سے قربان کر دوں گی ———

منور کچھ نہیں کرتا۔ عورت کا فرض محبت کے باب میں یہ ہے کہ وہ محبت کرے اور اپنے اور اپنے آپ کو محبت مجسم بنا ڈالے۔ لیکن منور مرد ہوتے ہوئے بھی وہ کچھ کر رہا ہے جو صرف عورت کو فطرت کی جانب سے قدرت ہوا ہے۔

مجھے اپنے جذبات، اپنے خیالات، اپنے آئندہ سے زیادہ منور کا آئندہ عزیز ہے اور اگر میں منور کے پیشِ نظر رہی تو ڈرتی ہوں اور بجا طور پر خوف کھاتی ہوں کہ منور بجائے اُبھرنے کے ڈوب جائے گا، اور اس مرگِ آرزو کی ذمہ داری مجھ پر ہو گی ——— میں اگر خود غرضی سے کام لوں تو منور کو صرف اپنی ذات میں مرکوز کر سکتی ہوں۔ مگر نہیں منور کی حیاتِ درخشندہ کا مقصد اس سے بہت بلند اور ارفع ترین ہے۔ وہ اپنے میں اوّلین ادیب ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اور کیا علم و ادب صرف ایک عورت کی خود غرضی کے لئے ایک بہترین شخصیت سے محروم ہو جائے گا؟ ——— گلشا راس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ قوم و ملک کو منور کی زیادہ ضرورت ہے تو کیا کروں! منور سے رشتۂ یگانگت نہ رکھوں! ہاں ایسا ہی ہو گا۔ عورت کی محبت کا بلند ترین نصب العین دائمی وصل نہیں بلکہ ہجر ہے۔ میں بھونرے کی طرح شاد کام نہیں بلکہ بلبل کی طرح فراق زدہ رہ کر اس کی محبت میں سرشار رہوں گی ——— گو میری بے پناہ محبت منور کے لئے غیر فانی ہے۔ لیکن کل سے کرب و اضطراب کی راتوں میں تھوڑی بہت تسکین کے لئے منور نہ ہو گا ——— منور کا خیال ہو گا ———

——— دنیا اور جاہ و دنیا منور کے قدموں پر جھک جائیں گی اور میں دُور سے خوش ہو لیا کروں گی یہ سمجھ کر کہ میں نے اس دنیا کو ایک بلند فطرت اور عالی دماغ شخص دینے میں خود غرضی سے کوئی کام نہیں لیا ——— میں اس سے کل کے بعد نہ ملوں گی اور دُور سے اُسے دیکھ کر اس طوفانِ زندگی کے جادۂ مستقیم پر اس طرح قائم رہوں گی جس طرح ایک طوفانی اور ہولناک رات میں ایک ملاح صرف قطبی تارہ پر نگاہ رکھ کر اپنی راہ گم نہیں کرتا ——— منور کے آئندہ نے میری خود غرض محبت کو شکست دیدی اور میں اپنا فرض سمجھ چکی ———

——— میں اُسے نہ بتاؤں گی کہ میں اُسے چھوڑ کیوں رہی ہوں، اور پھر شادی منور کرے تو شوق سے لیکن میں ——— آہ منور کے سوا دوسرا آزشاہ میرے لئے تخلیق ہی نہ ہوا۔

۱۵ر نومبر ۱۹۳۷ء ———

آہ موت! ظالم و خونخوار موت! تجھے خود ہی موت کیوں نہیں آئی۔ یہ میں کیا سن رہی ہوں کہ منور میرا پیارا منور اس دنیا کو اپنی جدائی سے بیباکت

ڈراونی اور سنسان بنا گیا - اُمنگوں کا تو خاتمہ آج سے دس برس پہلے کر چکی جب اپنے دُلارے منوّر کو اپنی تنہائی گوارا کرکے اس دغاباز دنیا کو امانت دیا تھا لیکن آہ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس دولتِ بیدار پر یہ یوں ہیچ جائے گی اور امانت میں خیانت کا اس قدر جلد موقع آجائے گا ——— منوّر آج بیاہ نہیں ——— مجھے کیوں نہ موت آگئی ——— اب تو آجانی چاہیئے - جب مقصدِ حیات ہی نہیں تو زندگی کیوں ہو ———

آج دل کی دنیا سُونی ہوگئی - جذبات کا موضوع ہی باقی نہ رہا ———

میری ہستی تک کا سہاگ لُٹ گیا ——— گو میں دنیا کی نگاہ میں ایک دوسرے ہی شخص کی بیوی ہوں - میں کیوں نہ اپنے عہد پر قایم رہی - لیکن بیٹی کیسے باپ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور ماں کی آنکھوں میں خونین آنسو بھی کیونکر دیکھ سکتی تھی ——— معاذ اللہ ہمارے خاندان کی بھی بساط کیونکر الٹی - لاکھوں پتی باپ چشم واحد میں کنگال ہوگیا اور اگر جیل جانے سے بچا تو صرف اسی قیمت پر کہ میں اپنے آپ کو ایک دولت مند کی بیوی بنا دوں - ایک قربانی منوّر کو چھوڑ کر کی، دوسری اپنے آپ کو خاندان کی عزت و آسائش کی خاطر سونے اور چاندی کے چند سکوں کے بدلے میں فروخت کرکے ——— گو میرے خاوند کو میرے جسم پر اقتدار تو ضرور حاصل رہا لیکن کیا وہ میری روح کو بھی رام کرسکا! نہیں، اس لئے کہ میں روحاً تو منوّر کی ہو چکی تھی ———

محبت منوّر کی آج بھی اسی شدّت سے میرے دل میں باقی ہے جس طرح روزِ اوّل تھی ——— منوّر، آہ منوّر، آج تو اس دنیا میں نہیں، اور میں تیری، تیری اپنی ———

منقول از روزنامہ آفتاب، مورخہ یکم دسمبر ۱۹۳۵ء

آج صبح قدسیہ باغ کے قریب ایک عورت لاری کے نیچے دب کر مرگئی۔ جن لوگوں نے یہ حادثہ خود دیکھا بیان کرتے ہیں کہ مقتولہ ڈرائیور کے بار بار ہارن دینے اور بچانے کے باوجود لاری کی جانب لپکی چلی آتی تھی - قدسیہ باغ کے قریب رہنے والے مخبر ہیں کہ یہ عورت تقریباً پندرہ دن سے دیوانی ہوچکی تھی - اور اس کا بیشتر وقت قبرستان میں گزرتا تھا ———

——— کوئی نہیں بتا سکا کہ وہ کون تھی ———

——— ؟

ارباب بزم قصہ سنا تو لو سہی

ٹھیری حرام اور نگارین ہوئیں فرض

موتی یا شبنم؟

اِک دَور وہ آنے والا ہے، دُنیا کی خوشی مٹ جائے گی
چلنے میں قدم تھرائیں گے، اُٹھنے سے نظر شرمائے گی

آئینۂ فروغِ ظلعت کا، چھُٹ جائے گا دستِ زینت سے
قندیلِ حیاتِ فانی کی، ہر سانس میں لَو تھرائے گی

اس نازِ تکبّرِ فطرت کا پندارِ خودی مٹ جائے گا
اس حُسنِ کشیدہ قامت کی، بَل کھا کے کمر جھک جائے گی

بدمست جوانی کی آنکھیں، جس چیز کو موتی کہتی ہیں،
دیکھے گی جو پیری جھک کے اُسے، اک قطرۂ شبنم پائے گی

(جوش)

نقد و نظر

سالنامۂ ساقی (جاپان نمبر)

مدیر۔ شاہد احمد صاحب دہلوی بی اے (آنرز)

قیمت۔ پرچہ ایک روپیہ چار آنے
سالانہ قیمت چار روپے آٹھ آنے

دلی کا ساقی آج کل ہندوستان کے موقر رسائل میں شمار کیا جا رہا ہے اور جو جدت سال بھر میں کئی خاص نمبر نکالنے میں اُس نے دکھائی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اس دفعہ اُس کا سالنامہ جاپان نمبر کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔ درحقیقت اس سالنامۂ ساقی کو اگر برلاسی نمبر کہا جائے تو صحیح ہے۔ کیونکہ وہ پروفیسر نور الحسن صاحب برلاس کی محنت، سعی، اور اُس دلچسپی کا مظہر ہے جو موصوف کو رسالۂ ساقی سے ہے۔ برلاس صاحب کے ادبی خدمت کے جذبے کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے، اور جس قدر اُن کے اس احسان کو اردو خواں ہندوستانی محسوس کریں تھوڑا ہے۔ کہ انھوں نے جاپان اور جاپانیوں کے ہر شعبۂ زندگی سے اُنھیں روشناس کرانے کی سعی کی ہے، ادب، تجارت۔ مذہب۔ سیاست۔ صحافت، روزمرہ کی زندگی، پھول پھل، مناظر۔ تعمیرات۔ شادی، بیاہ، غرض حتی الوسع کسی شعبے کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ جس قدر مضامین جاپان سے اپنے اور دوسروں کے بھیجے ہیں سب اچھے ہیں۔ بالخصوص وہ مضامین جو خود انھوں نے لکھے ہیں قابل تعریف ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ رفع شر کے خیال سے کہ شریک زندگی کی ملکیت میں اُن کا ہر صورت سا حجا قدرتی ہے "گذارش" میں صرف مسز برلاس کی ہی ستائش کی ہے اس کہنے کا یہ مدعا نہیں ہے کہ مسز برلاس کی محنت کی داد نہ دی جائے۔ جو کسی نشو کے چشمے دیکھنے پہنچیں اور گو خود چڑھائی پر نہ چڑھ سکیں تب بھی اپنے شوہر مسٹر برلاس کے مشاہدات کو اس خوبی سے سپرد قلم کیا ہے کہ وہ خود اُن کے ذاتی مشاہدات معلوم ہوتے ہیں۔

تصاویر کا اہتمام سبحان اللہ کیا کہنا، ۲۰۰ صفحات کے رسالے میں ۵۱ چھوٹی بڑی تصاویر ہیں۔ اور ساقی کے اس ٹائٹل پیج کا کیا کہنا، کہ "جلوہ دشمن ایمان و آگہی ہے۔"

ہمیں امید ہے کہ شاہد صاحب معاف فرمائیں گے اگر ہم یہ کہدیں کہ دو نظمیں "جاپان" اور "دنیا کا کامیاب دار التجارت" شائع کرکے جاپان نمبر پر انھوں نے بڑا ظلم کیا ہے۔ شعرائے نازک خیال کی ناخوشی کو فروری کے ساقی میں شائع کرکے بھی رفع کیا جا سکتا تھا۔ غرض اِن دو "مجبوریوں" کے سوا جاپان نمبر نہایت کامیاب نمبر ہے۔ اور ہم دلی مسرت سے مسٹر برلاس کو اُن کی محنت پر مبارکباد دیتے ہیں، اور شاہد صاحب کو بھی کہ اُن کے حلقۂ مضمون نگاران میں پروفیسر برلاس کے سے مخلص اور محنتی ادیب موجود ہیں۔ "م"

سالنامۂ ادب لطیف

مدیران۔ چودھری برکت علی بی اے۔
میرزا ادیب، بی اے۔

قیمت ۸/

ملنے کا پتہ۔ پنجاب بک ڈپو۔ لوئر مال۔ لاہور

ادب لطیف کا سالنامہ جس محنت و کاوش سے مرتب کیا گیا ہے وہ بہت قابل تعریف ہے۔ دو سو صفحات میں مضامین اور نظمیں ہیں۔ بعض تصاویر بہت اچھی ہیں۔ تاریخی مضامین علمی قابلیت کے آئینہ دار ہیں۔ "اکبر اور دینِ الٰہی" کے عنوان سے جو مضمون سپرد قلم کیا گیا ہے وہ ممکن ہے کہ اردو رسائل میں ایک ضروری تاریخی بحث کا افتتاح کردے، اور ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ فیصلہ کرسکے کہ دینِ الٰہی واقعی کوئی مذہبی تصور تھا یا وہ محض اکبری شاہنشاہی کے مضبوط کرنے کے لئے ابوالفضل کی ایجاد کردہ دسیسہ کاری تھی۔

افسانے سب اچھے ہیں اور بعض تمثیل حکیمانہ انداز پر بیان کی گئی ہیں۔

مذ حیہ مضامین بعض قابل قدر ہیں۔ مذاح نویسوں کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مذاح اگر پھکڑ بن جائے تو پھر وہ بجائے ادبی رسائل میں جگہ پانے کے چنڈو خانوں میں جگہ پانے کا زیادہ مستحق ہے۔ یہ انتباہ ہمارا کسی مذاح نگار ادب لطیف کے لئے نہیں ہے بلکہ ہمارا خطاب اُن سے ہے جو اس کے مستحق ہیں۔

پلاستان مولوی ظفر علی خاں صاحب کی نظم بغیر اُن کا نام پڑھے کہہ رہی ہے کہ میں اُس تخیل کا نتیجہ ہوں جو کلی دلے کو غاروں میں ڈھونڈھتا پھرا ہے، باقی اور نظمیں اور غزلیں بھی اچھی اور اکثر خاصی ہیں۔

رسالہ ظاہری شان۔ کتابت، طباعت اور ضخامت ، ہر لحاظ سے عمر سے زیادہ قیمت کا مستحق ہے۔　　ت م

پردۂ تصویر

مدیران :- (۱) سید ابن الحسن فکر ام اے　　قیمت سالانہ دو روپے بارہ آنے

(۲) ہمپال گپتا　　" فی پرچہ چار آنے

ملنے کا پتہ۔ دفتر پردۂ تصویر۔ دہلی

۴۸ صفحات پر یہ ماہوار مصور رسالہ دہلی سے نکلتا ہے۔ نام خود کہہ رہا ہے کہ وہ ایک فلمی رسالہ ہے۔ زیر ریویو نمبر میں ٹیگور کے مشہور آفاق ڈرامے چترا کا ترجمہ ہے۔ جو سید آصف علی صاحب بیرسٹر ایم۔ ایل اے جیسے قابل ادیب نے کیا ہے جس کو ترجمہ کہنا زیادتی ہے۔ ٹیگور کی حکیمانہ نازک خیالی کو جس خوبی سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے وہ ہمارے نزدیک اپنی مثال آپ ہے۔ درحقیقت مسٹر آصف علی ادب کے وہ گوہر گرانمایہ ہیں جس پر سیاست نے استحصال بالجبر کرکے اُردو ادب کو بڑا بھاری صدمہ پہنچایا ہے۔ اس ڈرامے کے علاوہ اور مضامین بھی خوب ہیں۔ اور تصاویر کی تو کچھ کمی ہی نہیں۔ ایک نہیں متعدد ہندی اور فرنگی ایکٹرسوں کی تصاویر ہیں۔

ہم کو یہ معلوم ہو کر بہت خوشی ہوئی کہ پردۂ تصویر اپنے دوسرے ہمعصر فلمی رسائل کے مقابلہ میں بہت زیادہ کثیر الاشاعت ہے۔

ناشران فلم کو یقیناً پردۂ تصویر سے مستفید ہونے کی کوشش کرنی چاہئے جس کے فلمی مضامین علمی و ادبی حیثیت سے بہت بلند پایہ ہیں۔

ت م

نوادر

مولفہ مرزا محمد عسکری صاحب بی اے۔　　قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:
(۱) مرزا محمد عسکری بی اے۔ (حکیم عبدالعزیز روڈ)
(۲) منیجر انوار المطابع (امین آباد پارک)
(۳) الناظر بک ایجنسی (وکٹوریہ اسٹریٹ)
لکھنؤ

فاضل مولف نے عربی، فارسی، انگریزی کتب کے بہت سے لطیفے، ظریفانہ اقوال شاہیر کے دلچسپ جملے جمع کر دئے ہیں، اور نامور حکما کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں۔ پھر التزام یہ کیا ہے کہ ہر طبقے کے ظریفانہ اقوال و اذکار کو علیحدہ علیحدہ ترتیب دیا ہے یہ نہیں کیا کہ ابھی تو حکیم ارسطو کا لطیفہ رکھا جاتا، پھر یکایک کسی مسجد کے امام صاحب گل فشانی کرتے نظر آتے۔ شیخ ممتاز حسین صاحب عثمانی اڈیٹر اودھ پنچ نے "پیش گفت" لکھکر مولف کی محنت کی داد دی ہے۔ اور آج کل کے مذاح نویسوں پر چوٹ کرتے ہوئے لکھا ہے "کہ آج کل کے ظریف بے نتیجہ افسانے لکھتے ہیں اور اپنی عبارت کو ادبی، اور اخلاقی محاسن سے معرا کرتے جاتے ہیں۔ بڑی ظرافت کی تو کسی پردہ نشین کی بدکاری کا حال لکھ ڈالا۔ یا اپنی "بدحواسی" پن کے رکھ دی"

مقدمہ مولف خوب ہے۔ جو ہر مذاح نویس کو پڑھنا چاہیئے۔ بقول مولف اس میں کوئی شک نہیں کہ سوسائٹی کے مذاق کے ساتھ ہر ذوق میں تبدیلی ہونی لابد ہے۔

بہر نوع یہ کتاب تفریح حاصل کرنے کا بہت اچھا ذریعہ ہے، اور جو محنت اس کے ترتیب دینے میں کی گئی ہے وہ قابل داد ہے۔

آخر میں ہم حضرت مولف کو داد دیتے ہیں کہ انھوں نے FORE WARD کا "پیش گفت" ایسا اچھا ترجمہ کیا ہے جس سے بہتر ممکن ہی نہیں ہے۔

کلیم کے فروری نمبر میں ہم اس نادر کتاب کے چند اقتباسات بھی شائع کر رہے ہیں۔

فاضل مصنف کی یہ کوشش قابل داد ہے اور اس لائق ہے کہ ہر صاحب ذوق اس کا مطالعہ کرے۔

ت م

حضرت جوش ملیح آبادی کا جدید مجموعہ نظم

نقش و نگار

نقش و نگار و رنگ و بو تازہ بتازہ نو بنو

اگر آپ شاعر انقلاب کا دل دیکھنا چاہتے ہوں تو
اس مجموعہ کا مطالعہ آپ کا اولین فرض ہے

نقش و نگار کے ابواب کی فہرست

(۱) خمریات ۔ وہ نظمیں جو رندی و مستی پر مشتمل ہیں۔
(۲) تاثرات ۔ ان امور پر مشتمل نظمیں جن سے شاعر براہ راست متاثر ہوتا ہے۔
(۳) نگارخانہ ۔ دیکھے ہوئے حسن کی مصوری پر نظمیں۔
(۴) واردات ۔ آپ بیتی۔ یعنی شاعر کی محبت کے حقیقی واقعات پر نظمیں جن میں صرف نام ظاہر نہیں کئے گئے ہیں۔
(۵) مشاہدات ۔ ان چیزوں پر استعارہ و تشبیہہ کے ساتھ نظمیں جن کا شاعر نے مطالعہ کیا ہے۔

قیمت [illegible]

ملنے کا پتہ ۔ منیجر کلیم بک ڈپو کشتہ ہریاں دہلی

داستانِ عشق! کس کی؟ ——— اُنکی

جو سب سے زیادہ پاک نام سے سب سے زیادہ ناپاک کام کرتے ہیں!
جو عباؤں اور ڈاڑھیوں کے سائے میں رینگتے ہوئے سانپ ہیں!
جو مذہب کی تحقیق صرف اس لئے کرتے ہیں کہ مذہب کی جڑوں کو کاٹ دیں!!
جو وظیفے اس لئے پڑھتے ہیں کہ سادہ لوحوں کی دولت اور اُن کی عورتوں پر قبضہ کرلیں!

پاپائے رُوم کی داستانِ عشق

از ملک حسیب احمد بی اے آنرز

پڑھیئے اور دیکھئے کہ تقدس اور روحانیت کی عبا میں حُسن کس کس رنگ میں جلوہ گر ہوا، فاحشہ عورتوں نے خدائی سلطنت پر کیونکر حکومت کی، کس پوپ نے اپنی بھابی سے عشق کیا، کس پوپ کی سُونی آغوش اپنی بھتیجی سے آباد ہوئی، کس پوپ کے حمام میں جوان عورتوں کو اذنِ عام تھا، کونسا پوپ اپنی حقیقی بھانجی کو دل دے بیٹھا، کن جمالوں کے اشارۂ چشم پر مسیحی دُنیا ناچتی تھی، کیوں کر ایک عورت پوپ بنی اور وضع حمل سے یہ راز کیونکر فاش ہوا۔ ایسے ایسے بیسیوں سنسنی خیز اور حیرت انگیز سچے واقعات، دیکھئے کہ شبستانِ محبت میں کافر جوانی بیتاب جذبات کی آغوش میں کیونکر مچلی، حبِ مسیحی دنیا حضرت عیسیٰ کے پاک نام پر قربان ہوئی جاتی تھی تو سُنئے کہ پوپ کے محلوں میں آنند کی مُرلی نے کیسے کیسے سریلے گیت گائے فاضل اور صاحبِ طرز مصنف نے اس اچھوتے موضوع پر شباب کی رعنائیوں میں کھو کر پیاری پیاری زبان میں دیر و حرم کے پردے اُٹھا کر کیسے کیسے صنم بے نقاب کر دئے ہیں!

کتاب نہایت دلچسپ ہے قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ: **کلیم بک ڈپو کٹڑہ بڑیاں دہلی**

افسانوں کی کتابوں میں زبردست اضافہ

"آنسو"

جو

ہندوستان کے مشہور صحافی ادیب اور افسانہ نگار حضرت فرید مجھلی شہری مصور درد

کے

۲۴ درد بھرے افسانوں کا نہایت حسین و جمیل مجموعہ ہے

جسمیں

مدیر کلیم شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

ادیب العصر حضرت ل۔ احمد اکبر آبادی

حضرت سلطان حیدر جوش بی اے ڈپٹی کلکٹر علی گڈھ

لسان القوم ساغر نظامی

کے مقدمات شامل ہیں۔ ہر افسانہ انقلاب کا پیامی ہے اور جہد حیات کا صحیح رہنما نیا اسلوب بیان، میٹھی خالص ہندوستانی زبان اور نہایت دردناک پلاٹ

چند افسانوں کے عنوان

مزدور کی بیوی، بی اے پاس مزدور، روٹی کا ٹکڑا۔ پھول کی راکھ۔ مرجھایا ہوا پھول۔ ٹھنڈی بجلی۔ پریم کی بھینٹ۔ اشنان۔ بجارن۔ دل کا سنگم۔ پوجا کا پھل۔ جوانی کی پیاس۔ نصیب کا بیوپار۔ شکست کی ہنسی۔ سماج کی کروٹیں۔ شاہ صاحب۔ مولون۔ شبستان کی شکاری وغیرہ

خوبصورت سائز۔ سہ رنگ سر ورق۔ رنگین آرٹ کی تصاویر۔ دو رنگ کے کئی نقوش، ولایتی جلد

قیمت ۲۵ فروری تک (مجلد) دو روپے

ملنے کا پتہ۔ نیرنگ خیال بک ڈپو۔ لاہور

اہل رنگون کو مژدہ

رنگون میں رسالہ "کلیم" کے سول ایجنٹ

منشی عبدالرزاق خان صاحب نظامی فیض آبادی

پوسٹ بکس ۳۳ مکان ۱۷۲ بار اسٹریٹ ہیں

وہاں سے تازہ بتازہ کلیم کا پرچہ عرفی پرچہ کے حساب سے ملے گا

(مینیجر کلیم دہلی)

رسالہ زمانہ کا خاص نمبر

"یادگار حالی"

مشہور رسالہ زمانہ کانپور کا دسمبر ۱۹۳۵ء نمبر شمس العلما مولانا حالی مرحوم کی صد سالہ سالگرہ کی یادگار میں خاص حالی نمبر کی حیثیت سے شائع ہوا ہے جس میں مولانا مرحوم کے سوانحی حالات کے علاوہ ان کی نثر اور نظم پر متعدد تنقیدی مضامین درج ہیں۔ موجودہ زمانہ کے کئی نامور شاعروں اور مشہور انشاپردازوں نے اس نمبر کے لئے خاص مضامین لکھے ہیں "جشن پانی پت" کا بھی مفصل تذکرہ ہے۔ کئی عکسی تصاویر بھی زیب رسالہ ہیں۔ غرض ہر حیثیت سے یہ پرچہ ایک قابل قدر یادگار حالی کہلانے کا مستحق ہے۔

حجم تقریباً سو صفحات، قیمت ۱۲ ر علاوہ محصول ڈاک

مینیجر رسالہ "زمانہ" کانپور سے طلب فرمائیے

شاعرِ انقلاب، مصوّرِ جذبات حضرت جوشؔ ملیح آبادی

کے

تازہ تصانیف

پندرہ سال کے منظومات چھ جلدوں میں

اگر آپ ہندوستان کے حقیقی زندہ شاعر کے الہامات سے بہرہ مند ہونا چاہتے ہیں، اور آپ کو عصرِ حاضر کی صحیح ترین ترجمانی کا مطالعہ مقصود ہے تو مندرجۂ ذیل کتب کے خریداروں میں اپنا نام رجسٹر کرا لیجئے



(مشتمل بر افکار سیاسی)



(مشتمل بر مناظر قدرت)



{مختلف مباحث پر رباعیات}



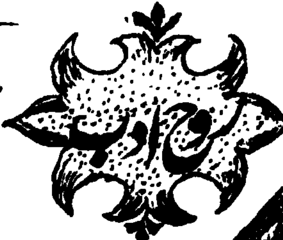
(حقائق و معارف)



غزلیں ایسے انداز پر جن سے اردو زبان (ابتک ناواقف ہے)



{متفرق نظمیں}



نظم و نثر کی شاعری کے جدید ترین نمونے



ہر کتاب کی قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک
جلد آرڈر دیجئے ورنہ انتظار کرنا پڑیگا

ملنے کا پتہ۔ مینجر کلیم بک ڈپو کٹرہ بڑیاں دہلی

مشرقی عظمت کا علمبردار

جاپان

مصنفہ چمن لال صاحب جرنلسٹ — مترجمہ۔ محمود علی خاں صاحب (جامعی)

آج سے صرف ۵۰ برس پہلے جاپان جس سے اب ایشیا کا نام روشن ہے بالکل گمنامی میں پڑا تھا۔ لیکن اس مختصر مدت میں اس نے وہ حیرت انگیز ترقی کی ہے کہ اس کا شمار دنیا کی زبردست طاقتوں میں ہونے لگا ہے۔ اس انقلاب کی داستان اس زبردست تصنیف میں ملاحظہ کیجئے۔ یہ کوئی سفرنامہ نہیں ہے کہ چند حالات و واقعات پر سرسری نظر ڈالی گئی ہو بلکہ ایک مبصرانہ تصنیف ہے جس میں تمام حالات کا غائر مطالعہ اور جاپان کے عروج پر مفصل بحث ہے مصنف نے ساری کتاب میں یہ بات پیشِ نظر رکھی ہے کہ ہمارا ملک جاپان سے کیا سیکھ سکتا ہے۔ سائز ۲۲×۱۸/۸۔ کاغذ ۲۸ پونڈ۔ ضخامت ۲۲۵ صفحات، بلاک کی تیس تصویریں۔ سرورق خوبصورت۔ مجلد ۴؍ بلاک کی ۱۱ تصاویر۔ غیر مجلد ۳؍

پتہ۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی

انشائے لطیف

ادیب العصر حضرت لطیف الدین احمد اکبرآبادی کے افسانے

اردو ادب میں صاحبِ "لالۂ رخ" کا نام محتاجِ تعارف نہیں، اور افسانہ نویسی کا جو معیار ل۔ احمد صاحب نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ تنہا ایک مثال ہے۔ اُن کا ہر افسانہ علم و حکمت، جذبات، واردات اور نفسیاتِ حسن و عشق کے نازک ترین اشارات کا حامل ہوتا ہے۔ اُن کا طرزِ انشا شعریت اور تفلسف اردو ادب میں مستقل اضافات ہیں۔ ل۔ احمد کے افسانے بلاشائبہ، ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں انشائے لطیف ل۔ احمد صاحب کے پندرہ شہ پاروں کا مجموعہ ہے جو اکثر نگار اور دیگر مجلّات علمیہ و ادبیہ میں طبع ہوکر مقبولیت و دوام حاصل کرچکے ہیں۔ اس لئے اگر آپ کو سلاست و نفاست زبان کے ساتھ نفسیاتِ شباب اور جذباتِ حسن و عشق کی صحیح نقاشی سے کوئی خاص لگاؤ ہے، اگر آپ ادب و شعریت کا ذوقِ سلیم رکھتے ہیں تو اس مجموعہ میں آپ کو اپنی طلب و تشنگی کیلئے مکمل سامانِ سیرابی نظر آئے گا۔ طباعت و کتابت روشن و بہترین ہونے کے ساتھ کراؤن سائز پر تقریباً ڈھائی سو صفحات کی ضخامت نفیس جلد اور قیمت صرف دو روپیہ۔ علاوہ محصول

منیجر کلیم بک ڈپو کٹرہ بڑیاں دہلی سے طلب فرمایئے

دنیائے ادب میں ایک تازہ ترین اضافہ

خمارستان کیا ہے؟

یہ اساتذۂ حال کے گلِ سرسبد، نثر و نظم کے لاثانی قلمکار، وحدانیت کے حقیقی معجز نگار۔ جہان استاد، افسر الشعراء حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی کا تازہ شاہکار ہے۔ دراصل یہ اُن جمالیات کا مجموعہ ہے جن سے آج تک نثر عاری تھی۔ یہ وہ مضامین ہیں جنھیں شمس العلماء مولانا آزاد۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ علامہ شبلی نعمانی کے بعد ہندوستان کا لٹریچر آج تک پیش نہ کر سکا۔ خمارستان قلعۂ معلّٰی کی ٹکسالی اردو اور شستہ و رفتہ بولی سے آراستہ ہے۔ صاحبانِ ذوق کی ضیافتِ طبع کیلئے شائع کی جا رہی ہے۔ ع اے زفرصت بے خبر در ہرچہ باشی زود باش

ابھی سے اپنا اسمِ گرامی خریداروں کی فہرست میں لکھوا لیجیے۔

مینیجر کلیم بک ڈپو کٹرہ بڑیاں دہلی

دنیائے افسانہ کا شاہکار

نغمۂ زندگی

مصنفہ ملک حسیب احمد۔ بی۔ اے۔ آنرز

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایسے افسانوں کا مطالعہ کریں جن میں آتشیں شباب اپنی پوری بیتابیاں لئے جھلک رہا ہو جن میں اہم ترین مباحث زندگی پر شوخ تبصرہ ہو جن کے کردار بلند ترین اور جاندار سیرت نگاری کی اردو ادب میں تنہا مثال ہوں تو نغمۂ زندگی کو دیکھئے!

ملاحظہ کیجئے کہ مصنف کا فکر جوان رُوح کی بلندیوں سے آپ کے لئے کیا پیامِ حیات لایا ہے ——— ہندوستان کے تین مشہور ادیبوں کے مقدمات شاملِ کتاب ہیں۔ کتاب زیرِ طبع ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ:۔ **کلیم بک ڈپو، کٹرہ بڑیاں دہلی**



کنول کا خاص نمبر
شایع ہو گیا، جس میں

متعدد یکرنگی اور کئی سہ رنگی لاجواب آرٹ کی تصویریں شامل ہیں رنگین تصویر مریم مجموعہ خاکر نیکے قابل ہے

کنول کا خاص نمبر بہ اعتبار مضامین
سنہ ۳۶ء میں شایع ہونے والے تمام سالناموں سے
ممتاز ہے

آج سے تقریباً دو سو سال پہلے کی ایک قلمی مثنوی بھی ملاحظہ فرمائیے جو نادر ترین ہونے کے علاوہ دنیائے ادب کے لئے ایک اضافی تصنیف ہے

چند مضمون نگار حضرات کے نام ملاحظہ فرمائیے اور اندازہ لگائیے کہ خاص نمبر میں کیسے کیسے ادب پارے شایع ہوئے ہیں

حضرت جوش ملیح آبادی حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی حضرت ماہر القادری خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی حضرت عاشق ٹونکی سعادت حسن منٹو مولوی انتظام اللہ اکبرآبادی۔ لطیف الدین احمد اکبرآبادی۔ دریا انصاری شاہد احمد مدیر ساقی۔ سید فرید مچھلی شہری مدیر نیرنگ خیال وغیرہ وغیرہ

ٹائیٹل آرٹ کا بہترین نمونہ ہے لکھائی چھپائی لاجواب اور رنگین حجم تقریباً ڈیڑھ سو صفحات اور قیمت صرف ۱۲ ر سالانہ خریداروں کو مفت سالانہ قیمت کے علاوہ محصول۔ بہت کم جلدیں باقی ہیں آج ہی طلب فرمائیے

مینجر "کنول" مرکز اشاعت ہینگ کی منڈی آگرہ

بدمعاش کی ڈائری

۱۷ اپریل ۱۹۰۵ء

"لمبی لمبی زلفوں کے نیچے میری پیشانی ستارہ کی طرح چمکتی ہے۔ اس لئے آدمی مجھے آنجم کہتے ہیں۔ میں نے سائنس نہیں پڑھی اور زباندانی پر مجھے ہمیشہ فخر رہا ہے۔ پھر بھی ایک ہم جماعت کو ورغلا کر کالج کے سائنس کے کمرہ سے آتش گیر مادہ اور ۔۔۔۔۔۔۔۔ الیسڈ منگوا کر ۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بم کے گولے بنانے کا تجربہ کرنا میرا اللہ مرۃ کا عمل رہا ہے ۱۸۵۷ء کے غدر کے علاوہ کی تاریخ میری میز پر رہتی ہے اس کا ایک ایک ہیرو میری نگاہ میں فوجی جنرل سے کم حیثیت نہیں رکھتا۔ میں اپنے تئیں قلمرو ۔۔۔۔۔۔۔۔ کا بادشاہ سمجھتا ہوں اور اس تصور سے خوش ہوتا ہوں جبکہ فوجی پرے مارچ کرتے ہوئے میری تخت نشینی کے روز سلامی اُتاریں گے اور دنیا کی حسین ترین عورت میری ملکہ بن کر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یہی زندگی ایک معمہ بن گئی ہے طبیعت اشتراکیت کی تحریک کی طرف مائل ہے۔ لیکن پیٹ بھی تو بھرنا ہے۔ اس لئے میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اچھے لوگوں پر اپنی نیک سیرتی کا اعتماد پیدا کرکے دھوکا دوں اور روپیہ جوڑ لوں۔ اب شادی تو کر رہا ہوں ایک اچھی جگہ پر بھولی بھالی لڑکی ہتھے چڑھ گئی ہے بیوقوف پیتل کو سونا سمجھکر میرے جال میں پھنس گئی۔ دنیا کہتی ہے کیرکٹر پیدا کرو لیکن میں کیرکٹر کو لیکر کیا چاٹوں اس سے اونچا تو روپیہ ہے! روپیہ!! روپیہ!!! اب تک زندگی کا یہی مقصد رہا اور جب تک میرا شیطان میری مدد کر رہا ہے اسی اصول پر چلوں گا۔ میں بھی خوب ہوں جو ملتا ہے اُسے پھانس لیتا ہوں اور اس وقت تک اپنے خلوص کا اظہار کرتا ہوں جب تک کہ اس کی جیب خالی نہ کر دوں۔ مکر و دغا میرا ایمان ہے اور روپیہ میرا خدا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اپنے محسن کو دھوکا دینا میرا فرض ہے۔ میرے عزم اور استقلال کے آگے فاصلہ کوئی چیز نہیں۔۔۔۔۔۔ کلکتہ سے۔۔۔۔۔ گڑھ۔ گڑھ سے ۔۔۔۔۔۔۔ ر آباد۔ اور ر آباد سے قطب صاحب کی لاٹ کے پاس۔ اور آگے خدا جانے کہاں کہاں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

یہ اس دلچسپ کتاب کا **اقتباس** ہے جس کو ۔۔۔۔۔۔ صاحب لکھنوی لکھ رہے ہیں۔ یعنی وہ ایک ایسے بدمعاش کی زندگی کا ناول ہے جو ہمیشہ ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتا رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔ ادیبوں کو ادیب بن کر، طلبا و استادانِ یونیورسٹی کو ایک اچھا ذہین طالبعلم بن کر دوستوں کو ایک اچھا دوست بن کر، نوجوان لڑکیوں کو ایک وفا پرست عاشق بن کر، وطن پرستوں کو فدائے ملت و وطن بن کر، اشتراکی کارکنوں کو خالص دشمن سرمایہ داری بن کر، غیر ملکی زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود اُس کا فرضی ادیب بن کر بڑے بڑے مولویوں پر اپنی کالی کالی زلفوں اور رسیلی آنکھوں کا جادو ڈال کر لوٹتا اور دھوکا دیتا رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔

کتاب از حد دلچسپ ہوگی۔ صفحات ۲۰۰ قیمت **صرف بارہ آنے** علاوہ محصول ڈاک۔ ملنے کا پتہ۔ **مینیجر کلیم بک ڈپو فتح پوری کٹڑہ بڑیاں دہلی**

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدرِ اعظم سے کہا "دُنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں، تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کرسکوں۔ تعمیلِ حکم کے لئے فردوس مثال کشمیر، جنت نظیر سوئزرلینڈ، شباب انگیز تسمانیہ، اور گل پاش مرغزاروں میں گل چینی کی گئی .... جب سب پھول دُور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے، تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے اور باقی اس قدر مُرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی حُسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی، مہارانی اس خواہش کو پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی کھانا پینا ترک کردیا، مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا اور وزراء سے مشورہ طلب کیا۔ مہتمم توشہ خانہ نے "اصغر علی محمد علی" سے عطر منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی، فوراً عمل کیا گیا جب عطر آیا تو مہارانی کا شبابِ رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا۔



اصغر علی محمد علی، تاجرانِ عطر، لکھنؤ، دہلی

REGD No. L. 3694



ملنے کا پتہ: مینیجر کلیم بک ڈپو کٹرہ بڑیاں فتح پوری دہلی


کلیم
مدیر: جوش ملیح آبادی



زینتھ لائف

چیرمین ۔ آنریبل سر ہومی مہتہ

جنرل منیجر مسٹر بہرام جی ۔ ہرمزجی

تحفظ

انشورنس

صدر مشاورۃ ۔ مسٹر جی ۔ ایس ۔ مراٹھی
ایم اے ۔ اے ۔ آئی ۔ اے

ہیڈ آفس ۔ اپا اسٹریٹ ، ساؤتھ
فورٹ ، بمبئی

خوش معاملگی

کمپنی لمیٹڈ

سکرٹری ۔ مسٹر ایم ۔ آئی ۔ ڈکشٹ
بی اے ۔ ایل ایل بی ،

سپرنٹنڈنٹ برانچس ، مسٹر بی اے ۔ انصاری
کورونیشن ہوٹل بلڈنگ دہلی

دیانتداری

بمبئی

اعتماد

دی

ایورِی مین پالیسی

نے

پبلک کی آنکھیں کھول دی ہیں ، اور ہندوستان بھر کی دنیائے بیمہ میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے

بحالت بیماری کوئی چندہ دینا نہیں پڑتا ، بلکہ ہر ماہ ایک معقول رقم بطور امداد ملتی ہے



" کلیم " دہلی



تجھہ سا حسین ناخدا اور یہ رات چاندنی

" سید "

بنام قوت و حیات

کلیم

جملہ حقوق محفوظ ہیں

سالانہ چندہ ۶ر

ششماہی چندہ ۳ر

قیمت فی پرچہ ۹ر

مدیر

جوش ملیح آبادی

نائب مدیر

سید مطلبی فریدآبادی

اردو زبان کا ہر جہت سے سب سے زیادہ قیمتی ماہ نامہ

جلد ۱ — فہرست مضامین ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۶ء — نمبر ۳

اشارات

(جوش ملیح آبادی)

(۱) ملک کے نامور فرزند شری آربندو کا مضمون "شاعری کی اصلی اور امتیازی خصوصیات" کی سرخی سے اس نمبر میں شائع ہو رہا ہے جس کے واسطے میں بی۔ پی ورما صاحب کا دل سے شکر گذار ہوں۔

مضمون شروع سے آخر تک نہایت بلند پایہ ہے۔ اور ایسے لطیف نکات پر مشتمل ہے، جن تک عوام کیا، خواص تک کی نظر نہیں جاتی۔ کاش ہمارے شعرائے کرام توجہ فرمائیں۔

شری آربندو کا طرز تحریر جس قدر حکیمانہ ہے، وہ اس اہم مضمون سے ظاہر ہے موصوف نے معیار شاعری کی جن بلند فلسفیانہ موشگافیوں سے توضیح کی ہے، وہ قابل غور ہیں۔

میں ورما صاحب کے اس کرم کا شکر گذار ہوں۔ اور ان کی خدمت میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ براہ کرم اس سلسلے کو قائم رکھیں۔ اور شری آربندو کی خدمت تک بھی میری یہی آرزو پہنچا دیں۔

(۲) اس نمبر کے ذریعے میں آج روشناس کراتا ہوں اس فرد کو جو "سیکڑوں قابل شہرت ہیں کہ مشہور نہیں" کا مصداق ہے۔

متین الدین صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ، ایک نہایت کامیاب وکیل کی حیثیت سے تمام شہر میں معروف ہیں، مگر یہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ شاعر، اور کس پائے کے شاعر ہیں

بات یہ ہے کہ متین صاحب حد سے زیادہ خاموش اور شہرت سے بھاگنے والے انسان ہیں۔ اور پسند نہیں کرتے کہ دنیا انہیں شاعر کی طرح جانے۔ معلوم نہیں وہ اس باب میں کہاں تک راستی پر ہیں۔

اس نمبر میں ان کی دو نظمیں، .... شائع ہو رہی ہیں۔ وہ نظمیں جو انہوں نے خود اپنے ہی لئے کہی تھیں، آج خلوت سے جلوت میں آ رہی ہیں۔

آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ کم مشقی، اور اس کے اثرات کے باوصف متین صاحب کے کلام میں حقیقی شاعری کی بجلیاں کیونکر چمک رہی ہیں، اور یہ معلوم ہوتا ہے گویا حافظ اور نظیری کی روح اردو قالب میں بول رہی ہے۔

وہ جس طرح ایک اچھے شاعر ہیں، اسی طرح ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ اور یہ میرے اس قول کی تصدیق ہے کہ اچھا شاعر، کبھی برا آدمی نہیں ہو سکتا۔

(۳) اس نمبر میں آپ "آدم و حوا" کی تصویر ملاحظہ فرمائیں گے، پہلے "آدم و حوا" کے متعلق دو حرف سن لیجئے،۔

آدم کوئی معمولی انسان نہ تھے، آدم نے کسی برے ماحول میں پرورش نہیں پائی تھی۔ آدم ابوالبشر تھے یعنی پہلے انسان تھے، اس لئے ان کے بارے میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے سرتابی اور گناہ کا جوہر اپنے آباؤ اجداد سے وراثت میں پایا تھا، اسی کے دوش بدوش آدم "پیغمبر" بھی تھے، یعنی وہ کسی دنیوی شاہنشاہ کے سفیر نہ تھے۔۔ بلکہ اس خالق ارض و سما کے وزیر تھے، جس کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔

اب اس بات کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے، آدم کو نصیحت کی جاتی ہے کہ شجر ممنوع کے پاس بھی نہ پھٹکنا، نصیحت کسی فرشتے یا جن کے وسیلے سے نہیں کی جاتی، بلکہ خود پروردگار عالم براہ راست نصیحت فرماتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ یہ اہتمام بلیغ بھی کرتا ہے کہ آدم کے "عدو ئے مبین" کو بھی پہنچوا دیتا ہے۔ کہ دیکھو یہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے، یہ تمہیں دھوکا دے گا۔ خبردار اس کے فریب میں نہ آنا۔

آپ معاملے کی نزاکت کو سمجھے؟ رب کائنات براہ راست نصیحت کرتا ہے کہ

کو؟ پیغمبر کو۔ کہاں؟ عصمت وطہارت کے آغوش یعنی جنت میں۔ اور اسی کے ساتھ دشمن کو بھی دکھا دیتا ہے۔ کہ دیکھو اس سے ہوشیار رہنا ———— لیکن پھر ہوتا کیا ہے؟ آدم، ابوالبشر، اور پیغمبر ہونے کے باوجود، اور پروردگار عالم کی سبق لینے کے باوصف شجرِ ممنوع سے ہم آغوش ہوکر ہی دم لیتے ہیں۔

آخر یہ ذوقِ گناہ کہاں سے آیا؟ یہ جذبہ سرتابی کس کا عطیہ تھا؟

اگر یہ کہا جائے کہ "عدو نے مبین" نے آدم پر غلبہ حاصل کرلیا، اور فریب دینے میں کامیاب ہوگیا۔ تو میں پوچھوں گا، آدم میں فریب کھانے اور اس آسانی سے فریب کھانے کی صلاحیت کا ذمہ دار کون ہے؟

آخر پروردگار عالم کی نصیحت کے اثر پر کھلے ہوئے دشمن کا فریب کیوں غالب آگیا؟ کیا آدم کے دل کی ساخت ہی ایسی تھی، کہ اس پر اپنے رب کے الفاظ کا نقش اتنا گہرا نہیں بن سکتا تھا، جتنا دشمن کے الفاظ کا؟

کون کہہ سکتا ہے کہ حقیقت کیا تھی؟ مگر اتنا ضرور معلوم ہے۔ کہ ہم کیا ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اگر حضرت آدم جنت میں گناہ نہ کرتے تو زمین پر نہ پھینکے جاتے، اور اگر زمین پر نہ پھینکے جاتے تو اس زمین کی خلافت اور نیابت الٰہی کا تاج بھی نہ پہن سکتے۔

اور اگر آدم کے سر پر خلافتِ ارض اور نیابت الٰہی کا تاج نہ جگمگاتا، تو پھر یہ دنیا پیغمبروں۔ اوتاروں، اور آسمانی کتابوں کی روشنی سے بھی محروم رہ جاتی۔

غور کیجئے آدم کے ذوقِ گناہ کی عظمت پر، کہ وہ کتنی بلندیوں اور پاکیوں کا سرچشمہ بن گیا۔

گرداب سے کھیل کر ابھرنے والے ممنوع شجر سے لے توڑنے والے
اِس ارض کا تحفۂ خلافت ہو قبول فردوس میں اے گناہ کرنے والے

زندہ باد انجامِ سرتابی! پائندہ باد مآلِ عصیاں!

غلامی کے نظارے

(۴) بڑی بڑی باتیں تو سب کو نظر آتی ہیں، آیئے چھوٹی چھوٹی باتوں پر نگاہ کریں۔ اور دیکھیں کہ ہماری قوم کی ذہنی کیفیت کیا ہے؟

لوگ بڑے بڑے واقعات کو دیکھنے کے خوگر ہیں، حالانکہ اس ناقابل فہم دنیا میں ہر معمولی سا واقعہ بھی ایک زبردست سانحہ، اور ہر چھوٹی سی بات بھی ایک عظیم حادثہ ہے۔

پہاڑوں کو سب دیکھتے ہیں، حالانکہ ایک ذرّے میں بھی وہ سب کچھ موجود ہے، جو پہاڑ میں وسیع و بلند ہوکر نمایاں ہوگیا ہے۔ لوگ ہاتھی کو غور سے دیکھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ بظاہر حقیر سی چیونٹی میں بھی وہ سب موجود ہے، جو ہاتھی بن کر ظاہر ہوگیا ہے۔

پہلے میں آپ کو بازاروں میں لے چلوں گا۔

(الف) دیکھیئے یہ تمام دکانیں ہندوستانیوں ہی کی ہیں، اس سرے سے اس سرے تک نگاہ ڈال لیجئے۔ کہ تماشائی اور گاہک بھی تمام تر ہندوستانی ہی ہیں۔ جو پیدل چل رہے ہیں وہ بھی ہندوستانی ہیں۔ جو سواریوں میں گذر رہے ہیں وہ بھی ہندوستانی ہیں۔ اور جو سواریاں چلا رہے ہیں، وہ بھی سب کے سب ہندوستانی ہی ہیں۔ لیکن بازار کے اس شدت سے ہندوستانی ہونے کے باوجود، ذرا دوکانوں کے تختے (سائن بورڈ) ملاحظہ فرمایئے کہ سب کے سب انگریزی میں لکھے ہوئے ہیں۔

اگر آپ آنسو نہیں بہا سکتے، تو کم سے کم ایک ٹھنڈی سانس ہی بھر لیجئے۔

کیا ان دوکانوں کے بندوں کو حکومت نے انگریزی بورڈ لگانے پر مجبور کیا ہے یا ان کے مذہب نے دیسی زبان کے استعمال کو "لحمِ خنزیر" قرار دے کر حرام کردیا ہے؟

شاید یہ ہماری تجارت کے نمائندے، جو دراصل بدیشی تجارت ہی کے ایجنٹ ہیں یہ فرما دیں کہ اس ملک میں چونکہ انگریز فرمانروا ہیں اس لئے ان کی رعایت و آسانی کی خاطر انگریزی حروف کے بورڈ لگائے جاتے ہیں۔

لیکن یہ سراسر غلط بیانی ہے، یا کم سے کم غلامانہ نفس کا ایک فریب ہے جو خود اپنی ہی ذات کو دیا جارہا ہے۔

سنیئے، اول تو پورے ہندوستان میں انگریزوں کی آبادی ہی کتنی ہے اس کے علاوہ ہر بڑے شہر میں خود انگریزی دوکانیں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ اور انگریز قوم کا یہ ایک زبردست اصول ہے کہ سودا خواہ کتنا ہی گراں کیوں نہ پڑے وہ ہمیشہ اپنے ہم قوموں ہی کی دوکانوں میں خریداری کرتی ہے۔ بعض کم حیثیت یا بخیل قسم کے انگریز کبھی کبھی ہماری دوکانوں کی طرف ضرور چلے آتے ہیں، لیکن ان کی یہ گاہ گاہ کی آمد ہرگز اس حد کی اہم نہیں ہوسکتی کہ لاکھوں اور کروڑوں مستقل ہندوستانی گاہکوں کی اہمیت کو پسِ پشت ڈال کر اپنی زبان میں بورڈ لگانا ہی ترک کردیا جائے۔

یاد رکھیئے، جو قوم اپنوں کی عزت نہیں کرتی اور اپنی زبان کو حقیر سمجھتی ہے، وہ آزاد ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔

خیر یہ تو بڑے شہروں کا ذکر تھا، آیئے ذرا اپنے قصبوں اور دیہاتوں کے بازار

کی سیر کریں۔ جہاں ایک انگریز بھی نہیں رہتا۔ اور نہ برسوں اُدھر سے کوئی انگریز گذرتا ہی ہے۔ اس کے علاوہ ان دوکانوں میں جو مال ہوتا ہے وہ اس شدت کے ساتھ ٹھیٹ ہندوستانی ہوتا ہے کہ انگریز اس سے واقف بھی نہیں ہوتے، لیکن ماتم کرنے کا مقام ہے کہ وہاں بھی اکثر بورڈ آپ کو انگریزی ہی میں ملینگے۔

اس سلسلے میں ایک سب سے زیادہ مضحک اور شرمناک صورت حال اور بھی ملاحظہ فرمالیجئے یعنی آپ کی بہت سی دوکانوں پر، دوسا بورڈ بھی نظر آتے ہیں، لیکن آپ خوش نہ ہوں۔ بلکہ رو دیں، اس لئے کہ وہ ہوتے تو ہیں اردو حروف میں لیکن ان کے الفاظ تمامتر انگریزی ہی ہوتے ہیں۔

"دی فائن آرٹ گیلری" "دی جبلانی کلاتھ مرچنٹس" "دی قنوج پرفیومریز" "دی گنڈ بوٹ فیکٹری"۔

کوئی ان دشمنان عقل و خرد اور غلامان مادرزادے پوچھے کہ لے دانشمندو تم نے یہ بورڈ کس قوم کی خاطر آویزاں کئے ہیں۔

انگریزوں کی خاطر؟ انگریز تو اس کا ایک حرف بھی نہیں پڑھ سکتا۔

انگریزی داں ہندوستانیوں کی خاطر؟ وہ تو انگریزی ہی میں پڑھ سکتے تھے۔

انگریزی سے ناواقف ہندوستانیوں کے لئے؟ ہاں اسی کو عقل کی آنکھیں پھوٹ جانا کہتے ہیں، اور یوں نہیں کیا جاتا ہے اپنی دوں فطری کا اعلان۔

(ب) اب بازار سے آیئے اپنے "تعلیم یافتہ طبقہ" میں۔

اس بحث کو سردست چھوڑیئے کہ اس گروہ کو "تعلیم یافتہ" کہہ بھی سکتے ہیں؟ اور سردست اس سوال کو بھی نہ اٹھایئے کہ انہیں سند یافتہ جاہل کیوں نہ کہا جائے، اس وقت تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے تاجروں کے مقابلے میں ان کی ذہنیت کتنی بلند ہے۔

ذرا نظر اٹھا کر دیکھیے، یہ ایک "تعلیم یافتہ" نوجوان گریجویٹ آپ کے سامنے کھڑا ہوا پائپ پی رہا ہے، کوٹ، پتلون، ٹائی، کالر، اور ہیٹ، سیاہ چمکتا ہوا جوتہ، قمیص کے سخت کف کوٹ کی آستینوں سے جھلکتے، اور رنگین رومال کا ایک کونا کوٹ کی جیب سے جھانکتا ہوا، اور جیب میں نامنظور شدہ درخواستوں کا انبار، یہ لیجئے اس کا ایک دوست آتا ہے، اور انگریزی میں بات چیت ہوتے ہوتے اردو یوں شروع ہوتی ہے "کل رات سے میری وائف کو ہیڈک بہت اپ سٹ کئے ہوئے تھے"۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا تھا، انہوں نے جو دوا پریسکرائیب کی ہے اسے لینے جا رہا ہوں۔ کہا تمہارے فادر کی ہیلتھ اب کیسی ہے، سنا ہے وہ لانگ لیو پر آؤٹنگ کے واسطے جانے والے ہیں"۔

میں پوچھتا ہوں "وائف" کے عوض "بیوی" کہنے سے کیا ان کی اہلیہ محترمہ بے پردہ ہو جائیں؟ اور "فادر" کے بدلے "باپ" کہنے سے کیا ان کے والد بزرگوار کی عزت اور ان کے تن و توش میں کوئی کمی آجاتی؟

دیکھیے چند "تعلیم یافتہ" چائے پی رہے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے، انگریز چائے میں شکر کم استعمال کرتے ہیں۔ میزبان دریافت کرتا ہے "ول مسٹر محمود! اُو مچ شوگر"؟ اور مسٹر محمود سفید کالر میں اپنی کالی گردن کو فرنگیوں کی طرح جھٹک کر فرماتے ہیں، صرف ایک "ٹی سپون فل" اور یہ کہتے ہی اپنے گرد و پیش بیٹھے ہوئے احباب کو فخر کے ساتھ دیکھ کر جیب سے نکلے ہوئے رومال کے کونے پر نگاہیں جما لیتے ہیں

اب ذرا ناموں کی کتر بیونت ملاحظہ ہو۔

حضرت کا نام ہے، زاہد علی جعفری۔ مگر لکھینگے، "زڈ۔ اے۔ جعفری" نام ہے تجمل حسین رضوی، تحریر فرمائیں گے "ٹی، ایچ، رضوی" اور اگر اسم گرامی ہے طاہر بیگ قادری، تو حضرت اچھے خاصے "ٹی، بی، قادری" بن کر رہ جائیں گے۔

انگریزوں میں ایک دیا سلائی سے تین سگرٹ جلانا فال بد سمجھا جاتا ہے۔ یہ حضرات ان کے اوہام کے بھی ورثائے حقیقی واقع ہوئے ہیں، ایک دیا سلائی سے دو سگرٹ جلاتے ہی ایک خاص فخر آمیز آواز کے ساتھ "پھو" کی آواز نکال کر دیا سلائی بجھا دی جاتی ہے۔ اور اس کے بجھتے ہی ان کی آنکھوں میں غرور تہذیب کا شعلہ تھرتھرانے لگتا ہے۔

اکثر انگریزوں اور بالخصوص میموں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ اثنائے کلام میں وہ اپنے شانوں کو ایک ادائے خاص سے جھٹک دیا کرتی ہیں۔ چنانچہ یہ چیز بھی ہمارے "تعلیم یافتہ" حضرات نے خیر سے چرالی ہے، اور خواہ موقع ہو کہ نہ ہو یہ غریب اثنائے گفتگو میں برابر اپنے شانے جھٹکتے رہتے ہیں۔

ہمارا سب سے بہتر لباس خواب ڈھیلے پائجامے اور کرتے ہو سکتے ہیں، مگر آپ جس مغرب گزیدہ کی خواب گاہ میں جائیں گے، تو حسرت کے ساتھ دیکھیں گے کہ دھاریوں والے پتلون کی میانی ایک کھونٹے سے کوٹ کے نیچے لٹکی ہوئی ہے۔ (باقی آئندہ)

---

(۵) افسوس کہ بعض موانع کے باعث حضرت آزاد انصاری سردست حیدرآباد کی سکونت ترک نہیں فرما سکتے، اس لئے میں نے اپنے مخلص دوست جناب مُطلبی صاحب فریدآبادی سے درخواست کی کہ وہ نائب مدیر کے فرائض انجام دیں۔ جسے انہوں نے براہ کرم منظور فرمالیا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ "کلیم"، ان کی بے پناہ قوت عمل کے طفیل نہایت حسن و خوبی کے ساتھ چلے گا۔

رفتارِ وقت

(ادارۂ کلیم)

نئے شہنشاہ انگلستان اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کی رسم تاجپوشی کے متعلق اعلان کردیا گیا ہے۔ کہ شہنشاہ سابق کے سوگ کا زمانہ ختم ہونے کے بعد اول انگلستان میں ادا کی جائے گی، اور پھر ۱۹۳۸ء میں شہنشاہ معظم سرزمین ہند میں بھی اس رسم کی ادائیگی کے لئے رونق افروز ہوں گے۔

یورپ آجکل عجیب حالات میں سے گذر رہا ہے۔ مسولینی کے اقتدار کے متزلزل ہونے کا قوی اندیشہ ظاہر کیا جارہا ہے۔ سپین میں روز بروز ایک اشتراکی حکومت کے قیام کے امکانات قوی تر ہوتے جارہے ہیں۔ گو اٹلی و حبش کی آویزش نے یورپ کے دو مشہور مدبر دل مینی سر سیموئیل ہور وزیر خارجہ انگلستان و ایم لاول وزیر خارجہ فرانس کو اپنی کرسیاں چھوڑنے پر مجبور کردیا ہے، لیکن تیل کی بندش خواب و خیال بن کر رہ گئی ہے۔ اور سنا جاتا ہے کہ حکومت فرانس اب پھر اٹلی سے آخری شرائط صلح طلب کر رہی ہے۔

مجلس اقوام کی پول گو قضیہ جاپان و چین سے ہی کھل گئی تھی، لیکن ہنگامۂ حبشہ نے اس کی رہی سہی قلعی اور کھول کر رکھدی، اور دنیا سمجھ گئی کہ وہ محض کمزوروں کو ہڑپ کرنے کا ڈھکوسلہ ہے۔ اور زبردست کے استحصال بالجبر کا اس کے پاس سوائے خاموشی کے اور کوئی علاج نہیں ہے۔

جس قدر اٹلی میں مسولینی کا اقتدار غیر مستقل معلوم ہو رہا ہے، اسی قدر جرمنی میں ہر ہٹلر کی قوت اور اقتدار میں استحکام نظر آتا ہے۔ اور نازی پارٹی نہ صرف جرمنی بلکہ آسٹریا ہنگری اور سوئٹزرلینڈ میں اپنے پنجے پھیلانے کی کوشش کر رہی ہے۔

فرانس اپنے ہمسایہ جرمنی کی جنگی تیاریوں کو نہایت اشتباہ کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ فرانس اور جرمنی کی مسلسل رقابت اور دشمنی ہی مسولینی کے حبش پر استحصال کی ذمہ دار ہے، فرانس کوئی ایسا عملی اقدام انگلستان کی دوستی میں (جو اس کے لئے بہت قیمتی ہے) کرنے سے قاصر ہے۔ جو اس کو جرمنی کے علاوہ کسی اور حریف سے بھی الجھادے۔ اور جرمنی خطرے کو کم کرنے کے لئے روز بروز سوویٹ روس کے ساتھ سلسلۂ اخوت مستحکم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

جرمنی صرف فرانس کے لئے ہی اندیشہ کا باعث نہیں ہے۔ بلکہ اس کی روز افزوں جنگی تیاریاں روس کے لئے بھی خطرے کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ اور بالخصوص اب جبکہ جاپان اور روس کے مفاد چین کے سرسبز میدانوں میں متصادم ہو رہے ہیں اور جرمنی جاپان سے رشتۂ اخوت روز بروز استوار کر رہا ہے۔ روس یہ سمجھنے میں حق بجانب ہے کہ اس کو ایک ہی وقت میں یورپی حریف اور ایشیائی دشمن سے جنگ آزمائی کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے، چنانچہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ روس ایک کروڑ انسانوں کے ٹڈی دل کو مسلح کرنے کا انتظام کر رہا ہے۔

گو یہ بات اب صاف طور سے عیاں ہوچکی ہے کہ حبشہ اور اٹلی کی وہ جنگ جو میکالے کے قریب ۱۰ فروری سے شروع ہوئی تھی، کئی روز کی خوں فشاں کشمکش کے بعد حبش کی شکست کی صورت میں منتج ہوئی۔ اور امبا ایرادم کی بلندیوں پر اٹلی نے قبضہ کرلیا۔ تاہم جنگ کے اختتام کے آثار ابھی تک رونما نہیں ہوتے ہیں۔ اور گو اٹلی ابھی تک پوری آزادی کے ساتھ نہر سویز سے اپنی فوجیں و سامان حرب حبشہ میں بھیجتا رہا ہے۔ اس کے ذرائع جنگ بھی کافی وسیع ہیں۔ لیکن دفاع ملک کا جذبہ حبشیوں کو ایسی شکستوں سے مایوس نہیں کرسکتا، وہ برابر ایک ایک انچ زمین پر اپنی جانیں فدا کر رہے ہیں۔ اور سامان حرب و ضرب بھی ان کو ہر چہار طرف سے حاصل ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی یورپ کی وہ سوداگر اقوام جن کے اغراض اٹلی کو حبش پر پوری طرح قابض نہیں دیکھ سکتے، حبش کو ہر اخلاقی مدد

اور سہارا دینے میں مشغول ہیں۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ حبش کی قوتِ مدافعت یا اٹلی کی دراندازی کی طاقت جلد ختم ہو سکے گی۔

مشرق قریب میں دول یورپ کی اپنی خود ساختہ وفاقی حکومتوں میں استخلاصِ وطن کے نعرے بلند ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ . . . . فلسطین کو وطن یہود بنانے کے خلاف فلسطینی اقوام جدوجہد کرتی نظر آ رہی ہیں۔ مصر میں وفد پارٹی پھر مصروف کار ہے۔ مدرسے بند کئے جاتے ہیں۔ طلبا و طلبات برسرِ شورش ہیں۔ بلوے بھی ہو رہے ہیں۔ گولیاں بھی چلائی جا رہی ہیں، غرض مصر کو وہی جواب دیا جا رہا ہے، جو ہر محکوم کو اس کے دعوائے استخلاص وطن پر ملا کرتا ہے۔

الجزائر۔ تونس، مراکو میں بھی آزادی وطن کا جذبہ عام ہے۔ اور فرانسیسی حکومت اس کو آجکل پوری حاکمانہ تدبیر و قوت سے کچلنے میں مصروف ہے۔

اتاترک ایک طرف بلقانی ریاستوں کو ایک ہی لڑی میں پرونے میں مصروف ہے۔ اور دوسری جانب وہ مسلم ایشیا کی شیرازہ بندی کا انتظام کر رہا ہے۔ ایران و عراق، حجاز و افغانستان و ترکی مواخید و سواخات کی قرار دادوں سے منسلک کئے جا رہے ہیں۔

مشرق بعید تین حریف ممالک کی حوصلہ مندیوں کا آماجگاہ اور رقابتوں کا میدان بنا ہوا ہے۔ جاپان چین کو بلا شرکت غیرے صاف نگل جانا چاہتا ہے لیکن امریکہ اور روس ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کے پورا ہونے میں زبردست روک بنے ہوئے ہیں اور اس امر کا نہایت یقینی امکان ہے کہ وہ آئندہ ہونے والی جنگ میں، جو جلد یا بدیر جنگ روس و جاپان کی صورت میں چینی منگولیا کی حدود پر برپا ہونے کے لئے منڈلا رہی ہے، متحدہ محاذ پیش کریں گے۔ اور اگر اس وقت جرمنی اور اٹلی نے جاپان کی، اور فرانس نے روس کی معیت اختیار کی۔ جو آخر کار انگلستان کو بھی کسی نہ کسی طرف مل جانے کے لئے مجبور کر دے گی تو کرۂ ارض ایک ایسے خوں ریز تصادم کا نمونہ پیش کرے گا، جو مستقبل میں آنے والی نسلوں کو کبھی نہ بھولے گا۔ اور جو زمانہ ماضی کی تمام خوں باریوں کی یاد کو صفحۂ تاریخ عالم سے اگر بالکل محو نہ کر سکے گا، تب بھی مدھم ضرور کر دے گا۔

آؤ ذرا ہندوستان کی طرف بھی رخ کریں اور دیکھیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے، اور سمجھیں کہ اہل ہند کیا کر رہے ہیں۔ جبکہ دنیا کا ہر ملک ایک عظیم الشان امتحان میں اپنے کو ڈال کر اپنی عزت و اقتدار کو وسیع اور مستحکم کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

کہنا چاہیئے کہ آجکل کا سارا تعلیم یافتہ اور متمول ہندوستان آنیوالے انتخابات کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ وزارتوں کے خواب دیکھے جا رہے ہیں۔ اور ان خوابوں کی کامیاب تعبیریں حاصل کرنے کے لئے نت نئے سانگ کھیلے جا رہے ہیں۔ اور طرح طرح کے روپ بھرے جا رہے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی آوازیں ان ہی ہونٹوں سے بلند کی جا رہی ہیں جنہوں نے ہمیشہ ہندو مسلم اختلافات کی خلیج کو وسیع کیا ہے۔ کاش کوئی ان سے کہہ دے کہ:- ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

ڈاکٹر امبیدکار کے اعلان عزم تبدیل مذہب سے ہندوستان کی فضا ابھی تک گونج رہی ہے، اور اس نے سیاسی "ہندو استھان" میں جو ارتعاش ایک سیاسی اور مذہبی تخیل کے تصادم سے پیدا کر دیا ہے وہ بھی کم نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ بنارس یونیورسٹی کا مشہور معمار، ہندو سیاست کا مایۂ ناز مفکر اور قدیم تہذیب ہنود کا مشہور زمانہ محافظ تک قدامت پسند ہندوؤں کے متعصبانہ حملے کا شکار ہوتا نظر آتا ہے۔

"اچھوت ہندو ہیں، اور انہیں ہندو ہی رہنا چاہیئے"۔ "مسیحیت ہی میں اچھوت اقوام کو راحت نصیب ہوگی"۔ "اسلام اور صرف اسلام ہی وہ خداوندی کنبہ ہے جہاں شاہ و گدا کو ایک ہی صف میں جگہ مل سکتی ہے"۔ یہ آوازیں ہیں جن میں گو اب پہلی سی شورا شوری تو نہیں رہی لیکن بالکل بے نمکی بھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔

ہم یہ تو ہرگز نہیں کہتے کہ اچھوتوں کو ہندو ہندو نہ بنائیں، یا مسلمان انہیں مسلمان، اور عیسائی ان کو عیسائی بنانے کی کوشش نہ کریں۔ مگر ان حضرات سے یہ پوچھنے کو دل چاہتا ہے کہ کیا اچھوتوں کی اصلی بیماریاں، غربت، افلاس اور جہالت، تبدیلی مذہب سے جاتی رہیں گی؟ جس کے باعث اونچی ذاتوں کے ہندو مسلمان اور عیسائی روز بروز اچھوتوں کے برابر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اس طرح فطرت کی انقلابی مشین ایک ایسے کنبے کی تدریجی تاسیس میں مصروف ہے، جس سے ہندوستان میں کچھ بہت دیر بعد نہیں بلکہ بہت جلد اس جماعتی آویزش (class war) کے تباہ کن جھگڑے چلنے کا، امکان قریب ہوتا جاتا ہے جس نے آجکل دوسرے متمدن ممالک میں تہذیب و تمدن کی بیخ و بن میں زلزلہ ڈال دیا ہے۔ —— ڈاکٹر امبیدکار کی چوکھٹ پر تو آج ہر مقتدر مذہبی و سیاسی لیڈر سجدے کرنے کو تیار ہے اور کر رہا ہے لیکن کیا کوئی اس کے لئے بھی تیار ہے۔ کہ خود اپنے ہم مذہب و ہم قوم مفلوک بھائیوں کی فلاکت اور تباہ کن غربت کی چھوت دور کرنے کا مداوا کرے افسوس کہ اس کے لئے کوئی تیار نہیں۔ حق رائے دہندگی ہندوستانیوں کو جب

سے ملا ہے اچھوت اقوام کی بھی دوسرے غریبوں کی طرح پوچھ ہونے لگی ہے۔ اور ہندو و مسلمان زعمار اپنی اپنی تعداد آبادی کو بڑھانے کی دھن میں لگ گئے ہیں۔ کونسل اور اسمبلی میں تناسب آبادی کے لحاظ ہی سے ہر فرقہ کی نمایندگی ہوتی ہے۔ شدھی اشاعت مذہب وغیرہ کی شورش اسی "تناسب نمایندگی" کی پیداوار ہے۔ اور یہ مسئلہ "تبدیلی مذہب اچھوت اقوام" وہ نوزائیدہ مولود مسعود ہے، جس نے دوسری گول میز کانفرنس کی تقریب سعید پر سیاسیات ہند و فرنگ کے اختلاط سے شکم مادر میں جنم لیا تھا۔

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی صدارت کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو کا نام تجویز کیا جا چکا ہے۔ اور وزارتوں کے قبول کرنے یا نہ قبول کرنے کا مسئلہ بھی اس مشہور قائد وطنیت کی صدارت میں طے ہونے والا ہے۔ جو گو اشتراکی نصب العین سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا، لیکن اس گروہ اشتراکین کے افکار سے کسی قدر مانوس بتایا جاتا ہے جو آئین پسند حقوق طلب کہلاتے ہیں۔ اور انتہا پسند اشتراکیوں کی نظر میں مذبذبین سے زیادہ نہیں ہیں۔ پنڈت جواہر لال کی صدارت کی خبر کے ساتھ اگر یہ خبر بھی ملا کر پڑھی جائے کہ "مہاتما گاندھی پھر گوشہ نشینی ترک کر کے میدان سیاست میں تشریف لا رہے ہیں" تو کانگرس کمیٹی کی آیندہ سیاست میں اس انتہا پسندانہ اقدام کا قطعاً امکان نہیں رہتا جو بعض سیاسیین سمجھے بیٹھے ہیں۔ وہی چرخے کی روں روں ہوگی یا دیہات سدھار و اچھوت ادھار کا شور جس کا ہندوستان ایک دو سال سے نہیں، بلکہ برسوں سے مشاہدہ کر رہا ہے۔

یہ اجلاس آل انڈیا کانگریس بہت ممکن ہے کہ اس ہندوستانی سیاسی جماعت کے قطعی دو ٹکڑے کر دے، کیونکہ "اشتراکی کانگرسی" اس کو کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ کانگریس وزارتیں سنبھال بیٹھے۔ اور آزادی ہند کی عملی جد و جہد سے، جس کو وہ کچھ عرصہ سے بالکل خیرباد کہہ چکی ہے۔ اور کوئی صحیح تعمیری یا تخریبی کام نہیں کر رہی ہے، بالکل دست بردار ہو جائے لیکن آجکل کانگرس کی اکثریت کی باگ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے، جو وزارت کی حسین نازک ادا پری کے خیر مقدم کیلئے آغوش کھولے منتظر ہیں، اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں ؎

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی

بے حجابانہ درے محفل ما باز آئی

گذشتہ اقتصادی تباہی اور بدحالی نے، اشتراکیت کو بھی ہندوستان سے روشناس کرا دیا ہے اور وہ افکار جو صرف یورپ کے نوجوانوں کے افکار سمجھے جاتے تھے، اقدامات کی صورتیں اختیار کر رہے ہیں، تمام ہندوستان کے صوبوں میں باوجود حکومت کی ان جوابی کارروائیوں کے نمایاں ہو رہا ہے جو اشتراکی خیالات کی تشہیر کرنیوالی مطبوعات کی ضبطیوں، اشتراکی سرزمین کی گرفتاریوں کی خبروں سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔

اشتراکیت کی روک تھام نہ صرف دشمنان اشتراکیت و عاشقان سرمایہ داری ضروری سمجھتے ہیں۔ بلکہ ان ہندوستانیوں کو بھی اشتراکی کشمکش کی خبر دکھ دینے والی ہے جو گو مفلس ہیں، مگر اس قدر افلاس کی تلخیوں سے لذت آشنا ہو چکے ہیں، کہ اس میں ایک قسم کا راحت بخش سکون محسوس کرتے ہیں۔ اور دست و پا کی حرکت و جد و جہد تو رہی ایک طرف، وہ کسی خیالی تصور کشمکش کو بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، اس لئے ہندوستان کی سرزمین میں اشتراکیت کے متعلق کہہ دینا کہ وہ اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوگی یا ناکام، بہت دشوار ہے۔

یہ سب صحیح لیکن ساری دنیا میں جس تیزی اور عجلت سے نئی تبدیلی کے آثار پائے جاتے ہیں اس کے مقابلہ میں ہندوستان پر ایسا سکون و جمود طاری ہے کہ بعض دفعہ یہ ڈر لگنے لگتا ہے کہ کہیں ہمارا تعلق اس کرۂ ارض سے منقطع کر کے کسی اور کرے سے تو قائم نہیں کر دیا گیا ہے، کہ

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

"م"

رباعی

گلشن کی روش روش پہ اتراتا ہوا چل

پست ہو کہ ہو رہگذر اتراتا ہوا چل

مل خاک میں مل جا پہ یگانۂ زر و شباب

جوشؔ آج تو بانکپن دکھاتا ہوا چل

(جوشؔ)

کِس کو ہے کِس کی جستجو؟

شبِ ماہ میں حسین ناخدا کی کشتی دیکھ کر

اے صنمِ قمر جبیں، نازشِ حُسن نازنیں، کھول دے زلفِ عنبریں
بحر کی آب وتاب دیکھ اے صنمِ قمر جبیں

بحر کی آب وتاب دیکھ، موج کا پیچ وتاب دیکھ بہتی ہوئی شراب دیکھ
تیر تا ماہتاب دیکھ نازشِ حُسن نازنیں

جلوۂ ذات چاندنی، مستِ صفات چاندنی آبِ حیات چاندنی
اک تو ترا شباب تو اُس پہ یہ رات چاندنی

جلوۂ حُسن کی ضیا، ماہ لقا، سمن برا دیکھا تھا پہلے کبھی بتا؟
تجھ سا حسین ناخدا اور یہ رات چاندنی

ماہ کی تجھ کو جستجو، مہ کو ہے تیری جستجو کِس کو ہے کِس کی جستجو؟

کچھ تو بتا دے کامنی ماہ سے ہو کے روبرو

اے صنمِ شگفتہ رُو، دیکھ اِدھر اُدھر نہ تُو کِس کو ہے کِس کی جستجو؟
صاف بتا دے کامنی دیکھ اِدھر اُدھر نہ تُو

کیا ہے بھلا یہ ماجرا؟ دونوں کا عکس ایک سا عکسوں کا رقص ایک سا
بہرِ خدا ذرا بتا کیا ہے بھلا یہ ماجرا

خواہ بتا کہ مت بتا، رہنے دے بس سمجھ گیا حُسن ہے منبعِ ضیا
عکس ہو دونوں حسن کا خواہ بتا کہ مت بتا

خواہ بتا دے کامنی خواہ بتا کہ مت بتا
ماہ سے ہو کے رُوبرو خواہ بتا دے کامنی

(سید مطلبی سیّد فرید آبادی)

شاعری کے اصلی و امتیازی خصوصیات

(حقیقت نگار شری اروندو کے قلم سے)

شاعری کی روح کی سی عمیق اور ناقابلِ تحدید شے کی تعریف کرنے کی کوشش بیشک ایک بے سود مشغلہ ہے۔ سرسوتی دیوی کے لاکھوں اور کروڑوں تاروں سے آراستہ حربتا (بربط) کو علمی تحلیل کی غرض سے ٹکڑے ٹکڑے کرنا محض تنگ نظری ہی نہیں بلکہ ایک فعلِ عبث ہے۔ تاہم اس امر سے کوئی انکار نہیں کرے گا کہ ہمیں کچھ ایسے نظریات اور بیانات کی ضرورت ہے جو ہماری راہِ تلاش میں شمع ہدایت کا کام کریں گے اور فنِ شاعری کے اصول قایم کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے۔

شاعری کے متعلق ہم دو عام غلط فہمیوں سے دوچار ہوا کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق معمولی غیر تربیت یافتہ ذہنیت سے ہے اور دوسری کا از حد تربیت یافتہ نقاد یا اشد ذہنی خاصہ رکھنے والے فن پرست یا صنّاع سے۔ معمولی ذہنیت کے نزدیک جو اس فن کا تصور محض سطحی طور پر کرسکتی ہے شاعری واہمۂ ادراک، اور سامعہ کی حسن پرستارانہ مسرت کا ایک وسیلہ یعنی وقت گزارنے کا ایک اعلیٰ ذریعہ ہے۔ فی الحقیقت اگر شاعری ایک تفنن کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے تو اُس کی رُوح کا تجسس، اُس کی اندرونی غرض و غائت کی تلاش، اور اُس کے عمیق تر قواعد و ضوابط کا تفحص نری تضیع اوقات ہوگی۔ ہر ایک خوشنما، طرب انگیز اور مسجع کلام جو ایک حسین اور لطیف خیال کا حامل ہو شعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم شاعری سے اُسی قدر مسرت کی امید رکھتے ہیں جیسی کہ اور تمام فنون سے۔ مگر یہ امر فراموش کرنے کے قابل نہیں کہ حواس ظاہری حتیٰ کہ حواس باطنی کی مسرت افزائی فنِ شاعری کا محض ابتدائی عنصر ہے۔ حواس ظاہری و باطنی شاعرانہ مسرت کے سچے اور اصلی ماخذ نہیں ہوتے۔ یہ فقط وسیلے اور آلۂ کار کا کام کرتے ہیں۔ رُوح ہی وہ تنہا شے ہے جو اصلی آفرینندہ ہے اور اصلی سامع بھی۔ ادراک، واہمہ، سامعہ اور جملہ حواس جس قدر سرعت و شفافی سے اپنا کارِ ترسیل انجام دیں گے اور اپنی علیحدہ خوشنودی کا مطالبہ جس قدر کم کریں گے اسی قدر زیادہ بلاواسطہ طریق پر کلام رُوح کے اندر پہنچکر پیوست ہو جائے گا اور نظم بھی عظیم الشان ہوگی۔ چنانچہ شاعری کا اعلیٰ ترین وظیفہ اس امر سے وابستہ ہے کہ وہ ان تمام آلاتِ ترسیل کی مسرت کو رُوح کی عمیق تر خوشنودی میں تبدیل کرے۔ جب ایک اعلیٰ درجے کا شاعر تمام انسانی مشکلات پر عبور حاصل کرکے اپنی اندرونی موزونیت کو اُبھارنے میں کامیاب ہوتا ہے اُس وقت جو سرور و انبساط اُس کے حصے میں آتا ہے وہ اسی آنند کا پرتو ہوتا ہے جسے ابتدائے آفرینش میں عالمگیر روح (Universal Soul) نے اپنے اندر سے ایک عظیم طاقت کو اُبھارنے اور عالمِ نظم کو

ترتیب دینے میں محسوس کیا تھا۔ شاعر کی مسرت اُسی روحانی مسرت کی تعبیر و توضیح کرتی ہے جو
ازل کے روز فضائے بسیط میں پھیل گئی تھی۔ جب کہ رنگ بہ رنگ کی صورتوں اور طرح طرح
کی حرکتوں کے راگ و سرود پر مشتمل ایک کائناتی سرگم کسی پُراسرار وجود کے نہاں خانے سے گونج
اُٹھا تھا۔ شاعری کا عظیم کارنامہ نہ صرف اس اصلی و ابتدائی ابتہاج کی صدائے بازگشت
ہوتا ہے بلکہ یہ بھی اپنی اصل کی طرح ایک تخلیقی و تعمیری قوّت کا حامل ہوتا ہے۔ جو لوگ اس کی
نورانی طاقت سے فیضیاب ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان تک اُس کی تجلّی آمیز اور تغیر آور
نوید پہنچ کر ایک نئی زندگی کی نیو ڈالتی ہے

خاص قسم کے نقّاد اور اشد ذہین حسن کار شاعری کو اصطلاح و ضابطے کا صحیح
اور بے نقص و خطا یا زیادہ سے زیادہ نفیس کارنامہ سمجھتے ہیں۔ اس میں شک
نہیں کہ ہر فن کے لئے اصطلاح اور ضابطے کا صحیح و موزوں اطلاق تکمیل کی طرف پہلا قدم
ہے۔ لیکن اس اوّل قدم، اور شاعر کے منتہائے مقصد کے درمیان متعدد منازل حتیٰ کہ
ایک عالم کائنات واقع ہے۔ چنانچہ طرز نگارش کی کم و بیش خامی ایک سریع الحس مشّاق
کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی اور نہ شاعری کی ایسے عظیم الشان کرداروں کی تخلیق
میں رخنہ ڈال سکتی ہے جن کی بقائے دوام کی مہر صدیوں پر ثبت رہے گی۔ علاوہ بریں
قواعد و ضوابط کا صحیح اطلاق کتنا ہی اشد ضروری کیوں نہ ہو۔ شاعری میں اس کا مقام
اس قدر بلند نہیں جیسا کہ دوسرے فنون میں۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ شاعری کا آلۂ
یعنی کلمۂ مسجّع (Rhythmic word) بمقابلہ دوسرے فنون کے
زیادہ باریک اور غیر مادی عناصر سے مالا مال ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حسن پرست
صانع کے دیگر آلات کار کی نسبت زیادہ پیچیدہ اور بوقلمون اثر آفرینیوں کی حامل
ہونے سے شاعری اور سب فنون کے بالمقابل مختلف قسموں اور جہتوں میں مزید امکانات
کی مالک ہوتی ہے۔ کلمۂ مسجع (Rhythmic word) دو عناصر پر مشتمل
ہوتا ہے ایک دقیق طور پر قابلِ احساس جسے صوت یا آواز کہتے ہیں۔ اور دوسرا قطعی
طور پر غیر مادّی جسے معنی یا تخیّل کا عنصر کہتے ہیں۔ پھر یہ دونوں عناصر فرداً فرداً اور مجموعتہً
ایک تیسرے عنصر کو اپنے اندر جگہ دیے ہوئے ہیں جس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے
اور جسے ایک براہِ راست روحانی قوّت سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ گو شروع شروع
میں یہ قوّت قواعد و ضوابط کی رعایت اختیار کر کے معرض اظہار میں آتی ہے۔ لیکن
فی الفور اپنی اوّلین پرواز میں ہی قواعد و قوانین کے قلمرو سے مافوق بلند پروازیاں
کرنا شروع کرتی ہے۔

یہ قوّت اپنی ظہوری صورت کا تعین آپ ہی کرتی ہے۔ قواعد اور ضوابط کے
صحیح اطلاق کے لحاظ سے شاعر دیگر تمام ماہرانِ فنون کی بہ نسبت زیادہ آزاد ہے اس
میں شک نہیں کہ قواعد و ضوابط کا علم اُس پر تمام و کمال لازم ہے۔ لیکن جس وقت
اس کی تخلیقی قوّت اپنے جوش پر آتی ہے اُس وقت شاعر کے دل میں اس کا خیال ایک
ادنیٰ سی جگہ اختیار کر لیتا ہے یا دھیما پڑ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بلند پروازیوں
کی بہترین ساعتوں میں تمام پابندیوں سے قطعاً آزاد ہو جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر
اس کے طرزِ سخن اور حرکت آواز کا کمال سراسر اس کی رُوح کا بے ساختہ اظہار ہوتا ہے
کلام اس کے اندر سے ایک مسجع الہام ایک بدیع مکاشفے کی صورت میں نکلتا ہے
اُس طرح سے جیسے عالمگیر رُوح نے اپنے اندر کے سرمدی کلمۂ مسجع (Sacred
word) کی طاقت سے کُن فکاں کی ہم آہنگیوں کو پیدا کیا تھا۔ تمام عالم
اسی افضل ترین کلام کا تانا بانا ہے اور اسی کو شاعری کا عنصر لایموت سمجھنا چاہئے اس کا
ایک شمّہ بھی شاعر کے تمام تخلیقات کو فنا ہونے سے محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہے

شاعر کا مسجع کلام روحانی تجلیات کے اظہار کے واسطے اعلیٰ ترین وسیلہ
بہم پہنچاتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ جب اہلِ معرفت اپنے خالص روحانی تجربات کی
جو ایسی چیزوں سے وابستہ ہوتے ہیں جن کا مکمل بیان ناممکن ہے محض ذہنی تشریح
کرنے کے بجائے اُنھیں اُن کی اصلی صورت میں ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں،
تب ان کی زبان پر شاعری کی شیریں ترکیب اور خوشنما کلام اُتر آتے ہیں۔ مگر
شاعر اپنی جلوہ آگیں طرزِ اظہار کو تمام حتیٰ کہ خارجی سے خارجی تجربات کے بیان میں
بھی لے آتا ہے۔ اگرچہ ظاہری طور سے دیکھنے والوں کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر
کسی شے کے فقط خارجی پہلو سے لطف لے رہا ہے لیکن در اصل اس کا رجحان
اس سے بھی ماورا و بلند ہوگا جو اس کی اصلی حقیقت کا انکشاف کرنے کی طرف ہوتا ہے۔

اب یہ احسن الوجوہ شاعرانہ اظہار کے ابتدائی عناصر پر نظر ڈالنا غیر مفید نہیں
ہوگا۔ گو اُس کے انقطاعی اور ناقابلِ بیان راز پر تبصرہ کرنا خارج از بحث ہے معمولی
بول چال میں زبان کا استعمال زیادہ تر روزمرّہ کے باہمی کاروبار کی عملی ضروریات
پورا کرنے پر محدود رہتا ہے۔ ہماری روزانہ زندگی میں الفاظ اسی طرح کام آتے
ہیں جیسا کہ ایک صنعتی کل یا اوزار۔ یہ فقط خیالات کی رسمی علامات ہوتے ہیں اور اُنکی
قدرتی طاقت پر کچھ زیادہ توجہ نہیں کی جاتی۔ گویا اُن کے ساتھ ہمارا وہی سلوک
ہوتا ہے جیسا کہ روزمرّہ کام آنے والی بے جان چیزوں کے ساتھ۔ اگر ہم ان میں
زندگی ڈالنا چاہیں تو ہمیں لب و لہجہ کی خاصی تبدیلیاں عمل میں لانا پڑتی ہیں تاکہ
ہماری جذباتی یا حیاتی (vital) قوتیں ان رسمی علامات میں سرایت

کرجائیں۔ لیکن اگر ہم انسانی زبان کی ابتدائی تاریخ اور اُس کے ماخذ پر غور کریں تو ہمارے خیال میں یہ امر واضح ہو جائے گا کہ انسانی کلام کی حالت اِن قدیم زبانوں میں کچھ اور ہی تھی۔ الفاظ اُس وقت ایک حقیقی اور آزاد زندگی کے حامل ہوتے تھے اور متکلم کو اس کا احساس بہت زیادہ ہوتا تھا۔ بمقابلہ ہم لوگوں کے۔ جو ایک میکانی اور کج بحث ذہنیت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دنیا کے ابتدائی دور میں زبان، جذبات، احساسات اور مختلف الوقائع خصوصیات رکھنے والے وسیع اور غیر معین ذہنی تاثرات کی علامت تھی نہ کہ ذہن کے منفصل خیالات کی۔ آج کل کا بے عیب ذہنی ادراک اُس وقت کے انسانی شعور کا ایک ادنیٰ سا عنصر تھا جو مادی ایام اور ارتقائے زبان کے ساتھ ساتھ غالب آنے لگا۔

اب سوال یہ ہے کہ آواز مقررہ خیالات کا آلۂ اظہار کیوں بن گئی۔ آواز اور اس کے ذہنی مفہوم میں تو کوئی فطری اور ذاتی مطابقت نہیں ہے۔ کیونکہ ذہنی نقطۂ نظر سے کوئی بھی آواز کسی بھی معنی کی حامل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ انسانوں کے درمیان اُس کی مطابقت کے باب میں اتفاق ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آواز کے اندر ایک ایسی ناقابل تحدید صفت یا قوت موجود ہوتی ہے جو قدرتاً انسان کی روح رواں (mind. soul) کو جنبش میں لاتی ہے۔ اور جو اُس کے حواس، جذبات اور کثیف ذہنی وجود پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مثلاً "بھیڑیا" یہ لفظ جس کے وجود میں آنے کے سبب کا خیال ہمارے ذہن میں اب قطعی نہیں آتا۔ ہمارے ادراک کے اندر ایک ذی حیات شے کا خیال پیدا کرتا ہے اور بس۔ باقی سب تفصیلات ہمیں خود پوری کرنی پڑتی ہیں۔ سنسکرت لفظ "وریکا" یعنی پھاڑنے والا شروع شروع میں بھیڑیا اور انسان کے درمیان اس شدید اعصاب آزار کا اظہار کرتا تھا جو انسان کی زندگی پر ایک گہرا اثر ڈالتا ہے۔ لیکن بعد میں اس کا حشر بھی وہی ہوا جو اب لفظ بھیڑیا کا ہے۔ اس لفظ کی آواز میں ایک ایسی خصوصیت تھی جو اس کے اور پھاڑنے کی سنسناہٹ کے درمیان ایک قدرتی تلازمہ پیدا کرتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس خصوصیت کی بدولت افتتاحی دور کی زبان میں ایک زبردست زندگی اور ایک منجمد طاقت رہی ہوگی اور ایک فطری شعری قوت بھی جسے اس نے اب کھو دیا ہے۔ گو صحیح خیال آفرینی، صراحت، اور عملی ضروریات پورا کرنے کی صلاحیت کے لحاظ سے اس نے خاصی ترقی کی ہے۔

شاعری صدیوں اور مدتوں کے مسلسل ہجوم کو چیرتی ہوئی قرون افتتاحیہ کے اُس سرچشمۂ تکلم پر جا پہنچتی ہے، جہاں انسانی زبان کی فطری شعریت محفوظ ہے۔ اور اسے حتی المقدور ہمارے سامنے لا کر ایک نئے پیرائے میں پیش کرتی ہے۔ اوّل تو یہ کہ زبانِ قدیمہ کی منجمد طور پر حسّی پیدا کرنے والی خصوصیت (sensational concreteness) کا کام یہ تشبیہوں اور استعاروں سے لیتی ہے اور دوسرے آواز کی قوتِ اثر آفرینی وارتعاش خیزی اور اس کی ذہنی اثر ریزی کی طرف زیادہ توجہ کرتی ہے۔ پھر یہ اپنے اس عمل اور جدید الفاظ کی امتیازی خصوصیت یعنی صحیح اور معین خیال پیدا کرنے کی قوت کے درمیان تلازمہ عمل میں لا کر دونوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ پروان چڑھاتی ہے۔ اس طرح سے شاعری یا رائے تکلم کو ایک ایسے معراجی طبقے پر لیجانے میں کامیاب ہوتی ہے جہاں دماغی یا حیاتی (vital) طبقوں کی بہ نسبت ایک اعلیٰ تر طبقے کے تجربات کا بلا واسطہ اظہار ممکن ہو جاتا ہے۔ اس بلندی پر پہونچنے کے بعد یہ نہ صرف لفظ اور تخیل کی مقررہ باہمی مناسبت اور لفظ کی جذباتی اور حسّی اثر اندازی اور حیاتی اثر آفرینی کو حرکت میں لاتی ہے بلکہ ان سب کی وساطت سے الفاظ کی روحانی اثر آفرینی (soul - suggestion) یعنی حقیقی اسپرٹ کو آشکارا کرتی ہے چنانچہ شاعری الفاظ کے محدود تخیلی معنوں سے پرے لامحدود و لامتناہی معنوں کا اشارہ کرتی ہے۔ یہ نہ صرف ابتدائی عہد کی زبان کی مانند انسان کی روحِ حیاتی (soul life) اور عہد موجودہ کے کلام کی مانند اس کے دماغی خیالات کی حامل ہوتی ہے بلکہ اس کی اصلی و حقیقی رُوح کے تجربات، جلوہ بینی، اور تخیلات کا اظہار کرتی ہے اور اِن روحانی حرکات کو حیات اور دماغ کی مطابقت میں لا کر ہمارے داخلے کے واسطے الوہیت کا دروازہ کھول رکھتی ہے۔

نثری عبارت کلام کو اُس کے معمولی روزمرّہ کے استعمال کے مقابلہ میں ایک اعلیٰ تر قوت عطا کرتی ہے۔ لیکن نظم سے اس کا اختلاف اس امر میں ہوتا ہے کہ یہ روحانی زاویۂ نگاہ سے ہر شے کا اظہار کرنے کی سعی نہیں کرتی۔ یہ الفاظ کی تخیلی قدر و قیمت کی بنا پر ہی اپنی ہستی کو متعلق رکھتی ہے۔ یہ ایسے سجع لہجے کا م لیتی ہے جس سے ہماری معمولی بول چال بے پرواہ ہے اور اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ حرکت کلام میں ایک عادِ مستیانانہ (rhythm) ہم آہنگی پیدا کرے۔ یہ الفاظ کے درمیان ایک ایسی خوشگوار اور بصیرت افروز مناسبت قایم کرنا چاہتی ہے جو انسانی ادراک کے لئے بیک وقت خوش مذاق اور صراحت انگیز ثابت ہو۔ یہ معمولی بول چال کے خشونت آمیز اسالیب کی بہ نسبت ایک زیادہ صحیح، باریک، لچکیلی، اور خاطر خواہ عبارت کے درپے رہتی ہے۔

ایک بہتر کلام کو کفایت و سلامت روی کے ساتھ ترتیب دینا نثر کا اولین مقصد ہے۔ اس کے علاوہ یہ مختلف ترکیبوں کے ذریعہ سے کلام میں فصاحت، جوش اور قوتِ تاثیر بھی پیدا کر سکتی ہے۔ پھر اس پر توازن مستحکم اور انضباط آمیز پیمانے سے تجاوز کر کے ایک زیادہ پُرشد و مد لہجہ کو گنجائش دے سکتی ہے اور جذبات کو زیادہ بلا واسطہ اور پُرزور طریقہ پر جنبش میں لانے کی قوت بہم پہنچا کر ایک آبدار حسن پرست احساس سے اپیل کر سکتی ہے۔ ناثر تشبیہوں کا اس قدر آزادانہ یا بافراط استعمال کر سکتا ہے جس سے اس کا کلام شاعرانہ طرز کے جوار میں آجائے۔ لیکن وہ انھیں آرائش یا زینت کے لئے یا اپنے خیال کی صریح تر توضیح کے لئے کام میں لاتا ہے نہ کہ اس عمیق تر اور روح افزا جلوہ ریزی کے لئے جو شاعر کا نصب العین ہے۔ انسانی ذہن وادراک ہی وہ خاص سامع و منصف ہے جس کی حمایت حاصل کرنا ناثر اپنا مقصد قرار دیتا ہے۔ دوسری قوتوں کو وہ صرف اسی مقصد کی تکمیل میں تعاون کرنے کے لئے طلب کرتا ہے۔ ذہن کی دو طاقتیں یعنی منطق (reason)، مذاق (talent) اس کے اعلیٰ دیوتا ہوتے ہیں۔ مگر شاعر کے لئے یہ ادنیٰ دیوتاؤں میں سے ہیں۔

اگر ناثر ان حدود سے پار ہو کر اپنی عبارت کے اندر ایک زیادہ متاثر لہجہ سے کام لے تو تشبیہوں کو فقط جلوہ ریزی کی غرض سے استعمال کرے اور اپنے آپ کو ایک قادر تر روحِ تکلم سے وابستہ کرے تب نثر اپنے علاقہ کی حد پار کر جاتی ہے اور نظم کے قلمرو میں جا داخل ہوتی ہے۔ اور نثر منظوم (poetic prose) ایسی ایک چیز وجود میں آجاتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ نظم نثر کے روپ یا ڈھیلے لباس میں اپنے آپ کو پوشیدہ کرتی ہے۔ ایک اعلیٰ و نفیس سلامت روی، اثر اندازی، ذہنی جلوہ افروزی اور ایک محتاط و معتدل حسن پرستانہ آسودگی اس کے کلام کی فطری و عمومی قوتیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس سے آگے بڑھنا شاعر ہی کا مخصوص حق ہے۔ وہ ایک تیز تر و برتر انجذاب و جذبہ شدید و زبردست کلام کا انکشاف کرتا ہے جس کی الہیانہ و مسجع صورت ایک عمیق معنی و لامحدود اثر آفرینی سے ہم آہنگ ہو کر اس کی اندرونی روح کے سرچشموں سے پیدا ہو کر نکل پڑتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ اس پُررونق صورت کی تلاش میں اکثر یا ہمیشہ کامیاب نہ ہو مگر اس کی تلاش میں رہنا شاعر کی فطرت کا خمیر ہے اور جب وہ اسے پا کر اس کے سانچہ میں کسی عمیق الہیانہ مکاشفے کو ڈھالتا ہے تب وہ منتر اُچارن کرنے والا یعنی الہامی شاعر کی حیثیت سے ممتاز ہوتا ہے۔

شاعر کی رُوح جب اپنی تجلی آمیز نگاہوں سے کسی چیز کا مشاہدہ کرتی ہے تب شاعر کے دل میں ایک اضطراب سا برپا ہو جاتا ہے اور اپنے تجربہ کا اظہار کئے بغیر اُسے چین نہیں پڑتا۔ نظم کی عبارت اور لہجہ اسی اضطراب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مشاہدہ خواہ کسی چیز کا ہو۔ فطرت کا۔ ذاتِ الٰہی کا۔ مخلوقات یا موجودات کی زندگی کا۔ کسی قوت متحرک کا۔ یا حسن و جمال کا۔ کسی تخیلی حقیقت کا یا جذباتی مسرت اور دُکھ کا۔ زندگی کا یا آخرت کا۔ بس صرف اتنا ہی کافی ہے کہ رُوح ہی مشاہدہ کرے اور باصرہ، حواس، دل اور دماغ اس کے اوزار ہوں۔ اسی حالت میں سچی اور بلند معیار نظم وجود میں آتی ہے۔ اگر دماغ واہمہ جذبات اور وظائف نفسی کی تڑپ روح تک نہ پہونچے اور اس میں سرایت کر کے مصفا، رفیع الشان اور متغیر نہ ہو جائے۔ اس کا کتنا ہی موزوں اور پُرجوش و خروش الفاظ میں اظہار کیوں نہ کیا جائے نظم کا معیار پست ہوگا اور شاعر کے کارنامہ کو بقائے دوام حاصل نہ ہو سکے گی۔ اور اگر شاعر ذہن کے پست عناصر سے اپیل کرے تو اس کا عمل شاعری کے دائرہ سے خارج ہو جاتا ہے۔ وہ یا تو نثر کے ڈانڈے پر جا پہنچتا ہے یا نظم کے لباس میں نری نثر پیدا کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ نثری عبارت کے سہل اور ڈھیلے وزن کے بجائے وہ زیادہ موزوں ترکیب اور پُرکار و پیوستہ اور جاذب توجہ و پُرزور عبارت سے کام لیتا ہے۔ غرضیکہ اُس کی پیداوار شاعری کی اصلی و امتیازی خصوصیت سے خالی رہ جاتی ہے۔

ہر وہ شے جو کلام کے ذریعہ ظاہر کی جاتی ہے دو عناصر پر مشتمل ہوتی ہے ایک خارجی یا اوزاری اور دوسری اصلی یا روحانی۔ مثلاً خیال کو لیجئے اس کے دو عنصر ہیں۔ ایک دماغی اور دوسرا روحانی۔ دماغی عنصر کو ادراک اس کی صحیح و متین صورت میں ہمارے روبرو پیش کرتا ہے۔ لیکن روحانی عنصر دماغی عنصر سے بالاتر ہوتا ہے اور ہمیں اظہار کردہ شے کی جامع صداقت کے جوار یا ضمن میں داخلہ کی اجازت دیتا ہے۔ اب جذبہ کے حق میں بھی یہ امر اسی قدر صادق آتا ہے۔ شاعر نہ صرف محض جذبہ کے درپے رہتا ہے بلکہ وہ جذبہ کی رُوح سے دوچار ہونا چاہتا ہے۔ یعنی اُس چیز سے جس کی مسرت آمیزی کی خاطر ہماری اور دُنیا کی رُوح جذباتی تجربات قبول کرتی ہے۔ شاعرانہ احساس کے اندر بھی وہی بات ہے۔ شاعر ایک عظیم تر صداقت کا جویا ہے اور ایک اعلیٰ تر حظ و حُسن کا خواہاں۔ صداقت اور حسن کی ہم آہنگی جو غیر فانی مسرت کی مظہر ہوتی ہے شاعر کی منزلِ مقصود ہے۔ اس کی رُوح کو اپنی اندرونی گہرائیوں کی حقیقتوں کو اُبھارنے میں سرور محسوس ہوتا ہے۔ نثر کا خالی از جرأت اور معتدل کلام گاہ بگاہ اس عظیم تر عنصر کی جھلک پیدا کر سکتا ہے۔ مگر نظم کی بلند اور پُرجبارت عبارت ہی اُسے ایک زندہ اور پُررونق پیرایہ میں پیش کر سکتی ہے اور جب شاعر اپنے حسب معمول لب و لہجہ سے بھی بلند ہو کر ایک مستثنیٰ فنِ ولحن کے آسمان پر بلند پروازیاں شروع

"کلیم" دهلی

آدم و حوا



نظارہ ہائے جنت عرفاں سے دور ہیں
کتنا ہی دور پھینک ! پر تیرے حضور ہیں

"سید"

ایک برتر کلام کو کفایت و سلاست روی کے ساتھ ترتیب دینا نثر کا اولین مقصد ہے۔ اس کے علاوہ یہ مختلف ترکیبوں کے ذریعہ سے کلام میں فصاحت، جوش اور قوتِ تاثیر بھی پیدا کر سکتی ہے۔ پھر اس پر توازن مستحکم اور انضباط آمیز پیمانے سے تجاوز کر کے ایک زیادہ پُرشدومد لہجہ کو گنجائش دے سکتی ہے اور جذبات کو زیادہ بلاواسطہ اور پُرزور طریقہ پر جنبش میں لانے کی قوت بہم پہنچا کر ایک آبدار حسن پرست احساس سے اپیل کر سکتی ہے۔ ناثر تشبیہوں کا اس قدر آزادانہ یا بافراط استعمال کر سکتا ہے جس سے اس کا کلام شاعرانہ طرز کے جوار میں آجائے۔ لیکن وہ انھیں آرائش یا زینت کے لئے یا اپنے خیال کی صریح تر توضیح کے لئے کام میں لاتا ہے نہ کہ اس عمیق تر اور روح افزا جلوہ ریزی کے لئے جو شاعر کا نصب العین ہے۔ انسانی ذہن و ادراک ہی وہ خاص سامع و منصف ہے جس کی حمایت حاصل کرنا ناثر اپنا مقصد قرار دیتا ہے۔ دوسری قوتوں کو وہ صرف اسی مقصد کی تکمیل میں تعاون کرنے کے لئے طلب کرتا ہے۔ ذہن کی دو طاقتیں یعنی منطق (reason) مذاق (taste) اس کے اعلیٰ دیوتا ہوتے ہیں۔ مگر شاعر کے لئے یہ ادنیٰ دیوتاؤں میں سے ہیں۔

اگر ناثر ان حدود سے باہر ہو کر اپنی عبارت کے اندر ایک زیادہ متاثر لہجہ سے کام لے تو تشبیہوں کو فقط جلوہ ریزی کی غرض سے استعمال کرے اور اپنے آپ کو ایک قادر تر روحِ تکلم سے وابستہ کرے تب نثر اپنے علاقہ کی حد پار کر جاتی ہے اور نظم کے قلمرو میں جا داخل ہوتی ہے۔ اور نثر منظوم (poetic prose) ایسی ایک چیز وجود میں آجاتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ نظم نثر کے روپ یا ڈھیلے لباس میں اپنے آپ کو پوشیدہ کرتی ہے۔ ایک اعلیٰ و نفیس سلاست روی، اثر اندازی، ذہنی جلوہ افروزی اور ایک محتاط و معتدل حسن پرستانہ آسودگی اس کے کلام کی فطری و عمومی قوتیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس سے آگے بڑھنا شاعر ہی کا مخصوص حق ہے۔ وہ ایک تیز تر و برتر تجلہ و علیہ شدید و زبردست کلام کا انکشاف کرتا ہے جس کی الہیانہ و مسجع صورت ایک عمیق معنی و لامحدود اثر آفرینی سے ہم آہنگ ہو کر اس کی اندرونی روح کے سرچشموں سے براہ راست نکل پڑتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ اس پُررونق صورت کی تلاش میں اکثر یا ہمیشہ کامیاب نہ ہو مگر اس کی تلاش میں رہنا شاعر کی فطرت کا خمیر ہے اور جب وہ اُسے پا کر اس کے سانچہ میں کسی عمیق الہیانہ مکاشفے کو ڈھالتا ہے تب وہ منتر اُچارن کرنے والا" یعنی الہامی شاعر کی حیثیت سے ممتاز ہوتا ہے۔

شاعر کی رُوح جب اپنی تجلی آمیز نگاہوں سے کسی چیز کا مشاہدہ کرتی ہے تب شاعر کے دل میں ایک اضطراب سا برپا ہو جاتا ہے اور اپنے تجربہ کا اظہار کئے بغیر اُسے چین نہیں پڑتا۔ نظم کی عبارت اور لہجہ اسی اضطراب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مشاہدہ خواہ کسی چیز کا ہو۔ فطرت کا۔ ذاتِ الٰہی کا۔ مخلوقات یا موجودات کی زندگی کا۔ کسی قوت متحرک کا، یا حسن و جمال کا۔ کسی تخیلی حقیقت کا یا جذباتی مسرت یا درد کا، زندگی کا یا آخرت کا۔ بس صرف اتنا ہی کافی ہے کہ رُوح ہی مشاہدہ کرے اور باصرہ، حواس، دل اور دماغ اس کے اوزار ہوں۔ اسی حالت میں سچی اور بلند معیار نظم وجود میں آتی ہے۔ اگر دماغ وا ہمہ جذبات اور وظائف نفسی کی تڑپ روح تک نہ پہونچے بعد اس میں سرایت کر کے مصفا، رفیع الشان اور متغیر نہ ہو جائے۔ اس کا کتنا ہی موزوں اور پُرجوش و خروش الفاظ میں اظہار کیوں نہ کیا جائے۔ نظم کا معیار پست ہوگا اور شاعر کے کارنامہ کو بقائے دوام حاصل نہ ہو سکے گی۔ اور اگر شاعر ذہن کے سے پست مقام سے اپیل کرے تو اس کا عمل شاعری کے دائرہ سے خارج ہو جاتا ہے۔ وہ یا تو نثر کے ڈانڈے پر جا پہنچتا ہے یا نظم کے لباس میں نری نثر پیدا کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ نثری عبارت کے سہل اور ڈھیلے وزن کے بجائے وہ زیادہ موزوں ترکیب اور پُرکار و پیوستہ اور جاذب توجہ و پُرزور عبارت سے کام لیتا ہے۔ غرضیکہ اس کی پیداوار شاعری کی اصلی و امتیازی خصوصیت سے خالی رہ جاتی ہے۔

ہر وہ شے جو کلام کے ذریعہ ظاہر کی جاتی ہے دو عناصر پر مشتمل ہوتی ہے ایک خارجی یا اوزاری اور دوسری اصلی یا روحانی۔ مثلاً خیال کر لیجئے اس کے دو عنصر ہیں۔ ایک دماغی اور دوسرا روحانی۔ دماغی عنصر کو ادراک اس کی صحیح و متعین صورت میں ہمارے روبرو پیش کرتا ہے۔ لیکن روحانی عنصر دماغی عنصر سے بالاتر ہوتا ہے اور ہمیں اظہار کردہ شے کی جامع صداقت کے جوار یا ضمن میں داخلہ کی اجازت دیتا ہے۔ اب جذبہ کے حق میں بھی یہ امر اسی قدر صادق آتا ہے۔ شاعر نہ صرف محض جذبہ کے درپے رہتا ہے بلکہ وہ جذبہ کی رُوح سے دوچار ہونا چاہتا ہے۔ یعنی اُس چیز سے جس کی مسرت آمیزی کی خاطر ہماری اور دُنیا کی رُوح جذباتی تجربات قبول کرتی ہے۔ شاعر احساس کے اندر بھی وہی بات ہے۔ شاعر ایک عظیم تر صداقت کا جویا ہے اور ایک اعلیٰ تر حظ و حُسن کا خواہاں۔ صداقت اور حسن کی ہم آہنگی جو غیر فانی مسرت کی مظہر ہوتی ہے شاعر کی منزلِ مقصود ہے۔ اس کی رُوح کو اپنی اندرونی گہرائیوں کی حقیقتوں کو اُبھارنے میں سرور محسوس ہوتا ہے۔ نثر کا خالی از جرأت اور معتدل کلام گاہ بگاہ اس عظیم تر عنصر کی جھلک پیدا کر سکتا ہے۔ مگر نظم کی بلند اور پُرجسارت عبارت ہی اُسے ایک زندہ اور پُررونق پیرایہ میں پیش کر سکتی ہے اور جب شاعر اپنے حسبِ معمول لب و لہجہ سے بھی بلند ہو کر ایک مستی نغمہ و لحن کے آسمان پر بلند پروازیاں شروع

"کلیم" دہلی

آدم و حوا



نظارہ ہائے جنت عرفاں سے دور ہیں
کتنا ہی دور پھینک ! پر تیرے حضور ہیں

"سعد"

کرتا ہے تب وہ اُس عنصر کی اصلی ضیاء، درد لق کو اور بھی کامیابی کے ساتھ آشکارا کرتا ہے۔ شاعرانہ کلام کی قدرتی حدت وشدت کا ماخذ در اصل اُنکی بلند وازیوں سے وابستہ ہے۔ یا یوں کہئے کہ رُوح اندرونی اور بیرونی عالموں کے اسم و جسم کے افسونی جوا ز کے درمیان اپنی ذات کا انکشاف کرنے کی غرض سے شاعرانہ سیاحی کرتی ہے۔ اور یہ حدت وشدت اُسی سیاحی کی کیف و مسرت سے پیدا ہوتی ہے۔

سعیِ لاحاصل

اے جوشؔ ہلکیوں میں پُرافشاں ہوئے تو کیا؟ بہروں کی انجمن میں غزلخواں ہوئے تو کیا؟
ہندوستاں غلام ہے، گونگا ہے بہرہ ہے ہندوستاں میں آپ سخنداں ہوئے تو کیا؟
اک وسوسہ جو قوم ہو خود "فی صدورِ ناس" اُس وسوسے میں جذبۂ ایماں ہوئے تو کیا؟
جس چرخِ تیرہ پر ہو سیہ ابر کا ہجوم اُس چرخِ تیرہ پر مہِ تاباں ہوئے تو کیا؟
جو سرزمینِ شور ہو، محرومِ رنگ و بُو اُس سرزمیں پر ابرِ خراماں ہوئے تو کیا؟
موجوں نے جس کی توڑ دیا ہو صدف کا دِل اُس جُوئے غم میں قطرۂ نیساں ہوئے تو کیا؟
جس گلستاں میں ایک ہے، کانٹا ہو یا گلاب اُس گلستاں میں سنبل و ریحاں ہوئے تو کیا؟
ہم وزن و ہم گہر ہوں جہاں، زاغ و عندلیب اُس بوستاں میں مرغِ خوش الحاں ہوئے تو کیا؟
جس تیرگی میں ہو نہ سکندر، نہ رُوحِ خضر اُس تیرگی میں چشمۂ حیواں ہوئے تو کیا؟
نکلے نہ صحن خانہ سے باہر جہاں نظر واں آپ کائنات بداماں ہوئے تو کیا؟

اندھوں سے جب پڑا ہے زمانے میں سابقہ
اے جوشؔ! آپ یوسفِ کنعاں ہوئے تو کیا؟

جوشؔ ملیح آبادی

کسی عالمگیر مذہب کی اشاعت میں نوجوانانِ عالم کیا حصہ لے سکتے ہیں؟

(مصلح الدین احمد اسیر)

کاش ازیں طوفانِ بیداری و ہوش
وارہیدی ایں ضمیرِ چشم و گوش

زندگی کا اعتبار کیا، جب تک سانس آتی ہے سبحان اللہ۔ نہیں تو انا اللہ غنیمت ہے جو دم بھی اپنے معبود کی یاد میں بسر ہو جائے۔ انسان محض آب و گل کے ایک کھوکھلے ڈھانچے کا نام نہیں ہے، بلکہ ہمارے اندر ایک بڑا راز مضمر ہے جس کی مدد سے ہم حقائق اشیاء کا ادراک کرتے ہیں: باصرہ۔ سامعہ۔ ناطقہ۔ شامہ۔ لامسہ۔ حسِ مشترک۔ متصرفہ۔ متخیلہ۔ واہمہ اور حافظہ۔ نیز نفس کی آمد و شد سب اسی کے تابع ہیں۔ اسی پر ہمارے تمامی اصول کا مدار ہے، جس کو کہ ہم رُوح کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کی حقیقت کا ادراک ہی ہماری تمام دینی و دنیاوی صلاح و فلاح کا پیش خیمہ ہے۔ دنیا کے تین مسلمہ اصول جو تمام کاروبارِ عالم کا احاطہ کئے ہوئے ہیں: علم سیاست مدن۔ تدبیر منزل۔ امور معاد و معاش، سب اسی کے حلقۂ اقتدار میں ہیں۔ اور ان اقتدارات کی کنجی ہر نوجوان کے ہاتھ میں ہے، بشرطیکہ وہ اپنے وجود کو تزکیۂ نفس۔ تصفیہ قلب، اور تجلیۂ رُوح کی تجلیوں سے معمور کرکے قُربِ حق حاصل کرے۔ تمام کائنات میں ایک ہی رُوح کو کارفرما پائے۔ فرش سے عرش تک ایک ہی نُور کا دریا موجیں مارتا دیکھے۔ تاکہ اجسامِ خاکی کا کثیف پردہ جو اس کی آنکھوں پر پڑا ہوا ہے بالکلیہ اُٹھ جائے۔ اس کی نظر میں حاضر و غائب۔ ماضی و مستقبل سب یکساں ہو جائیں۔ اس پر ظہورات کی حقیقت کا انکشاف ہو جائے۔ اور تمام عالم تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی دھاگے میں پرویا ہوا نظر آنے لگے۔

بس یہی وہ ہتھیار ہے جس سے آراستہ ہو کر ایک نوجوان تن تنہا تمام عالم کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ہر جنبشِ نگاہ میں ہستیوں کے دریا کے دریا لنڈھا سکتا ہے۔ اپنی کافر ادائیوں سے عالم والوں کے قلوب پر چھاپہ مار سکتا ہے۔ ؎

جس پر نگاہ پڑ گئی دیوانہ کر دیا

کے راز کو آشکارا کر سکتا ہے اور اس طرح اپنی تیغ دو دم کا لوہا منواتا ہوا اس عالم گیر صداقت کی اشاعت میں حصہ لے سکتا ہے کہ جس کے لئے تمام قوتیں سلب ہیں۔ ہاتھ پاؤں۔ دل و دماغ مفلوج۔ جہاں نہ کوئی تدبیر کارگر ہوتی ہے اور نہ کوئی دنیاوی طاقت ہی کام کرتی ہے۔ حسنِ اخلاق و عادات، علم و عمل۔ سوز بیانی۔ اعجاز قلم۔ لطافتِ خیال۔ وسعت نظری۔ پامردی و مستقل مزاجی۔ قوتِ ارادی و ہمت۔ زہد و ورع۔ عفت و عصمت۔ ایمان و صداقت۔ دیانت

سخاوت۔ شجاعت۔ عشق و محبت۔ غرض کہ ایک عالم گیر مذہب کے تمام محاسن اسی کے حلقہ بگوش ہیں۔ خیال تو فرمائیے کہ صرف اسی ایک تلوار بے نیام کو ہاتھ میں لے کر ایک نوجوان کتنی تلواروں اور ہتھیاروں کی جلو میں زندگی کی شاہراہ پر قدم اٹھاتا ہے۔ کتنی قوتیں اس کے ہمراہ رکاب ہوجاتی ہیں۔ کتنی فوجیں یمین و یسار پیش و عقب اس کی کمک کے لئے کمربستہ رہتی ہیں۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کسی نوجوان کو کوئی معراج حاصل ہوسکتی ہے اور کیا وہ اس معراج کے حصول کے بعد بھی ایک عالم گیر مذہب کی اشاعت کرنے میں کسی سے پیچھے رہ سکتا ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ اس صورت کے بعد بھی کسی سچے مذہب کی اشاعت کے لئے کسی دوسری تدبیر کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ تاہم دنیا عالم اسباب ہے، یہاں کا کارخانہ ہی سبب بینی اور عقل کی رہنمائی کے ہاتھوں چل رہا ہے۔ حالانکہ

ع۔ ہر سبب را آں مسبب آورد

کا معاملہ ہے۔ یعنی جو کچھ ہونے والا ہے۔ اس کے لئے خواہ مخواہ اسباب بھی ایسے ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کی موت واقع ہوجاتی ہے اس کا سبب دریافت کیا جاتا ہے تو کسی نہ کسی مرض کا نام لے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسی مرض میں مبتلا ہو کر صدہا جانیں صحت یاب ہوچکی ہونگی اب اگر مرض ہی موت کا باعث تھا تو پھر اسی مرض کے دوسرے مریض کیوں جانبر ہو گئے۔ نہیں! معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اصل میں اس شخص کی زندگی کا خاتمہ ہونے والا تھا تو اس مرض کو اس کا سبب بنا دیا گیا۔ اس کے علاوہ جہاں کوئی مرض معلوم نہ ہوسکا تو دفعتہ قلب کی حرکت بند ہونے ہی کو سبب قرار دے دیا جاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ قلب کی حرکت کا بند ہوجانا ہی موت کا پیغام ہے۔ جب وہ کسی مرض کے باعث بند ہوتی ہے تو اس مرض کو سبب گردانا جاتا ہے۔ ورنہ یہی بیچاری مورد الزام ٹھہرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس عالم میں جو کچھ واقع ہوگا اس کو کسی نہ کسی سبب کے تحت ہی پیش کیا جائے گا۔ اسی لئے اس کو عالم اسباب کہتے ہیں۔ اس کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہے کہ تقدیر عالم سبب کی پابند ہے۔ پھر ہم کو کیا پڑی ہے جو ہم بیکار اپنا وقت ضائع کریں اور خواہ مخواہ سبب بینی میں پڑنے کی دردسری مول لیں۔ کہیں اس کے یہ معنی نہ نکال لئے جائیں کہ انسان تعطل اختیار کر بیٹھے بلکہ

غور سے دیکھا نظام دہر تو ثابت ہوا
آدمی پیدا ہوا ہے کام کرنے کے لئے (جوش)

جب نظام عالم کا مدار ہی اسی پر ٹھہرا تو کوئی متنفس کبھی خاموش بیٹھ ہی نہیں سکتا۔

عالم کی مثال ایک بڑے کارخانہ کی ہے۔ ہم لوگ اور تمام کائنات اس کے کل پرزے ہیں تو جس طرح مشین کو حرکت میں لانے والے کل پرزے نہیں ہوسکتے بلکہ یہ فعل مشین کے چلانے والے کا ہے اور جب وہ اس کو حرکت میں لائے گا تو کل پرزے چلنے پر مجبور رہوں گے۔ اسی طرح عالم کو گردش میں لانے والے ہم لوگ نہیں ہوسکتے۔ بلکہ یہ کام کسی دوسری ہی قوت کا ہے۔ جس کو کہ قدرت کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور قدرت ایک آن معطل نہیں ہے تو ہم لوگ کیوں کر معطل رہ سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہم لوگوں کو بذات خود تگ و دو میں پڑنے کی ضرورت بھی نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خیریت اسی میں ہے کہ ہم اپنی تمام قوتیں چپ چاپ قدرت کے حوالہ کردیں جس طرح کہ تنکا دریا کی موج کے حوالے ہوتا ہے۔ موج اس کو جس طرف چاہتی ہے لے جاتی ہے۔ اب تنکا نہ تو معطل ہی ٹھہرایا جاسکتا ہے اور نہ بیکار تگ و دو کرنے کا الزام ہی اس کے سر عائد ہوسکتا ہے۔ اس وقت اس کا فعل عین موج کا فعل ہے۔ اسی طرح جب ہم اپنی تمام قوتیں قدرت کے حوالے کرچکے تو ہم بے فکر ہوگئے۔ اب قدرت جانے اور اس کا کام جانے۔ جو کام وہ مناسب سمجھے گی ہم سے لے گی۔ اور جو کام نامناسب سمجھے گی نہ لے گی۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس سے فائدہ کیا حاصل ہوا۔ اولاً تو نفع و نقصان فائدہ و ضرر کس شمار میں ہے جس کی تلاش میں ہم بیکار اپنا وقت ضائع کریں۔ دوسرے یہی کیا کم ہے کہ ہم نے اپنی قوتوں کو مسلوب دیکھا اور قدرت کو جاری و ساری۔ جس کا مطلب یہ برآمد ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم سے سرزد ہوتا ہے وہ عین قدرت ہی کی کارفرمائی ہے۔

ع۔ انچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

چلئے چھٹکارا ملا۔ گناہ اور ثواب، جنت اور دوزخ کہاں۔ نجات ابدی جس کی کہ ہم کو تلاش تھی وہ نقد حاصل ہے۔ اور یہی منشا ہماری تخلیق کا بھی ہے۔ تاہم اس عالم تگ و دو میں خال ہی خال انسان میرے ہم خیال ملیں گے۔ زیادہ تر تو اسی قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو صبح سے شام تک لٹھیا لئے ہوئے اپنی خواہشات کے پیچھے پھرا کرتے ہیں۔ اور اگر اتفاق سے بعد از خرابی بسیار وہ کسی خواہش کے حصول پر قادر بھی ہوگئے تو اس کامیابی کو اپنی ہی کوششوں کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہر لمحہ ہماری ناکامیاں اشتہار دے رہی ہیں کہ جاری و ساری ہے لَا تَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ مگر سنتا ہی کون ہے اور فرصت بھی کسے ہے جو سمجھنے کی کوشش کرے ایک رَو ہے جس میں منہ اٹھائے ہوئے تمام عالم بہتا چلا جا رہا ہے۔ اس لئے لازم ہوا

کچھ سہل الاصول تدابیر بھی پیش کروں۔ جو اُس کی تشفی کا باعث ہوں۔ حالانکہ یہ بھی ایک وسوسہ ہے جس میں ازل سے لے کر ابد تک عالم مبتلا چلا جا رہا ہے۔

جس طرح کہ آفتاب اپنی ضیا باریوں سے کسی حال میں عاری نہیں ہوتا اسی طرح حُسن خواہ کسی چیز میں ہو نگاہوں کو جذب کئے بغیر نہیں رہتا۔ اس کے تاثر سے خود بخود لوگوں کے قلوب گرما جاتے ہیں اور ایک خاص جذبہ کے تحت اسی طرف کشاں کشاں چلے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر نوجوانانِ عالم اپنے پسندیدہ عادات و پاکیزہ خصائل کی برکت سے لوگوں کے قلوب کو مسخر کرنے کا ملکہ پیدا کریں تو وہ دن دور نہیں ہے جبکہ خود بخود لوگ ان کی صحبت کو ذریعۂ حیاتِ ابدی سمجھ کر اُن کے پاس آئیں گے۔ اور الصحبت من التاثر کے فیض سے مالا مال ہو کر رفتہ رفتہ ان کے ہم خیال ہوتے جائیں گے۔ اُن سے محبت و عقیدت کریں گے یہی خلوص بالآخر اُن کو اس عالمگیر شاہراہ پر لا ڈالے گا۔

سگِ اصحابِ کہف روزے چند
پئے نیکاں گرفت و مردم شد (سعدی)

مذہب کی پیروی عقلی و خرد کی رہنمائی کے ہاتھوں نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ اُس کے لئے حسنِ عقیدت درکار ہے اور جب تک کوئی قوت بدعقیدگی کو حسنِ عقیدت سے تبدیل کر دینے پر قادر نہ ہو محض افہام و تفہیم شاذ و نادر ہی نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ تاہم ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس عالم گیر مذہب کو منظرِ عام پر پیش کیا جائے۔ لوگوں کو تبادلۂ خیال کا موقع دیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو ان کی غلط فہمیوں کو دُور کیا جائے ایک سحر بیان اپنی سوز بیانی کو کام میں لاتے ہوئے بہت سے قلوب کو اپنا گرویدہ بنا لے گا جو اُسی کا کلمہ پڑھنے لگیں گے۔

اسی طرح ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس عالمگیر مذہب کی صداقت کا اعلان کرتے ہوئے رسائل۔ جرائد۔ قصائد۔ نظمیں۔ مضامین وغیرہ کی اشاعت کی جائے جو پاکیزہ زبان اور پُرمغز مطالب کی بدولت لوگوں کے خیالات میں انقلابِ عظیم برپا کر دینے کی طاقت رکھتے ہوں۔ جس کے لئے بھی زورِ قلم سے زیادہ سحرِ صداقت درکار ہے اور جہاں تک جس پیمانہ پر ممکن ہو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نگاہوں تک پہنچائے جائیں۔ اس کے لئے بھی نوجوانانِ عالم کو اپنی قوتِ فکری کو بلند سے بلند تر منازل پر پہونچانا چاہیئے۔ تاکہ اُن کے قلم کے نکلے ہوئے نقوش خواہ نظم کی شکل میں ہوں یا نثر کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر بکھرتے ہی لوگوں کے قلوب میں اپنا گھر کر لیں۔

اگر قلوب کو تلوار کے زور سے مسخر کیا جا سکتا ہوتا تو میں بھی یہ رائے دیتا کہ نوجوانانِ عالم فنِ حرب کو بدرجۂ اتم حاصل کریں اور اپنی تلوار کی ضرب سے اس عالم گیر مذہب کی اشاعت میں حصہ لیں۔ لیکن افسوس ہے کہ تلوار کا اثر قلب سے زیادہ جسم پر ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ جسمانی تکلیف کے خوف سے کوئی شخص اس مذہب کو قبول کرنا پسند کرے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ایک ایسی کمزور فطرت سے جو ہر رسّی کو سانپ سمجھ کر اور ہر سایہ کو بھوت سمجھ کر لرزہ براندام ہو جاتی ہے کسی مذہب کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ مذہب کو پامردِ مستقل مزاج اور اٹل ارادے کے افراد درکار ہیں۔ کہ جو اپنی آنکھوں سے آسمان کو روئی کے گالوں کی طرح اُڑتا ہوا دیکھیں اور زمین کو خاک ہو کر دوشِ ہوا پر سوار پائیں۔ مگر ان کی پیشانی ہمت پر بل نہ آنے پائے۔ دنیا کے تمام پہاڑ ٹکرا ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ سمندر کی جگہ خشکی اور خشکی کی جگہ سمندر رہیں مگر ان کو اپنی جگہ پر ذرا بھی جنبش نہ ہو۔ مذہب کو ایسے نام نہاد افراد کی ضرورت نہیں ہے کہ جو تمام عمر منافقانہ اور بزدلانہ زندگی گذارنے کے عادی ہو چکے ہوں کہ جن کی ذات سے خود ان کے نفوس کو بھی کوئی مفاد نہیں پہونچا۔ جن کا وجود خود اُن کے ہی لئے عذابِ الیم بنا ہوا ہے۔ مذہب کو ایسے پاکیزہ سیرت انسان درکار ہیں جو کہ

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

کا کلمہ پڑھتے ہوں۔ دوسروں کے درد کو اپنا درد۔ دوسروں کی راحت کو اپنی راحت سمجھتے ہوں۔ صفا کیشی جن کا ایمان ہو۔ صدق معاملگی جن کا پیشہ ہو۔ خوش عقیدگی جن کا شعار ہو اور اکل حرام پر موت کو ترجیح دیتے ہوں۔ ایک نوجوان جو اپنے دل میں صحیح جذبہ خدمتِ مذہب کا پاتا ہے اس کے لئے لازم ہوا کہ وہ ان خصوصیات کا بھی حامل بنے۔ پھر اس کے بعد اُٹھے اور دنیا والوں سے نبرد آزمائی کے لئے آمادہ ہو جائے۔ اس کا جذبۂ صحیح اور ذوقِ کامل اس کی رہنمائی کرے گا۔

آخر میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ مذہب کیا ہے؟ اور اس کے صحیح معنی کیا ہیں؟ میرے خیال میں مذہب ایک راستہ ہے حیاتِ ابدی کے حاصل کرنے کا یا یوں سمجھئے کہ منزلِ مقصود پر پہونچنے کا۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ منزلِ مقصود (خدا) ایک ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس منزل تک پہونچنے کے لئے راستہ بھی ایک ہی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ راہِ راست کوئی ایک ہی ہو اور دوسرے راستے خطرناک ہوں۔ نشیب و فراز سے پُر ہوں۔ لیکن اُن کا اختلاف بعید از عقل نہیں۔ اس لئے سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا اور اس کی خواہش کرنا کہ تمام عالم ایک ہی مذہب کے ڈورے میں تسبیح کے دانوں کی طرح پرو دیا جائے بے جا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ باغبان اپنے باغ کو گلہائے رنگا رنگ و بوقلمون کیاریوں ہی سے آراستہ دیکھنے کا آرزومند ہوتا ہے اور یہی منشائے قدرت بھی اس عالم کی تخلیق سے ہے اور یہی تقاضائے جامعیت بھی۔ اس لئے مذاہب کا اختلاف تو ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اور ہمیشہ چلا جائے گا۔ کیونکہ بمصداق ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند
میل آں اندر دلش انداختند

قدرت کو جس سے جو کام لینا منظور تھا اسی کا میلان اس کے ضمیر میں رچ دیا، اس کی فطرت میں ودیعت کر دیا اور فطرت کے حدود سے باہر نکلنا ناقص تو کیا ایک کامل سے کامل انسان کے بھی حیطۂ اختیار سے باہر ہے۔ البتہ ناقص اپنے ماحول، صحبت اور زمانے کی آب و ہوا سے بھی متاثر ہوتا ہے اور ایک کامل ان تمام زنجیروں کو توڑ پھوڑ کر عین فطرت کے مطابق ہو جاتا ہے۔ یہی اس کا کمالِ انسانیت اور منشاءِ حقیقی اس کے خالق کا ہے جس کو "جنت الفردوس" کہئے یا "جنت الماوٰی" یا جس قدر بلند ترین مقام تک آپ کا تصور آپ کی رہنمائی کرے۔ اس کے علاوہ فطرتیں بھی مختلف ہیں۔ سمندر، مچھلی اور انسان کو لے لیجئے۔ اوّل کو آگ۔ دوسری کو پانی اور تیسرے کو ہوا سانس لینے کے لئے درکار ہے جس طرح پہلے کو دوسری اور دوسری کو تیسرے اور تیسرے کو پہلے کی جگہ پر رکھنا گویا ان کی موت کو دعوت دینا ہے۔ اسی طرح جب یہ مسلّمہ امر ہے کہ جنابِ باری عزّ اسمہٗ کی دو شانیں ہیں (۱) جلال (۲) جمال۔ تو مظہرِ جلال سے جمالی افعال و خواص، اور مظہرِ جمال سے جلالی آثار کی توقع کرنا، دن کو رات کہنے کی سعی نا حاصل کرنا نہیں تو کیا ہے کل شیٔ یرجع الیٰ اصلہ کو بھی نہ بھولنا چاہئے یعنی ہر شے اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے۔

اس لئے اگر نوجوانانِ عالم واقعی کسی عالمگیر مذہب کی اشاعت میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ وہ سب سے پہلے ہر نفس کی فطرت کا مطالعہ کریں پھر اپنے علم و عمل اور قوّتِ ارادی کی مدد سے اُن کو اُن کے ماحول کی زنجیروں سے آزاد کر کے عین فطرت پر ڈالنے کی کوشش کریں جو حقیقی معنوں میں صراطِ مستقیم کی طرف دعوت نیز نجاتِ ابدی کے حصول کا کھلا ہوا راستہ اور کسی عالمگیر مذہب کے اشاعت کا "مقصدِ وحید" ہے۔

آنسو

یہ کس کی یاد میں آنسو بہا رہا ہوں میں؟ تمہارے نام پہ موتی لٹا رہا ہوں میں

اک آرزوئے محبّت کا خواب دیکھا تھا اب اس کی یاد بھی دل سے بھلا رہا ہوں میں

اُمنڈ رہا ہے جو طوفانِ گریہ آنکھوں سے ہنسی کی موجوں میں اُس کو ڈبا رہا ہوں میں

ہوا تھی تیز، جلایا چراغ الفت کا اب آہ و گریہ سے اُس کو بجھا رہا ہوں میں

اُبھر رہے تھے نقوشِ امید پھر میرے
اِن آنسوؤں سے اُنھیں کو مٹا رہا ہوں میں

(تمنائی)

بالِ جبریل پر ایک نظر

سید معشوق حسین اطہر ہاپوڑی

"بالِ جبریل پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک ناقدانہ مضمون جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کلکٹر ڈیرہ دون کا جریدہ کلیم ماہ جنوری ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں جناب اثر نے اُن اعتراضات کی تردید کی ہے جو بالِ جبریل پر رسالہ "شاعر" آگرہ میں شائع ہوئے ہیں اور ڈاکٹر سر اقبال کے کلام کی توثیق فرمائی ہے۔

بعض اعتراضات کی تردید کرتے ہوئے کئی مرتبہ لکھا ہے کہ آج کل سافرت اور بے اطمینانی کا عالم ہے۔ کتابیں حوالے کو موجود نہیں، حافظے کی مدد سے لکھتا ہوں۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں "اوپر اپنی مجبوریوں کا اظہار کر چکا ہوں کوئی لغت کی کتاب ہمراہ نہیں نہ دستیاب ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شعر میں لفظِ پارس میں ر متحرک نہیں بلکہ ساکن ہے" پھر فرماتے ہیں کوئی اللہ کا بندہ کسی معتبر لغت یا بہارِ عجم کے حوالے سے میری تائید یا تردید کردے"۔ میری رائے میں حضرتِ اثر نے تردیدِ اعتراضات میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی اور کما حقہٗ دادِ تحقیق دی ہے۔

مضمون میں جہاں کہیں اسناد و شواہد کی کمی رہ گئی ہے میں لغت کے حوالہ جات سے پورا کئے دیتا ہوں۔

حوالہ جات کے علاوہ بعض مواقع پر مضمون تشنۂ توضیح و تصریح رہ گیا ہے وہاں اپنی جانب سے مختصر مگر مفید تشریح و تفسیر بھی کر دی ہے تاکہ جناب اثر کا مفہوم واضح تر ہو جائے۔

کلیم صفحہ ۱۶۹: ————— -

مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر
کر دے اسے اب چاند کے غاروں میں نظر بند

اعتراض:- فکر کو مذکر اور غار کو مؤنث خلافِ مذہب فصحا نظم کیا گیا۔ فکر مؤنث ہے اور غار مذکر۔

جواب مزیل۔ فکر مذکر خلافِ مذہب جمہور نہیں ہے، اور یہ صحیح نہیں کہ فکر لکھنؤ میں بلا اختلاف مؤنث ہے۔ اسیر لکھنوی۔ از دستور الشعرا صفحہ ۱۲۷

قرار آ ہی گیا غم میں دل سنبھل ہی گیا
گئے وہ دن کہ جو تھا فکر جان جانے کا
(اسیر)

ڈاکٹر اقبال اور حضرتِ معترض کے اُستاد فصیح الملک داغ دہلوی۔ از دستور الشعرا صفحہ ۱۲۷

گذر جائے گی ہر صورت کروں کیا داغ اندیشہ
مرے مولا کو خود ہی فکر ہے میرے گزارے کا
(داغ)

غار بالاتفاق مذکر ہے۔ اور ڈاکٹر سر اقبال نے بھی شعر مبحوث عنہ میں مذکر ہی نظم کیا ہے کوئی شخص بھی نہیں کہہ سکتا کہ شعر مذکور میں غار مؤنث ہے کیا و۔ ن سے مذکر کی جمع نہیں ہوتی۔ ہار۔ خار مذکر ہیں اسی طرح اُن کی جمع بھی۔ و۔ ن سے ہاروں۔ خاروں۔ آئی ہے۔ رہا حرفِ اضافت (کے) یا (کی) اس کی ذمہ داری کاپی نویس پر۔ نہ اقبال پر

اعتراض:- ذرا اس شعر کی عروضی شان دیکھئے ؎

یوں دادِ سخن مجھکو دیتے ہیں عراق و پارس
یہ کافرِ ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز

پہلا مصرع قیدِ بحر و وزن سے خارج ہے اور کچھ ایسا مبہم اور مہمل ہے کہ باوجود کوشش اُسے صحیح بھی نہیں کہا جا سکتا۔

یعنی عراق و پارس کسی طرح بھی اس مصرع میں نظم نہیں کئے جا سکتے۔

اس کی تردید میں حضرتِ آثر نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا ہے کہ کوئی لغت کی کتاب موجود نہیں ہے۔ مگر بدُون حوالہ کتاب بھی موصوف نے جواب صحیح دیا ہے کہ پاؔرس میں رؔ متحرک نہیں ہے اور پارس بر وزن یافت ہے نہ کہ بروزن آمد۔

مجھے تعجب ہے کہ جنابِ سیمابؔ اکبرآبادی جو رسالہ عرُوض کے مولف ہی نہیں ہیں بلکہ قدیم عرُوض کے ناسخ اور جدید عروض کے مدوّن بھی ہیں۔ کس طرح پہلے مصرع کو قیدِ بحر و وزن سے خارج فرماتے ہیں۔ ہم کو ایک عروضی ماہر سے یہ توقع کسی طرح نہیں ہو سکتی کہ وہ اس مصرع کو قیدِ بحر و وزن سے خارج بتائے۔ واقعہ یہ ہے کہ جناب سیماؔب کو لفظِ پاؔرس کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ اس کا صحیح حلیہ کیا ہے۔ اُن کے خیال میں بحرکت رائے بروزن آمد ہے۔

حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔

(۱) پاؔرس یکسر حرف این لفظ کہ رائے مہملہ باشد۔ اکثر از وزن شعر زاید می آید وساکن باشد یعنی ملک فارس۔ (ازغیاث)

(۲) پارس نامِ ولایتے و در استعمال یک حرف پاؔرس زیادت از وزن آمدہ است (موید الفضلا)

(۳) پارس نام ملک بارائے موقوف است نہ برائے متحرک۔ (تحفۃ الشعرا)

(۴) پارس نام ولایتے در استعمال یک حرف پارس زیادت از وزن آمدہ است۔ (کشف اللغات)

(۵) پارس نام ملکیت عوام بحرکتِ را خوانند۔ (ازاحۃ الاغلاط)

جس شخص نے گلستانِ سعدی شیرازی کے ابتدائی دو ورق پڑھے ہوں گے سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ قطعہ ضرور اُس کی نظر میں ہوگا۔ قطعہ

اقلیمِ پارس راغم از آسیب دہر نیست
تا برسرش بود چو توائے سایۂ خدا
یارب ز بادِ فتنہ نگہدار خاکِ پاؔرس
چندانکہ خاک را بود و آب را بقا

مفعُول فاعلات مفاعیل فاعلن یا فاعلات۔ مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف یا مقصور۔

تقطیع:- اقلیم مفعول پار راغ فاعلات مز آسیب مفاعیل دہر نیس فاعلن۔ یارب ز مفعول باد فتن فاعلات نگہدار مفاعیل خاک پار فاعلات، دیکھیئے دونوں مصرعوں میں لفظ پاؔرس بسکوُن را نظم ہوا ہے اور حرف (س) ساکن سوم ہے تقطیع سے ساقط ہے۔

یہ ہے لفظ پاؔرس کا صحیح حلیہ اور یہ ہے صورتِ استعمال۔

جس طرح سعدیؒ کے آخر مصرع میں لفظ پاؔرس نظم ہوا ہے اسی طرح سر اقبال کے آخر مصرع میں موزوں کیا گیا ہے ؎

یوں داد سخن دیتے ہیں مجھکو عراق و پارس

مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلان۔ ہزج مثمن اخرب مکفوف مجبوب مبغ

تقطیع۔ یوں داد مفعول سخن دیتے مفاعیلن ہے مجک مفعول عراق و پار مفاعیلان دیکھیئے یہاں بھی (س) ساقط التقطیع ہے۔

فردوسی　　بکا ہو کپِ زرد در مہد عاج
سوئے پارس رفت آن خداوند تاج

اشعار قاآنی

مانم چرا پارس کہ نبود دراں دیار　　نے آب و خاک نے شتر و گاؤ خر را
درست ہواست کہ در ملک پارس فتنہ نیشند　　یکے ز خلق بہ پرسش آں دو چشم غنان را
اے اہل پارس مژدہ کہ از فضل کردگار　　آمد بملک پارس امید بزرگوار را
اگرچہ پارس گلستانِ عشرت است ولے　　چو نیست بخت بہ شادی دہد گر تا ز
مرا او را ملک یزد و پارس بخشید　　لقب دادش بصاحب اختیاری
ز دجلہ تا لبِ جیحوں ز طوس تا سر پارس　　ز پارس تا در شوشی ز رشت تا شستر

اب عروضی شان بھی دیکھیئے۔

عام قاعدۂ عروض ہے کہ ساکن سوم جہاں کہیں بھی ہوگا ساقط ہو جائے گا اور محسوب التقطیع نہ ہوگا کیونکہ اوزان عروض میں تین ساکن متوالی کیں نہیں۔ تیئے فارسی اور اُردو میں ایسے الفاظ ہیں جن کے اواخر میں تین ساکن حروف ہوتے ہیں اور سنسکرت اور انگریزی میں تو چار ساکن بھی الفاظ میں پائے جاتے ہیں، جیسے چار اسٹر بسکوُن الف، سین، ٹے، رے اور اسپارکس (Sparks) بسکون الف و رے و کاف و سین اس قاعدہ کی بنا پر ساکنِ سوم اکثر ساقط ہو جاتا ہے جیسے اس مصرع سیفی میں ؎

کارد برکشِ گوشت برگشتاسپ را

کارد کی دال گوشت کی تے اور گشتاسپ کی پے ساقط از تقطیع ہیں۔ کار برکش فاعلاتن گوش برگش فاعلاتن تاس را فاعلن۔ (از عروض قاضی جہاں سیفی)

یا جیسے اس مصرع میں ؎

نیست شکل زیست یا بد از لبت طہورث گر

نیست اور زیست کی تے طہورث کی ثے ساقط التقطیع ہیں۔ نیس شکل فاعلاتن زیس
یا بد فاعلاتن از لبت طہ فاعلاتن مورث گر فاعلن۔ (از قواعد العروض)

کار دا گوشت۔ نیست۔ زیست بروزن پارس ہیں۔

بعض اساتذہ نے تو ساکن دوم کا بھی سقوط جائز رکھا ہے۔ حضرت مولانا نظامی گنجوی علیہ الرحمۃ کے مشہور قطعہ کا شعر ہے۔

پاسے از شب بگذشت بیشترک یا کمتر
رندے از غرفہ بروں سر و سرو رخ بنمود

تقطیع۔ پاس ز شب فاعلاتن بگذش بے فعلاتن شترک یا فعلاتن کمتر فعلن
دیکھئے تے ساکن دوم صاف اڑ گئی۔

یہ قاعدہ بلا استثنائے اعلام و افعال تمام الفاظ پر عام اس سے وسط مصرع میں ہوں یا اواخر مصرع میں حادی ہے۔

مجھے امید کرنا چاہیئے کہ جناب سیماب اکبرآبادی مُدیر شاعر اس سامعہ خراشی کے بعد مطمئن ہو جائیں گے۔

اعتراض ۵

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر　　حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے　　اُسے بازوئے حیدرؑ بھی عطا کر

پہلے بیت میں خطاب انسان سے ہے اور دوسرے میں خدا سے، ایک ہی رباعی (قطعہ) میں یہ تغادتخاطب فنّی اعتبار سے ناروا، ناجائز اور قابلِ اعتراض ہے۔

اس کا جواب حضرتِ اثرؔ نے یہ دیا ہے: "جناب معترض لفظ کبریا کے معنی نہیں سمجھے۔ خدا کے علاوہ اس کے اور بھی معنی ہیں اور یادداشت سے کہتا ہوں۔ (لغت موجود نہیں) کہ اس سے جلالتِ استغنا کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔ اسی سے عدم واقفیت کی بنا پر حضرتِ معترض سے تسامح ہوا"

اب میں صرف لغات کا حوالہ دے کر سند استعمال پیش کئے دیتا ہوں۔
کبریا بالکسر بمعنی بزرگی (از منتخب) کبریا۔ بزرگی عزت۔ بڑائی۔ شان مرتبہ (لغات سروری)
اسناد۔ سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ از "بوستان"

مرا در رسد کبریا و منی
کہ ملکش قدیم است و ذاتش غنی

دیکھئے اس شعر میں بالفاظ حضرتِ اثرؔ جلالتِ استغنا کا مفہوم ادا ہوا ہے یعنی
اسم تبارک و تعالیٰ نہیں ہے۔ قاآنی

دو شم ندا رسید ز درگاہ کبریا
کے بندہ کبر بہتر از عجز بار یا

اس لفظ میں لفظ کبریا بمعنی اسم تبارک و تعالیٰ ہے اسی قصیدہ کا دوسرا شعر ہے ۔

یا رب بنور حجت قایم کہ تا قیام
قایم باد و ست قائمہ عرش کبریا

اس شعر میں جناب الٰہی سے تخاطب یا رب کہہ کر کیا ہے اس لئے عرش کبریا سے عرش الٰہی مراد نہیں ہو سکتی بلکہ عرش جلالت و تخت عظمت مراد ہے۔

تسبیح

اردو	عربی
پاک ہے مالک زمین و آسمان کا	سبحان ذی الملك والملكوت
پاک ہے مالک عزّت و بزرگی اور	سبحان ذی العزّة والهيبة
ہیبت اور قدرت اور بزرگی	والقدرت والكبرياء والكمال
کمال اور جمال اور غلبہ کا۔	والجمال والجبروت

یہ سند عربی میں کبریا بمعنی بزرگی کی ہے۔

اعتراض ۱۔ ۵

عشق کی تیغ جگردار اڑالی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

اوّل تو ساقی سے تیغ و نیام کے متعلق گفتگو ہی بے جوڑ ہے۔ دوسرے تیغ جگردار کی ترکیب غلط ہے۔ جگردار کی صحت میں ہمیں کلام ہے۔ بے جگر تو سنا ہے مگر جری یا مضبوط کے معنی میں جگردار کسی سے نہیں سنا۔ تیغ کو جوہر دار کہتے ہیں جگردار نہیں کہتے۔ یہ ترکیب ضعف تالیف کی تعریف میں آتی ہے۔

حضرتِ اثرؔ نے جواب تو وہی دیا ہے جو ایک معقول شخص کو دینا چاہیئے اور آخر میں لکھا ہے کوئی اللہ کا بندہ کسی معتبر کتاب لغت یا بہار عجم کے حوالے سے میری تائید یا تردید کر دے۔

مجھے صرف تیغ جگردار کی صحت سے تعلق ہے، مجھے اس سے مطلب نہیں کہ گفتگو بے جوڑ ہے یا نہیں، اس کا جواب حضرتِ اثرؔ دے چکے ہیں۔ تیغ جگردار کی ترکیب غلط ہے کیونکہ جناب داغؔ مرحوم نے نہیں لکھا، حضرتِ معترض نے نہیں دیکھا

اردو لغات میں نہیں آیا۔ اردو مصطلحات میں نہیں ملا۔ دہلی و اکبرآباد میں کسی سے نہیں سنا۔ فارسی غیر زبان ہے اس کا ایک دم ہائی بائیکاٹ کر دینا چاہیئے۔ فارسی فرہنگ و لغات متروک الاستعمال سب سوختنی ہیں یہ وجوہ ہیں جو ترکیب غلط کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہیں اور واقعاً ان وجوہ کے معقولیت میں کلام بھی نہیں ہے۔

میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ جگر دار اور تیغ جگر دار کے متعلق فارسی ادب کو پیش نظر رکھ کر لکھتا ہوں، اس کا فیصلہ ناظرین خود کریں گے کہ وجوہ اعتراض صحیح ہیں یا نہیں، ایک فارسی داں سے بعید ہے کہ وہ بغیر تحقیق ایسا اعتراض کرے جس کو تردید لغات متداولہ سے باسانی ہوسکے۔

جگر دار۔ جگر اور دار سے مرکب ہے دار داشتن کا امر ہے۔ ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ جگر داشتن مصدر مرکب کس معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

جگر داشتن۔ تاب و طاقت داشتن۔ طغرا

دارم دو ہزار دشنہ چوں بید
در کشتن خود جگر ندارم

جگر بمعنی تاب و طاقت بسیار آمدہ چنانچہ جری را جگر دار گویند

(از مصطلحات وارستہ)

جگر داشتن تاب و طاقت داشتن۔ (از غیاث اللغات)

جگر چیزے داشتن تاب و طاقت آں داشتن (از بہار عجم)

ان اسناد سے واضح ہے کہ جگر داشتن بمعنی حوصلہ و بہادری ہے اور جگر دار بمعنی حوصلہ مند و بہادر ہے۔

اب صرف یہ اور دیکھنا ہے کہ جگر دار تیغ کی صفت ہوسکتی ہے یا نہیں بہار عجم میں صفات تیغ میں بہت سے الفاظ سیماب گوں۔ سیماب ریز۔ جگر شگاف وغیرہ کے ساتھ جگر دار بھی لکھا ہے، جگر دار کو ردیف جیم میں جداگانہ لغت قرار دیکر لکھا ہے۔

جگر دار کنایہ از مرد دلیر و بیباک و اطلاق آں بالفظ تیغ نیز آمدہ۔

صائب ؎

در قبضۂ گردوں ستم آں تیغ جگر دار
کز سختی ایام مرا سنگ فشاں است

اب یہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ تیغ جگر دار کی ترکیب غلط ہے اور جگر دار کی صحت میں بھی کلام ہے۔ حضرت سیماب کا یہ ارشاد کہ بے جگر تو سنا ہے مگر جری یا مضبوط کے معنی میں جگر دار کسی سے نہیں سنا۔ کسی کا سننا یا نہ سننا کوئی دلیل استقرائی نہیں ہوسکتا۔

اردو میں اکثر بہادر شخص کو کہا کرتے ہیں کہ وہ بڑے بے جگر ہیں۔ محاورۂ اردو مسلم۔ لیکن سر اقبال کے شعر میں فارسی ترکیب ہے۔ فارسی زبان کے متعلق کہنا چاہیئے تھا کہ فارسی میں بے جگر بمعنی بہادر نہیں آیا۔ اردو کے محاورہ کو فارسی کے لئے معیار صحت قرار دینا فارسی زبان سے انتہا درجہ کی بیگانگی ہے۔ سر اقبال اردو کی طرح فارسی کے بھی مستقل شاعر ہیں۔ اُن کے اردو کلام میں فارسی تراکیب کو فارسی ادب کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ یہی بات جناب سیماب نے پیش نظر نہیں رکھی۔

فائدہ۔ اکثر الفاظ فارسی و عربی زبان کے اردو میں اپنی لغوی معنی کے خلاف مستعمل ہیں، جیسے سرپرست فارسی میں بمعنی خادم ہے اردو میں بمعنی مربی مستعمل ہے۔ عرصہ لغات عربی میں بمعنی میدان اور اردو میں زمانہ کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بے جگر بھی اردو میں جری کی بمعنی بولا جاتا ہے۔ اور صحیح ہے۔ لیکن فارسی نہیں۔ غیاث اللغات میں ہے بے جگری بمعنی بینائی کہ ضد بہادری ست۔ پس بے جگری بمعنی نامرد و بزدل ہے۔ ناصر علی کے دیوان میں ایک غزل کا مطلع ہے ؎

ہمچو پیل بے جگر بگریز د از میدان ما
بشنود گر کوہ آواز غضنفر خان ما

اس مطلع میں بے جگر بمعنی ڈرپوک ہے۔ تحفۃ الشعراء میں لکھا ہے کہ بے جگر آنچہ در اردو بمعنی بہادر شہرت دارد غلط است۔

یہ غلط بلحاظ محاورۂ فارسی ہے نہ باعتبار محاورۂ اردو۔ دونوں میں بون بعید ہے۔

جہاں تک حضرت آثر نے دعوت شرکت دی تھی میں نے وہیں تک اپنے مضمون کو محدود رکھا میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کہاں تک اس بحث و تمحیص میں کامیاب ہوسکا ہوں، اس کا فیصلہ حضرت آثر اور دیگر ناظرین کلیم پر چھوڑتا ہوں۔ مجھے حضرت سیماب سے بھی کوئی عناد و اختلاف نہیں ہے۔ میں اُن کو دور حاضرہ کا نہایت کامیاب شہرت شاعر جانتا ہوں۔ لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر کامیاب شاعر محقق بھی ہو۔

شاعری امر آخر ہے اور محقق امر دیگر

برقِ رہ گذر

جو کوئی یوں سرِ رہ دِن کے وقت لُٹ جائے
وہ کیا کرے غمِ دل کو اگر کہے بھی نہیں

وہ ایک برقِ تجلی جو دل کے خرمن پر
نہ چاہے گرنا مگر بے گرے رہے بھی نہیں

وہ اُن کی مانگ میں سیندور میرے دل میں تپش
وہ شمعیں ہیں جنھیں کوئی بُجھا سکے بھی نہیں

لیا سلام نگاہوں کا یوں نگاہوں سے
کہ جانتے ہیں مجھے اور جانتے بھی نہیں

غرور اُن کا مرے سوزِ تازہ دم کی کشش
وہ جا سکے بھی نہیں اور ٹھہر سکے بھی نہیں

جمی ہوئی ہے زمیں پر نگاہ میرے قریب
وہ دیکھتے ہیں مجھے یوں کہ دیکھتے بھی نہیں

کبھی نگاہ میں یہ سعیِ رائگاں اُن کی
کہ مجھکو دیکھ بھی لیں اور نظر ملے بھی نہیں

کبھی ہنسے تو ملائی نہ پھر نگہ مجھ سے
کبھی نگاہ ملائی تو پھر ہنسے بھی نہیں

تڑپ رہی ہے رگ و پے اُن کے وہ بجلی
جلا بھی دے مری تمکیں کو اور گرے بھی نہیں

زفرق تا بہ قدم وہ پیام ہیں دونوں
جو کہہ سکے بھی نہیں اور چھپا سکے بھی نہیں

کہا یہ اُن کے تبسم نے آرزو سے مری
کہ روکتے بھی نہیں اور مانتے بھی نہیں

عجیب قسم کا ارمان ہے مرے دِل میں
کہ رہ سکے بھی نہیں اور نکل سکے بھی نہیں

مآلِ سوزِ تصادم کا کیا کہیں میکش
اگرچہ مر نہ سکے ہم مگر جیے بھی نہیں

میکش اکبر آبادی

مُرجھائے ہُوئے پھُول

از مجنوں گورکھپوری

لکھنؤ۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۳۱ء

پیاری نوشابہ

شکایت نیست مطلب نالہ آہنگ است می نالم
ز دل تنگی نمی نالم دلم تنگ است می نالم

خط بھی ملا اور باسی ہار بھی۔ قبل اس کے کہ کچھ اور کہوں ان ہدیوں کو شکریہ قبول کرو۔ آج آٹھ برس سے تم مجھ کو برابر اپنے پہنے ہوئے پھول یادگار رکھنے کے لئے دیتی رہی ہو اور اس کو اپنا وظیفہ سمجھے ہوئے ہو۔ یہ میرے لئے معمولی بات نہیں ہے۔ یہ تمہارا ایسا زبردست احسان ہے جس پر مجھے قربان ہو جانا چاہیئے۔ خدا تم کو خوش رکھے، اور تمہاری آئندہ زندگی کو ہموار و خوشگوار بنائے۔ لیکن اگر اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہوں کہ

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را

تو تم شاید مجھے کوسنے لگو اور کہو کہ یہ شخص زخموں پر نمک چھڑکتا ہے اس لئے کچھ نہ کہوں گا ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اب مجھے یہ کہنے کا حق حاصل ہے اور اگر نہ سنو تو تمہاری زبردستی ہوگی۔

تمہاری شادی آخر ہو گئی۔ یہ خبر خلاف توقع کسی طرح سے نہ تھی اور مجھے اس سے کوئی صدمہ نہ پہنچنا چاہیئے۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ دن تاریخ کی اطلاع مجھے قید ہی میں مل گئی تھی۔ لیکن میری اچھی نوشابہ نہ جانے کیوں اب یہ جان کر کہ آج تمہارے بیاہ کو چار دن ہو گئے اور یہ خط تم نے اپنے نئے گھر سے لکھا ہے میرے دل کی عجیب حالت ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی اور جس کو میں اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے تم سے کنارہ کش ہوئے دو برس ہو گئے جس دن سے میں نے تم کو چھوڑا اسی دن سے یہ معلوم تھا کہ اب میں تم کو نہیں پا سکتا اور تمہاری شادی کسی اور کے ساتھ یقیناً ہوگی۔ پھر آج جبکہ وہی ہوا جس کا ہونا اس قدر قطعی تھا تو میرا دل بیٹھا کیوں جاتا ہے۔ غالب کا یہ شعر اب میری سمجھ میں آیا۔

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

آج مجھے رہ رہ کر جوانمرگ مقتول و مظلوم یقین کا ایک شعر یاد آ رہا ہے:۔

کیے مجھکو یقیں اس ناتوانی نے خجل ورنہ
گلی کو یار کی لہو سے اپنے گلستاں کرتا

تم جانتی ہو یقین کون تھا؟ میری صحبت سے تم کو نہ سہی کہ اتنا فائدہ تو ہوا ہی ہے کہ تم بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے اردو و فارسی شاعر کے نام سے واقف ہو گئی ہو۔ یہ سچ ہے کہ اگر تمہاری خدا داد صلاحیت اور تمہاری اپنی تعلیم و تربیت اس درجہ کی نہ ہوتی تو میں تمہارے ساتھ کچھ نہ کر سکتا اور تم کو کچھ نہ دے سکتا۔ فیض رسانی کے لئے فیض پانے کی قابلیت پہلی شرط ہے جو تمہارے اندر بدرجۂ تمام موجود تھی۔ لیکن پھر بھی نوشابہ مجھ سے تم نے جو کچھ پایا اس کا بھی اعتراف کرنا ہی ہے۔ مگر اصل مطلب تو رہا جاتا ہے۔ اور وہ یہ تھا کہ تمہاری گلی کو میں اپنے لہو سے گلستان نہ بنا سکا۔ یہ حسرت قیامت تک خجالت بن کر ساتھ رہی۔

نوشابہ! میں نے جو سوال تم سے کبھی نہیں کیا وہ آج کرتا ہوں۔ یہ پھول تم نے کہاں پائے؟ جواب دو۔ پہلے تو میں نے یہ سمجھا کہ جب تک میں قید میں تھا تم مجھے ہفتہ وار پھول نہیں بھیج سکی تھی اسی لئے اب اکٹھا اتنے سارے پھول بھیج کر اس مدت کی خلا کو بھرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن پھر نہ جانے کیسے مجھے یہ خیال

آگیا اور دل میں بیٹھ گیا کہ یہ وہ پھول ہیں جن سے تم کو دولہن بنایا گیا تھا۔ نوشابہ! کیا تم انھیں پھولوں سے دولہن بنی تھیں؟ میرا یہ پوچھنا یقیناً فضول ہے۔ لیکن میں اپنے کو پوچھنے پر مجبور پاتا ہوں۔ تم کہوگی یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔ ہاں نوشابہ آج آٹھ برس سے تم مجھے اپنے پہنے ہوئے پھول اسی طرح دیتی رہی ہو اور گذشتہ دو سال سے جبکہ میں وطن اور تم سے دونوں سے دُور ہوں تم ہفتہ وار ڈاک سے برابر یہ پھول مجھے بھیجتی رہی ہو۔ میں تمہاری وضع داری کا قائل ہوں۔ تم بڑی پختہ مغز ہو۔ مگر نوشابہ! ان پھولوں سے عجیب قسم کی غیر مانوس مہک آرہی ہے۔ یہ پھول کیسے ہیں؟ اگر یہ وہی پھول ہیں جو میں ان کو سمجھتا ہوں تو تم نے میرے ساتھ بڑی بے دردی کی۔ تمہاری فطرت سے جو یکسر ضد اور بغاوت ہے یہ کوئی بعید بات نہیں۔ اسی لئے پوچھتا ہوں۔

مگر میرے لئے تو آج زندگی میں سب سے زیادہ سنگین، سب سے زیادہ ناقابلِ تردید اور سب سے زیادہ ناقابلِ قبول حقیقت یہ ہے کہ تمہاری شادی ہوگئی۔ تم پوچھتی ہو "کیوں؟" میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ جس بات کو دل قبول نہ کرے وہ ہمیشہ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے تم کو چھوڑے ہوئے تو دو سال ہوگئے لیکن خدا جانے یہ کیا منطق تھی کہ اس پر بھی تم کو اپنی ہی نوشابہ سمجھتا تھا اور اسی بھروسے پر جی رہا تھا۔ میری زندگی میں تمہاری کمی درا صل اب ہوئی ہے اور یہ احساس مجھے آج ہوا ہے۔

جان کو صبر ہے نہ دل کو ہے تاب
تو نہیں ہے تو زندگی ہے خراب

نوشابہ! تم اب کس کی ہو؟ اس کندۂ ناتراش کی جو نوشابہ اور ایک جاہل دہقانی عورت میں کوئی فرق محسوس کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا جس کے لئے ذائن اور بڑی دونوں ایک عنوان کی چیزیں ہوں اور عورت کا حکم رکھتی ہوں! .... مگر نہیں۔ نوشابہ! مجھے معاف کرو۔ للہ معاف کردو۔ وہ تمہارا شوہر ہے۔ تمہاری زندگی اب اس سے وابستہ ہے۔ دنیا میں مجھ سے بہتر لوگ ہیں۔ ممکن ہے نعمان بھی مجھ سے بہتر ہو اور مجھ سے بہتر تمہاری زندگی کا ذمہ دار بن سکے۔ دنیا کی معاشرت میں محض حسن لطیف اور ندرتِ ذوق سے کام نہیں چلتا۔ زندگی کو جو لوگ یکسر شعر و موسیقی سمجھے ہوئے ہیں وہ سراب کو پانی سمجھ رہے ہیں۔ نعمان کو میں اچھی طرح نہیں جانتا۔ مجھے اس سے بہت کم سابقہ رہا ہے۔ میری اس کی طبیعت میں بچپن سے بیگانگی تھی۔ اتنا جانتا ہوں کہ دنیا کے معاملات میں وہ مجھ سے کہیں زیادہ سوجھ بُوجھ رکھتا ہے اور زندگی کو مادّی حیثیت سے کامیاب بنانا خوب جانتا ہے۔ حکمتِ عملی، مصلحت اندیشی، زمانہ شناسی میں بچپن ہی سے وہ مشہور تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسا شخص جاہ و ثروت میں ترقی نہ کرے تو اس کو محض بدبختی کہیں گے۔ لیکن نعمان کی قسمت کا ستارہ بھی حسبِ مراد گردش کر رہا ہے۔ اس کو عروج بھی میسّر ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ مجھ سے زیادہ وہ تمہاری زندگی کو کامیاب نہ بنا سکے۔ کم سے کم میری یہی دعا ہے اور یہی امید۔ یہ تو میں نہ جانے کس ہیجان و اضطراب میں ایسی ناشائستہ اور رکیک باتیں لکھ گیا۔ دنیا میں شعر و ادب، نزہت و لطافت، خلوص و معصومیت کے علاوہ بھی بہت سی خوبیاں ہیں جو شوہر اور بیوی کے تعلقات کو پائدار اور خوش آئند بنانے کے لئے بے حد ضروری ہیں اور جو مجھ سے بدرجہا زیادہ نعمان میں نظر آئیں گی۔ وہ یقیناً تمہارے حق میں شوہر کی حیثیت سے ایک برکت ثابت ہوگا۔ میری ہرزہ سرائیوں کو معاف کردو اور بھول جاؤ۔ لیکن پھر بھی اتنا تو کہہ لینے ہی دو کہ اگر تم مجھے مل جاتیں جن کا تصوّر بھی استحالہ تھا تو میں تم کو وہ بناتا جو کوئی دوسرا نہیں بنا سکتا۔ نعمان تم کو صرف اپنی بیوی بنائے گا۔ میں تم کو اپنا معبود بناتا .... مگر خیر۔

جاتے ہو جاؤ ہم بھی رخصت ہیں
ہجر میں زندگی کی مدّت کیا!

میں تم کو دردمند کی مثنوی کے اشعار اکثر سنایا کرتا تھا اور تمہاری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ آج آخری بار بھی ایک شعر سن لو۔

یہی تھا لکھا میری قسمت میں جان
قیامت تھا سب ہجر و وصل اک آن

معلوم نہیں آج تمہاری آنکھوں میں آنسو آئے کہ نہیں۔ میری آنکھوں میں تو آئے نہیں۔ اول تو میری آنکھوں میں آنسو رہے نہیں۔ دوسرے جس بات کو زندگی کی سب سے زبردست حقیقت مان لیا جائے اُس پر کوئی کیا روئے۔ تم اس کو میرے تخیّل کی خرابی کہوگی۔ لیکن نوشابہ ہجر ہی کا دوسرا نام زندگی ہے۔ اور شاعر موت کو وصال اسی لئے کہتا ہے کہ اس سے ہجر کی میعاد پوری ہوجاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد بھی وصل میسّر نہ ہو اور ہجر کی پھر دوسری میعاد شروع ہوجائے۔ مگر میں بھی بہک کر کہاں پہنچا!۔

ہاں تو تمہارا بیاہ ہوگیا! تم اب بیگم نعمان ہو! خدا مبارک کرے اور تمہارا مستقبل یکسر کیف و مسرت ہو۔ تمہاری زندگی میں اس چیز کی ارزانی ہو جو میری

قسمت میں نہ تھی ۔ نوشابہ ! مقدر بھی کیسا طرفہ ماجرا ہے ! کبھی دو آدمیوں کا مقدر ایک نہیں ہوتا ۔ اسی لئے اب کبھی کبھی مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ زندگی کی اصل حقیقت انفرادیت ہے ۔ اور یہ محبت اور خود باختگی کا دعویٰ محض فریب ہے ۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ اپنے مقدر میں مبتلا ہے اور اس کی تکمیل کر رہا ہے ۔ اب ذرا تم بھی اس مسئلہ پر غور کرو اور جواب دو ۔ خواہ مخواہ طنز و طعن کو راہ نہ دو ۔ ذرا اپنی اور میری قسمتوں کا مقابلہ کرو ۔ تم کو دولہن بنے ہوئے دو چار روز ہوئے ۔ اور مجھے قید سے چھوٹے ہوئے بھی کچھ اتنی ہی مدت ہوئی ۔ تمہارے لئے اس کا سامان ہے کہ کم سے کم کچھ دنوں تک تمہاری زندگی میں کچھ نئی باتیں ہوتی رہیں اور تم کو خستہ و درماندہ نہ ہونے دیں ۔ میں اپنی زندگی کو دیکھتا ہوں تو دور تک کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جو مجھے اپنے میں محو کئے رہے ۔ میری زندگی ایک ریگستان ہے جہاں سوا تھکا دینے والی ریت کے اور کچھ نہیں ہے ۔

تمہارے اس خط اور ان نئے ڈلے پھولوں نے اب سے آٹھ برس پہلے کی دنیا میرے پیش نظر کر دی ہے ۔ کچھ تمہیں بھی یاد ہے وہ تمہارے والد کا بمبئی سے پنشن لے کر آنا اور میرا پہلے پہل تم کو دیکھنا اور یہ محسوس کرنا کہ شفیع آباد میں ایک نئی جان پڑ گئی ہے ۔ تمہاری عمر اس وقت ۱۲ ، ۱۳ برس کی تھی ۔ لیکن تمہاری تعلیم و تربیت اور تمہاری اپنی دانائی اور بصیرت تم کو سب سے بلند و برتر بنائے ہوئے تھی میں خود اپنے کو تمہارے مقابلہ میں بے مایہ سمجھنے لگا تھا اور شاید آج تک سمجھ رہا ہوں ۔ پھر وہ چھ برس کا زمانہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے جو کم و بیش میں نے تمہارے ساتھ گذارے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ میں خود کو تمہارا اور تم کو اپنا سمجھ رہا تھا ۔ خود تمہارا خیال تھا کہ میرے سوا تم کسی کی نہیں ہوگی اور کسی کو اپنا نہیں بناؤ گی ۔ ہم اپنے اس زعم میں کس قدر بلند آہنگ اور بر خود غلط تھے ۔ اور پھر ساری دنیا جانتی تھی کہ مجھے تم سے اور تم کو مجھ سے عشق ہے ۔ ہمارے ماں باپ بھی اس کو مانتے تھے اور اپنی اپنی جگہ اس پر ناز بھی کرتے تھے ۔ اب معلوم نہیں لوگوں کا کیا خیال ہے ۔ مجھے اس زعم کو چھوڑے ہوئے تم جانتی ہو ایک زمانہ ہو گیا لیکن اب تم سے پوچھتا ہوں ۔ تمہارا اب کیا خیال ہے ؟ تم کس کی ہو ؟ اور میں کس کا ہوں ؟ تم نے آخر کار کس کو اپنا بنایا ؟ آہ نوشابہ !۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم نے خط میں ایک سنگین الزام مجھ پر لگایا ہے اور اس سے پہلے بھی کئی بار یہی الزام لگا چکی ہو ۔ نوشابہ یہ سچ ہے کہ کہنے کو میں نے خود تمہارے خیال کو چھوڑ دیا ورنہ اگر میں اپنی جگہ ثابت قدم رہتا اور میرے گھر والے اصرار کرتے رہتے تو تمہارے ماں باپ بھی رام ہو ہی جاتے اور کچھ نہیں تو قرابت کی پاسداریوں سے مجبور ہو کر آخر کار تم کو مجھ سے بیاہ دیتے ۔ لیکن نوشابہ تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ دراصل بات کیا تھی ۔ پھر جان کر انجان بنتی ہو ۔ اس کو کیا کہتے ہیں ؛ میں تمہارے والدین کے (اور شاید تمہارے بھی) اس خیال کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا کہ دولت و ثروت اور بخت و اقبال میں تم مجھ سے فائق ہو ۔ اور تم کو اس اعتبار سے تمہارے لائق شوہر ملنا چاہیئے جیسا کہ آخر ملا ۔ تم جانتی ہو اسی خیال نے میری آنکھیں کھول دیں ۔ بات کی بات میں میرے تمام التباسات دور ہو گئے ۔ پھر میں کیا سے کیا ہو گیا اور کہاں سے کہاں جا پہنچا ۔ اب مجھے احساس ہوا کہ شاہ و گدا کی تفریق کتنا بڑا ظلم ہے اور اس فساد انگیز حقیقت کو بھولے رہنا کہ کوئی محتاج ہے کوئی غنی ۔ کوئی آقا ہے ، کوئی غلام ، کتنی زبردست خود فریبی اور سہل انکاری ہے ۔ اپنی اور تمہاری مثال سے میں نے قیاس کرنا شروع کیا کہ آج سارے انسانی تمدن اور ساری ہیئت اجتماعی کی بنیاد اسی غیر انسانی تفریق پر ہے ۔ پھر تم تو جانتی ہو کہ کیا ہوا ۔ اب میرے سر میں ایک ہی سودا تھا ۔ اپنی چند روزہ زندگی کا کوئی ایسا مصرف نکالو جس سے اس فرق و امتیاز کے مٹانے میں مدد ملے ۔ چاہے یہ مدد بجائے خود کتنی ہی حقیر اور ناقابل لحاظ ہو ۔ اس سے کم سے کم مجھے یہ تسکین ہوگی کہ میں اس حد فاصل کو توڑنے میں حصہ لے رہا ہوں جو میرے اور تمہارے درمیان حائل ہے اور جو ہزاروں بندگان خدا کے درمیان بے معنی مدارج قایم کئے ہوئے ہے ۔ بڑی حیرت ہوئی کہ میرے سر میں یہ سودا سما گیا ورنہ نوشابہ مجھے تم سے نفرت ہو جاتی اور میں اس نفرت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا ۔ میری شادی اگر تمہارے ساتھ ہو بھی جاتی تو بھی میں اپنے دل میں یہ کھٹک لئے رہتا کہ تم مجھ سے زیادہ دولتمند ہو اور یہ کھٹک ہمارے دو دلوں کو کبھی ایک نہ ہونے دیتی ۔ تم کو اپنے سے زیادہ خوبصورت اپنے سے زیادہ لائق اور ہوشمند ، اپنے سے زیادہ ذی علم ماننے میں میرے لئے سکون تھا ۔ حالانکہ کوئی اس کو تسلیم نہیں کرے گا اور خود تم کو بھی یہ ماننے میں تامل ہوگا کہ تم مجھ سے زیادہ ذی علم اور دانا ہو اس لئے کہ کم سے کم دنیا کے کہنے کے لئے میں نے تم سے کہیں زیادہ تعلیم پائی ہے اور عالم و فاضل سمجھا جاتا ہوں ۔ مگر نوشابہ

میں یہ بھی مانتا تھا کہ تمہارا ذوقِ علم و ادب زیادہ سنجیدہ اور زیادہ صحیح ہے لیکن اس سونے چاندی کے امتیاز نے مجھے تم سے بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ یہ خیال میرے لئے ایک کانٹا تھا کہ تم مجھ پر دولت و ثروت کی فوقیت رکھتی ہو۔ یہ خیال سراسر سفلہ پن تھا۔ اور ہم دونوں کو گندہ اور ناپاک کر رہا تھا۔

بہر حال یہ تھی میری اس دو سالہ زندگی کی ابتدا۔ اس کی انتہا کیا ہو گی؟ یہ سوال بے معنی ہے۔ شمع کا آغاز و انجام ہی کیا؟۔ جلنا اور جل بجھنا۔ جو آغاز تھا وہی انجام ہے۔ مولانا رومؒ کا ایک شعر ہے ۔

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بُدم۔ پختہ شدم، سوختم،

میری زندگی کا ماحصل بھی یہی رہا۔ البتہ یہ خیال چین لینے نہیں دیتا، کہ میں پختہ ہونے سے پہلے ہی جل جاؤں گا۔ نوشابہ! ہر چیز کی اصلیت اس کا آغاز ہے۔ انجام کی نہ کوئی اصلیت ہے نہ اس کا کوئی اعتبار۔ تمہیں بتاؤ جس محبت کی میں نے اور تم نے اس ولولے اور فراخ دلی کے ساتھ ابتدا کی تھی، اُس کی حقیقت سوائے اس کے آغاز کے اور کیا ہے؟ انجام تو کچھ رہا نہیں!۔

تم نے بڑے طنز کے ساتھ پوچھا ہے "کہو تمہاری قوم کا کیا حال ہے اور تمہارے ہندوستان کا کیا مستقبل ہے؟" میں جانتا ہوں کہ اس سوال سے تمہارا اصلی مقصد کیا ہے؟ اور اس کا محرک کونسا جذبہ ہے، ورنہ عام حالات سے تم بے خبر نہیں ہو۔ تم میری زبان سے یہ سنکر خوش ہونا چاہتی ہو کہ یہ ساری شورش بے نتیجہ ثابت ہوئی، اور میرا ہر زعم غلط نکلا۔ ہاں نوشابہ تم اس خیال سے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لو۔ ہمارا سارا شور و غل ایک بھبکا ہی رہا، اور کسی خواب کی کوئی تعبیر نہیں نکلی۔ میں اس نمک کی شورش اور مالگذاری کی مخالفت سے بہت کچھ امیدیں لگائے ہوئے تھا۔ مجھے یہ تحریک ہندوستان کی پچھلی تحریک سے زیادہ معقول زیادہ مستقل اور زیادہ جاندار معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد ایسی چیزوں پر تھی جن کا تعلق جمہور کی زندگی سے بھی اسی قدر ہے جس قدر کہ معدودے چند امرا اور اعیان کی زندگی سے۔ نمک اور خدا کی دی ہوئی زمین پر محصول لگانا ایسا اندھیر ہے جو قضا و قدر کی زبردستیوں سے بھی بڑھ گیا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اب کے مرتبہ کا سیاسی شور کچھ نہ کچھ حاصل کر کے دم لے گا۔ لیکن اس نے تو ایسا دم توڑا کہ اب عرصہ تک کوئی نئی تحریک شروع ہوتی نظر نہیں آتی۔ اللہ اللہ! جس وقت ہم لوگوں نے اس نمک اور مالگذاری کے جہاد کے لئے تیاریاں شروع کی تھیں اس وقت ہمارے دل میں کیسی کیسی امنگیں تھیں! اور آج ہر طرف ایک سناٹا ہے۔ نہ کانگریس میں جان ہے۔ نہ ہمارے سرداروں میں زندگی کے کوئی آثار باقی ہیں۔ ہر چیز پر سستی چھا رہی ہے اور ہر شخص جماہیاں لے رہا ہے۔ تم کو یہ کہنے کا حق ہے اور تم یہ کہہ سکتی ہو۔

اب کہیں آسیٔ نالاں ہے نہ قیس و فرہاد
کیا ہوئے کنگرۂ عرش ہلانے والے

میں خود بھی سوچ رہا ہوں۔ آخر یہ اُداسی اور بے حسی کب تک رہے گی۔ اور اس کا حشر کیا ہوگا؟ کاش کسی گوشہ سے کوئی ہلاکو یا چنگیز ہی اُٹھ کھڑا ہو اور وہ لوٹ مار ہی شروع کر دے؟ کاش کسی طرف سے ظلم و استبداد ہی کی تحریک ہو اور کشت و خون کا بازار گرم ہو جائے۔ پھر کچھ ردِ عمل ہو۔ کچھ صدائے احتجاج بلند کی جائے۔ کچھ دار و گیر کا ہنگامہ برپا ہو اور سوتی ہوئی دنیا پھر جاگ اُٹھے۔ مگر نوشابہ یہ اداسی صرف ہندوستان پر مسلط نہیں ہے بلکہ دنیا کے کسی حصہ میں بھی آج کوئی حرکت و زندگی نہیں پائی جاتی اور کنگرۂ عرش ہلانے والوں کا ہر جگہ کال ہے۔ اس لئے اکیلے ہندوستان کو طعن و ملامت کا نشانہ نہ بناؤ۔

مگر تم نے تو در اصل مجھ پر طعن کیا ہے اور میری ناکامیوں پر ہنسی ہو۔ نوشابہ میں تمہاری محبت میں بھی ناکام رہا، وہ ناکامی تنہا میری ناکامی تھی۔ یہ ناکامی ایک خلق اللہ کی ناکامی ہے۔ تم اُس ناکامی کا تو مجھے طعنہ دے سکتی ہو۔ لیکن میری یہ ناکامی تمہاری زد میں نہیں آتی۔ نوشابہ اب اگر میں کامیاب ہوا تو میرے ساتھ خدا کی ایک دنیا کامیاب ہوگی۔ اور میں مایوس نہیں ہوں۔ وہ زمانہ آکر رہے گا جبکہ دنیا میں خواجگی اور بندگی دونوں باقی تو رہیں گی، لیکن دونوں میں بلند و پست کا کوئی فرق تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ جیسا کہ آج کیا جا رہا ہے۔ آقا اور مزدور میں صرف اتنا امتیاز باقی رہے گا کہ ایک کا کام کام کرانا ہے اور دوسرے کا کام کرنا۔ دونوں کو اپنے اپنے کام سے کام ہو گا۔ اور دونوں کا مرتبہ مسلم رہے گا۔ نہ حاکم کو محکوم سے کوئی ضد اور کد ہوگی نہ محکوم کو حاکم سے۔ میرا ایمان یہ ہے کہ آقا اور مزدور دونوں یکساں آزاد اور آسودہ ہو کر رہیں گے۔ صفحۂ ہستی پر اس وقت جو قوم ہے اس کو غلام اور محتاج ہو کر نہیں رہنا ہے۔ ہندوستان بھی ہمیشہ اس بندگی اور بیچارگی میں مبتلا نہیں

رہ سکتا۔ اس وقت اس پر جو اد بار بھی چھا رہا ہو اس کو ایک دن زندہ ہو کر فروغ پانا ہے۔

اس وقت کی فضا افسردہ اور مکدر کرنے والی ضرور ہے اور میں بے انتہا افسردہ اور مضمحل ہو رہا تھا۔ لیکن نوشابہ تمہارے خط نے رہی سہی سکت میرے دل سے چھین لی، اور میں ایسا محسوس کرنے لگا ہوں کہ میرے جیتے جی اب ہندوستان میں کچھ نہیں ہو گا۔ ممکن ہے یہ محض ایک توہم ہو جو میرے اپنے ذاتی جذبات کا نتیجہ ہو۔ جو کچھ بھی ہو مجھے اطمینان ہے کہ کبھی نہ کبھی ہمارے ہندوستان کا بھی ستارہ چمکے گا اور اس کا بھی زندوں میں شمار ہو گا۔

تمہارا ایک سوال میری سمجھ میں نہیں آیا تم نے لکھا ہے :-

کہوں کون ہے وہ جواہر مثال
بسے کس کے سینے میں اے میرے لال

اور پھر کہتی ہو "سنا ہے آج کل پریوں کے جھرمٹ میں گھرے رہتے ہو۔ اور اُن میں سے کسی خاص پری کہ جس کا نام مجھے معلوم نہیں تم کو سایہ بھی ہو گیا ہے۔ خدا کرے یہ خبر غلط نہ ہو اور دنیا میں کوئی ہستی تو ایسی نکل آئے جو تم کو عمر بھر اپنا بنائے رہ سکے"

نوشابہ سب سے پہلے تو مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ تم اب بھی مجھکو "اپنا لال" کہہ سکتی ہو۔ یہ کس منہ سے؟ اگر میں اس کے جواب میں صرف یہ کہہ دوں تو بھی تم کو چپ ہو جانا چاہیئے۔

عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

لیکن یہ بات میرے کہنے کی نہیں ہے جو تمہارے سوچنے کی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں تمہاری بات سمجھا ہی نہیں۔ تمہاری مراد کس سے ہے؟ نمک کی شورش۔ ہڑتال بدیشی کے مقاطعہ اور دوکانوں کے محاصرہ میں کئی عورتیں میری سرکردگی میں شریک رہی ہیں، اور اُن میں سے دو ایک ایسی بھی ہیں جن کو میرے ساتھ غیر معمولی انس ہو گیا ہے۔ لیکن نوشابہ میں ان سب کو تمہاری بہنیں سمجھتا ہوں۔ ان میں سے ایک پاربتی ہے جس کے حوصلے اگر میں بڑھاتا تو آج وہ میرے قدموں سے لگی میری پوجا کرتی ہوتی۔ شاید تمہاری مراد اسی سے ہے اس لئے کہ قریب و دور مشہور ہے کہ وہ میرے ساتھ والہانہ وابستگی رکھتی ہے اور میں بھی اس کا گرویدہ ہوں۔ لیکن نوشابہ

تم نہ مانو کہ یہ اغیار کی افواہیں ہیں

پاربتی کو مجھ سے جو بھی تعلق خاطر پیدا ہو گیا ہو مجھے اس سے صرف اس قدر سروکار ہے کہ وہ میرے ساتھ اس شورش اور ہنگامہ میں شروع سے آخر تک شریک رہی۔ تمہارے بعد اگر واقعی پھر کوئی عورت میری زندگی میں آئی ہے تو تم کو یہ سنکر دھوکہ لگے گا کہ وہ ایک مالزادی ہے جس کا نام شیاما ہے اور جو بنارس کی سب سے زیادہ دولت مند اور ممتاز کسبی ہے۔ وہی حسن خیز اور عبادت انگیز بنارس جس کو غالب نے "کعبۂ ہندوستان" بتاتا ہے اور جہاں کے معشوقوں کے بارے میں اُن کا تجربہ یہ ہے :-

بتانش چو زرۂ مہر جو شند | شکر گویند و گوہر می فروشند
قیامت قامتاں مژگاں درازاں | زمژگاں بر صف دل نیزہ بازاں
میا نہا نازک و دلہا توانا | زنادانی بہ کار خویش دانا

شیاما کہنے کو تو ایک بازاری عورت ہے۔ لیکن اس میں یہ تمام انداز دلبری بھر پور موجود ہیں۔ نوشابہ۔ اس کی صورت بہت کچھ تمہاری یاد تازہ کر دیتی ہے، اور پھر وہ تم سے کم دولت مند نہیں ہے۔ دیکھو دولت ایسی چیز ہے جو اس مذموم اور مکروہ طریقے سے بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ شیاما میں کوئی پندار نہیں ہے نہ عورت کا۔ نہ دولت کا۔ اور علم تو خیر اس کو نصیب ہی نہیں ہوا۔ اس اعتبار سے وہ مجھ سے اور تم سے دونوں سے بلند ہے۔ اور اس کے اندر ایثار اور خود گزاشتگی کی قابلیت بھی ہم دونوں سے زیادہ ہے۔ جب سے اس کی مجھ سے ملاقات ہوئی ہے اُس نے بڑے بڑے راجاؤں اور رئیسوں کو جوتی پر مار دیا ہے۔ اس نے اپنی ساری دولت میرے اشارہ پر چھوڑ دی ہے۔ وہ ہم دونوں سے زیادہ صاحب دل ہے۔ وہ ہم دونوں سے زیادہ خیرات کر سکتی ہے اور زیادہ صدق نیت اور فراخ حوصلگی کے ساتھ خیرات کر سکتی ہے وہ اپنے اوقات کا زیادہ حصہ چرخہ کاتنے میں صرف کرتی ہے، صرف اس لئے کہ میں اس سے خوش ہوتا ہوں۔ میں نے اگر کبھی شادی کی تو اسی عورت سے کروں گا۔ تم بھی ذرا اس معاملہ میں سوچ کر مجھے مشورہ دینا۔ مگر اب اس واسوخت کی لے بہت بڑھ چکی ہے۔

نوشابہ یہ تو محض جلے پھپھولے پھوڑ رہا تھا، ورنہ کیسی پاربتی اور کہاں کی شیاما! کہاں میں اور کہاں شادی کا تصور! اگر میری باتوں کا تم کو یقین آ گیا تو تم اب بھی بڑی بھولی ہو۔ یہ سچ ہے کہ پاربتی مجھ پر دم دیتی ہے، اور شیاما میرے نام کی تسبیح پڑھتی ہے۔ لیکن نوشابہ

تم سے جہاں میں لاکھ سہی تم مگر کہاں؟

یہ خیال مجھے دنیا میں اب کسی کا نہیں ہونے دے گا۔

تمہارا خط میرے سامنے ہے۔ تمہاری شادی کی خبر اپنی تمام واقعیت اور سنگینی کے ساتھ مجھے اپنا یقین دلا رہی ہے اور نوشابہ میرے کلیجہ پر چھریاں چل رہی ہیں۔ خدا جانے کیوں میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ اب میں کسی کام کے قابل نہیں رہا۔ اب میں اس قابل بھی نہیں کہ پلٹ کر تمہاری خاکِ پا کا سجدہ کر سکوں۔ مجھے اپنے ماں باپ کی چنداں فکر نہیں جن کا تم بار بار مجھے واسطہ دلاتی رہی ہو۔ اُن کے پاس خدا کے فضل سے میرے اور بھائی بہن ہیں جن میں وہ بہل جائیں گے اور مجھے بُھول جائیں گے۔ لیکن نوشابہ تم کہاں سے کیا ہو گئیں اور مجھ سے کتنی دُور نکل گئیں۔ مجھے ابھی اس حقیقت کو دن دن سمجھنا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب اور کیا لکھوں۔ تم جاننا چاہتی ہو کہ اب آئندہ میرے ارادے کیا ہیں؟ اگر انسان کے ارادے کوئی چیز ہیں اور وہ اگر پورے ہو سکتے ہیں تو سنو۔ اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ عمر بھر اسی ہیجان و انتشار کی زندگی میں پڑا رہوں گا۔ اس سے پہلے اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ جب سب کچھ کر چکوں گا اور جب کسی قدر سکون اور اطمینان نصیب ہو گا تو تم سے قریب شفیع آباد میں معتکف ہو کر بیٹھ رہوں گا اور زندگی کے باقی دن تمہیں یاد کر کر کے گزار دوں گا لیکن اب میرے اندر یہ حوصلہ بھی نہیں۔ تم پوچھتی ہو گی۔ کیوں؟ تو میں خود اس کی تشریح نہیں کر سکتا۔ آخر اس سے پہلے بھی تو یہ قطعی تھا کہ اب تم میری نہ ہو گی اور اس سے زیادہ یہ قطعی تھا کہ کسی دوسرے کی ضرور ہو گی۔ اور میں اس کو اچھی طرح سمجھے ہوئے تھا۔ یہ سچ ہے، لیکن اس وقت یہ واقعہ نہیں ہوا تھا اور مجھے نہ جانے کیوں اور کسی قسم کی تم سے ڈھارس تھی۔ میں تم کو اپنی زندگی کا آسرا سمجھ رہا تھا۔ یہ سراسر خود فریبی تھی۔ مگر تھی۔ اب میری نجات اسی میں ہے کہ جس طرح مٹ رہا ہوں اسی طرح اپنے کو مٹاتا رہوں اور میں یہی کروں گا۔ تم کو اب میرے معاملہ میں مداخلت کا کوئی حق نہیں اور تم فضول میرے پیچھے اپنی اوقات تلخ نہ کرو۔ میں اب کسی کے کہنے سننے سے نہ بد راہ ہو سکتا نہ راہِ راست پر آ سکتا ہوں۔ تم میری فکر چھوڑ دو۔ تم کو یہ سنکر شاید رنج ہو کہ اب میں تمہاری اس فکر کو ریا سمجھوں گا۔ اگر تم کو واقعی میری اس "بدانجامی" کا غم ہے تو کیا تم اس غم میں اتنی از خود رفتہ ہو سکتی ہو کہ معاشرت اور ہیئت اجتماعی کی پروا نہ کرو اور ننگ و نام کو بالائے طاق رکھکر اپنا گھر بار تج دو۔ اور دیوانہ وار میرے پاس چلی آؤ؟ مجھے اگر کوئی قوت برباد ہونے سے بچا سکتی ہے تو وہ تمہاری یہی مجنونانہ جرأت ہو گی۔ اگر واقعی تم کو میرا غم ہے جیسا کہ تم دعویٰ کرتی ہو تو نوشابہ کچھ اس غم کی مردانگی کا ثبوت دو۔ نعمان کی خوابگاہ چھوڑ دو اور میرے غم خانہ کو اپنی زندگی کی شبستان بناؤ۔ لیکن نوشابہ نہ تم ایسا کر سکتی ہو نہ تم کو ایسا کرنا چاہیئے۔ پھر بیکار میری حالت پر غم کا اظہار نہ کرو۔ میں اس غم کا قائل نہیں جو کچھ کر نہ دکھائے۔ قصہ مختصر اب مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں اپنی زندگی کا دستور العمل خود بنا لوں گا۔ اگر کانگریس پر یہی مردنی عرصہ تک چھائی رہی اور اگر پھر کسی طرف سے جلد کسی تازہ منظم تحریک کا جھنڈا نہ بلند کیا گیا تو میں اور سمتوں میں نظر دوڑاؤں گا۔ اور اپنی زندگی کو یکسر شور و اضطراب بنائے رہنے کی پوری کوشش کرتا رہوں گا۔ چاہے اس میں میری جان ہی کے لالے کیوں نہ پڑ جائیں۔ نوشابہ اگر یہ نہ ہوا تو اب میں بے موت مر جاؤں گا۔ غرضکہ اب میری زندگی اور میرے ارادوں کو کیا پوچھتی ہو۔ اب تو

جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

تم البتہ اپنے نواب کے محل میں ناز و نعم کی زندگی بسر کرو۔ مگر یہ میں نے ناحق کہا۔ تم سوا اس کے کر ہی کیا سکتی ہو!۔

مجھے اب صرف ایک اندیشہ لگا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ سے میری صحت خراب ہو رہی ہے۔ ڈاکٹروں کو تشویش ہے اور وہ اصرار کر رہے ہیں کہ میں کچھ دنوں اپنی موجودہ زندگی سے برطرف ہو کر آرام کروں۔ میرے رفیقوں کو بھی یہی اصرار ہے۔ لیکن نوشابہ! اوّل تو اس "جہانِ خراب" میں آرام سے کون رہ سکتا ہے۔ دوسرے میرے لئے آرام موت کا حکم رکھتا ہے۔ ڈرتا ہوں میری صحت کہیں زیادہ خراب نہ ہوتی جائے۔ پھر میری کوئی نہیں سنے گا اور مجھے زبردستی الگ کر دیا جائے گا۔ اس وقت میں کیا کروں گا۔ اور کہاں جاؤں گا اور مرنے سے پہلے زندہ رہنے کی کیا صورت ہو گی؟ کہیں مجھے یہ ماتم نہ کرنا پڑے۔

جفا اُس کی نہ پہنچی انتہا تک
دریغا عمر نے کی بے وفائی!

نوشابہ! کاش زمانہ الٹی گردش بھی کر سکتا! یا انسان زمانہ میں بھی سفر کر سکتا۔ اور جس طرح وہ آگے پیچھے جہاں چاہے ایک جگہ سے دوسری جگہ آتا جاتا رہتا ہے اسی طرح زندگی کے ایک دور سے دوسرے دور میں نقل و حرکت کرنے پر بھی قادر ہوتا۔ کاش تم مجھے کچھ ہی دنوں کے لئے ایک بار پھر مل جاتیں! آج ایک پوری مدت کے بعد میں اپنے کو اس حسرت سے مغلوب و مجبور

پاتا ہوں۔ مگر آہ!

اب تجھے اے ستم یار کہاں سے لاؤں

میں تو ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ دفعتہً مجھ پر سے سالہا سال کا زمانہ گزر گیا ہے اور اب میں وہ عزیز نہیں رہا جس کو احباب "عزیزِ خاطر آشفتہ حالاں" کہا کرتے تھے اور جو میں اب سے چند گھنٹوں پہلے تک بھی تھا۔

نوشابہ! ذرا تم بھی اپنے کو آئینہ میں دیکھنا۔ کیا تم اب بھی وہی میری نوشابہ ہو؟

تم نے مجھ سے یہ بھی دریافت کیا ہے کہ ادھر میں نے کیا کیا لکھا پڑھا ہے۔ تم شاید یہ سننے کے لئے تیار نہ ہو کہ گزشتہ چند سال میں میں نے مشکل سے دو تین کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ بھی مجبوراً، اور لکھنے کا تو نام ہی نہ لو۔ سوا جلسوں کی رودادوں کے اور کچھ نہیں لکھا ہے، اور نہ آئندہ کچھ لکھنے کی امید ہے۔ نوشابہ اب مجھے شعر و ادب سے کوئی راحت نہیں ملتی۔ میں اب اپنی اس حقیقت ہی کو محو کر رہا ہوں جس کو شعریت یا روحانیت کہا جا سکتا ہے اور جس کی تم کو میں ایک زندہ تمثیل سمجھتا تھا۔

میں نے اتنا طویل خط لکھکر تمہارا بڑا وقت ضائع کیا۔ معاف کرنا۔

میرا جی اُمنڈا چلا آتا تھا اور میں لکھنے پر مجبور تھا۔ اگر میں نے اپنی کسی بات سے تم کو دُکھ پہنچایا ہو تو اُس کو بھول جاؤ۔ اگر میری خرابیٔ صحت کی خبر سنکر تم کو کوئی تازہ تردد ہو گیا ہو تو اُس کو دل سے نکال دو۔ اب تم کو یہ زیبا نہیں۔

اب تمہاری دنیا اور ہے اور اس کے فرائض اور ہیں۔ میری آخری دعا یہ ہے کہ تم اپنی اس نئی زندگی سے ہمیشہ خوش اور آسودہ رہو اور نعمان سے تم کبھی مایوس نہ ہو۔ نوشابہ میرا دل کہتا ہے کہ تمہاری زندگی ہموار اور صعوبتوں سے آزاد رہے گی۔ اور کسی لئے نہیں تو صرف اس لئے کہ تم مجھ سے زیادہ متین اور مستقل مزاج، مجھ سے زیادہ سلیم الطبع اور صابر و شاکر اور مجھ سے زیادہ معصوم اور خوش اعتقاد ہو۔ اس کے علاوہ نعمان دل کا برا آدمی نہیں ہے اور چونکہ تعلیم و تربیت میں تم سے فروتر ہے اس لئے اور بھی وہ تمہاری خوشنودی کو ہمیشہ ہر چیز پر مقدم سمجھے گا۔ اب خوش رہنا تمہارا کام ہے۔

نوشابہ: تو یہ سچ ہے کہ اب زندگی بھر کے لئے نہ تم میری نہ میں تمہارا! میرے اس خط کو آخری خط سمجھنا۔ اور اب تم بھی مجھے خط نہ لکھنا، اور نہ پھول بھیجنا۔ تمہارے بھیجے ہوئے پھولوں کا میرے پاس خاصا ذخیرہ ہو گیا ہے اور اب یہ بہت کافی ہیں۔ آج میں اُن تمام مُرجھائے ہوئے پھولوں کو نکال کر گھنٹوں سونگھتا رہا ہوں۔ اُن میں سے بہت سے تو ایسے ہیں جو ہاتھ لگاتے ہی خاک ہو جاتے ہیں، لیکن اُن سے ابتک تمہاری مہک آتی ہے۔ میرے لئے اب اتنا بھی بہت ہے۔ تم سے تو یہ خاک شدہ پھول ہی اچھے، جو زندگی بھر میرا ساتھ دیتے رہے۔ اب میں انہیں سے تسکین حاصل کروں گا۔

اے گُل بہ تو خرسندم تو بُوئے کسے داری

یہ پھول میرے اس ماضی کا تابُوت ہیں جو کبھی یکسر رنگ و بُو رہ چکا ہے۔

اچھا نوشابہ: تو اب رخصت۔ جس حال میں رہو خوش رہو۔ میری زندگی بھی گزر ہی جائے گی۔ ممکن ہے زندگی میں کبھی اس کا موقع بھی آئے کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔ لیکن نوشابہ! اب اس ملاقات میں کوئی جان نہ ہوگی۔ تم جیسی صاحب تمیز اور ہوشمند عورت کو اس کا ملال نہ ہونا چاہیئے۔

خدا حافظ!

تمہارا

آخری بار

عزیز

فتنے کی ندی میں ناؤ کھیتا ہوں میں
دھوکے ہوا میں سانس لیتا ہوں میں
اتنی کڑوی زمین کو بھی دنیا نہیں چلی
تلخ خود فریب دیتا ہوں میں

اچین

اَچھُوت

اے کہ یہ دنیا تجھے سمجھی ہے اک مدِ فضول / یا گناہِ خلق یا فطرت کی اک معصوم بھول

تو بہ ایں صورت نظر آتا ہے لالہ زار میں / برگِ خشک اُلجھا ہوا ہو جیسے تازہ ہار میں

رنگ ہے پیراہنِ گُل کا، مگر اُڑتا ہوا / شمع ہے، لیکن فروغ و نور سے ناآشنا

آج اپنی ظرف فہمی کے بھی دعویدار دیکھ / رنگ میں اقرار کے لپٹا ہوا انکار دیکھ

ہیں تری گنجائشیں پیدا ہر اک آغوش میں / نبضِ دُنیا دیکھنے والے اب آئے ہوش میں

فی الحقیقت ایک دھوکا ہے یہ سارا انقلاب / بحر قطرے کو بنا دیتا ہے مطلق اضطراب

دعوتِ بزمِ کلیسا ہو کہ پیغامِ حرم / ثبت کر دے گا یہ تیرے دل پہ تازہ مُہرِ غم

آج کل مذہب بھی اک سوداگری کا نام ہے / برتری کہتے ہیں جس کو ابتری کا نام ہے

عرش پر تجھ کو بٹھا دے گا سیاست کا شکیب / یہ غلط، بالکل غلط، دھوکا ہے اور مطلق فریب

بتکدوں سے اُٹھ چکی اصنام کی وہ آذری / حرص آلودہ حرم کی ہو چکی پیغمبری

یہ جہاں اس امتیازِ خاص سے محروم ہے / ہے اچھوتا پن تجھی میں یعنی تو معصوم ہے

اپنے مرکز پر تو دنیا میں بہت ممتاز ہے / چھُو سکا جس کو نہ کوئی نغمہ تو وہ ساز ہے

اختلافِ رنگ و بُو کو چھوڑ اور پردہ اُلٹ / مہرِ عالم تاب نکلے گا ذرا ذرہ الٹ

آئینہ خانے میں فطرت کے کبھی دیکھ اپنا رُوپ / پھر نظر آئے گی اِن تاریکیوں میں تجھ کو دُھوپ

درس لے خودداریوں کا بزمِ گُل میں جا کے دیکھ / ابرِ گوہر بار کی صورت چمن پر چھا کے دیکھ

باغ میں پتہ بھی ہے، غنچہ بھی ہے، کانٹا بھی ہے / خشک ویرانوں میں لہرایا ہوا دریا بھی ہے

ہیں یہ سب اپنی جگہ، ان میں نہیں کچھ انقلاب / التہابِ مہر کیوں چاہے فروغِ ماہتاب!

تو جہاں اب ہے، وہیں ہے دائمی منزل تری
اپنی منزل پر بہت وزنی ہے یہ محفل تری

فضل اثر - بی۔اے
آگرہ

معاش اور معاد!

انوری خانم

بیگم اسرائیل احمد خاں

قرضِ خدا و قرضۂ دنیا بہ گردنم!
آیا ادائے فرض کنم، یا ادائے قرض؟

سیاسی آزادی کا ایک روحانی پہلو بھی ہے: پولٹیکل قید و بند جس طرح ایک قوم کی مادی ترقی و سربزی میں حائل ہوتی ہے اُسی طرح وہ امتوں کے خدا کا پرستار بننے کی راہ میں بھی ایک سنگِ راہ ہوا کرتی ہے! یہ ایک سیدھی سادی سی بات ہے جو ادنیٰ تامل سے دیکھنے پر ایک عُریاں حقیقت نظر آئے گی۔

جو انسان ایک دوسرے انسان کا غلام ہو وہ خدا کا بندہ نہیں بن سکتا۔ بقولِ حضرتِ مسیحؑ کے "ایک غلام دو آقاؤں کی خدمت کا حق ادا نہیں کر سکتا"؛ ع

سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے!

یہ فرمودہ خود قرآن حکیم کا ہے!" دینِ حنیفی" یہی ہے۔ نبیوں اور پیغمبروں کے جد امجد حضرت ابراہیم "خلیل اللہ" کا مشرب یہی تھا۔ حضرت یوسفؑ اپنی اسی طریقت کے متعلق اپنی شیفتگی کا اظہار کرتے ہیں جب کہ وہ تحدی آمیز لہجے میں فرماتے ہیں "ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ"؟! (بہت سے معبودوں کا بندہ بننا اچھا، یا ایک ہی خدائے قہار کی کبریائی کے سامنے سربسجود ہو جانا؟!)

مہاتما گاندھی کو دیکھئے، خالص روحانی اُفتادِ مزاج کے آدمی ہیں، چنانچہ موجودہ "کلجگ" کی جس لعنت پر وہ سب سے زیادہ نالاں و نوحہ کُناں ہیں وہ بالفاظ اُن کے یہی ہے کہ "لوگ بالکل خدا فراموش ہو گئے ہیں، اور کم از کم اپنی عملی زندگی میں ہر شخص "ایں بندہ را خدائے نیست" کی عبرت ناک مثال بن کر رہ گیا ہے!"—
لیکن پھر ہم کو تعجب ہوگا کہ مہاتما گاندھی "روحانی" سے "سیاسی" کیوں بن گئے!! حقیقت یہ ہے کہ اُن کے نصب العین روح کی پہلی منزل ہی "سیاست" ہے! خدا اور بندوں کے درمیان بعض "بندے" ہی حائل ہو جاتے ہیں! انسانی پرستش "ماسوی اللہ" کا سب سے بڑا بُت انسانی گوشت و پوست ہی سے بنتا ہے! یہی خدا یندان مجازی ایک طرف اپنی آنی و فانی ہستی کی بے حقیقتی کو بھولتے ہیں، اور دوسری طرف خدائے قہار و جبار کی عظمت و جبروت سے دیدہ بردوختہ ہو جاتے ہیں! خدا تک پہونچنے کے لئے درمیان کے اس "انسانی طاغوت" کے خار و خس کو صاف کرنا ضروری ہے! یہی راز ہے اس حقیقت کا کہ مذہب کے فکر و عمل کا اولین قدم عموماً منفی اور تخریبی نوعیت رکھتا ہے! وہ خدا کو بعد میں پیش کرتا ہے، لیکن خدا کے "انسانی حریف" اس فرعون بے سامان کے بُت کو اپنی ضرب کے لئے پہلے رکھتا ہے! اسی پہلی چیز کے برطرف ہو جانے کے بعد دوسری چیز از خود قائم ہو جاتی ہے! کلمۂ طیبہ لاالٰہ الا اللہ کی نفی و اثبات والی ذو وجہتین حقیقت کی یہی تعبیر ہے!! سچ یہ ہے کہ جو انسان اپنی عزت کی تاراجیوں، اور اپنی مالی حالت کی قلاشیوں سے اس مصیبت میں گرفتار ہو کہ ایک ایک صاحبِ زر کے سامنے دستِ سوال" دراز کرنے پر مجبور ہو، وہ خدا کے حضور کیا "دستِ دعا" بلند کر سکتا ہے! ؎

شب چو عقدِ نماز بربندم
چہ خورد بامداد بچہ و زن؟

جو شخص اپنی مقروضیت کی زیر باریوں میں اپنے کو اس طرح فروخت کر چکا ہو کہ سوائے "قرضخواہ" کے کوئی اُس کو اپنا "رزق" و پروردگار نظر نہ آتا ہو۔ اُس کو ہنگام نماز اگر اس قسم کا ماجرا پیش آئے تو کیا تعجب ہے کہ ؎

بزمیں چو سجدہ کردم، وز زمیں ندا برآمد
کہ مرا خراب کردی تو زسجدۂ ریائی!

معاشی بے نوائی، جو بیرونی سیاسی تسلط کے ساتھ ساتھ "شجر و ثمر" کی طرح لازم و ملزوم ہے، نہ صرف توحید باری و خدا پرستی کی راہ میں ایک سدِّ راہ ہوتی ہے، بلکہ بعض اوقات وہ نہایت مخدوش طریقے سے کفر کی علانیہ دعوت دیا کرتی ہے! آنحضرتؐ کی نظرِ حقیقت رس میں یہ خطرہ موجود تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوا تھا کہ "کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا" (بہت ممکن ہے کہ فقر کفر ہو جائے!) پھر "معاش" کا فقدان جس طرح "معاد" کے سارے توشے کو سوخت کر دیا کرتا ہے اُس کو اِس طرح واشگاف بیان فرمایا "اَلْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْهِ فِي الدَّارَیْنِ!" (افلاس دین و دنیا میں روسیاہی کا سامان ہے!)

بلاشبہ مخصوص شخصیتیں "دام و درم" کے اِس "دامِ سخت" کی گرفت سے بالاتر ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ خود اپنی ذات قدسی صفات کے متعلق رسول اللہ صلعم کا یہ مقولہ بالکل برمحل اور شایانِ شان تھا کہ "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" (فقر میرا فخر ہے!) لیکن اِن برگزیدگانِ انام کا اور عوام کالانعام کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے۔ بقول مولانا حالی کے "حضرت عمرؓ فاروق اپنی ذات کے لئے تو اِس حالت میں شاداں و فرحاں تھے کہ "ستر پیوند" کی عبا زیبِ تن کریں، لیکن فرزندانِ اسلام کو تو جب تک قبائے سلطنت اور خلعتِ حشمت" میں ملبوس نہ دیکھ لیا چین نہ آیا! پیغمبر عربی کی لائے ہوئے "فقر و بادشاہی" کو اپنے اپنے صحیح محل پر اقبال یوں بیان کرتا ہے ؎

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش،
تختِ کسریٰ زیرِ پائے اُمتش!

ایک مستبد اور مطلق العنان حکومت خدائے قدوس کے اعتقاد کی راہ میں ایک سدِّ سکندری بن جاتی ہے؛ خالقِ کائنات اور رب السمٰوات والارض کی ساری آیاتِ رحمت اور مظاہرِ ربوبیت پر وہ ایک گہرا پردہ ڈال دیتی ہے؛ لاریب کہ بتکدۂ ماسوی اللہ کے "صنمِ کبیر" کے نام کا اطلاق اگر کسی چیز پر کیا جاسکتا ہے تو وہ ایک شخصی بادشاہت ہی ہے! انسانیت و بشریت کے لئے اس سے بڑا کوئی فتنہ نہیں! جس طرح وہ خدا کی ذاتِ منبع برکات کے لئے ایک "حجابِ اکبر" بنتی ہے۔ اُس کی تھوڑی تفصیل سننے کے قابل ہے:۔

سب کو معلوم ہے کہ صحفِ سماوی و اسفارِ دینی میں خدائے جلیل کی طرف سے زمین کی پہنائی اور زرخیزی، کشت و باغ کی ثمر داری و ذائقہ نوازی بارش و انہار کی روانی و اثر شادابی، سبزہ زار و چمنستان کی خوش منظری و دلفریبی مادرِ ارضی کے دیئے ہوئے رزق و لباس کی ارزانی، مال و زر کی فراوانی، مویشی کی خدمتِ سواری و باربرداری و شیرخورانی، اہل و عیال کی قرۃ العینی، مایۂ زمین کی گود میں پلے ہوئے انسان کی تنومندی و خوش جمالی وغیرہ وغیرہ انہی آثار و برکاتِ حیاتِ بشری کی دعوتِ تنظر و فکر دی گئی ہے اور انہی کی بلیغ زبانِ حال سے تمتع پذیر انسان کو ایمان باللہ کا پیام سنایا گیا ہے!—————— لیکن اب دیکھئے کہ انسانی دنیا میں شخصی حکومت کی بدعتِ سیئہ کی فرمانروائی ہو جانے کے نتیجے میں یہ سارا منظرِ رحمت کس طرح "محجوب" اور یہ سارا دفترِ معرفت کس طرح "سیاہ" ہوگیا ہے! جابر بادشاہوں، کشورکشا حکومتوں، اور نوآبادیاں تعمیر کرنے والی قوموں نے اللہ کی وسیع و عریض زمین کو باوجود اس کی غیر معمولی وسعت و فراخی کے انسان پر تنگ کر دیا ہے! خود ہندوستانِ "جنت نشان" کی بابت بعض حق گو برطانوی ماہرینِ معاشیات کی تحقیق یہ ہے کہ اس خطۂ ارم صفت کی زمین اپنی قدیم ضرب المثل زرپاشی کو خیرباد کہہ چکی ہے اور فطرت کے اس عظیم خزینۂ رزق نے جو عبارت ہے ہندوستان کے ناپیداکنار رقبۂ کاشت سے اپنی سالانہ بخشش برآورد کو بقدرِ نصف کے روک لیا ہے!!!"

ہندوستان کے کشت و باغ میں ایک "بارہ ماسی" منظرِ خزاں برپا رہتا ہے۔ پھر جو۔ گندم اور چاول، جو آم اور امرود، اور جو گل و شگوفہ پیدا بھی ہوتے ہیں اُن کی صفتِ شکم پُری و ذائقہ نوازی، اُن کی نکہت باری و نسیم انگیزی، اُن کی رنگ طرازی اور نظر افروزی کی ساری جنت اُسی سوختہ سامان ہندی کاشتکار پر حرامِ مطلق ہے جس کی عرق ریزیوں اور خوں فشانیوں کے آبِ رنگ نے اس سارے عالمِ "رنگ و بو" کی تخلیق کی ہے، اور جو صرف سرمایہ والوں کی اِس بہشت کے معمار، لیکن خود اپنے افلاس و فاقہ کشی کی دوزخ کے آباد کار ہیں! ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
واز جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

پھر دیکھئے کہ یہی ہندوستان براعظم ایشیا کے "مانسونی ممالک" میں ایک مرکزی جائے وقوع رکھتا ہے۔ لیکن بارش ہو یا امساکِ بارش اس کے "بیگانِ سرزمین" کی دائم الحال بینوائی کی ترجمان بس یہ رباعی ہے:۔

سرما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں	گرما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں
القصہ تمام سرد و گرمِ عالم	برما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں

ہندوستان ایک بین الاقوامی قحط کا گودام ہے، اور امریکہ کے بعد دُنیا کا دوسرے نمبر کا کپاس کا کھیت ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنی آغوش میں اُس لکھو کھا ازلی محروم و پیدائشی خلقت کو لئے ہوئے۔ ایک ستم ظریفانہ بوالعجبی پیش کر رہا ہے جو کہ سال کے بیشتر حصے میں "نیم شکم" اور "نیم برہنہ" رہا کرتی ہے :

ہندوستان جو صدیوں تک کرۂ ارضی کا "دولت مند ترین" ملک رہا، آج دنیا کے "دیوالیہ ممالک" کی سرِ فہرست پر ہے! وہ جس دن سے "برطانوی تاجِ زرنگار کا سب سے زیادہ باآب و تاب الماس" بنا ہے، اس کی پیشانی کی سیاہی پر مہر لگ چکی ہے! جو سرزمین دولت کی ایک لامتناہی "کان" تھی وہ افلاس و بینوائی کا ایک بے آب و گیاہ صحرا بن گئی ہے! جس دیس نے نہ معلوم کتنے بادشاہوں کی حریص جھولیاں لبریز زر و جواہر کر دیں آج وہ غیر ملکوں کی رعایا کے دئے ہوئے "پونڈوں" سے ایک گراں بار "قومی قرضے" میں دبا ہوا ہے! الغرض قدرت کی بخشش و عطا کا ہر چشمہ آج خشک ہے، اور اللہ کی مخلوق ماہی بے آب بنی ہوئی ہے ؎

واین طرفہ تماشا بیں لب تشنہ بآب اندر!

برنارڈ شا نے، جو مغرب کا سب سے بڑا مجاہدِ وقت اور مجتہدِ ادب ہے، کیا خوب کہا ہے۔ "شخصی حکومت انسانی پرستش کے شرکِ عظیم کا ایک مسلّم بت خانہ ہے، اور سیاسی غلامی انسانی حقوق کی قربانی کا ایک خونریز ذبح خانہ!"

قیصریت پرست حکومتوں اور اُن کے زیرِ سایہ بے شمار سرکاری و غیر سرکاری یا نیم سرکاری سرمایہ دار نوعیت کے اداروں کے کاروبار ذبحِ انسان کے امن و عافیت پر جیسی قیامت برپا کئے ہوئے ہیں وہ ایک نہایت ہی ہوش رُبا منظر ہے! سرمایہ داریت کے بعض ناقابلِ رشک کارنامے اس درجہ سیاہ کار ہیں کہ اگرچہ خود اِس ملعون دستور بندی کو اُن کے ارتکاب میں مطلق باک نہیں، لیکن اُن کو بیان کرتے ہوئے ہمارا قلم لرزہ براندام ہونے لگتا ہے: رُودکش دیارِ فرنگ، شہر بمبئی کی مزدور عورتیں صبح کے وقت اپنے شیرخوار بچوں کو اتنی افیون دے کر کارخانوں کو جایا کرتی ہیں کہ وہ دن بھر ایک گہری مدہوشی کی خود عاید کردہ "مصنوعی موت" کی آغوش میں سوتے رہتے ہیں! اس لئے کہ خود ان کی ماؤں کو اپنی ساری "ساعاتِ کار" میں اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ ایک درندہ صفت کارخانہ دار کی "مشینوں کی غلامی" کو ترک کر کے ایک دفعہ بھی اپنا شیرخوارانی کا "وظیفہ مادری" ادا کر سکیں! کبھی کبھی نشے کی مقدار کے زیادہ ہو جانے کے خمیازہ میں ان معصوم بچوں کی یہ نیند موت کی دائمی "خوابِ راحت" کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اُن کو اس پُر کوفت زندگی سے نجات دے دیتی ہے جو دراصل موت و حیات کے درمیان ایک مسلسل "کشمکش" ہوتی ہے! چنانچہ یہ سوختہ سامان مائیں جب دن بھر کی خستہ و شکستہ اپنے گھروں کو لوٹتی ہیں تو گہوارے کے اندر اُن کے لختِ جگر کی ننھی سی "نعش" اُن کا خیر مقدم کیا کرتی ہے! ؏

الاماں اے سنگدل سرمایہ داری الاماں!

کیا اِن جگر خراش اور روح فرسا مناظر کے اندر اللہ کی ربانیت و رحمانیت کا کوئی بعید ترین تصور بھی ممکن ہے؟! دامنِ زمین کی بے شمار نعمتوں سے لبریز ہونے پر بھی خدا کی اِس پامالِ ستم مخلوق کے لئے اس میں اتنا حصہ بھی نہیں جتنا کہ جنگل کے چرند و پرند کے لئے ہے:

کیا خدائے کریم کے لاتعداد افضال و اکرام کو ان سے منقطع کر کے اِن قارونوں اور فرعونوں نے ان لوگوں کے سینے بھی ایمان و اعتقاد سے اُسی طرح ویران نہیں کر دئے ہیں جس طرح کہ اُن کے معدے نانِ خشک سے؟ کیا اُنھوں نے فاقہ کشی اور ارتدادِ روحانی دونوں لعنتوں میں اللہ کے اِن کس مپرس بندوں کو گرفتار نہیں کر دیا ہے؟ کیا خدا کی راہ کا راہزن اِن جابر لوگوں سے زیادہ "شیطان" بھی ہو سکتا ہے؟

اور یہ حالت ہمہ گیر ہے! ہندوستان عزبار ضعفاء ارض کے اِس مقتلِ عظیم کا صرف ایک مختصر گوشہ ہے! اگرچہ اِس میں شک نہیں کہ اُس کے نقوشِ خونین سب سے زیادہ رنگین ہیں! لیکن بہرحال یہ ایک عالمگیر طوفانِ مصیبت و صعوبت ہے جو محکوم قوموں کو غرقِ ہلاکت کئے ڈالتا ہے! قابوچی حکومتیں اور سرمایہ دار سامراج اِن کو ایک بے رحمانہ "اقتصادی تاخت و تاراج" کا تختۂ مشق بنائے ہوئے ہیں، اور اِن کے آخری مارالحیات کو خشک کر رہے ہیں۔

الغرض دستِ قدرت کے دئے ہوئے سارے بے پایاں افضال و نعائم کو ظالم انسان کے دستِ ستم نے چھین لیا ہے، اور پھر اس زبوں حالی اور انتشارِ دماغی میں مظلوم انسان کے ہوش و حواس کو اس قابل بھی تو نہیں رکھا کہ وہ اس بات کو صحیح طور پر بھی سمجھ سکے۔ کہ آیا یہ ایک "بلائے آسمانی" ہے یا صرف ایک "آفتِ ارضی"؟ جس کا اندوہناک نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس نرغۂ مصائب میں بجائے "شیاطین الانس" کی ایک جماعت پر لعنت بھیجنے کے خود خدائے قدوس کی پروردگاری اور بندہ پروری کے متعلق سنگین شبہات میں مبتلا ہو گیا ہے! اس طرح بے درد قیصریت نے اُس کے جسم کی تازگی اور دل کی خوشی کے ساتھ ساتھ اُس کی رُوح کی دولتِ ایمان کو بھی

تاراج کر ڈالا ہے؟ کس "قوت" وہیل تن نے بھی یہ کفر پرور ی و عالم آشوبی دکھائی تھی؟

ہاں کیا ان فاقہ زدہ پیٹوں کو بھرنے، ان نگونسار سروں کو بلند کرنے اور ان تشنگ روحوں کو اُن کا ایمان و سکینت واپس دلانے سے بڑھ کر آج تختۂ زمین پر مذاہب و ملل کا کوئی "فرضِ عین" ہو سکتا ہے؟ کم از کم اسلام کی طرف سے جواب دیا جا سکتا ہے کہ وہ اس فریضۂ عظیم و جلیل کی اہمیت و مؤکّدیت کو اس سے زیادہ بلیغ و معنی خیز الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا تھا کہ

اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ الْحَقِّ عِنْدَ السُّلْطَانِ الْجَائِرِ



انیسِ خلوت سے

میں قرباں اے مرے ترکِ قبا پوش — کبھی آ اس طرف بھی زلف بر دوش

نگارِ خوش خرام و یارِ شیریں — بُتِ آشوبِ عقل و فتنۂ ہوش

ہنوز اے شہریارِ کشورِ دل — گدائے راہ کا خالی ہے آغوش

کسی دن تو بَن اے جانِ خرابات — انیسِ خلوتِ رندانِ مے نوش

کروں کس طرح دامن پارہ پارہ! — کدھر ہے اے مری سلمائے گل پوش

کبھی تو سامنے آ، جام بر کف — بہ زعمِ زاہدانِ خرقہ بر دوش

وہ گونجا نغمۂ شیرینِ جاناں — زمین و آسماں: خاموش، خاموش

وہ دستک دی ترے در پر کسی نے

بجا لا سجدۂ شکرانہ اے جوشؔ

(جوشؔ)

وصیّت

مزدور کی تصویر

چشمِ عبرت! آ دکھاؤں میں تجھے وہ سرزمیں — چومتی ہے جس کی چوکھٹ کو فرشتوں کی جبیں

سوکھا ٹکڑا بھی جہاں مزدور کو حاصل نہیں — ہے لہو سے جس کے رنگیں اہلِ زر کی آستیں

محنت و اندوہ و غمِ شام و سحر جس کی غذا — جگمگاتا ہے پسینہ بن کے بجلی کی ضیا

جس کی ہے گاڑھی کمائی سود خواروں کیلئے — جس کی جانِ زار ہے سرمایہ داروں کے لئے

آہ یہ اُس شیر دل مزدور کی تصویر ہے — جس کے ہاتھوں رحمتوں کے باب کی زنجیر ہے

ابنِ آدم جس کے باعث صاحبِ توقیر ہے — جس کی محنت اہلِ زر کے واسطے اکسیر ہے

آہ! لیکن اُس کی ساری کلفتوں کا یہ مآل — ننھے بچوں کو ملے نانِ شبینہ یہ محال!

مزدور جمیلہ بسترِ علالت پر

موسمِ سرما کی شب، سہمی ہوئی ہے کائنات — سو رہا ہے خامشی کی گود میں سازِ حیات

تیرگی کا دَور دورہ ہے فضا ویران ہے — اہلِ زر کے گھر میں لطف و عیش کا سامان ہے

جھونپڑوں میں فاقہ کش مزدور ہیں کھوئے ہوئے — گویا اپنے ہی نصیبوں کی طرح ہیں سوئے ہوئے

اک جمیلہ جس کا شوہر گھر سے کوسوں دُور ہے — اپنے بیکس لاڈلوں کو دیکھ کر رنجور ہے

چہرہ افسردہ تنِ نازک علالت کا شکار — دم لبوں پر اور آنکھوں میں کسی کا انتظار

مشعلِ راہِ عدم ہیں سینۂ بریاں کے داغ — ہچکیاں سی لے رہا ہے زیست کا دھندلا چراغ

تابِ گویائی زباں میں گو نہیں دل میں مگر — کہہ رہی ہے کون لے گا اِن یتیموں کی خبر

آہ یہ نورِ نظر وجہِ بہارِ زندگی — جن کا اک ہلکا تبسّم ہے مدارِ زندگی

آہ یہ نورانی چہرے ماند پڑ جائیں گے اب — ٹھوکریں کھایا کریں گے راستوں میں روز و شب

سوتے سوتے خواب سے جب چونک اٹھیں گے غریب — کون دیکھے گا اُنہیں اور کون سوئے گا قریب

کون ہوگا جو دھڑکتی چھاتیوں پر رات کو — رکھ کے سوئے مادرانہ شفقتوں سے ہات کو

کھیل کر آئیں گے یہ معصوم گھر میں جب کبھی — کس سے پوچھیں گے کہ کیا ابّا نہیں آئے ابھی؟

کیا خبر کب کام سے باپ اُن کا واپس آئے گا — اور بلکتے بیکسوں کو پیار سے سمجھائے گا:

مزدور جمیلہ کی وصیت

اے ہوا، اے تیرگیٔ بخت، اے پُرغم فضا — جب سنبھالیں ہوش یہ معصوم دل نامِ خدا

اُن سے کہنا کر گئی ہے یہ وصیت ماں تمہیں — اہلِ دولت نے ملایا خاکِ ذلّت میں ہمیں

تم طلسم ان کا نہ توڑو گر تو جینا ہے فضول — نیند بھر سونا حرام اور کھانا پینا ہے فضول

ہاں اُڑا دو عیش کے متوالے انسانوں کی گرد — اور فلک سے باتیں کرنے والے ایوانوں کی گرد

زورِ بازو سے بدل دو گردشِ ایام کو — نوچ لو زربفت میں لپٹے ہوئے اجسام کو

چھین لو اِن معصیت کاروں کی بینائی کا نور — توڑ کر رکھ دو زر و دولت کے بندوں کا غرور

بوٹیاں سرمایہ داری کی فضا میں چار سُو — اُڑ رہی ہوں اور ٹپکتا ہو ہواؤں سے لہو

مجھ کو خاکِ گور میں راحت ملے گی تب کہیں — ورنہ انگاروں کا بستر ہوگی تربت کی زمیں

ٹھوکروں سے سیم و زر کے بُت ملا دو خاک میں — تا مسرت کی چمک ہو دیدۂ نمناک میں

ہاں مٹا دو صفحۂ ہستی میں نامِ نابکار — ننگِ عالم ہے، نہ رہنے پائے یہ سرمایہ دار

ہڈیاں جب تک چباؤ گے نہ زرداروں کی تم — گردنیں جب تک اڑاؤ گے نہ زرداروں کی تم

قبر میں تڑپا کرے گی میری روحِ غم شعار — چونک چونک اُٹھا کریں گی حسرتیں بے اختیار

کہنے پائی تھی یہیں تک وہ کہ شمعِ زندگی
موت کے زہریلے جھونکوں سے اُلجھ کر بُجھ گئی!

شاعر کا خدا سے خطاب

اے خدا اے نعمتِ امن و اماں کے مدعی — وسعتِ رحمت تری اے بندہ پرور ہے یہی
اے خدا بندہ نوازی کیا اسی کا نام ہے؟ — بس یہی مزدور کی محنت کا کیا انعام ہے!
کیا اسی پہ تو ہے رحمان و رحیم دو جہاں — کیا اسی پر نام چلتے ہیں ترا خورد و کلاں!
کیا یہی ہے تیری رزّاقی کی حدِ اختتام — کیا یہیں پر جوش کھاتا ہے غضب تیرا مدام
کیا اسی پر چھاؤں میں تاروں کی شب بھر غم نصیب — کیا اسی پر برف زا ٹھنڈی ہواؤں میں غریب
تیرے منظورِ نظر خوں خوار کتّوں کے لئے — پیش کرتے ہیں لہو دل کا جگر کے لوتھڑے
کیا اسی پر منعموں کی ٹھوکریں سہتے ہیں یہ؟ — کیا اسی پر رحمتوں کے منتظر رہتے ہیں یہ
کیا اسی حسنِ کرم پر تجھ کو کہتے ہیں کریم؟ — کیا اسی بل پر دکھاتا ہے انھیں نارِ جحیم؟
کیا یہی خوں خوار ہیں ناز و نعم کے واسطے؟ — اور یہ مزدورِ بیکس ہر ستم کے واسطے!
ہیں سنہری قصر میں اربابِ زر جلوہ فگن — اور یہ مزدور بیچارے اسیرِ صد محن
کس لئے تو نے بنایا ہے انھیں ذی احتشام — چھینتے ہیں کس لئے مزدور کے منہ سے طعام
کوئی حد بھی ہے یہ آخر تا کجے رنج و محن — سڑ رہی ہے جھونپڑی میں دیکھ نعشِ بے کفن
آہ دنیا میں نہیں ہمدم کوئی ایسا کہ جو — اشکباری میں یتیموں کا شریکِ حال ہو
آہ وقفِ بیکسی فطرت کا رنگیں شاہکار — حیف اے خونخوار دنیا حیف اے سرمایہ دار
اب کوئی دن میں چھلکنے کو ہے جامِ اضطراب — دیکھنے والی ہے چشمِ شوق دورِ انقلاب

فضائے آسمانی میں شاعر کا نالہ

شاعرِ آتش نوا کا نالۂ بے اختیار — عرش پر پہنچا ہوا کے دوش پر ہو کر سوار
لرزہ بر اندام تھے کرّوبیاں سُنکر صدا — قاضی الحاجات خود حیران تھا یہ کیا ہوا!
زلزلہ ہے آگ کا شعلہ ہے یا طوفان ہے — ذرّے ذرّے سے عیاں اک حشر کا سامان ہے
بڑھ گئی حد سے پریشانی فلک والوں میں جب — لے کے انگڑائی لگا بڑھنے اثر نالوں میں جب

عرش کی چوکھٹ کر ہوا نے خالقِ ارض و سما
ہے یہ اک تیرے پریشاں حال بندے کی صدا

رات دن سیلِ حوادث میں بہا کرتا ہے جو!
داستاں مزدورِ بیکس کی کہا کرتا ہے جو!

سُن کے قسّامِ ازل نے جوش میں آکر کہا
اے فلک کے رہنے والو ہوش میں آؤ ذرا

آہ اک ناپاک انساں کی مرے افلاک پر
حیف ہے صد حیف ایسی جرأتِ بیباک پر

کھینچ کر لاؤ زمیں سے بے ادب کو تم یہاں
تاکہ ٹوٹے اس کی جرأت کا طلسمِ بیکراں

گونج اُٹھی آسماں پر اک صدائے جاں رُبا
اور فلک سے اک فرشتہ جوش میں نازل ہوا

دیکھتا کیا ہے کہ اک عصمت کی دیوی خاک پر
دیکھتی ہے دیدۂ بے نور سے افلاک پر

منتظر ہے بے نوا کب وہ خدائے ذوالمنن
بھیجتا ہے خُلد سے میرے لئے زرّیں کفن

ماتمِ خاموش ہے گھر پر مسلط اس طرح
دور ویرانے میں پردیسی کی تربت جس طرح

حسرتیں ہیں نعشِ بے گور و کفن پر نوحہ خواں
یاس کا مضراب تارِ اشک پر جیسے رواں

آتی ہے گھر کے جھروکوں سے ہوائے پُر غبار
چھیدتے ہیں جن کے جھونکے تیز تر خنجر کی دھار

ماں کی جانِ آرزو، غربت کے پروردہ یتیم
ہاتھ اُٹھا کر کہہ رہے ہیں موت لے ذاتِ کریم

گھر کی حالت دیکھ کر اندوہ گیں، حسرت فزا
آنے والے کا غرورِ قدس بھی تھرّا گیا

ننھے بچّوں کو بچشمِ غور دیکھا اور کہا
آہ! یہ تو اُس کے بچّے ہیں جو کل شب چل بسا

آہ! یہ تو اُس کے بچّے ہیں جو دستِ قہر سے
بھینٹ زر داری پہ چڑھ کر اُٹھ گیا ہے دہر سے

آہ وہ مزدور پردیسی وہ جسمِ ناتواں
جس کی کوڑوں سے اُڑائیں ظالموں نے دھجیاں

یہ کہا اور نعش کو ہاتھوں پہ لے کر اُڑ گیا
اور چشمِ دہر سے پل مارتے غائب ہوا

اہلِ گردوں نے کیا پُر حشمت و شوکت تپاک
آسماں کی نورِ دیدہ بن گئی وہ روحِ پاک

اُس کے بچّے درسِ عبرت ہیں زمانے کے لئے
منظرِ سرمایہ داری جن کے کھانے کے لئے

ہندوستان سے خطاب

شرم اے ہندوستاں! ہے ڈوب مرنے کا مقام
دیکھ مزدوروں کے خوں سے اپنے تلوے لالہ فام

شرم اے عزبت کے گھر محکومیت کی سرزمیں　　پھٹ کے زرداروں کی ہستی کو نگلتی کیوں نہیں!
ہوش میں آ توڑ کر رکھ دے غلامی کی کمند　　ڈال آزادی کے میداں میں ترقی کا کمند
آ بدل دیں اٹھ کے ہندی کی غلامانہ روش　　آ کچل دیں زر کے بندوں کو کہ مٹ جائے خلش

آکہ سفاکانہ فطرت ہی کو کر دیں ختم آج

آکہ دنیا سے مٹا دیں ان جفاؤں کا رواج

سید الطاف مشہدی الرضوی

بے بہا آنسو

کیا میں نے کبھی آنسو دیکھے نہیں تھے؟ کیا میں کبھی رویا نہیں تھا؟

برسوں میں اپنی محرومیوں اور ناکامیوں پر رو چکا تھا، مدتوں میں فراق و غم کی طویل راتوں میں آنسو بہا چکا تھا۔

میں نے لاکھوں مرتبہ آنسو دیکھے تھے ———— :

لیکن اُس شام کو میری حیرت کی کوئی حد نہ تھی جبکہ میں ایک پہاڑی پر غروب کا تماشا دیکھ رہا تھا ————

میں نے ایک اسّی برس کے بڈھے کو دیکھا کہ لکڑیوں کا ایک بہت بڑا بوجھ سر پر لادے آرہا ہے۔ اس کا تمام جسم وزن سے کانپ رہا ہے اور اُس کی گردن کی سب رگیں اُبھری ہوئی ہیں۔

میں یہ دیکھکر بیقرار ہو گیا۔ فوراً بلندی سے اترا اور اُس کا بوجھ اپنے سر پر لے لیا ————

غریب بڈھا ڈر گیا۔ اُس کی سانس چڑھ رہی تھی اور وہ مجھے اپنی دُھندلی آنکھوں سے دیکھنے لگا ————

اُس کی اس حالت پر میرا دل پس گیا، اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک چشمہ پھوٹ نکلا۔ اُس شام کو میرے آنسو ایسے روشن تھے کہ اس سے قبل کبھی نہ تھے۔ معلوم ہوتا تھا ستارے چمک رہے ہیں۔ ایسی روشنی تھی کہ میری نظر خیرہ ہوئی جاتی تھی۔ اور یہ میری زندگی کا گریہ وزاری میں پہلا موقع تھا کہ میں نے ایسے درخشاں آنسو دیکھے۔

جوش ملیح آبادی

(انتخاب از روحِ ادب)

شاعر

ذوقِ جمالیات کے نام

ملک حسیب احمد

آپ بیتی کہوں یا جگ بیتی ؛ اچھا تو آج جگ بیتی ہی سُنئے !

ایک تھا شاعر، نحیف الجثہ۔ منحنی سا آدمی، مختصر سا انسان جسے تخلیق کرنے میں قدرت نے کفایت شعاری سے کام لیا تھا۔ اُس کا چہرہ ہر ذکی اور حساس انسان کی مانند غور و فکر کی آماجگاہ رہا تھا۔ جس پر حیاتِ انسانی کے سرد و گرم نے ایسے واضح اور پائدار نقوش چھوڑے تھے جیسے صحرا کی خشک ریت برسات کی چھینٹوں سے ہم آغوش ہونے کے بعد کسی رہرو کے نقوشِ پا کو اپنے سینے پر جوں کا توں محفوظ کرلے ! گو اس کے اشعار میں عشق و سیہ چشمی کے جذبات ہنوز باقی تھے۔ لیکن سب درباری اور خود بادشاہ فیصلہ کر چکے تھے کہ شاعر بوڑھا ہو گیا ہے اُس کی بینائی بھی کم ہو رہی ہے ۔ مگر شاید اس کا علم اس قدر عام نہ ہو جاتا اگر گذشتہ نوروز کے دربار میں وہ بیلا جمعدار کو اعلیٰ حضرت شہنشاہ جہاں پناہ سمجھ کر مجرا بجا نہ لاتا۔

قانونِ کائنات کے برعکس صرف شاعر اور مصوّر ہی ایسی دو ہستیاں ہیں جن کی زندگی بڑھاپے پر ختم نہیں ہوتی، جب نوعِ انسانی پر بڑھاپا آئے۔ جب درختوں پر پت جھڑ کا موسم ہو، جب چمن کی شادابی کو خزاں جھلس دے، جب ہر چیز پر انحطاط ہو اس وقت ایک صناع کا حقیقی شباب شروع ہوتا ہے ۔ گو بظاہر قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں، عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہتا مگر شاعر کا دل صرف اسی منزل میں پہونچ کر جوان ہوتا ہے ۔ گو بظاہر قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہتا ۔ مگر شاعر کا دل صرف اسی منزل میں پہونچ کر جوان ہوتا ہے" یہ تھے وہ خیالات جن کا اظہار درباری مؤرخ نے صدر اعظم سے اس وقت کیا جب نشاط باغ میں ان دونوں نے شاعر کو رتیلی اور تن سکھ کی خوش فعلیوں سے متاثر ہو کر آزادانہ ہنستے ہوئے سنا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شاعر کی آواز میں شباب و تمنا پوری شدت سے مچل رہے تھے۔

باوجود اس کے کہ شاعر کی زندگی کو کبھی کسی عورت نے اپنے پریم بھرے اور رسیلے گیتوں سے پُر کیف نہ بنایا تھا، لیکن اس کے اشعار سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زندگی ایک طویل شب مسرت تھی جس میں کسی کسی گوری گوری سڈول کلائیاں شاعر کے گلے میں مسلسل حائل رہی ہوں اور شاید اسی لئے لوگ محسوس کرتے تھے کہ اس کے اشعار ایک کامیاب عاشق کے جذبات تھے۔ جس میں وصل و ہجر بھی کچھ تھا، لیکن وہ درد، وہ تڑپ ۔ وہ سوز مفقود، جو حقیقت میں جانِ شعر ہے، اور شاید اسی لئے قصیدے کا وہ بادشاہ تھا اس لئے کہ صنفِ شعر کا معاملہ دل نہیں بلکہ دماغ سے ہوتا ہے۔

——————— آخر وہ دن بھی آگیا جب جواں بخت و جواں سال شاہ گیتی پناہ شہزادی مہر نیم روز کو بیاہ لایا۔ اس خوشی میں اس شان کا دربار کیا گیا کہ بوڑھے اب تک اپنے نواسوں اور نواسیوں کو اس کے قصے سناتے ہیں۔ انعام و اکرام سے کل رعایا کو نہال کر دیا گیا۔ اکابر سلطنت کو زر و جواہر عطا ہوا۔ وزراء و دولت کو جاگیریں ملیں۔ قرنا پھونکنے والوں، نجاغ بجانے والوں، بھانڈ، گایت، اور رہتکاروں کو جوڑے بٹے۔ شاعر اس موقعہ پر تن زیب کا انگرکھا پہنے اور کمر سے دوپٹہ باندھے اپنی جگہ مؤدب بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ خسرو نہاد نے اعلان کیا کہ "مابدولت اپنے شاعر کو ملک الشعراء کا خطاب عطا فرماتے ہیں" شاعر

شاعر نے ترقیِ اقبال و دولت کی دعائیں دیتے ہوئے قصیدہ سنایا ——— ——— ملکہ نے چلمن کے قریب بُلا کر داد دی اور حکم دیا کہ شاعر ہر روز سوا نیزہ دن چڑھے قصرِ سلطانی پر حاضری دیا کرے۔ حکم بظاہر لینے کو تو دے لیا۔ لیکن جس آواز نے حکم دیا وہ ایسی پیاری، ایسی شیریں، اتنی لوچدار، اتنی مدبھری تھی کہ شاعر کو اس کی لذت سے مدہوشی سی معلوم ہونے لگی۔ ایک کپکپی سی محسوس ہوئی، اور سارا جسم سنسنا گیا ——— معلوم نہیں اس آواز میں کیا جادو تھا کہ شاعر اس کو سننا چاہتا تھا اور تڑپنا چاہتا تھا، تڑپنا چاہتا تھا اور مرجانا چاہتا تھا آج زندگی میں پہلی بار وہ ایک ایسی لذت سے دوچار ہوا تھا جس کے لئے باوجود قادر الکلام ہونے کے وہ کوئی اور نام تجویز بھی نہ کر سکتا تھا، مسرت۔ ایک ناقابلِ بیان مسرت اس کے رگ و پے میں اُمنڈی چلی آتی تھی۔ مردہ رگوں اور خفیف شریانوں میں خون اُبلا پڑتا تھا ——— یہ آواز ایک دعوت تیز تھی کہ شاعر اس دنیا کو پھول کی پنکھڑی کی طرح مسل کر رکھ دینے کے لئے تیار تھا کہ سوائے اس موہنی آواز کے اُسے اور کچھ دکھائی نہ دے سنائی نہ دے۔ وہ ایک لطیف نغمہ کی مانند فضائے بسیط میں تحلیل ہو جانا چاہتا تھا۔ اس سحرِ شیریں کلامی نے اس کے جسمِ نزار میں ایک آگ سی پھونک دی تھی اور بوڑھا شاعر نہ جانتا تھا کہ اُس کے خون میں جو شعلے سے لپک رہے ہیں اُنھیں کونسی چیز ٹھنڈا کر سکے گی ——— وہ دربار سے سیدھا پھول باغ کی جانب بھاگا۔ مدن بان کی نرم و نازک بیلوں کو جھکا کر اُن کے روپہلی پھولوں سے اپنے جلتے ہوئے رُخسار ملنے لگا۔ چمپا کی جھاڑیوں سے اُلجھ گیا۔ پریم چکری کے پتے نوچ ڈالے ——— دیوانے کو کیا خبر کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ آج شاعر کی جوانی کا پہلا دن تھا! ——— آج پہلی مرتبہ جذباتِ رنگین نے اس کے سازِ دل پر ایک متوالا گیت گایا!

——— گھر آ کر چراغ کی مدہم روشنی میں فکرِ سخن شروع کی جس رفتار سے اس کا دل دھڑک رہا تھا، اسی انداز سے چراغ بھی ٹمٹما رہا تھا! آج غضب کی آمد تھی۔ جو کچھ اُس کی بوڑھی اُنگلیاں لکھ سکیں محفوظ ہو گیا۔ بیسیوں شعر ہوئے اور بے لکھے ضائع ہو گئے۔ اسے یقیناً الہام ہو رہا تھا۔ زرطلبی، جاہ طلبی، شہرت پسندی، خطاب یا فتگی کوئی چیز اس کے پیشِ نظر نہ تھی۔ آج اس کا موضوع اور نیتِ سخن بالکل جداگانہ تھے ——— ان سب کے مقابلہ میں حسین تر گیت آور، پاکیزہ اور لطیف تر ——— ہاں! وہ ملک الشعراء بھی تو تھا اُسے یاد آ گیا! مگر نہیں اب وہ اس خطاب کا محتاج نہیں رہا۔ وہ اس خطاب کو بالکل اسی طرح بھول جانا چاہتا تھا جس طرح ایک چھوٹی لڑکی بالغہ ہوتے ہی اپنی گڑیوں کو کسی اونچے سے طاق میں رکھ کر بھول جائے ——— آج تو اس بوڑھے شاعر نے پیارے پیارے شعر کہے۔ آج اس کا دل شعر کہہ رہا تھا اور اس کے نزدیک دماغ کی حیثیت ایک عضوِ معطل سے زیادہ کچھ نہ تھی ———

شاعر نے بے شمار راتیں شرابِ طہور کی تمنا میں کاٹ دی تھیں بالآخر آج اس نے معلوم نہیں کس ترنگ میں شرابِ انگوری پی ہی لی۔ ایک جام بھرتا اور شوقِ جبو۔ بیتا سے پی جاتا۔ دوسرا۔ تیسرا۔ معلوم نہیں کتنے جام پی گیا۔ اور جب صراحی اس جذبۂ آتشین سے خالی ہو گئی تو اسے اس انداز سے پرے پھینک دیا جس طرح پجاری منہ اندھیرے دیوی کے گلے سے رات کے پہنائے ہوئے باسی ہار مندر کے دوارے سے دُور کہیں اور پھینک دیتا ہے! بہت سے شعر کہہ گیا ——— کچھ دیر ٹھہرا ——— کچھ سوچا ——— ایک جھنجھنی سی لی اور یہ شعر کاغذ پر لکھ لیا ؎

پسِ مرُدن بنائے جائیں گے ساغر مری گِل کے
لبِ جاں بخش کے بوسے ملیں گے خاک میں مِل کے

——— شاعر اس رات کو اُچاٹ سی نیند سویا۔ ایک عجیب سی کیفیت اس کے دل و دماغ پر مستولی تھی۔ اس نے خواب دیکھا کہ دنیا بھر کی حسین اور جوان عورتیں ایک مرغزار میں جمع ہیں، اور سیوتی، گلاب، اور چنبیلی کے پھولوں میں اسے تول رہی ہیں۔ کچھ دیر کے بعد ان عورتوں نے شاعر کو حلقہ میں لے لیا اور سب کی سب پریت کے گیت گانے لگیں۔ شاعر نے محسوس کیا کہ وہ اپنے جسم کی کثافتوں کو تج کر اس نغمہ کی ان لطیف تاروں پر جو فضا میں ان حسین گلوں سے تخلیق ہو کر بکھر گئی تھیں۔ شاعر خود بھی ایک رقصِ مستانہ میں مصروف ہے۔

——— ابھی آفتاب کی ٹکیا سنہری سے روپہلی نہ ہوئی تھی کہ شاعر بیدار ہوا۔ شہزادی کی حلاوت آفرین آواز اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ شاعر کے دل میں ایک گدگدی سی محسوس ہوئی اور وہ چاہتا تھا کہ ہمہ تن سامعہ ہو جائے۔ اس کے دماغ نے کہا، شاعر کیوں بن آئی مرنے چلے ہو؟ دل نے کہا، شاعر ایسی ہی موت کا نام تو حیاتِ ابدی ہے۔

——— شاعر سوچنے لگا کہ آخر رات اس نے شراب کیوں پی لی۔ آخر وہ کیوں اپنے شیشۂ تقدس کو توڑنے پر مجبور ہو گیا۔ کیوں اس نے شراب پی لی!

دماغ نے کہا "شاعر یہ تھی تیرے اخلاق کی موت" دل نے کہا "نہیں شاعر تو نے فطرت کی بلندی کو پالیا" شاعر نے اپنے تئیں کہا "خیر یہ تو سب کچھ ہوا مگر میں اپنے آپ کو کیوں باؤلا کئے ڈالتا ہوں۔ بھلا سوچ تو سہی دیوانے کہاں تو اور کہاں شہزادی کا عشق، اوہنہ، بھکاری کہیں کا" دل نے کہا "بھکاری کیوں؟ تو بھی تو ملک الشعراء ہے" دماغ کہنے لگا "بیشک، جھولے جاؤ، اسی خیال میں" شاعر نے یہ کہہ کر فیصلہ ہی کر دیا کہ ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

——— شاعر نے پھر ایک بار اپنے تئیں کہا "شہزادی کو بولتے ہوئے سنتے رہنے کی تنا مجھ پر کیوں اس قدر قابو پا گئی ———
شائد اسی کا نام ——— اسی کا نام محبت ہے ———
آخر ہوگا کیا اگر میں اس کی آواز سننے سے محروم کر دیا جاؤں ——— —
مر تو جاؤں گا نہیں کچھ ———" اس خیال کے آتے ہی شاعر کا دل دھک دھک کرنے لگا اور وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔

——— آج شاعر نے اپنے تئیں خوب سنوارا، اتنا کہ لوگ دیکھکر ہنس دیتے۔ جب چوک سے گزر رہا تھا تو مالتی نے دریچہ سے جھانک کر دیکھا اور پریم متا سے کہنے لگی "اے ری سکھی ادر بھی دیکھا تو نے۔ بوڑھی گھوڑی اور لال لگام" اور دونوں ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگیں۔ ———

——— وقت سے کچھ پہلے ہی شاعر قصر سلطانی میں تھا۔ ملکہ کے حضور میں باریابی ہوئی تو بادشاہ بھی وہیں موجود تھا ———

——— شاعر نے اپنا کلام سنانا شروع کیا ——— - - ——— بادشاہ حیرت میں تھا۔ مورچھل ہلانے والی پرستار اپنی جگہ پر بُت بن کر رہ گئی، چوبدار عصا کو کونے میں ٹیک کر آدابِ شاہی سے بے خبر چلمن کے قریب آ کھڑا ہوا، باندی جسے صبوحی لانے کو حکم دیا گیا تھا ساکت کھڑی ہو کے خالی صراحی کو تھپکیاں دینے لگی۔ ملکہ حزن و حیرت کی نظروں سے شاعر کو تک رہی تھی، ساکت و صامت بعینہ اس مورتی کے مانند جس کے پجاریوں نے ایک نیا صنم ترشوالیا ہو، ملکہ اس وقت اپنے باپ کے نوجوان و حسین وزیر تشریفات کے تصور میں تھی۔ وہی جو اصلی معنوں میں اس کے دل کا مالک تھا، وہی جو اس کے جذبات پر حکمران تھا۔ ملکہ نے نظریں نیچی کر لیں اور سوچنے لگی کہ انسان فاعل مختار ہونے کے باوجود کس حد تک سماج کا غلام ہے۔ اس وقت اُسے ان رس بھری راتوں کا تصور مارے ڈالتا تھا جب اس کا بالم پچھلے پہر مولسری کے درختوں کے نیچے اس کے انتظار میں بیٹھا رہتا تھا ——— افسوس وہ اس سے شادی نہ کر سکی، مراتب کا فرق مانع تھا ——— ملکہ کو دل میں ایک چبھن سی محسوس ہوئی، ایک ہوک سی اٹھی، ایک پھریری لے کر اس خواب سے بیدار ہوئی۔ ہر چہار جانب سناٹا تھا۔ صرف شاعر کی آواز اس سکوت پر حکمراں تھی ———
شاعر نے شعر پڑھا ؎

پس مردن بنائے جائیں گے ساغر مری گل کے
لب جاں بخش کے بوسے ملیں گے خاک میں مل کے

بادشاہ نے کہا "وہ کیوں کر؟" شاعر نے ہاتھ باندھکر جواب دیا "شعر قصہ طلب ہے جہاں پناہ" بادشاہ نے کہا "وہ کیا قصہ ہے جہاں پناہ؟" شاعر نے یوں قصہ کا آغاز کیا ———: "ایک زمانہ گذرا کہ اپنی سلطنت کے شمال میں بہت دور ایک سلطنت تھی۔ بادشاہ بہت عادل اور رعایا پرور تھا۔ اُس کی ایک بیٹی تھی کام روپ نام۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب، ایک دن شہزادی مہتابی پر کھڑی بال سکھا رہی تھی کہ ایک نوجوان رہگیر کی نگاہ اچانک اس پر پڑی اور وہ ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ لیکن کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگا تیلی، قرب نصیب ہوتا تو کیوں کر، ایک مدت تک وہ نوجوان اس چنگاری کو دل کے خاکستر میں چھپائے رہا۔ لیکن جب یہی ننھی سی چنگاری اُسے شعلہ بنتی ہوئی معلوم ہوئی تو وہ جنگل و بیابان کی جانب اس خیال سے چلدیا کہ شائد صحرا کی وسعتوں میں اس کا جنون سما جائے، لیکن قدرت کے حسین مناظر یہاں اُسے اور زیادہ تڑپانے لگے۔ دلِ وحشی مچلتا، وہ خود تڑپتا، ایک مدت تک تڑپا کیا۔ آخر موت نے آکر اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سکون کی نیند سلا دیا - - ——— ایک چشمے کے کنارے اُس کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی۔ وقت گذرا اور اس کی لاش مٹی کا ایک حقیر سا تودہ بن کر رہ گئی اور بالآخر چشمے کا پانی اُسے بہا کر لے گیا اور اِس امانت کو اُس دریا کو سونپ دیا جس سے چشمہ خود وصل ہو جاتا تھا ———
اِدھر کام روپ کسی دوسری جگہ بیاہ دی گئی۔ ایک دن شہزادی کام روپ نے اپنے شوہر سے کہا "ہر چند ساغر بلور نمائش میں کو خوب ہے لیکن مٹی کا کوزہ خوب تر۔ جی چاہتا ہے کہ کل سے مٹی کے کوزہ میں مے پیوں۔ کیوں! کیسی سوندھی معلوم ہوگی۔ سوامی!؟" دوسرے ہی دن کوزہ گر مٹی کے کوزے بنا لایا اور نصیبِ عشق

مٹی بھی ملی تو وہی جسے دریا بہالایا تھا ———— برسات کی بھیگی بھیگی راتیں تھیں۔ کام روپ اور اُس کا سوامی شیشۂ ساغر لئے شبستانِ محبت میں آئے۔ کام روپ کے لبوں کو کوزے نے چھوا ہی تھا کہ آواز آئی ؎

پسِ مردن بنائے جائیں گے ساغر مری گِل کے
لبِ جاں بخش کے بوسے ملیں گے خاک میں مل کے

کام روپ تیورا کر گری اور ایک سسکی لینے کے بعد ختم ہوگئی ———— شاعر خاموش ہو گیا ———— تیورا کر گرا ————

خدام جھپٹے ———— ملکہ نے بڑھ کر پُوچھا۔ شاعر! کیوں۔ کیسے ہو؟" شاعر نے ایک لمحہ کے لئے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی نگاہیں مسکرا رہی تھیں۔ پرسشِ حال کرنے والے کو دیکھتے ہوئے اُس نے خاموشی سے آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر لیں۔

شاعر کی موت کو تقریباً ڈیڑھ برس گزر گیا۔ ملکہ مہر نیم روز کے ہاں ایک چاند سا بچہ پیدا ہوا۔ ولی عہد سلطنت کی ولادت پر اس قدر جشن ہوئے کہ لوگ اُکتا گئے اور اس یک رنگ زندگی سے تھک کر ایک گروہ تو رنج و غم کی تمنا کرنے لگا جس دن سب سے بڑا دربار منعقد کیا گیا تو ہر اس سلطنت کے سفیر حاضر تھے جن سے دوستانہ تعلقات تھے۔ شہزادی مہر نیم روز کے باپ نے بھی اپنے نوجوان وزیر تشریفات کو ننھے ولی عہد کے لئے تحائف دے کر بھیجا ————

اس دربار میں وزیر تشریف اپنی جگہ پر ہاتھ باندھے ایستادہ تھا۔ وہ مردانہ حسن و وجاہت کا مکمل نمونہ تھا، اور معلوم نہیں اس کی شخصیت میں کونسی کشش پنہاں تھی کہ ہر شخص کی نگاہیں بار بار اُس کی جانب اٹھی جا رہی تھیں۔ ہر سفیر نے باری باری اپنے دوستانہ تعلقات کا اعادہ کیا، اور اپنے آقائے ولی نعمت کی جانب سے محبت اور خلوص کا پیام دیا۔ وزیر تشریفات بھی آگے بڑھا۔ ملکہ مہر نیم روز نے اپنا خوبصورت ہاتھ بڑھا دیا۔ وزیر تشریفات نے اپنے گھٹنے کو خم دے کر ملکہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور دو آنسو ٹپکا دئے۔ دربار برخواست ہوا اور مہمان رخصت ہوئے ———— بادشاہ اور ملکہ نے دوسرے دن سنا کہ واپسی پر وزیر تشریفات نے دریا میں کُود کر خودکشی کر لی ———— ———— کوئی نہ سمجھ سکا کہ اس خودکشی کا سبب کیا تھا ———— ———— ملکہ اپنی خوابگاہ میں جا کر خوب روئی۔ پھُوٹ پھُوٹ کر روئی، اس قدر کہ جوشِ گریہ سے چہرہ سُرخ بھبوکا سا ہو گیا۔

———— چند دن کے بعد ملکہ کو حرارت رہنے لگی وہ دن بدن لاغر ہوتی چلی گئی۔ کوئی چیز تھی جو اُسے اندر ہی اندر گھُلائے دے رہی تھی۔ کندن سا رنگ سیاہ ہو چلا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ طبیبوں نے دِق تجویز کی۔ ہر چند دِق بادشاہوں کا مرض ہے۔ لیکن ملکہ کو اس کی شاہی نے بھی کچھ کام نہ دیا۔ بوڑھے طبیب شاہی نے نہایت محنت سے ایک دوا تیار کی۔ اس کی ہدایت کے مطابق یہ دوا مٹی کے ایک کوزہ میں جانثار ملکہ کے سامنے لائی گئی ———— ———— ملکہ نے لڑکھڑاتے ہوئے ہاتھوں سے کوزہ تھام لیا اور لبوں سے لگاتے ہی کوزہ کو فوراً ہٹا لیا ———— کون جانے کہ ملکہ کے دل نے کیا کہا کہ اس کوزہ کو چھاتی سے لگا کر بھینچ ڈالا ———— قصر سلطانی میں رہنے والے کچھ تو رو رہے تھے اور کچھ سناٹے میں تھے ———— ملکہ سماج کی قیود سے ہمیشہ

جب وقت چھلکتی ہے مئے ناز کسی حبیب
رنج ہوتا ہے واعظ پارسی کا نصیب
کرتا ہوں جب انساں کی تباہی پہ نظر
دل چیخ اُٹھتا ہے خدا ہے کہ نہیں

[illegible]

عرضِ حقیقت

مری فطرت میں گو موجود ہیں جذباتِ طوفانی
نرالا ہے جہاں سے گو مرا ذوقِ سخندانی

مری کوشش ہے گو میں نظم کو سلکِ گہر کردوں
مری خواہش ہے گو اشعار کو پاکیزہ تر کردوں

مری گو آرزو ہے داستانِ شوق ہو جاؤں
تمنا ہے مری گو ترجمانِ شوق ہو جاؤں

مجھے گو اک زمانے سے نرالی دُھن سمائی ہے
مگر حارج مرے رستے میں میری بے نوائی ہے

جو لاؤں شاعری میں انقلاب اک کس طرح لاؤں
جو پاؤں جوہرِ فطرت کی قیمت کس طرح پاؤں

سناؤں تو سناؤں کس طرح جذباتِ پنہانی
نہ دنیا دی حشم حاصل نہ حاصل فضلِ ربانی

گرفتارِ غمِ ہستی اسیرِ قعرِ پستی ہوں
جو بس بس کر اُجڑ جائے میں وہ برباد بستی ہوں

دیا فطرت نے بہرہ جس قدر روشن خیالی کا
اُڑایا اُس قدر حصہ مری آسودہ حالی کا

نہ شکوہ ہے مقدر کا نہ قسمت کی شکایت ہے
مجھے صبر و رضا کی راہ پر چلنے کی عادت ہے

جنونِ شعر گو اک آئینہ ہے ہوشمندی کا
مگر اُلٹا ہے اُس میں عکس میری سربلندی کا

اگر چاہوں تو ذرے میں ضیا خورشید کی بھر دوں
اگر چاہوں خزف کو آب میں رشکِ گہر کر دوں

اگر چاہوں تو قطرے کو سمندر کر دکھاؤں میں
اگر چاہوں بگولا بن کے صحرا کو اُڑاؤں میں

اگر کہنے پہ آجاؤں بقا کو لا فنا کر دوں
زمیں کو عرش کر دوں، عرش کو تحت الثریٰ کر دوں

اگر ہر جھوٹ سچ کہنے پہ آجائے زباں میری
روانی میں بڑھے گنگا سے بھی طبعِ رواں میری

خوشامد کی ریاکاری سے لیکن دُور رہتا ہوں
میں ہوں مجبورِ فطرت اِس لئے معذور رہتا ہوں

قصیدہ خوانیوں سے سر بسر مجبور ہے فطرت
زمیں سے آسماں مجھکو ملانے کی نہیں عادت

یوں ہی دَر دَر پہ مجھ کو جبّہ سا ہونا نہیں آتا
مری خود داریوں کو منت کا رونا نہیں آتا

عرش ملسیانی - بی اے

انتقام

میکش اکبر آبادی

ثابت ابن جابر ایک عربی اور جاہلی شاعر ہے جس کا لقب "تابط شرا" ہے۔ تابط بغل کو کہتے ہیں۔ اُس نے ایک دفعہ چھری بغل میں چھپا کر دھوکے سے اپنے کسی دشمن کو قتل کر دیا تھا۔ عربی بہادری کے لئے یہ عمل باعث صد ننگ تھا، اس لئے اس کا لقب تابط شرا ہو گیا۔ کسی شخص نے اس کو قتل کر دیا جس پر اُس کے بھانجے نے ذیل کا مرثیہ لکھا ہے۔ پڑھئے اور یہ بھی دیکھئے کہ غم کے ساتھ شجاعت اور عدل کی خصوصیات کس درجہ نمایاں ہیں، اور انفعالی کیفیات کے ساتھ قوائے عملیہ حرکت کے لئے کس طرح بے چین ہیں۔ مقتول ماموں کی یاد بھی ہے اور قاتل کی مظلومی کے واقعات کا بیان بھی۔ واقعات اور جذبات کو اس قدر صداقت اور فطری سادگی کے ساتھ بیان کر دینا حقیقی شاعری کی روح ہے۔

ان بالشعب الذی دون صلع	اس گھاٹی میں جو سلع پہاڑ سے اس طرف ہے
لقتیلاً دمه ما یطلُّ	ایک ایسا آدمی قتل ہو گیا جس کا خون رائگاں نہیں جائے گا
خلف العبأ علی و ولی	اس نے مجھ سے پیٹھ پھیر لی، اور مجھ پر بوجھ رکھ دیا
انا بالعبأ له مستقلٌ	اب میں اس بوجھ (بار انتقام) کو اُٹھائے ہوئے ہوں۔
ووراء الثار منی ابن اخت	انتقام کے ضمن میں اس کا ایک بھانجہ بڑا جنگجو ہے
مصع عقدته ما تحل	جس کی کمر کبھی کھولی نہیں جاتی
مطرق یرشح سما کما	وہ خاموش سر جھکائے ہوئے زہر اگلتا رہتا ہے
اطرق افعی ینفث السم صل	بالکل افعی سانپ کی طرح
خبر ما نابنا مصمئل	بڑی سخت خبر ہمیں موصول ہوئی جس کے مقابلہ میں
جل حتیٰ دق فیه الاجل	خوفناک ترین خبریں بھی حقیر معلوم ہوتی ہیں۔
بزنی الدهر وکان غشوما	ظالم زمانے نے مجھ سے ایسے متکبر جوان کو چھین لیا
بابی جاره ما یزل	جس کا ہمسایہ کبھی ذلیل نہیں کیا جا سکتا۔
شامس فی القرحق اذا ما	وہ سردی کے موسم میں آفتاب کی طرح گرم
ذکت الشعری فبرد وظل	تھا اور جب ستارۂ شعریٰ چمکنے لگے اور گرمی ہو جائے تو ٹھنڈا اور سایہ دار
یابس الجنبین من غیر بوس	بغیر مفلسی کے اس کا پیٹ پسلیوں سے ملا ہوا رہتا تھا
وندی الکفین شهم مدل	اس قدر سخی تھا اور دشمنوں کو سر کی طرف سے پکڑنے والا
ظاعن بالحزم حتی اذا ما	ہشیاری کے ساتھ سفر کرنے والا، ہوشیاری
حل حل الحزم حیث یحل	وہیں مقیم ہوتی جہاں وہ قیام کرتا
غیث مزن غامر حیث یجدی	بخشش کے وقت موسلا دھار بارش کی
واذا یسطو فلیث ابل	مانند۔ حملے کے وقت مضبوط ارادے کا شیر
مسبل فی الحی احوی رفل	اپنی قوم میں جب بیٹھتا تو ڈھیلے ڈھالے نرم کپڑے پہنتا اور لڑائی کے وقت بھیڑئے
واذا یغزو فسمع ازل	کے بچے کی طرح چست و چالاک اور بہت تیز دوڑنے والا۔
وله طعمان اری وشری	اس کے دو مزے تھے ایک شہد کی طرح شیریں، دوسرا ایلوے کی طرح تلخ،
وکلا الطعمان قد ذاق کل	دونوں ذائقے (دوست و دشمن) سب چکھے ہوئے ہیں۔
یرکب الهول وحید ا ولا	وہ خوف پر اکیلا ہی غالب آجاتا، کوئی
یصحبه الا الیمانی الافل	اس کے ساتھ نہ ہوتا، سوا اُس کی دندانے پڑی ہوئی یمانی تلوار کے۔

رفتو هجروا ثم اسروا
ليلهم حتى اذا انجاب جلوا

بہت سے جوان دوپہر کو چلے پھر رات کو سفر کیا اور جب رات صبح سے الگ ہوگئی تو اُتر پڑے۔

كل ماض قد تردى بماض
كسنا البرق اذا ما يسل

ہر قوی اراده جوان منزل پر اترا ایسی تلواریں لئے ہوئے جو نیام سے نکلتے وقت بجلی کی طرح چمکتی ہیں۔

فادركنا الثار منهم ولما
ينج ملحيين الا الاقل

ہم ان جوانوں سے جا بھڑے اور ہم نے ان سے بدلہ لے لیا، دونوں طرف کے آدمی باقی نہ رہے مگر کم

فلئن فلت هذيل شباه
لبما كان هذيل يفل

جس تیزی سے مرحوم ہذیل کو کند کیا کرتا تھا اسی تیزی کے سبب ہذیل نے مرحوم کو کند کر دیا

وبما ابركها في مناخ
جعجع ينقب فيه الاظل

اس ہلاکی کا سبب ہی یہ ہے کہ اس نے ہذیل کو ایسی سخت جگہ بٹھایا جہاں اونٹوں کے تلوؤں میں بھی سوراخ ہو جاتے۔

وبما صبحها في ذراها منه
بعد القتل نهب وشل

اسی لئے ہذیل نے صبح کے وقت اُس کو قتل کر دیا اس کا مال لوٹ لیا اور اس کے اونٹ ہنکا لے گئے

صليت مني هذيل بخرق
لا يمل الشر حتى يملوا

اب ہذیل کا مجھ جیسے جوان بہادر سے مقابلہ ہوا جو لڑنے سے کبھی نہ تھکے گا یہاں تک کہ ہذیل ہی تھک جائے۔

ينهل الصعدة حتى اذا ما
نهلت كان لها منه عل

وہ جوان جو اپنے نیزے کو دشمنوں کا خون پلاتا ہے، جب ایک دفعہ نیزے سیراب ہو جاتے ہیں تو پھر دوبارہ پلاتا

حلت الخمر وكانت حراما
وبلاءٍ ما الملت تحل

(میں نے ماموں کا بدلہ ہذیل سے لے لیا) اب شراب میرے لئے حلال ہے ورنہ حرام تھی، مدت بعد شراب میرے لئے حلال ہوئی ہے

فاسقنيها يا سواد بن عمرو
ان جسمي بعد خالي لخل

اے سواد بن عمرو شراب پلا کر مجھ میں قوت آ جائے، کیونکہ ماموں کے بعد میرا جسم ناتواں ہو گیا ہے

تضحك الضبع لقتلى هذيل
وترى الذئب لها يستهل

گفتار (درندے) ہذیل کو جو میں نے قتل کیا ہے تو ہنستے ہیں اور بھیڑئیے خوشی منا رہے ہیں۔

وعتاق الطير تغدو بطانا
تتخطاهم فما تستقل

بڑے بڑے پرندے پیٹ بھر کر ناشتہ کر رہے ہیں اور ان کی لاشوں کے گرد ٹہلتے پھرتے ہیں اس قدر کھا گئے ہیں کہ اڑا بھی نہیں جاتا۔

اخلاص کا دنیا میں اجالا کر دے
الفت کا جہاں میں بول بالا کر دے
[illegible] کر اے رب قوی
[illegible] پیدا کر دے

بسمل

شاعرِ قیصریت

اسرائیل احمد خاں

کپلنگ کی وفات نے ہندوستان میں ایک بڑی دلچسپی کو بیدار کیا ہے۔ اخبارات وجرائد نے اس حادثے پر جو نوٹ لکھے ہیں، اور مختلف ادیبوں اور ناقدوں نے جو خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ کافی شایانِ شان معلوم ہوتا ہے۔ رائے عامہ کے یہ مظاہر بالکل قدرتی اور عین قرین توقع تھے، اس لئے کہ یہ "شاعرِ سلطنت" بڑی قربت کے ساتھ ہماری سرزمین سے وابستہ رہا ہے۔ ہندوستان اس کی ولادت کا گہوارہ تھا؛ اُسی نے اُس کو زندگی کا پہلا قدم بہم پہنچایا؛ اور یہ ہندوستان ہی کے متعلق "شاعرِ متوفی" کے وہ قصے تھے جنھوں نے اُسے "زندۂ جاوید" بنا دیا!!

لیکن وہ ہندوستان کا ایک ناخلف فرزند ثابت ہوا۔ اور اس محسن سرزمین کا ایک محسن کش مستفید!! کپلنگ پرلے درجے کا قیصریت پرست واقع ہوا تھا: وہ ہندوستان کی بہترین آرزوؤں کے خلاف تازیست صف آرا رہا! اِن معکوس سپاس گذاریوں کے لئے یہ ملک کبھی اُسے فراموش نہ کرے گا۔

کپلنگ کی نسبت کیا خوب کہا گیا ہے کہ "وہ ایک بڑا شاعر تھا، اور ایک چھوٹا انسان"! موخرالذکر حصۂ بیان کے بارے میں مطلقاً کوئی شبہ نہیں: وہ ایک بہت ہی ننھا سا دل ودماغ رکھتا تھا، اتنا ننھا کہ ایک عظیم سلطنت بھی جس کے جلوس تزک واحتشام کے ساتھ وہ ہمیشہ رواں دواں رہا۔ اُس میں وسعتِ ظرف پیدا نہ کرسکی۔ اور اب ایک شاعر اور نیز ایک ادیب کی حیثیت سے بھی، اُس کے حلقۂ نقد و داد میں وہ سابقہ گرم جوشی باقی نہیں رہی ہے: بلاشبہ، "ویسٹ منسٹر ایبے" (انگلستان کا گنجِ شہیداں) کے اندر اُس کی خاک کو "مشعرا کا گوشہ" مل گیا ہے! تاہم یہ امر کہ وہ انگریزی ادبیات کے "سلسلۃ الذہب" کی ایک کڑی ہے، بیحد مشتبہ ہے! یہ کوئی متعصبانہ قول نہیں جو کہ ایسے جذبے کی پیداوار ہو جس کا منشا ایک عظیم صاحبِ قلم کی بے وقاری کرنا ہو، محض اس بنا پر کہ وہ اک بے رحم دشمنِ حریت واقع ہوا تھا! خود انگریزی ناقدین کا روشن خیال طبقہ اسی نقطۂ نظر کا قائل ہوتا جا رہا ہے۔

نامور نقاد، اے جی، گارڈینر نے عرصہ ہوا لکھا تھا۔

"مسٹر رڈیارڈ کپلنگ پہلا انگریز ہے جسے ادبیات کا "نوبل انعام" ملا ہے، وہی پہلا فرزندِ انگلستان ہے جو یورپ کے دربارِ ادب میں تاج پوش کیا گیا ہے؛ اُسے علم وادب میں ہمارے ترجمان کی حیثیت سے منتخب کیا گیا ہے، در آنحالیکہ میریڈتھ، ہارڈی اور سوئن برن ہنوز ہماری محفلِ ادبی میں ضیا پاشی کر رہے ہیں؛ درگردوں کے مینا بازار سے لوگ گزر جاتے ہیں، اور جوہر شناسوں کی نظریں "ادبی آہنگروں" کی بھٹیوں پر مرکوز ہو رہی ہیں؛ ہم نہیں جانتے کہ بزمِ خاص کے اس فتوے کے کیا اسباب ہیں، لیکن اپنے اس اِذعان کے متعلق ہمیں شمہ برابر شبہ نہیں کہ کپلنگ ہماری بزمِ ادب کا صدر نشین ہرگز نہیں ہے!!"

مسٹر گارڈینر کے قلم سے منقولہ بالا الفاظ نے اُس وقت تراوش کی تھی جسے اب بیس سال کی مدتِ مدید گزر چکی ہے! اور دنیائے ادب کے ماضی قریب کے حوادث اب اس کے شاہدِ عادل بن رہے ہیں: اپنے دمِ واپسیں سے کُل دو ہفتے قبل کپلنگ نے اپنی ہفتاد سالہ سالگرہ منائی تھی: لندن کے ایک صفِ اوّل کے روزنامے نے اس موقعے پر جو اظہارِ خیال کیا یہ ہے:۔

"آج مسٹر رڈیارڈ کپلنگ کی ہفتاد سالہ سالگرہ ریاست ہائے متحدہ کے طول وعرض میں اپنا جشن منعقد کر رہی ہے۔ لکھوکھا امریکیوں کے گھروں میں مخصوص ہمہ گیر "لاسلکی نشریات" کا التزام کیا گیا ہے! ——— لیکن یہ کپلنگ صاحب سوائے اس کے کیا ہیں کہ برطانوی سامراج کے مُنادی ہیں؛ چنانچہ خود اس ملک میں کسی قومی وعمومی تقریب کا سامان نہیں کیا گیا!"

خیالات وجذبات کے اس انقلاب کی کیا علت ہے؟ مسٹر گارڈینر اپنے

خطیبانہ مرقعے میں اس حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں:-

"کپلنگ کسی فلسفۂ حیات کا پیغمبر ہے نہ کسی رفیع نصب العین کا داعی: وہ صرف ایک قوم کی مخصوص العہد سفلی ذہنیت کی مبلغ ہے: اس ماجرے کی کیفیت یہ ہے کہ بنی اسرائیل فربہ تن پرور ہونے لگے تھے، اور طلائی گوسالہ سامری کی پرستاری پر جھک پڑے تھے: یہ حسیاتِ اسفل کے صعود کا ایک دَور تھا: طاقت کی مستی کا ایک عہد تھا: ایسی طاقت کا جو قطعاً عفریت صفت واقع ہوئی تھی! جس کا کوئی نہ ہدایت مقصود نہ تھا! یہ ایک ایسا زمانہ دولت و عشرت تھا جس میں اکل حلال اور صدق مقال حرام تھا۔ جنوبی افریقہ کی کان ہائے زر نے خون میں اک ہیجان پیدا کر رکھا تھا! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانوی قوم کی روحانی زندگی میں اک "تحویل قبلہ" کا انقلابی نعرہ آیا تھا جس نے اس کے چہروں کو "کلیساؤں" سے "مرکزِ بازار ہائے مبادلہ" کی طرف کر دیا تھا:"

کپلنگ کی مشہور عالم وطن پروری بھی ایک رسوائے عالم چیز تھی! وہ مدینۂ تمدن کے قلب و مرکز سے بالکل منحرف تھی! اُس کا مرکزِ ثقل "گوروں کی بارگیں" تھا: یہ دعوت تھی اک ایسی قوم کے جاذبۂ وطنیت کو جسے بشریت کی خدمت کی کوئی سعادت حاصل نہ ہو بلکہ بجائے اس کے جو اپنی جہانگیریوں اور کشورکشائیوں کے نشۂ فخر سے بدمست ہو: جس چیز کی اُس نے مدحت گری کی وہ انگلستان کی رُوح نہ تھی بلکہ اُس کی قوت و بازو! اُس کے نغمۂ قلب کو اس نے نہیں گایا، اُس کے جنگی جہازوں کی اژدر دَم توپوں کی صدائے بازگشت بلند کی: اُس نے انگلستان کی اُس عظمت کو بیان نہیں کیا جس کا طغرائے امتیاز یہ ہو کہ ؎

بزرگ اوست کہ برخاک ہمچو سایۂ ابر
چناں رَوَد کہ دلِ مُور را نیازارد

بلکہ اُس کی اُس سینہ زوری کی بھٹی کی جو جرار فوجوں کی حملہ آوریوں اور قہار لشکروں کی ارض پامالیوں میں نظر آتی ہے: اس نے انگلستان کے ہر فرد کے متعلق چاہے جو کہا ہو لیکن شیکسپیئر اور ملٹن کی تو ایک جگہ بھی ہمنوائی نہ کی:۔

سُنیئے، اقوامِ عالم کے بارے میں اُس کا نعرۂ فرعونی کیا ہے؟

"نیکی اور راستبازی؟! لاحول ولا قوۃ! کیا ہمارے بازوئے قومی کو ایک پنجۂ فولادی نصیب نہیں؟ کیا رب الافواج ہمارے عقب میں ہماری کمک پر نہیں؟ کیا اِس خوش سَواد روئے ارض کو ہم نے اپنے نقدِ شمشیر سے اپنے نام بیع نہیں کرا لیا ہے؟ کیا اپنے خون و گوشت کی صورت میں ہم نے خدا کو اُس کی پوری قیمت نہیں ادا کر دی ہے؟ اور کیا ہم اپنی خدائی جاگیر کے سیاہ و سفید کے مختار نہیں ہیں؟ ہندوستان کا ہندی۔ ٹرانسوال کا بوئر۔ آئرلینڈ کا آئرستانی یہ کیا ہیں، اگر ہمارے معدۂ قیصریت کی غذائے لذیذ اور ہمارے دہن سلطنت کے لقمۂ تر نہیں: یہ اہل ہند کو ہماری ذات بیچوں و بیچگوں کے سامنے منقار شکایت کھولنے کا حق کیا ہے! اور یہ آئرلینڈ کے شوریدہ سر اگر انگریز خلفائے ارض کے مردود و باغی نہیں ہیں تو کیا ہیں؟!"

کیا یہ غلط ہے کہ کپلنگ، ہندوستان کے دورِ بدعہد اور عہدِ بدبختی کا ایک آوازہ تھا؟ یا دش بخیر ورڈز ورتھ کی نسبت ایک ناقد نقاد نے کہا تھا کہ:

رہانیدی مرا از شیشۂ ہستی
چو پیمودی پیاپے جامِ مے را

انگلستان کی نئی پود کو یہ ذاتِ شریف ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ ایک نوجوان نے ابھی حال میں کہا تھا:-

"جب میں رڈیارڈ کپلنگ کا کلام پڑھتا ہوں تو میرا تخیل ہمیشہ لوہار کی بھٹی، اور چمار کی رانپی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے: یہ شاعر کے رشحاتِ خامہ ہیں، یا آہنگر کی ضرباتِ گُرز؟ اُس کا قلم عین برمنگھم کی کسی کارگاہِ اسلحہ کا ساختہ معلوم ہوتا ہے!"

مشہور ادیب مِنِّن سوئفنرٹن نے اپنے ایک مکتوبِ مفتوح میں رڈیارڈ کپلنگ کے "ضیاءِ قیامِ ہند" کی طرف اس طرح چشمک کی تھی۔

"آپ کے شباب کو ایک ایسا ملک ملا تھا جو کرۂ ارض کی ہر سرزمین سے زیادہ رنگینی، بوقلمونی، اور بوالعجبی رکھتا تھا۔ یہاں فیلان کوہ پیکر مع ہودج زر، اور جذامیوں کے لشکر، تاج محل اور پھوس کی جھونپڑی، "تاجِ برطانیہ کا درخشاں ترین الماس" اور سلطنتِ برطانیہ کا پامال ترین افلاس ——— پہلو بہ پہلو نظر آتے تھے! تاہم اس ہجوم جہنم و جنت کے منظر میں جنابِ آنجناب کی تراوشِ خامہ کی زہر چکانی اس سے زیادہ نہیں کہ کس طرح تین گورہ سپاہیوں نے شراب پی اور کس طرح شملہ میں اطالوی افسر بدمست ہوئے اور عزیز بار کی بیویوں کو خراب کیا؟"۔

تفو، بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

"کلیم" دهلی

طوفان نوح



کجا دانند حال ماسبک اِن ساحل ها !

"حافظ"

آئینۂ تخیلات

محمد عسکری لکھنوی

(آرٹس)

سچا آرٹ خالق کی موذبانہ نقل ہے۔ (اڈورڈس)

حقیقی آرٹ اظہار ہے انسان کی مسرت کا اللہ تعالے کے کاموں میں، جو خود انسان کے نہیں ہیں۔ (رسکن)

سب سے بڑا مسئلہ کسی آرٹ کا یہ ہے کہ کسی اعلیٰ اصلیت کی جھلک، ھوکہ سے دکھائی جائے۔ (گیٹے)

آرٹ کے سچے کام کمال الٰہی کا سایہ ہوتے ہیں۔ (میکائیل انجلو)

آرٹ کا کمال یہ ہے کہ ایک روح دوسری روح سے گفتگو کرے اور جس قدر بولنے والے کی روح بڑی ہوگی اسی قدر آرٹ کا درجہ بڑا ہوگا۔ (رسکن)

بہترین آرٹ نیچر کی نقل کرتا ہے۔ جیسے کوئی شاگرد استاد کی نقل کرے پس آرٹ گویا اولاد الٰہی میں سے ہے۔ (ڈینٹے)

آرٹ کا کمال یہ ہے کہ آرٹ نہ معلوم ہو۔ (کوئنٹیلین)

کسی آرٹ کے کام کی جانچ اس کی عیب گوئی کرکے نہ کرو۔ (واشنگٹن ارونگ)

شہوت مارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ حسین چیزوں کی قدر کرو۔ تمام اعلیٰ درجہ کی تصاویر لازمی طور پر عفت کی تصویریں ہیں۔ گو کہ تصویر کا مضمون کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے مطالعہ سے خیالات میں پاکیزگی اور بزرگی پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح ٹریجڈی سے جذبات انسانی پاک وصاف ہوتے ہیں۔ (شلیگل)

بہترین آرٹ نیچر کی بہترین پیروی ہے۔ (ڈیس)

آرٹ کی اصلی غرض یہ ہے کہ نیچر کی نیابت کرے نہ کہ اس کی نقل۔ (ہنٹ)

چونکہ سنگتراشی، مصوری اور قصہ نویسی کی بنیاد تخیل پر قائم ہے، اس وجہ سے ان کا برتنے والا قطعی حق کا جویا نہیں ہوتا۔ بلکہ حق کی ایک خیالی تصویر کی تلاش میں رہتا ہے (ریلو)

معمولی حقائق یا اشیا کی اصلیت آرٹ کے دائرۂ اثر سے باہر ہیں۔ ایک ایسا دھوکا جس کی بنیاد اصلیت پر ہے، تمام فنون لطیفہ کی جان ہے۔ (جوبرٹ)

آرٹ نیچر کی نقل نہیں کرتا، بلکہ نیچر کے مطالعہ سے فائدہ اٹھاتا ہے، وہ نیچر سے ایسی چیزوں کو چن لیتا ہے جن سے اس کے خیالات میں مطابقت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ان چیزوں کو ایسی صفتیں دیتا ہے جن کا وجود نیچر میں نہیں ہے یعنی اپنی عقل و روح۔ (ملبوئر)

آرٹ کی غرض جذبات کو خیالات میں تبدیل کرنا، اور پھر ان خیالات کو تشکل کرنا ہے (ڈیسائرلی)

سمجھدار آرٹ کے اسباب پر غور کرتا ہے، اور ناسمجھ اس سے صرف لطف اندوز ہوتا ہے۔ (کوئنٹیلین)

مفید فنون کی ماں ضرورت اور لطیف فنون کی ماں تعیش ہے۔ اور مفید فنون کا باپ عقل اور لطیف فنون کا باپ تخیل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ تخیل بھی عیش کی ایک صورت ہے۔ (شوپنہار)

جہاں تک کسی تصویر کے عمل کا تعلق ہے تو مصور محض ایک دستکار ہے، اور جہاں تصویر کا تعلق تخیل اور رومانیت سے ہے تو مصور اور شاعر میں کوئی فرق نہیں۔ (شیلر)

تصویر میں رنگ کو شکل سے وہی نسبت ہے جو نظم کو نثر سے ہے یعنی اظہار خیال کا وہ بہترین ذریعہ ہے (مسز جیمسن)

آرٹ ایک متناسب اظہار حسن کے لئے ایک طریقہ اختیار کرتا ہے، یہی طریقہ سائنس بھی احقاق حق کے لئے اختیار کرتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ سائنس کی تحقیق میں وہ طریقہ نظر کے سامنے واضح رہتا ہے۔ اور آرٹ میں وہ چھپ کر رنگ اور شکل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ (ملبوئر)

کیا اچھا ہوتا کہ ہماری آنکھوں میں تصویر کھینچنے کی قوت ہوتی خیال کرو کہ آنکھ سے ہاتھ تک اور پھر ہاتھ سے پنسل تک کس قدر تضیع وقت ہے۔ (لیسنگ)

ابتدا

ہر چیز کی ابتدا کا خیال رکھو، نتائج اپنا خود خیال رکھیں گے۔ (الیگزنڈر کلارک)

قدما کا قول تھا کہ کسی کام کی ابتدا اگر اچھی ہو تو گویا وہ آدھا پورا ہو جاتا ہے

(پالبیس)

ہر چیز میں پہلا قدم مشکل ہے۔ (میڈم ڈی اسٹیل)

نقصان کو ابتدا ہی میں روکو، تاکہ وہ وقت کے ساتھ بڑھنے نہ پائے۔ (شکسپیر)

ابر

وہ آسمان کی رنگ آمیزیاں۔ (البرٹ اسمتھ)

ابر ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا کسی فرشتہ نے اپنی رنگین قبائیں ہوا میں معلق چھوڑ دی ہیں۔ (جوانا بیلی)

اے اللہ یہ ابر تیری گاڑیاں ہیں۔ ان پر تو سوار ہو کر اپنے کھیتوں، اپنے باغوں۔ اپنی چراگاہوں، اپنے جنگلوں اور میدانوں کی سیر کرتا ہے۔ یہ وہ پردے ہیں جن کو تو جب تیرا جی چاہتا ہے درختوں پر ڈال دیتا ہے۔ تاکہ وہ دھوپ کی تپش سے محفوظ رہیں۔ اور مرجھائیں نہیں، کبھی وہ تیرے توپخانوں کا کام دیتے ہیں جن سے تو اپنے قہر و غضب کے رعد و برق سے لوگوں کو ڈراتا ہے۔ اور کبھی ان کو اسی سے سزا بھی دیتا ہے۔ (گا تھولڈ)

اتفاق (حادثہ)

خدا کے نزدیک کوئی امر اتفاقی نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ (لانگفیلو)

ہر برے سے برے امر اتفاقی سے عقلمند کوئی مفید نتیجہ نکالتا ہے اور ہر اچھے سے اچھے امر اتفاقی سے بے وقوف اپنے واسطے نقصان تصور کرتا ہے۔ (روکی فوکو)

عقل اور تدبیر جن چیزوں کو آہستہ آہستہ اور محنت سے جمع کرتے ہیں ان کو اتفاق بعض وقت ایک لمحہ میں مہیا کر دیتا ہے۔ (شلر)

جس کو ہم اتفاق کہتے ہیں وہ خدا کی عین مشیت ہے۔ (بیلی)

اتفاق کوئی چیز نہیں، جو چیز ہم کو اتفاق معلوم ہو وہ تقدیر کے گہرے پردوں سے نکلتی ہے۔ (شلر)

لفظ اتفاق کسی واقعہ یا نتیجہ کے اسباب کے جہل پر دلالت کرتا ہے، نہ یہ کہ ہم خود اتفاق کو سبب قرار دیتے ہیں۔ (ہنری فرگس)

اتفاق ضرور ایک چیز ہے، مگر اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اللہ تعالے کیوں نہ اس سے کام لے۔ (ہمس)

اس سے بڑھکر کون خیال بے وقوفی کا ہو سکتا ہے کہ اتنا بڑا کارخانہ۔ زمین و آسمان۔ اتفاق سے وجود میں آیا۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک چھوٹی سی سیپی کا خلق بھی ہمارے امکان سے باہر ہے۔ (جیری ٹیلر)

اتفاق کو خدا کا دوسرا نام سمجھنا چاہیئے۔ ان صورتوں میں جبکہ خدا اپنا اصلی نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ (کولرج)

اکثر اتفاق سے علم کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ (ٹیپر)

اکثر کارنمایاں اتفاق سے ہوتے ہیں، مگر تعریف کسی بڑے آدمی کی ہو جاتی ہے

(ہیوم)

کسی کام کی کامیابی پر پورا بھروسہ نہ کرو۔ کیونکہ دنیا میں سلسلہ اتفاقات کی ایسی نظر میں نہ آنے والی کڑیاں پھیلی ہوئی ہیں کہ اگر وہ سب خود تمہارے اختیار میں ہوتیں تب بھی کامیابی یقینی نہ تھی۔ (ہربرٹ)۔

اتفاق نے کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ کوئی خوبصورت مکان نہیں تعمیر کیا۔ کوئی عمدہ تصویر نہیں بنائی، پھر بھی یہ چیزیں بمقابلہ ایک پھول یا ایک درخت کی آفرینش کے ہیچ ہیں۔ (بیرد)

اتفاق بہت قوی چیز ہے۔ تدبیر کے کانٹوں سے ہر وقت کام لو تو ماہی مراد کبھی نہ کبھی ضرور مل جائے گی۔ (اووڈ)

اتفاق ایک بے معنی لفظ ہے۔ کوئی چیز دنیا میں بغیر سبب کے نہیں ہوتی۔

(والٹیر)

اتفاق بھی ذی فہم کی مدد کرتا ہے۔

(جوبرٹ)

---

[1] مقابلہ کرو سے سرچشمہ شاید گرفتن بہ بیل ؛ چو پر شد نشاید گزشتن بہ پیل (سعدی)

احتیاط

دوسروں کے مصائب سے احتیاط سیکھنا عقلمندی ہے (پبلیس سائرس)

جب ہر چیز فانی ہے تو ہر چیز سے ڈرنا چاہیئے۔ (بائرن)

احتیاط یعنی گفتگو سمجھ بوجھ کے کرنا اور اپنے دلی خیالات بہت کم لوگوں سے ظاہر کرنا اس امر کی ضامن ہے کہ تم دنیا سے بھی اچھے رہوگے اور اپنے نفس کو بھی مطمئن رکھوگے۔ (ٹامس اے کیمپس)

کوئی شخص اس سے ہمدردی نہیں کرتا جو کسی جال میں بعد آگاہ کئے جانے کے پھنس جاتا ہے (ہیرک)

اپنی زبان اور اپنی روپیہ کی تھیلی ہمیشہ احتیاط سے کھولا کرو۔ اس سے تمہاری دولت اور تمہاری شہرت ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ (ہمرٹین)

جب تمہارے پڑوس میں آگ لگے تو تھوڑا پانی احتیاطاً اپنے مکان پر بھی ڈلواؤ۔ اس سے ممکن ہے کہ بعض لوگ تم کو وہمی خیال کرینگے، مگر احتیاط میں افراط بہ نسبت تفریط کے بہتر ہے۔ (برک)

جو شخص تمہارے ساتھ ایک مرتبہ بدعہدی کرے اس پر کبھی اعتبار نہ کرو کیونکہ جس نے ایک مرتبہ دغا کی وہ پھر دغا کرے گا۔ (شیکسپیر)

افراط احتیاط کمی عمل کا باعث ہوتی ہے۔ (شلر)

لوگوں کے مصائب سے سبق سیکھو، تاکہ دوسرے تم سے مثال نہ حاصل کریں (شیخ سعدی)

جو چیزیں کمال غور و فکر سے عمل میں آتی ہیں، وہ خوف سے مبرا ہوتی ہیں۔ (شیکسپیر)

میں کبھی ایسے محتاط لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اس خوف سے کہ کوئی بات غلط ان کے منہ سے نہ نکلے زبان بند رکھتے ہیں اور اس خوف سے کہ کوئی کام غلط نہ کریں کوئی کام ہی نہیں کرتے۔ (بیچر)

اختصار فی الکلام

اختصار روح ذہانت ہے۔ (شیکسپیر)

حقیقی خوش مذاقی زیادہ مطلب کم الفاظ میں ادا کرنا۔ اپنے خیالات کو جمع و منتخب کرنا، اپنی گفتگو میں ایک ترتیب و نظام قائم رکھنا۔ اور جو کچھ ہم کو کہنا ہو اس کو نہایت سکون و دلجمعی سے ادا کرنا ہے۔ (فینیلون)

جب کوئی شخص کوئی سچی بات کہتا ہے اور اس میں کوئی اپنی غرض پوشیدہ نہیں رکھتا تو وہ بہت زیادہ مطلب چند الفاظ میں ادا کر سکتا ہے۔ (اسٹیل)

بہترین عقل و ذکاوت اختصار کلام سے ظاہر ہوتی ہے۔ (امرسن)

تقریر کی بہترین اور شاندار ترین خوبی اور مقرر کی قدرت زبان کا راز یہ ہے کہ کلام مختصر ہو۔ (ہالیک)

اختصار تقریر کی بہترین خوبی ہے۔ عام اس سے کہ وہ کسی سنیٹر (ممبر کانسل) یا کسی فصیح کی ہو۔ (سسرو)

مطلب کی بات کہو اور جب مطلب ختم ہو جائے تو کلام ختم کرو۔ جو کچھ منہ سے کہو یا قلم سے لکھو وہ جامع اور مختصر ہو۔ بے مطلب عبارت سے کتاب بھر دینا کوئی تعریف کی بات نہیں ہے۔ (نیل)

جتنے ہی کم الفاظ ہوں گے اسی قدر دعا موثر ہوگی۔ (لوتھر)

الفاظ مثل پتیوں کے ہیں۔ اور مطلب مثل پھل کے، جب کسی درخت میں پتیاں زیادہ ہوں تو اس میں پھل کمزور ہوتے ہیں۔ (پوپ)

اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری تقریر پر موثر ہو تو اس کو مختصر کرو، کیونکہ الفاظ مثل شعاع آفتاب کے ہیں جتنی زیادہ و مجتمع ہوں گی اتنی ہی تیز ہونگی (ساؤدے)

جو کچھ لکھنا ہو اس کو جہاں تک ہو سکے مختصر کرو، ورنہ پڑھنے والا الفاظ چھوڑتا جائے گا اور جہاں تک ہو سکے سادہ الفاظ میں کہو، ورنہ وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکے گا۔ (رسکن)

جب کوئی اخلاقی سبق (یعنی وعظ) تم کو دینا ہو تو اس کو مختصر کرو۔ (ہاریس)

اتنا اختصار ناپسندیدہ ہے کہ مطلب خبط ہو جائے۔ (اڈورڈس)

اخفا

جن سے میں محبت کرتا ہوں اُن سے میں کوئی بات نہیں چھپاتا، جن کے واسطے میرا دل کھلا ہوا ہے ان کے لئے میرے ہونٹ بند نہیں ہو سکتے۔ (ڈکنس)

جو اپنی خوشیاں چھپا سکتا ہے اس سے بزرگ تر ہے، جو اپنے رنج چھپا سکتا ہے۔ (لیوییٹر)

کسی چالاکی کا چھپانا بڑی چالاکی ہے۔ (روکی فوکو)

اخوت

آدمی تنہا پیدا ہوتا ہے، مگر تنہا رہنے کے لئے نہیں۔ اس کو چاہیئے کہ ایک دوسرے کی مدد کرے۔ (میناندر)

اگر خدا تیرا باپ (پیدا کرنے والا) ہے تو انسان تیرا بھائی ہے۔ (لامارٹین)

ہم سب ایک ہی جسم کے اعضا ہیں۔ فطرتاً ایک دوسرے سے محبت کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اور ایک معاشرتی زندگی کے قابل ہیں۔ ہم کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے، کہ ہر شخص کی غرض آفرینش بنی نوع کی امداد ہے[1] (سنیکا)

اگر انسان امداد باہمی چھوڑ دے تو وہ صفحہ ہستی سے فنا ہو جائے، ہمارا وجود بغیر ایک دوسرے کی مدد کے ناممکن ہے پس نتیجہ یہ نکلا کہ حاجتمند کو حاجت روا سے مانگنے کا حق ہے۔ اور حاجت روا کو مدد سے انکار کرنا گناہ ہے۔ (والٹر سکاٹ)

تمام عالم ایک بڑا شہر ہے۔ جس میں ہمارے پیارے آباد ہیں۔ اور فطرت نے صحبت باہمی کا سبق ہم کو دیا ہے۔ (ریکٹیٹس)

انسان گو کیسا ہی ذلیل و خوار ہو پھر بھی آخر انسان ہے۔ (سنیکا)

ہمارے تمام مسائل مساوات و آزادی و انسانیت سب اس خیال کے نتیجہ ہیں کہ تمام انسان خدا کے بندے اور ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ (کاین گولیچ)

استواری (ثابت قدمی)

تمام فضائل کی تکمیل استواری ہے۔ (مزینی)

مقصد کی استواری کامیابی کا راز ہے۔ (ڈزرائیلی)

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے ؛ مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو (غالب)

کامل انسان تو مجھکو کہیں نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی ثابت قدم ہی مل جائے تو میں اس کے قدم آنکھوں سے لگاؤں۔ (کنفیوشس)

کبھی تغیروائے سے بھی استواری ثابت ہوتی ہے۔ (ہوگل)

بغیر استواری کے نہ دنیا میں محبت کوئی چیز ہے، نہ دوستی اور نہ نیکی۔ (ایڈیسن)

حق اور اصول کی استواری اہل دنیا کی زبان میں بعض وقت عقل کی کمزوری کہلاتی ہے۔ (ورڈزورتھ)

ملہ اے اللہ! اگر انسان ثابت قدم ہوتا تو کیسا کامل و مکمل ہوتا۔ (شیکسپیر)

اشتراکیت

کمیونزم کیا چیز ہے؟ وہ اس امر کی خواہش ہے کہ غیر مساوی محاصل مساوی طور پر تقسیم ہونا چاہئیں یعنی کوئی سست، کاہل، اپاہج اپنا پیسہ تو الگ رکھے اور تمہارا روپیہ اینٹھنا چاہے۔ (اینبے نزر ایلیٹ)۔

مساوات پسند یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کے لوگ ایک سطح پر آجائیں۔ مگر یہ نہیں چاہتے کہ جو ان سے نیچے ہیں وہ ان کے برابر پہنچ جائیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ کچھ لوگ ان سے نیچے ضرور رہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کچھ لوگ ان کے اوپر کیوں نہ رہیں۔ (جانسن)

اشتہا

عقل کو حاکم اور اشتہا کو محکوم ہونا چاہیئے۔ (سیسرو)

اچھی غذائیں اچھی زندگی کے منافی نہیں ہیں۔ (ارطیغوس)

بہتر ہے کہ تم اشتہا کو سزا دو۔ نہ اشتہا تم کو سزا دے (سکیپس)

جانور چرتے ہیں، آدمی کھاتا ہے، مگر صرف عاقل و ہوشیار آدمی کھانا جانتا ہے۔ (ساوارین)

دسترخوان کا خرچ اپنی آمدنی کے ربع سے کبھی نہ بڑھاؤ۔ غذا مقوی ہونا چاہیئے نہ کہ مکلف۔ ان میں صنعت سے زیادہ قدرت کو دخل ہو۔ انکی تیاری میں اسراف مطلق نہ ہو اگر تمہارے مہمان اچھے قسم کے لوگ ہیں تو تمہاری دعوت دعوت ورنہ تضیع زر ہے، دعوت یا اسراف نمائش ہے۔ (کوارلے)

دعوت میں بیجا التکلف اکثر جنازہ کے تکلف سے مشابہ ہوتا ہے۔ (ولیس)

اعتدال اور محنت انسان کے دو بہترین طبیب ہیں۔ محنت اشتہا کو بڑھاتی اور اعتدال اس کو زیادتی سے ہمیشہ روکتا ہے۔ (روسو)

ایک محکوم اشتہا ایک عظیم جزو آزادی ہے۔ (سنیکا)

اپنی خواہشات کو جتنا دباؤ گے اتنا ہی ان پر قابو رکھو گے۔ خواہش اور عقل مثل دو ڈولوں کے ہیں جنمیں سے ایک اگر اوپر رہتا ہے تو دوسرا ضرور نیچے ہوگا۔ (کالیر)

جس طرح دوائیں تولہ ماشہ کے حساب سے کھاتے ہو، اسی طرح تندرستی کے واسطے غذائیں بھی تول ناپ کر کھایا کرو۔ (اسکاٹ) (باقی آئندہ)

---

[1] مقابلہ کرو۔ بنی آدم اعضائے یک دیگرند ؛ کہ در آفرینش زیک جوہرند۔ اگر عضوے بدرد آورد روزگار ؛ دگر عضوہا را نماند قرار (شیخ سعدی)۔

عِلم کی تشنگی

دولت دنیا؟ نہیں، آسائشِ عقبیٰ؟ نہیں اتنی پستی. کم سے کم، میرے لئے زیبا نہیں
عرصۂ عشرت نہایت تنگ ہے میرے لئے خواہشِ دنیا و عقبیٰ ننگ ہے میرے لئے
نعمتِ حور و طہور و دولتِ تاج و سریر! ہو نہیں سکتے ہیں میرے ولولے اتنے حقیر
اس زمیں کو، اور خطابِ "نعمتِ بسیار" دوں؛ آسماں بھی سامنے آئے تو ٹھوکر مار دوں
اپنی چوکھٹ پر جھکاؤں صرف گردوں کی جبیں؛ اس تصور کو بھی میں برداشت کر سکتا نہیں
کیا؟ سرِ نقشِ قدم ہو، اور جبینِ آفتاب!! اس قدر ادنیٰ نہیں میری تمناؤں کے خواب
اڑ سکوں عرشِ بریں پر، اور سمندر پر چلوں؛ میں ہوں شاعر، اس قدر اوچھی تمنا کیوں کروں؛
"لے یہ دنیا کے خزانے ہیں، یہ نقد و جنس ویں"؛ اے خدا! شاعر سے یہ کہنا تجھے زیبا نہیں
مجھکو تو پیغمبری دے، اور نہ شاہنشاہ کر بن پڑے تو سرِّ موجودات سے آگاہ کر

اپنے اصلی خال و خد سے آشنا کر دے مجھے
"بندگی" اک جہلِ مطلق ہے "خدا" کر دے مجھے

(جوش)

مردِ مُضحک

(گذشتہ سے پیوستہ)

(جملہ حقوق محفوظ)

(از جناب اسرائیل احمد صاحب سکندرآباد دکن)

باب ا

فصل ا

ایک تیز و تند شمالی ہوا سارے براعظم یورپ پر چلی، اور جب یہ طوفان باد انگلستان پر سے گذرا تو شدید تر ہوگیا۔ یہ دسمبر ۱۶۸۹ء کا ماہ و سال تھا۔ طوفان ۱۶۹۰ء کی جنوری تک طوالت پذیر رہا۔ دریائے ٹیمس یخ پوش ہوگیا۔ جغرافیہ طبعی کا یہ ایسا نظارہ تھا جو پوری صدی میں شاید ایک ہی دفعہ دیکھنے میں آتا ہے، اس لئے کہ بحر اعظم کے مد و جزر کی پیہم ضربوں سے ٹیمس کی امواج کا انجماد ناممکن ہوتا ہے۔ برف کے براق تختے پر، جو دریا پر دور دور تک بچھ گیا تھا گاڑیاں اور سواریاں نقل و حرکت کرنے لگیں۔ لوگوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ اور ایک میلا سا جم گیا۔ یہ جنگل میں منگل تھا۔ "سردی" کی سرگرمی تھی۔ تفنن طبع کے مستانہ جوش میں لوگوں نے ایک بڑا بیل ذبح کیا، اور اسے سلم بھونا یہ عجیب و غریب مناظر پورے دو مہینے تک جاری رہے۔ سنہ ۱۶۹۰ء کی سردیوں کی شدت سترہویں صدی کی یادگار موسم سرما پر بھی سبقت لے گئی، ڈاکٹر گڈمین ڈیلین نے ان غیر معمولی موسمی انقلابات کے مشاہدات بڑے ذوق علمی اور وقتِ نظر کے ساتھ قلمبند کئے۔ اور ان کی ان نادر علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کے اعزاز پر شہر لندن کی پبلک نے ان کا ایک نیم جسم بت نصب کیا۔

ان ہی ایام میں ایک دن شام کے وقت ساحل پورٹ لینڈ کی ایک طوفانی خلیج میں کچھ خلاف معمول حوادث پیش آرہے تھے۔ بحری طیور اور آبی جانور سمندر کے شور و شر سے ڈر کر کنارے پر نکل آئے تھے۔ اور اپنے اصلی "عنصر" (مسکن آبی) میں واپس جانے سے خائف تھے۔

اسی خلیج میں بحر مواج کے طوفان و تلاطم سے بچنے کے لئے ایک میانہ قامت کا جہاز اس وقت پناہ گزیں ہے، جس موقع پر وہ لنگر انداز ہے، ایک مامون "گودی" ہے:

آفتاب سارے دن ابر و غبار میں روپوش رہا تھا۔ اور اب غروب بھی ہوگیا تھا۔ سارے عالم آب پر اک یاس و حسرت کا منظر طاری تھا۔ گویا افق عالم سے آفتاب جہاں تاب کی "رحلت" پر محفل قدرت نے صف ماتم بچھائی تھی۔ سمندر بھی اب قدرے سکون پر تھا۔ اور خلیج کے اندر بھی کوئی تموج نظر نہ آتا تھا۔

خوش قسمتی سے یہ سردیوں کا زمانہ تھا، اس لئے کہ ایسا حسن اتفاق شاذ و نادر ہی ہوا کرتا ہے۔ پورٹ لینڈ کے ساحل بحر کی ساری خلیجیں ریتیلے کنارے رکھتی ہیں، طوفانی موسم میں ان موقعوں سے صحیح و سلامت گذر جانے کے لئے بڑی چابکدستانہ کشتی رانی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ یہاں کے بندرگاہوں میں جہازوں کی حفاظت کی خاطر کوئی قدرتی لوازم نہیں ہیں۔ اور بالعموم ان میں داخلہ، اور ان سے خروج، پر خطر و مخدوش ہوا کرتے ہیں۔ مگر ان تمام معمولات و روایات کے خلاف آج یہ نواح بالکل پرسکون اور بے خطر ہے۔

پورٹ لینڈ کا جزیرہ نما، اگر شاعرانہ تصور کی عینک سے دیکھا جائے تو ایک پرندے کے سر کی سی ہیئت پیش کرتا ہے۔ جس کی چونچ سمندر کی طرف مڑی ہوئی ہے، اور سر کی پشت ویماؤتھ کی طرف مائل ہے۔ اس موقع پر جو خاکنائے پیدا ہوگئی ہے وہ سر اور سینہ کے مابین اس پرندے کی گردن کی شبیہ بن گئی ہے۔

پورٹ لینڈ کا سارا اقتصادی وجود اس تجارتی کاروبار سے وابستہ ہے، جو وہاں جاری ہے۔ اس خطّے کا گذشتہ صحرائی منظر موجودہ تمدنی رونق سے بہت کچھ

کچھ گم ہو گیا ہے۔ سواحل پورٹ لینڈ کا انکشاف سترھویں صدی کے وسط میں ملاحوں نے کیا تھا۔ اسی زمانہ سے پورٹ لینڈ کے پتھر سے وہ مصنوعی جنس بنائی جاتی ہے جس کو "رومن سیمنٹ" کہتے ہیں۔ یہ بڑی نفع بخش حرفت ہے۔ جس نے اس آبادی کے اہل حرفہ کو بڑا مرفہ حال بنا دیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی خلیج کے نظری منظر کے سارے حسن کو بھی مسخ کر دیا ہے۔ سمندر کی موجوں اور لہروں کی شکست و ریخت نے اس ساحل میں بہت کچھ رد و بدل کر ڈالا ہے اور اکثر موقعوں پر ریگ و گِل کٹ کٹ کر زیر سطح کی سنگستانی چٹانیں نکل آئی ہیں۔ قدیم ایام میں پورٹ لینڈ کا بندر جو بحری انجنیری سے بنایا گیا تھا بہت مشہور تھا۔ اس کے شکستہ آثار جا بجا اب بھی نظر آتے ہیں۔ اور مختلف موقعوں پر لنگرگاہ کی ساری ضروری تعمیرات کے باقیات دیکھے جا سکتے ہیں۔ قدیم گودی کے متعدد منارہائے جہازی کی شکستہ ہوئی یادگاروں کی نشان دہی بھی ممکن ہے۔

شام کا ہلکا حجاب اور بعد ازاں شب کی دبیز نقاب چہرۂ عالم پر پڑ گئی ہے مغرب کے وقت کی شفقی سرخی و زردی اور جھٹپٹے کی نیم سیاہی رفتہ رفتہ کامل تاریکی میں مبدل ہو گئی ہے۔ غور سے دیکھنے سے وہ کشتی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے گودی کے کنارے سے بندھی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگرچہ اب تمام مناظر پر کالی رات کے تہ بہ تہ پردے پڑتے چلے جاتے ہیں۔

کشتی پر اک تختہ رکھا جاتا ہے، اور اس کے ذریعہ ساحل سے اتصال قائم کیا جاتا ہے۔ تاکہ کشتی کے مسافر خشکی پر اتریں۔ ناگاہ سیاہ سیاہ پیکر ادھر ادھر تلملاتے نظر آئے۔ اور چند لوگوں نے کشتی کے عرشے کو چھوڑ کر زمین پہ قدم رکھا۔

خلیج کا درجۂ حرارت کھلے سمندر کی سردی سے زیادہ تھا۔ مقامی موسم کی نسبتاً اس خوشگوار اعتدال کے لئے ہمیں اس کوہستانی چٹان کا ممنون ہونا چاہیئے جو اک چھجے کی طرح اس جہازی پناہ گاہ پر چھائی ہوئی تھی۔ الغرض یہاں لوگ سردی کی شدت سے لرزندہ براندام نہ تھے۔ اگرچہ بندرگاہ سے باہر "صحن بحر" پر یہی کیفیت تھی۔

کشتی سے اترنے والے اپنے کام میں بہت سرگرم اور شتاب کار معلوم ہوتے ہیں۔ نیم تاریکی میں ان کے جسم ایسے نظر آتے ہیں۔ کہ گویا وہ کاٹھ کی پتلیاں ہیں، جن کو کسی مصنوعی اور مخفی "ریشہ دوانی" سے متحرک کر دیا گیا ہو۔ ان کے لباس کی ہیئت کذائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انگلستان کے اس طبقۂ آبادی سے تعلق رکھتے ہیں، جس کے افراد اپنے بدن پر کپڑوں کے بجائے چیتھڑے لگائے پھرتے ہیں۔ اس سنگستانی چٹان پر چڑھنے کا راستہ بڑا پیچ در پیچ تھا۔ اور اس قدر دشوار گذار کہ بجائے انسان کے پہاڑی بکریوں کی چال ہی اس کی حریف ہو سکتی تھی۔ یہ راستہ اک عمودی حالت میں اٹھتا ہوا اس تخت نما قطعۂ سطح پر جا کر ختم ہو جاتا تھا جس پر اہل کشتی ابھی تختہ رکھ کر اترے تھے، یہ راہ اپنی بالائی منازل میں اور بھی پیچ در پیچ ہو گئی تھی۔ قدم قدم پر اک مرحلہ تھا۔ اور گوشے گوشے میں اک عقدہ، تمام موقعے اک ورثت منظر رکھتے تھے۔ اور کوہستانی زینے کی آمد و رفت مسافروں کے لئے ایک سخت صبر آزما عمل تھا کشتی جن لوگوں کا انتظار کر رہی تھی وہ یقیناً ان ہی ناقابل گذر بھول بھلیاں سے ہو کر آخری سطح مرتفع سے اترے ہوں گے۔

کشتی میں سوار ہونے کی کارروائی بڑی محتاط اور رازدارانہ معلوم ہوتی تھی۔ سب دم بخود تھے۔ اور ایک ایک قدم پھونک پھونک کے رکھ رہے تھے ان کی تمام حرکات و سکنات سے یہ حقیقت عیاں تھی کہ انہیں کسی کا خوف ہے۔ ہجوا خلیج رنگسنیڈ کے ایک حصہ میں ماہی گیر کشتیوں کا اگرچہ ایک پورا بیڑا لنگرانداز تھا۔ لیکن ان کی طرف سے یہ لوگ مطلق خائف نہ معلوم ہوتے تھے، گویا ان کی موجودگی کو انہوں نے نظرانداز ہی کر دیا تھا۔

یہ شکاری بیڑا دراصل اہل ڈنمارک کا تھا جس کو سمندر کی اٹکھیلیوں نے اپنے ملک کے سواحل رینا روتے بہا کر انگریزی "پانیوں" میں لا ڈالا تھا۔ سمندر کی یہ خوش فعلیاں اکثر جاری رہتی ہیں۔ چنانچہ جو غیر ملکی کشتیاں اس وقت پورٹ لینڈ کے بندرگاہ میں پناہ گزیں ہیں وہ بحر اعظم کے موسم کی ان ہی مطلق العنانیوں کی "صید سپیدہ" ہیں۔

اس بیڑے کو لنگراندازی میں بڑی بڑی مشکلات پیش آئی تھیں۔ کشتیوں کا کماندار ایک پیش قدم کشتی کے اندر وزنی آہنی لنگر کو جھکانے اور گرانے کے کام میں دیر تک اس کے ساتھ دست و گریباں رہا تھا۔ اس نے لنگر کے ثقل کو بڑھانے کے لئے اس کے ساتھ وہ سارے کانٹے برچھے اور جال بھی شامل کر دیئے تھے، جو مختلف قسم کی مچھلیوں اور آبی جانوروں کے شکار میں استعمال ہوتے ہیں۔

سارے جہاز اور کشتیاں باستثنائے چند کے بندرگاہ کے ایک ہی گوشے میں جمع ہو گئے ہیں۔ خلیج کا بقیہ حصہ تقریباً اک "بالوخالی" بن گیا ہے بر و بحر کے دونوں افقوں پر جہاں تک نگاہ جاتی ہے سارا منظر ویران اور سنسان نظر آتا ہے۔ سطح بحر پر کوئی جہاز ہے۔ نہ روئے ارض پر کوئی مکان۔

ساحل کا یہ حصہ بیشتر غیر آباد ہے۔ خال خال مسافروں کا گذر بھی اب موقوف ہوگیا ہے۔ سال کے اس موسم میں یہ علاقہ پرخطر، اور راستے مخدوش ہوجاتے ہیں۔

سمندر میں نکلنے کے لئے اگرچہ یہ موقع بالکل غیر موزوں ہے، اور حالات گرد و پیش سفر کی قطعاً اجازت نہیں دیتے لیکن جو لوگ ابھی ابھی کوہستان کا پرشور اندرراستہ قطع کر کے آتے ہیں اور بندرگاہ کی ناتراشیدہ پلیٹ فارم پر آکر اس کشتی میں سوار ہونے ہیں وہ ہیچ "ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم" کی بیباک تفسیر زمانی پرشتہ معلوم ہوتے ہیں وہ علی الفور جلد محفوظ ساحل کو چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ اور طوفانی سمندر کے سینے پر سوار ہوجانا چاہتے ہیں۔

انہوں نے اپنی کشتی کا لنگر اٹھانے کی آخری تیاریاں کیں، آپس میں جمع ہوکر کچھ مشورہ کیا۔ وہ بہت ہیبت اور عجلت میں معلوم ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کے تشخص کا پتا لگانا مشکل ہے۔ اندھیرا ہوجانے کی وجہ سے یہ تمیز کرنا بھی دشوار ہے کہ ان کی جماعت میں کون جوان ہے اور کون بڈھا۔ رات کی پردہ پوشش تاریکی نے ان کے چہروں پر اک نقاب ڈال رہی ہے۔ تاہم اتنا معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ تعداد میں آٹھ ہیں۔ بدقت نظر دیکھنے سے یہ بھی منکشف ہوا کہ ان کے گروہ میں دو عورتیں بھی ہیں۔ جو مردوں سے بمشکل ہی متمائز دکھائی دیتی ہیں۔ اس لئے کہ ان کا کوئی جداگانہ نسوانی لباس نہیں ہے۔ پوشاک کی نوعیت کے لحاظ سے وہ "مردانہ پوشش" بھی نہیں کہی جاسکتیں، کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ سب چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ہیں۔ اور "چیتھڑوں" کو کس "صنف پوشش" کے تحت شمار کیا جائے۔

اس ٹولی میں ایک چھوٹے قد و قامت کا آدمی بھی ہے، جو ادھر ادھر چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ یہ غالباً یا تو کوئی بالشتیا ہے یا بچہ۔

لیکن انسانی نقل و حرکت کے قیافے کا ایک مبصر اس کی تشخیص ایک "بچے" ہی کی حیثیت سے کرے گا۔

فصل ۲

کوئی یہ جا کے مرے ساتھ والوں سے کہہ دے
یہ ناتواں ہے بس قافلہ رہا جاتا

حازم سفر جماعت میں ایک سارق معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک زرق برق صدری پہنے ہوئے ہے جس کے کناروں پر زریں سنجاب لگی ہوئی ہے، اس کے لبادے کے نیچے سے یہ چیز ایسی چمکتی نظر آتی ہے، جیسے کسی مچھلی کے زیر پشت اس کا سینہ! ایک دوسرے شخص نے اپنے چہرہ کے اوپر ایک ادنیٰ نقاب ڈال رکھی ہے جس میں منہ کی جگہ پر کوئی روزن بھی نہیں ہے، جس کی ضرورت پائپ پینے کے لئے ہوا کرتی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی تعلیم یافتہ آدمی ہے۔

بچہ اپنے خاک آلود چیتھڑوں کے نیچے ایک ملاح کا بحری جیکٹ پہنے ہوئے ہے جس میں وہ ننھا سا آدمی بالکل چھپ سا گیا ہے۔ جیکٹ کے دامن چوغہ کی طرح اس کے گھٹنوں سے بھی نیچے لٹکے ہوئے ہیں۔

بچے کے قد و قامت سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کا سن تخمینتہً دس گیارہ برس کا ہوگا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں بالکل ننگے ہیں، گھر کے آغوش نما صحن تو ان پاؤں سے چلنا پھرنا آسان ہے، لیکن اس سنگدل کوہستان پر پیدل کیا معنی رکھتی ہے۔؟

کشتی کا عملہ ایک کپتان اور دو ملاحوں پر مشتمل ہے۔

کشتی اپنی ساخت کے اعتبار سے ہسپانوی معلوم ہوتی ہے۔ ہسپانیہ سے آئی ہوئی ہے۔ اور اب اس سفر مراجعت میں اس کی منزل مقصود شاید یہی ملک ہے۔ وہ یقیناً کسی مخفی اور مجرمانہ کام میں مشغول ہے۔ جس کے سد ساحل بساحل سیر و گردش کر رہی ہے کشتی کے مسافر آپس میں مصروف سرگو[شی]

ان کی یہ رازدارانہ گفتگو ایک قسم کی لسان "ریختیہ" میں معلوم ہو[تی] جو ہسپانی، فرانسیسی، جرمن وغیرہ زبانوں کے الفاظ سے مخلوط تھی بعض اوقات دو ایک قدیم اور متروک زبانوں کے لغات بھی ان کی زبان پر آجاتے تھے۔ یہ گروہ گوناگوں قومیتوں سے مرکب تھا۔ لیکن اتحاد مقصد اور ایک ہی کام [illegible] عمل کی بنا پر ان پر ایک "واحد جماعت" کا اطلاق کیا جاسکتا تھا۔

اگر روشنی ذرا زیادہ ہوتی۔ اور ان لوگوں کے ملبوسات و زیورات [illegible] جزئیات کا دیکھنا ممکن ہوتا تو ان کے گلوں میں خاص قسم کی تسبیحیں بھی [illegible] آتیں، جو ان کے تار تار اور پارہ پارہ کپڑوں میں کہیں چھپی ہوئی ... [illegible] دکھائی دیتی تھیں۔ ایک عورت کی گردن میں، جو اپنی شباہت و ہیئت [illegible] "بیتم عورت" معلوم ہوتی تھی، اک ایسی بڑی تسبیح ہزار دانہ بھی جو سنہ [illegible] کے لوازم زہد میں دیکھنے میں آتی ہے۔ بعض گلوں میں ایسے مالے بھی تھے [illegible] وغیر ممالک کے مخصوص مذہبی مرکزوں کا تبرک معلوم ہوتے تھے۔

اگر تاریکی نے منظر کو ناقابل معائنہ نہ بنا دیا ہوتا تو دیکھنے والوں کو کشتی کے بیرونی رخ پر حضرت مریم" اور "فئے" سولو دسعود" کی تصویریں بھی نظر آتیں۔ یہ مرقع جس جگہ منقوش تھا، اسی کے قریب ایک لالٹین بھی نصب تھی۔ جو اس وقت روشن نہ تھی۔ وجہ ظاہر تھی یعنی اس نازک موقع پر انتہائی احتیاط و اخفا کی ضرورت۔ لیکن بعض اوقات میں یہ لالٹین جلائی جاتی تھی۔ تو دو اغراض سے "ابن اللہ" اور دو شبیہ مقدسہ کی شبیہ پر روشنی ڈالی جائے۔ یا یہ کہ گرد و پیش کی "بحری سرزمین" پر کشتی کی گذرگاہ اجالے میں آجائے۔ ظاہر لالٹین کے یہی دو گونہ فرائض تھے۔

کشتی کا اگلا حصہ، جو پانی کو کاٹنے کا کام کرتا ہے بالائی شکل کا تھا، جس پر ایک فرشتے کی تصویر اس وضع سے بنی ہوئی تھی کہ وہ "پاک کنواری" کے قدموں میں اپنی ملکوتی باز و سمیٹے دوزانو بیٹھا ہے۔ فرشتے کی آنکھوں پر ایک دوربین نما تشمہ سا تھا جس کے تمن در "حجاب" اس کی مودب آنکھیں اس مقدس ماحول کا نظارہ کر رہی تھیں۔ ان سب محترم ہستیوں اور متبرک مناظر کے مرقعے زریں آب و رنگ سے بنائے گئے تھے۔

حضرت مریم کی تصویر کے نیچے طلائی حروف میں لکھا ہوا کشتی کا نام تھا "سیٹیوٹنا"۔

اولین فرصت میں ساحل کو چھوڑ دینے اور کشتی کا لنگر اٹھا دینے کے خط آت خلفشار میں اس جماعت نے اپنا بہت سا سامان بھی خشکی پر چھوڑ دیا۔ جو خوراک اور مختلف اسباب معیشت پر مشتمل تھا۔ اجناس غذا میں مچھلیاں اور دوسرے آبی جانور تھے۔ اثاث البیت میں منجملہ دیگر چیزوں کے بحری سفر میں کام آنے والی جہازی مشعلیں اور سگنل کے آلات تھے۔ سارق اور قزاق بات کی بات میں بدرحتا مال و منال کا مالک بن جایا کرتا ہے۔ لیکن جس دائمی خوف و خطر میں اس کی زندگی بسر ہوا کرتی ہے، اور جو اس کے مجرمانہ پیشہ کا ناگزیر لازمہ ہے، وہ بعض اوقات اس تمام مال و متاع پر اس کے قبضہ و تصرف کو "حقوق ساقطۃ الملکیت" میں تبدیل کر دیا کرتا ہے۔

تاہم راکبان کشتی نے کوئی ایسی چیز ترک کر دینے کی فروگذاشت نہ کی، جو ان کے کردہ کاروبار کے مصرف میں آنے والے ضروری اسباب و آلات سے ہو، خانہ بدوش زندگی میں اور خانہ برانداز قزاقانہ پیشے میں، بالخصوص جبکہ کسی ناگہانی گرفتاری سے بچنے کے لئے عاجلانہ نقل مکانی کی ضرورت پیش آجائے۔ چیزیں کبھی کبھی ... [illegible] وہ بار بن جایا کرتی ہیں۔ لیکن پھر ان ... [illegible] بھی نہیں۔

الغرض ان مفرورین کی سرگرمی اور مستعدی قابل دید تھی کسی نے کوئی گٹھڑی اٹھائی تو کسی نے کوئی پیٹی۔ ساحل سے کنارۂ کشتی تک، اور کشتی سے لب ساحل تک، ان کی پیہم آمد و رفت کا ایک تانتا سا بندھا ہوا تھا۔ سب زن و مرد اور خورد و کلاں یکساں مصروف کار تھے، چنانچہ بچہ بھی پوری بلند آہنگی سے حمالی کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ اور بعض دفعہ اپنی بساط سے زیادہ بوجھ اٹھانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

یہ امر مشتبہ تھا کہ آیا بچے کے والدین اس جماعت میں ہیں یا نہیں، لیکن بظاہر وہ کشتی کی بستی میں "یتیم و یسیر" ہی معلوم ہوتا تھا، وہ خاندان کا کوئی بچہ نظر نہ آتا تھا۔ بجائے اس کے، وہ قبیلے کا "غلام" دکھائی دیتا تھا۔ اس لئے کہ ہر شخص کی ... خدمت کی "بیگار" اسے بجا لانی پڑتی تھی۔ اور کوئی شخص اولاد یا عزیز کی طرح اسے منہ نہ لگاتا تھا۔

تاہم بچہ اس پُراسرار مجمع کا بالکل جزو لاینفک بنا ہوا ہے۔ وہ دوسروں ہی کی طرح دوڑ دوڑ کر چیزیں بھی اٹھا رہا ہے۔ اور جلد جلد یہاں سے چل دینے کے لئے بھی ساری جماعت کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ لیکن یقیناً یہ معلوم نہیں جاتا کہ کیوں؟ اس کے اتحاد عمل کی ماہیت بڑوں کی نقالی سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ اضطراری طور پر خود بخود حرکت میں ہے، محض اس وجہ سے کہ دوسرے بھی اس کو متحرک نظر آتے ہیں۔

آخر کار سب تیاریاں مکمل ہو گئیں، اسباب کا ایک ایک عدد کشتی میں پہنچ چکا ہے، اور آخری صندوق بھی تختے کے عارضی پل پر سے منتقل ہو کر کشتی میں جا ہو چکا ہے۔ اب صرف آدمیوں کا سوار ہونا باقی ہے۔ جماعت کی دو عورتیں بھی کشتی کے عرشہ پر نمودار ہوئی ہیں۔ خشکی کے اوپر اب صرف چھ مرد رہ گئے ہیں۔ جن میں وہ بچہ بھی ہے۔

بالآخر کشتی نے روانگی کے لئے پہلی جنبش کی، ناخدا اپنی مخصوص نشست پر آگیا، ایک ملاح نے اس رسّے کو کاٹ دیا، جس سے کشتی کنارے کے ساتھ لنگرگاہ میں بندھی ہوئی تھی۔ یہ علامت عجلت اور خطرے کی تھی، اس لئے کہ طبعی حالات میں ... [illegible] نہیں جاتا۔ کھولا جاتا ہے۔

"ہوشیار، خبردار!" کپتان کے ... [illegible]

تختے پر سے دوڑ کر ... [illegible] پہلے کشتی میں جا پہنچ ... [illegible] ... بچہ پانی میں ... [illegible] ... ہوتا ... [illegible] ... کہیں کر دیا تھا بلکہ ... [illegible] ... حیثیت اور اس ناکردہ گناہ "ماندۂ درگاہ"

میں ہم خشکی پر پلٹ آیا تھا۔ سب کے آخر میں ساحل کو چھوڑا، درمیانی تختے کا وسیلا اختیار کرنے کے بجائے وہ براہِ راست اک جست لگا کر کشتی میں جا گرا، اور پھر مغالات مار کر تختے کو ہٹا دیا۔ جو پانی میں جا پڑا، تیشوں کی پیہم دو تین ضربوں سے بقیہ رسیاں بھی کاٹ دی گئیں، جو کشتی کو گودی سے ہم رشتہ کئے ہوئے تھیں، مستول استادہ کر دیا گیا، بادبان کھول دیا گیا، اور کشتی پانی کو کاٹنے لگی، اس کشمکش و چپقلش میں بچہ اور تنہا پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ جو اس وقت حیران و مبہوت کنارے پر کھڑا ہوا ہے۔

یعنی چہ؟ . . . .

فصل ۳

بچہ ساکت و صامت کنارے پر کھڑا رہ گیا۔

وہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ لیکن اپنے ساتھیوں کو پکارتا ہے، نہ ان سے کچھ فریاد کرتا ہے۔

اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

یہ بات توقع کے بالکل خلاف معلوم ہوتی تھی۔

یہی سکوتِ مطلق اور اندازِ بے اعتنائی کا عکس کشتی میں بھی نظر آتا ہے۔

جس طرح بچے کی طرف سے کشتی والوں کو کوئی "صدائے مدد" نہ دی گئی، اسی طرح انہوں نے بھی اس کو "خوش آمدی" نہ کہا۔ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ کی یکساں قرأت طرفین نے زبانِ حال سے کی۔

بچہ روانہ ہو جانے والی کشتی کو دیکھ رہا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساحل کی سنگین چٹان پر خود اس کے قدم گڑ کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ اس کی جائے قیام کو اب سمندر کے مد نے چھینٹے دینا شروع کر دیئے ہیں۔ بالآخر معلوم ہوا کہ اسے اپنے گرد و پیش کی صورتِ حال کا شعور ہوا۔ لیکن آپ کو خبر ہے کہ اس کا خیال کس چیز کی طرف منتقل ہوا ہے!

رات کی تاریکی کی طرف۔

کشتی خلیج کی گردن نما تنگنائے میں داخل ہو رہی ہے، دو طرفہ ساحل دو بلند دیواروں کی شکل اختیار کرتا نظر آ رہا ہے۔ جن کے درمیان آبنائے نے اک گلی کی سی صورت پیدا کر لی ہے۔ "آبی راہرو" (کشتی) اسی "بحری کوچے" میں گھس گیا۔ اس وقت اس کا صرف بلند "خرطوم" (مستول) نظر آ رہا ہے۔ آخر کار یہ پیچیدہ راستہ ختم ہو گیا کشتی وسیع بحرِ محیط میں جا پہنچی۔ اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

بچے نے کشتی کی روپوشی کو دیکھا۔ وہ غمگین اور سہمگین ضرور تھا، لیکن کسی خاص خیال میں غرق بھی معلوم ہوتا تھا۔ وہ کم و بیش اک نیم خوابی حالت میں تھا اس کے احساسِ وحشت کو شب دیجور کی ظلمت نے شدید تر بنا دیا ہے۔ زندگی کی تصویر کا تاریک ترین رخ اس کے پیش پا افتادہ ہے۔ اور عملی حقائق کے سنگین ترین خط و خال اک مشاہدہ، کیا اس نے اپنی قوتِ فیصلہ سے کام لینا شروع کر دیا؟ کیا ایک ملہم بالغیب کی طرح اس کے دل و دماغ پر بعثت طبق روشن ہو رہے ہیں؟ جب کسی کمسن بچے پر زندگی کے مصائب کا دور اس طرح قبل از وقت شروع ہو جاتا ہے تو اس کے معصوم قلب کی گہرائیوں میں خدائے حیّ و قیوم کی شان بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ کو تولنے کے ایک خطرناک قسم کی میزانِ عدل کھڑی ہو جاتی ہے۔

لیکن اسی لمحے پر اپنی ہی معصومیت کی مجسم صورت بچے کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ اور اس کی روح ایک نیاز آگین گداز لطافت میں ڈوب جاتی ہے وہ بالکل رضا بالقضا ہو جاتا ہے۔ بچوں کی فطرت کی ازلی جمالیت جلالِ الٰہی سے آشنا ہونا نہیں چاہتی۔

جس سنگدلی سے شقی القلب انسانوں کی اس جماعت نے اس بچے کا مقاطعہ کیا تھا اس پر اس ننھی سی بے نیاز مخلوق نے ایک آہ سرد بھی نہ بھری صرف اس کے مزاج میں اک گونہ "صلابت" پیدا ہو گئی، فطرت کی جو ناگہانی افتاد دنیا کے اس "نو وارد" کو ایسے وقت میں فنا کر دینا چاہتی تھی، جبکہ بمشکل اس کے وجود کا آغاز بھی ہوا تھا، اس کے سامنے ذلت سے اس نے سرِ تسلیم خم نہ کیا، اک برقِ خاطف اس پر ٹوٹ پڑی تھی، لیکن وہ اک سنگین چٹان کی طرح کھڑا رہا تھا۔

وہ عالمِ خیال میں ایسا گم تھا کہ اس "عالمِ آب و گل" کی سردی کا بھی اس نے احساس نہ کیا، آخر سمندر کی موج نے اس کے پاؤں کو تر کیا۔ کیونکہ بحری مد کی ساعت آ گئی تھی۔

بادِ شمال کا ایک تیز جھونکا اس کے بالوں میں سے گذرتا ہوا نکل گیا اس کے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی، اک بیداری کی پھریری سر سے پاؤں تک اس کے جسم پر چھا گئی۔

اس نے اپنے گرداگرد نگاہ ڈالی۔ اس نے پہلی دفعہ بصحتِ حواس و ثباتِ ہوش دیکھا کہ وہ تن تنہا ہے۔

اب تک سوائے ان آدمیوں کے، انسانوں کی کسی اور جماعت یا بنی آدم کی کسی دوسری نوع سے اس بچے کو سابقہ نہ پڑا تھا۔ لیکن خود اس اختلاط و ارتباط کی "باہمگی و یکجہتی" بھی سمجھنے کے قابل ہے۔ یعنی وہ اپنے گروہ کے کسی فرد سے بھی واقف نہ تھا۔

اس کا پورا بچپن ان میں گذر رہا تھا لیکن ایک لحظہ کے لئے بھی کبھی وہ ان کی آغوشِ محبت سے مانوس نہ ہوا تھا، وہ اپنی ذات کو اس مجہول الحال جرگے کا طبعی جز سمجھنے کے لئے اپنے سینے میں کوئی انشراح نہ پاتا تھا۔ وہ صرف ان کے "حلقۂ محفل" میں۔ بار تھا، ان کی "کنار و دل" میں نہیں۔

اور اب ان لوگوں نے یہ برائے نام تعلق جسمانی بھی اس سے منقطع کر لیا تھا ایک سرد مہرانہ "پہلو نشینی" ایک عاجلانہ دامن کشی سے بدل گئی تھی۔

بچے کی کس مپرسی اور بے سر و سامانی کا کیا عالم ہے۔ اس کے پاؤں تپ جوتیاں نہیں۔ جس قسم کے چیتھڑوں میں بدن لپٹا ہوا ہے ان پر مشکل سے لباس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس کی خورجی میں روٹی کا ٹکڑا ہے، نہ اس کی جیب میں تانبے کا پیسہ۔

سردیوں کا موسم ہے اور رات کا وقت، ورنہ اس کے کہ کوئی انسانی آبادی ملے اسے میلوں تک پیدل چلنے کی ضرورت ہے۔

اسے یہ بھی خبر نہیں کہ وہ کس سرزمین پر کھڑا ہے، اور یہ کون سا مقام و نواح ہے۔

وہ اپنے رفیقوں کا حال اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ انہوں نے یہ "رفاقت" بھی اب اس کے ساتھ ترک کر دی ہے۔

وہ اپنے کو ملکِ حیات سے خارج البلد تصور کر رہا ہے۔

وہ محسوس کر رہا ہے کہ نسلِ آدم نے اس سے غداری کی ہے۔

اس کی روح کا یہ غیر مسموع شور و شیون بجا ہے۔ آہ کہ وہ صرف دن کی ایک جان ہے۔

وہ اک لق و دق ویرانے میں کھڑا ہے، اور اک عالمِ ہو میں استادہ۔

وہ بحرِ ظلمات کے طوفانوں کے دو پاٹوں کے درمیان آ گیا ہے، ایک طرف سے کالی رات، دوسری طرف سے بھیانک سمندر۔

بچے نے فضا میں اپنی باہیں تانیں، اور ایک جماہی لی، بیکسی اور بے بسی کی دو طفلانہ ادائیں۔

ناگہاں عزم و ہمت کے آثار اس پر نمایاں ہوئے۔ اس نے ساحل کی طرف پشت کی اور خشکی کی طرف لپکا۔

وہ چٹانوں، پہاڑیوں پر سے رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی منزلِ مقصود اس نے اپنے دل میں طے کر لی ہے۔

لیکن سچ بات کہ اس کی ساری روداد و نقش بر آب ہے، وہ کسی جگہ کا بھی عازم نہیں اس کی ساری دست افشانی اور پاکوبی اک حرکت مذبوحی ہے، وہ بیرحم تقدیر کے "مقدمۃ الجیش" کے سامنے ایک "بے پناہ مفرور" ہے، جسے اپنی سمتِ فرار بھی معلوم نہیں۔

بلندیوں، اور پہاڑیوں پر چڑھنے کے آدمی اور جانور کے دو الگ الگ انداز ہیں مگر یہ مصیبت زدہ نوگرفتار، دشوار گذار کوہستانی منازل و مراحل کو طے کرنے میں انسانی و حیوانی ہر دو طریق سے کام لے رہا ہے۔ پگڈنڈی پر شاذ و نادر ہی کسی جگہ برف تھی۔ لیکن زمہریری سردی نے راہ کے سنگریزوں کو بھی یخ جامد کے اولے بنا دیا تھا۔ جو کمسن و برہنہ پا مسافر کے تلووں کی جلد کو پارہ پارہ کئے ڈالتے تھے۔ اس کا کوٹ جو اسے اترن کے طور پر ملا تھا، اور جو اس کے قامت سے کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا اس کی رفتار میں مزید دقتیں پیدا کر رہا تھا کبھی کبھی دامن کا کونہ تو دہ یا سل راہ میں حائل ہو جاتی تھی۔ ان موقعوں پر ناآزمودہ کار مسافر پھنس جاتا تھا، پھر جس جگہ جا کر ٹھہرتا وہیں سے چپٹے چپٹے کسی گارے یا کسی جھاڑی کی ٹہنی کو پکڑ لیتا اور اوپر کی طرف اچک جاتا۔ ایک مقام پر سلیٹ پتھر کا ایک تختہ آیا، اور جوں ہی اس پر بچے کا قدم پڑا پتھر نے جواب دے دیا اس قسم کا پتھر بعض اوقات "ریگِ رواں" ثابت ہوا کرتا ہے۔ اور ناواقفکار چلنے والوں کو لغزش پیش آتی ہے۔ چنانچہ بچہ بھی بے اختیار پھسلا، اور تھوڑی دور تک اسی طرح لڑھکتا چلا گیا۔ جس طرح کسی چھت پر سے کھپریل کا کوئی ٹکڑا سرکا ہو۔ بالآخر سوکھی گھاس کا ایک بوٹا ملا جس پر اس نے بروقت پنجہ مارا اور خوش قسمتی سے وہ اس کی گرفت میں آ گیا۔ اس طرح اس چھوٹے سے حادثے کا انجام بخیر ہوا۔ گداز انسانیت سے عاری چٹانوں اور قلب انسانیت سے خالی غاروں کی ان "سرزنشوں" کو اس نے ویسے ہی صبر و شکر سے برداشت کیا جس کا ثبوت اس نے اپنے ان "انسانیت تاب" محسنوں کے معاملہ میں دیا تھا۔

پھر اس نے پھر کر ہمت چست کی، اور اک مختصر وقفے کے بعد اپنے بالائی سفر کو از سرِ نو طے کرنا شروع کیا۔ لیکن اس ناقابلِ گذر سنگستان کے "پل صراط" کو قطع کرنا زمین کی طنابیں کھینچنا تھا۔ قلۂ کوہ بالکل عمودی ہیئت میں بلند ہوتا چلا گیا تھا۔ اور پھر اس کا کوئی اور چھور معلوم نہ ہوتا تھا۔ بچہ برابر چڑھتا چلا جاتا تھا۔ لیکن راہ میں کوئی اختصار ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ گویا پہاڑ بھی اس کی چڑھائی کے ساتھ ساتھ اونچا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پہاڑ نے بچہ کی منزلِ مقصود ہی کو ناپید و بے نشان نہیں کر دیا تھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی سر بفلک چوٹی خدا کی بہشت اور اس ناکردہ گناہ "راندۂ درگاہ"

کے درمیان ایک برزخ بن گئی ہے۔

آخر بہزار خرابی وہ چوٹی پر جا پہنچا۔ اور خدا خدا کر کے نامتناہی سفر سقر "ختم ہوا" اس وقت بچہ بالائے کوہ کی سطح سطح پر کھڑا ہے۔ اس کے پیچھے سمندر ہے، سامنے اک وحشت زار اور اوپر خلائے آسمانی۔

بچے کے سامنے اب خشکی کا منظر ہے۔ جو حدِ نظر تک پہنائی اختیار کرتا چلا گیا ہے۔ زمین گویا ایک عریض و طویل تختہ ہے، جس پر برف کی شفاف چادر پھیلتی ہوئی چلی گئی ہے اور جو دور جا کر نیلگوں افقِ آسمانی کی سنجاب سے ہمکنار ہو گئی ہے۔ اس خطۂ ارض پر ساری سڑکیں اور راہیں معدوم ہیں، دور، دور کہیں کسی گوالے کی جھونپڑی تک نظر نہیں آتی۔ کسی کسی جگہ خشک شدہ گھاسیں اور جھاڑیوں کی چوٹیاں برفانی ہواؤں کانپتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ دراصل یہ کوئی نباتاتی روئیدگی نہیں۔ بلکہ نوافتہ وہ برف کے گالے ہیں جنہیں ہوا اڑا اڑا کر یہ مغالطہ آمیز نظارہ پیش کر رہی ہے۔ زمین کی صورت یخ جامد کے اس دبیز گدیلے کے نیچے گم ہے۔ اک سکوتِ مطلق طاری ہے۔ جو ذاتِ سرمدی کی طرح ہر شے پر حاوی و مستولی ہے۔ اور جس نے ساری کائنات پر اک منظرِ ممات کا "کفن" ڈال رکھا ہے۔

بچے نے پھر سمندر کی طرف رخ کیا۔

بحرِ زخار کی ناقابلِ پیمائش وسیع دامانیاں سامنے تھیں۔ ہاں "سینیوٹنا" بھی دکھائی دی۔ جو اپنی بجھی ہوئی لالٹین کے ساتھ بحرِ ظلمات کے سینے پر رواں تھی۔ اس کی قامت اب لحظہ بہ لحظہ کم ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ سطحِ بحر پر فاصلے کے سواد میں اک کشتی، اک برف کے تودے کی مثال جس طرح "تحلیل" ہوتی نظر آیا کرتی ہے، وہ بھی ایک دیدنی تماشا ہوا کرتا ہے۔

یکبارگی سینیوٹنا کی لالٹین روشن ہوئی۔ اور اس روشنی میں دیکھا گیا کہ اہلِ کشتی کچھ بے چین سے نظر آتے ہیں۔ اب ناپیدا کنار بحرِ اعظم میں یہ نورانی نقطہ فلکِ آسمانی کے کسی تارے کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔ عالمِ تخیل کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ گویا سمندر میں واقع ہو جانے والی کسی میت کا "تابوت" ہے، جس پر ایک "چراغِ مزار" جل رہا ہے۔

سمندر کے اندر طوفان کے آثار نظر آئے، بچہ اس "بحری انقلاب" کی آمد آمد سے قطعاً غیر متاثر رہا لیکن نہنگ آہنگ جہازراں کے لئے بھی یہ کانپ اٹھنے کا مقام تھا۔ یہ وہ ساعتِ قیامت تھی جس کو بے جان عناصر "زندہ وجود" بنتے معلوم ہوتے ہیں ساری فضا اک "ذی شعور ارادے" کی حامل بن جاتی ہے، ایک ایک لہر اک اژدر کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ ہوا کے تھپیڑے طمانچہ ہائے ید اللہ کی ضربت حاصل کر لیتے ہیں۔ کرۂ بادی کی شورش "نفخِ صور" کی ہمنوائی کرنے لگتی ہے۔ اور بحرِ مہیب کی سطح متلاطم ہو کر محشر کا منظر پیدا کر دیتی ہے

فطرت کا "نفسِ خوابیدہ" اک رستخیز نما بیداری کی انگڑائی لیتا ہے۔ اور انسان ضعیف البنیان کی جانِ ناتواں، کائنات کی پر جبروت و جلال "روحِ اعظم" سے اپنے کو دوچار پاتی ہے۔

طوفان سمندر میں اک طوفانِ بے تمیزی پیدا کر رہا ہے، سطحِ آب جو چند لمحے قبل بالکل ساکن و ساکت تھی، اب فطرت کے اس ہولناک "ڈرامے" کے کھیلے جانے کے لئے اک "اسٹیج" بنا چاہتی ہے۔ جسے "طبیعات" کی زبان میں "طوفانِ برف و باد" کہتے ہیں۔

سمندر میں اک قیامت برپا ہے جہازوں اور کشتیوں نے خشکی کا رخ کر دیا ہے اور قریب ترین ساحل کی کسی نزدیک ترین گودی کی طرف گریزاں گریزاں آ رہی ہیں۔ بحری پناہ گاہوں کی سمت میں اک "دوڑ" سی جاری ہے، گھٹا ٹوپ بادلوں کے دل کے دل چھا رہے ہیں جنہوں نے رات پر اک اور رات پیدا کر دی ہے۔ "ظلماتٌ بعضها فوق بعض" کا نقشہ ہے۔

فی الواقع سمندر میں نکلنے کا یہ کوئی موقع و محل نہ تھا لیکن جرائم پیشہ لوگوں کی اس کشتی کے راکبوں نے خدا معلوم کون سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا تھا کہ پشتِ زمین گویا ان کا بوجھ اٹھانے کی تاب نہ لا سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے خوفناک سمندر کو اپنا "دارالامان" قرار دیا تھا اور اپنے کو اسی کی آغوش کے حوالے کر دیا تھا۔

اس اثنا میں متلاطم کرۂ ہوائی میں اک مواج دھارا آیا جس کا رخ خشکی سے عین برعکس سمت میں واقع ہوا تھا "سینیوٹنا" نے اپنے کو لنگر و بادبان ہر دو سے آزاد کر لیا اور مصداق

کشتی خدا پہ چھوڑ دوں، لنگر کو توڑ دوں

اسی تند جھکڑ کی رو میں اپنے تئیں ڈال دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتی ہے اور بیش از بیش ساحل سے دور ہو جانا چاہتی ہے۔ اہلِ کشتی کی نیت و غایت کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ خلافِ توقع نہ تھی اس لئے کہ درحقیقت یہ کوئی "سفر" نہ تھا۔ بلکہ اک "فرار" تھا مسافروں کے سامنے کوئی "منزلِ مراد" نہ تھی، انکے پیچھے اک "نامراد تعاقب" تھا، "سمندر" میں اتنا خطرہ مضمر نہ تھا جتنا کہ "خشکی" میں، "آب و ہوا" کی دارو گیر سے اس قدر بھاگنے کی ضرورت نہ تھی جس قدر کہ "اشرف المخلوقات" کہے جانے والے انسان کی گرفت سے۔

الغرض کشتی لحظہ بہ لحظہ دور تر اور کوتاہ تر ہوتی چلی گئی۔ اور بالآخر "عمقِ افق" میں غرق ہو گئی۔ جو ستارہ نما روشنی اس میں ٹمٹماتی دکھائی دے رہی تھی وہ بتدریج زرد ہوتی گئی۔ اور ایک وقت جا کر تاریکی سے واصل ہو گئی، کشتی بھی درجہ بدرجہ رات کی سیاہی میں جذب ہوتی گئی۔ اور آخر کار اسی میں معدوم ہو گئی۔

بچے نے بھی مایوسِ نظارہ ہو کر اپنی آنکھیں سمندر کی طرف سے پھیر لیں

اور برف پوش میدانوں کا پھر سامنا کرنا شروع کیا۔ لق و دق ویرانے کا ایک ہوش ربا منظر تھا۔ ننھے قطرہائے نمدارت وچپ بالا و پست تمام ممکن اطراف و اکناف میں نظریں دوڑائیں۔ جہاں خیال تھا کہ کوئی آدم زاد یا کوئی انسانی آثار نظر پڑ جائیں لیکن سب بے سود، نگاہیں تھک تھک کر واپس آگئیں۔

اسی تغیر ناپذیر مطلع، اور اسی مجہول الحال سرزمین میں یہ خورسال رہ نوردہ چل کھڑا ہوتا ہے۔

(خبر نہیں ہے، کہ مر جاؤں گا۔ چلا ہوں کہاں؟ مثال ریگ پریدہ ہوں، پرا اڑا جاتا)۔

(باقی آئندہ)

دکھیا ماں

(گوردھن داس بھوانی)

تجھے کس نے ستایا ہے ماں؟ تیرے بال بکھرے ہوئے ہیں! تیری آنکھوں میں آنسو ہیں، تو رو رہی ہے! ماں پیاری ماں! تجھے کس نے ستایا ہے؟

تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔ وہ تیرے دشمنوں کو نیست و نابود کر دیں گے، ماں تو غم نہ کر، تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔

ماں وہ کمزور نہیں ہیں۔ ان میں ہمت ہے۔ حوصلہ ہے۔ دل ہے، دماغ ہے۔ سب ہے ماں، سب کچھ ہے۔ ماں تو فکر نہ کر، غم نہ کر۔

وہ دن گئے ماں، جب وہ بچے تھے، جب وہ نادان تھے۔ لیکن ماں اب وہ تیری عزت کو۔ تیری آبرو کو سمجھتے ہیں۔ ان میں عقل آگئی ہے۔

وہ کریں گے ماں سب کچھ کریں گے۔ وہ تیرے دشمنوں کو پچھاڑ دیں گے۔ ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھیں گے۔ ہاں ماں۔ تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔

جب وہ سب مل کر تیرے گرد جمع ہونگے تو تو پرسن ہو جائے گی۔ تو مسکرا دے گی، تیری خوشی کا ٹھکانا نہ رہے گا۔ اور۔۔۔ اور جب وہ سب مل کر تیری جے کے نعرے لگائیں گے، تو تیرے دشمن دہل جائیں گے۔ کانپ اٹھیں گے۔

جب وہ حسن و عشق، وھرم ادھرم، مذہب و ملت کے جھگڑے چھوڑ کر میدان میں آئینگے، اور دشمنوں کو للکاریں گے، تو دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

وہ تجھے خاک سے اٹھا کر تخت پر بٹھائیں گے، تیرے سر پر تاج رکھیں گے، تیری پوجا کریں گے، تو ان دنوں کو بھول جائے گی ماں۔۔۔۔ یقیناً بھول جائے گی۔

ہاں ماں تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔

ہندوستانی پردہ

(از جوش ملیح آبادی)

مسلمانو! خدا لگتی کہنا، کیا تم اپنے کو اپنے خدا اور اپنے رسول دونوں سے زیادہ غیرت مند نہیں سمجھتے؟ ایک دم سے بھڑک نہ اُٹھو، بے سمجھے بوجھے مشتعل نہ ہو، دوسروں کی باتیں صبر کے ساتھ سننے کی عادت ڈالو، یقین مانو، ہر وہ بات جو تمہارے مزاج کے خلاف ہو لازمی نہیں کہ ہمیشہ غلط ہی ہو۔ بات سنتے ہی جامے سے باہر ہو جانا، آدمی کے واسطے زیبا نہیں۔ یہ روش تو یادش بخیر اُس عہد کی یادگار ہے جب ہمارے اجداد جنگلوں میں رہا کرتے تھے۔

سنو: میں بالفاظ دیگر تم سے پھر یہی سوال کرتا ہوں کہ اے پردہ کے حامی مسلمانو، اے اپنی عورتوں، اور اپنی آئندہ نسلوں کے قاتلو! کیا واقعی تمہارا پردہ یہ غیر ملفوظ اعلان نہیں ہے کہ تم اپنے خدا اور اپنے رسول دونوں سے زیادہ غیرت مند واقع ہوئے ہو؟

تم سمجھے بھی میں کیا کہہ رہا ہوں؟ تم سے مجھے یہ بہت سخت شکایت ہے کہ تم بیداری و زندگی کی باتوں کو بہت دیر میں سمجھا کرتے ہو۔ نہیں یہ بھی میں تمہاری خوشامد کر رہا ہوں، حالانکہ واقعہ تو دراصل یہ ہے کہ زندگی و بیداری کی باتیں سمجھنے کی تم میں کئی صدیوں سے صلاحیت ہی باقی نہیں رہی ہے۔

لیکن اس باب میں تم سخت مجبور بھی ہو، تمہاری صلاحیتوں کو تو نہایت چالاکی کے ساتھ سُلا دیا گیا ہے۔ تمہاری عقلوں پر تو قبائے حرام کے پیچھے دوڑنے والے ریاکار "عالمانِ دین متین" اور "گندم نما" صوفیائے خانقاہ نشین" کی جھوٹے وضو کے پانی سے پالی ہوئی سفید و سیاہ ڈاڑھیوں کی دھوپ چھاؤں کے مضبوط جال تنے ہوئے ہیں۔

تمہاری عقلیں اُس جال کے نیچے پھڑک رہی ہیں اور لطف تو یہ ہے کہ تم اس پھڑکنے کو اتباعِ کتاب و سنت کی چہل پہل سمجھ رہے ہو۔

ہاں تو میں تم سے دریافت کر رہا تھا اے "ملّا زدہ" اور "صوفیا گزیدہ" بھولے مسلمانو! کیا واقعی تم اپنے کو اپنے خدا اور رسول دونوں سے زیادہ غیرت مند نہیں سمجھتے؟

میرا مدعا صاف لفظوں میں یہ ہے کہ جب تمہاری کتاب، یا یوں کہو تمہارا خدا عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دیتا ہے اور تمہارا رسول عورتوں کو گھروں میں بند رکھنے کا حکم صادر نہیں فرماتا، تو پھر یہ تمہارا پردہ کیا اس بات کا گستاخانہ و کافرانہ اعلان نہیں ہے کہ تم نعوذ باللہ اپنے خدا اور اپنے مقدس رسول دونوں سے زیادہ غیرت مند واقع ہوئے ہو؟

کیا تم نے اپنی کتاب کے آیاتِ حجاب کا مطالعہ خود کیا ہے؟ یا اپنے محلّہ کی مسجد کے بڑے مولوی صاحب ہی کے ارشاداتِ عالی پر عمل پیرا ہو؟

مسلمانو! میں سفارش کرتا ہوں کہ برائے خدا و رسول، تم قرآنِ حکیم کی سورۂ "نِسَاء"، "نُور"، اور "اَحزاب" کا خود مطالعہ کرو۔ اور جیسا کہ خود تم سے قرآن بار بار مطالبہ کرتا ہے۔ تدبر و تفکر سے مطالعہ کرو۔

اگر تقلیدی آوازوں کی طرف سے کان بند کر کے، صحیح اسلامی طرز پر تم مطالعہ کرو گے تو آنِ واحد میں یہ حقیقت تم پر کھل جائیگی کہ تمہارا یہ پردہ جس پر تم آج اس قدر اترائے پھر رہے ہو، اسلام سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا۔ بلکہ تم پر یہ بھی واضح ہو جائیگا کہ ازروئے اسلام حشر کے روز تم سے اس ظلم و بدعت کا جواب بھی طلب کیا جائیگا کہ کس خطا پر تم نے حوّا کی بیٹیوں کو حبسِ دوام کی سزا دے رکھی تھی۔

ہاں، تمہارے اس پردے کے جواز کی ایک صورت ضرور نظر آتی ہے، سورۂ "نِساء" میں ارشاد ہوتا ہے کہ "تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بدچلنی کی مرتکب ہوں، تو چاہیئے کہ اپنے آدمیوں میں سے چار آدمیوں کی اُس پر گواہی لو، اگر چار گواہ بیان دے دیں، تو پھر ایسی عورتوں کو گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ موت اُن کی عمر ختم کر دے۔"

اے غیور مسلمانو! تمہیں اپنی معصوم بہو بیٹیوں کی مسلّمہ عصمت و عفّت کی قسم، سچ کہو، کیا اُس وقت غصّے کے مارے تم دیوانے نہ ہو جاؤ گے، جب کوئی شوخ چشم تم سے یہ پوچھ بیٹھے گا کہ اے مسلمانو، کیا اسی حکمِ قرآنی کے اتباع میں تم نے اپنی عورتوں کو زندگی بھر کے لئے گھروں میں بند کر رکھا ہے؟

کیا تمہیں نہیں معلوم ہے کہ خود تمہارے برگزیدہ رسول کی زندگی میں مسلمان عورتیں باہر آتی جاتی تھیں، اپنا تمام کام کاج خود کرتی تھیں، اور غزوات میں مسلمانوں

کی مرہم پٹی انہیں کے سپرد ہوا کرتی تھی؟

رسول کی لاڈلی بیٹی فاطمہؓ، اور محبوب بیوی عائشہؓ نے کیا میدانِ جنگ میں پیاسوں کو پانی نہیں پلایا، اور مجروحوں کی خبرگیری نہیں کی؟

اللہ اللہ! اے بلند مرتبہ مسلمانو! تمہاری عزّت کا کیا کہنا، تمہاری بیویاں اور بیٹیاں، رسول کی بیویوں اور بیٹیوں سے بھی بڑھ گئیں۔ میں تمہیں اِس صولت و شوکت پر مبارکباد دیتا ہوں!

آخر وہ اُمّت کس کام کی جو اپنے رسول، اور وہ بندے کس کام کے جو اپنے خدا سے نہ بڑھ جائیں!

اے ابلیس! یہ نمایاں فتح مُبارک ہو!!

شاید تم میں سے کوئی اِس موقع پر یہ سمجھکر وہ بڑے دُور کی کوڑی لا رہا ہے، یہ کہے کہ "جناب وہ عرب تھا۔ یہ ہندوستان ہے، وہاں ایک قوم آباد تھی، یہاں ستّر ہزار قومیں بستی ہیں"

سب سے پہلا اعتراض تو اِس بات پر یہی ہے کہ ہندوستان میں ستّر ہزار یا مُتعدد قومیں بستی ہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے، قوم تو یہاں بھی صرف ایک ہی بستی ہے، جسے "ہندوستانی" کہتے ہیں۔ البتہ مذاہب مختلف ہیں، سو، عرب میں بھی مسلمانوں کے دوش بدوش بُت پرست موجود تھے۔ اور مسلمان عورتیں اُن بُت پرستوں، اور منافقوں سے پردا نہیں کرتی تھیں۔

دوسرا اعتراض اِس پر یہ وارد ہو سکتا ہے کہ جب آیاتِ حجاب کا نُزول ہوا تھا، آیا خدائے بزرگ کے علم میں یہ بات تھی کہ اسلام عرب سے باہر بھی نکلیگا، مسلمان دوسری قوموں کے دوش بدوش بھی زندگی بسر کریں گے، اور ۱۹۳۶ء میں آٹھ کروڑ مسلمان، محکوموں اور غلاموں کی طرح ہندوستان میں رہنے پر مجبور ہوں گے؟

اگر خدا کے علم میں یہ بات تھی، تو کیا ہندی عورتوں کے احکامِ حجاب کے باب میں اُس سے بھول ہو گئی؟ اُس کے ذہن میں اتنی موٹی بات بھی نہ آئی کہ اسلامی پردہ ہندوستان میں کیوں کر مقبول ہو سکیگا؟

اور جس وقت پیغمبرِ اسلام نے حجّۃ الوداع کے موقع پر دین کے "اکمل" اور نعمتوں کے "تمام" ہو جانے کا بشدّ و مد اعلان فرمایا تھا، کیا حضورؐ کے پیشِ نظر اُس وقت یہ بات نہ تھی کہ ہندی عورتوں کے پردے کے باب میں قرآن کے آیاتِ حجاب، تشنہ، غیر مکمل، اور ناتمام ہیں؟

مسلمانو! آؤ تمہاری عبرت کیلئے تمہیں تمہاری ہی بڑی بوڑھیوں کے تاریخی واقعات میں سے ایک واقعہ سناؤں۔ سُنو، اور عبرت کے کانوں سے سُنو۔

نہیں۔ پہلے قادسیہ کی جنگ کے میدان میں اپنی ایک شاعرہ کے اُن شعر کا ترجمہ سُن لو، جو اُس نے اپنے بچّوں کو سُنائے تھے۔

"پیارے بیٹو! تم اپنے ملک پر بار نہ تھے کہ میں تمہیں آتشِ جنگ کا ایندھن بنانے لائی ہوں۔ تمہارے مُلک میں قحط بھی نہیں پڑا تھا کہ میں تم سے سبکدوش ہونے کے لیے تمہیں جنگ کے شعلوں میں جھونک رہی ہوں۔ نہیں، اے پیارے بیٹو، اِن میں سے کوئی بات نہیں، میں تمہیں جنگ کی طرف اِس لئے للکار رہی ہوں کہ یہ معاملہ ہے قومی غیرت و عزت کا، یہ معاملہ ہے اسلام کی سربلندی کا، یہ معاملہ ہے رُوحِ عرب کی سرفرازی کا۔ خدا کی قسم جس طرح تم ایک ماں کے بیٹے ہو اسی طرح ایک ہی باپ کے فرزند بھی ہو۔ میں نے تمہارے باپ سے بددیانتی نہیں کی۔ نہ تمہارے ماموں کو رُسوا کیا۔ اے میرے چاروں بیٹو، آج مُعاوضے کا دن ہے، آج تم مجھ سے بھی بددیانتی نہ کرنا۔ اور مجھے بھی رسوا کرنے سے احتراز کرنا"

مسلمانو! یہ بھڑکتی ہوئی آگ تھی، جو تمہارے مردوں ہی میں نہیں، تمہاری عورتوں تک کے سینے میں مشتعل رہا کرتی تھی۔ ذرا اپنی پردے میں بیٹھنے والی عورتوں کے سینے چاک کر کے دیکھو، کیا وہ بھی اسی طرح مشتعل ہیں؟

اِں تو جو واقعہ میں بیان کرنا چاہتا تھا، وہ بھی سُن لو۔ شاید تم کچھ سبق حاصل کر سکو۔

یہ عراقِ عرب کی جنگ کا واقعہ ہے۔ مُسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی خاطر عیسائی، بحر و بر سے آندھیوں، اور طوفانوں کی طرح اُمڈے چلے آرہے تھے۔

خانقاہ نشین راہب، اور خلوت گزین پادری بھی اپنے اپنے گوشوں سے نکل نکل کر عیسائی فوجوں میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے تھے۔ آدمیوں کا ایک بپھرا ہوا سمندر تھا، جو مسلمانوں کے بیڑے کو غرق کر دینے کے لئے تڑپ رہا تھا، مچل رہا تھا۔ موجیں مار رہا تھا۔

الغرض دیکھتے ہی دیکھتے دو لاکھ سے زیادہ رُومیوں کا جنگل، صرف تیس ہزار مسلمانوں کے سامنے آکھڑا ہوا۔ رُومی عربوں کی قلّت پر مُسکرائے، اور یہ خیال کیا کہ شاید عرب دیوانے ہو گئے ہیں۔

آخر کار طبلِ جنگ پر چوب پڑی، آگ اور خون کے دیوتا نے انگڑائی لی۔ موت نے کروٹ بدلی ـــــ قتال کا بازار گرم ہو گیا، زمین، دریا کی موجوں کی

طرح چلنے لگی۔ تلواروں کی بجلیاں گرنے لگیں، اور سنسناتے ہوئے تیر روہیوں میں ترازو ہونے لگے۔ مردوں کی جانیں، اور عورتوں کا سہاگ لٹنے لگا ——— رومیوں کے جوش کا یہ عالم تھا گویا وہ وقت کا پہیا ہیں جو کبھی پیچھے کی طرف گردش نہیں کرتا۔

اتنے میں پادری اور بشپ ہاتھوں میں صلیبیں لئے اور مسیح کا نعرہ بلند کرتے ہوئے نمودار ہوئے اور ایک لمحے کے اندر رومیوں نے اس شدت سے حملہ کر دیا کہ مسلمان پسپا ہونے لگے۔ اور پسپا ہو کر اپنی عورتوں کے خیموں تک پہونچ گئے ——— یہ دیکھنا تھا کہ تمام عورتیں دفعۃً طیش میں آگئیں، اور خیموں کی چوبیں نکال نکال کر دیوانہ وار چلانے لگیں کہ اے عرب کے سپاہیو، اب اگر ایک قدم بھی پیچھے ہٹے تو خدا کی قسم انھیں چوبوں سے ہم تمہارے سروں کو پاش پاش کر دیں گے، کچل ڈالیں گے۔"

لیکن اس اثنا میں رومیوں کے ایک مزید تازہ دم ریلے نے مسلمانوں کو چند قدم اور پیچھے دھکیل دیا ——— اب کیا تھا، آگ لگ گئی، اور تمام عورتیں دیوانی شیرنیوں کی طرح دشمنوں پر ٹوٹ پڑیں۔ اور اس حیرتناک ولولے اور جوش کے ساتھ حملہ کیا کہ عیسائیوں کی پیش قدمیوں کی سانس دفعۃً رک گئی، اور وہ سراسیمہ ہو کر ان عورتوں کو دیکھنے لگے ——— اتنے میں بپھری ہوئی شیرنیو نے اپنے مردوں کو پھر للکارا "اے عرب کے بہادر بچو، اے محمد عربی کے غلامو، اے خدائے بزرگ و برتر کے آخری پیغام کے حاملو! آگ اور خون کے دریا میں کود پڑو۔ مر جاؤ، یا رومیوں کو پیس ڈالو۔ دیکھو خود رسول اللہ کی روح مطہر تمہیں غور سے دیکھ رہی ہے"

یہ سننا تھا کہ مسلمانوں کی رگوں میں بجلیاں دوڑنے لگیں، اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ مسلمان رومیوں پر ٹوٹ پڑے ——— عورتیں صف آہنین سے پیچھے آگئیں اور پکار پکار کر کہنے لگیں "اے اسلام کے فرزندو، اے عرب کے سپوتو، اب ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹنے، اب اگر ایک انچ بھی تم ہماری طرف جھکے تو تمہیں قسم ہے خدائے بزرگ و برتر کی کہ پھر زندگی بھر ہمارا منہ نہ دیکھنا، ہم تم پر حرام ہو جائیں گے"۔

اور اے مسلمانو! جانتے ہو تمہاری ان بہادر عورتوں کی مردانگی کا نتیجہ کیا ہوا؟

مسلمانوں نے رومیوں پر ایسی شاندار اور اسی کے ساتھ ساتھ ایسی حیرتناک فتح پائی کہ تاریخ آج تک انگشت بدنداں ہے۔

انصاف سے کہو کیا یہ پردہ نشین عورتوں کے کارنامے ہیں؟

اے دوستو! تمہاری عورتیں تو بھوتوں اور چڑیلوں کے تذکروں سے کانپتی ہیں، تمہاری عورتیں تو اپنی کہانیوں سے تمہارے بچوں تک کو بزدل بنا رہی ہیں۔ کیا تم انھیں میدانِ جنگ میں لے جا سکتے ہو! کیا یہ طبلِ جنگ کی آواز سنتے ہی "اوئی، اوئی" کر کے بیہوش نہ ہو جائیں گی؟

کیا تم سمجھ رہے ہو اے بھولے بھالے مسلمانو، کہ میں تم سے کیا مطالبہ کر رہا ہوں؟ آہ تمہاری عقلوں پر تو پردے پڑے ہوئے ہیں۔

کان کھول کر سنو، میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں، یورپ والیوں کی ریس کرنے لگیں۔ میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں ایتھر کی طرح آزاد ہو جائیں۔ میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں مشرقی شرافت کو بالائے طاق رکھ کر مغرب زدہ گری اختیار کر لیں۔ میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں پنڈلیاں، اور بانہیں عریاں کر کے اونچی ایڑیوں پر کھٹکھٹاتی پھریں۔ میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں، پریاں بن کر لال ڈوبے ساتھ، اڑن کھٹولوں پر سوار ہو کر راجہ اندر کے اکھاڑے میں اترنے لگیں۔ میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں فانوسِ خلوت کے عوض شمعِ جلوت بن جائیں۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تمہاری عورتیں، یونیورسٹیوں کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر کے، اپنے چہروں پر مجتہدانہ خشکی پیدا کر لیں ——— میرا تو تم سے صرف یہ خفیف سا مطالبہ ہے کہ اپنی عورتوں کو کھلی ہوئی ہوا میں سانس لینے کا موقع دو، انھیں اس طرح پردے میں گھونٹ کر نہ رکھو۔ انھیں باہر نکالو۔ انھیں اتنی تعلیم دو کہ وہ تدبیر منزل، اور تربیتِ اولاد کو سمجھنے لگیں، زندگی اور اس کے مقتضیات سے واقف ہو جائیں۔ اور بس۔

میں کہوں گا، اور بار بار کہوں گا اپنی عورتوں سے تمہارا سلوک نہایت ہی ظالمانہ، بلکہ وحشیانہ ہے، تم نے انھیں زندگی کے تمام حقوق سے یکسر محروم کر دیا ہے تم نے ان سے وہ سب کچھ چھین لیا ہے، جو تمہارے خدا اور رسول نے انھیں بخشا تھا۔

اے مسلمانو! کیا تم نہیں دیکھتے کہ پردے کی وبا نے تمہاری عورتوں کی کیا درگت بنا رکھی ہے؟

کیا مردہ اور بجھے ہوئے خون کی مائیں تازہ اور شگفتہ بچے پیدا کر سکتی ہیں؟

کیا تم اپنے گھروں کی گندگی اور بدسلیقگی کو نہیں دیکھتے۔ کیا ایسے مکانوں کے مکیں، اور اس ماحول میں پروان چڑھنے والے بچے بلند خیالی اور شائستگی کا

تصور تک کر سکتے ہیں؟

اے بھائیو، ذرا اپنی عورتوں کو غور سے دیکھو، کیا وہ زرد اور مدقوق نہیں ہیں؛ کیا اُن کے جسم، ترس آنے کی حد تک لاغر نہیں ہیں؛ کیا اُنکی پنڈلیاں اور اُن کے بازو سُوکھے ہوئے نہیں ہیں؟

خدارا ان مُقید عورتوں کے سُتے ہوئے، رُوکھے، پھیکے، سینٹھے، اور رُوڑے چہروں پر نگاہ ڈالو ——— کیا تمہارے پردے نے اُنھیں تمام نسائی دلفریبیوں سے محروم نہیں کر دیا ہے،

ذرا اپنی عورتوں کی غیر فطری چالوں، گِرتے ہوئے بالوں، پٹکتی ہوئی کنپٹیوں اور اُڑتے ہوئے رنگ دیکھو۔ یہ لاغر تصویریں، تمہارے ہی ہاتھ کی کھینچی ہوئی ہیں۔

آنکھیں اچھی طرح کھول کر دیکھو، کیا اس نام اور پردے کے باعث حسن و جمال تمہاری جماعت سے روز بروز مفقود ہوتا نہیں چلا جا رہا ہے؛ اور کیا مسلمان کا ذوقِ جمال، تنگ حجروں کی اور گندی مرطوب ہواؤں کے مارے ہوئے حُسن ہی پر قانع ہو جانے پر آمادہ ہو چکا ہے؟

اے جھوٹی غیرت کے جھوٹے اوتارو! اے اپنی عورتوں کی جہالت، کمزوری، وہم پرستی، بزدلی، اور بدصورتی پر فخر کرنے والے حاجیو، قاریو، اور حافظو!

ذرا سینماؤں میں جاؤ، تھیئٹروں کی سیر کرو، اور زنانِ بازاری کی خلوت گاہوں میں جھانک کر دیکھو، ان تمام مقامات پر تمہیں ستّر فیصدی مسلمان نظر آئیں گے۔

تمہیں خبر نہیں تمہارے پردے کے ذوق ہی نے ان نوجوانوں کو یہاں بھیجا ہے ——— تمہیں ان تمام بد اخلاقیوں کے ذمہ دار ہو۔

تم نے اپنی عورتوں کو پردوں میں گھونٹ کر اُنھیں اس قدر بیکار، غیر دلچسپ اور بدصورت بنا دیا ہے کہ شام ہوتے ہی تمہارے نوجوان گھروں سے رسّیاں تڑا کر بھاگ جاتے ہیں۔ اور وہاں پہونچ جاتے ہیں جہاں اُنھیں "رنج و محن" کی عورتیں مل سکتی ہیں، جو خطرناک ہونے کے باوصف اُن کی جوانیوں کو اپنی دلچسپ باتوں اور اپنے ٹھنڈی ہوا کے پالے ہوئے سُرخ رخساروں سے آسودہ کر سکتی ہیں۔

یاد رکھو کاغذ کے مصنوعی پھول، اصلی پھولوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ اور بہتے ہوئے پانی پر ٹھہرے ہوئے پانی کو صرف وہی لوگ ترجیح دے سکتے ہیں، جن کی کھوپڑیوں کا گُودا خشک ہو چکا ہے۔

کیا تم نے نہیں سُنا!

کہ بُو فساد کی آتی ہے بند پانی سے



اخبارِ اُردُو

اَز مُلا رموزی

فروری کے کلیم میں حضرتِ جوشؔ کو ہندو مسلمانوں کے موجودہ اختلافات پر جو تاؤ آیا ہے اور موصوف نے اس سلسلہ سے جو کچھ لکھا ہے اُس کے متعلق عرض ہے کہ اگر آئندہ بھی ایسا ہی ہو تو براہ کرم ہندو مسلمانوں کو کچھ کہنے سے پہلے اُس نصابِ تعلیم پر بھی کچھ ارشاد فرمایئے گا جس نے یہ جذبہ بیدار و مشتعل کیا ہے۔

بے شبہ ایک ہی ملک کے باشندوں کا ایک دوسرے کے خلاف حرکت کرنا اُس ملک کے باشندوں کی آخری بدنصیبی ہے، لیکن وہ مجبور بھی ہیں اور بے خبر بھی، جبکہ اُن کے دماغوں میں کچھ ایسی "ہوائیں بھر دی گئی ہیں" جن کے ہوتے ہوئے اُن کا متحد ہو جانا خام خیالی ہے، حد ہے کہ ہندو مسلم سوال مذہب و سیاست سے گزر کر اب تہذیب و تمدن اور علم و ادب تک کو متاثر کر رہا ہے، حالانکہ ادبیاتِ ہند کا کوئی حصہ نہیں ہے جو ہندو مسلمانوں ہی سے مل کر پیدا نہ ہوا ہو۔ مگر اب ایسے بھی ہیں جو "ہندی ہندوؤں کے لئے" اور "اردو مسلمانوں کے لئے" کا نعرہ بلند کرنے کو اپنے دماغ کی سب سے اونچی لیاقت سمجھتے ہیں۔

~~~~~~~~

چنانچہ گزشتہ ماہ نومبر ۳۵ء میں "ہندی اور اردو" کا جو دنگل صوبہ سرحد میں ہوا اُس کی تفصیلات ہندوستانی باشندوں کی تہذیب و سربلندی اور اُن کی ذہنی فضیلت پر گندا و ناداغ ہیں۔ یعنی اس صوبہ کی حکومت نے کہیں حکم دے دیا کہ آئندہ سے صوبۂ سرحد کی درسگاہوں میں ذریعۂ تعلیم زبانِ اردو ہوگی۔

اس حکم کا نافذ ہونا تھا کہ ہندی اور گورمکھی والوں نے صوبۂ سرحد کا پورا آسمان سر پر جو اُٹھایا ہے تو آج تک نیچے دھرنے کا نام نہیں لیتے۔ حد ہوگئی کہ جھگڑا ہے صوبۂ سرحد میں اردو ہندی کا مگر ہندی اور گورمکھی والے ہیں کہ شہر بمبئی اور شہر مدراس میں قابو سے باہر نظر آتے ہیں۔ حالانکہ یہ امر حقیقت ہے کہ حکومت صوبۂ سرحد نے اس معاملہ کو کامل تحقیق اور غور و فکر کے بعد صحیح اور ضروری تسلیم کیا ہے، ادھر صوبۂ سرحد کی مجلسِ قانون ساز میں ہندوؤں اور سکھوں کو وہ حقوق دے دئے گئے ہیں جو صوبۂ مدراس کے مسلمانوں کو حاصل نہیں ہیں، لیکن صوبۂ سرحد کے مسلمانوں نے ان حقوق کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کی، لیکن جہاں اُردو ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی کہ پہلے تو اس کے مقابل ہندی اور گورمکھی لائی گئی اور اب صاف صاف ہندو مسلمان اور سکھ صاحبان ہیں اور اُن کی لمبی لمبی زبانیں، مگر میں وہی عرض کروں گا کہ اس سلسلہ سے نہ ہندو مسلمان ہیں نہ سکھ بلکہ یہ تو وہی "حکیمانہ تعلیم" ہے جسے "اعلیٰ تعلیم" مشہور کیا گیا ہے اور یہی ہے جو آج ہندو مسلمان بن کر لڑ رہی ہے یا لڑا رہی ہے۔ اس لئے جب تک نصابِ تعلیم کی اصلاح نہ ہو ہندو مسلم اختلافات پر کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔

~~~~~~~~

صحافتِ اردو کے سلسلہ سے چند دن سے شہر دہلی بھی کچھ ہوتا جا رہا ہے خصوصاً مہین اور باریک لکھائی چھپائی اور خوبصورت رسالوں اور اخباروں کے حساب سے دہلی بھی اب لاہور ہوا جا رہا ہے، لیکن زبان و ادبِ اردو کے حق میں دہلی نے کوئی قابلِ اعتنا قدم اُٹھایا، یہ قدرے مشکوک ہے۔ پھر بھی یہاں اردو کے لئے جو کچھ ہوتا رہتا ہے اُس میں نومبر ۳۵ء میں خواتینِ ہند کی مجلس کا جو اجلاس ہوا اُس کی یہ تجویز لائقِ احترام ہے کہ

"حکومت ایک ایسی جماعت مقرر کرے جو ایک ایسا لغت تیار کرے جس میں زیادہ سے زیادہ وہ الفاظ جمع کئے جائیں جو دیسی زبانوں میں زیادہ مستعمل ہیں، اور حکومت اس کا بھی بندوبست کرے کہ درسگاہوں میں ایسا نصابِ تعلیم پڑھایا جائے جس میں مشترک الفاظ مستعمل ہوں"

اس تجویز پر دہلی کے معزز و محترم اخبار "ملت" نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۲ نومبر ۳۵ء

کے مقالۂ ۔۔۔۔ میں ذیل کی موزوں رائے پیش کی ہے کہ

"جہاں تک خواتین کا تعلق ہے وہ زبان کے معاملہ میں
سب سے مؤثر خدمت انجام دے سکتی ہیں۔ اس طرح کہ وہ
اپنے بچّوں کو شروع ہی سے ایسی زبان سکھائیں جو مشترک
ہو، خصوصاً جہاں کی درسگاہیں عورتوں کے ہاتھوں میں
ہیں وہاں یہ کام زیادہ آسان ہے، اس طرح زبان کی
بنیادیں مضبوط ہوسکتی ہیں"

شک نہیں کہ دونوں تجویزیں مبارک اور لائق عمل ہیں، پس مصیبت ہے تو یہ کہ ہندوستانیوں کی "والدائیں" تو زبان کی خدمت انجام دیں اور وہ بھی ایک مشترکہ زبان کی، لیکن ہندوستانیوں کے "والدلوگوں" کو کیا کہئے گا جو انٹرنس ہوتے ہی انگریزی میں چلتے ہیں، انگریزی ہی میں سوتے ہیں، اور انگریزی ہی میں بیدار ہو کر کام کاج کرتے ہیں؟

~~~~~~~~~~

اردو کے حق میں قابلِ اعتنا تحریکات میں سے ایک تحریک مدراس کی ہے جہاں سے کوشش کی گئی کہ پورے صوبے میں اردو کے حق میں بنام "ہفتۂ اُردو" کچھ کیا جائے، یہ تحریک "ہفتۂ اطفال" سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے، جو علی گڈھ میں بھی رُونما ہوئی تھی، مگر اس کی تفصیلات مجھے حاصل نہ ہوسکیں، البتہ "ہفتۂ اردو مدراس" کی تفصیلات کو اخبار "الجمعیۃ دہلی" نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۲ر نومبر ۳۵ء میں شائع کیا ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ

"انجمن اردو مدراس نے تمام صوبے میں اردو کی تحریک کو
مقبول بنانے کے لئے وہاں کی مختلف زبانوں میں اشتہارات
تقسیم کئے رضا کاروں نے گشت اور ملاقات کے ذریعہ لوگوں
کو متوجہ کیا جس کے نتیجہ میں یہ ہفتہ کامیابی سے منایا گیا اور
مختلف دارالمطالعے اور کتب خانے کھولے گئے۔ جلسے ہوئے
اور تقریریں"

اس سلسلے سے ملّا رموزی کو معلوم ہوا ہے کہ مدراس میں جب سے حضرت پروفیسر مولوی محمد حسین صاحب محوّی صدیقی لکھنوی رونق افروز ہوئے ہیں وہاں زبان اردو سے نہ فقط کافی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے بلکہ موصوف کی کامیاب کوشش سے وہاں سے متعدد اخبارات اور رسالے اردو میں جاری ہو رہے ہیں۔ پس خدا کرے اس قسم کے محمد حسین محوّی ہندوستان کے ہر شہر میں پیدا ہو جائیں جو بغیر اردو ہندی کے مقابلے مجادلے، مکالمے، مناظرے اور مقاتلے کے اردو کو ترقی دیتے رہیں

~~~~~~~~~~

۱۳ر نومبر ۳۵ء کے اخبار "انقلاب لاہور" نے یہ مسرت بخش اطلاع شائع کی ہے کہ امرتسر کے بعد شہر لاہور میں بھی اُردو کی ایک لائق اعتبار انجمن بنائی گئی ہے جس کا "اینگلو انڈین نام" "اردو کانفرنس" ہے، اس کے مقاصد میں قیمتی مقاصد و مطالب ہیں، لیکن پُرلطف بات یہ ہے کہ اس کی مختصر سی روداد میں انگریزی کے اتنے الفاظ موجود ہیں۔ لیکچر ہال۔ یونین۔ لائف ممبر۔ جنرل سکرٹری۔ فنانشل سکرٹری وو‌ٹ۔ سینئر نائب صدر۔ فرنیچر۔ کورم۔ فارم۔ رکنیت۔

میری حقیر فقیر اور کمترین سی رائے میں یہ وہ الفاظ ہیں جن سے زیادہ عام فہم الفاظ دیسی اور پُرانی اردو میں موجود ہیں۔ بارے تحریک لائق احترام ہے۔ جن صاحب کو اس مجلس سے دلچسپی ہو وہ ذیل کے پتہ سے خط و کتابت کریں۔

مولینا عاشق بٹالوی بی اے۔ ایل ایل بی، ناظم پنجاب اردو کانفرنس
نمبر ۱ ایمپرلین روڈ لاہور۔

~~~~~~~~~~

ترقیٔ اردو یا حفاظتِ اُردو کی جو خدمت حیدرآباد نے انجام دی ہے ظاہر ہے کہ اُس کی بلندی کو ہندوستان کی نہ کوئی ریاست پہونچ سکتی ہے نہ کوئی صوبہ۔ اگرچہ اس خدمت و بلندی میں "حکومت حیدرآباد" کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کو کافی دخل ہے۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ وہاں کے باشندوں نے "خالص اردو بولنے" اور "خالص اردو لکھنے" میں ہندوستان کے تمام اردو والوں پر فوقیت حاصل کرلی ہے، یقین نہ ہو تو حیدرآباد اور پنجاب کے اخبارات ملاحظہ فرمائیے۔ حیدرآباد ہی کے اخبارات ہوں گے جن کی اردو وطنی مصطلحات اور محاورات سے آراستہ ہوگی اور ان میں بجز بے حد ضروری انگریزی الفاظ کے اور کچھ نہ ہوگا۔ لیکن پنجابی اخباروں میں بجز الّا ماشاء اللہ کے ۲۵ فیصدی سے کچھ زیادہ ہی انگریزی الفاظ ہوں گے جو ان اخباروں میں روزانہ ڈھلتے اور داخل ہوتے نظر آئیں گے، بارے اب حیدرآباد کے لائق احترام "اردو پسندوں" نے ایک اور قدم اٹھایا ہے، چنانچہ اخبار "رہبر دکن" حیدرآباد مورخہ ۲۴ر اکتوبر ۳۵ء کے صفحہ ۵ پر جناب اشفاق حسین صاحب عثمانی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ:-
~~~~~~~~~~

"ہمارے ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ایسا سادہ اور عام فہم
اسلوب اختیار کریں جسے زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں
حیدرآبادی محاوروں کو رواج دیں"

حیدرآبادی محاورے یا پنجابی محاوروں کو اردو میں رواج دینے سے اگرچہ دوسرے صوبوں کے باشندوں کو چند دن مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، لیکن چند دن کے بعد ہی یہ آسانی ہو جائے گی کہ اردو میں تمام ذخیرۂ الفاظ "ہندوستانی" ہوگا جس کے سمجھنے اور سمجھانے میں وہ مشکلات پیدا نہ ہوں گی جو انگریزی الفاظ کی بھرتی سے عمر بھر رہیں گی۔

~~~~~~~~~~~~

خضر علیہ السلام کی عمر کا ایک اخبار "گورکھپور" سے شائع ہوتا ہے جس کا نام نامی و اسم گرامی "مشرق" ہے، اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر حال میں شائع ہو کر رہتا ہے، پس اس کی اشاعت مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے صفحہ ۱۰ پر حضرت علامہ سلیمان ندوی کا ایک مضمون شائع کیا گیا ہے جس میں ممدوح نے "اردو و ہندی والوں" کے متعلق یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ:-

اس وقت ہندی اور اردو ملک کی عام زبان بننے کے لئے کوشش کر رہی ہیں۔ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے شک نہیں کہ وہ اپنے حامیوں کی انتھک کوششوں کی ممنون ہے۔ ایک زبان جو صرف چند مذہبی کتابوں میں تھی انگریز دور اندیشوں کی قوتِ فکر سے وہ کلکتہ کے فورٹ ولیم میں سب سے پہلے ہندوستانی یعنی اردو کے مقابل دوسری زبان کی حیثیت سے رواج پائی۔ اب صوبہ صوبہ اس کی شاخیں ہیں، مرکزی انجمنیں ہیں، اہلِ دولت اس کی مدد کر رہے ہیں، اہلِ قلم اس کو پھیلا رہے ہیں، وہ ریاست کشمیر، راجپوتانہ، بڑودہ، گجرات اور مدراس میں قدم جما رہی ہے اور ہندو ریاستیں اس کی سرپرستی میں نمایاں حصہ لے رہی ہیں، اس کے مقابل اردو کے لئے نہ تبلیغی انجمنیں ہیں، نہ اس مقصد پر ایک پیسہ خرچ ہو رہا ہے، نہ حیدرآباد کے سوا کوئی اسلامی ریاست اس کے لئے اعزازی یا تنخواہ یاب مبلغ مقرر کرتی ہے۔"

حضرت علامہ کے مذکورہ بالا بیان کے دو حصے ہیں، ایک یہ کہ ہندی زبان کو فورٹ ولیم میں چند "دور اندیش انگریزوں" نے رواج دیا، گویا آج اردو ہندی جو "ہندو مسلم فساد" کی طرح ہندوستانی قومیت کے حق میں ایک مصیبت بنی ہوئی ہے سو الحمد للہ کہ یہ بھی انگریز بھائیوں کی "نظر" کا کرشمہ ہے۔

دوسرا حصہ متعلق ہے اسلامی ریاستوں کی اردو کی طرف سے بے اعتنائی کا۔ سو اس پر کچھ زیادہ لکھنے سے بہتر ہے کہ یہ کہہ دیا جائے کہ اُن کے اونٹ کی وہ کونسی کروٹ ہے جسے سیدھا کہا جائے، بلکہ میرا تو عقیدہ ہے کہ مسلمان ریاستیں ہی کیا ہر وہ مسلمان اردو کے حق میں جہنم ہے جس نے انگریزی پڑھی ہے، اور اگر وہ بی اے پاس ہو گیا ہے تو پھر اس کے گھر میں ایک اردو کیا، جو کچھ بھی ہوگا یورپ ہی کا ہوگا، اور اگر مسلمانوں میں یہ خواص پیدا نہ ہوں گے تو وہ زوال یافتہ کس طرح کہے جائیں گے! بہرحال خدا اردو کو مسلمان امیروں اور دولت مندوں کے ہاتھ سے محفوظ ہی رکھے۔

~~~~~~~~~~~~

انہیں دنوں اردو کے لئے ایک کوشش کلکتہ میں بھی ہوئی، یعنی یہاں مردوں کے ساتھ عورتوں نے بھی اردو کے حق میں تقریریں کیں، اور یہ تو ساری دنیا کو آنکھ بند کر کے تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ہندوستان کے مسلمان رسمی تقریریں اور رسمی تحریریں لکھنے میں خاص کمال رکھتے ہیں، چنانچہ شاید ہی کوئی بدنصیب جلسہ ہوگا جس کے صدر نے اردو پر اتنی جامع تقریر نہ کی ہو جس سے دنیا مان لے کہ اس صدر کے برابر اردو کا نہ کوئی حامی ہے نہ سرپرست، لیکن اردو کے تمام جلسوں کے صدر حضرات میں ایک آدھ ہی ایسا صدر نکلے گا جس کے گھر میں بھی اردو سے ہمدردی اور دلچسپی ہو ورنہ عام صدر وہی ہوتے ہیں جو جلسہ میں اردو کے حامی اور گھر میں انگریزی کے سرپرست۔

لیکن غنیمت ہے کہ کلکتہ کے جلسوں کے صدر ضرور ایسے ہیں جن کے ہاں اردو سے محبت کی جاتی ہے، مثلاً ایسے ایک جلسہ کی صدر محترمہ بیگم مولانا محمد علی مغفور بھی تھیں، چنانچہ موصوفہ نے جو تقریر اردو سے متعلق ارشاد فرمائی اُس میں آپ نے متعدد حوالوں سے دکھایا کہ اس زبان کی ترقی میں پچھلے زمانے کی خواتین نے خاصا حصہ لیا ہے، اور اس کے ثبوت میں ممدوحہ نے چند گزری ہوئی شاعر خواتین کے اشعار بھی نقل فرمائے اور موجودہ عہد کی خواتین کو اردو کی حمایت پر آمادہ فرمایا۔

اس جلسہ کے دوسرے صدر کیا بتاؤں کہ کون تھے، یعنی خالص اردو کے جلسہ کے صدر کا نام تک جب مسٹر اے، کے افضل الحق صاحب ہو تو کم سے کم ملّا رموزی تو زیادہ مسرور نہیں ہو سکتا، یقین نہ ہو تو کلکتہ کا اخبار "مسلم گزٹ" مورخہ ۶ر جنوری ۳۶ء ملاحظہ فرمایئے جس نے اسی نام سے صدر اور جلسہ کی روداد شائع کی ہے، اسی طرح خود اس مجلس کا نام "اُردو لٹریری کانفرنس" تھا۔

پھر بھی اس مجلس کے کارکنوں کا خلوص اور عمل لائق احترام اور اُن کی عذرات لائق امداد و تحسین ہیں خدا کرے کلکتہ والے اس تحریک کو کامیابی کی حد تک پہنچانے سے پہلے آرام نہ لیں۔

〰〰〰〰〰

اُردو کے متعلق اب تک تو گویا چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں، لیکن اب دو بڑی باتیں بھی سن لیجے جن میں سے ایک ہے گاندھی جی کے منہ کی اور دوسری ہے بابو راجندر پرشاد صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس کے منہ کی۔

چنانچہ اخبار "مدینہ بجنور" مورخہ ۱ر دسمبر ۳۵ء کے صفحہ ۹ پر ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا ایک حصہ یہ ہے کہ

"گاندھی جی خلافت اور سوراج کی تحریک کے دنوں میں آپ
اُردو کے بجائے "ہندوستانی" کا لفظ استعمال کرتے رہے،
اگرچہ یہ لفظ بھی مسلمانوں کو ناگوار تھا تاہم اس میں تلخی کم تھی، مگر
اب اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ آپ نے کھلم کھلا
مدراس کے دورہ میں ہندی کانفرنس کی صدارت کرتے
ہوئے اردو کی مخالفت کی وغیرہ"

لیجے یہ گاندھی جی پر اعتراض نہیں بلکہ اہم ذمہ داری ہے، جس کا جواب وہی جناب مولانا جوشؔ ملیح آبادی، جب تک کہ وہ رسالہ "کلیم" کو اُردو میں چھاپ رہے ہیں۔ کہ اس موقع پر گاندھی جی سے کیا سوال کریں؟۔

〰〰〰〰〰

اب رہے گاندھی جی کے برابر کے راجندر بابو صاحب، سو موصوف کے لئے ۲۵ر اکتوبر ۳۵ء کے اخبار "ملت دہلی" کے صفحہ ۳ پر لٹھ کے برابر موٹے قلم سے لکھا ہوا ہے کہ آپ نے پتر و پور اور دھارا پورم کی بلدیہ اور اس کے ارکان کے سپاس نامہ کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ

"بلدیہ ضلع، اور دوسرے قومی اداروں سے مدارس وغیرہ میں ہندی زبان کی ترویج کی درخواست کرتا ہوں"

یہ ہندوستانی قومیت کے دو سب بڑے بزرگ ہیں، اور اُردو کے خلاف اُن کے یہ خیالات مع حوالوں کے حاضر ہیں، اب ناظرین جو حکم دیں وہ لکھوں؟

〰〰〰〰〰

اب آیئے اور ذرا صوبجات متوسط میں اُردو کی کس مپرسی بھی معلوم فرمایئے، چنانچہ صحیح ہے کہ ان علاقوں میں اکثر مقامات کی پیدائشی زبان اردو نہیں ہے، پھر بھی ان علاقوں میں اُردو خاصی بولی اور سمجھی جاتی ہے، مگر اس طرف اُردو سے جو بے اعتنائی ذمہ دار افراد کی جانب سے نظر آتی ہے اُس کی افسوسناک تفصیلات کے لئے ناگپور کا ایک چھوٹا سا اخبار ملاحظہ فرمایئے جو "امید" نام سے ناگپور سے ہفتہ وار شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار نے زبانِ اُردو کی حفاظت، حمایت، اصلاح ترقی، ترویج اور تشویق کے لئے جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا ہے نہ آپ کے اورنگ آباد کے "اُردو" نام کے رسالے نے لکھا ہوگا نہ اُردو کے کسی اخبار نے، لیکن اہم سوال ہے اُردو والوں کی تحریکات اور اُن کی ہر جگہ ناکامی کا، سو اس کا سبب ایک اور صرف ایک ہے، وہ یہ کہ اصلاح و ترقی کی ہر تڑپ اور ہر کوشش کا احساس پیدا ہوتا ہے، غریبوں میں اور غریبوں کے پاس روپیہ نہیں اس لئے زبانِ اردو کی نہیں بلکہ مسلمانوں کی ہر تحریک ناکام رہتی ہے، اور مسلمان دولت مندوں کے ہاں صرف ایک ہی احساس ہے، اور وہ صرف اُن کے ذاتی عیش اور نمود و نمائش کا سو بدقسمتی سے نمود و نمائش بھی وطنی تحریکات کے ذریعے نہیں، بلکہ یورپی لغویات اور یورپی تحریکات کے ذریعے، اس لئے جب تک مسلمان دولت مندوں کو قومیات پر خرچ کرنے پر آمادہ نہ کیا جائے گا اُس وقت تک نہ زبانِ اردو کی کوئی تحریک کامیاب ہوگی، نہ ملا رموزی کی دوسری شادی ہوگی، کیونکہ دولت مندوں میں خصوصیت سے وطنی علوم اور وطنی زبان سے اس لئے کوئی دلچسپی اور ہمدردی نہیں کہ وہ خود نہ اردو میں صحیح خط لکھ سکتے نہ رسالہ "کلیم" کی تحریریں صحیح پڑھ سکتے۔ اس لئے وہ حضرتِ جوشؔ کی نظموں کے لئے کیا خرچ کریں، اور حضرتِ ملا رموزی کی غزلوں کو کیا خاک سمجھیں؟

باقی سب خیریت ہے، خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام

〰〰〰〰〰

چلتے چلتے اتنی اور سن لیجے کہ جس پنجاب کی شہرت ہے کہ اُس نے اردو کو موت کے منہ سے بچا لیا، اُسی پنجاب میں اللہ میاں کے ایسے بندے بھی موجود ہیں جن کے لئے روزانہ اخبار "حریت" لاہور مورخہ ۱۴ر فروری ۳۶ء کے صفحہ ۶ پر

لکھا ہے کہ :-

"۴ فروری کے اخبار "انقلاب لاہور" کے پہلے صفحہ پر پنجاب یونیورسٹی کی ایک ہنگامہ خیز اجلاس کی اطلاع دی گئی ہے کہ یونیورسٹی میں اس امر پر بحث ہوتی رہی کہ انٹرنس تک کس زبان میں تعلیم دی جائے، اس پر مسلمانوں نے اُردو، ہندوؤں نے ہندی، اور سکھوں نے گورمکھی، کی حمایت کی، اس پر یونیورسٹی نے اس گتھی کو سلجھانے کا یہ طریقہ سوچا کہ صوبہ کی زبان ہے پنجابی، اس میں تعلیم بھی پنجابی میں ہو، لیکن لکھی جائے رومن میں :

غلام ہونے پر بھی زندگی کے ہر معاملہ کو یورپ ایسی بلند اقوام کے معیار پر لانے کے لئے جو ہندوستانی دماغ مشتعل رہا کرتے ہیں، ایسی حرکات اُنہی سے سرزد ہوتی ہیں، ممکن ہے کہ رسم الخط کا معاملہ غلامی کے معاملہ سے پہلے ہی طے ہو جائے۔ لیکن پورے ہندوستان کو یورپ کی ہر ترقی کے برابر لے آنے سے پہلے کم سے کم اُردو والے یہ تو برداشت نہیں کر سکیں گے کہ رومن میں وہ "عورت" ایسے لطیف و حسین وجود کو "اورت" بڑی ٹوے سے لکھیں :"

عِشق !

محبّت کے طوفانی سمندر کی سب سے اونچی موج، سوز و گداز کی نَے کا سب سے بلند نغمہ، خارستانِ اضطراب و کشمکش کا سب سے بڑا کانٹا، چھالوں کی تپک کا جوہر، سوز و گداز کی رُوح، سوزش و شورش کا ست۔

جنون کے ارگن کا گرجتا ہوا نالہ، زہرِ ہلاہل کا چھلکتا ہوا پیالہ۔

تکلیف میں جہنّم کے ساتویں طبقہ کا "صدر آتش دان"

راحت میں فردوسِ بریں کا بہترین چشمہ۔

کتابِ فنا کا پہلا ورق، دفترِ حیاتِ ابدی کا آخری باب۔

خودداریاں سلب کرنے والا آلہ، نظامِ ہستی بدل دینے والا انقلاب، پہاڑ اُڑا دینے والی بارود، دل و دماغ کو تلاطم میں لانے والا زلزلہ، فراغت کی عظمتِ خاک کو اُڑا دینے والی آندھی، دنیائے عافیت کی وبا، صحرائے امن کا رہزن۔ بحرِ غم کا سفید طوفانی کف، محشرستانِ آرزو کا شاہدِ حقیقی، دنیائے تمنّا کا فرمانروا، آسمانوں پر چڑھا دینے والا زینہ۔ قبروں میں اُتار دینے والا رعشہ، استقلال کا حاکم۔ دربارِ حُسن کا گدا۔

دل کا غنی، بات کا دھنی، قول کا پورا، دُھن کا پکّا، ارادوں کا مضبوط، ———

روحانی اثرات کی بہترین تشریح، حُسن کے سوال کا پورا پورا جواب ——— "

"انتخاب از روحِ ادب"

ترے بغیر

جلد آ، کہ زندگی ہے پریشاں ترے بغیر
اب زہر ہے یہ چشمۂ حیواں ترے بغیر

مضطر ہے روحِ لالہ و نسریں ترے لئے
برہم ہے زلفِ سنبل و ریحاں ترے بغیر

جس کا ہر ایک نغمہ تھا، گلبانگِ صد نشاط
شیون ہے اب، وہ لحنِ ہزاراں ترے بغیر

چھلتی ہے نبضِ سیرِ چمن تیری یاد میں
ڈستا ہے ابرِ کوہ و بیاباں ترے بغیر

پھیکا ہے رنگِ لالہ و گل تیرے ہجر میں
گونگے ہیں، طائرانِ خوش الحاں ترے بغیر

دامن ہے پارہ پارہ، نہ ڈھوئیں چمن چمن!
کیا کیا بہار سے ہوں پشیماں ترے بغیر

جلد آ، کہ شوقِ دید میں لیلائے زندگی
بھولی ہوئی ہے جنبشِ مژگاں ترے بغیر

اے فتنۂ زمانہ و آشوبِ روزگار
سونی پڑی ہے انجمنِ جاں ترے بغیر

لرزاں تھی، جس کے پنجۂ وحشت سے کائنات
اب وہ جنوں ہے سر بہ گریباں ترے بغیر

اک اشکِ خوں ہے تیری جدائی میں نجمِ صبح
اک شامِ غم ہے صبحِ بہاراں ترے بغیر

اک زخمِ دشنہ ہے تری فرقت میں بوئے گل
اک داغِ تازہ ہے مہِ تاباں ترے بغیر

اے پیکرِ شگفتگی، اے بنتِ ابر و باد
کیوں کر کٹے گا موسمِ باراں ترے بغیر

جوش ملیح آبادی

مولانا راشد الخیری مرحوم

ماہِ گذشتہ میں علامہ راشد الخیری کا انتقال پُرملال دہلی کا ایک افسوسناک سانحہ ہے، مرحوم مشہور ادیب تھے، تحریکِ آزادیٔ نسواں کے علم بردار تھے۔ دہلی کے ایک قدیم خاندان کی یادگار تھے۔ مرحوم اُن لوگوں میں سے تھے جنھوں نے سرسید علیہ الرحمۃ، مولوی ڈپٹی نذیر احمد، مولوی حالی، اور مولوی منشی ذکاء اللہ سے حضرات کی صحبتیں اُٹھائیں۔ اور اُن سے استفادہ کیا۔ چنانچہ ان سب حضرات کا رنگ مرحوم کی تحریر، تقریر، اور چال ڈھال تک میں نمایاں نظر آتا تھا،

مرحوم ہندوستان کے اُن چند مایۂ ناز دردمند مردوں میں سے تھے جو رسم و رواج میں گرفتار، جہالت اور مرد کی غلامی کی آغوش میں بھنچی ہوئی اپنے آقا کی جابرانہ ٹھوکروں میں ٹھکرائی ہوئی، مظلوم ہندوستانی عورت کا درد رکھتے ہیں، مولانا راشد نے جو کچھ لکھا اس جنسِ لطیف کے لئے لکھا، اور جو کچھ کیا اس قابلِ رحم مخلوق کے لئے کیا۔

رونے روئے تو اس کے لئے، اور ہمت افزا گیت گائے تو اس کی خاطر، عورتوں کے مظلومانہ جذبات اور حسیات کے اظہار کے لئے زبان میں نسائیت پیدا کی، اور ان کی جہالت پر ماتم کرنے کے لئے۔ کوسنے، روجھنے سیکھے اور ٹونے ٹوٹکے سیکھے، اور وہ سب کچھ کیا جس کے کرنے کی اُن کی عقلِ سلیم نے رہنمائی کی۔

متعدد ادبی رسالے مرحوم نے نکالے، جس میں عصمت سب سے کامیاب زنانہ ماہنامہ ہے۔ لاتعداد کتابیں چھوٹی بڑی لکھیں، لوگ انھیں مصوّرِ غم کے خطاب سے موسوم کرتے تھے، اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے رزم و بزم کا مرانی و عشرت پر کبھی کچھ قابلِ ذکر طور پر نہیں لکھا۔ وہ الم نگار تھے، اگرچہ لوگ اُن کی زندگی میں اس طرزِ نگارش کا مضحکہ اُڑاتے تھے کہ "جب دیکھو پھوڑ لگائیوں کی طرح ٹسوے بہا رہے ہیں"۔ یہ اعتراض مرحوم کے جذبات کی ہمارے نزدیک ناوانستہ تائش ہے۔

جو شخص ساری عمر صرف عورتوں کے متعلق سوچتا اور غور کرتا رہا ہو اُن کے درد دکھ کی دوا کا جویا رہا ہو، اُن کے جاہلانہ عادات و اطوار کے لئے نسخے تیار کرتا رہا ہو، جس نے عورت کو سمجھنے کے لئے اس کے دل میں گھسنے کی کوشش کی ہو، اگر وہ عورتوں کی طرح ٹسوے بہانے لگے تو کیا عجب ہے۔ ہندوستانی عورت کا گھر وہ گھر ہے جس میں صرف اُس کے خاوند، باپ، بھائی یا بیٹے کے سوائے کوئی غیر داخل نہیں ہوسکتا۔ مولانائے مرحوم بھلا کس کس کے باپ، بھائی اور بیٹے یا خاوند بنتے، اُن کی کامیابی کا راز یہی تھا جس پر لوگ معترض تھے۔ شکل دیکھو تو ایک ضعیف سفید ڈاڑھی کے مولانا، اور اگر نہ دیکھو اور صرف اُن کی تصنیفات پڑھو تو کسی گھر کی بھیدی عورت کی قلم کاری معلوم ہوتی ہے۔

بلاشبہ مولانا راشد الخیری اپنے وقت کے بہت بڑے خادم تھے جس جنس کی اصلاح کا اُنھوں نے بیڑا اٹھایا، اور جس کی فوز و فلاح کی دُھن میں اُنھوں نے اپنی عمر کا معتد بہ حصہ صرف کیا، اس کی عدمِ اصلاح ہندوستانی زندگی کی راہِ ترقی میں عظیم ترین رکاوٹ ہے۔ اور اس کے لئے اگر سیکڑوں راشد الخیری بھی اپنی جانیں گنوا دیں تو کم ہے۔

ہمیں مرحوم کے پسماندگان سے جن میں اُن کی ادبی اولاد اور اصلاحی تحریکات بھی شامل ہیں۔ صدقِ دل سے ہمدردی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اس سانحہ پر ہمدردی ہمیں ہندوستانی عورت سے ہے۔ کہ جس کا ایک بڑا دردمند آج نہیں ہے۔

"ت م"

آخری ملاقات

سید مطلبی فریدآبادی

آسمان پر کچھ تارے، سورج کی آمد کے خوف سے سسکیاں لے رہے تھے، اور کچھ اُس حسرت دار، ماں بھرے بدنصیب مسافر کے مستقبل کو دیکھ کر سہم رہے تھے جو سطح زمین پر ٹھیک اُن کے نیچے، بندوق بغل میں دبائے، ننگے سر، پورے انہماک و مدہوشی سے اسی سمت قدم اُٹھائے جا رہا تھا جس طرف سے وہ آدھی رات سے برابر چل کر آئے تھے۔

〰〰〰〰〰

مغرب سے مشرق کو چلنے والی ہوا کے تند فراٹے، آہوں میں تبدیل ہو کر رہ گئے ——— کیا وہ ہوا اس سترہ سال کے ہم سفر کی آنے والی گھڑیوں سے متاثر تھی، جو ایک سحور کی طرح اُس کے متحرک آغوش میں گھنٹوں سے سرگرم سفر تھا

——— !

〰〰〰〰〰

پو پھٹی۔ سپیدۂ صبح بڑھتے بڑھتے صبح بن گیا۔ مشرقی تاجدار کی جلوہ فروزی کا احساس سب سے پہلے ببول کی کٹی ہوئی پتیوں سے جو کھلنی شروع ہو گئی تھیں ہوا ——— پھر الگن اور فاختہ کی بولیوں سے ——— پھر ہرنوں کے چوکنے پن سے، جو بستیوں کی طرف سے واپس ہونے والے درندوں کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے، اور اُٹھے ہوئے کانوں، اور بڑی بڑی پریشان آنکھوں سے اُن کو دیکھنے لگے تھے ——— مدہوش مسافر ابھی تک چلا جا رہا تھا ——— اور اُسی انہماک سے چلا جا رہا تھا۔

〰〰〰〰〰

کائنات کا ذرہ ذرہ بیدار ہونے لگا تھا ——— مگر وہ اسی انہماک سے چلا جا رہا تھا ——— خاموش، مدہوش ———

〰〰〰〰〰

سرد پانی سے نکل کر ٹھٹھرے ہوئے آدمی کی طرح، خورشید افقِ مشرق کو چومتا ہوا، سبز کاہی رنگ کے درختوں میں سے جھانک رہا تھا ——— کس کو؟ ——— خیالات میں مستغرق، غلطاں و پیچاں نوجوان مسافر کو، جس کی آنکھیں اس منظر سے قطعاً بے خبر شمال مغرب کے ایک گاؤں پر جمی ہوئی تھیں جن پر ہلکا ہلکا دھواں ایک دریدہ اور باریک برقعہ کی طرح لپٹا ہوا نظر آتا تھا۔

〰〰〰〰〰

سامنے جمنا بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی، مسافر کی نظریں، اس راستے پر جمی ہوئی تھیں، جو گاؤں سے جمنا کے کچے گھاٹ کو آ رہا تھا ——— رنگ برنگ کی اوڑھنیوں میں لپٹی ہوئی عورتیں سروں پر مٹکے، ٹھلیاں اُٹھائے گاؤں سے آ رہی تھیں۔

〰〰〰〰〰

مدہوش نوجوان اب مدہوش نہ تھا، اُس کی متجسس نگاہ کسی کی تلاش میں تھی۔ ——— وہ برابر گھاٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ خوش گلو عورتوں کی سُریلی آوازیں اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

"جل کیسے بھروں جمنا گہری"

یہ میٹھے سُر نوجوان کے کانوں میں جذب ہو رہے تھے ——— مگر وہ حسرت، حزن و ملال، اور مایوسی مجسم بنا ہوا گھاٹ پر کھڑا تھا۔ نہ اُس جمنا کو دیکھتا تھا جس میں سورج کی سنہری کرنیں لہروں کے کندھوں پر سوار اُن کے نشیب و فراز سے

کھیل رہی تھیں نہ وہ گھاٹ پر نظر ڈالتا تھا جہاں پانی کے متحرک آئینے میں حسن و جمال خود آرائی کر رہے تھے۔

البیلی شوخ دوشیزہ لڑکیاں چہلیں کرتے کرتے یک لخت رُک گئیں، جیسے تیتریوں کے مست جوڑے ذرا سی آہٹ پر نامیں اڑاتے ہوئے رُک جاتے ہیں —————— پھر کچھ کانا پھوسی ہوئی۔

ایک بولی، آری چلو! کوئی سپاہی ہے چلو! جلدی چلو!! نوجواں گنے درختوں میں گھرے ہوئے گاؤں کو غور سے دیکھ رہا تھا، سراپا انتظار بنا ہوا، کیا وہ کسی کا منتظر تھا؟

گاؤں سے کوئی نہ آیا۔ بند دیتی نوجوان کی موجودگی سے گھبرائی ہوئی اور سہمی ہوئی دوشیزہ لڑکیاں برابر سے گزر رہی تھیں، اتنی ڈری ہوئی کہ قدم ڈگمگا رہے تھے اور ٹھلیوں سے پانی چھلک چھلک کر گر پڑتا تھا۔

نوجوان ابھی تک گاؤں سے آنے والے راستے پر نگاہ جمائے کھڑا تھا —————— بُت کی طرح —————— گھاٹ نے ایک لمبا، مایوسی سے بھرا ہوا سانس اپنی خاموش فضا میں محسوس کیا۔

کئی گھنٹے گزر گئے اور وہ گاؤں کی طرف ہی دیکھتا رہا ——————

کیا وہ دیکھ ہی سکتا تھا؟ —————— رسیلی اور بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے —————— اُس کی پشت جمنا کی طرف اور منہ گاؤں کی طرف تھا۔

آفتاب نصف النہار پر تکن اپنے جھلس دینے والے تاروں سے نظر سے اس مدہوش انسانی پیکر کا مطالعہ کر رہا تھا جو تھک کر گھاٹ کے قریب ایک ببول کے درخت سے کمر لگائے بیٹھا تھا —————— اسی ببول سے بندوق بھی لگی کھڑی تھی، اس کی نگاہیں گاؤں کے راستے کی فضا کو چیرتی ہوئی کسی کی تلاش میں گاؤں کے اندر گھسنے کی کوشش کر رہی تھیں —————— اپنے ناقابل شکست انہاک سے گاؤں کے اندر۔

——————————

——————— !

وہ یکایک چونکا —————— — — —————— آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ملا، پھر شبہ دور کرنے کے لئے گاؤں کی طرف دیکھا —————— ہم آواز حسرت نہ وہ مسکراہٹ کے ساتھ —————— سفید چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت پیتل کی گاگر ہاتھ میں لٹکائے اس کی طرف بڑھتی آرہی تھی —————— مسافر نے رومال جیب سے نکال کر آنکھوں کو صاف کیا، شبہات مٹ گئے، وہ لرزتی ہوئی ٹانگوں سے کھڑا ہوگیا۔ بندوق اُس کی پنڈلی سے ٹکرائی اور گر پڑی —————— وہ آگے بڑھا —————— پھر رُک گیا —————— گھبراہٹ، خوف، آنے والے واقعات کا خوف —————— وہ کانپ رہا تھا۔

سفید چادر میں لپٹی ہوئی حسینہ اُس کے سامنے تھی، شباب کی سُرخی لئے ہوئے گندم گوں چہرہ کھلا ہوا تھا، جیسے برف کی تہوں میں سے صبح کا سورج جھانک رہا ہو، ایسی نازک جیسے گلِ نوخیز کی پنکھڑی —————— نوجوان کی نگاہ زمین کی طرف تھی —————— اور حسینہ کی نگاہ نوجوان کے چہرہ کی جانب ——————

——————— !

ہوا خاموش ہوگئی کہ اُن کی غمناک گفتگو میں مخل نہ ہو —————— ببول ساکت تھا۔ انجام عشق کا دردناک منظر دیکھنے کے لئے —————— گھاٹ گوش برآواز تھا کہ آج پھر کچھ ہونے والا ہے —————— مگر وہ ہنس کے جوڑے کی طرح دونوں خاموش پاس پاس کھڑے تھے۔

آخر —————— آخر —————— !

ہوا بیچینی سے سرسرائی ——————

ببول اس سریلی آواز پر جھوما ——————

گھاٹ پر جمنا کی لہریں مچل مچل کر چڑھنے لگیں ——————

نوجوان کی نظریں نیچے، کسی کے قدموں پر ——————

پھر وہی سکون ——————

یہاں آئے ہو مجھے بدنام کرنے —— جب میرے ماں باپ گذر گئے
ہو گئے تو یہ تو پھر سسرال ہے —— یہاں کیوں آئے ہو اختر——"

پھر وہی سکوت طاری ہو گیا۔

نوجوان کی آنکھیں آنسو برسانے کی طیاریاں کر رہی تھیں۔

"خدا کے واسطے جاؤ اختر پھر نہ آنا، جب میکے جایا کروں تب اور بات ہے۔ مگر
مگر تم نے آج تک بات تو کی نہیں کبھی ——"

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

آخر نوجوان نے طلسم خاموشی توڑ دیا

"اب میں کبھی نہ ملوں گا —— زہرہ، تجھ پر کوئی شبہ نہ آئے
گا، نہ یہاں نہ وہاں،

کبھی بھی نہیں —— میں —— میں ——

نوجوان سلسلۂ کلام جاری نہ رکھ سکا۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

"کہیں جاؤ گے کیا؟ —— کہاں؟ —— کیوں؟

"دُور —— بہت دور!"

"کتنی دُور؟ —— کس جگہ؟"

"بہت دُور زہرہ، بہت دُور!" جہاں سے کوئی لوٹا نہیں کرتا ——

—— کوئی بھی نہیں"

"کیوں؟ آخر کیوں؟"

"تو بدنام ہوتی ہے زہرہ، میں نے آج تک کبھی تجھ سے بات کرنے کی جرأت
نہیں کی —— اور اگر کی بھی تو ڈر کر، شرما کر، ہمت نے جواب دیدیا۔
—— کبھی بات نہ کی —— کبھی بھی نہیں ——
پھر بھی لوگ شبہ کرتے ہیں، جب تیرے سامنے آیا، ہمت، ارادے، جرأت، سب
شش ہو کر رہ گئے —— پھر بھی لوگ شبہ کرتے ہیں ——
مگر آج! آہ آج!! میری زندگی کی صرف ایک آرزو —— وہ آج
پوری ہو گئی —— سب سے بڑی آرزو! بس اب جا، جا۔ یہاں بھی
کوئی شبہ نہ کرنے لگے۔ تو بدنام نہ ہو جائے کہیں"

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

"جاتی ہوں، اختر جاتی ہوں۔ جب گھر آؤں تو ضرور آنا، ضرور! اب تو
بات کر لے رہاں!! مجھے ایک بات پوچھنی ہے، وہاں ہی پوچھوں گی!

"اس دنیا میں! اس دنیا میں، اب ہم نہ ملیں گے، یہ ——
یہ —— آہ! یہ آخری ملاقات ہے اور آخری بات چیت!!"

"ہیں! کیا کہا!! آخری ملاقات! آخری بات چیت!! اب نہ ملیں گے!
ہیں یہ کیا! —— کیوں؟ - کہو! کہو!! بولو!!!"

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں اوپر اٹھیں۔ شاید آخری دفعہ حسینہ کا
جمال آرا چہرہ دیکھنے کے لئے۔

"تجھ سے میں نے بات کر لی —— زہرہ میرے کانوں نے
تیرے الفاظ سن لئے —— زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری
ہو گئی —— تیری شادی کے بعد، اب کونسی آرزو ہو سکتی ہے جس کے
لئے میں زندہ رہوں؟ ہاں! کیوں! ٹھیک ہے نا؟"

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

ہوا تھرا گئی، ببول کی پتیاں کانپنے لگیں، دریا ٹھنڈے سانس بھرنے
لگا، بادل کے چھوٹے سے غلیظ ٹکڑے سے سورج نے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔
غریب حسینہ کی آنکھیں استعجاب سے باہر اُبلنے لگیں، اُس کا سانس زور
زور سے چلنے لگا۔

پھر خاموشی، سکون، حیرت —— غم انگیز حیرت
——

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

"جو بات گھر پر جا کر پوچھنا چاہتی تھی وہ اب پوچھ، بول! بول!!"
ٹھنڈا سانس گلاب کی پتیوں کے سے نازک ہونٹوں کو مس کرتا ہوا نکلا۔
"اب کیا پوچھوں —— تم نے بے پوچھے بتا دیا، مگر ——"
"بول، کچھ بول، پھر یہ آواز شاید میری بھٹکتی ہوئی روح ہی یہاں آکر
سُن سکے۔ بول میں جواب دونگا۔ ہمیشہ کے برعکس میں آج دلیر ہوں، میری وہ آرزو
آج پوری ہوئی ہے جس کو میرے خواب تک نہ پوری کر سکے۔ مگر آج! آہ آج وہ
پوری ہو ہی گئی!"
حسینہ کا چاند سا چمکتا ہوا چہرہ زرد چنبیلی کے پھول کے ہم رنگ ہو چکا تھا۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

دیر تک سکوت رہا۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

اچھا الوداع۔

مردانہ عزم سے بھرّائی ہوئی آواز، گراں گوش گھاٹ نے سُنی۔

"نہیں، نہیں، ٹھہرو، ٹھہرو، تم کہاں جاؤ گے؟ خیر، اچھا کہیں بھی—— جہاں بھی—— میں ساتھ ہوں، چلو—— چلو——"

وہ اُس کی طرف بڑھی، لگا کر نیچے گر پڑی، بغیر ارادے کے، جس طرح پانی کے کٹاؤ سے جمنا کے کنارے پانی میں پھسل پڑتے ہیں۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

"نہیں نہیں، ابھی نہیں، زہرہ کیا میرے کہے بغیر؟——"

"تمہارے بے بغیر؟—— نہیں—— تمہارے کہے بغیر—— نہیں"

"بس ٹھیک ہے معصوم فرشتے، بالکل ٹھیک ہے، ایک دن میں خود آؤں گا، تیرے لینے کے لئے، میری معصوم زہرہ"

"کب؟ کس دن؟"

"جس دن اندھیاؤ کا جھکّڑ چل رہا ہو گا، ایسا اندھیاؤ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے گا۔ ایسا تند جھکّڑ کہ جو آدمیوں کو اُڑانے کے لئے دھکّے دے گا۔ زلزلہ آئے گا، اور ایسا سخت کہ جمنا کا پانی جگہ کو چھوڑ کر پہاڑوں پر چڑھ جائے گا۔ —— پیاری؛ معصوم فرشتوں سے زیادہ پاک، زہرہ، میں آؤں گا اُس دن تجھے لینے، سُنا تو نے؟"

"ہاں سنا"

"تو طیار ہو گی۔۔؟"

"ہاں اختر بالکل طیار، میں اسی وقت سے اُس گھڑی کا انتظار کروں گی"

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

عدم کے مسافر کا ہاتھ بے اختیار کانپتا ہوا بلند ہوا اور آہستہ آہستہ لرزتی ہوئی، کانپتی ہوئی، معصوم حسینہ کے گرد حمایل ہو گیا——
حسینہ کی معصوم آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو گئیں۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

زمین و آسمان کانپ کر رہ گئے، ببول کی پتیاں سمٹ گئیں، اور تیز تیز کانٹے کھڑے ہو گئے، جمنا کا پانی گہرے سانس کی طرح اندر کی طرف سمٹ گیا۔ گھاٹ کے جبڑے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ تمام کائنات کے محسوسات سُن ہو گئے ایک سناٹا چھا گیا۔ مکمل سناٹا——

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

تھوڑی دیر کے بعد حسینہ نے آنکھیں کھولیں —— مگر آہ! وہ جا چکا تھا،

کہاں؟

کسی نامعلوم جگہ

غریب حسینہ کی مایوس نظر نے چاروں طرف اُسے تلاش کیا، مگر لا حاصل —— وہ آہستہ آہستہ گاؤں کی طرف چل دی۔

پیتل کی گاگر اور آہنی، سخت دل بندوق اس آخری ملاقات کی یادگار پر نوحہ خوانی کرنے کے لئے رہ گئے تھے۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

حسینہ ہر آندھی اور جھکّڑ چلنے پر انتظار کرتی ہے کہ وہ آئے گا، مگر زلزلہ نہیں آتا، اس لئے وہ نہ آتا ہو گا——

زمین کا پتّہ ہلا دینے والے زلزلے آئے، مگر جھکّڑ اور اندھیاؤ اِن دِنوں میں نہ تھا، شاید اسی واسطے وہ نہ آیا——

جھکّڑ بھی چلا اور اندھیاؤ بھی سخت تاریک، زلزلہ بھی سخت طوفناک آیا، مگر بے رحم جمنا کا پانی اپنی جگہ سے نہ ہلا، اس لئے وہ بھی نہیں آیا——

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

"شاید وہ یوں ہی گھاٹ پر گشت کرتا ہوا نکل آئے"

وہ گھاٹ پر جاتی ہے، ببول کے درخت سے کمر لگا کر گھنٹوں اس کا انتظار کرتی ہے، مگر پھر مایوس ہو کر گاؤں کو لَوٹ جاتی ہے۔ ایک ناقابلِ فراموش دن کی یاد، اور ایک پُر حسرت، آنے والے دن کی آرزو، اپنے دل میں چھپائے ہوئے——

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

وہ پھر گھاٹ پر آتی ہے، مگر بے سود؛ صرف ایک غم سے بھرے ہوئے دن کی یاد ببول کو مزید دلا جاتی ہے——

ہاں وہ آتی ہے، مگر بے حس گھاٹ کا دل دکھانے کے لئے——

وہ آتی اور چلی جاتی ہے، لیکن جمنا کو گھنٹوں کے لیے سامانِ ملال و غم بخش جاتی ہے، جو اوّل اوّل شدتِ غم سے بے تاب ہو کر کناروں سے ٹکریں مارتی ہے۔ سارے دن میں یہ شدت آہستہ آہستہ کم ہوتی ہے، پھر بھی رات گئے تک سسکیاں، سسکیاں اس میں بلند ہوتی رہتی ہیں۔

جمنا اپنا آغوش کھولے طیار ہے کہ وہ آئے، تب وہ اپنے سینے کی گہرائیوں میں غرق کر دے، اور اس کے ساتھ اس دردناک دن کی یاد بھی غرق ہو جائے، مگر ایسا نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ ایک "پُرمسرت دن" کی منتظر ہے ——

~~~~~~~~~~~~

آہ معصوم حسینہ!!

~~~~~~~~~~~~

حُسن

یہ کائنات مرا اک تبسمِ رنگیں — بہارِ خلد مری اک نگاہِ فردوسیں

ہے نور ریز فضائے جہاں مرے دم سے — ہیں جلوہ خیز زمین و زماں مرے دم سے

گھٹا؟ نہیں، یہ مرے گیسوؤں کا پرتو ہے — ہوا؟ نہیں مرے جذبات کی تگ و دو ہے

جمالِ گُل؟ نہیں بے وجہ ہنس پڑا ہوں میں — نسیمِ صبح؟ نہیں، سانس لے رہا ہوں میں

ہے میرا خندۂ بیباک شورِ بلبل کا — ہے میرا دامنِ صد چاک، پیرہن گُل کا

مری تجلّیٔ زیبا ہیں چاند کی کرنیں — مری حیات کی اجزا ہیں چاند کی کرنیں

مری نگاہ کی تابانیوں کا مظہر ہے — جو نُورِ سینۂ سینا میں جلوہ گستر ہے

یہ عشق تو ہے اک احساسِ بیخودانہ مرا — یہ زندگی تو ہے اک جذبِ والہانہ مرا

ہر ایک چیز ہے ظلمت نصیب میرے بغیر — جہاں ہے ایک طلسمِ مہیب میرے بغیر

ظہورِ کون و مکاں کا سبب فقط میں ہوں
نظامِ سلسلۂ روز و شب فقط میں ہوں

مجید امجد
(جھنگ)

انشائے لطیف پر ایک نظر

(۲)

اثر لکھنوی

فسانہ "میں ہوں اپنی شکست کی آواز"

لطیف صاحب نے یہ فسانہ ہوبہو اسی انداز میں لکھا ہے جو حقیقت نگار جماعت (REALIST SCHOOL) کی ایک نمایاں فرد ہے۔ اس جماعت کا خیال ہے کہ فسانہ نویسی میں اخلاقی پہلو سے قطعی بیگانہ ہو کر فطرت کے تابع مسائل نفسیات خصوصاً تحریکاتِ جنسی کو من و عن بیان کر دینا چاہیئے۔ میں اسی معیار کو پیش نظر رکھ کر اس افسانے پر تنقید کروں گا۔

نوشابہ فلسفے کے ایک پروفیسر کی لڑکی ہے۔ بہت کم سن تھی کہ ماں کا انتقال ہو گیا۔ باپ نے اُس کی پرورش بالکل فطرت کے مطابق کی "نہ کبھی کوئی حکم دیا، نہ کبھی کوئی نصیحت کی، اور نہ کبھی کسی بات پر جھڑکا۔" آزاد پھرتی، گاتی اور چشمے کے پانی میں گھنٹوں تیرا کرتی" جوان ہونے پر ایسی لڑکی کے جذبات، ولولے، اور جنسی خواہشات کیا ہوں گی۔ کہاں تک اُن پر قابو رہے گا۔ کس طرح اُن کا ظہور ہو گا؟ فسانے میں انہی امور سے بحث کی گئی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ماحول، تعلیم و تربیت، صحت، اور دیگر واقعات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو افعال اُس سے سرزد ہوئے فطرت کے مطابق تھے یا خلاف۔

سولہ برس کی عمر میں ایک صبح آئینے کے سامنے یہ لڑکی محسوس کرتی ہے کہ جوانی اپنی تمام رعنائیاں، رنگینیاں، امنگیں، اسرار اور الجھنیں لئے ہوئے اُس پر چھا گئی ہے۔ لطیف صاحب کے الفاظ ہیں:۔

"عالم طفلی کی پُرسکون سطح سے ایک ہستی واقعی اُسی طرح طلوع کرتی ہے جس طرح سطح بحر سے چاند، اور وہ ہستی اسی لئے طلوع ہوتی ہے کہ آفتاب کی شعاعوں سے تپش حاصل کرے، ہواؤں کی چھیڑ میں لذت پائے، ایک وسیع البسط دنیا کا وجود اُس پر منکشف ہو جائے اور پھر مسحور تماشا آنکھوں کے سامنے وہ سر عظیم و عجیب جسے حیات کہتے ہیں بے نقاب ہو جائے۔ اس کے بعد "سب میرے لئے ہے" "سب میرا ہے" کا ترانہ، ساز دل سے اس کی سانسوں کی شکل میں نکلے گا"

اس لڑکی کی دنیا کو ہسار و مرغزار سے قطع نظر جنسی اعتبار سے اس کے باپ تک محدود تھی۔ خیالی و جذباتی فسانہ نگاری اس اصول پر کہ "ایسا ہونا چاہیئے" اس کی حیات کو کامیاب، پُر عشرت اور مسلسل تر از مسرت بنانے کے لئے ایک مضبوط خوش رو خوش گشتہ مرد کو جس کی عمر اس سے دو چار برس زیادہ ہوتی، جو صورت میں یوسف تو سیرت میں فرشتہ ہوتا، اس کے مقابل پیش کر دیتی۔ لیکن حقیقت نگاری جو "کیا ہونا چاہیئے" کے بجائے "کیا ہوتا ہے" دکھانا چاہتی ہے ایسا شخص تجویز کرتی ہے (پروفیسر کے فلسفی سکرٹری کی صورت میں) جو رعنائیت سے کوسوں دور ہے۔ اس کا حلیہ ملاحظہ ہو:۔

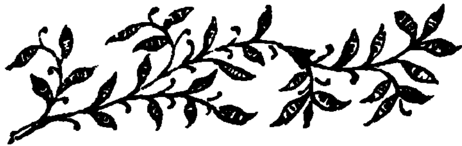
"وہ چنداں دل کش بھی نہ تھا، تاہم بعض باتیں محبت کی سفارش کرنے والی اپنے اندر ضرور رکھتا تھا۔ اُس کا شباب سب سے بڑی نوید عشق تھا۔ لیکن وہ نہ تو بالکل متمدن تھا اور نہ قطعی وحشی: افسوس ہے کہ اُس کی زندگی کے رنگین لمحات شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئے تھے: وہ فلسفے کا جویا تھا، اس لئے متین و سنجیدہ تھا۔ ——— وہ چشمہ بھی لگاتا تھا، مگر اس سے بھی اُس کے حسن میں کوئی اضافہ نہ ہوتا تھا۔ وہ خوبصورت نہ تھا بلکہ کچھ بدصورتی کی طرف مائل تھا۔ جو کپڑے پہنتا اُس سے بھی کوئی رعنائی پیدا نہ ہوتی تھی ——— تاہم ایک ہفتے کے اندر نوشابہ اس کی محبت میں اس شدت سے مبتلا ہوتی ہے کہ غیر دلچسپ جمال "ایک خوبصورت دیوتا بن جاتا ہے"

ایک "شباب درخشاں" بن کر نوشابہ کی آنکھوں کو چوندھیا دیتا ہے۔ اور وہ حیران ہوتی ہے کہ اس نے "اب تک اس گل تر کو اپنے دیوتا کے عناصر ترکیبی میں کیوں نہ دیکھا۔ گرویدگی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ دل ہی دل میں جمالی جمالی کہتی ہے اور ایک ایک حرف بیخود و مدہوش کئے دیتا ہے۔ باپ ناشتے کے لئے پکارتا ہے مگر انکار کر دیتی ہے، اور جمالی کی دعوتِ نظر کو پھولوں اور پتیوں کا گجرا بنا کر اپنے سر کو سجاتی ہے اور خواہشات و جذبات سے مغلوب ہو کر فرش سبزہ پر گر پڑتی ہے۔ جمالی متاثر نہیں ہوتا غالباً اس وجہ سے کہ فلسفی ہونے کی بنا پر نوشابہ کے حسن اور اداؤں سے زیادہ اس کی فطرت کو ایک "مسئلہ" سمجھ کر مطالعہ اور حل کی فکر میں محو ہے۔ یہ بن ٹھن کر کھانے کے کمرے میں داخل ہوتی ہے، جمالی ایک مرتبہ بھی اُس کی طرف نہیں دیکھتا۔ یہ اُسے گھورتی ہے مگر بے سود۔ اُٹھکر اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے اور وہاں خوب روتی ہے۔ رات کے کھانے پر متالم نظر آتی ہے مگر جمالی پھر بھی متوجہ نہیں ہوتا۔ پروفیسر صاحب چلے جاتے ہیں، اب یہ دونوں خاموش اور تنہا ہیں۔ جمالی اب بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ نوشابہ کے غصے کی انتہا نہیں رہتی، کیونکہ جمالی اس لمحے کی موسیقی و شعریت کو تباہ کئے دے رہا تھا" نوشابہ عاجز آگئی، اور آخر کار فیصلہ کیا کہ وہ میرے ساتھ معاشقے کی ابتدا نہیں کرتا، تو میں ہی پیش قدمی کروں گی اور ایسا ہی کرتی ہے۔

رومانوی فسانہ نگار نوشابہ کو اس کے بعد ایسے شخص سے ملا دیتا ہے جو اس کی تباہی کے باوصف جان و دل سے عاشق ہو جاتا ہے، اور سب جانتے ہوئے کہتا "پیاری نوشابہ اس اعتراف نے تجھے میری نظروں میں پہلے سے زیادہ حسین بنا دیا" اور یہ سسکیاں بھرتی ہوئی اُس کی آغوش میں ہوتی، مگر حقیقت نگاری صرف اتنے پر اکتفا کرتی ہے کہ جمالی جسے فلسفے میں ڈگری لینا تھا، اور مضمون (THESIS)

لکھنے کے لئے نوشابہ کے والد کے ایما سے اُس نے۔ نوشابہ کی فطرت کو اپنے مضمون کا موضوع بنایا، مقصد پورا ہو جانے کے بعد نوشابہ کی منت سماجت رونے دھونے کی مطلق پرواہ نہیں کرتا اور رخصت ہو جاتا ہے۔ فسانے کا یہی پہلو ہے جس نے حقیقت نگاری میں آرٹ کا اضافہ کیا۔ مگر میں اتنا عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ لطیف صاحب نے اس امر کو اس قدر مبہم طریقے سے بیان کیا ہے کہ میں بہت غور کے بعد تہ تک پہنچ سکا۔ اور میرا ادعا خود ستائی پر محول نہ کیا جائے تو گذارش کروں کہ شاید سو میں ایک متنفس افسانے کی یہ باریک معانت معلوم کر سکے۔ افسانے بھر میں صرف دو جملے ہیں جو انتقال ذہن کے معین ہیں، دونوں ایک دوسرے سے بہت الگ اور بے حد مبہم۔ پہلا فقرہ جمالی کا ہے کہ "میں جس غرض سے آیا تھا وہ پوری ہو چکی" اور دوسرا فقرہ نوشابہ کے باپ کا کہ "میرا سکرٹری حل مسئلہ میں میرا ساتھ نہیں دے سکا"۔

آخر میں ایک اور بات حقیقت نگاری کے متعلق عرض کر دوں۔ اس میں افادی پہلو بھی نکلتا ہے۔ وہ اس طرح کہ پڑھنے والے کو حرکاتِ انسانی کی عریاں و کریہہ تصویر دکھا کر اُن کی طرف سے متنفر کر دے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد آپ نوشابہ کے مماثل کیرکٹر سے نفرت کئے بغیر نہیں رہ سکتے، جوان لڑکیوں کو جن میں ایسی امنگیں اور تحریکیں موجود ہوں فسانہ پڑھکر غیرت آئے گی اور اپنی طبیعت پر زیادہ قابو رکھیں گی۔ یا کم سے کم قابو رکھنے کی کوشش کریں گی۔ خصوصاً اس دور میں کہ پردے کا رواج قریب قریب اُٹھ گیا ہے۔



دنیائے افسانہ کا شاہکار

نغمۂ زندگی

مصنفہ ملک حبیب احمد بی اے آنرز

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایسے افسانوں کا مطالعہ کریں جن میں آتشیں شباب اپنی پوری بیتابیاں لئے جھلک رہا ہو جن میں اہم ترین مباحثِ زندگی پر شرح تبصرہ ہو۔ جن کے کردار بلند ترین اور جاندار سیرت نگاری کی اردو ادب میں تنہا مثال ہوں۔ تو نغمۂ زندگی کو دیکھئے۔

ملاحظہ کیجے کہ مصنف کا فکرِ جوان، رُوح کی بلندیوں سے آپ کے لئے کیا پیامِ حیات لایا ہے ——— ہندوستان کے تین مشہور ادیبوں کے مقدمات شامل کتاب ہیں،

کتاب زیر طبع ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ علاوہ محصول ڈاک۔ ملنے کا پتہ:۔ مینیجر کلیم بک ڈپو، کٹرہ بڑیاں دہلی

رُت آگئی

ہاں ساقیا رُت آگئی پھر سُرخ بنا دے　　بے کیف ہوں مُدّت سے چھلکتا ہوا لا دے
صدقے تری اس نیم نگاہی کے جِلا دے　　ساغر نہ سہی اوک لگائے ہوں پلا دے

شورش نہ سُنی۔ یا نہیں معلوم سُنی ہے
تیری تو سخاوت کی بڑی دُھوم سُنی ہے

جب لطف ہے سر جوش چھلکتی ہوئی آئے　　ٹوٹے ہوئے ہوں پھول مہکتی ہوئی آئے
ایک ایک رگِ گُل سے اُٹکتی ہوئی آئے　　بُلبل لبِ مینا سے چہکتی ہوئی آئے

لغزش سے مری ہاتھ ذرا بھی جو بہک جائے
چھینٹیں وہ پڑیں زروئی رخسار چمک جائے

پیتے ہیں شبِ ماہ میں تو خوب ہے آگاہ　　رُخسار پہ گیسو نہیں رکھنے کی سند واہ
گُل زار کا رسیا ہوں تبسّم کی بھی ہو راہ　　تو ہنس پڑے تو پھول برسنے لگیں واللہ

دریائے طبیعت تری، پھر کیا ہے ذرا ایں
جھوما کروں بیٹھا ہوا، گلشن کی ہوائیں

آغا شاعر قزلباش دہلوی

مسائلِ حیات

(گذشتہ سے پیوستہ)

حیات

(جوشؔ ملیح آبادی)

(۱۲) وہ آدمی جو ہر شخص سے مشورہ کرتا پھرتا ہے، جو اپنے سے مشورہ کرنا بھول جاتا ہے۔ اور اس کا مقسوم ہمیشہ قابلِ رحم ہوا کرتا ہے۔ مشوروں کی کثرت سے ہوشیار!۔

(۱۳) جب تم تمام لوگوں کو مطمئن کرنا چاہتے ہو تو تمھیں ہزار مرتبہ اپنی روح فروخت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دوسروں کو کیوں مطمئن کرو؟ کیا تمھیں بھی اس کا مساوی حق نہیں ہے کہ زندہ رہو، اور مطمئن کیے جانے کا دوسروں سے مطالبہ کرو۔

(۱۴) ہم تصورات کے ذریعہ سے جیتے ہیں۔ ہماری صناعت، فلسفہ، سائنس، اور اس کے ساتھ سب کچھ، محض ان تصورات پر قائم ہیں۔ جن کا مستقبل میں ابطال کیا جانے والا ہے۔ ہماری راستیاں وقتی راستی کے اعتبار سے چند محبوب تصورات کا مجموعہ ہیں۔ اور ہماری زندگی ان چند موہوم الوقوع امور کی امید واری ہے، جو ہمارے کردار کے لئے ایک نیا میدان پیدا کردیں گے۔

دنیا کے سرور افزا حقیقت میں کا ارباب تصورات ہیں۔ کیا تم ان میں سے ایک ہو؟

(۱۵) اس حیات چند نفس کے لذائذ سے محض اس بنیاد پر منہ پھیر لینا کہ کسی دوسری دنیا میں اس سے بہتر لذتیں حاصل ہوں گی، ایسا ہی احمقانہ فعل ہے کہ ہاتھ کی مچھلی کو اس امید پر دریا میں پھینک دیا جائے، کہ بڑی مچھلی مل جائے گی۔

ایک عملی کاروباری آدمی کی حیثیت سے کیا ہم زندگی کی مقدس شے سے جوا کھیلنے کی جسارت کرسکتے ہیں؟ کیا نو نقد نہ تیرہ ادھار کی ضرب المثل سنی ہے؟۔

(۱۶) کیا اس مہذب دنیا میں ہم نہیں دیکھتے کہ لوگ دوسروں سے وہ شے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو بہت ممکن ہے ان کے قبضے ہی میں نہ ہو۔

(۱۷) عملی زندگی میں انسان کی آزادی کا بلند ترین اور عام صرف انتہائی اشتراکیت کے اندر، اور نظری زندگی میں ذہنی بدعملی کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ان چیزوں سے کیسے خوف کھانا چاہیئے؟۔

(۱۸) تغیر اور تبدل صرف ضروری نہیں بلکہ مفید بھی ہے۔ کیونکہ دراصل تغیر و تبدل ہی زندگی ہے۔ ابداع۔ زندگی کی نوجوانی۔ نقالی، خودکشی اور جمود و یکرنگی سانس لیتی ہوئی موت ہے۔

(۱۹) عملی زندگی میں "آئیڈیل" (منتہائے نظر) تسویلات شیطانی ہیں۔ "مذہب" ایک مقدس سازش اور "اخلاقیات" ایک شائستہ بکواس ہے۔

(۲۰) زندگی ہم سے بسر کرائی جاتی ہے۔ اس کے تراشے ہوئے احکام ہم پر لادے جاتے ہیں۔ ہمیں بار بار آگاہ کیا جاتا ہے کہ دیکھو یہ تم کرسکتے ہو۔ وہ نہیں کرسکتے۔

کتنی عجیب مگر سچی صورت حال! یعنی دنیا ہماری ضروریات کو ہم سے زیادہ سمجھنے کی کوشش کرتی معلوم ہوتی ہے۔

(۲۱) کیا ہم دنیا کے پیشتر سے مرتب کردہ اصول حیات کی مطابقت میں زندگی بسر کرائے جانے کی مصیبت میں مبتلا رہیں۔ اور اس طرح قبل اس کے کہ ہمیں حیات کے آغاز کرنے کا موقع ملے، خودکشی کرلیں۔

(۲۲) کیا زندگی محض ایک مایوسی سے گذر کر دوسری مایوسی سے دوچار ہونے کا نام نہیں ہے۔ مایوسی کا ایک دور تسلسل۔

(۲۳) قانون ہمیں دباتا ہے، سوسائٹی ہمیں نچوڑتی ہے۔ اور مذہب ہمارا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ ہمارے اب تک زندہ رہنے کی جرأت و کاوش کا صرف یہی ایک سبب و حیلہ ہے کہ اب دیکھیں کیا ہونے والا ہے۔ کیا تمہیں علم ہے کہ آئندہ کیا ہوگا۔

(۲۴) میں ایک قطرۂ شبنم کی طرح آتا ہوں۔ لیکن ایک طوفان کی طرح واپس جاتا ہوں۔ کیوں؟ یہی انسانیت ہے نا؟

(۲۵) ہر طلوع سحر کے وقت اس شگفتہ امید کے ساتھ ہم آنکھیں کھولتے ہیں کہ ممکن ہے آج کسی لطیفۂ غیبی کی بنا پر ہماری موافقت میں قطعی اچانک طور پر کوئی ایسا امر ظہور پذیر ہو جائے جس سے ہم اپنی زندگی کے متعین و محقق مقصد کو پالیں لیکن کیا ہر غروب کے بعد اپنی تمام مایوسیوں اور نا امیدیوں کے ساتھ ہم بستروں پر کروٹیں بدلتے بدلتے تھک کر سو نہیں جاتے۔ یہاں تک کہ آخر کار موت ہمیں وہ چیز دے دیتی ہے، جس کا ہمیں گمان بھی نہ تھا۔

(۲۶) جب میں اس دنیا میں آیا۔ تو وہ تنہا چیز جو حقیقی طور پر مجھ سے وابستہ تھی میرا جسم تھا۔ اور جب مجھے یہاں سے جانا پڑے گا۔ تو کیا اس تنہا چیز کو مجھے موت کے حوالے نہیں کر دینا پڑے گا؟

(۲۷) زندگی کو مبتذل و ملول کیوں بناؤ۔ خوش و خرم کیوں نہ ہو؟ کیونکہ دنیا میں اس سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کہ وہ محض جینے کے لئے زندہ رہے، کیا مسرت ہمیں یہ محسوس نہیں کراتی کہ حیات قابل قدر شے ہے۔

(۲۸) جب تمہیں زندہ رہنا ہی ہے تو کیوں ان سیاہ مست رندوں کی طرح نہ رہو، جو بساط عشرت پر پیالے ہی پیالے خالی کر دیتے ہیں۔ اور ہر بار زندگی کو مخاطب کرکے آواز دیتے ہیں: "ایک اور جام"۔

(۲۹) جب خوشی کا لمحہ تمہارے دروازے پر دستک دے، ممکن ہے تم اس وقت سو رہے ہو، اور تمہارے جاگتے جاگتے وہ کسی غلط راستہ پر گامزن ہو جائے، زندگی بھی ایک ایسا ہی زریں لمحہ ہے، بیدار رہو۔ کیونکہ یہ لمحہ ایک بار اور صرف ایک بار آتا ہے۔

جنس

(۱) خواہ ہمارے شعورِ اخلاقی اور آداب ظاہری کو کتنا ہی صدمہ کیوں نہ پہنچے لیکن ایک صاف گو آدمی کیا بغیر ادنیٰ ترین فرق الطال یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ اگر انسانیت دنیا کے تمام تر مقاصد سے بڑھکر کسی ایک مقصد کے واسطے زندہ ہے تو وہ مقصد مقصدِ جنس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

(۲) مرد خوشامد کرتے اور جھوٹ بولتے ہیں، اسلئے کہ وہ سمجھتے ہیں عورتیں اسے پسند کرتی ہیں۔ اور عورتیں یہ سب کچھ اکراہ کے ساتھ برداشت کرتی رہتی ہیں [illegible] مرد کی فطرت ہے۔

مردوں کے نزدیک عورتیں دلفریب لیکن [illegible] سفر پریاں ہیں۔ اور عورتوں کے نزدیک مرد شائستہ و ذی شعور درندے ہیں۔ اور کیا یہ دونوں فریق تھوڑی سی ایمانداری کی کمی کے باعث اور اس علم کے بغیر کہ ان دونوں کے دماغوں کے پس پردہ کیا ہے زندگی کا تناسب قائم رکھنے کی خاطر ایک دوسرے کو در پردہ سبک کرانے اور چاہنے کے مشغلے میں مصروف نہیں رہتے ہیں۔

(۳) کیا اس محل پر جب ہماری جنسی زندگی کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے ہم سب کے سب دروغگو نہیں ہیں؟

(۴) کیا تم نے اسے نوٹ نہیں کیا ہے کہ کتنے بیشمار عورتوں سے نفرت کرنے والوں کی خوش قسمتی سے کوئی بیوی نہیں ہے، جو ان کے اقوال کی تکذیب کر سکتی۔

(۵) کسی صاحب معلومات مرد سے ملنا مسرت کا باعث ہے۔ اور کسی پر از معلومات عورت سے ملنا اس سے بھی زیادہ خوشی کا سبب ہے ذہین عورت ایک ذہین مرد کے مقابلے میں انسانیت کی ایک زیادہ قابل ستائش قسم ہے۔

کیا عورت کو پہچان لینا ایسا ہی مشکل ہے۔ جیسے اسرار حیات کو جاننا۔

(۶) عورتیں مردوں کے مقابلہ میں زیادہ حساس واقع ہوئی ہیں۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ ان میں اچھے شعراء بہت ہی شاذ ہوتے ہیں۔

(۷) کیا عورت کا سمجھ لینا اسرار حیات کے سمجھنے سے زیادہ دشوار کام ہے؟

(۸) جنس کے متعلق ہماری معلومات کس قدر محدود ہیں، تمام جنسی

مصیبتیں اس چیز کے مخفی رکھنے کی عادت سے پیدا ہوتی ہیں۔ جس کا اظہار موجب ذلالت ہوسکتا ہے۔ لیکن فطری طور سے جنہیں ترک نہیں کیا جاسکتا۔

(۹) کیا جنسی مصائب اس محبوب خواب وخیال یا وہم پر مبنی نہیں ہوتے کہ جہالت ہمیشہ معصومیت کے ہم رتبہ اور علم کی کمی ہمیشہ خیر کے ہم پایہ ہوتی ہے۔

(۱۰) جنسی جہل ایک جرم ہے اور جنس کی خود بردو دوسرا جرم ہے۔ کیا ہم ان دونوں جرموں سے پاک ہیں؟

(۱۱) قوت تخیلہ کی پرواز جنسی جذبات میں نمایاں حصہ لیتی رہتی ہے جنسی آسودگی محض میکانکی ہے۔ کیا اس کے لذائذ دماغ سے متعلق نہیں ہوتے؟

(۱۲) خیال خود بے شعور ہے۔ کیا مقصد فطرت انسان کو اسی طرح لذت اندوز کرنا ہے جتنا کہ اس کے مبادی جو علانیہ طور پر اضطراب انگیز ہوتے ہیں۔

(۱۳) شرم عفت کا نشان ہے، اور کیا یہ ثابت نہیں کرتی کہ کوئی ایسی شے ضرور ہے جس کا مخفی رکھنا ضروری ہے۔ اور جس کے باب میں خوف ہے کہ ظاہر نہ ہو جائے۔

(۱۴) ایک پرجوش عاشق قبل اس کے کہ اس کی شرمیلی محبوبہ کو اس سوال کا موقع ملے جواب دیتا ہے کہ "میں چاہتا ہوں"۔

کیا عشاق جب "کیوپڈ" ان کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے، آپس میں لڑنے جھگڑنے نہیں لگتے ہیں؟

(۱۵) جنسی آشفتگی، عدم موافقت ایک ایسا سنگ گراں ہے جو ہزاروں دلوں کے شیشوں کو چور چور کر چکا ہے۔

جنسی جبلت کے غلط استعمال کے مواقع ازدواجی زندگی میں، مجرد زندگی سے کہیں زیادہ ہیں۔ کیا شادی فطری خود برد کے واسطے ایک بلینک چیک (صفحۂ سادہ) نہیں ہے۔ ایک غیر مشروط فرمان نہیں ہے۔

(۱۶) کیا جنسی جرم ایک ایسے اجنبی کے ساتھ جو صرف کل وارد ہوا ہے محض اس وجہ سے یکایک اخلاقی حق کا خطاب حاصل نہیں کرلیتا ہے، کہ قانون یا سوسائٹی نے اس پر "ازدواج" کی مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔

(۱۷) جب ہم مردوں کے عزائم کا ذکر کرتے ہیں تو عورتوں کے آزادانہ انتخاب کے حق کا چرچا کیوں نہ کریں۔ کہ انہیں ایسی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں کہ وہ یہ خود انتخاب کرسکیں کہ ان کے بچے کا باپ کون ہوگا؟

(۱۸) کیا یہ ہمیشہ عورت ہی ہوتی ہے جو مرد کو بداخلاقی کی ترغیب دیتی ہے؟ یا یہ مرد کی ذات ہوتی ہے، جو حسب موقع ایک قابل حصول عورت کے پالینے میں اپنی آپ امداد کرتا ہے؟۔

(۱۹) کیا کسی غیر آمادہ رفیق سے تکلیف دہ فرض کے ادا کرنے کا مطالبہ جرم۔ جور اور بد مذاقی نہیں ہے؟

(۲۰) جنسی معاملات میں انفرادی آزادی، اور دماغ کے صحیح میلان کا لحاظ رکھنا سب سے زیادہ ضروری اور خوشگوار مسئلہ ہے۔

(۲۱) تحمل و نیازمندی عورت کی فطرت کی قابل پرستش صفتیں ہیں۔ کیا مرد کا فرض نہیں ہے کہ وہ عورت کے ان اوصاف کی تقدیس کرے۔ اور ان نادر صفات کے بیجا استعمال سے گریز کرتا رہے۔

(۲۲) جنسی معاملات میں تہذیب اس وقت تک محض شائستگی اور آداب کا ایک کھیل ہے، جو جہالت و اوہام کے قدیم مندر کی آرائش میں مصروف رہتی ہے جب ہمارے نقطۂ نظر میں تبدیلی نہ پیدا ہوگی، جنسی تفصیلات غیر متبدل ہی رہیں گی۔ جنسی امور میں کیا ہم وحشیوں سے زیادہ شائستہ کہے جاسکتے ہیں؟۔

ازدواج

(۱) ازدواج۔ انتفاع باہمی کے لئے صرف ایک معاہدہ یا ٹھیکہ ہے۔۔۔۔

کیا یہ محض اس لئے اچھا مشغلہ نہیں ہے کہ خوش آیند ہے۔

(۲) ازدواج میں جنسی جبلت کے علاوہ اور بھی کچھ ہے، ازدواج اس تناسب سے کامیاب کہا جاسکتا ہے، جس تناسب سے فریقین اپنے کو ایک دوسرے کے حوالے کردیتے ہیں۔ حقیقی ازدواج کے معنی ہی ایک جان و دو قالب کے ہیں۔ جیسے ایک چراغ کی دو بتیاں۔

(۳) کیا تم نے کبھی اس کا حساب لگایا ہے کہ کتنی عورتیں جن سے وہ شادی کرنا چاہتی ہیں، شادی نہیں کرسکتیں، اور کتنے مرد جن سے ان کی شادی ہوتی ہے محبت نہیں کرتے۔

(۴) صحیح تعلق فراخدلی کی مناسبت سے پیدا ہوتا ہے۔ نہ کہ خون سے لیکن کیا ازدواج محض ایک کاروباری چیز نہیں ہے، رومان سے دور، لطافت سے بعید۔

(۵) کیا ازدواج حسن و لطافت کو آخر کار فنا نہیں کردیتا ہے، کیا شوہر کا احساس ملکیت عورت کے حسن کی تب و تاب کو زیادہ مدت تک باقی رکھ سکتا ہے کیا ہمیشہ کے لئے کسی شے کے قبضے میں آجانے سے اس کی روحانی لطافتیں فنا

فنا نہیں ہو جائیں؟۔

(۶) چہرہ خواہ کتنا ہی دلفریب ہو، اگر لگاتار صبح و شام دیکھا جائے تو کیا اس میں کوئی دلکشی باقی رہ جا سکتی ہے؟

(۷) کیا ہماری رسم ازدواج پر آئندہ نسلیں جب ایک حکیمانہ تاریخ مرتب کریں گی، تو ہمیں ان الفاظ سے یاد کریں گی کہ ہمارے آباؤ اجداد اس قدر احمق تھے کہ شادیاں کیا کرتے تھے؟

(۸) اگر ترک علائق کا نام انسانی نجات ہے تو کیا ازدواج دنیا کی سب سے بڑی وابستگی اور علاقہ نہیں ہے۔ اور اس کی موجودگی میں کیا کوئی شخص آرام سے زندگی بسر کر سکتا ہے؟

(۹) بچوں کی موت اور زندگی دونوں مساوی طور پر موجب ایذا ہیں۔ ان کی زندگی میں یہ خطرہ لگا رہتا ہے، کہ کہیں مر نہ جائیں۔ اور ان کے مر جانے پر دل میں ایسا ناسور پیدا ہو جاتا ہے جو کبھی بھر نہیں سکتا۔ اور کیا انہیں برکات کی خاطر رسم ازدواج کو زندہ رکھنا چاہیئے؟

(۱۰) بہت سے ایسے ہیں جن کی شادی ہو چکی ہے۔ مگر نکاح نہیں ہوا ہے بہت سے ایسے ہیں جن کا نکاح تو ہو چکا ہے، مگر شادی نہیں ہوئی ہے۔ میرا شادی سے مقصود وہ مضبوط روحانی قربت ہے، جو معدوم نہیں ہو سکتی۔

(۱۱) رسمی یا بخلاف مرضی شادی مذہبی مراسم عقد کے ادا ہونے کے بعد بھی ایک ناجائز تعلق سے زیادہ نہیں ہے۔

(۱۲) کتنے بچے ہیں۔ جو غیر منکوحہ ماؤں کے بطن سے پیدا ہو کر حقیقی نقطۂ نظر سے جائز بچے کہے جانے کے مستحق ہیں۔ اور کتنے بچوں کا منکوحہ ماؤں کے بطن سے پیدا ہونے کے باوجود ناجائز بچوں کی فہرست میں نام لکھنا چاہیئے۔

(۱۳) صرف اس موقع پر جب کوئی شخص کسی عورت سے جبریہ جسمانی تمتع کرے عورت مرد کی مقاربت کرنا جائز ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ ورنہ فریقین کی رضامندی، خواہ وہ کسی شکل میں ہو قطعی طور پر ازدواج کہی جا سکتی ہے۔

(۱۴) ازدواج، اعلان رسوم اور چند الفاظ کے دہرائے جانے کا نام نہیں ہے۔ وہ فریقین کے باہمی سمجھوتہ کی بات ہے۔

(۱۵) ازدواج تو جس پر سوسائٹی کو کوئی پابندی عائد کرنے کا حق نہیں یہ ہیں۔ فریقین کے طبائع کی ہم آہنگی، وقتی ضروریات۔ دلی پسندیدگی۔ اور ذہنی رجحانات لیکن کیا قانون اور سوسائٹی جب تک اس پر مہر تصدیق نہ ثبت کر دیں، گرفتار رسوم دنیا اسے جائز سمجھنے پر تیار ہو سکتے ہیں؟

(۱۶) کیا کوئی "جسمانی ازدواج"، ازدواج کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو سوسائٹی اور قانون کی اصطلاح میں محض ایک محاورہ ہے، اور کیا ہماری اکثریت اس "جسمانی ازدواج" کی بلا میں گرفتار نہیں ہے؟

(۱۷) صرف وہی ازدواج حقیقتاً مقدس ہے، جو پورے خلوص اور کامل آزادی کے ساتھ واقع ہو، اور اس طرح کے ازدواج کو اس کی پروا کیوں ہو کہ دنیا کے ادارے اس پر مہر تصدیق ثبت فرمائیں۔

(۱۸) قانون اور سوسائٹی سے شوہر یا بیوی بننے کے لئے کیوں مدد لو۔

(۱۹) جب تم آزادی کے ساتھ لطف زندگی بسر کر سکتے ہو تو پھر ازدواج کے بارگراں کو دعوت دینا کیا انتہائی حماقت اور بدبختی نہیں؟

(۲۰) انگور ایک بہترین پھل سہی لیکن کیا تمام عمر اور ہر روز انگور برداشت کیا جا سکتا ہے خطرناک یکرنگی! قابل گریہ جمود!!

(۲۱) شادی بزدلوں کی اس بات میں مدد کرتی ہے، کہ بیویوں کو محفوظ کر لیا گیا ہے، کیا تم بزدل ہو یا خود غرض؟۔

(۲۲) ازدواج کی الوہیت اور تقدیس کو خاتمہ دے کر ہلاک کیوں نہ کر دو؟ اور اس کی جگہ محض میلان خاطر اور محبت کو کیوں نہ قائم کر لو۔

(۲۳) سوسائٹی سے کہدو کہ ازدواج کو فریقین کے علاوہ اور کسی سے کوئی دھکا علاقہ نہیں ہے۔ آخر یہ تمام غیر متعلق چھوٹے بڑے خورد و کلاں اپنی ٹانگ کیوں اڑاتے ہیں۔

(۲۴) آجکل کا ازدواج تو محض ایک آنکھ مچولی ہے، دونوں اس کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں کہ کون کیا چھپا رہا ہے لیکن کیا یہ ازدواجی زندگی کا گناہ قدیم ترین نہیں ہے؟

(۲۵) تم ایک دوسرے کو اس وقت تک قطعی نہیں پہچان سکتے جب تک شادی نہ ہو جائے، اور اس پر بھی ایک کافی مدت گذر نہ جائے، اور پھر کیا اکثر اوقات یہ نہیں ہوتا کہ تم تمنا کرتے ہو کہ کاش ہم نے ایک دوسرے کو کبھی دیکھا ہی نہ ہوتا۔

(۲۶) وہ ہمیشہ مجرد ہی رہتا ہے جو اپنی زندگی کی مقدس شے میں کسی دائمی شریک کے تخیل کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور کیا تم اسے عقلمند انسان کہنے پر مجبور نہیں ہو؟

(۲۷) ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں ناقابل برداشت ہیں، اور کیا ازدواجی زندگی کی تقریباً تمام ناکامیوں کی ذمہ دار بھی، ناقابل برداشت ذمہ داریاں نہیں ہوا کرتیں؟ (باقی)

کلامِ متین

(۱)

تجھے بھی اپنی طرح بیقرار دیکھا ہے
سکوتِ شب میں کبھی اشکبار دیکھا ہے

غرورِ حسن کو بھی مضمحل کبھی پایا
نگاہِ ناز کو بھی شرمسار دیکھا ہے

جگر نے خنجرِ ابرو کے زخم کھائے ہیں
نظر نے نرگسِ جادو کا وار دیکھا ہے

قیود و رسم و رہِ عام توڑ ڈالے ہیں
کبھی کبھی تجھے بے اختیار دیکھا ہے

ہر ایک رنگ میں دیکھا تری اداؤں کو
جمالِ نشۂ حسنِ خمار دیکھا ہے

بہارِ صبح کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے
کنارِ آب و سرِ لالہ زار دیکھا ہے

چراغِ مہر میں، قندیلِ ماہ و انجم میں
تری ہی برقِ نظر کا شرار دیکھا ہے

فضائے نور میں اے شمعِ انجمن تجھ کو
نگاہِ شوق نے پروانہ وار دیکھا ہے

خرامِ صبح میں اکثر مری نظر نے تجھے
گیاہِ سبز پہ مستانہ وار دیکھا ہے

سوادِ کوہ میں میں نے کبھی کبھی تجھ کو
اسیرِ زمزمۂ آبشار دیکھا ہے

لباسِ گل میں، کبھی نغمہائے بلبل میں
غرض تجھی کو برنگِ بہار دیکھا ہے

---

(۲)

بے ترے حسنِ بہارِ چمنستاں معلوم
بن ترے لطفِ ضیائے مہِ تاباں معلوم

کیف پھولوں میں جو کچھ ہے سو تری ذات سے ہے
ورنہ رنگِ سمن و سنبل و ریحاں معلوم

جانِ خوبی ہے تو ہی اے مہِ خوبی تجھ بن
زینتِ انجمنِ زہرہ جبیناں معلوم

تو نہیں پاس تو رنگینیِ عالم بیکار
تو نہیں ہے تو فضائے طربستاں معلوم

زندگانی ہے ترے ہی لبِ شیریں سے مری
ورنہ جاں پروریِ چشمۂ حیواں معلوم

خندۂ برق، دلآویزیِ تبسم سے ترے
بے ترے دلکشیِ موسمِ باراں معلوم

نقد و نظر

اخبار و رسائل

سالنامہ وطن۔ دہلی

قیمت ۸/

ایڈیٹر۔ شیونرائن بھٹناگر۔

ملنے کا پتہ۔ دفتر روزنامہ وطن۔ دہلی۔

وطن کا سالنامہ جس کا سائز ۲۲×۲۹ ہے ۱۴۴ صفحات پر شائع ہوا ہے جو نامور ادیبوں کے مضامین۔ اور مشہور شعرائے کلام سے مزین کیا گیا ہے۔ دیگر اخبارات کے سالنامے اس کاوش اور انہماک سے بہت کم ترتیب دیئے جاتے ہیں، منشی پریم چند کا مضمون "اقلیت کے حقوق" پڑھنے سے اندیشہ ہوتا ہے کہ ایک نامور افسانہ نگار کہیں آہستہ آہستہ ایک فرقہ دار سیاسی مضمون نگار کا چولہ نہ بدل لے۔

ترتیب مضامین تو کچھ زیادہ قابل اعتراض نہیں لیکن اشتہارات کا ایسا شدید حملہ ہوا ہے کہ بچارے مضامین اکثر بارہ باٹ ہو ہو گئے ہیں۔

اخبار وطن آہستہ آہستہ مگر بڑی مستقل مزاجی سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہو رہا ہے۔ ہم فاضل مدیر اور منتظمین کو مبارکباد دیتے ہیں، اور توقع رکھتے ہیں کہ آیندہ سالانہ نمبر نکالتے وقت وہ اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کا اہتمام اس دفعہ سے زیادہ شاندار طریق پر کریں گے۔

"م"

کنول (خاص نمبر)

قیمت سالانہ ۲/۔ فی پرچہ ۵/۔ خاص نمبر ۱۲/

مدیر۔ منظر صدیقی اکبرآبادی۔

ملنے کا پتہ۔ آگرہ۔

حضرت سیماب اکبرآبادی کے خلف الصدق کی ادارت میں یہ رسالہ نکلتا ہے۔ جنوری نمبر جو زیر ریویو ہے اس کا خاص نمبر ہے۔ جو اعلیٰ پایہ مضامین، دلآویز افسانوں اور پاکیزہ نظموں سے جس حسن ترتیب کے ساتھ آراستہ کیا گیا ہے، وہ قابل داد ہے، اور اس چھچھورپن سے جس کی رو میں ہمارے اکثر و بیشتر اردو رسائل بہے چلے جا رہے ہیں۔ بالکل منزا اور پاک ہے۔ ہم کنول کی اس کامیابی پر منظر صاحب کو صدق دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ ۱۴۴ صفحات کا رسالہ جس میں متعدد تصاویر یک رنگی و سہ رنگی ہوں اور پھر مضامین بھی قابل قدر، کسی طرح ۱۲/ میں مہنگا نہیں، ارباب ذوق ضرور مذکورہ بالا پتہ سے طلب کر کے منظر صاحب کی تگ و محنت کی داد دیں۔

"م"

مصحف

مدیر۔ شاطر نائطی۔

ملنے کا پتہ۔ منیجر مجلہ مصحف۔ عمرآباد۔ (شمالی ارکاٹ)

شمالی ارکاٹ سے یہ مذہبی اور ادبی رسالہ ۷۲ صفحات کا دو سال سے نکل رہا ہے۔ ماہ فروری کا پرچہ ریویو کی غرض سے دفتر کلیم میں بھیجا گیا ہے، شروع میں چند خالص مذہبی مضامین ہیں۔ درمیان میں دو ایک تاریخی اور علمی مضامین ہیں۔ اور آخر میں ادبی چاشنی کے لئے چند افسانے بھی موجود ہیں۔ شعر و سخن سے بھی خالی نہیں ہے۔ زبان کے لحاظ سے رسالہ اچھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ جامعہ دارالسلام عمرآباد کے زیر نگرانی نکالا جاتا ہے۔ ایک مضمون "عورتوں کی تعلیم و تربیت" کے متعلق افضل العلماء مولوی محمد یوسف صاحب کوکن عمری کا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ آخر طبقہ علماء نے بھی عورتوں کے جہل اور اس جہل کے نتائج کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے۔ مولانا نے حسب دستور عہد حضور سرورِ کائنات (صلعم) اور خلفاء و تابعین وغیرہم کے زمانہ کی خواتین کا ذکر فخر و مباہات سے کیا ہے کیا آجکل کے علمائے کرام اس آزادی کو مردوں کے تئے بھی جائز رکھ سکتے ہیں۔ جو حضرت عمرؓ کے عہد میں ایک عورت کے تئے جائز تھی۔ اگر آج کوئی مسلمان خطبہ یا وعظ کے دوران میں واعظ یا خطیب صاحب کو ٹوک دے، تو پھر خدا ہی ہے جو وہ خیریت سے مسجد سے باہر آسکے۔ اس رسالہ کی طباعت کتابت اور کاغذ نہایت عمدہ ہے۔ اور سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ جنوبی ہند کے اس حصہ سے نکلتا ہے، جہاں اردو کی پرسش شمالی ہند، یا حیدرآباد دکن کی طرح نہیں ہے۔ پھر بھی معلوم ہوتا ہے، گویا اعظم گڑھ کے معارف کا سائز بڑھا دیا گیا ہے ہم حضرت مدیر مسئول اور انکے معاونین کو اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ "م"

الاصلاح

قیمت سالانہ ۔للعہ۔ فی پرچہ ۶ر

مرتب ۔ امین حسن ۔ اصلاحی ۔

ملنے کا پتہ، دفتر دائرۂ حمیدیہ الاصلاح۔ سرائے میر۔ اعظم گڑھ۔

الاصلاح مذہبی رسالہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مقصد اجرا کو ضرور پورا کرتا ہے۔ صوری حیثیت سے اپنے ہمعصر "معارف" کے ہمرنگ ہے۔ جو اصحاب دینی شغف رکھتے ہوں، وہ ضرور مطالعہ فرمائیں۔ "م"

باغ و بہار نئی دہلی

نمونہ مفت۔ قیمت سالانہ ۸ر۔ فی پرچہ ۱ر۔ ضخامت مع اشتہارات ۴۰ صفحے

مدیر ۔ سعدی، مچھلی شہری ۔

یہ اردو کا سب سے پہلا ماہوار پرچہ ہے، جو نئی دہلی سے نکالا گیا ہے۔ اگر ایک جگہ کے اس قدر ادیب یکجا نہ کئے جائیں تو تنوع کے لحاظ سے یہ امر نہایت مناسب ہوگا۔

شذرات میں مدیر مسلمہ نے فرمایا ہے کہ "پہلے" اردو رسالہ نکالنے کا خیال پیدا ہوا" ساتھ ہی یہ خیال ہوا کہ "بچوں کا ماہوار رسالہ ہو" اور "آخرکار ایک سستا سا علمی رسالہ "منظر" ناظرین کر رہا ہوں"

ہونہار مدیر نے عمدہ مضامین جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ جعفری ڈائرکٹر پبلک انفرمیشن بیورو حکومت ہند۔ خواجہ حسن نظامی، اور مصور درد حضرت سید فرید جعفری۔ یہ رنگ خیال و لیلی کے مضامین دلچسپ ہیں۔

سعدی صاحب سے ہمیں یہ کہنے کا حق ہے، کہ بھائی بڑھو اور خوب بڑھو اور رسالہ احتیاط سے نکالو، تو تم ضرور ایک دن ادیب بن کر ہوگے، جس کے آثار ابھی سے ہویدا ہیں

"م"

کوثر

مدیر ۔ محمود خاں محمود بنگلوری ۔

قیمت سالانہ عہ ۔

فی پرچہ ۲ر ۔

یہ ۴۲ صفحے کا ماہنامہ جنوبی ہندوستان کے مشہور شہر بنگلور سے نکل رہا ہے۔ لکھائی۔ چھپائی پاکیزہ ہے۔ اور کاغذ پاکیزہ تر ہے۔

ماہ فروری کا رسالہ ہمیں ریویو کے لئے ارسال کیا گیا ہے۔ جس میں بعض مشہور ادیبوں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ زیادہ تر جنوبی ہندوستان کے اہل قلم کی معاونت اسے حاصل ہے۔ جنوبی ہندوستان سے اردو رسائل کا اجرا، درحقیقت ادب اردو کے پرستاروں کے لئے نہایت دل خوش کن اور مسرت انگیز خبر ہے۔ ہمیں کوثر کی کامیابی کی یقینی توقع ہے۔

ارباب ذوق جس قدر جنوبی ہند کے رسائل کی سرپرستی خریدار بن کر فرمائینگے اسی قدر خدمت زبان و ادب ہے۔ "م"

اتحاد (خورجہ)

قیمت سالانہ ۲؎ - فی پرچہ ۵؍

ایڈیٹر۔ بشیر بھائی۔

۴۴۔ ۴۴ صفحات کا یہ ماہانہ رسالہ کئی سال سے خورجہ ضلع بلند شہر سے نکلتا ہے۔ صرف افسانے اس رسالے میں ہوتے ہیں۔ ہم ہندوستانیوں میں اور بالخصوص مسلمانوں کی تو گھٹی تک میں قصے اور کہانیاں پڑی ہوئی ہیں۔ پھر کیوں نہ ایسے رسائل مقبول ہوں۔ جن میں صرف کہانیاں۔ قصے اور افسانے ہی فسانے ہوں۔ چنانچہ اتحاد کا یہ نمبر جو ہمارے پاس بغرض ریویو ارسال فرمایا گیا ہے گو ہم ورق گردانی اور کافی جستجو کے بعد بھی یہ بتانے سے قاصر رہا کہ وہ جنوری ۱۹۳۳ء کا رسالہ ہے یا فروری ۱۹۳۳ء کا، جنوری ۱۹۳۲ء کا ہے یا جنوری ۱۹۲۲ء کا لیکن ورق پلٹتے ہی اس نے یہ بتا دیا کہ اس کا بہترین افسانہ جناب مدیر کے نزدیک چونکہ نور جہاں ہے، اس لئے "آج" کے ماہنامے کو اسی نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ جدت تو یہ واقعی بالکل انوکھی ہے۔

اس سے زیادہ افسوس رسالہ کے مطالعہ سے یہ ہوا کہ جس فسانے کو پسند کیا گیا ہے، وہ بلا وجہ طویل ہے۔ پلاٹ فرسودہ ہے۔ اور کوئی بھی خوبی اس میں ایسی نہیں جو چڑے چڑیا کی کہانی سے اسے ممیز کر سکے۔ دوسرا افسانہ خود حضرت مدیر کا ہے جو ان کے پسندیدہ فسانے سے یقیناً بہتر ہے۔ باقی افسانوں کا تو ذکر ہی فضول ہے، لیکن اس میں نہ حضرت مدیر کا کچھ قصور ہے۔ اور نہ افسانہ نویسوں کا، بلکہ اس قسم کے رسائل سے ہمارے عوام کے ذوق ادب کا پتہ لگتا ہے۔ جو قوم کوک شاستر، دلہن کی ڈائری پہلی شب وغیرہ مہملات اور مخربات ہزاروں کی تعداد میں خرید سکتی ہے، وہ اگر ایسے رسائل کی بھی سرپرستی کرے تو کوئی برائی نہیں۔ جو یقیناً اس درجہ مخرب تو نہیں ہیں۔

ساربان

مدیر۔ غلام محمد خاں بی۔اے۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر ساربان۔ آسٹریلیا بلڈنگ۔ لاہور۔

چندہ سالانہ عمومی ۲؎۔

یہ رسالہ اس قدر کم قیمت اور اس کے دوش بدوش اس قدر مفید اور اعلیٰ مقاصد کے تحت جاری کیا گیا ہے، اس میں ایک ایسی عظیم روح کار فرما ہے کہ اگر اس کی یہی رفتار رہی تو عنقریب ہی ملک کا ایک بہترین راہنما اور سچا خادم ثابت ہو کر رہیگا لکھائی چھپائی قابل تعریف اور کاغذ نفیس ہے۔ ہمدردانِ ادب ضرور ملاحظہ فرمائیں (م م)

کتب

کلیم عجم

مصنفہ، حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی۔

حجم۔۔۔ ۴۰۰ صفحات۔

قیمت۔ ۲؎ علاوہ محصول۔

ملنے کا پتہ۔ قصر ادب آگرہ۔

"افسوس ہے کہ مارچ کا رسالہ تیار ہے اور ہمیں اتنی مہلت نہیں ملی کہ ہم کلیم عجم کا بہ نظر امعان مطالعہ کر کے مکمل تبصرہ نذر ناظرین کر سکتے۔ یہ کسی چلتے پھرتے شاعر کا مجموعۂ کلام نہیں ہے، بلکہ اپنے زمانے کے ایک کہنہ مشق شاعر و ادیب کی تصنیف ہے۔ جو صاحب فکر ہے جدت آفریں ہے۔ "تعدادِ نظر" میں اتنی گنجائش بھی نہیں ہے کہ حضرت سیماب کے اس گنج گراں مایہ کی اس میں تفصیل سما سکے۔ لیکن ہم یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں، کہ عنقریب کلیم عجم پر ایک ایسا مضمون لکھکر نذر ناظرین کریں جو صحیح معنوں میں تبصرۂ کلیم عجم" کہلا سکے"! تاہم جس قدر اس قلیل مہلت میں اسے دیکھا ہے، اس کے لحاظ سے یہ چند سطور بطور تبصرہ حاضر ہیں:

حضرت سیماب کی غزلیات اور خطبات شاعری کا مجموعہ "کلیم عجم" کے نام سے حال ہی میں جلوہ گر ہوا ہے۔ سیماب صاحب نے اس میں ایک کے بجائے دو جدتیں دکھائی ہیں۔ اول تو نظم و نثر کو ایک جگہ اکٹھا کیا، دوسرے چند اوراق اپنی سوانح کے متعلق بھی بہ اختصار سپرد قلم کر دیئے ہیں۔

پہلے حصہ کا نام خطبات شاعری ہے۔ جس میں وہ تمام خطبے شامل ہیں جو آپ نے مختلف مشاعروں اور ادبی مجالس کی صدارت کرتے ہوئے شاعری پر پڑھے ہیں۔ مشاعرہ میں صدر کا خطبہ پڑھنا بھی سنت سیمابی ہی ہے۔ دوسرا حصہ یا باب شعر الحیات ہے۔ جس میں کچھ اپنی زندگی کا احوال اور شعر گوئی کا تذکرہ ہے۔ تیسرے حصہ کا "نشید نو" نام ہے، جس میں ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۲ء تک کی غزلیات جمع کی گئی ہیں چوتھے حصے "بادۂ دوشیں" میں ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۸ء تک کی غزلیات ہیں، اور آخری حصہ صہبائے کہن ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۹ء تک کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔

تمام خطبات شاعری پڑھنے کے قابل ہیں۔ حضرت سیماب کا یہ احسان کہ انہوں نے شاعروں میں تحقیق و تنقید کی بنیاد رکھی، ادب اردو پر ہمیشہ رہے گا۔

۵۔ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء کے مشاعرہ بزم ادب آگرہ کے خطبہ صدارت میں حضرت سیماب نے آگرہ کو اردو کی جنم بھومی قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے۔ کہ

"عہد جلال الدین محمد اکبر میں مردانہ و زنانہ بازار قلعہ (آگرہ) میں لگتا تھا، اسے اردو کہتے تھے، جہانگیر کے عہد میں بھی یہ بازار آباد رہا، وہاں لین دین بدستور اسی زبان میں ہوتا تھا، شاہجہاں نے اسے اور رونق دی۔ اور یہ شاہی بازار چونکہ احتراماً و تعظیماً "اردوئے معلے" کہلاتا تھا اس لئے اس نئی زبان مرکب کا نام بھی اردوئے معلے، رکھا گیا۔"

اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان کی بنیاد سب سے پہلے آگرہ میں پڑی چنانچہ آگے چل کر حضرت سیماب صاحب ظہیر اونشا کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ "اس مخلوط زبان کی بنیاد سب سے پہلے آگرہ میں پڑی۔ جو صحیح نہیں ہے۔ اردو زبان کی پیدائش فی نفسہ ہر جگہ مختلف اقوام کے میل جول اور مختلف زبانوں سے پیدا ہوئی۔ اس کے لئے کوئی خاص کوشش او عمل میں نہیں لائی گئی، اور سب سے پہلے اردو کی جنم بھومی بننے کا فخر دکن کو حاصل ہوا۔ چنانچہ خود حضرت سیماب نے اپنے خطبۂ امراؤتی ۲۹ نومبر سنہ ۱۹۳۶ء میں اس امر کا اقرار کیا ہے کہ "پنچھی نامہ" "تحفۂ عاشقاں" وجدی دکنی کی دونوں مثنویوں کا زمانہ سنہ ۱۱۱۵ء ہے گو ان کی زبان آجکل کی اردو سے مختلف ہے، اور اسی طرح اپنے ساتویں خطبہ میں" دکن کے شعرا، نوری۔ غواصی، ابن نشاطی، نصرتی کا زمانہ ۹۱۶ھ و ۱۰۹۵ھ کے درمیان قرار دیتے ہیں۔ اس زمانے کے آگرہ، دہلی یا لکھنؤ کے کسی اردو شاعر کا نام پیش نہیں کیا جاسکتا، اس لئے آگرہ یا دہلی والوں کا یہ کہنا کہ اردو نے سب سے پہلے جنم یہاں لیا صحیح نہیں ہے۔ خدا بھلا کرے "حب وطن" کا کہ آدمی کی طبیعت مچل ہی جاتی ہے، اور وہ اس کا تصور ہر حیثیت سے بلند ترین ہی کرنا چاہتا ہے۔

حضرت سیماب کا کلام کسی خاص تعارف کا محتاج نہیں، کلام کے سرسری مطالعے سے صاف نظر آرہا ہے کہ جوں جوں شاعر عمر رسیدہ ہوجاتا ہے، اس کی بلندی فکر میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور استادانہ پختگی ہر شعر میں جلوہ فرما نظر آتی ہے بعض شعر ایسا ہوتا ہے کہ ناظر جھوم جاتا ہے۔ کبھی دل پکڑ کر رہ جاتا ہے۔ اور کبھی مدہوش ہوجاتا ہے۔ زبان سیماب کا کیا کہنا، "اردوئے معلے کے مالک ہیں"۔ چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل کئے جاتے ہیں:۔

منزل ملی، مراد ملی۔ مدعا ملا　　سب کچھ مجھے ملا جو ترا نقش پا ملا

سرگشتۂ جمال کی حیرانیاں نہ پوچھ　　ہر ذرے کے حجاب میں اک آئینہ ملا

جلوہ گاہ دل میں گھٹتے ہی نہ ہیرا ہو گیا　　جس میں تم جلوہ تھے وہ آئینہ کیا ہو گیا

دل کھنچا جتنا قفس میں آشیانے کی طرف　　وہ اتنا ہی قفس سے آشیانہ ہو گیا

اٹھا ہے حسن پھر محفل سے پیغام وفا لیکر　　نیا اب شیوۂ آئین و نیائے وفا ہو گا

وفاؤ حسن مل کر اک نئی دنیا بنائیں گے　　نہیں معلوم کب ہو گا وہ عالم اور کیا ہو گا

وفا کے گیت جب حسن و محبت مل کے گائیں گے　　وہ دور عاشقی سیماب کتنا دلربا ہو گا

وہ نور چمن بن کر برسات میں آتے ہیں　　منظور ہے بوندوں کو پروانہ بنا دینا

تمہید خرابی کی تکمیل خدائی ہے　　اک بت کا بنانا ہے بتخانہ بنا دینا

کسی کو تو نہ ملا اور کھو دیا سب کو　　تری تلاش میں گم ہو اک زمانہ ملا

وفا کی سطح سے گندی ہوئی ملی دنیا　　غرض کے رنگ میں ڈوبا ہوا زمانہ ملا

مثال نکہت آوارۂ گل چار سو ہو جا　　سکوں چاہے تو آزاد قیود رنگ و بو ہو جا

اگر تو چاہتا ہے آرزو تیری کرے دنیا　　تو دل پر جبر کر کے بے نیاز آرزو ہو جا

تصور میں کسی کی طلعتوں کا منتظر کیوں ہے　　خدا بن یا آئینہ بن جا، خود اپنے روبرو ہو جا

غرض تو صرف اے سیماب ہستی کا مٹانا ہے　　نتیجہ ایک ہی ہے خاک ہو جا یا لہو ہو جا

ہستی و نیستی کی حدیں دور رہ گئیں　　یہ آ گیا کہاں میں تجھے ڈھونڈتا ہوا

محفل کسے دکھاؤں کہ ہے زندگی اداس　　اب شمع کیا جلاؤں کہ ہے دل بجھا ہوا

ہمیں یقین ہے کہ تمام ہمدردان ادب کلیم عجم کو خرید کر خدمت ادب کا ضروری فرض انجام دیںگے۔

"م"

بادۂ مشرق حصہ اول

معنف و مرتبہ، ساغر نظامی ایڈیٹر ایشیا۔ میرٹھ

قیمت عہ۔ پانچ روپیہ۔

ملنے کا پتہ (۱) حضرت ساغر میرٹھ۔ (۲) کلیم بک ڈپو۔ فتح پوری دہلی۔

حضرت ساغر نظامی میرٹھی، حضرت سیماب اکبرآبادی کے شاگرد رشید ہیں۔ انہی کے کلام کا مجموعہ "بادۂ مشرق" حصہ اول کی حسین صورت میں جلوہ گر ہوا ہے، یہ مجموعہ جس کی ضخامت ۲۰۰ صفحات سے کم نہیں، چھوٹی بڑی ۵۸ نظموں اور گیتوں پر مشتمل ہے، غزلیات اس کے علاوہ ہیں۔ نظر پہلے حسن ظاہری پر ہی پڑا کرتی ہے، اور ظاہری حسن جب اپنی طرف کھینچتا ہے، تو آدمی حسن باطنی کا متوقع ہو جاتا ہے، بادۂ مشرق کا حسن طباعت و ترتیب اردو کی مطبوعات حاضرہ میں اپنی مثال آپ ہے۔ ہر باب از

ہر عنوان کہتا ہے کہ ساغر صاحب شاعر ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن ذوقِ مصوری سے کیا حقہٗ بہرہ ور ہیں۔

بادۂ مشرق کو بارہ مختلف ابواب پر منقسم کیا گیا ہے۔ ہر باب کا عنوان شاعرانہ کیف سے مخمور نظر آتا ہے۔ مثلاً "صبح نو" ـ "ہدیہ روح"۔ "پیامِ سروش"۔ "صنم کدۂ حیات"۔ "رموزِ میکدہ"۔ "جرعۂ آخریں"۔ "ساغرِ مستان"۔ "روحِ بادہ" وعلیٰ ہذا۔ لیکن جب رموزِ باطن کی تلاش کے لئے ورق گردانی کی جاتی ہے۔ تو اکثر یہ دل چاہتا ہے کہ "بس اس نظم کو پڑھیئے اور پڑھتے رہیئے، نہ معلوم دوسری نظم لطف کو بے مزہ نہ کردے" لیکن جب ڈرتے ڈرتے دوسری نظم کو شروع کیا جاتا ہے، تو اکثر وہی کیفیت پھر پیش آتی ہے۔ بلکہ بعض دفعہ وہ سرور و کیفیت جرعاتِ بادہ پیدا کرتے ہیں کہ روح وجد کرتی ہے اور قلب سرشاری و سرمستی کے کیف میں گم ہو جاتا ہے۔

بادۂ مشرق نے اردو زبان میں ادائے تخیل کی جدید داغ بیل ڈالی ہے جس کو محترمی مولوی عبدالحق صاحب نے جدید فارسی شاعری کے تتبع سے تعبیر کیا ہے بعض دفعہ یہ طرزِ جدید بہت دلکش اور رس بھری معلوم ہوتی ہے۔ اور اس پر ہی کچھ موقوف نہیں "بادۂ ساغر تمام تر رسیلا ہے۔ اور اپنے رسیلے پن کو شاعر نہ میکدے میں بھولتا ہے اور نہ سیاسی مجالس و مباحث میں، یہ رس شاعر نے گوکل، بندرابن کی "بنیوں" اور جمنا کے کنارے کے "بیلوں" کے گلبار درختوں کے پھولوں میں سے بھونرا بن کر چوسا اور چوس کر بادۂ مشرق میں ملا دیا ہے۔ چنانچہ اکثر جہاں اس سے برج بھومی کی بولی الگ ہو جاتی ہے، وہ مٹھاس بھی گم ہو جاتی ہے، جو اس کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔

بادۂ مشرق کا ساقی اول درجہ کا وطن پرست ہے۔ وہ ہندوستان سے محبت کرتا ہے۔ اس کے ہر خار کو وہ گل اور ہر گل کو حسین بلبل سمجھتا ہے۔ آزادیٔ ہند اس کا قصرِ آرزو ہے۔ اور ہر وہ شے جو اس قصر تک اس کو پہنچنے سے روکتی ہے، اس کا وہ دشمن ہے اور اس کی شکل دیکھتے ہی وہ جوشِ غضب میں کپڑے سے باہر ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ضرور کہنا چاہیئے کہ وہ ارتقائی دور میں سے گذر رہا ہے۔ اور بلندی کی طرف اڑ رہا ہے۔ اور ابھی وہاں تک نہیں پہنچا، جہاں پہنچکر شاعر "صاحب فکر" کہلاتا ہے۔ کیونکہ "صاحب فکر" وطنیت قومیت اور جنسیت کی قید و بند سے آزاد ہے۔ وہ صرف انسانیت کا مبلغ ہے، بہی خواہ ہے۔ اور اس کی نظر عرب و عجم، ہند و فرنگ سے گذر کر سارے کرۂ ارضی کے لئے سکون و راحت کی متلاشی رہتی ہے۔ ہمارا اس سے یہ مقصد نہیں کہ وطن پرست بننا گناہ ہے بلکہ وہ "سیڑھی" ہے اس بامِ کامرانی کی۔ جہاں ایک صاحبِ فکر کے لئے پہنچنا مقدر ہو چکا ہے۔ خدا کرے ایسا نہ ہو کہ ہمارے مہربان دوست اس پہلی منزل کی بھول بھلیاں میں ہی بھٹک کر رہ جائیں۔

دل چاہتا تھا۔ کہ حضرت ساغر کے بادۂ خوش رنگ کو جرعہ جرعہ کر کے پیا جاتا۔ اور ہر قطرہ کی لذت اور کیف سے ناظرینِ کلیم کو آشنا کیا جاتا لیکن افسوس ہے کہ مارچ کا رسالہ تیار ہے۔ اور رسالہ کا یہ تقاضا ہے کہ "حضرت کیا "بادۂ مشرق" کا کوئی ذکر اس دفعہ بھی کلیم میں نہ ہوگا" اس لئے مجبوراً اس نامکمل تبصرے کو یہ عرض کر کے ختم کیا جاتا ہے کہ بادۂ مشرق ہر صاحبِ ذوق کے پڑھنے اور دیکھنے کے قابل ہے۔ اور کسی بھی لائبریری میں اس کا نہ ہونا بہت بڑی کمی ہے۔

بشرطِ فرصت حضرت ساغر کے اس ہدیۂ گراں مایہ پر ایک مکمل مضمون سپردِ قلم کرنے کا ارادہ ہے۔ تاکہ پوری طرح ہمارے قابلِ فخر دوست کے جذبات و حسیات کو اربابِ ذوق آشنا ہو سکیں۔

"م"

ایمان اکبر

مؤلفہ۔ حکیم مفتی سید علی اکبر صاحب، دولت پوری۔

قیمت ۲/

ملنے کا پتہ۔ عبدالرزاق خاں فیض آبادی ایجنٹ اخبارات پوسٹ بکس ۳۳۲ مکان نمبر ۱۶۲، ماہ اسٹریٹ۔ رنگون۔

مفتی صاحب موصوف نے یہ چھوٹی سی کتاب مسلمانوں کے افادۂ دینی کے لئے لکھی ہے۔ اور اس کوشش کا دعوے کیا ہے کہ "طرزِ بیان ایسا ہو کہ لہو باز طبیعتوں کو پڑھنے اور سننے پر اپنا گرویدہ بنائے رہے"۔ جو لوگ دینی شغف رکھتے ہیں، وہ پتہ مندرجہ بالا سے اس کتاب کو طلب کر سکتے ہیں۔ جس میں توقع ثوابِ جارین کی کشش کم از کم ضرور موجود ہے۔

"م"

جذباتِ خادم الموسوم بہ روحِ جذبات

مؤلف و مصنف۔ محمد خادم حسن قامنوی گدڑی شاہی منتظم محی الاوقاف معین گدڑی شاہی انجمن اجمیر۔ حضرت مصنف جو کسی گدڑی شاہی "سلسلۂ صوفیہ" سے تعلق رکھتے ہیں، ۱۰۴ کے ساتھ ۹۰ صفحات پر اپنا کلام شائع کرایا ہے، جو دو حصص "عقیدت" و "عشق و محبت" پر منقسم ہے۔ پہلا حصہ میں قوالوں، نعت خوانوں، و مولود خوانوں کے لئے جن کے سرود سے ہماری درگاہیں، مزارات و مجالس پر کیف ہیں، کافی سامان موجود ہے۔ دوسرا حصہ "عشق و محبت" اس کے کیا کہنے کہ نفسِ مضمون ہی بہت وسیع ہے۔ قیمت ۸/ ہے۔ اہلِ ضرورت مندرجہ بالا پتہ سے طلب فرما سکتے ہیں۔

"م"

مشرقی عظمت کا علمبردار

جاپان

مصنفہ چمن لال صاحب جرنلسٹ — مترجمہ محمود علی خاں صاحب (جامعی)

آج سے صرف ۸۰ برس پہلے جاپان جس سے اب ایشیا کا نام روشن ہے بالکل گمنامی میں پڑا تھا لیکن اس مختصر مدت میں اس نے وہ حیرت انگیز ترقی کی ہے کہ اس کا شمار دنیا کی زبردست طاقتوں میں ہونے لگا ہے، اس انقلاب کی داستان اس زبردست تصنیف میں ملاحظہ کیجیے۔ یہ کوئی سفرنامہ نہیں ہے کہ چند حالات و واقعات پر سرسری نظر ڈالی گئی ہو، بلکہ ایک مبصرانہ تصنیف ہے جس میں تمام حالات کا غائر مطالعہ اور جاپان کے عروج پر مفصل بحث ہے مصنف نے ساری کتاب میں یہ بات پیش نظر رکھی ہے کہ ہمارا ملک جاپان سے کیا سیکھ سکتا ہے۔ سائز ۲۲×۱۸/۱۶ کاغذ ۲۸ پونڈ، ضخامت ۲۲۵ صفحات، بلاک کی تیس تصویریں۔ سرورق خوبصورت، مجلد عہ بلاک کی ۱۱ تصاویر۔ غیر مجلد عہ۔

پتہ:- مکتبہ جامعہ دہلی

انشائے لطیف

ادیب العصر حضرت لطیف احمد صاحب اکبر آبادی کے افسانے

اردو ادب میں صاحب "لالہ رخ" کا نام محتاج تعارف نہیں اور افسانہ نویسی کا جو معیار ل احمد صاحب نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ تنہا ایک مثال ہے۔ اُن کا ہر افسانہ علم و حکمت، جذبات، واردات، اور نفسیات حسن و عشق کے نازک ترین اشارات کا حامل ہوتا ہے، اُن کا طرز انشا شعریت اور تفلسف اردو ادب میں مستقل اضافات ہیں، ل احمد صاحب کے افسانے بلا شائبہ، ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں، انشائے لطیف ل احمد صاحب کے پندرہ شہ پاروں کا مجموعہ ہے، جو اکثر نگار اور دیگر مجلات علمیہ و ادبیہ میں طبع ہو کر مقبولیت دوام حاصل کر چکے ہیں، اس لئے اگر آپ کو سلاست و نفاست زبان کے ساتھ نفسیات شباب اور جذبات حسن و عشق کی صحیح نقاشی سے کوئی خاص لگاؤ ہے، اگر آپ ادب و شعریت کا ذوق سلیم رکھتے ہیں تو اس مجموعہ میں آپ کو اپنی طلب و تشنگی کیلئے مکمل سامان سیرابی نظر آئے گا، طباعت و کتابت روشن و بہترین ہونے کے ساتھ کراؤن سائز پر تقریباً ۲۰۵ کی ضخامت۔ نفیس جلد قیمت عہ علاوہ محصول۔

منیجر کلیم بک ڈپو، کٹرہ بڑیاں، فتح پوری دہلی سے طلب فرمائیے

دنیائے ادب میں ایک تازہ ترین اضافہ

خمارستان

کیا ہے؟

یہ اساتذۂ حال کے گلِ سرسبد. نظم ونثر کے لاثانی قلمکار، وجدانیت کے حقیقی سحر نگار، جہان استاد، افسر الشعراء حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی کا تازہ شاہکار ہے، یہ ان جمالیات کا مجموعہ ہے جن سے آج تک نثر عاری تھی، یہ وہ مضامین ہیں جنھیں شمس العلماء مولانا آزاد، ڈاکٹر نذیر احمد، علامہ شبلی نعمانی کے بعد ہندوستان کا لٹریچر آج تک پیش نہ کر سکا. خمارستان قلعۂ معلّیٰ کی ٹکسالی اردو اور شستہ و رفتہ بولی سے آراستہ ہے، صاحبانِ ذوق کی ضیافتِ طبع کے لئے شائع کی جا رہی ہے. ع

اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

ابھی سے اپنا اسمِ گرامی خریداروں کی فہرست میں لکھوا لیجئے۔

منیجر کلیم بک ڈپو کٹرہ پریاں دہلی

رسالہ "کلیم" کے ایجنٹ

مولوی عبد الرزاق خاں نظامی ۱۷۲ بار اسٹریٹ رنگون،

محمد شفیع صاحب نیوز ایجنٹ ۱۴۱- ذکریا اسٹریٹ کلکتہ ۔ منیجر سعیدیہ بک ایجنسی بھوپال

میاں غلام محمد صاحب اینڈ سنز نیوز ایجنٹ چوک انارکلی لاہور ۔ احمد حسین صاحب نیوز ایجنٹ سبزی باغ بانکی پور پٹنہ

احمد بخش صاحب مالک کتب خانہ ادبیہ، سول ایجنٹ اخبارات۔ کارنر جے ہاسپیٹل بمبئی نمبر ۹

اکرام الدین صاحب قدوائی ایجنٹ اخبارات محلہ تلیا بنارس۔ صادق کمیشن ایجنٹ بازار قصہ خوانی پشاور

قوام

بوئے لبِ گلرنگ جوانی کی

دل و دماغ کی قوت

اور

دیگر طبی فوائد کے ساتھ ساتھ

اگر حقیقت میں مہکتی ہوئی سانس بجائے خود کوئی نعمت ہے اور لبوں سے منہ اندھیرے کھلتی ہوئی کلیوں کی سی خوشبو کا آنا اگر در اصل اپنی جگہ ایک دولت بیدار ہے تو ہم آپ کو مشورہ دیں گے کہ ہمارے کارخانہ کی روپہلی سنہری گولیاں، ہمارا لاجواب زردہ اور ہمارا معطر قوام آپ پان کے ساتھ ساتھ ضرور استعمال فرمائیں

اور دیکھیں کہ

آپ میں مسیحا نفسی پیدا ہوتی ہے کہ نہیں ؟

احمد حسین دلدار حسین

تاجر تمباکو ئے خوردنی چوک لکھنؤ

سو شعر کا سِٹ

جگر۔ اصغر، حسرت، میر، غالب اور جوش کے

ایک ایک سو بہترین اشعار

ہر شخص کو ہر شاعر کا سب کلام پڑھنے اور اس کی شاعری کے متعلق رائے قائم کرنے کا موقعہ نہیں ملتا ہے۔ اسی خیال سے یہ سلسلہ جاری کیا گیا ہے۔ ہر کتاب میں دورِ جدید یا دورِ قدیم کے ایک ممتاز شاعر کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام سے منتخب کرکے بہترین سو شعر دیے گئے ہیں، ساتھ ہی سوانح حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔ باوجود اختلافِ مذاق کے نصف سے زیادہ اشعار آپ کو اپنی پسند کے ملیں گے۔

جیبی سائز۔ کاغذ، کتابت، طباعت دیدہ زیب، سرورق خوشنما

جس پر ہر شاعر کی تصویر بھی ہے

قیمت فی کتاب چار آنے

مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

حضرتِ جگر مرادآبادی کے کلیات

شعلۂ طور

کی سول ایجنسی مکتبۂ جامعہ دہلی کو مل گئی ہے

اس لئے

شائقین وہیں سے طلب فرما سکتے ہیں

قیمت تین روپے

داستانِ عشق — کس کی؟ — انکی

جو سب سے زیادہ پاک نام لے کر سب سے زیادہ ناپاک کام کرتے ہیں!
جو عباؤں اور ڈاڑھیوں کے سائے میں رینگتے ہوئے سانپ ہیں!
جو مذہب کی تحقیق صرف اس لئے کرتے ہیں کہ مذہب کی جڑوں کو کاٹ دیں!
جو وظیفے اس لئے پڑھتے ہیں کہ سادہ لوحوں کی دولت اور اُن کی عورتوں پر قبضہ کریں!

پاپائے رُوم کی داستانِ عشق

از ملک حسیب احمد بی۔ اے آنرز

پڑھئے اور دیکھئے کہ تقدس اور روحانیت کی عبا میں حُسن کس کس رنگ میں جلوہ گر ہوا، فاحشہ عورتوں نے خدائی سلطنت پر کیوں کر حکومت کی، کس پوپ نے اپنی بھابی سے عشق کیا، کس پوپ کی سُونی آغوش اپنی بھتیجی سے آباد ہوئی، کس پوپ کے حمام میں جوان عورتوں کو اذن عام تھا، کونسا پوپ اپنی حقیقی بھانجی کو دل دے بیٹھا، کن جمالوں کے اشارۂ چشم پر مسیحی دنیا ناچتی تھی، کیوں کر ایک عورت پوپ بنی، اور وضع حمل سے یہ راز کیوں کر فاش ہوا، ایسے ایسے بیسیوں سنسنی خیز اور حیرت انگیز سچے واقعات دیکھئے، کہ شبستانِ محبت میں کافر جوانی بیتاب جذبات کی آغوش میں کیوں کر مچلی، جب مسیحی دنیا حضرت علیٰؑ کے پاک نام پر قربان ہوئی جاتی تھی تو سُنئیے کہ پوپ کے محلوں میں آنند کی مُرلی نے کیسے کیسے سُریلے گیت گائے۔ صاحب نظر فاضل مُصنّف نے اس اچھوتے موضوع پر شباب کی رعنائیوں میں ڈوب کر پیاری پیاری زبان میں دیر و حرم کے پردے اُٹھا کر کیسے کیسے صنم بے نقاب کر دئے ہیں!

کتاب نہایت دلچسپ ہے۔ قیمت ۱۲ علاوہ محصول

اپنا آرڈر جلد بک کرائیے۔ کتاب کی مانگ از حد بڑھ رہی ہے

ملنے کا پتہ: **منیجر کلیم بک ڈپو کھٹرہ بڑیاں دہلی**

عورتوں کا بہترین اور سب سے سستا

رسالہ

لیلیٰ

(دورِ جدید)

جو پہلے نیرنگِ خیال بک ڈپو لاہور سے شائع ہوا کرتا تھا

اب

ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی سے بہتر صورت میں شائع ہوگا

دورِ جدید کا پہلا پرچہ یکم مارچ تک شائع ہو جائیگا

سالانہ چندہ صرف تین روپیہ بذریعہ منی آرڈر، بذریعہ وی پی ۳ ؍ علاوہ محصول

قیمت فی پرچہ ۴ ؍

ہر ماہ حجم ۸۰ صفحات، تصویر آرٹ ۱ - فوٹو بلاک کی تصاویر ۴ عدد - سائز نہایت خوبصورت

ادارہ

نگران ـ مصور درد سید فرید جعفری مجھلی شہری آنریری ایڈیٹر حکیم یوسف حسن صاحب چیف ایڈیٹر نیرنگِ خیال لاہور
ایڈیٹرس ـ بیگم عبدالحفیظ المنہوی ـ معاونین ـ وزیر بیگم ضیاؔ (لاہور) آمنہ دیوی پریاگی مس اختر حسن (الہ آباد)
شوکت دہلوی دہلی گوہر اقبال حمد مس محمودہ ضیا شاہ جہاں بیگم دہلی مس شگفتہ دیوی (بنارس)

خط و کتابت کا پتہ ـ منیجر رسالہ لیلیٰ دہلی

افسانوں کی کتابوں میں زبردست اضافہ

"آنسو"

جو

ہندوستان کے مشہور صحافی ادیب اور افسانہ نگار حضرت فرید مچھلی شہری مصور درد

کے

۲۴ دردبھرے افسانوں کا نہایت حسین و جمیل مجموعہ ہے

جس میں

مدیر کلیم شاعر انقلاب حضرتِ جوش ملیح آبادی
ادیب العصر حضرتِ ل۔ احمد اکبرآبادی
حضرتِ سلطان حیدر جوش بی اے۔ ڈپٹی کلکٹر علی گڈھ
لسان القوم ساغر نظامی

کے مقدمات شامل ہیں، ہر افسانہ انقلاب کا پیامی ہے اور جہدِ حیات کا صحیح رہنما
نیا اسلوب بیان، میٹھی خالص ہندوستانی زبان اور نہایت دردناک پلاٹ

چند افسانوں کے عنوان

مزدور کی بیوی، بی اے پاس مزدور، روٹی کا ٹکڑا، پھول کے ٹکڑے، مرجھایا ہوا پھول، ٹھنڈی بجلی،
پریم کی بھینٹ، اشنان، پجارن، دل کا غم، بڑھاپا کا پہلا جوانی کی ... ہار،
شکست کی ہنسی، سماج کی گردنیں، ش... ...ن، ... ...
خوبصورت سائز، سہ رنگا ... ...

قیمت رعایتی ... ...

ملنے کا پتہ۔ ...

بدمعاش کی ڈائری

۵ر اپریل ۱۹۰۵ء

"لمبی لمبی ... کے نیچے میری پیشانی ستارہ کی طرح چمکتی ہے۔ اس لئے آدمی مجھے انجم کہتے ہیں میں نے سائنس نہیں پڑھی، اور نہ اس کی ندانی پر مجھے ہمیشہ فخر رہا ہے، پھر بھی ایک ہم جماعت کو ورغلا کر کالج کے سائنس کے کمرہ سے آتش گیر مادہ اور ———— ایک دھماکہ ———— بم کے گولے بنانے کا تجربہ کرانا میرا روزمرہ کا عمل رہا ہے ۱۸۵۷ء کے غدر کی تاریخ میری میز پر رہتی ہے۔ اس کا ایک ایک ہیرو میری نگاہ میں فوجی جرنیل سے کم حیثیت نہیں رکھتا۔ میں اپنے تئیں قلمرو ———— کا بادشاہ سمجھتا ہوں، اور اس تصور سے خوش ہوتا ہوں جبکہ فوجی پرے مارچ کرتے ہوئے میری تخت نشینی کے روز سلامی اُتاریں گے، اور دنیا کی حسین ترین عورت میری ملکہ بن کر ————

ابھی زندگی ایک معمہ بن گئی ہے۔ طبیعت اشتراکیت کی تحریک کی طرف مائل ہے۔ لیکن پیٹ بھی تو بھرنا ہے۔ اس لئے میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اچھے لوگوں پر اپنی نیک سیرتی کا اعتماد پیدا کرکے دھوکا دوں۔ اور روپیہ بٹوروں، اب شادی تو کر رہا ہوں ایک اچھی جگہ پر، بھولی بھالی لڑکی پھنسے چڑھ گئی ہے، بیوقوف پیتل کو سونا سمجھ کر میرے جال میں پھنس گئی، دنیا کہتی ہے کیرکٹر پیدا کرو۔ لیکن میں کیرکٹر کو لیکر کیا چاٹوں، اس سے اونچا تو روپیہ ہے، روپیہ اور روپیہ اب تک زندگی کا یہی مقصد رہا، اور جب تک میرا شیطان میری مدد کر رہا ہے، اسی اصول پر چلوں گا۔ میں بھی خوب ہوں، جو ملتا ہے اُسے پھانس لیتا ہوں۔ اور اُس وقت تک اپنے خلوص کا اظہار کرتا ہوں جب تک کہ اُس کی جیب خالی نہ کر دوں۔ مکر و دغا میرا ایمان ہے، اور روپیہ میرا خدا ہے ———— اپنے محسن کو دھوکا دینا میرا فرض ہے، میرے عزم و استقلال کے آگے فاصلہ کوئی چیز نہیں ———— کلکتہ سے ———— گڑھ۔ گڑھ سے ———— آباد اور آباد سے قطب صاحب کی لاٹ کے پاس، اور آگے خدا جانے کہاں کہاں ————"

یہ اس دلچسپ کتاب کا **اقتباس** ہے جس کو ———— لکھ رہے ہیں۔ یعنی وہ ایک ایسے بدمعاش کی زندگی کا مرقع ہے جو ہمیشہ ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتا رہا ہے ———— ادیبوں کو ادیب بن کر، طلباء و اساتذۂ یونیورسٹی کو ایک اچھا ذہین طالب علم بن کر، دوستوں کو ایک اچھا دوست بن کر، نوجوان لڑکیوں کو ایک وفا پرست عاشق بن کر، وطن پرستوں کو فدائے ملت و وطن بن کر، اشتراکی کارکنوں کو خالص دشمن سرمایہ داری بن کر، غیر ملکی زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود اُس کا فرضی ادیب بن کر، بڑے بڑے مولویوں پر اپنی کالی کالی زلفوں اور رسیلی آنکھوں کا جادو ڈال کر لوٹتا اور دھوکا دیتا رہا ہے ———— کتاب از حد دلچسپ ہوگی ... صفحات ... قیمت صرف ... علاوہ محصول۔ ملنے کا پتہ: **مینیجر کلیم بک ڈپو کٹرہ چڑیاں دہلی**



ہماری آئندہ نسلوں کی ترقی

عورتوں

... اگر اچھی تربیت یافتہ نہ ہوں ...
... دنیا میں ترقی نہیں کر سکتے۔
... صحیح تعلیم و تربیت دینے کے لئے

رسالہ **حریم** لکھنؤ

... سال کے لئے ...
... **مشرقی عورت** کے لئے ...
... افسانے، مضامین، نظمیں، تاریخی واقعات ...
... تعلیم و تربیت ...
... حریم کی خریداری کافی ہے

چندہ سالانہ صرف تین روپیہ

منیجر حریم ... لکھنؤ

شاعرِ انقلاب، مصورِ جذبات حضرت

جوش کی تازہ تصنیفات

ہر کتاب کی قیمت

ایک روپیہ عہ آٹھ آنے

علاوہ محصول ڈاک

روحِ ادب — جوش ملیح آبادی

آتشکدہ — جوش ملیح آبادی

افکار — جوش ملیح آبادی

شعر و حکمت

REGD. No L 3694

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدر اعظم سے کہا، دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں، تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کرسکوں، تعمیل حکم کے لئے فردوس شال کشمیر، جنت نظیر سوئٹزرلینڈ، شباب انگیز تسمانیہ اور حسن پاش مرغزار روس میں تگ و دو کی گئی ——— جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے، تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے، اور باقی اس قدر مرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی حسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی، مہارانی اس خواہش کو پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی کھانا پینا ترک کردیا، مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا، اور وزراء سے مشورہ طلب کیا مہتمم توشہ خانہ نے **اصغر علی محمد علی** سے عطر منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی، فوراً عمل کیا گیا، جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا:

اصغر علی محمد علی، تاجران عطر، لکھنؤ و دہلی

بنام قوت و حیات



سالانہ چندہ - چھ روپے
ششماہی چندہ - تین روپے

اردو زبان کا ہر جہت سے قیمتی ماہنامہ

جملہ حقوق محفوظ
قیمت فی پرچہ - نو آنے

جلد | فہرست مضامین ماہ مئی سنہ ۱۹۳۶ء | نمبر ۵

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے گوردھن پرنٹنگ پریس فتح پوری میں چھپوا کر دفتر کلیم دہلی سے شائع کیا)

اشارات

(۱) "کلیم" کی رفتار ترقی بہت امید افزا ہے، اور قرائن خود بخود ایسے پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں جن سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا مستقبل نہایت درخشاں ہوگا۔

(۲) رسالے کی امداد کے سلسلے میں مجھ پر شکریہ واجب ہے، ہندوستان کے جواں مرد والیٔ ملک یعنی ہز ہائنس مہاراجہ پٹیالہ، اور سر میرزا اسمٰعیل دیوان میسور کا، کہ انہوں نے اودھ کے روسا کی طرح بے اعتنائی نہ برتتے ہوئے "کلیم" کی معقول امداد کر کے حوصلہ افزائی فرمائی۔

رؤسائے اودھ پر اردو زبان کا جس قدر حق ہے، وہ ظاہر ہے، اس کے علاوہ چونکہ میں بھی تعلقدار خاندان کا ایک فرد ہوں، اس لئے برادرانہ حیثیت سے بھی ان پر لازم تھا کہ میرا ہاتھ بٹاتے، لیکن ان میں سے ایک کے علاوہ کسی نے بھی کوئی توجہ نہیں کی۔

وہ "ایک" جنہوں نے توجہ فرمائی، میرے محترم کرم فرما راجہ سید ابوجعفر صاحب مغفور کے صاحبزادے سید حیدر مہدی صاحب تعلقدار پیر پور ہیں۔ جو صرف تعلقدار کی حیثیت ہی سے نہیں، بلکہ شرافت، علمیت اور حسن اخلاق میں بھی اپنے قابل فخر باپ کے صحیح وارث اور جانشین ہیں۔

(۳) گاڑی کے پلیٹ فارم پر رینگتے ہی پوری رفتار کی امید تو نہیں کی جا سکتی ظاہر ہے کہ ہر رسالہ پورے ایک سال کے بعد اپنے مضمون نگاروں کا حلقہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوا کرتا ہے، پھر بھی یہ بڑی مسرت کا باعث ہے کہ کلیم سرعت کے ساتھ ایسے مضمون نگار پیدا کر رہا ہے جو اس کے مقاصد کو بروئے عمل لا سکتے ہیں اور ایک ایسی ذہنی فضا پیدا کر سکتے ہیں جو تندرست و امید افزا ہو۔

کوشش کی جا رہی ہے کہ مشہور مضمون نگاروں کو "کلیم" کے سانچے میں ڈھالا جائے اور غیر مشہور حضرات کو جو ہر طرح کی صلاحیتوں سے معمور ہیں، پردۂ غیب سے نکالا جائے۔

غیر معروف حضرات میں سے سید انور علی بی۔ اے، اور اسرائیل احمد خاں تو بزم کلیم میں آ ہی چکے ہیں اور ثابت کر چکے ہیں کہ تفکر و انشا پردازی کسے کہتے ہیں اور عبدالرحیم شبلی صاحب کے مضامین بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ وہ کس قدر محنت و جانفشانی اور عرق ریزی سے مرتب کئے جاتے ہیں اور ان سے ہندوستان کو کس قدر فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ عنقریب کئی قابل ناز حضرات اور پیش کئے جائیں گے جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں، حکیم احمد صاحب۔ ڈاکٹر ضیا عباس صاحب ہاشمی اور منظر صاحب۔ حکیم احمد صاحب فلسفیانہ دماغ رکھتے ہیں، ڈاکٹر ضیا عباس صاحب ادبی اور منظر صاحب بند [illegible]

(۴) تھوڑے دن ہوئے کہ میں ایک مجتہد العصر کی زیارت کے لئے ان کے دولتکدے پر گیا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ برآمدے میں چند ترس آنے کی حد تک دبلے پتلے مومنین مرعوبیت و انتظار کی فضا میں بیٹھے ہوئے اونگھ رہے ہیں۔ میں بھی ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ دبلے مومنوں نے مجھے اس طرح دیکھنا شروع کیا گویا وہ چاندنی رات میں کسی دور کی شے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کامل آدھ گھنٹہ کے انتظار کی الجھی ہوئی گرم سانسوں کے بعد یکایک نعرۂ "صلوٰۃ" بلند ہوا، اب جو نظر اٹھائی تو دیکھا کہ مجتہد صاحب آنکھوں کو جھکائے اور جسم کو چرائے ہوئے اس طرح چلے آ رہے ہیں گویا آدھی رات کی تاریکی میں کوئی سہمی ہوئی سازش حرکت کر رہی ہے۔

میں نے بڑھکر سلام کیا جس کا اس طرح جواب دیا گیا جس طرح ہندوستانی لڑکیاں ایجاب وقبول کے وقت "ہوں" کرتی ہیں۔ میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ قبلہ وکعبہ نے اپنی انگوٹھیوں سے آراستہ انگلیوں کی نوکوں کو میری انگلیوں سے بسرعت تمام مس کرکے فوراً ہاتھ کھینچ لیا، میری انگلیوں کو وہ مس بالکل ایسا معلوم ہوا گویا خواب میں کسی دیوی کا آنچل ہوا دیتا ہوا نکل گیا۔

اتنے میں ایک دیہاتی وضع کے موٹے تازے بزرگ۔ جن کی سیڑھیوں پر چڑھنے سے سانس چڑھ رہی تھی۔ اور مونچھوں کے پولے لہلہا رہے تھے، گھبرائے ہوئے آئے۔ اور بغیر دم لئے ہوئے جیب سے ایک پرچہ نکال کر قبلۂ کعبہ کی جانب بڑھا دیا، "حضور اس پر دستخط فرمادیں"۔

دیہاتی مومن کی اس خلاف آداب عجلت پسندی پر تمدن کے آغوش کا پلا ہوا اور معتقدین کی پابوسیوں کا پروان چڑھایا ہوا اجتہاد چیں بجبیں ہوگیا بگڑ گیا۔ تیوریوں میں بل پڑگئے، اور "مجھے اس وقت فرصت نہیں ہے" کا انتقامی جواب دے کر قبلہ وکعبہ نے منہ پھیرلیا۔ اور اس برہم ہوکر منہ پھیر لینے نے غیر ملفوظ طور پر کہا۔ "دیہاتی، بدتمیز۔ اجڈ۔ گنوار"۔

لیکن دیہاتی مومن دھن کا پکا، اور عقیدت میں راسخ تھا۔ اس کا پرچہ در انگشت ہاتھ قبلہ وکعبہ کی جانب بلند ہی رہا، "آپ پرچہ لے جائیں"۔ مجتہد العصر نے پھر جھڑک کر کہا۔ "حضور! میری گاڑی میں صرف دو گھنٹے باقی ہیں۔ اور کام اس قدر ضروری ہے کہ میں ٹھہر بھی نہیں سکتا ہوں۔ قبلہ وکعبہ کی بڑی پرورش ہوگی اگر اس پرچے پر اس وقت دستخط کردیں"۔ دیہاتی مومن نے بڑی لجاجت کے ساتھ عرض کیا۔

لائیے، پرچہ لائیے، وقت، ناوقت لوگ پریشان کیا کرتے ہیں"۔ قبلۂ کعبہ نے یہ کہہ کر پرچہ دست مبارک میں لے کر پڑھنا شروع کیا۔ پرچہ پڑھنے کے وقت قبلہ وکعبہ کا چہرہ مئی جون کے آسمان کی طرح روکھا، اور کھرا ہوا تھا۔ اور آسمان سے آواز آرہی تھی، "اخاہ رے مادّے"! پرچہ پڑھکر قلم اٹھایا اتنے زور سے دستخط کئے کہ روشنائی کی چھینٹیں دور دور تک پھیل گئیں، اور صریرِ قلم سے سب وشتم کی آوازیں آنے لگیں۔

تیکھے تیکھے کی رتازدے غیظ میں تلی ہوئی آواز کے ساتھ مجتہد العصر نے دستخط کرکے پرچہ ان کی طرف پھینک دیا ——— یہ دیکھتے ہی حضور مہر مہر کی گھبرائی ہوئی آواز دیہاتی مومن کے گلے سے نکلی۔ اور اس آواز کے سنتے ہی قبلہ وکعبہ نے اپنے ملازم کو گرج کر صدا دی۔ "مہر لاؤ، مہر لاؤ"۔ "مہر لاؤ، مہر" کے لہجے میں وہی گونج تھی جو کھو کھلے امیروں کی "کوئی ہے" کی فرعونی آواز میں پائی جاتی ہے ——— ملازم نے دہشت زدہ ہوکر مہر پیش کردی، گھبراہٹ اور خوف سے اس غریب کے رنگ پٹے اسپنج کی طرح پھول کر رہ گئے۔

قبلہ وکعبہ نے کاغذ پر ثبت فرمانے کے لئے مہر بلند کی، اس انداز سے گویا کسی کافر کا سر کچلنے والے ہیں ——— اٹھے ہوئے ہات کی انگوٹھیوں کے فیروزے چمکے، مہر لگنے کی دھم سے مہیب آواز آئی ——— دیہاتی مومن اچھل پڑا، ——— مہر ثبت فرمادی گئی، اور ثبت کرتے ہی بچاری کو نڑ سے دور پھینک دیا گیا۔

یہ ہے ہمارے مجتہدین کرام کا اخلاق ——— یہ ہے ان مقدس ہستیوں کا عقیدتمند مسلمانوں سے برتاؤ، جو اپنے کو انبیائے بنی اسرائیل کا ہمپایہ سمجھتے ہیں۔

اور یہ ہے آپ کے "علمائے کرام" کا کروفر، آپ کے "حامیان دین متین" کا دبدبہ، اور آپ کے "شمس العلماؤں" کا طنطنہ؟

اور یہ بھی غور کیجئے کہ یہ فرعونیت کا مظاہرہ کس مقام معصومیت سے کیا جاتا ہے؟ بسابِط ائمہؑ، اور مسند رسول سے! کون ائمہؑ، اور کون رسول؟ وہ ائمہؑ، جو سلام میں سبقت کرنے والے، سب وشتم کا جواب احسان سے دینے والے، منہ پر تھوک دینے والے کے سینے سے اترنے والے، اور اپنے قاتل کو شربت پلانے والے تھے۔

اور وہ رسول جو صاحب خلق عظیم، اور رحمۃ للعٰلمین تھا۔ وہ رسول جس نے حکم دیا ہے کہ سائل کو بھی نہ جھڑکا جائے، اور وہ رسول جس نے کفار کی نجاست اپنے مقدس ہاتوں سے صاف کی تھی۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

شکایت کی جاتی ہے مغربی تہذیب، مغربی ثقافت اور مغربی لٹریچر سے کہ یہ ہمارے نوجوانوں کو ملحد وکافر بنا رہا ہے۔ حالانکہ دنیا اور بالخصوص بھولے بھالے مقلد قسم کے مسلمانوں کو اس کا علم نہیں ہے کہ ان خطاب یافتہ مولویوں، ان حکومت گزیدہ مجتہدوں اور ان قوالی زدہ پیروں کی ہر سانس

ایک زبردست دارالضرب ہے۔ جہاں آئے دن ارتداد والحاد کے لاکھوں سکے ڈھلا کرتے ہیں۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با ما ہر چہ کرد آں آشنا کرد

---

(۵) یہ دیکھیے ایک پیر صاحب خانقاہ کے احاطے میں بیٹھے قوالی سن رہے ہیں، کالی بھونرا سی لٹوں میں تیل رینگ رہا ہے ہونٹھ میں گلوری، اور گلوری میں قوام مہک رہا ہے۔ عبا سبز رنگ کی ہے، تسبیح سرخ ہے، اور چاندی کا عصا سامنے رکھا ہوا ہے۔ جس کے پاس ہی ایک تھالی میں گلوریاں، اور دوسری میں پھول رکھے ہوئے ہیں۔

مریدوں کا ہجوم ہے۔ مشتاقانِ زیارت کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ کھڑے ہوئے ہیں۔ کچھ بیٹھے ہیں۔ کھڑے ہوئے لوگوں میں ہلچل ہے۔ کوئی کسی کے کاندھے پر جھکا ہوا ہے۔ کوئی کسی کی بغل سے جھانک رہا ہے۔ اور کوئی کہنیاں مار مار کر اندر آنا چاہتا ہے۔ بیٹھے ہوؤں میں کوئی تو کسی کے گھٹنے پر گھٹنا اس زور سے رکھے ہوئے ہے کہ اس کی قوالی کا تمام مزا کرکرا ہو رہا ہے۔ اور کسی کے بغل میں دبے ہوئے جوتوں سے کڑوے تیل کی اس قدر بد بو آ رہی ہے کہ پاس والوں کی ناکیں سڑی جاتی ہیں۔ اور کوئی اس طرح جھوم رہا ہے کہ دوسروں کے سروں میں ٹکریں لگ رہی ہیں ـــــ البتہ بازاری عورتیں نسبتاً آرام سے بیٹھی ہوئی ہیں۔ کیونکہ انھیں جوار پیری میں جگہ دی گئی ہے اور وہاں سے آنکھیں لڑا لڑا کر روحانیت کی نبضوں میں خون دوڑایا جا رہا ہے۔

تالیوں کے ساتھ "آہے وا" کی بلبلا دینے والی صدائیں ایسی ہیں کہ بڑی بڑی داڑھیوں والے بوڑھوں کے مونڈھے رقص کرنے کے لئے ہلے چلے جاتے ہیں

دھوتیاں باندھے ہوئے مرید ہر "آرے آرے می کنم" کی آواز پر جس کے معنی وہ بالکل نہیں سمجھتے لانبے لانبے ڈگ رکھتے ہوئے پیر کے سامنے آآ کر نذریں پیش کر رہے ہیں کہ اتنے میں ایک نہایت بھدا تنڈیل ادھیڑ آدمی، جس کی صورت ناریل سے ملتی ہوئی ہے یکایک ایک چیخ مارتا ہے، اور کھڑا ہو کر تھرکنے لگتا ہے۔ "آرے آرے می کنم، رے آرے آرے می کنم، ہاں آرے آرے می کنم"۔ "آرے آرے می کنم" کا ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے اور تمام محفل اُچھل کود میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

مرید چیخیں مار مار کر پیر کو نذریں دینے لگتے ہیں۔ دو روپے کی نذر والے سے پیر صرف مصافحہ کرتا ہے، اور چار روپے دینے والے کے گلے میں باہنیں ڈال دیتا ہے۔ اور چیخیں مار مار کر رونے لگتا ہے۔

یہ ہے اسلامی تہذیب کا مظاہرہ، اور یہ ہے اسلام کی روحانیت کا اعلان ـــــ ڈنکے کی چوٹ پر اعلان، چیخیں مارتا، ناچتا، تالیاں بجاتا اور تھرکتا ہوا اعلان! ۔

شکایت کی جاتی ہے کہ ہم مظلوم ہیں۔ بے دست و پا ہیں۔ مفتوح ہیں تو کیا تم سارنگیوں کی روں روں، تالیوں کی چٹا چٹ، اور "آہے وا" کی گونج میں ممالکِ عالم کو مسخر کرنا چاہتے ہو؟ کیوں نہ ہو، اے ناچنے والو سورما و!

الفاظ اور شاعر

الفاظ کو کاغذ پر روشنائی کی لکیریں نہ سمجھو، وہ نہ تو بے جان لکیریں ہیں، نہ ہوا کی گرہیں۔

الفاظ تو ذی حیات ہیں، انسانوں کی روح ذی حیات۔

الفاظ بھی آدمیوں ہی کی طرح پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ بیمار پڑتے اور تندرست ہوتے ہیں۔ بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ گوشہ نشین رہتے اور سفر کرتے ہیں۔ یہ بھی اپنے اپنے خاص مزاج، عادات، رسوم، روایات اور تاریخی واقعات رکھتے ہیں۔ ان کی دنیا میں بھی ذات پات اور مذہب و معاشرت کا رواج ہے۔ یہ بھی انجمنیں اور سوسائٹیاں بنا کر رہتے اور ترقی کے مدارج سے انھیں بھی گذرنا پڑتا ہے۔

ان میں بھی مختلف نسلیں، خاندان اور شجرے ہوتے ہیں۔ اور ہر خاندان اپنے ہی عزیزوں اور کفو میں بیاہ شادی کرتا ہے۔

الفاظ پر بھی لڑکپن، جوانی، اور بڑھاپے کی فضائیں آتی ہیں۔ ان میں بھی بعض تو ہم انسانوں کی طرح نیکنام ہوتے ہیں۔ اور بعض بدنام، بعض عبائیں پہنے ہوئے دیوتاؤں کے مندروں میں رہتے ہیں، بعض دستاریں زیب سر کئے ہوئے درباروں میں اور بعض ننگے پاؤں بازاروں میں مارے

مارے پھرتے ہیں بعض کے ہات پاؤں چومے جاتے ہیں۔ اور بعض جب دروازے پر آتے ہیں تو انھیں دھتکار دیا جاتا ہے۔

ان میں متقی و پرہیزگار بھی ہوتے ہیں۔ اور آزاد و خراباتی بھی۔ ان میں امیر بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی، متوسطین کا طبقہ ان میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اور اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا رہتا ہے۔

الفاظ میں بھی ہم انسانوں کی طرح بعض الفاظ انتہا درجہ کے شریف رقیق القلب اور بردبار ہوتے ہیں۔ اور بعض پرلے درجہ کے مفسد، سفاک، دل آزار۔ ان میں سے بعض تو باغی قسم کے ہوتے ہیں۔ اور بعض چپراسی ذہنیت کے۔ بعض بزم کے رسیا ہوتے ہیں اور بعض رزم کے مرد میدان۔ بعض کی کمروں میں تو لانبے پرتلوں کی تلواریں لٹکی رہتی ہیں اور بعض گلے میں پھولوں کی بدھیاں اور کان میں سونے کے دُر پہنتے ہیں۔

لیکن تمام الفاظ میں یہ ایک عجیب مشترک و عمومی خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ بے ہمہ و باہمہ رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ ملتے تو سب سے ہیں۔ مگر اپنے کو لئے دیئے ہوئے۔ معلوم نہیں یہ شرمیلے ہوتے ہیں کہ مغرور۔ مگر ان سب کی یہ ایک عام عادت ہے کہ جلد بے تکلف ہو جانے کو بہت ہی برا سمجھتے ہیں۔ اور دیر آشنائی پر کاربند رہتے ہیں۔

آدمی کے حافظے کی کمزوری، یا درس و تدریس کے شوق نے نہایت ہی گستاخی کے ساتھ انہیں لغات کی نمائشی الماریوں میں سجا دیا ہے۔ یہاں الماریوں میں طوعاً و کرہاً بیٹھے تو ہیں۔ مگر بڑی چالاکی کے ساتھ انھوں نے اپنے چہروں پر نقابیں ڈال رکھی ہیں۔ تاکہ انھیں بہ آسانی پہچانا نہ جا سکے اور مکمل خط و خال تو کبھی نمایاں ہی نہ ہو سکیں۔

جب تک کوئی اللہ کا بندہ ان کے پیچھے نہ پڑ جائے، ان کی گلیوں کی خاک نہ چھان ڈالے، مہینوں نہیں برسوں ان سے ملے جلے نہ، ان کی میزبانی نہ کرے۔ ان کے گھر مہمان نہ رہے، سالہا سال تک ان کے ساتھ نشست و برخاست نہ رکھے، ان کی غمی شادی میں شریک نہ ہو ان سے رشتہ ناتا نہ جوڑے ان کی نبضوں کی رفتار۔ ان کے خون کی گردش، اور ان کے خاندانی و ذاتی خصوصیات کو نہ پرکھ لے، اس وقت تک یہ مغرور یا شرمیلے الفاظ اس سے بے تکلف نہیں ہوتے، اور اسے اپنے مزاج کی افتاد اور اپنے اسرار سے آگاہ کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔

انسانوں کے بے شمار طبقوں میں سے صرف ادیبوں اور شاعروں کے دو ایسے طبقے ہیں جن سے ان کی بے تکلفانہ رسم و راہ اور مخلصانہ دوستی ہے۔

ادیبوں سے ہر چند ان کی ملاقات دوستانہ اور مخلصانہ ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے گھر اکثر آیا جایا بھی کرتے ہیں۔ لیکن بعض نازک مزاج، سُر پسند اور نغمہ پرور، اونچے گھرانوں کے الفاظ ان سے کھُل کھیلنا اور خلا ملا رکھنا پسند نہیں کرتے، وہ اگر ادیبوں کے سامنے آتے بھی ہیں تو ان شوخ و شنگ لڑکیوں کی طرح جو دور سے تو خوب لگاوٹ دکھاتی ہیں لیکن جب ان کا دامن پکڑ لینے کے لئے لپکو تو انگلیاں چٹکاتی اور قہقہے مارتی ہوئی الٹے پاؤں بھاگ جاتی ہیں۔

البتہ شاعروں کے ساتھ ان کا برتاؤ دوستوں ہی کا سا نہیں، قرابت داروں کا سا ہوتا ہے۔ وہ شاعروں سے اس طرح ملتے جلتے ہیں جیسے ایک ہی گھر کے مختلف افراد۔ یا ساتھ کھیلے ہوئے لنگوٹیا یار۔

شاعروں کو انہوں نے یہاں تک اختیارات دے رکھا ہے کہ وہ جب چاہیں ان کے لباس تبدیل کر دیں، ان کی لے اور رنگ بدل دیں۔ ان کا رخ موڑ دیں، ان کے معنوں میں تنگی یا وسعت پیدا کر دیں۔ اور ان کے خط و خال میں کمی بیشی فرما دیں۔

شاعر سے ان کے گھروں کی عورتیں بلکہ کنواریاں تک پردہ نہیں کرتیں۔ وہ جب چاہے دوپہر ہو یا آدھی رات بے دھڑک ان کے گھروں، اور ان کی خوابگاہوں میں آ جا سکتا ہے۔

شاعر کے سامنے آتے ہی ہر نسل اور ہر مزاج کے الفاظ اپنی نسلوں اور مزاجوں کا جھگڑا بھول جاتے ہیں، ذات پات اور رنگ مذہب کی کوئی آویزش باقی نہیں رہتی، وہ سب ایک ہی تھالی میں کھاتے، ایک ہی کونے میں بیٹھتے اور ایک ہی حلقے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ شاعر کا مکان الفاظ کی عبادتگاہ ہے۔ جہاں ادنیٰ و اعلیٰ اور شاہ و گدا ہر قسم کے الفاظ ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں، اور صفوں میں ایسی شائستگی ہوتی ہے، جیسے راگنی کے بولوں میں ہم آہنگی۔

اکثر اوقات رومانی لمحوں اور وجدانی ساعتوں میں جبکہ شاعر کے احساسات انگڑائیوں پر انگڑائیاں لینے لگتے ہیں، الفاظ کی ٹولیوں کی ٹولیاں جن میں بوڑھے۔ جوان لڑکے اور لڑکیاں سبھی ہوتے ہیں شاعر کے پاس ہواؤں کے دوش پر آتے ہیں اور اس کی معنویت کے گرد حلقہ باندھ کر اس طرح ناچنے اور گانے لگتے ہیں کہ کبھی تو ماہی سے ماہ تک تبسم ہی تبسم جھلکنے لگتا ہے۔ اور کبھی ذروں سے لیکر ستاروں تک آنسو ہی آنسو نظر آتے ہیں۔

خاتونِ مغرب

جب ضمیرِ حق میں انساں کا ہیولیٰ بن چکا
مرد کو فصلِ خزاں کی دھوپ سے پیدا کیا

اور عورت کو بنایا اک سبک رو نہر سے
موسمِ گل کی معطر چاندنی کی لہر سے

مرد کو تحفے میں دی شمشیر تدبیر حیات
اور عورت کو چراغ و بربط و قند و نبات

راستے میں مرد کے ڈالے گئے تیر و تبر
اور عورت کی طرف پھینکے گئے گلہائے تر

مرد کے اعضا کو بخشا سنگ و آہن کا جلال
اور عورت کو صبا کا لوچ شبنم کا جمال

مرد کو بخشا لہو، افسردہ میدانِ جنگ
اور عورت کو دیا پگھلے ہوئے سونے کا رنگ

اُس کو بخشی سنگ کی تعمیر، صرصر کا جلال!
اور اسے طبعِ حریر و مستیِ بادِ شمال!

اُس نے صولت پائی اِس نے جلوۂ مسند طراز
اُس کو محنت دی گئی، اِس کو محبت کا گداز

اُس کو طبلِ جنگ کا ہنگامۂ دہشت فزا
اس کو ہلکی نرم کلیوں کے چٹکنے کی صدا

اُس کو طوفاں گاہِ بیداری اِسے خوابِ خیال
اس کو چشمِ ضیغم و شاہیں، اِسے چشمِ غزال

اُس کو شانِ مہر، اِس کو جلوۂ ماہِ منیر
اس کو سنگ آشوب تیشہ اس کو رقصِ جوئے شیر

اُس کو تاجِ زرفشاں، اس کو خمِ زلفِ دراز
اُس کے ماتھے کو شکن، اِس کے لبوں کو موجِ ناز

اُس کو چھانٹا زخمِ دندانِ تلاطم کے لئے
اس کو رکھا سوجِ رنگینِ تبسم کے لئے

اُس کو چھانٹا عشوۂ بزمِ تمنا کے لئے
اُس کو رکھا کاوشِ امروز و فردا کے لئے

اُس کو شورِ حرب اِس کو شوخیِ گفتار دی
تیغ دی اُس کو، اِسے پازیب کی جھنکار دی

مرد کے زانو کی جنت بن گیا عورت کا سر
کچھ دنوں چلتی رہی دنیا اسی انداز پر

لیکن اک شب دفعتہً تاریکیوں کے درمیاں
جب فرازِ چرخ پر منڈلا رہی تھیں بدلیاں

[illegible] دنیا کے نغمے سے [illegible]
ہو رہا تھا [illegible]

رات یوں تاریک تھی جس طرح مجرم کا ضمیر سر کیا شیطان نے عورت کی جانب ایک تیر

سرخ تیر، افسردہ سناٹے میں سنّاتا ہوا
آتے ہی عورت کے سینے میں ترازو ہوگیا

تیر کھاتا تھا کہ روحِ نازبل کھانے لگی! مرد بننے کی تمنا دل کو تڑپانے لگی!
دی صدا عورت نے اس نرمی کو کھونا چاہیئے مرد کا مدِّ مقابل مجھکو ہونا چاہیئے
نازکی ہے اک اہانت آفریں اُفتادگی سکراتی ہوگی میرے لوچ پر مردانگی
ابنِ آدم کی مٹا دیں نازشِ تاب و تواں مرد بن جائیں اگر حوا کی نازک بیٹیاں

روح پر عورت کی یہ دیوانگی جب چھا گئی
لو، سحر ہوتے ہی وہ مردوں کی صف میں آگئی

آئی، اور خم ٹھونک کر آئی مثالِ پہلواں پنڈلیاں گھومی ہوئی، شانوں کی اُبھری مچھلیاں
ترک کر بیٹھی ادا و ناز کا شغلِ رکیک اب ہے وہ دنیا کی ہر مردانہ ورزش میں شریک
باگ پر ہے ہات، اور ترشی ہوئی زلفوں پہ گرد تن کے کہتی ہے کہ دیکھو، زن سے یوں بنتے ہیں مرد

لیکن اس تریاق میں ہے زہر کی بھی ایک موج
کس گراں قیمت پہ عورت نے خریدا ہے یہ اوج

اپنے سینے کا خزانہ، اپنی فطرت کا جمال مرد بننے کی ہوس میں کر دیا ہے پائمال
کر چکی ہے بے طرح محروم چشمِ التفات اپنے اس شیریں تبسم کو، کہ تھا اک کائنات
زلف غائب ہوگئی اور دست و پا کھنچ کر طویل بجھ گئی برنائی، بُڈھا ہوگیا روئے جمیل
جذبۂ مردانگی نے بڑھ کے تلووں سے ملی جنبشِ مژگاں کی موسیقی، تبسم کی کلی
جلد کی سختی کے اندر لوچ پنہاں ہوگیا ایک سیٹھا پن سا ہونٹوں پر نمایاں ہوگیا
جنتِ ارضی کو دوزخ کا نمونا کر دیا چشمکِ بے باک نے آنکھوں کو سونا کر دیا
جامِ زریں کی کھنک گم ہوگئی گفتار سے ابر کی سی شوخیاں جاتی رہیں رفتار سے
ہوگیا سنگِ جرأت سے شیشہ بھولے پن کا چور مر گیا دیدوں کا پانی، اڑ گیا چہرے کا نور

نازکی، عفت، محبت، آرزو کچھ بھی نہیں
نام تو ہے پھول، لیکن رنگ و بُو کچھ بھی نہیں

جوشؔ

بحضرتِ ساقی

تجھے کیا، دورِ گل ہے، یا زمانِ خار ہے ساقی ۔۔۔ تو خود اپنی جگہ اک دولتِ بیدار ہے ساقی

حقیقت کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتی دو عالم کی ۔۔۔ جو کچھ آتی بھی ہے ناقابلِ اظہار ہے ساقی

ترے مستوں کو روز و شب کی آویزش سے کیا مطلب ۔۔۔ یہاں تو تیرگی بھی مطلعِ انوار ہے ساقی

ترے خدمت گذاروں کو حق و باطل سے کیا نسبت ۔۔۔ یہاں تو خیر بھی شر کی رفیقِ کار ہے ساقی

یہاں ہر عقدہ، اک کھلتا ہوا در ہے فراغت کا ۔۔۔ یہاں ہر قید اک گرتی ہوئی دیوار ہے ساقی

قسم اس جام کی رقصاں ہے جس میں کیف و سرمستی ۔۔۔ کہ اس مٹھی میں روحِ ثابت و سیّار ہے ساقی

عقائد کے ہزاروں عقل پیما کاروانوں کا ! ۔۔۔ فقط اک واہمہ ہی قافلہ سالار ہے ساقی

نہ گھبرا، انتہائی صبر و نرمی سے مدارا کر ! ۔۔۔ کہ عقلِ انساں کی اک عمر سے بیمار ہے ساقی

بہت عجلت نہ فرما کاروبارِ دل کے اجرا میں ۔۔۔ کہ یہ دنیا اسیرِ اندک و بسیار ہے ساقی

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو ۔۔۔ کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

مرا ایمان ہے اک لرزۂ براندام بے دینی ۔۔۔ مرا اقرار اک سہما ہوا انکار ہے ساقی

نظر کر جوشؔ پر اپنے کہ اتنی بیخودی پر بھی
یہ رندِ لاابالی کس قدر ہشیار ہے ساقی

جوشؔ

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

لفظ و معنی

(خاص رسالہ کلیم کے لئے)

حقیقت نگار شری اروبندو کے قلم سے

(اروبندو آشرم پانڈی چری)

شری اُروبندو گھوش کے گراں قدر مقالے کی یہ تیسری قسط ہے۔ اروبندو نے قارئین کو خود اندازہ ہو گا کہ شاعری، اور رُوحِ شاعری پر کس قدر عمیق نظر ڈالی ہے، جو اردو شاعروں کے لئے شمعِ ہدایت کا کام دے سکتی ہے ـــــ مترجم صاحب کی خدمت میں خط لکھ دیا گیا ہے کہ وہ شری اروبندو گھوش کا اصلی مضمون بھی جو انگریزی زبان میں ہے روانہ فرمائیں۔ تاکہ ترجمے کے سمجھنے اور بنانے میں آسانی پیدا ہو جائے ـــــ مترجم صاحب نے ہماری درخواست منظور فرمائی اور ہمیں امید ہے کہ آئندہ سے ترجمے کی شگفتگی اس بے بہا مضمون کی افادی قوت میں اضافہ کرے گی۔ (ادارہ کلیم)

ترنّم (RHYTHM) شاعرانہ اظہار کا اوّلین ضروری عنصر ہے۔ کیونکہ اسی سے وہ صوتی حرکت منسوب ہے جس کی موجیں تخیّلاتی تحریک کی حامل ہوتی ہیں۔ اور ایک سُریلی صوتی تصویر ہی وہ چیز ہے جو تخیلی جذباتی یا حیاتی (VITAL) تاثرات کا مکمل مبسوط باریک اور عمیق نقشہ پیش کر سکتی ہے اور اپنی مخصوص و امتیازی قوت کے ذریعے سے معنی کو ایک ایسے اوج پر لے جاتی ہے۔ جہاں دماغی مظہرات کی گنجائش نہیں۔ دورِ موجود کی ذہنیت اور عصرِ حاضر کے ذوقِ سماعت کے مقابلے میں متقدمین کو اس ترنّم کی حقیقت کا مجموعی طور سے بہتر یا کم از کم زیادہ مستقل احساس تھا، اس کا سبب شاید یہ تھا کہ وہ لوگ اپنے اشعار کو گاتے تھے میٹھی آوازوں میں پڑھتے، اور تال، سُر کے ساتھ گنگناتے تھے۔ برخلاف اس کے ہم اپنی نظموں کو فقط رواں پڑھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہماری یہ عادت شعر کے دماغی اور جذباتی عناصر کو تو آشکارا کرتی ہے۔ مگر اس کی غنائی قدر و قیمت کو غیر مناسب طور پر پس پشت ڈال دیتی ہے۔ متقدمین کے مقابلے میں شعرائے متاخرین نے طرزِ بیان اور تخیّل میں ایک بدرجہا باریک تر، نفیس تر، اور عمیق تر اثر آفرینی کی قوت بہم پہنچائی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زورِ کلام، بلند خیالی، اور سادگی وسعت کے لحاظ سے اُن کی سخن گوئی شاید متقدمین کے مقابلے میں ضعیف تر واقع ہوئی ہو۔ قدیم زمانوں میں آج کل کی روش کے خلاف ایک دھیما غنائی مادہ رکھنے والا نظم گو، بلند پایہ شعراء کی بزم میں بہ آسانی بار نہیں پا سکتا تھا۔

آج کل ہر اُس کلام کو جو قدرے پُرزور انداز میں ترتیب دیا گیا ہو، اور کسی قسم کے مسجع صیغے میں ڈھال لیا گیا ہو، اشعار کے زُمرے میں داخل کر لیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے مضمون کا موضوع ہے بہترین و اعلیٰ ترین سخن گوئی کے نقطۂ آغاز کی تلاش، اور یہ وہ چیز ہے جو ہم سے اس امر کا تقاضہ کرتی ہو کہ ہم اسلوب و طرزِ بیان کے لحاظ سے شاعری کی مختلف صورتوں کے درمیان امتیاز پیدا کریں۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے سمع و وزن کے مضمون میں کر چکے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ طرزِ کلام میں کس قسم اور کتنی شدت کا زور ہونا چاہیئے کہ اُسے شاعرانہ گردار کے شایانِ شان سمجھا جائے۔ نظموں اور شعروں کی یہ افراط جو چند روزہ یا دائمی شہرت رکھنے والے شعراء کے ناموں سے وابستہ ہے اس قماش کی واقع ہوئی ہے کہ اُسے اکثر و بیشتر ہم شاعری کے حدود میں محصور کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

کیونکہ اس شاعری میں اصولِ نظم اور اصولِ نثر کے درمیان کافی مسافت نہیں پائی جاتی ہے۔ یہ شاعری اس امر سے غافل دکھائی دیتی ہے کہ جہاں نثری اسلوب کے اندر تحسین فہم اور ادراک کے روبرو کسی شے یا حقیقت یا احساس یا تخیل کی تجدید وارتسام خاص طور سے مقصود ہے اور سلاست، زورِ کلام، فصاحت یا دوسری کوئی خوبی محض ضمنی حیثیت رکھتی ہے، وہاں شاعرانہ اسلوب کا اول مقصد یہ ہوتا ہے کہ موضوعِ اظہار کو تخیل بنیا، حسنِ معنوی اور احساس وبصیرتِ روحانی کے آگے زندۂ جاوید صورت میں پیش کیا جاوے، جہاں فقط زورِ کلام میں کوتاہی واقع ہوتی ہے وہاں دونوں کی تفریق وتمیز بہ آسانی کی جا سکتی ہے اور ہم فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ محض الفاظ کا اُتار چڑھاؤ ہے۔ شعر نہیں ہے، لیکن جہاں قدرے زورِ کلام کے ساتھ ساتھ کچھ تخیلی قوت یا کوئی دوسرا معنوی جوہر موجود ہوتا ہے وہاں قدر وقیمت کا غلط تخمینہ رائج ہو جاتا ہے، اور بہت ممکن ہے کہ ایک کامل ادبی دور اسی نوع کی نظم ونثر کی درمیانی منزل میں مقید رہے یا اس نیم شاعری کی ناجائز تحسین وقدردانی کے باعث گمراہ ہو جائے۔

مصوری، سنگ تراشی اور معماری کے سے ہم صنف فنون کی مانند شاعری بھی معنوی تصاویر کے ذریعے سے انسان کی رُوح سے اپیل کرتی ہے، فرق صرف اسی قدر ہے کہ اس کی تصویریں ذہنی اور لفظی ہوتی ہیں، اور اس کی مادی شاعرانہ کلام کی اصلی قوت اسی میں ہے کہ وہ کسی شے کا خیال یا احساس بہم پہنچانے کے عوض اُسے دکھا دیتا ہے۔ یہاں نظارے کی وقعت سب سے زیادہ ہے اور تخیل اور احساس اس کے نتیجے یا جزو ہوتے ہیں۔ شاعر پر یہ فرض ہے کہ وہ ہمارے وجود کو خارجی ذہنیت اور حواس سے علیحدہ کر کے رُوح اور داخلی ذہنیت میں مرکوز کر دے۔ شاعری کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ جس چیز کو ہم بالعموم حواس اور ادراک کی محدود اور پُرفریب طاقتوں سے دیکھتے ہیں اُسے وہ رُوح کی روشنی اور عمیق تر مشاہدے میں پیش کرے۔ متقدمین کو اس امر کا پورا علم تھا کہ شاعر ایک حقیقت نگر وجود کا نام ہے نہ کہ محض ایک قافیہ پیما بھاٹ، شُریلہ گویا یا مصرعوں اور بندوں میں فکر کرنے والے کا جو قافیے ردیف کو ٹٹول ٹٹول کر الفاظ جوڑا کرتا ہے۔ شاعر سطحی ذہن کی دسترس سے ماوریٰ دیکھتا ہے اور کلمۂ کاشفہ یا نطقِ عالیہ (REVEALING WORD) کا سُراغ لگایا کرتا ہے، یعنی وہ اُس کلمے کو ڈھونڈھ نکالتا ہے جو کفایت آمیز اور اثر انگیز ہونے کے علاوہ تجلی آمیز و تجلی بخش ہوتا ہے۔ نیز ایک الہام آمیز ناگزیر حیثیت رکھتا ہے اور جو ہمیں حقیقت بینی پر مجبور کر سکتا ہے۔ شاعرانہ اسلوبِ بیان کی تمام تر کوشش اسی کلمۂ کاشفہ کی تلاش سے وابستہ ہوتی ہے۔

جدید خیال کی رُو سے شاعر وہ ہے جو تخیل (IMAGINATION) کو متاثر کرتا ہے نہ کہ ذہن ودماغ کو، مگر تخیل کے مختلف اقسام ہوتے ہیں ایک خارجی تخیل ہے جو حیات اور اشیاء کے بیرونی پہلوؤں کا اثر آفریں مرقع پیش کرتا ہے، دوسرا باطنی تخیل ہے جو حیات اور اشیاء کے چھیڑے ہوئے دماغی اور جذباتی تاثرات کی تصویریں کھینچتا ہے، ایک تخیل شاعرانہ تخیل کے نام سے مخصوص ہے جو ذہنی تصورات (MENTAL FICTIONS) سے کھیلتا ہے اس کے علاوہ ایک جمالی تخیل بھی ہے جو محض حسنِ الفاظ اور تناسب تشابہ کی نشاط آفرینیوں میں جھومتا رہتا ہے۔ اور اُس کے آگے کچھ نہیں دیکھتا، ان میں سے ہر ایک کو شاعری کے اندر گنجائش ہے، مگر تخیل کے یہ مختلف اقسام صرف شاعری کے مسالے فراہم کرتے ہیں اور شاعرانہ اسلوب کے محض ابتدائی اوزار ہوتے ہیں حقیقی شاعرانہ تخیل خارجی یا داخلی اشیاء کے باریک سے باریک انعکاس پر اکتفا نہیں کرتا، یا وہم وخیال کے گوناگوں اور نازک ترین حرکات یا الفاظ وتشبیہات کی دلآویز رنگینیوں پر قانع نہیں ہوتا۔ یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے تعبیری ہوتا ہے اور حقیقی سے حقیقی اشیا کو وجود میں لاتا ہے نہ کہ واقعاتی یا مصنوعی خبروں کو۔ یہ مختلف المدارج روحانی صداقتوں کا متلاشی ہوتا ہے گو اُس کے تجربے کا نقطۂ آغاز واقعاتی خبروں پر بھی ہوتا ہے، اور تصوراتی خبروں پر بھی۔ جملہ فنون کے مانند شاعری کا مقصد بھی محض فطرت کی عکسی یا کسی دوسری قسم کی واقعاتی تقلید نہیں ہے، نیز اُس کے فرائض میں فطرت کے چہرے کا آب ورنگ دے کر چمکانا یا اس کے خط وخال میں ایک خاص دلبری پیدا کرنا بھی داخل نہیں ہے۔ حقیقی شاعری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ فطرت کی تعبیر وتفسیر اِن صورتوں اور تشبیہوں کے ذریعے سے کرے، جنھیں قدرت اپنی آفرینش کے متعدد طبقات کے روبرو پیش کرتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب شاعری کو بجا طور پر مخاطب کیا جاتا ہے تب وہ اُس وقت اُس راز کا انکشاف خود کر دیتی ہے جو وہ اپنے اندر چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔

شاعر کا اعلیٰ ترین، اصولی اور اسی لئے حقیقی مقصد وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا، مگر اُس تک پہنچنے کے لئے انسانی ذہن رفتہ رفتہ قدم اُٹھاتا ہے، اس بُرونر کا اول قدم تو منزلِ مقصود سے کوسوں دُور دکھائی دیتا ہے، شروع

شروع میں انسانی ذہن اشیا کے متعلق اپنے سب سے بدیہی اور خارجی خیالات، جذبات اور حسیات کو مصرعوں کی لڑیوں میں پروتا ہے، اور معیارِ کلام اس مقصد کے لئے کافی ہوتے ہوئے بھی کچھ ایسا بلند نہیں ہوتا، اگرچہ زیادہ کفایت آمیزی اور قوتِ تاثیر سے کام بھی لیا جاتا ہے تو اُس کی نوعیت محض حیاتی، جذباتی یا ذہنی ہی ہوتی ہے، ایک پُر زور حیاتی شاعری کا کارنامہ ہمارے احساسِ زندگی سے اپیل کرتا ہے۔ ایک متاثر جذباتی شاعر کا کلام ہمارے جذبات کو جنبش میں لاتا ہے اور سوز و گداز کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ایک زبردست ذہنی شاعر زندگی اور اُس کے پیچیدہ سلسلے کی نسبت ہمارے راز جو نفس کو تسکین بہم پہنچاتا ہے یا دُنیا و حیات کے نفسیاتی مسائل وغیرہ سے بحث کرتا ہے، یا ہمارے تخیلات کی ایک متاثر و حیرت انگیز طریقے پر تشکیل کرتا ہے، اور اکثر ایسے ڈھنگ پر کہ اُس کی کمال خوش اسلوبی کے باعث ہم اسے ہر موزوں موقع پر پڑھنا یا اُس کا اقتباس کرنا پسند کرتے ہیں، اِس میں کلام نہیں کہ اِن سب سے ذہن اور نفسِ انسانی کو مسرتیں حاصل ہوتی ہیں اور یقیناً راہِ ارتقا پر اُن سے تمام و کمال لطف اندوز نہ ہونا غلطی جائز ہے، لیکن اگر ہم اِنھیں پر اکتفا کر لیں تو اُس پہاڑ کی نیچی چوٹیوں تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے جس کی سب سے اونچی چوٹی پر شاعری کی دیوی کا مندر واقع ہے۔

اِن سب سے بھی ایک اعلیٰ اور ارفع تر طرزِ بیان ہے، مگر یہ بھی اُس بلند معیار تک نہیں پہنچتا جو ہمارا مطمحِ نظر ہے، صرف ذہنی طاقت، یا حیاتی اور جذباتی جوش و خروش ہی حقیقی شاعری کی امتیازی خصوصیت نہیں ہوا کرتا، بلکہ اُس کے عوض یا یوں کہئے کہ اس کے ماورا حقیقی شاعری میں ناقابلِ تصور طرزِ بیان (IMAGINATIVE STYLE) کا پورا غلبہ ہوتا ہے، ایسا طرزِ بیان جس میں نامعلوم بجلیاں چمکتی رہتی، اور ایک عظیم، مگر غیر معین روحانی قوتِ نغمہ سرا نظر آتی ہے۔ موخر الذکر ہر دو عناصر کا کچھ نہ کچھ جزو تو ہمیشہ دیکھنے آتا ہے، لیکن ہر اُس کلام میں جو اِس انداز پر ترتیب دیا جاتا ہے یکساں شدت نہیں پائی جاتی جو سر (CHAUCER) کی تصانیف کے اُن حصوں میں جہاں وہ اظہارِ مشاہدات کی عوض پروازِ تخیل میں مشغول نظر آتا ہے اِس شدت کی معتدل مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں اور اسپنسر (SPENSER) میں بمقابلہ چوسر اس شدت کا زور قدرے زیادہ ہے ملٹن کی ابتدائی شاعری میں اس کی بلند و برتر مگر ایک خاص قسم کی مثالیں جا بجا پائی جاتی ہیں اسی طرح کیٹس (KEATS) اور شیلی (SHLLEY) کے سے شعرا کے کلام میں بھی جو قوتِ حقیقت بینی کے مالک تھے، اس کی مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں، دراصل انگریزی شاعری کا عمومی سانچہ یہی ہے۔ مگر اس سے وہ انتہائی کی شدت منسوب نہیں کی جا سکتی جیسے مکاشفانہ (RIVELATORY) شاعری کا طرۂ امتیاز کہا جاتا ہے۔ اور جس سے منتر کی ہدایت ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک حد تک قوتِ مکاشفہ رکھتی ہے۔ مگر اس کی عمیق تر جلوہ بینی خارجی چیزوں کی استر کاری سے ڈھکی رہتی ہے۔ شاعری کے اندر یہ زیبائش و آرائش کا رجحان اندرونی رُوح کے عمیق تر اسرار دوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اس اندرونی رُوحِ مستور کا نظارہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کوئی بالغ نظر انسان تشبیہوں کے اثر سے بالا ہو کر اور مغزِ کلام کو استعاروں کی تار و پود سے چھڑا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتا ہے۔ ہر چند درجۂ دوم کی شاعری سے ایک خاص مسرت ضرور حاصل ہوتی ہے، جو اپنی نوعیت میں غیر روحانی بھی نہیں ہوتی۔ پھر بھی یہ اُس نقطۂ کمال تک نہیں پہنچتی جہاں انسانی مسرت خالص رُوحانی یعنی تخلیقی شاعرانہ مکاشفے کی وجد آمیز بے خودی میں تبدیل یا جذب ہو جاتی ہے۔ موخر الذکر کیفیت صرف اس صورت میں پیدا ہوتی ہے، جب ایک زبردست و ناقابلِ تصور پرتوِ الہام دل و دماغ کو سیال و درخشاں بنا کر اور شاعرانہ اسلوبِ بیان کے تمام بے پناہ عناصر کو اپنی گرفت میں لے کر دریائے تخیل میں طوفان برپا کرنے لگتا ہے۔ اس موقع پر شاعری کے دیگر عناصر میں سے ایک دو یا سب کے سب موجود رہ سکتے ہیں۔ مگر پرتوِ الہام کی تابانی سے یہ اثر خیرہ و متغیر ہو جاتے ہیں کہ ایک نورانی و دل رُبا لکیر کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

یہ شدت کسی خاص طرزِ بیان سے وابستہ نہیں ہوتی اور نہ اس کا انحصار انتخابِ الفاظ کے کسی خاص ضابطے ہی پر ہوتا ہے۔ یہ شدت کالیداس اور شیکسپیر کے کلام کی طرح ایک مجلّیٰ اور آراستہ تشابیہ اسلوبِ بیان کے انتہائی مدارج پر پائی جا سکتی ہے۔



ربّانی انقلاب

مولانا آزاد سبحانی

ربّانی انقلاب نمودار ہو چکا، اب اُس کی جگہ آسمانِ تخیل پر نہیں ہے بلکہ زمینِ حقیقت ہے، دیکھو وہ انقلابات کا ایک گراں قدر ذخیرہ اور لاتعداد لشکر لئے ہوئے عالمِ واقعات میں کس طرح ہنگامہ آرائیاں کر رہا ہے، اور بصیرت ہی کی نہیں بصارت کی آنکھیں بھی اس کا تماشا دیکھ رہی ہیں، اس کے چند ذیلی انقلابات نمونے کے طور پر پیش کر دیے جاتے ہیں۔ ان سے دوسرے انقلابات کی طرف بھی ذہن متوجہ ہو سکیں گے یا موقع بہم پہنچا تو اُن کے ذکر بھی اسی پیرائے میں ہو جائیں گے۔

(۱) کارخانۂ ہدایت و خدمت کا نظم منقلب ہو چکا۔ ہدایت و خدمت کی مرکزیت شخصیتوں سے جمعیتوں میں اور حکموں سے حکمتوں میں منتقل ہو چکی۔ اب انسانیت کی مرکزی ہدایت و خدمت بڑی بڑی شخصیتیں نہیں کریں گی جمعیتیں کریں گی۔ اور احکام سے نہیں حکمتوں سے بر آئیں گی۔

(۲) عظمت و رفعت کا معیارِ کہن بدلا جا چکا۔ اب بڑی سے بڑی شخصیتیں نقطۂ موہوم اور خیالِ معدوم سے زیادہ نہیں رہ جائیں گی۔ انقلابات کے تھپیڑوں اور تغیرات کے طوفانوں میں حبابوں کی طرح ٹوٹتی رہیں گی۔ اور پرکاہ کی طرح اُڑتی پھریں گی عظمت، رفعت کا پائدار محل صرف جمعیتیں ہوں گی، اور حکمتیں۔

(۳) سیادت و قیادت کا دستورِ کہن تقویمِ پارینہ ہو چکا شخصیتوں اور حکموں کی سیادت و قیادت ناممکن ہو گئی۔ سیادت و قیادت کا تاج جمعیتوں اور حکمتوں کے سروں پر رکھا جا چکا۔ شخصیتیں اور فرمانبرداریں صرف اس کام کے لئے رکھ لی گئی ہیں کہ جمعیتوں اور حکمتوں کی کارندگی و نمائندگی بجا لاتی رہیں جب تک کہ معزول نہ کر دی جائیں۔

(۴) جمعیتوں اور حکمتوں کے بھی پرانے تار و پود بکھیرے جا چکے ہیں اور نئے تار و پود سے اُن کی نئی بناوٹیں شروع ہو گئیں۔ نفسانی جمعیتیں اور نفسانی حکمتیں اب جھڑے ہوئے مصالحے کے مانند ہیں۔ ربّانی حکمتوں اور ربّانی جمعیتوں کی نئی اینٹیں تیار ہو چکیں، اور انھیں سے ربّانی نظام کے نئے محل کی تعمیر شروع کر دی گئی۔

(۵) مقاصد و مطالب کی پرانی دُنیا بھی فنا کی بھٹی میں پگھل رہی ہے اور مقاصد و مطالب کی نئی دنیا خمیر پا رہی ہے۔ جن باتوں کے کل صرف خواب دیکھے جاتے تھے آج ان کی تعبیریں مجسم ہیں، اور کل جن چیزوں کی تمنا میں بھی جھجک تھی آج اُن کا شکار کھیلا جا رہا ہے۔

(۶) نبوتیں ختم ہو چکیں، الہامات بند ہو چکے۔ نبوتوں کی جگہ فراستیں ہیں اور الہامات کی جگہ ادراکات جو کام نبوتوں نے کیا وہ فراستیں کریں گی اور جو کچھ الہامات سے ہو سکا وہ ادراکات سے بن پڑے گا، اور یہ حقیر بدل اپنے معظم مبدل سے بھی زیادہ کر دکھائیں گے، یہ اس لئے کہ پودا درخت ہو چکا ہے۔ بچہ جوان بن چکا ہے، گوشہ میدان ہو رہا ہے، انسانیت جو زمین پر رینگتی چلتی تھی ہواؤں میں فراٹے بھرتی پھرتی ہے، اور ستاروں کو چھو لینے کے لئے بے چین ہے۔

(۷) ربانیت کا اجمال تفصیل میں پھیل رہا ہے، ربانیت اجمال کا لبادہ پھینک کر تفصیل کے حلّے میں آراستہ ہو رہی ہے۔ ربانیت اب بھی دوپہر کا سورج بن گئی ہے۔ پو پھٹ کا آفتاب یقیناً بن چکی اور اپنی صبحی شعاعوں سے ظلمتکدہ انسانیت کو نورانی بنانے میں مصروف ہو گیا ہے۔ مبارک ہیں وہ جنھوں نے پرانے تماشوں کے عشق میں اس نئے تماشے سے آنکھیں نہیں بند کر لی ہیں۔

صنعت و حیات

عبد الوالی

صنعتگری کیا ہے؛ انحراف و بغاوت، فطرت سے، اور اُن چیزوں سے جوشکوہ کے منجمد ہوکے، بیجان ہوگئی ہیں۔ پہلا صنعتگرِ اعظم وہ تھا جس نے فطرت کی غلامی سے انسان کی گلو خلاصی کی۔ پہلی عظیم بغاوت اور اعلیٰ صنعتگری انسان کی یہ تھی کہ عالمِ ظاہر کی ہیبت، گران ڈیل ہستیوں کی قوتوں کا منکر ہوا۔ اُن کی بندگی چھوڑ ی، اپنے خداوند بنائے۔ اپنے ذہن میں اُن کی شکل و صورت قایم کرکے بُت تراشے۔ یہ انسانی عالمِ باطن کی جنگ عالمِ ظاہر سے تھی۔ کون نہیں جانتا کہ عالمِ ظاہر کو فاش شکست ہوئی۔ چاند، سورج، پہاڑ، دریا، آگ اور پانی کا رعب انسان کے دل سے اُٹھا۔ اُن سے جڈر اور خوف تھا وہ زائل ہوا۔ اُن کا حُسن بھی سیمیائی نمود انسان کی نگاہ میں ہوا۔ دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش شروع ہوئی۔ تبکدوں کے دَر کھُلے۔ کفر اپنی پوری انسانی شان اور کر و فر کے ساتھ جلوہ آرا ہوا، وہ بُت بنے جن میں سے

"انجاز سے زیادہ ہے سحر اُن کے ناز کا؛ آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیان نہ ہو"

باطن کے جلوے ظہور میں لائے جانے لگے۔ انسانیت کا دَور دَورہ ہوا۔ وہ حسن جو انسانیت نے ہویدا کیا، وہ حقیقت جو انسان کے باطن سے کھُلی، اس کی کارفرمائی شروع ہوئی۔ خوفناک، تباہ کن، اُبلتے ہوئے دریاؤں کی نہیں، گراں ڈیل، سربلند مہیب پہاڑوں کی نہیں، طوفان خیز، ڈراؤنے سمندروں کی نہیں، اُن میں سے کسی چیز کے نہ حُسن سے مسحور، اور نہ حقیقت سے متحیر، اپنے بنائے مندروں، اُن کی آراستگیوں اور مندروں کے مکین، دیوتاؤں اور دیویوں کے حُسن سے مسحور اور اُن کے حقائق سے متحیر ہونا شروع ہوا۔ ہر چیز پڑی ہنس رہی ہے کہ ہر چیز میں گویا انسانی دل اور انسانی جان ہے، وہ غیریت، اجنبیت اور بے تعلقی جو کوہ اور دشت و دریا اور انسان کے درمیان تھی وہ جاتی رہی۔ ان اپنی بنائی چیزوں سے ربط و اتحاد قایم ہوا، یہ "ہیومنائز" کی ہوئی چیزیں ہوئیں، خصوصیاتِ انسانی اُن میں پیدا ہوگئے۔ صنعتگری حقیقت میں فطری اشیا میں خصائص انسانیت پیدا کرنا ہے۔ آسمان اور زمین کی جتنی چیزیں ہیں اُن کو تسخیر کرکے انسانی بنا لینا صنعتگری بشرگری ہے۔ چیز میں بشر کا سا دل اور بشر کی سی جان پیدا کر دینا ہے، تاکہ انسان کا دل اُس چیز سے مل سکے، اُس چیز سے موانست پیدا ہو جائے۔

ہاں تو صنعتگر منحرف اور باغی ہے، کس سے منحرف ہے اور کس سے بغاوت کرتا ہے؟ بیجانی جو جان داری کی شکل میں نمودار ہو، بڑھاپا جوانی دکھایا جائے، موت حیات کی شکل میں لائی جائے۔ یہ چیز غیر حقیقی اور کریہہ صرف نہیں، بلکہ مضررساں ہے۔ صنعت گر اس سے اسی لیے انحراف و بغاوت کرتا ہے، انسانیت جانداری اور حیاتِ باطن ہے۔ صنعت گر حیاتِ باطن کا پیامبر ہے ؎

ہر روز نو جامم دہد تسکین و آرامم دہد
ہر روز پیغامم دہد این عشق چوں پیغمبرم

جو چیز مائل بہ موت ہو اُس کا وہ دشمنِ قاتل ہے۔

کفر و بت پرستی میں بھی انحطاط شروع ہوا، اس درخت کے بھی پتے سوکھنے لگے۔ اور چھال موٹی و منجمد ہونے لگی۔ پھولنا پھلنا کم ہو، پیغامِ موت آیا۔ جو درخت پھل نہ دے اُس کی جگہ باغ کی زمین نہیں چولہے کا منہ ہے۔ کفر و بت پرستی سے

روشن باطنی پیدا ہونا بند ہوئی، جو کیفیت مستی اور سرور پیدا ہوتا تھا وہ غائب ہوگیا۔ زہد و تقوے، عبادت و پرہیزگاری جو کر باطنی کے علامات ہیں وہ شروع ہوگئے، دوامی باطنی اشخاص ان بتوں سے بھی روگردانی کی، اُن کا بھی منکر ہوا، باطنی بے شکل و صورت خدا کو لا کھڑا کیا۔ خدا اور انسان کے درمیان انسانی واسطہ پیغمبر کے ذریعے قائم کیا کہ انسان خدا کی نشانی ہے نہ کہ بُت، اوتاروں اور پیغمبروں کا دَور دورہ ہوا۔ الہامی کتابوں کے ذریعے مذاہب قائم ہوئے، ان درختوں نے بھی خوب پھل دئے۔ ارحیاتِ انسانی کی نشو و نما میں بہت مدد و معاون رہے۔ زمانہ گزرنے کے بعد مذاہب کے عقائد اور شریعتیں الحاد کی جانب مائل ہوئیں۔ کور باطنی پھر پھیلی۔ سحرت ابدی صنعت گر پھر چونکا۔ ایمان و مذہب کے درخت میں کفر کی قلم باندھی۔ کہ ایک نیا بار آور درخت تیار ہو۔

زُنّار را نیابتِ تسبیح میدہم

اے اہلِ شرع مژدہ کہ اسلام تازہ شد

یہ دعوت کفر بالاعلان دی گئی، چوری چھپے نہیں۔

مسلماناں مسلماناں نگہ دارید دینے خود

کہ شمس الدین تبریزی مسلماں بود کافر شد

عالمِ باطن کا پیام بآوازِ دہل دنیا کو پہنچایا گیا۔

مزا آں دلبر پنہاں ہمی گوید بہ پنہانی	بمن دہ جاں بمن دہ جاں رہا کن ایں گرانجانی
یکے لحظہ قلندر را تو آخر شو	سمندر شو سمندر شو در آتش رو بہ آسانی
در آتش رو در آتش رو، در آتشداں خوشتر شو	کہ آتش با خلیل ما کند رسم گل افشانی
نمیدانی کہ خار ما بود شاہنشہ گلہا	نمیدانی کہ کفر ما بود مقصود ایمانی
خداوندا تو میدانی کہ صحرا از قفس خوشتر	ولیکن جغد نشکیبد زگورستان و ویرانی

تصوف میں بھی ایک زمانہ کے بعد الحادی کیفیت پیدا ہوئی، خرقہ پوشی اور خانقاہ نشینی بجائے دل میں آگ پیدا کرنے کے ٹھنڈک پیدا کرنے لگی۔ سرد دل صوفی کفر و ایمان کی آگ سے خائف ہو کر شریعت کے سرد و خشک پتھروں کے نیچے جا چھپا، اور اپنے حشر کا ساتھی فقیہہ کو بنایا یا فلسفہ کی گندگی کیچڑ میں غلطاں ہوگیا۔ فقہ اور فلسفہ انسانی آتشِ حیات کو سرد کرنے والی اور بجھانے والی چیزیں ہیں۔ عمل الحاد یہیں شروع کرتی ہیں۔ فقہ و فلسفہ رُوح و ذہن کی دُھند لگی کے نتائج ہیں، حیات مقصود و وجود ہے، حیات موجودات کی تکمیل ہے، عالم موجودات نے بے حساب گردشیں کیں۔ جب نورِ حیات ظہور میں آیا، حیات میں الکٹرونی کیفیت ہے نہ کہ پروٹونی۔ فیزکس کے محققین نے ایٹم میں دو جزو پائے ہیں، الکٹرون اور پروٹون۔ الکٹرون کی کیفیت یہ ہے کہ اپنی گردش میں جگہیں بدلتا ہے، کسی قاعدہ کا پابند نہیں، کسی قانون کا تابع نہیں، رندی کیفیت رکھتا ہے۔ بچوں کی طرح کودتا، اچھلتا پھرتا ہے۔ جب ذرہ جس سے موجودات بنے ہیں اس کی یہ کیفیت ہے تو دنیا میں قانونِ قدرت کی تلاش بے سود ہے۔ سائنس کی لاف کہ قوانینِ قدرت معلوم کرتی ہے اتنی ہی غلط و بیہودہ ہے جیسا کہ مسئلہ تقدیر۔ خدا، انسان اور الکٹرون قانون کے تابع نہیں۔ حیات جتنی کم ہوتی جاتی ہے قانون کی جانب مائل ہوتی ہے، اور اُس کا وفور قانون شکنی کی طرف آمادہ کرتا ہے۔ فقہ یا قانون بوڑھی یا بیوہ عورت ہے۔ جو دل میں اپنی جوانی اور سہاگ کا زمانہ یاد کرکے خون کے آنسو بہاتی ہے۔ لیکن تازہ جان رکھنے والے جوان مرد و عورت کو زندگی کا مزہ نہیں اُٹھانے دیتی۔ طرح طرح کے رخنے ڈالتی ہے۔ اگر ہمیں یقین نہیں آتا تو کپور اور رنگینا کی کا قصہ اخباروں میں پڑھو۔ رنگینا کی سترہ برس کی جوان لڑکی ہے۔ شادی ہوئی۔ میاں نے چھوڑ دیا۔ ہندو فقہ نکاحی رشتہ باندھ کے توڑنے نہیں دیتی چاہے عورت کی مٹی خراب ہو جائے۔ رنگینا کی اپنے باپ بھائی کے ساتھ عاطفت میں رہنے لگی۔ یکایک ایک رومیو کپور کی شکل میں رنگینا کی جیولیٹ سے عشق کرنے لگا اور ہوائی جہاز پر لے کے چمپت ہوگیا۔ رنگینا کی کا بھائی تلاش میں نکلا اور بمبئی میں پتہ لگا لیا۔ قانون کی مشین چالو کی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ بیچارہ رومیو کپور اس وقت جیل میں ہے۔

رنگینا کی اور کپور کا واقعہ ہیرو رانجھے کے قصے سے زیادہ دلچسپ ہے کہ زمین اور پانی پر نہیں ہوا میں ہوا۔ رند جاندار اصرار سے ذہ کرتا ہے جسے فقہ و قانون بُرا اور قابل سزا سمجھتا ہے۔ اور اس ضد میں کرتا ہے کہ جس مقصد کے لئے فقہ اور قانون بنے تھے۔ وہ مقصد اُن سے پورا نہیں ہوتا، اس وجہ سے بیکار صرف نہیں بلکہ مضر ہیں۔ فقہ اور قانون کے شوقِ خون آشامی کو کون بھول سکتا ہے اور رندانِ بلاکش کے ذوقِ خون افشانی کو کون نہیں جانتا۔ ایک بوڑھی بیوی نے اپنے بوڑھے شوہر کا قصہ بیان کیا کہ جوانی سے لیکر بڑھاپے تک بیاہ نہ معلوم کتنے بیاہ کئے لیکن سوا ان بیاہتا بیوی کے کوئی بھی نہیں۔ کہنے لگیں تو میں نے بھی کہا تو کرتا جا میں کھاتی جاؤں، تو کرتا جا میں کھاتی جاؤں ۔ بوڑھی

فقہ بھی رندوں سے یہی کہتی ہے "تم کرتے جاؤ میں سزا دیتی جاؤں!" لیکن باز نہ یہ آتے ہیں نہ وہ۔ جس چیز کے لئے فقہ اور قانون کا سانچہ بنا تھا وہ چیز اس سے بن کے جب نہیں نکلتی تو وہ سانچہ بیکار ہے۔ اُسے شکست کیا جائے۔ نیا سانچہ بنے۔ مگر کور باطن جماعت پُرانی چیز کی بیکاری پر نہیں غور کرتی۔ برخلاف اس کے چیز جتنی پُرانی ہوتی جاتی ہے اسی قدر اُس کی قدر و منزلت بڑھائی جاتی ہے رند چیز کے پرانے پن اور بوسیدگی کی عزت بگاڑتا ہے اُسے نظر سے گراتا ہے۔ اس کا مضحکہ کرتا ہے۔ اُس کی رُوح آزاد ہے، وہ فقہ قانون کے تابع ہو کر نہیں رہ سکتا۔

تصوّف نے جب جنگاری دنیا چھوڑی انسان کے لئے بیکار ہو گیا، خرقہ و خانقاہ بے جان و درماندگی کے نشانات ہوئے۔ دورِ علم شروع ہوا مشینوں کا زمانہ آیا۔ حرفت و تجارت کو ترقی ہوئی۔ کارخانہ دار سرمایہ دار ہوا سوسائٹی کی ساخت بدلی۔ سرمایہ داروں کی حکومت ہوئی۔ مولوی کی دستار اور درویش کا خرقہ تو بے حقیقت عالم کی نگاہ میں ہو ہی چکا تھا۔ بادشاہوں کے تاج بھی سر سے اُتر گئے۔ بنئے اور مہاجن اپنی بے ڈھنگی شکلیں لئے پیش پیش ہوئے۔ بجائے بادشاہ کی حکومت کے بنک کی حکومت ہوئی۔ بابر و بونا پارٹ کی نبرد آزمائیاں گئیں، اُن کی جگہ خام اشیا اور سود خواری کے لئے جنگیں شروع ہوئیں۔ اس دور نے جب استحکام حاصل کیا تو رُوح کشی کی نئی نئی تدبیریں اختیار ہوئیں انسان کو بے انسان بنانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا گیا۔ فقہ نے قصرِ مذہبی میں انسانی روح کو محبوس کیا تھا۔ دورِ تجارت و مہاجنی کے قانون نے اس سے زیادہ مستحکم اور مضبوط قلعہ میں اُسے قید کیا۔

انقلابِ فرانس نے آزادی، اخوت اور مساوات کے لئے معرکے کئے۔ مگر نتیجہ ان معرکوں کا صرف یہ ہوا کہ تاجِ حکومت بادشاہ کے سر سے اتر کر بنئے کے سر پر چلا گیا۔ اس نام نہاد جمہوری حکومت کی مضبوطی و استحکام کے لئے سخت قوانین درکار تھے۔ قانون ایک نیا ادارہ بنا۔ اس ادارہ کو اس درجہ بلند کیا کہ مذہب اور شاہی تاج کو حکم ہو کر چوکھٹ چُومیں۔ خدا نہیں، انسانیت نہیں، قانون کی پرستش کرو۔ ہر تعریف ثابت ہے واسطے قانون کے، جو انسانی حقوق پر حدِ سماعت عارض کرتا ہے۔ جو اس کی مدد چاہنے والے سے اپنی فیس میا بتا اور بے فیس پوری پوری وصول کئے عدل کے دروازے نہیں کھولتا۔ عدل و انصاف صرف پیسہ خرچ کرنے والے کے لئے، وہی اس سے فیضیاب ہو۔ رند پاک باطن و صاف گو انسانیت کو مقید نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے اس جدید دورِ سرمایہ داری کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ گو کہ صنعتگری کو اس دَور نے کافی رشوت اس کی قدر و منزلت بڑھا کے دی۔ آرٹ کا حرفِ اوّل بجائے چھوٹے کے بڑا لکھا جانے لگا، جیسے کرائسٹ کا C بائیل کا B اور گاڈ کا G بڑے حرف سے لکھا جاتا ہے لیکن صنعتگر نے جب غور کیا تو یہ پایا کہ آرٹ کی قدر و منزلت سوتیلی ماں کی قدر و منزلت کی ایسی ہے جب باپ مر گیا ہو کہ قدر و منزلت کے ساتھ گوشۂ عافیت بٹھا دی جاتی ہے۔ گھر کے معاملات میں اُس کا کوئی تعلق اور دخل باقی نہیں رہتا۔ صنعتگری کا تعلق معاملاتِ زندگی سے سرمایہ داری تہذیب نے قطع کرا دیا، اور سجا بنا کے اُسے طاق پر رکھدیا، "یہ شاعرانہ خیال ہے" ایسے جملے، روزمرہ کی گفتگو میں سنائی دیتے ہیں۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ ہی کہ یہ غیر حقیقی خیال ہے۔ سُن کے دل خوش کر لو۔ اور بھول جاؤ۔ تمہارے اعمال اور افعال پر اس کا کوئی اثر ہے نہ ہونا چاہئیے۔ گویا کہ شاعری زندگی کے درخت کی کٹی ہوئی شاخ ہے۔ درخت سے توڑے ہوئے پھولوں کا گلدستہ ہے۔ سرمایہ دار نے اس کی خوشبو اور رنگ و بُو سے ایک لحظہ لطف اٹھایا اور دوسرے دن پھینک دیا۔ یہ آرٹ کی قدر و منزلت ہے جس پر جدید تہذیب کو فخر ہے "یہ شاعرانہ خیال ہے" کے ایسے جملے اتنے دہرائے گائے کہ خود شاعر یہ سمجھنے لگا ہے کہ اس کی شاعری کو انسان کی عملی زندگی سے تعلق نہیں کہہ کہہ کے اس کو غیر ذمہ دار بنا دیا۔ وہ ایسا ہوا باز ہو گیا کہ ارضی زندگی سے اُسے مطلب ہی نہیں رہا۔ الاماں والحفیظ، صنعتگری جس کی پہونچ عالمِ باطن تک ہے۔ جو احساسات، کیفیات اور تحریکاتِ باطن کو معرضِ اظہار میں لاتی ہے اُسے انسانی زندگی سے تعلق نہیں!! دل کو جان سے بے تعلق کر دیا!! انیسویں صدی کی بنیادِ تہذیب کا یہ کارنامہ ہے! اس افتراق سے دل کو الگ تڑپایا اور جان کو الگ پھڑکایا۔ یہ حکم ہے کہ بے روحی زندگی بسر کرو۔ یہ بے رُوحی اور بے دلی زندگی رندِ حقیقت پرست کو کیسے گوارا ہو سکتی ہے۔ اسپرو منٹ ٹرسٹ کے حالات دریافت کرنے کے لئے صوبہ متحدہ میں ایک کمیٹی حال میں بنی تھی، اس کی سفارشوں میں سے ایک سفارش یہ ہے کہ جن رقبات کو ترقی دی جائے اُن میں مکانات کے متعلق یہ تاکید رہے کہ ایک طرح کے ہوں۔ کمیٹی کا خیالِ حسن قابلِ داد ہے مشینی یکسانیت مکانوں میں بھی۔ مکان کھڑے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ایک وردی پہنے ایک قد کے سپاہیوں کی قطار کھڑی ہے۔ رہگیر نے بھی حسنِ مشینی حسن کہ ہر چیز صاف صاف برابر کی۔ چیونٹیوں کی قطاروں سے تمہیں پھریری نہیں آتی!

فوج کی قطاریں دیکھکر تمہیں ہیبت نہیں ہوتی ؟ خدا کے لئے بتاؤ یکساں مکانوں کی قطاریں دیکھکر تمہیں فرحت کس طرح ہوگی۔ پھر مکان مکان بنانے والے کی روح کا مظاہرہ ہے۔ کمیٹی کا حکم ہے کہ بے روح مکان بناؤ بس سیدھی قطار رخ و غار تگرِ حسن ہے۔ حسین حسین عورتیں جو منفرداً جس صحبت میں جائیں اُسے منور کردیں۔ اگر اکٹھا ایک جگہ ایک سیدھی قطار میں کھڑی کردی جائیں تو اُن کے حسن میں کشش باقی نہ رہے گی۔ پھر یکساں مکانوں کی قطار تو سونے میں سہاگہ ہے۔ بالکل یہ معلوم ہوگا کہ قیدخانہ کے قیدی نمبر گلے میں ڈالے کھڑے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ رُوح کشی طرح طرح سے یہ تہذیب کرتی ہے۔ رہائش کو رُوح سے تعلق نہو۔ لباس اس سے بے نیاز رہے۔ غذا تو بہت جلد محکمہ حفظانِ صحت یکساں کردے گا۔ قانون پاس ہوتے کتنی دیر لگتی ہے روح کے لئے عالمِ ظاہر میں اب کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ باطن ہی میں ہے اور وہیں گھٹ گھٹ کے مرے، یہی مرضی اس جلاد دور کی ہے۔

بندہ اِن روشن باطن رُوح کی یہ گت دیکھتے اور خاموش رہتے۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ اس مہاجنی تہذیب کے خلاف واویلا مچایا۔ جنگِ عظیم نے جہاں قیصرِ جرمنی کا تاج سر سے اُتارا وہاں روس کی شہنشاہی کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا، اور یورپ کی آنکھیں انسانی زندگی کے متعلق کھولیں۔ اُنیسویں صدی کا فلسفہ پاش پاش کردیا، سرمایہ داری تہذیب کے بدنما دھبے جو قومیت اور شہنشاہیت کی دُخانی چادروں سے چھپائے جاتے تھے۔ کھول کے دنیا کی آنکھوں کے سامنے کردئے۔ امریکہ کی مشہور رقاصہ ایسا ڈورا ڈنکن ایک نیا رقص، روحانی جو جسم کے ذریعہ روح کا نظارہ کرائے جنگِ عظیم سے پیشتر یورپ میں لائی۔ یورپ نے اس کی خوب تعریفیں کیں۔ اس کی بڑی قدر ہوئی۔ مگر وہ بے چاری یہ رقص یورپ کو سکھا نہ سکی۔ اس کی تعلیم کا مدرسہ قائم کرنے کی یورپ میں کوئی سبیل نہ ہوئی۔ کیونکہ یورپ پر اس وقت سرمایہ داری چھائی ہوئی تھی۔ سرمایہ داری تہذیب، جیساکہ اوپر کہا جا چکا ہے حقیقی صنعت گری کو طاقِ نسیاں کے نقش و نگار میں صرف صَرف کرتی ہے۔ زندگی بنانے میں اُسے دخل نہیں دینے دیتی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد روسی بالشویکی حکومت کا تار ۱۹۲۱ء میں بدیں الفاظ اُسے ملا " روسی حکومت ہی صرف تمہیں سمجھ سکتی ہے، تم ہمارے یہاں آؤ۔ تمہارے اسکول کو ہم قایم کریں گے " ڈنکن کہتی ہے " مجھے حیرت و استعجاب تھا کہ یہ پیام اس جگہ سے آیا ہے جسے سرمایہ دار یورپ جہنم بتاتا ہے " آگے لکھتی ہے " روس کے سفر میں مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری روح موت کے بعد نئے عالم میں جا رہی ہے۔ یورپی زندگی کے تمام اشکال پیچھے چھوڑے جا رہی ہوں " پھر لکھتی ہے " میرے منعی صُور ذہنی یورپ میں معرضِ اظہار میں نہ آسکے۔ اس مایوسی کے بعد جدید بالشویکی زندگی والی جگہ میں داخل ہونے کے لئے تیار ہوں۔ پُرانی دُنیا کی نامستقل ناانصافی و محنت دلی کو دور سے سلام کرتی ہوں جنہوں نے میرا اسکول نہ قائم ہونے دیا "

آگے چل کر اپنی نہایت دلچسپ سوانح عمری ان الفاظ میں ختم کرتی ہے " جب جہاز ساحل سے لگا تو میرا دل خوشی کے مارے اُچھل رہا تھا۔ اس نئی بنی ہوئی دنیا میں میں آگئی۔ نئی اخوت کی دنیا، وہ دنیا جس کا خواب گوتم بدھ نے دیکھا اور جس کی آواز بازگشت حضرت مسیح کے الفاظ میں ہوئی۔ اور اب لینن ایک سحرِ عظیم سے اسے وجود میں لے آیا۔ میں اُسی خوابی وجود میں داخل ہو رہی ہوں۔ میرا کام اور میری آئندہ زندگی اس کی شاندار امیدوں کا جز بنیں گے۔ اے دنیائے کہن تو جا اور اے نئی دنیا تو بنت بنت آ !!

غرض یہ ہے کہ نئی دنیا آرہی ہے، اور نئی تہذیب بن رہی ہے۔

گل آمد در چمن مے در خم و پیمانہ می بینم
ہجومِ مے پرستاں بر درِ میخانہ می بینم

دل چاہتا ہے اتنا جیوں کہ اِس مہاجنی تہذیب کا ایک ایک نشان مٹتے دیکھلوں۔ یہ ملعون تہذیب جس میں ہر چیز کے دام و قیمت غلط لگی ہے یہ نامراد تہذیب جس میں روح حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹائی جارہی ہے۔ یہ مردود تہذیب جس میں جان کی غرض سے روپیہ اکٹھا کرنا ہے، یونیورسٹیوں میں جاؤ تو بے جان لاشیں طلبار کی دیکھو۔ عدالتوں میں قدم رکھو تو بے روحی کے تماشے دیکھو۔ عدمِ سماعت عارض ہے دعوے خارج۔ کورٹ فیس کم ہے، دعوے واپس، اسٹامپ کم لگا دستاویز ضبط، جرمانہ۔ کونسلوں میں گذر ہو تو جھوٹی فرقہ پرستی، بے دماغی کی بحثیں، قوم سازی کے بجائے صرف قانون سازی۔ عالمِ انسانیت کو شکنجوں میں کسنا۔

ایک بات اور کہنی ہے۔ صنعت میں طبیعت، آرٹسٹک مذاق کے متعلق غالب کے تین شعر پیش کرتا ہوں۔

پہلا شعر
دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بجمالِ دلبری
در رگِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری

دوسرا شعر
با من میاویز اے پدر فرزندِ آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

تیسرا

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

صنعتگری اور صنعت بینی کے متعلق بہت کچھ اِن تین شعروں میں کہہ دیا ہے دل عالمِ باطن کا نام ہے۔ وہ احساسات وہ کیفیات اور وہ تحریکات جو باطن میں پیدا ہوتی ہیں اُن کا مجموعی نام دل ہے، اور وہ صُور و اشکال جو ذہن میں نمودار ہوتی رہتی ہیں، اُن کا نام دیدہ ہے۔ صورت و شکل دیکھنے کی چیز ہے۔ اور جب وہ باطنی ہے تو اُس کے دیکھنے والی قوّت بھی باطنی ہوگی۔ نظرِ باطنی کو دیدہ وری کہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دیدہ و دل باطنی صورتیں، کیفیات، احساسات و تحریکات ہیں: "پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی" یعنی پہلے باطنی تحریکات شروع ہوں، احساس باطنی پیدا ہو اور کیفیاتِ باطنی طاری ہوں، تب شمعِ سخن کے فروغ میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ ڈنکن رقاصہ کہتی ہے کہ اسٹیج پر جانے سے پیشتر میں اپنی رُوح کے موٹر کو اگنائٹ کر لیتی تھی۔ جب یہ چالو ہو جاتا تھا تو میرے جسم کے حرکات اس کے تابع ہو جاتے تھے۔ بغیر میرے قصد کے چلتے تھے۔ پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی، پہلے دل جس کا دوسرا نام روح ہے، اُس میں آگ دے لو تو انسانیت چالو ہو جائے گی صنعتیں پیدا ہونے لگیں گی۔ غالبؔ کے وقت میں موٹر ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اس لئے مصدر گداختن سے کام لیا۔ اور اپنا مطلب ظاہر کیا۔ اب جبکہ موٹر دنیا میں آگیا تو اگنائٹ کا لفظ استعمال کیا جائے۔ ایک بات ہوئی دل کا ذکر ہو چکا۔ اب دونوں فارسی شعروں میں دیدہ کا ذکر ہے۔ ایک چیز ظاہر بینی ہے اور ایک باطن بینی، ظاہر بینی وہ ہے جو آنکھوں سے عالمِ ظاہر میں دکھائی دے، انگریزی میں وِژن اس کے واسطے لفظ ہے، دیدہ وری یہ نہیں ہے کہ آنکھوں سے جو دکھائی دے وہ دیکھے۔ ظاہر بینی دیدہ وری نہیں ہے۔ دیدہ وری باطن بینی ہے، وہ چیزیں دیکھنا جو آنکھ کو نہیں دکھائی دیتیں، ذہنی صورتیں دیکھنا۔ ظاہری صورتیں دیکھکر باطن جو صورتیں پیدا کرتا ہے وہ صورتیں دیکھنا پتھر کی رگوں میں پریوں کا ناچ دیکھنا۔ موجودہ دورِ مصوّری آنکھ کی دیکھی چیز بناتی ہے۔ کیونکہ مہاجن و سرمایہ دار چاہے جتنی خوبیاں رکھتا ہو ظاہر میں ہوتا ہے باطن میں نہیں ہوتا۔ وہ مصوّروں سے اپنی تصویر بنواتا ہے۔ جب تصویر ہو بہو اُس کی سی بن جاتی ہے تو اُس کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ تعلقداروں کے گھروں میں جاؤ، کوئی گھر نہ پاؤ گے جس میں تعلقدار زرق برق کپڑے پہنے دیوا

پر نہ ٹنگا ہو، موجودہ دَور کا ماحصل اور مآل کار ترقی فوٹو ہے۔ ہو بہو ظاہری شکل ہونا کمال سمجھا گیا ہے۔ نیچر کو آئینہ دکھانا عروجِ فن اِس دَور میں ہے۔ حقیقتاً یہ صنّاعی کی مٹی خراب کرنا ہے۔ صنعت کار باطن ہے، کار ظاہر نہیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ دلبری دل کا لیجانا، بیخود ہو جانا۔ اپنے آپے سے گزر نا یعنی کیفیتِ وجد۔ وجد کے حُسن کے جلوے جب باطن میں دیکھنا شروع کرتا ہے تو سنگِ بے جان میں بھی حرکات حسن دکھائی دینے لگتے ہیں۔ غالب کو یہی کہنا ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ حقیقتاً یہ ہی ایپی جی نیشن اور دیدہ وری ہے۔ مگر یہ باطن بینی یہ رقص رُوح اور حُسن کے جلوے کیا خالی تماشہ ہیں؟ کیا صنعتگر تماشہ گر ہے؟ صنعتگری کیا اربابِ نشاط کا کام ہے کہ "توندیلے مہاجن" اور "حلق تک پیٹ بھرے سرمایہ دار" کے تفننِ طبع کے لئے استعمال کی جائے؟ صنعتگری اور صنعت بینی کا کام غالب نے بتایا ہے "ہرکس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگان خوش نہ کرد" یعنی وہی جو اوپر بتایا جا چکا ہے، بغاوت، انحراف و انقلاب۔

ہیانے جرمن شاعر بھی یہ ہی کہتا تھا کہ میرے تابوت پر بجائے پھولوں کے ہار کے تلوار رکھنا، کیونکہ میں اُس جنگ کا سپاہی ہوں جو انسانیت کی آزادی کے لئے ہو رہی ہے۔

صنعت گری عالمِ باطن سے یہ پیام لاتی ہے کہ فقہ ہو یا فلسفہ، قانون ہو یا مادّی علوم اُن کے پیچھے آدمی اپنی انسانیت برباد کرنے اِس دُنیا میں نہیں آیا ہے۔ تمہاری فقہوں نے کور باطن متقی و پرہیزگار پیدا کئے، تمہارے قانونوں نے ناانصافی درمیان انسان و انسان اور انسانی حقوق شکنی کی، ایک نیا انصاف پیدا کیا جس کا نام قانونی انصاف ہے۔ تمہارے فلسفوں نے قوموں میں جنگیں کرائیں، اُنھیں سودخواری کا عادی کیا۔ تمہارے مادّی علوم نے ذمہ دار انسان کو پہیّا چلانے والا غیر ذمہ دار مزدور بنا دیا۔ اہلِ دل اور صاحبِ نظر انسان کے یہ الزامات موجودہ تہذیب کے خلاف ہیں۔ ذرا میں بھی سُنوں اِس کی تردید میں کیا کہا جاتا ہے۔



نذرِ امام

وفا سرشت لیاقت! محبِ من تسلیم
غلام بادہ پرستاں کا ہو قبول سلام

سُنا ہے تم نے مری مے کشی کے بارے میں
کسی عزیز کے خط میں کیا ہے کچھ ارقام

عزیزِ من! تمہیں اِن رفعتوں کا علم نہیں
سمندِ وقت کی ساقی کے ہاتھ میں ہے لگام

یہ رازِ بادہ و ساغر ہے آج تک اِس کو
سمجھ سکے ہیں نہ سمجھیں گے مسجدوں کے امام

یہاں کا زینۂ اوّل ہے عالمِ ملکُوت
بہت بلند ہے آزاد میکشوں کا مقام

یہاں نماز کے لب پر ہے مُہرِ خاموشی
یہاں وضو و طہارت ہیں لرزہ بر اندام

عبائیں چاک گریباں دعائیں سر بسجود
یہاں ہے سبحہ و زُنّار کا فسوں ناکام

اذان گنگ ہے، ناقوس گم، گجر خاموش
یہاں ہیں مستی و رندی کے سکہ و احکام

یہاں ہر ایک ہے نبّاضِ گردشِ انجم
یہاں ہر ایک سمجھتا ہے معنیٔ الہام

ہر ایک رند یہاں صرفِ بے نیازی ہے
یہاں نہ زیست کو طعنہ نہ موت کو الزام

خیالِ دیر و حرم ننگِ شانِ رندی ہے
یہاں نہیں کوئی ذی ہوش بستۂ اوہام

یہاں اُٹھاتے ہیں راز و نیاز کے پردے
یہاں اُلٹتے ہیں اوراقِ چرخِ نیلی فام

یہاں نہیں ہے غمِ روزگار کی فرصت
کہ گُم ہے گردشِ ساغر میں گردشِ ایام

یہاں کے مُرغکِ نوخیز تک بھی واقف ہیں
گیا ہے گھات میں صیاد لے کے دانہ و دام

اِس انجمن میں حقیقت پرست ہے ہر فرد
نہ مسجدوں کے گدا ہیں نہ مندروں کے غلام

یہاں نہیں ہے صحافت ذریعۂ تبلیغ
یہاں نگاہ کی جنبش کا نام ہے الہام

یہاں نہیں ہے کسی کو ضرورتِ جبریل
براہِ راست ہیں رندوں کے نامہ و پیغام

[illegible] اہلِ مذاہب کو خانقاہ و کنشت
میں اپنے پیرِ مغاں کا ہوں بندۂ بے دام

رموزِ ہستیٔ عالم کو پا رہا ہوں میں
ورائے کرسی و افلاک جا رہا ہوں میں

[illegible]

[illegible] ش. کانفرنس

بالِ جبریل پر دو نظریں

عطاء اللہ پالوی

پہلی نظر

علامہ حضرت سیماب اکبر آبادی مدظلہٗ کے بالِ جبریل پر جو اعتراضات رسالہ شاعر (آگرہ) میں شائع ہوئے تھے اُن کا نہایت محققانہ جواب جناب اثر (لکھنوی ڈپٹی کلکٹر متعینہ بلیا۔ یو پی) صاحب نے سپردِ قلم کیا تھا، جو رسالہ کلیم بابتہ جنوری میں شائع ہوا۔ یہ بصیرت افروز مضمون دادِ سخن اور رکاحقہٗ کامیاب، کافی اور لیس تھا لیکن پھر بھی جو تشنگی اسناد کی بہ سبب عدم دستیابی کتب کے رہ گئی تھی اُس کو جناب سید معشوق حسین صاحب اطہر نے پوری کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مجھے معاف فرمائیں جناب اطہر صاحب اگر میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ وہ کمی اپنی حد تک پوری نہ ہوئی اور اُن کا ناقدانہ مضمون اب بھی محتاجِ نظر ہے۔ اِس لئے اُن کا یہ کہنا کہ "جہاں تک حضرتِ اثر نے دعوتِ شرکت دی تھی میں نے وہیں تک اپنے مضمون کو محدود رکھا" صحیح نہیں۔ بعض اعتراضات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور بعض تکملۂ جواب پر بھی تشنہ ہیں۔ جن کے متعلق میں عرض کروں گا۔

ہمیں سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی ایسے نکتہ رس۔ باہوش اور سمجھدار شاعر نے جن کا دورِ حاضرہ کے استادانِ فن میں شمار ہے اور "کارامروز" کی سی ہوش ربا تصنیف کے مصنف اور رسالہ عروض کی سی تالیف کے مولف ہونے کے بعد بھی کیوں اُنھوں نے ایسے مہمل اعتراضات کرکے سر اقبال کے نازک حسیات کو ٹھیس لگانے کا گناہ

(باقی ہے)

مئے کہ بدنام کنند اہلِ خرد با غلط است
بلکہ مے میشود از صحبتِ ناداں بدنام

امید کہ جناب سیماب میری اس ناچیز گزارش پر لمحاتِ فرصت میں غور کریں گے۔

اب قبل اس کے کہ میں "بالِ جبریل" کے اعتراضات اور جناب اثر کے ارشادات کے متعلق کچھ عرض کروں، ہمیں جناب اطہر کے متعلق کچھ کہنا ہے۔

جناب اطہر صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ "سر اقبال اردو کی طرح فارسی کے بھی مستقل شاعر ہیں" یہ تحریر توجیہ طلب ہے۔ الفاظ "اردو کی طرح" اور "فارسی کے بھی" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے خیال میں سر اقبال کی اردو شاعری بہ نسبت فارسی کے زیادہ ہے اور نہیں تو کم از کم برابر تو ضرور ہے۔ لیکن اُن کا یہ خیال صحیح نہیں۔ زبانِ اُردو کو سر اقبال کی کم التفاتی کا ہمیشہ سے گلہ رہا اور ہے جس طرح غالب مرحوم فارسی کے شاعرِ بے بدل تھے مگر اُردو میں بھی کچھ لکھ لیتے تھے۔ اسی طرح علامہ اقبال بھی فارسی کو اُردو پر ترجیح دیتے ہیں اور دراصل وہ فارسی ہی کے شاعرِ بے نظیر ہیں، اُردو میں تو محض گنتی کے اشعار کہتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است — طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است
فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت — خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت
پارسی از رفعتِ اندیشہ ام — در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

بانگِ درا اور بالِ جبریل دونوں اُردو مجموعہ میں بہت زیادہ اشعار فارسی کے ہیں اور وہ ایسا کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ یا تو اُن مطالب و معانی کو ادا

میں حسن و خوبی ادا نہیں کرسکتے اور یا اُن کو قالب میں ڈھال کر اس کی شعریت کو برباد کرنا نہیں چاہتے۔ مثلاً بالِ جبریل میں "پیر و مرید" کے مکالمے کو دیکھئے، پیر رومی کا کُل جواب فارسی میں ہے۔

عنوان۔ "یورپ سے ایک خط" دیکھئے جوابِ خط فارسی میں ہے، غالب کی طرح اقبال کے بھی پچاسوں مصرعے ایسے ملیں گے جو ہیں تو اُردو، لیکن دیکھنے میں بالکل فارسی ہیں۔ مثلاً

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی سرمستی و رعنائی

"جبریل و ابلیس" کے مکالمے میں سوال اُردو میں اور جواب فارسی میں ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سوال۔ جبریل، ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بُو
جواب۔ ابلیس، سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

اسی طرح "بالِ جبریل" میں ایک مصرع ہے

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی

اِس کے متعلق ایک ایم اے، صاحب نے لکھا تھا کہ "یہ مصرع ایک لفظ کے تغیر سے فارسی کا مصرع کہا جاسکتا ہے، اِس لئے اِس مصرعے کو ہندوستان سے ایران پارسل کردیا جائے۔

پس اُن کے متعلق یہ خیال کہ وہ "اُردو کے شاعر ہیں اور فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں" غلط ہے۔ وہ در اصل فارسی کے شاعر ہیں اور اسی وجہ کر اُن کے اُردو کلام میں قریب قریب کل تراکیب فارسی کے ہیں، اور پائے جاتے ہیں۔

دوسری نظر

علامہ سیماب کے اعتراضات کی تردید جو جنابِ اثر نے لکھی ہے اُس میں دوسروں کو بھی شرکت کی اجازت دی ہے۔ اِس لئے میں جنابِ اثر کو اپنا بزرگ سمجھ کر اُن کا ہاتھ بٹانے کی سعی کرتا ہوں، اب رہی یہ بات کہ کامیابی یا ناکامی اُس کا فیصلہ بقول جنابِ اطہر قارئین پر ہے۔

اعتراض۔

اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر
مجھے معلوم کیا؟ وہ راز داں تیرا ہے یا میرا
(اقبال)

اِس شعر پر اعتراض یہ ہے کہ ضمیر "اُسے" لکھکر اور اسم "شیطان" کا ذکر کسی شعرِ ماقبل میں نہ کرنا ایک غلطی ہے، جو مبتدی بھی نہیں کرسکتا: اِس کا جواب جنابِ اثر نے نہایت عمدہ دیا ہے کہ "جب تسلیم کرلیا گیا کہ شعر کے مفہوم سے ضمیر کا اشارہ ظاہر ہوتا ہے تو ضمیر کا منشا پورا ہوگیا" لیکن میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اساتذۂ فن نے ایسا کیا ہے، غالب کی ایک غزل اِس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

یہ غزل کا پہلا شعر ہے اِس میں ضمیر کا اسم کہاں ہے، مگر کیا مطلب صاف نہیں ہے؟ مومن کی ایک غزل اِس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

آگ اشکِ گرم کو لگی جی کیا ہی جل گیا
آنسو جو اُس نے پونچھے شب اور ہاتھ جل گیا

اِس شعر کے دوسرے مصرعے میں "اُس" ضمیر کا اسم کدھر ہے؟ لیکن کیا مطلب خبط ہے؟

امیر کی ایک غزل اِس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

اوروں کو اُس نے اِذن دیا دیدِ عام کا
ہم ڈھونڈھتے ہیں دُور سے موقع سلام کا

اِس شعر کے دوسرے مصرعے میں "اُس" ضمیر کا اسم کس طرف ہے؟ پھر یہ لوگ تو گویا مبتدی ہیں الارہے۔ اس لئے یہ کہہ دینا کہ "ایسا کرنا بدترین غلطی ہے جو تحریر یا تقریر میں ایک مبتدی بھی نہیں کرسکتا" صریحاً ظلم ہے۔

اعتراض۔

مرا سبو چہ غنیمت ہے اِس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو
(اقبال)

اِس شعر کے اعتراض میں علاوہ غلط اعتراض کے کہ "کبھی استعمال نہیں ہوا" معترض موصوف نے خود دو غلطیاں کی ہیں، ایک تو سہواً جو "تلم" کو "غزل" لکھا، دوسری ظر افتاً جو لفظ "استعمال" استعمال کیا، کیونکہ اعتراض بلفظ کدو پر ہے

اور کدو کے لئے استعمال ہی لکھنا زیادہ موزوں تھا، بہرکیف کدو اُردو میں بھی استعمال ہوا ہے۔ استاد وزیر فرماتے ہیں۔

سما گئے مرے سینے میں شکلِ دلِ شیشے
تمہارے محتسبو ہاتھ کیا کدو آیا

اس لئے اقبال پر یہ اعتراض غلط ہے کہ کدو کبھی استعمال نہیں ہوا۔

اعتراض:۔

مُدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر
کر دے اِسے اب چاند کی غاروں میں نظر بند — اقبال

فکر تو یقینی مذکر ہے، اور جناب اثر نے صحیح فرمایا ہے کہ دونوں جائز ہیں مزید برآں جناب اطہر نے سند بھی پیش کی ہے، مگر اِس سند میں غلطی ہے۔ امیر لکھنوی کا شعر اس طرح ہے۔

قرار آہی گیا غم میں جی سنبھل ہی گیا
گئے وہ دن کہ جو تھا فکر جان جانے کا

پہلے مصرعے میں بجائے "جی" کے "دل" غلط لکھا گیا ہے۔ اب رہا "غار" اِس کے متعلق جناب اطہر فرماتے ہیں کہ "غار" کو مؤنث کاتب نے لکھدیا ہے۔ میں اُن سے یہ پوچھتا ہوں کہ ساری کی ساری کتاب میں کاتب نے غلطی کی تو یہی کہ "غار" کو مؤنث لکھدیا اور اگر فرض کیجئے کہ کاتب نے اُس کو غلط لکھدیا ہے تو پھر اطہر صاحب نے اِس اعتراض کا جواب کیوں نہیں دیا؟

ضمیر لالہ مے لال سے ہوا لبریز
اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

اِس شعر پر بھی تو یہی اعتراض ہے کہ "پرہیز کو خلافِ جمہور مؤنث لکھا ہے" کیا یہ بھی کتابت کی غلطی ہے؟ ہرگز نہیں یہ تاویل سراسر غلط ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ تذکیر و تانیث کے بحث وتمحیص میں پڑ کر تو تو میں میں کرنا تحصیل حاصل ہے جس طرح آج تک شیعہ اور سنّی کا مذہبی مسئلہ طے نہ ہوا، اور نہ ہوگا۔ اُسی طرح اُردو میں یہ مذکر و مؤنث کا جھگڑا ابھی نہ طے ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ استادوں کو حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہیں لکھیں اُن پر کسی استاد کا تتبع فرض نہیں۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو بالاتفاق مؤنث ہیں، مگر بعض استاد اُس کو نہیں مانتے اور مؤنث لکھتے ہیں اور عوام اُس کو مانتے اور سند میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً قلم جو بالاتفاق مذکر مستعمل ہے مگر ظفر نہیں مانتے وہ کہتے ہیں۔

ظفر جو خوف سے تیرا نہ کانپتا تھا ہاتھ
قلم تری دمِ تحریر بل گئی تھی کیوں

نقاب بالاتفاق مؤنث ہے، مگر امانت نہیں مانتے وہ فرماتے ہیں۔

چہرے سے اپنے دُور جو اُس نے نقاب کی
رنگت سفید شب کو ہوئی ماہتاب کی

بعض الفاظ ایسے ہیں جو مؤنث ہیں مگر بعض ادیب اُس کو نہیں مانتے مثلاً فغاں بالاتفاق مؤنث ہے مگر آسی نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں۔

عشقِ گل میں وہی بلبل کا فغاں ہے کہ جو تھا
پرتومے وہی حالِ کتاں ہے کہ جو تھا

افشاں بالاتفاق مؤنث ہے۔ مگر آتش نہیں مانتے۔ فرماتے ہیں۔

حُسن وجمال کو بھی طمع سیم و زر کی ہے
افشاں ہوا ہے یار کے رخسار کو پسند

گریز کو فصحا مؤنث بولتے ہیں۔ مگر رشک اُن لوگوں کا تتبع نہیں کرتے وہ فرماتے ہیں۔

جس سے گریز تھا مجھے اب ہے اُسی کا اشتیاق
کام لیا ہے عشق نے جبر سے اختیار کا

ان سب کو جانے دیجے۔ بہت سے الفاظ ایسے ملیں گے جن کو ایک ہی شاعر ایک جگہ مؤنث لکھتا ہے تو دوسری جگہ مذکر۔ اور دونوں کو صحیح کہنا پڑتا ہے۔ استاد وزیر زنّار کو ایک جگہ مؤنث کہتے ہیں تو دوسری جگہ مذکر۔ ملاحظہ ہو

مؤنث ۔ اُس بتِ بے دیں پہ ہم دیندار بھی مرنے لگے
برہمن زنّار پہنا دے کفن کے تار کی

مذکر۔ کافر ہوا ہوں پی کے مے عشقِ بُت وزیر
زنّار مجھ کو چاہیئے موجِ شراب کی

حضرت ناسخ بلبل کو ایک جگہ مذکر کہتے ہیں تو دوسری جگہ مؤنث دیکھئے۔

مذکر — بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا
رُوح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

مؤنث :- گُل ترے دامِ محبت میں ہیں یوں تازہ اسیر
جس طرح دام میں بُلبل ہو گرفتار نئی

اسی طرح اقبال عہد حاضرہ کے باکمال شاعر ہیں اور اُستاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور اُنھیں حق حاصل ہے کہ دوسروں کا تتبع کئے بغیر جس طرح اور دوسرے استادوں نے کیا یہ بھی اپنا اسکول الگ قایم کریں اور اگر ایسا نہ تھا اور نہیں ہے تو پھر اُن اساتذہ پر کسی نے کیوں نہیں اعتراض کیا؟ یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں کو اس کا حق حاصل تھا اور وہ کسی کے اتباع پر مجبور نہیں تھے اور نہ کئے جاسکتے تھے۔ اِس میں نہ تو دہلوی کی قید تھی، اور نہ لکھنوی کی "قامت" کو انیسؔ مونث لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

سرو شرمائے قد اِس طرح کا قامت ایسی
اسد اللہ کی تصویر تھی صورت ایسی

لیکن دبیرؔ اس کو نہیں مانتے وہ مذکر لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

تڑپا جو شہ کے ہاتھوں پہ قامت سرک گیا
ٹوپی گری زمین پہ منکا ڈھلک گیا

اب بتایئے دونوں لکھنوی ہیں۔ مگر ایک دوسرے کی اتباع نہیں کرتے۔

اعتراض :- یوں دادِ سخن مجھکو دیتے ہیں عراق و پارس
یہ کافرِ ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز
اقبال

اعتراض یہ ہے کہ "عراق و پارس قیدِ بحر و وزن سے خارج ہے۔ اور کسی طرح بھی اس مصرعے میں نظم نہیں کئے جاسکتے"

شبہ ہوتا ہے کہ کیا واقعی یہ اعتراضات علامہ سیمابؔ ہی کے ہیں؟ جناب اثرؔ نے تو اس کی تقطیع کرکے اعتراض کے پہلے ٹکڑے کی کہ "قیدِ بحر و وزن سے خارج ہے" تردید کردی تھی، اور اُن کے بعد جناب آلہرؔ نے بھی بڑی محنت سے لغات کی اسناد پیش کرکے اور فارسی کے چند شعر لکھکر یہ ثابت کردیا ہے کہ شعر "قیدِ بحر و وزن سے خارج" نہیں ہے اور پارس کی "ر" متحرک نہیں بلکہ ساکن ہے لیکن اب بھی اعتراض کے اس آخری ٹکڑے کا جواب شافی کہ "کسی طرح بھی اس مصرعے میں نظم نہیں کئے جاسکتے" نہیں ہوا، اور ضرورت ہے کہ اُس سے زیادہ مستند ثبوت پیش کیا جائے۔

جناب سیمابؔ بلاشبہ پارس کی "ر" کو متحرک پڑھکر بہک گئے اور ایسے بہکے کہ لکھدیا "کسی طرح عراق و پارس" اس مصرعے میں نظم ہی نہیں ہوسکتا" حالانکہ حضرتِ حافظؔ کا شعر ثبوت میں موجود ہے فرماتے ہیں۔

عراق و پارس گرفتی بہ شعرِ خود حافظ
بیا کہ نوبتِ بغداد و وقت تبریز است

دیکھئے تو کس طرح اس مصرعے میں نظم کئے گئے ہیں۔ کیا آپ مسلم الثبوت فصیح البیان حافظؔ کے متعلق یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ "اُن کا یہ شعر ایسا مبہم اور مہمل ہے کہ باوجود کوشش کے اُسے صحیح بھی نہیں کیا جاسکتا"

اعتراض۔ روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھکو بھی شرمسار کر
اقبال

اس پر کئی اعتراضات ہیں جن کا جواب جناب اثرؔ نے بہت کافی طور پر دے دیا ہے اور اب اُس میں اضافہ کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ لیکن پھر بھی بقول چغتائی صاحب کے ایک "نُکتہ" لگانے کو جی چاہتا ہے کہ جب سیمابؔ کا اقبالؔ کے اِس شعر پر یہ اعتراض ہے کہ اِس میں "عبودیت کا خوفناک تجاوز ہے" تو حضرتِ جامیؒ کے اس شعر کے متعلق کیا خیال ہے؟ خدا سے کہتے ہیں

ساختی مومن کسے را کردہٗ کافر کسے
رخنہا انداختی خود فتنہ برپا کردہٗ

حضرتِ جامیؔ تو اقبالؔ سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ اُنھوں نے تو صرف شرمساری ہی کی رائے دی تھی اور یہ تو "رخنہ انداز" اور "فتنہ برپا" وغیرہ سب کچھ کہہ گئے ہیں خیر اُن کو چھوڑیے، غالبؔ کے اس شعر کے متعلق اُن کا کیا خیال ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اِس میں تو غالبؔ عبودیت کے درجہ سے تجاوز کرکے خود معبود بن بیٹھے ہیں۔ کیا جناب سیمابؔ اُن پر بھی اعتراض کرکے اُن کی رُوح کو خوش کریں گے؟ دوسرے اِس شعر میں اصلاح دے کر تو غالباً وہ بھی اس گناہ کبیرہ میں حصہ رسدی کے قاعدہ پر برابر کے شریک ہوگئے۔

اعتراض :-

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تونے اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

اس شعر پر اعتراض یہ ہے کہ "پہلے بیت میں خطاب انسان سے ہے، اور دوسرے میں خدا سے"

جناب اثر مدظلہٗ نے معترض کی غلط فہمی کو خوب سمجھا اور سمجھایا ہے، اور جناب اطہر نے اپنے مضمون میں سند بھی پیش کی ہے۔ مگر قاآنی کے پہلے شعر سے کبریا کا مفہوم یعنی "خدائے جبار" ہے، اور دوسرے شعر میں "عرش کبریا" کا مفہوم عرشِ الٰہی ہی ظاہر ہوتا ہے، اس لئے قابلِ اطمینان نہیں، ہاں اگر حضرات اثر اور اطہر اجازت دیں تو میں زیادہ صاف شعر ثبوت میں پیش کر سکتا ہوں جو بلا شبہ پوری طرح جناب اثر کے جواب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ حضرتِ حافظؒ فرماتے ہیں۔

ترکِ ما سُوئے کس نمی نگرد
آہ ازیں کبریا و جاہ و جلال

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

دانکہ پیشش بنہد تاجِ تکبر خورشید
کبریائیست کہ در حشمتِ درویشان است

غالباً اس سے زیادہ توضیح و تصریح کی ضرورت نہیں، کیونکہ آخر جناب سیماب بھی تو نکتہ رس اُستادِ وقت ہی ہیں۔

اعتراض۔ عشق کی تیغ جگردار اُڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی (اقبال)

ساقی سے تیغ و نیام کی بے جوڑ گفتگو کے ضمن میں جناب اثر مشعل راہِ ہدایت بن چکے ہیں، اور اُن کے بعد جناب اطہر نے تو فارسی میں صائب کا شعر سند میں پیش کر کے یہ ثابت ہی کر دیا کہ کیسی جوڑدار ترکیب ہے۔ لیکن اگر اُردو کا شعر بھی چاہیئے تو حاضر ہے۔ مرزا کاظم فرماتے ہیں۔

غازی نے اِدھر میان سے لی تیغ جگردار   چھیڑا جو ذرا پیچ میں تھا فوج کے رہوار
لشکر کے نمودار وں سے چلنے لگی تلوار   سرداروں کے سر کٹ کے ہوئے کھیت میں انبار

لاشے تھے طپاں ہاتھ تھے نہ جسم پہ سر تھے
نخلِ قدِ اعدا میں نہ پتے نہ ثمر تھے

اس کے علاوہ یہ کیا مشکل ہے کہ تیغ کے ساتھ آبدار۔ آتش بار۔ باڑھ دار زہر دار۔ شرربار۔ جگر افگار تو لکھا جائے مگر نہ لکھا جائے تو جگردار۔ کیوں بھائی! آخر جگردار نے کیا قصور کیا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ جناب سیماب کے سے اُردو دوست اردو زبان میں الفاظ کے اضافے کی اجازت نہیں دیتے۔

اب رہے یہ اعتراضات کہ "مشکل نہ بن جائے" یا "مجھے میرا" فصحا نہیں بولتے، اور محاورے نہیں ہیں تو اس کے متعلق صرف اتنی گذارش ہے کہ مانا فصحا نہیں بولتے مگر یہاں فصحا سے کون مراد ہیں، صرف فصحائے دہلی اور لکھنؤ، تو اس کے یہ معنی کہاں ہوئے کہ پنجابی اگر کوئی ادیب یا شاعر ہو تو وہ اپنے یہاں کے محاورات استعمال نہ کرے۔ جس طرح فصحائے دہلی اور لکھنؤ نے اپنے اپنے محاورات استعمال کئے ہیں اُسی طرح فصیحانِ پنجاب کو بھی اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے محاورات استعمال کریں۔ وہ کسی طرح اس بات پر مجبور نہیں کئے جا سکتے کہ وہ اپنے یہاں کے محاورے متروک کر کے فصحائے دہلی اور لکھنؤ کی اتباع کو اپنا فرض سمجھیں۔ بقول اسیرؔ۔

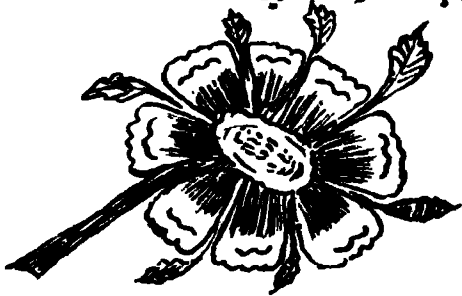
کیوں کسی استاد کے دیواں کو دیکھیں وقتِ فکر
حاکمِ مردہ کا دستور العمل پایا تو کیا

علاوہ بریں "مجھے مرا" ایک جملہ تو ہیں "ہاتھ آ نے مجھے" ایک جملہ ہوا، "میرا مقام" ایک جملہ ہوا "اے ساقی" ایک جملہ ہوا، ہر ایک جملے بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں جس میں کوئی ثقالت نہیں، اور اگر فرض کیجے کہ "مجھے میرا" ایک ہی جا یا لفظ ہو تو کیا ظلم ہے کہ "تیری تو" استعمال ہو اور "مجھے میرا" نہ لکھا جائے۔ شوقؔ فرماتے ہیں۔

آبرو جان مری جائے گی
تیری تو اس میں بھی بن آئے گی

بہرکیف جناب سیماب کی سی ذمہ دار ہستیوں کا ایسے ایسے اعتراضات اُردو زبان کی ترقی و ترویج میں حارج اور معترض ہونا بعید از دانشمندی ہے۔

اِس سلسلے میں مجھے کچھ اور کہنا ہے اور وہ یہ کہ بالِ جبریل پر جتنے اعتراضات اب تک شائع ہوئے ہیں اگر اُن کو ایک جگہ ترتیب دیا جائے تو غالباً پوری تصنیف "بالِ جبریل" میں صرف چند ہی شعر نکلیں گے جن پر اعتراض نہ ہو۔ لیکن اب تک جتنے اعتراضات و اصلاح کے سلسلے میں خود معترضین سے ایسی غلطیاں سرزد ہوتی گئی ہیں جو بے حد افسوسناک ہیں۔



غزل مستزاد

بتلا تو ہی کیا وعدہ تھا، مجھ کو جو نہیں ہوش
او وعدہ فراموش

گردن نہ جھکا، دیکھ ادھر، کیوں رہوں خاموش
او وعدہ فراموش

کیا قول تھا، کیا فعل ہے، انصاف ذرا کر
کچھ خوف خدا کر

دل چاک، جگر خون ہے، ارمان سیہ پوش
او وعدہ فراموش

خونابۂ دل اشکوں کے ہمراہ بہا ہے
وہ جبر سہا ہے

گل پوش ہے دامن تو گریباں ہے گل جوش
او وعدہ فراموش

کیا چال نکالی ہے، تری چال کے قرباں
بسمل ہیں دل و جاں

بے ہوش کا ہوتا ہے گماں، گو نہیں مدہوش
او وعدہ فراموش

قابو میں اختر کے دلِ دیوانہ نہیں ہے
مستانہ نہیں ہے

غم اس کو فراموش شدہ غم کو فراموش
[illegible]

[illegible] لکھنوی

[illegible] بقلم جناب [illegible]

قدیم ترین افسانہ

ل۔ احمد، اکبر آبادی

بدبخت ہیں وہ ملک جہاں علم و فن کی پرستش نہ ہوتی ہو، اور قابلِ احترام ہیں وہ قومیں جو اس دھن میں بسر کرتی ہوں! یادش بخیر! ہم بھی کبھی علم کے ایسے ہی بھوکے اور فن کے اتنے ہی پیاسے تھے، لیکن آج یہ عالم ہے کہ اقوامِ مغرب کی وارفتگیٔ علم و فن کی حد بھی ہم تیرہ بختوں کی رسائیِ تصور میں نہیں آسکتیں۔

قدیم مصری ادب کا میدان جتنا وسیع اور متنوع تھا اُس کے باوجود یہ گمان ہونے لگا تھا کہ مصرِ قدیم نے تخیلی و رومانی ادب میں کوئی ارتقا حاصل کیا ہی نہ تھا، کیونکہ دُنیا کے تمام عجائب خانے، جملہ کتب خانے، اور کل مجموعۂ نوادر میں ایسی کوئی شہادت موجود نہ تھی۔

۱۸۵۲ء میں ایک انگریز خاتون، مسز دَدربنی کی جستجو کامراں ہوئی، اور وہ خوش قسمت مشتری ثابت ہوئی جس کے ہات ایک قدیم قرطاس لگ گیا جس نے قدیم مصری ادب کے تخیلی جزو کی شہادت بہم پہونچا دی۔

پیرس کے مجموعۂ نوادرِ مصریات کے سپرنٹنڈنٹ اور اپنے عہد کے برترین ماہرِ مصریات، ویکانت، دُروژ لے، کو جب یہ مسودہ دیا گیا تو اُس کی قدر و قیمت کا فوراً اندازہ ہوگیا، اور اُس نے پیرس کے "آرکیالوجی ریویو" میں اس پر ایک مختصر تبصرہ شائع کرکے علما و مجتہدینِ فن کو توجہ دلائی، وہ دن یورپ کے شیدائیانِ فن و ہنر کے لئے عید کا دن تھا جس روز یہ مضمون شائع ہوا۔

یوں تو معلوم نہیں کس نامعلوم زمانے سے ذہن و تخیلِ انسانی مصروف ہے، بعد اُس کی بارہ آوری بہت سے قصّے کہانیوں کی صورت میں آج ہمارے سامنے [illegible] اس وقت بھی تھی جب یہ مصری فسانہ لکھا گیا تھا، اور یہ کہانیاں جو اکثر [illegible] اپنی اصل کے اعتبار سے ایک مگر شکل میں متغائر، امتدادِ وقت کی گود میں لوٹتی ہوئی کرۂ ارض کے مختلف حصّوں میں محض مقامی تغیراتِ رنگ و صورت کے ساتھ موجود تھیں۔ لیکن یہ ایک حقیقتِ امری ہے کہ اِن کہانیوں کا اوّلین عہدِ آغاز محو ہوچکا ہے۔ یہ کب وضع ہوئیں اِن کا مخترع کون تھا، اور اُن میں تغیرات کیونکر رونما ہوئے، کچھ معلوم نہیں ہوسکتا۔ بلکہ وہ نسلِ انسانی میں زبانی طریق پر منتقل اور متغیر ہوتی رہی ہیں۔ اِن کہانیوں کو اگر "تخمِ پراں" کا نام دیا جائے تو زیادہ مناسب حال معلوم ہوتا ہے، کہ وہ جہاں تہاں، مختلف آب و ہوا میں پہنچکر مخصوص مقامی چیزیں بن گئیں، اور اپنی اصل نسل کی تحقیق کرنا کام جستجو ہی رکھنا پسند کرتی ہیں، اِن اساطیر، کہانیوں، اور مضمون کی تدوین معلوم نہیں کتنے زمانے کے بعد ہوئی، اور جن مجلّدات کے اندر اُن کو قرار ملا، وہ جلدیں خدا جانے اُن کے اختراع کے کتنے بعد کی ہیں!

لیکن تمام مسودات قدیم ہیں جو اس وقت دریافت ہوئے ہیں، یہ فسانہ جو اس مسودے میں رقم ہے قدیم ترین نوشتہ باور کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی اصلی و واقعی اور مستند صورت میں ہم تک پہنچا ہے، اور اِس افسانے کی صورت اِن کہانیوں سے مختلف اور جداگانہ ہے، جن کی قدرت کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اِس افسانے کی صورت آج بھی وہی ہے جو روزِ تحریر تھی، اور قرطاسِ قدیم جس کا رنگ بھورا پڑ گیا اور جو گھِسا ہوا ہے، جس پر پُر رمز حرف منقوش ہیں، بتیس صدی پہلے ایک کاتبِ فرعون انّانا (ANNANA) نے تصنیف کیا اور آج برٹش میوزم لندن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اس فسانے کی وجہ تصنیف یہ معلوم ہوتی ہے کہ یُوسم ڈیلفنی نیس شہزادے

مرنپتاہ (MERNEPHTA) یعنی فرعون رامیسیس میامون (RAMESESMIAMUN) کے بیٹے کے لئے لکھا گیا۔ اور مصری ادب کے شہ پاروں میں باور کیا جاتا تھا۔ اس مسودے کے آخر میں یہ عبارت درج ہے۔

"یہ مسودہ اس درجے کا ہے کہ فرعون کے کاتبوں سے نامزد ہو
ان کاتبوں کے نام یہ ہیں۔ لگاپور جو اپنے وقت کا برترین کاتب
تھا، ہورا اور میرے باپو (یہ دونوں آسمانِ کتابت کے
درخندہ اختر تھے) یہ کاتب انّانا کی تصنیف ہے جس کے
قبضے میں یہ بلند وبالا ہے، خداوند تھوتھ (THOTH)
ان تمام الفاظ کو فنا سے محفوظ رکھے!"

یہ تین ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی تصنیف ہے بہت سی باتیں ہمارے سامنے پیش کردیتی ہے، اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس کے کون کون سے نقطے ایسے ہیں جو دوسرے ملکوں اور مختلف زمانوں کی کہانیوں اور روایتوں سے مطابق یا مماثل ہیں۔

اس سے نہ صرف ہمیں مصریانِ قدیم کے رسم ورواج، طور وطریق، اور رائے وخیال کا علم ہو جاتا ہے، نہ صرف اس عہد میں مسئلہ تناسخ کے وجود کا پتہ ملتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے عقیدے میں رُوح جسم سے الگ ایک وجود رکھتی تھی، یہ فسانہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ عورت کے متعلق مصریانِ قدیم کیا خیال وعقیدہ رکھتے تھے۔

اس فسانے کے متعلق یہ سوال چنداں اہم نہیں کہ آیا یہ بالکل طبعزاد ہے یا دوسرے ذرائع سے مصر میں پہنچا تھا، کاتب انّانا کو اس کا مخترع کہا جائے یا مؤلف اس کی دلچسپی میں کمی نہیں آتی۔ اگر اس کو مستعار، مختار، یا ترجمہ بھی مان لیا جائے تو اس کی "انجیلی انشا" اس کی سادگی، اس کی تازگی اور اس کا تسلسلِ بیان خیال کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

انگریزی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ مترجم نے التزام رکھا ہے کہ اصلی عبارت کا انداز قایم رہے، اور اس لئے میں نے بھی ترجمے میں خیال رکھا ہے کہ وہ شان باقی رہے۔ قوسین میں الفاظ ربط دیدئے ہیں۔ لیکن پھر بھی اگر سلاست کمی پائی جائے تو اس کا یہ استفادہ بہت زیادہ قابلِ قدر ہے کہ ہم اتنا قدیم منظوم بیان وانشا کا اندازہ کرسکتے ہیں۔

ایک ماں باپ سے دو بھائی تھے۔ بڑے کا نام آنپو اور چھوٹے کا باتو تھا، اور آنپو کا ایک گھر تھا، اور اس کی بیوی، اور وہ چھوٹے بھائی کو بیٹوں کی طرح رکھتا تھا، اس کے کپڑوں وغیرہ کی خبر گیری کرتا تھا، وہ اپنا جوارسے کر کھیت پر چلا جاتا تھا۔ (اور صرف اس وقت جب) کھیت کی جتائی ہو چکتی تو وہ (باتو) کھیت کے ہر کام مدد دینے پر مجبور ہوتا تھا، اور یہ چھوٹا بھائی خوب کام کرنے والا تھا۔ اس کی برابر کام کرنے والا سارے علاقے میں (کوئی) نہ تھا، جب بہت دن گزر گئے (تو) پھر چھوٹا بھائی جوارے جاکر کام کرتا تھا، جو اس کا (بڑے بھائی کا) طریقہ تھا، اور (اسی کی طرح) وہ بیلوں کو شام کے وقت لیکر گھر پہنچا کرتا تھا، اور (جب وہ کھیت سے پلٹتا تو بیلوں کے لئے بہت سی چری کاٹ کر لاتا تھا، اور بڑا بھائی اپنی بیوی کے پاس گھر پر رہا کرتا تھا کہ کھائے اور پئے، اور چھوٹا بھائی بیلوں کی خدمت میں لگا رہتا تھا۔

اب، جب دنیا روشن ہوتی اور ایک نیا دن نکلتا، اور چراغ (گل کردیا) جاتا) تو وہ اپنے بڑے بھائی سے پہلے جاگتا، اور کھیت پر روٹیاں لیجاتا، کہ مزدوروں کو دی جائیں (تاکہ مزدور بھی اس کے ساتھ روٹی کھائیں، پھر وہ اپنے جوارے کے پیچھے ہو لیتا۔ اور وہ (لوگ) اُسے بتاتے کہ اچھا چارہ کہاں ملے گا، اور وہ اُن کا کہنا مانتا۔ اور بیلوں کو اسی جگہ لے پہنچتا، جہاں چری اچھی ہوتی، جس کو بیل خوش ہو کر کھاتے، اس کے بیل اچھی نسل کے تھے، اور اُن کی بیانت بڑھتی رہی، پھر ہل جوتنے کا وقت آگیا، اور اس کے بڑے بھائی نے اس سے کہا۔

"چلو جوارے لے چلو، کھیت جوتیں، کیونکہ کھیت اُبھر آئے ہیں (نیل کی طغیانی کے بعد) ہل جوتنے کے لئے یہ موسم اچھا ہے، تو کھیت پر بیج لے چل، کیونکہ ہم ہل چلانے میں لگے ہوں گے-------"

یہ اُس نے کہا اور اس کے چھوٹے بھائی نے وہی کیا جو اس کے بڑے بھائی نے کہا تھا------ اور جب دنیا روشن ہوئی اور (پھر) نیا دن نکلا تو وہ کھیت پر (اپنے جوارے کو لے کر) گئے، اور کھیت میں اپنے مزدوروں کے ساتھ کام کرتے رہے، اور بہت خوش تھے کہ انھوں نے کتنا کام (ختم) کرلیا تھا---

------ اب ہوتا گیا ہے کہ کچھ دن بعد جب وہ کھیت پر تھے اُن کو بیج کی (اور) ضرورت پڑی، اور اُس نے چھوٹے بھائی کو (بیج کے لئے) گھر بھیجا اور کہا۔

"جلدی جا اور گاؤں سے بیج لے آ"

اور (جب اُس کا چھوٹا بھائی (گھر پہنچا تو) بڑے بھائی کی بیوی کو چوٹی گوندھتے پایا، اُس سے بولا۔

"اُٹھ اور مجھے بیج دیدے۔ مجھے جلدی کھیت پر پہنچنا ہے۔ بھیا نے بہت جلدی کی ہے۔" اس پر وہ بولی۔

"جا، کوٹھی کھول کے جو چاہتا ہے لے لے۔ (اگر میں اُٹھوں گی تو) میری چوٹی کھل جائے گی۔ اس پر وہ لڑکا کوٹھی میں گیا اور ایک بڑی ٹوکری بھر لی، کیونکہ وہ اناج کی زیادہ مقدار لے جانا چاہتا تھا، اور (جب) وہ گیہوں اور جَو کا بوجھ سنبھالکر باہر نکلا، وہ اس سے کہنے لگی۔

"کتنا اناج لے چلا ہے؟"

"جَو کے تین ماپ اور گیہوں کے دو۔ سب پانچ ماپ لئے جا رہا ہوں"

اُس نے جواب دیا۔

(اس کے آگے یہ (تفصیلی) بیان ہے کہ اس مکّار اور بدکار عورت نے (پوتیفر کی بیوی کی طرح جب اُس کو اپنی خواہش اور مرضی پر راضی نہ پایا تو) بدلا لینے کے لئے اس نوجوان پر کس طرح الزام لگایا، اور الزام کو سنگین بنانے کے لئے اپنے کچھ زخم بھی لگایا، اور ظاہر کیا کہ زخم اُس کے دیور نے لگایا ہے)

شام کے وقت جب اُس کا شوہر گھر پلٹا، جو اس کا روزمرّہ کا معمول تھا، اور گھر میں داخل ہوا تو اپنی بیوی کو (اس طرح) پڑا پایا جیسے اس پر کسی بدنیت آدمی نے حملہ کیا ہو، اور اس نے (بیوی نے) اُس کو ہاتھ دھونے کے لئے پانی (بھی) نہیں دیا، جو اس کا معمول تھا، اور نہ اس نے اُس کے لئے چراغ روشن کیا، اور اس کے گھر میں اندھیرا تھا، اور وہ وہاں کھلے (بدن) پڑی ہوئی تھی۔ اس کے شوہر نے اس سے پوچھا۔

"تجھ سے کس نے بات کی ہے، اُٹھ!"

اس پر اُس نے جواب دیا۔

"مجھ سے کسی آدمی نے تیرے چھوٹے بھائی کے سوا بات نہیں کی ہے"

یہ سُن کر بڑا بھائی ایک شیر کی طرح (غصّے میں) بھر گیا، اور اُس نے اپنی کلہاڑی تیز کی اور ہاتھ میں لے لی۔

(یہ) بڑا بھائی اپنے گھر کے کواڑوں کے (ایک پٹ کی) آڑ میں ہو گیا، کہ چھوٹے بھائی کو (جب وہ) شام کے وقت بیلوں کو لے کر گھر آئے تو اس کو مار ڈالے۔

اب جب سورج ڈوبا اور اُس نے حسبِ معمول کھیت پر سے چارے کا گٹھر سر پر رکھا (اور گھر آیا) اور ایک بیل کو باندھ دیا تو بیل اپنے رکھوالے سے کہنے لگا۔

"اپنے بڑے بھائی سے ہشیار رہنا جو تیرے سامنے وہاں کلہاڑی لئے تجھے قتل کرنے کو کھڑا ہے"

اور اُس نے اپنے بیل کی باتیں سنیں، پھر دوسرے کو باندھا تو اس نے بھی وہی کہا، اور اُس نے دروازے کی طرف دیکھا، (تو) اُسے اپنے بھائی کے پاؤں نظر آئے جو کلہاڑی ہاتھ میں لئے دروازے کے پٹ کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ تب اُس نے فوراً اپنا بوجھ پٹک دیا اور وہاں سے بھاگا، اور اُس کا بڑا بھائی کلہاڑی لئے اُس کے پیچھے بھاگا۔ چھوٹے بھائی نے سورج دیوتا ہرماشش (HARMCHIS) سے دعا مانگی۔

"عظمت والے آقا، وہ تو ہی ہے جو جھوٹ سچ کو الگ الگ (کر) جانتا ہے!"

اور سورج دیوتا اس کی شکایتیں سننے کو ٹھہر گیا، اور سورج دیوتا نے اُس کے اور اُس کے بڑے بھائی کے بیچ میں ایک زبردست ندی حائل کر دی جس میں بہت سے گھڑیال تھے اور (اب) ایک اس کنارے پر اور ایک اُس کنارے پر (تھا) بڑے بھائی نے دو ہاتھ لگائے (بھی) لیکن اُس کو (چھوٹے بھائی کو) مار نہ سکا، اُس نے یہ کیا (اور) چھوٹے بھائی نے اس کنارے سے پکار کر کہا۔

"ٹھیر اور انتظار کر کہ زمین (پھر) روشن ہو، (اور) جب سورج کا گردا افق پر پھر دکھائی دیگا، اُس وقت میں اس کے سامنے (اپنے آپ کو) تیرے روبرو کر دونگا کہ میں تجھے وہ دے سکوں کہ تو سچ کو جان جائے، کیونکہ میں نے تیرا کوئی قصور نہیں کیا ہے، ورنہ جہاں تو ہے میں اُس جگہ نہیں آؤں گا، اور صنوبر کی جنگل کو (نکل) جاؤں گا"۔ جب دنیا (پھر) روشن ہوئی، اور دوسرا دن نکلا تو سورج کا دیوتا ہرماشش نمودار ہوا اور اُنھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، اور لڑکے نے بڑے بھائی سے کہا —

"میرا پیچھا مت کر (کہ تو) مجھے بے انصافی سے قتل کر دے؟ میرے منہ سے جو نکلتا ہے، کیا تو نہیں سنتا ہے، یعنی (یہ کہ) میں واقعی تیرا چھوٹا بھائی ہوں اور تو میرے باپ کی جگہ تھا اور تیری بیوی میری ماں کی جگہ تھی" (پھر وہ اس الزام کی صفائی کر دیتا ہے جو اُس پر لگایا گیا تھا۔ اور اپنے بھائی کو اپنی بے گناہی کا یقین دلا دیتا ہے)

لیکن (یہ معلوم کرکے) اُس کے بھائی کی رُوح بہت بے چین ہوئی، اور وہ وہاں کھڑا ہو کر رونے اور افسوس کرنے لگا۔ مگر وہ گھڑیالوں کے ڈر سے اپنے چھوٹے بھائی کے پاس نہ جا سکتا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی نے پکار کر کہا۔

"دیکھ تو نے نیت خراب کی۔ اور اس کی جگہ تیرے خیال میں بھلائی نہ تھی۔

لیکن میں تجھ سے ایک بات کہتا ہوں، جو تجھے کرنا چاہئے (تو) اپنے گھر جا، اپنے مویشی کی رکھوالی اور خدمت کر، کیونکہ (اب) میں وہاں نہ جاؤں گا جہاں تو رہتا ہے، بلکہ میں صنوبر کے جنگل میں نکل جاؤں گا، اور جب تو مجھے پھر ڈھونڈھنے آوے تو میرے لئے تو اتنا کرنا، سُن رکھ، (کہ) میں اپنی جان کو اپنے آپ سے الگ کر دوں گا، تاکہ میں اسے صنوبر کے سب سے اونچے شگوفے پر رکھدوں، اور وہ صنوبر کا درخت جیسے ہی کاٹا جائے گا تو وہ (شگوفہ) زمین پر آرہے گا، جب تو اُسے ڈھونڈھنے آوے تو سات برس ٹھہر کر ڈھونڈھیو، اور اگر تیری رُوح اس (انتظار کو) سہارے گی، تو پھر (تُو) اُسے (شگوفے کو) ٹھنڈے پانی کے ایک برتن میں ڈال دیجو، تب میں پھر زندہ ہو جاؤں گا اور (تیرے) سب سوالوں کا جواب دوں گا، اور جَو کے پانی کی ایک بوتل بھی اپنے ہاتھ میں لے کر اُس پر ڈال لپیٹ دیجو، مگر جو تُو آوے تو اُسے اپنے ہاتھ میں نہ رکھیو۔

اور (پھر) وہ صنوبر کے پہاڑ پر چلا گیا، اور اُس کا بڑا بھائی سر میں خاک ڈالتا ہوا اپنے گھر کو پلٹ گیا۔ اور جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا، اُس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا، اور کتوں کے سامنے ڈال دیا، اور بھائی کے غم میں رہنے لگا۔ بہت دنوں کے بعد چھوٹا بھائی کوہِ صنوبر پر پہنچا، وہ اکیلا تھا اور درندوں کا شکار کیا کرتا تھا، اور شام کو اس صنوبر کے درخت کے نیچے سو رہتا تھا جس کے سب سے اونچے پھول میں اُس کی جان (رہتی) تھی۔

اِس کے بہت دن کے بعد اسی صنوبری پہاڑی پر اُس نے اپنے لئے ایک جھونپڑی بنالی اور جو چیز اُس کو پسند آتی وہ اپنی جھونپڑی میں جمع کرتا رہتا (ایک روز) جب وہ اپنی جھونپڑی سے نکلا (تو) اسے نُو ن دیوتاؤں سے ملاقات ہوئی، جو اس لئے آئے تھے کہ سارے ملک (مصر) کے باشندوں کی ضروریات پوری کریں، اور دیوتاؤں نے آپس میں باتیں کرکے اس سے کہا۔

"او دیوتاؤں کے بیل باتو، تو اِس طرح اکیلا کیوں ہے؟ اپنے بڑے بھائی کی بیوی کے سبب سے تُو نے اپنا گاؤں کیوں چھوڑ دیا ہے؟ (تجھے) خبر ہے، اُس کی بیوی (تو) ماری گئی؟ بھائی کے پاس گھر چلا جا، وہ تجھے سب حال بتلائے گا۔"

اور ان (دیوتاؤں) کا دل میں اُس کی طرف سے، رحم آگیا تھا، اس لئے سُورج کے دیوتا ہرماخیس نے کنوَم سے کہا کہ باتو کے لئے ایک بیوی بناؤ کہ وہ اکیلا نہ رہے، اور کنوَم نے اُس کے لئے ایک بیوی بنادی جو وہاں (جنگل میں) بیٹھی ہوئی سارے ملک کی عورتوں سے خوبصورت تھی، اِس میں تمام الوہیت ہی معلوم ہوتی تھی، اور وہ ساتوں ہاتھور اس کے دیکھنے کو بڑھے، اور اُنھوں نے ایک آواز ہو کر کہا۔ "اس کی موت ناگہانی ہوگی!"

اور وہ اِس سے بہت محبت کرتا تھا، اور جب وہ دن بھر جنگلی جانوروں کو شکار کرکے اس کے قدموں میں لا ڈالتا، وہ اس کے گھر میں بیٹھی رہتی، اور وہ اِس سے کہنے لگا۔

"(گھر سے باہر مت نکلیو، اگر تجھے سمندر اٹھا لے گیا (تو) اس کے قبضے سے تجھے نہ چھڑا سکوں گا۔ .... کیونکہ میری جان صنوبر کے سب سے اونچے شگوفے میں ہے، اگر کوئی ڈھونڈھ لیگا تو مجھے اِس کے ساتھ جنگ کرنا پڑیگی"

اور اُس نے اپنا سب بھید اسے بتا دیا (اس کے) بہت دن کے بعد باتو روزمرّہ کے معمول کے مطابق شکار کو گیا ہوا تھا کہ اس کی اکیلی بیوی بھی اس صنوبر کے درخت کے نیچے ٹہلنے کو باہر نکلی جو اس کے گھر کے برابر (ہی) کھڑا تھا۔ سمندر نے اُس کو دیکھ لیا اور اُس کے پیچھے لپکا، لیکن وہ جھپٹ کر گھر کے اندر ہو رہی مگر سمندر نے صنوبر سے پکار کر کہا۔

"اوہ، مجھے اِس سے کس قدر محبت ہے!"

اس پر صنوبر نے اس کے بالوں کا ایک گچھا سمندر کو دے دیا، اور سمندر اُس کو مصر لے پہنچا، اور وہاں رکھ دیا، جہاں فرعون کے دھوبی (اُس کے کپڑے) دھوتے تھے، اور اِن بالوں کی خوشبو فرعون کے کپڑوں میں بس گئی، اور پھر فرعون کے دھوبیوں میں جھگڑا ہونے لگا (وہ آپس میں) کہنے لگے۔

"فرعون کے کپڑوں میں کس تیل کی خوشبو ہے؟"

اور اِن (دھوبیوں) میں روزانہ خوشبو کے متعلق حجت رہتی، اور وہ اپنے فعل کو سمجھتے نہ تھے۔ لیکن سردار دھوبی سمندر کے پاس گیا، کیونکہ وہ اس معاملے میں روز کی لڑائی جھگڑے سے بہت پریشان (ہو گیا) تھا۔ اور وہ کنارے پر وہاں کھڑا ہو گیا جس کے مقابل (پانی کے اندر، وہ (بالوں کا) گچھا پڑا (رہتا) تھا۔ پھر وہ جھکا اور اُس گچھے کو اُٹھا لیا جس میں ایک عجیب قسم کی خوشبو تھی۔ پھر وہ اُسے فرعون کے پاس لے گیا۔ اور فرعون کے (دربار کے) تجربہ کار مذہبی پیشوا بلائے گئے اور انھوں نے فرعون سے کہا۔

"یہ بال سورج کے دیوتا کی بیٹی کے ہیں، اور اس کے اندر تمام الوہیت ہے، سارا ملک تیرے قبضے میں ہے۔ ہر طرف اپنے سفیر بھیج کہ اُس کو ڈھونڈھ لائیں،

لیکن جو سفیر کوہِ صنوبر کو جائے اُس کے ساتھ میرے آدمی بھی جائیں کہ وہ اُسے یہاں لاسکیں۔"

اور بادشاہ نے کہا۔

"تم نے جو کچھ کہا (وہ تو بہت (ہی) عمدہ بات ہے۔"

اور لوگ بھیج دئے گئے۔ بہت دن (گزر جانے) کے بعد وہ لوگ پلٹے، جو (مختلف) مقامات کو بادشاہ کے لئے (اس معطر گیسوؤں والی کو) لینے گئے تھے۔ لیکن وہ لوگ نہیں پلٹے جو کوہِ صنوبر کو گئے تھے۔ کیونکہ باتو نے اُن کو قتل کر دیا تھا، اور صرف ایک آدمی کو زندہ چھوڑ دیا کہ بادشاہ کو خبر کر دے۔

پھر بادشاہ نے بہت سی فوج، سوار اور پیدل، روانہ کی کہ جا کر اُس کو لائیں، اور اُن میں ایک عورت بھی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں قسم قسم کے زنانہ زیور دئے گئے۔ تب (کہیں) اُس کے ساتھ وہ عورت (باتو کی بیوی) مصر میں آئی اور اس کے سبب سے سارے ملک میں خوشی اور جشن کیا گیا۔ اور بادشاہ اس سے بہت محبت کرتا تھا، اور اُس کی حیرت آفرین خوبصورتی کے مطابق اُس نے (بادشاہ نے) اُس کی خاطر و دلداری کی۔ اور اُنھوں نے (لوگوں نے) اس سے کہا کہ اپنے شوہر کا حال بتا دے۔ تب اُس نے بادشاہ سے کہا۔

"صنوبر کے درخت کٹوا دو تو وہ فنا ہو جائے (گا)۔"

پھر مسلح آدمی روانہ کئے گئے جو صنوبر کو کاٹ ڈالنے کے لئے کلہاڑیاں لیگئے، اور وہ اُس صنوبر کے پاس آئے اور اُنھوں نے اُس شگوفے کو کاٹ ڈالا جس کے اندر باتو کی جان تھی۔ پھر وہ (شگوفہ) گر پڑا اور باتو مر گیا۔ جب زمین (پھر) روشن ہوئی اور ایک نیا دن نکلا تو وہ صنوبر کا درخت بھی کاٹ ڈالا گیا، اور انپو، باتو کا بڑا بھائی اپنے گھر میں گیا اور ہات دھونے بیٹھا، اور اُس نے جَو کے پانی کا برتن لیا جسے اُس نے رال سے بند کر دیا، اور ایک دوسرے (برتن) کو شراب سے (بھرا) اُسے مٹی سے بند کیا، اور اُس نے اپنی لکڑی اُٹھالی اور اپنے جوتے (پہنے) کپڑے بھی لئے اور سفر کا ناشتہ لیا اور کوہِ صنوبر کا راستہ پکڑا، اور وہ اپنے چھوٹے بھائی کی جھونپڑی میں پہنچا۔ اور اُسے چٹائی پر پڑا پایا۔ وہ مر گیا تھا۔ چھوٹے بھائی کو مردے کی طرح پڑا دیکھکر وہ رونے لگا۔ پھر وہ اپنے چھوٹے بھائی کی رُوح کو ڈھونڈھنے صنوبر کے درخت کے نیچے گیا جس کے نیچے اُس کا چھوٹا بھائی شام کو لیٹتا تھا، اور وہ تین سال تک ڈھونڈھتا رہا۔ مگر پتا نہ ملا۔ جب چوتھا سال آیا تو مصر کو واپس ہونے کی خواہش ہوئی اور اُس نے (اپنے آپسے) کہا، میں کل (صبح بہت تڑکے چلا جاؤں گا۔" اِس میں اس کا (ایک) مطلب تھا۔ جب زمین روشن ہوئی اور ایک نیا دن نکلا، وہ اس صنوبر کے نیچے پہنچا۔ اور دن بھر (بھائی کی) رُوح کو ڈھونڈھ پھرا، اور جب وہ شام کے وقت گھر کو پلٹنے لگا اور اِدھر اُدھر دیکھا تو اُسے ایک پھل نظر آیا، اور جب وہ اُسے لے کر گھر پہنچا تو اُس کے چھوٹے بھائی کی رُوح (موجود) تھی۔ تب اُس نے ٹھنڈے پانی کا برتن اُٹھا کر اُس میں اس (پھل) کو ڈالا اور خود بیٹھ گیا، جو اُس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ اب رات ہوتے ہی وہ رُوح پانی رہی، اور باتو نے اپنے تمام اعضا کو جنبش دی، اور اپنے بڑے بھائی کی طرف لگا۔ لیکن اُس کا قلب حرکت نہ کر سکتا تھا۔ اور انپو، اس کے بڑے بھائی نے ٹھنڈے پانی کا برتن اُٹھا لیا جس میں اُس کے چھوٹے بھائی کی رُوح تھی (اور وہ پانی) اُسے پلا دیا۔ اور (اُس کی) روح اپنی جگہ پہنچا دی گئی، تب وہ ویسا ہی ہو گیا جیسا کہ تھا، اُنھوں نے ایک دوسرے کو چھاتی سے لگایا، ایک دوسرے سے باتیں کیں، باتو نے اپنے بڑے بھائی سے کہا۔

"دیکھو (اب) میں اپنے تئیں ایک بیل کا چولا بدلتا ہوں جس پر سب مقدس نشانیاں ہوں گی۔ اس کا راز کسی کو معلوم نہ ہوگا، اور تو میرے اوپر سوار ہو جانا (اور لے چلنا) اور جیسے ہی سورج نکلے گا، ہم وہاں پہنچ جائیں گے جہاں میری بیوی ہے، (کیا) تو مجھے وہاں لے چلے گا؟ اس سے تیری سب خواہشیں پوری ہوں گی، جو تھی ہوں گی۔ اگر تو مجھے فرعون کے سامنے لے جائے گا تو سونے چاندی سے لاد دیا جائے گا، کیونکہ میرا نصیبہ بہت چمکنے والا ہے، ملک کے تمام لوگ خوشی کے نعروں سے میرا خیر مقدم کریں گے۔ لیکن (اب) تم اپنے گاؤں کو چلے جاؤ۔"

جب پھر روشن ہوئی اور ایک نیا دن نکلا تو باتو نے (بیل کا) چولا بدل لیا، جیسا کہ اُس نے اپنے بھائی سے کہا تھا، اور انپو اُس کا بڑا بھائی، سویرے پَو پھٹے اُس کی پیٹھ پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا، اور جب وہ اس مقام کے قریب پہنچا تو لوگوں نے بادشاہ کو خبر کی، اور جب بادشاہ نے اُس کو دیکھا تو بہت خوش اور اُس کے خیر مقدم میں ایک بہت بڑا جشن کیا، اُس سے بڑا جو بیان میں آسکتا ہے، کیونکہ یہ بہت بڑی خوش نصیبی (کی بات) تھی، اور اُس کی وجہ سے سارے ملک خوشی تھی، اس کے بڑے بھائی کے لئے جو اپنے گاؤں میں رہتا تھا، لوگ بہت سا سونا چاندی لائے، اور بہت (دوسری) چیزیں (بھی اُسے) دیں، اور فرعون

بہت عزت کرنے لگا۔ سارے ملک کے لوگوں سے زیادہ (اُس کی عزت کرتا تھا)

کچھ دن کے بعد وہ بیل "حرم" میں داخل ہوگیا، وہاں جا کھڑا ہوا جہاں وہ حسینہ (اُس کی بیوی) تھی، اور اُس سے کہنے لگا۔

"اِدھر دیکھ! میں ابھی زندہ ہوں (اور سچ مچ)!"

اس پر وہ بولی۔

"تُو کون ہے؟"

"میں باتو ہوں! اس وقت جب تُو صنوبر کو کٹوا سکتی تھی، تو نے فرعون کو میرا پتہ بتا دیا تھا تاکہ میری زندگی ختم کر دی جائے۔ (مگر) مجھے دیکھ، میں اب بھی سچ مچ زندہ ہوں، البتہ ایک بیل کی صورت میں ہوں"

تب اُس کی حسین بیوی نے یہ سُن کر کہ اُس کا شوہر (ہی) اس سے بات کر رہا ہے بہت ڈری۔ پھر وہ "حرم" سے نکل گئی۔ اور بادشاہ اُس کے برابر بیٹھ گیا، اور اُس نے دیکھا کہ بادشاہ (ابھی تک) اُس پر مہربان ہے، اور وہ (خود) اُس کی نظروں میں بہت محبوب ہے، تب اُس نے بادشاہ سے کہا۔

"مجھ سے دیوتاؤں کی قسم کھاؤ کہ تم جو میں کہوں گی اُسے پورا کرو گے!"

پھر اُس (بادشاہ) نے وعدہ کیا کہ وہ جو کچھ کہے گی (وہ اُسے) پورا کرے گا، تب وہ کہنے لگی۔

"میرے کھانے کو اس بیل کی کلیجی ہونی چاہیئے، کیونکہ تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے"

جب اُس نے اس (بادشاہ) سے یہ کہا تو وہ اُس کی بات سُن کر بہت رنجیدہ ہوا، اور فرعون بہت بڑی مشکل میں پڑ گیا۔

جب دُنیا روشن ہوئی اور ایک نیا دن نکلا اور ایک بڑا جشن ترتیب دیا گیا کہ بیل کے سامنے قربانی چڑھائی جائے تو اُس وقت بادشاہ کا ایک خاص خادم بیل کو مار ڈالنے کے لئے بڑھا۔ اور جب وہ اس کو ذبح کر دینا چاہتا تھا یہ واقعہ ہوا کہ لوگوں نے اُسے بچانا چاہا، اور جب اُس نے اس (بیل) کی گردن پر ہات مارا تو خون کے دو قطرے اُچٹ کر اُس مقام پر جا پڑے جہاں فرعون کے محل کا پھاٹک تھا اور پھاٹک کے دو کھمبے نصب تھے، ایک قطرے فرعون کے دروازے کے ایک جانب اور دوسرا دوسری جانب (جا) گرا۔ اور وہاں الگ الگ دو خوبصورت درخت نمودار ہو گئے، تب لوگوں نے بادشاہ کے پاس اطلاع پہنچائی کہ خود شاہی محل کے پھاٹک پر دو خوبصورت درخت پیدا ہو گئے ہیں اور اس وجہ سے سارے شہر میں خوشی ہے۔

چند دن کے بعد بادشاہ جو ابرک کا ہار پہنے اور پھولوں کی مالائیں گلے میں ڈالے اپنے سنہری رتھ میں سوار جب شاہی پھاٹک پر پہنچا تو اُسنے اِن دونوں درختوں کو دیکھا، فرعون کی سواری کے پیچھے اُس کی خوبصورت ملکہ بھی اپنی رتھ میں سوار آ رہی تھی۔ بادشاہ ایک درخت کے نیچے ٹھیر گیا، اور اس درخت نے ملکہ سے کہا۔

"آہ، بیوفا عورت! میں باتو ہوں۔ میں ابھی زندہ ہوں۔ میں نے چولا بدل لیا ہے، تُو نے فرعون کو میرا پتا بتا دیا تھا کہ میں جان سے مار دیا جاؤں۔ میں ہی بیل بھی تھا، اور (بیل کے رُوپ میں بھی) تو ہی میری موت کا سبب تھی"

بہت دن گزر گئے، اور (جب وہ) حسین عورت بادشاہ کی نظر میں مقبول تھی اور وہ اُس کو عزیز رکھتا تھا۔ اُس نے بادشاہ سے کہا۔

"دیوتاؤں کی قسم کھا کر مجھ سے کہو کہ جو کچھ میں کہوں گی وہ سب پورا کرو گے"

اس (بادشاہ) نے پھر اس کی ہر طرح کی خواہش پوری کرنے کا وعدہ کر لیا، تو وہ کہنے لگی۔

"اِن دونوں درختوں کو کٹوا دو تاکہ اِس میں سے خوبصورت میزیں بنائی جائیں"

اور اُس کی جو خواہش تھی وہ سب پوری کی گئی۔ بہت دنوں کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ ہشیار کاریگر آ کر فرعون کے درختوں (کی لکڑی) کو چیر ڈالیں، اور (وہ) حسین ملکہ قریب کھڑی تھی، اور ایک چھپٹی (کا ریزہ) اُڑ کر اُس کے منہ میں جا پڑا۔ اور کچھ عرصے کے بعد یہ واقعہ رونما ہوا کہ اُس کے ایک لڑکا پیدا ہوا، اور بادشاہ کو خبر پہنچائی گئی۔

"آپ کے شہزادہ پیدا ہوا ہے"

اور وہ (بچہ) باہر لایا گیا، اور اُس کی نگہداشت کے لئے دایہ اور کھلائیاں مقرر ہوئیں، اور سارے ملک میں خوشی منائی گئی۔ لوگوں نے اُسے ایک تہوار بنایا اور اُس کا (لڑکے کا) نام رکھا گیا۔ اُس وقت سے بادشاہ اُس سے بہت محبت کرنے لگا۔ اور اُسے "شاہزادہ حبش" کا لقب دیا۔

بہت عرصے کے بعد بادشاہ نے اُسے ساری سلطنت کا نائب شاہ بنا دیا اور جب نائب کی طرح کام کرتے بہت دن گزر گئے تو بادشاہ مر گیا، فرعون آسمانوں پر پرواز کر گیا۔ اور دوسرے (شاہزادے) نے کہا۔

اب سارے بڑے بڑے سرداروں اور بڑے بڑے درباریوں کو جمع کرو، میں اُن کو پوری تاریخ سناؤں گا کہ میرے اور ملکہ کے درمیان کیا (واقعہ) گزرا ہے اور اُس کی (فرعون) کی بیوی اُن کے سامنے لائی گئی، اور اُس نے (شاہزادے نے) سب کے سامنے اپنے تئیں اس (عورت) کو پہچنوایا، اور اُنھوں نے (درباریوں نے سزا کا) فیصلہ سنا دیا، اور (پھر) اُن کے پاس اُس کے بڑے بھائی کو لائے۔

اور اُس نے اس کو (بڑے بھائی کو) سارے ملک کا نائب سلطنت مقرر کیا اُس نے تیس سال شاہِ مصر کی طرح حکومت کی۔

جب وہ یہ تیس سال تک زندگی گزار چکا (مر گیا) تو اس کے بھائی نے اُس کے دفن کے دن اس کی جگہ لے لی۔ (سلطنت اختیار کی)

~~~~~~~~~~~~*~~~~~~~~~~~~

الوالعزم شاعر کا ترانہ

خستہ حالی سے مری جان کے ادنیٰ مجھ کو | ہمنشیں! پائے حقارت سے نہ ٹھکرا مجھ کو

مانا ظاہر میں نہیں کچھ بھی حقیقت میری | پا نہیں سکتا مگر کوئی بھی قیمت میری

سازِ ہستی کے لئے میں ہی ہوں مضراب بنا | دردِ دنیا کے لئے صورتِ سیماب بنا

میں وہ شاعر ہوں اگر آئے مرے جی میں ذرا | آنِ واحد میں بدل ڈالوں نظامِ دنیا

گرمیٔ شعر سے پانی میں لگا دوں میں آگ | اور پھر نغموں کی بارش سے بجھا دوں میں آگ

میں اگر چاہوں تو پتھر کو بھی گویا کر دوں | ذرے کو مہر کروں، مہر کو تارا کر دوں

ہم سخن ہوتے ہیں بے نطق وہاں بھی مجھ سے | باتیں کر لیتا ہے خلاقِ جہاں بھی مجھ سے

راز کی بات بیاں کرتا ہوں ہمدم سن لے | آج کرتا ہوں عیاں تجھ پہ ارادے اپنے

غیریت صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالوں گا | عنقریب اک نئی دنیا کی بنا ڈالوں گا

لا کے ترتیب میں شیرازۂ ہستی پھر سے | میں بساؤں گا یہاں اک نئی بستی پھر سے

دوں گا پیغامِ جوانی دلِ افسردہ کو | زندگی بخشوں گا ملت کے تنِ مردہ کو

ہند میں لطف و محبت کی بنا ڈالوں گا
خرمنِ رنجش باہم کو جلا ڈالوں گا

تاجور ساحری۔ لائل پوری
~~~~~~~~~~~~

کوہستانِ دکن کی عورت

یہ اُبلتی عورتیں، اِس چلچلاتی دھوپ میں
سنگِ اسود کی چٹانیں، آدمی کے رُوپ میں

واہ کیا کہنا ترا، اے حُسنِ ارضِ آفتاب!
یہ برشتہ رنگ، یہ تپتے ہوئے سنگیں شباب

ہر سراپا، بُت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل
اِتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل

چال، جیسے تُند چشمے، تیوریاں، جیسے غزال
عارِضوں میں جامنوں کا رنگ، آنکھیں بے مثال

عورتیں ہیں، یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز پتھریلا شباب

یہ جواں چہرے، یہ چہروں میں توانائی کا جوش
تُو کہے آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش

جسم ہیں کچھ اِس قدر ٹھوس، الحفیظ و الاماں!
لیجیے چٹکی تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں

مچھلیاں شانوں کی اُبھری سی، بٹی سی کاکلیں
آہن و فولاد کے پٹھے، سلاخوں کی رگیں

دید کے قابل ہے اِن کافر بُتوں کا رنگ روپ
کھپ چکی ہے جس میں بارش، ڈس چکی ہے جس کو دھوپ

اِن بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی الاماں
پتھروں کا دُودھ پی پی کر ہوئی ہیں جو جواں

کنکروں کے فرش پر دُنیا سُلاتی ہے جنھیں
آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنھیں

کیا خبر کتنے دلوں کی جوشش پامالی ہوئی
اِن اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہریالی ہوئی

جوش

چند ڈراموں پر تنقید

مجیب احمد۔ ایم اے

آرٹ یا فنِ لطیف دراصل ہمارے مَن کی موجوں کا بنایا ہوا سمندر ہے اور ہماری فطرت یہ چاہتی ہے کہ اس میدان میں ہر شخص طبع آزمائی کرے۔ کیونکہ آرٹ ان تمام حوصلوں اور خواہشوں، اُمنگوں اور حسرتوں کا نتیجہ ہے جو سبھی کے دلوں میں ہوتی ہیں، اور زندگی میں جیسا کہ ہم چاہتے ہیں پوری نہیں ہوتی ہیں۔ غریب اور امیر، نیک اور بد، عقلمند اور بیوقوف، سب اپنے اپنے طور پُرانی زنجیروں کے توڑنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں پیٹ پالنے کی ضرورت، روزمرّہ کا کام، عادتیں اور کمزوریاں اُنھیں جکڑ دیتی ہیں، اور آرٹ بیداری کا وہ خواب ہے جس میں یہ آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ خواب آدمی خود بھی دیکھتا ہے اور اُسے دکھایا بھی جاتا ہے۔ اور جتنی آسانی اور خوشی سے آدمی کا مذاق اور اس کی طبیعت آرٹ کے پیدا کئے ہوئے خواب کو قبول کرے اتنا ہی گہرا اُس کا اثر ہوتا ہے۔ یہ خواب ہمیں زندگی کے بندھنوں سے بالکل آزاد تو نہیں کر دیتے۔ مگر اُن کا بوجھ ہلکا کر سکتے ہیں، اُن کی بدولت ہمیں شخصی زندگی کی کال کوٹھری سے اگر بالکل نجات پانے کا موقعہ نہیں ملتا تو دھوپ اور تازہ ہوا اور زمین اور آسمان پر نظر ڈالنے کا موقعہ تو مِل ہی جاتا ہے۔

ڈراما بھی آزادی حاصل کرنے کے اُنھیں ذریعوں میں سے ایک ذریعہ ہے۔ اُسے ایک رُخ سے دیکھئے تو وہ زندگی کی ایک تصویر ہے، دوسرے رُخ سے نظر ڈالئے تو وہ زندگی کو سمجھانے کی ایک ترکیب یا اُسے بدلنے کی تدبیر ہے۔ لیکن ڈرامے میں زندگی ایک ندی کی طرح چپ چاپ نہیں بہتی، اس میں سمندر کی سی شان ہونا چاہیے جس کی لہریں اُٹھتی ہیں، تڑپتی ہیں، ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور پھر آسمان کی طرف لپکتی ہیں۔ ڈرامے کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں اُٹھان ہو، ہر بات، ہر واقعے کا ایک مرکز کی طرف رجحان ہو اور اس کے اُتار میں بھی ایسا زور ہو کہ ہمارے جذبات میں نئی لہریں پیدا کر سکے۔ ڈراما نام ہے کشمکش کا، خیالات، جذبات اور اغراض کی ٹکر کا۔ اُن کے اُلجھنے اور سُلجھنے کا۔ یہ کشمکش بالکل قدرتی نہیں ہوتی۔ مگر بالکل من گھڑت بھی نہیں ہوتی، جیسے کسی زمانے میں بھی آدمی کی زندگی بالکل قدرتی یا بالکل مصنوعی نہیں ہوتی۔ پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہماری بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جو زمانے میں بھی آدمی کی زندگی بالکل قدرتی یا بالکل مصنوعی نہیں ہوتی۔ پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہماری بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جو زمانے کے ساتھ بدلتی نہیں ہیں۔ بعض ایسی ہیں جنھیں مختلف زمانوں میں مذہب، قانون اور تعلیم ایک نرالا رنگ دیدیتے ہیں۔ اور ہمارے من کے اُن دونوں ٹکڑوں کا جوڑ کبھی ٹھیک بیٹھتا ہے کبھی نہیں۔ ڈراما نویس کی نظر میں اس کی قدرت ہونا چاہئے کہ اِن دونوں کو الگ کر سکے۔ آدمی کے دل کے بھید بتلائے۔ ان بھیدوں کے سمجھ نہ سکنے یا کسی اور غلطی سے زندگی میں جو گتھیاں پڑ گئی ہوں اُنھیں بھی سلجھائے۔ ڈراما نویس کا ایک فرض یہ دکھانا بھی ہے کہ اس کے زمانے کے موضع زندگی کا رُوپ بھرتے ہیں تو اُن کی کیا شکل ہوتی ہے، یا اگر وہ زندگی کا روپ بھر نہیں سکتے تو اس سے کیا نقصان ہوتا ہے، آدمی کی سیرت اور سماج کی تعلیم اور قانون کا حال دنیا کی آزمائشوں میں کیسا ہے، اور ڈرامے کی کشمکش کو اسی آزمائش کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہونا چاہئے۔

آرٹ کے نقطۂ نظر سے اگر اس وقت کی ہندوستانی زندگی کی موٹی موٹی تقسیم کی جائے تو اس کے تین حصے ہو جاتے ہیں۔ ایک تو روحانی حوصلے، دوسرے

سیاسی اور قومی اور تیسرے معاشرتی۔ ہندوستانی ڈرامے پر سرسری بحث کرنے کے لئے کافی ہوگا اگر ہم ایسے ڈراموں کے نمونے چن لیں جن میں ہماری زندگی کے یہ تینوں پہلو نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور نے کئی ڈراموں میں وہ کیفیتیں بیان کی ہیں جو پرماتما سے جدا ہونے کے سبب سے ہر آتما پر گذرتی ہیں۔ لیکن جس سادگی اور سچائی سے یہ اُن کے ڈرامے "ڈاک خانے" میں پیش کی گئی ہیں اُس کا جواب اور کہیں نہیں ملتا۔ "ڈاک خانے" کا ہیرو ایک لڑکا ہے جسے یہ خیال ہو گیا ہے کہ بادشاہ کے یہاں سے اُس کے نام ایک خط آنے والا ہے۔ وہ ہر وقت اسی انتظار میں اپنی کھڑکی کے پاس کھڑا ڈاکئے کا راستہ دیکھا کرتا ہے، اور جو لوگ سامنے سے گزرتے ہیں اُنھیں اپنی بھولی بھالی امیدوں کی کہانی سناتا ہے۔ یہ لڑکا بیمار بھی ہے۔ اور ہمیں رفتہ رفتہ معلوم ہوجاتا ہے کہ جس خط کا اُسے انتظار ہے وہ اس کی موت کا پیغام ہوگا۔ لیکن موت آتی ہے تو آزادی کا مژدہ سنانے آتی ہے۔ اس حبس اور تاریکی کو دور کرتی ہے جس میں نادان طبیبوں نے بچے کو قید کر دیا تھا، اور ان تمام پابندیوں کو توڑ دیتی ہے جس میں جاہل خیر خواہوں نے اُسے جکڑ دیا تھا۔ آخر میں جب شاہی طبیب آتا ہے اور تمام دروازے اور کھڑکیاں کھولنے کا حکم دیتا ہے تو ہمیں بھی معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہمارے دل کے دروازے کھل گئے ہیں، اور مدتوں گھٹ گھٹ کر رہنے کے بعد ہمیں روشنی اور تازہ ہوا نصیب ہوئی ہے۔ ڈرامے کے قصے، اس کے کیرکٹروں اور اُن کی گفتگو کی سادگی اثر کو دوبالا کر دیتی ہے، اور جب ہم بعد کو سمجھ جاتے ہیں کہ یہ سارا تماشا ایک تمثیل ہے، تو ہماری نظروں میں ڈرامے کی قدر اور بڑھ جاتی ہے، کیونکہ ہم کو اپنی زندگی بھی ایک تمثیل معلوم ہونے لگتی ہے، جن مصیبتوں اور دشواریوں میں ہم پھنسے ہوتے ہیں وہ دھوئیں کی زنجیروں کی طرح آپ ہی آپ اڑ کر غائب ہوجاتی ہیں اور امید ہمیں لطیف فضا میں سیر کرانے کو لے جاتی ہے۔

لیکن "ڈاک خانے" کی انھیں خوبیوں سے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا چاہیئے کہ خالص روحانی مسائل کو جہاں تک ہو سکے ڈرامے سے الگ رکھنا چاہیئے۔ یہ خاص حصے ہیں فلسفے اور شاعری کا۔ ڈرامے کی کشمکش کے لئے زیادہ ٹھوس چیزیں چاہئیں، جن کی آدمی کو اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی کہ فلسفے اور شاعری کے لطیف خیالات کی، اُن سے وہ محروم کر دیا گیا تو اُس کی روح کا وہی حال ہوگا جو ترکی کے مشہور بزرگ ناصر الدین خوجہ کے گدھے کا ہوا تھا۔ سنتے ہیں کہ ناصر الدین خوجہ کے ایک دوست نے اُن سے کہا کہ اگر کوئی شخص چاہے تو گیہوں کے ایک دانے پر گزر کر سکتا ہے۔ بس عادت ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ان حضرت کی اپنی جان تو بہت پیاری تھی، اس لئے اُنھوں نے سوچا کہ گدھا ٹھیک راہ پر آجائے تو کافی ہوگا۔ اُنھوں نے اس کا دانا گھٹانا شروع کیا، یہاں تک کہ اُسے دن بھر میں ایک چنا دینے لگے۔ لیکن گدھے کی عادت نہ پڑنا تھی اور نہ پڑی، اور اگرچہ وہ جنت میں ناصر الدین سے پہلے ہی پہونچ گیا، دُنیا کے مصرف کا وہ نہ رہا۔ اسی طرح ہم بھی چاہیں تو جنت میں وقت سے پہلے پہنچ سکتے ہیں، مگر اس سے دُنیا کی مشکلیں آسان نہ ہوں گی اور ہمیں [illegible] تجربہ حاصل نہ ہوگا۔ ہمارے ارادے میں وہ پختگی [illegible] آئے گی جو دنیا کی آزمائشوں میں ٹھیک پورے اُترنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہماری زندگی [illegible] اور اس لئے ہمارے [illegible] کی کشمکش پر بھی روحانیت کا سایہ ضرور ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر اس کشمکش کو ہم نے بالکل رُوح کی لطیف بیتابیوں کی شکل دے دی تو ڈرامے کی صورت بگڑ جائے گی اور ہمارا اصل مطلب بھی پورا نہ ہوگا۔ "ڈاک خانہ" اپنی جگہ پر ڈراما نویسی کے فن کا کمال ہے۔ پھر بھی اگر ہم اس کی نقل نہ کریں اور رُوحانی مسائل کی بحث کو ایسے مہاتماؤں کے لئے چھوڑ دیں جیسے کہ ڈاکٹر ٹیگور ہیں تو بہتر ہے۔

ہندوستانیوں کی بیداری کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ پچھلے بیس پچیس سال میں بہت سے تاریخی ڈرامے لکھے گئے ہیں اور اب بھی اُن کا سلسلہ جاری ہے۔ اِن ڈراموں میں زیادہ تر ایسے ہیں جو کسی خاص سیاسی مقصد سے لکھے گئے ہیں اور ڈرامے کی حیثیت سے اُن پر تنقید کی جائے تو شاید یہ سمجھا جائے گا کہ اُن کے مقصد پر اعتراض کیا گیا ہے۔ اِس لئے میں نے ایسا نمونہ لیا ہے جس میں ڈرامے کی خوبیاں پیدا کرنے کے سوا اور کسی بات کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ سید امتیاز علی صاحب تاج کا ڈراما "انارکلی" ہے۔ مصنف نے اس پر جتنی محنت کی ہے اُتنی محنت لوگ علمی کاموں میں کم کیا کرتے ہیں، اور اُن کی محنت ہر اعتبار سے بارآور بھی ہوئی ہے۔ ڈرامے کا قصہ مغل دربار کی ایک مشہور داستان ہے، اور اگرچہ مغل دربار میں اُردو نہیں بولی جاتی تھی، "انارکلی" کی زبان میں وہ تمام صفتیں نظر آتی ہیں جو ایک درباری بات میں ہونا چاہئیں۔ آپ بادشاہ کی گفتگو سنئے، یا اس کی ماچہیتی رانی کی، شہزادہ سلیم یا دربار کی خواصوں کی، سب کی زبان کو اُن کی حیثیت، اُن کے مزاج اور اُس خاص موقعہ سے صحیح اور سچی مناسبت ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغل اپنی مادری زبان بول رہے ہیں۔ یہ خود بھی ایک کمال ہے، کیونکہ تاریخی ڈرامے کی گفتگو میں وہ انداز اور وہ محاورے آگئے جو ہمارے زمانے کے ہیں، یا ڈرامے کے کیرکٹر

کے لیے موزوں نہیں تو پھر سارا کام کھوٹا ہو جاتا ہے۔ انارکلی میں مغلوں کی بود و باش کا بھی بہت صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس میں دربار کے آداب اس طرح برتے گئے ہیں کہ انارکلی اور شہزادہ سلیم کا عشق ہمیشہ شہزادہ اور نوجوان خواص کا عشق معلوم ہوتا ہے معمولی مرد و عورت کی محبت کا قصہ نہیں معلوم ہوتا۔ اسی طرح اکبر کے کارنامے کہیں بیان نہیں کئے گئے ہیں، پھر بھی اس کی ہر ادا سے شہنشاہی ٹپکتی ہے۔ آخر میں اس کا غصہ جس نے انارکلی کو موت کے گھاٹ اتارا۔ صرف اسی اعتبار سے صحیح نہیں ہے کہ اکبر واقعی غصے میں آپے سے باہر ہو جاتا تھا، بلکہ ڈرامے میں اکبر کی جو حیثیت ہے اُسے دیکھتے ہوئے بھی نامناسب نہیں۔ پھر اگر سارے قصے پر غور کیجے تو اس میں محبت کی کہانی کا پورا رس ملتا ہے اور ڈرامے کی فضا میں اس شراب کی تاثیر ہے جس نے سلیم اور انارکلی دونوں کو مدہوش کر دیا تھا۔

انارکلی میں ڈرامے کا حق ہر طرح سے ادا کیا گیا ہے۔ اس میں اگر کمی ہے تو بس یہ کہ اکبر کا حق مارا گیا ہے۔ ڈرامے میں دو ایک جگہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اکبر بڑے حوصلے کا بادشاہ ہے، وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کو اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھتا ہے۔ اور سلیم کے چلن سے اُس کو خاص تکلیف اس کے سبب سے ہوتی ہے کہ اپنے جانشین سے اُس کو جو امیدیں تھیں اُنھیں سلیم خاک میں ملا رہا تھا۔ یہی غم آخر میں اُس کے غصے کی آگ کو اور دہکا دیتا ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ڈراما نویس نے اکبر کی سیرت کو مکمل کر کے دکھایا ہے اور اپنے پلاٹ کو چوکس رکھنے کے لئے اکبر کی سیاسی حوصلہ مندی کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے، اور میرا مطلب یہ ہے کہ اکبر کی تاریخی عظمت اُسے گوارا ہی نہیں کر سکتی کہ وہ ایک درباری بادشاہ بنا کر دکھایا جائے، چاہے ہم یہی جتانا چاہتے ہوں کہ اکبر کے اعلیٰ حوصلوں کا اس خاندان اور محل کے لوگوں پر کوئی اثر نہیں تھا اور وہ اُسے بیہودگیوں میں پھنسائے رکھتے تھے۔ عشق اور رقابت کی داستانیں ہماری تاریخ کا جوہر نہیں ہیں، ہماری تاریخ کا جوہر اکبر کی سی شخصیتیں ہیں، اور اُنھیں بھی ہم نے حسن و عشق کی نذر کر دیا تو ہم بالکل خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔

اگر ہر بات کا پورا خیال رکھا جائے تو تاریخی ڈرامے میں سیاسیات اور تاریخ کو بہت زیادہ دخل ہو جاتا ہے، جیسے روحانی مسائل کے پیش کرنے سے فلسفہ اور شاعری ڈرامے پر چھا جاتی ہے۔ ڈرامے کو اُس کی حد کے اندر رکھتے ہوئے اس میں اثر اور جان ڈالنے کا سب سے آسان اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنے زمانے کے سماجی یا معاشرتی یا عام انسانی مسائل کو ڈرامے کا لباس پہنایا جائے، لیکن ان ڈراموں میں بھی اس کا خطرہ رہتا ہے کہ مصنف کسی خاص خیال یا تعلیم کے پرچار کی فکر میں پڑ جائے گا اور ڈراما اسی پرچار کے لئے ایک بہانہ بن کر رہ جائے گا۔ اتنا ہی اندیشہ اس کا بھی ہوتا ہے کہ ڈراما نویس اس دلچسپی کا سہارا لے کر جو سماج کو اپنی زندگی سے ہوتی ہے پُر لطف مگر بے حقیقت خیال آرائیوں میں پڑ جائے گا اور ڈرامے سے تفریح کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

جدید طرز کے معاشرتی ڈراموں کا ایک اچھا شائستہ نمونہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی تصنیف "پردۂ غفلت" ہے۔ اس میں شریف گھرانوں کے ایک طرف بگڑنے اور دوسری طرف بننے کی کیفیت دکھائی گئی ہے، اور ان تمام مسائل پر بحث کی گئی ہے جو اس وقت ہمارے سماج کے رہبروں کو مصروف رکھتے ہیں یعنی نئی تعلیم کا اثر، عورتوں کی آزادی، زمینداری، سود خواری، لیڈری، بے روزگاری اور پیدا کشی حماقت۔ میر الطاف حسین، رسول آباد کے زمیندار، بالکل سٹھیا گئے ہیں۔ لیکن ان میں انتظام کرنے اور آدمی یا موقعے کے پہچاننے کی صلاحیت کبھی نہ تھی۔ میر محمد حسین، اُن کے سالے برسوں سے اُن کے مختار بنے ہوئے ہیں، اور خاندان کی آبرو رکھنے، یعنی ہر چھوٹی بڑی تقریب میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کے لئے خاندانی جائداد کو ایک ساہوکار کے پنجے میں پھنسا رہے ہیں۔ جائداد کو فوراً نیلام ہونے سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ میر الطاف حسین کی بھتیجی سعیدہ کا مقامی مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر محمد جواد سے نکاح کر دیا جائے۔ کیونکہ اس جوار میں وہی ایسا شخص ہے جو اس کا ضامن ہو سکتا ہے کہ جو جائداد کا وہ حصہ جو میر الطاف حسین کے بھتیجے اور بھتیجی کا حق ہے ساہوکار کے قبضے میں پہنچ جائے گا۔ میر الطاف حسین کا بھتیجا اور سعیدہ کا بھائی منظور حسین ہمت کر کے اپنی بہن اور اپنی جائداد کو تباہی سے بچا لیتا ہے اور اُس کے والد کے اتالیق شیخ کرامت علی فلسفے اور مذہب کی رو سے اُس کے عمل کو، جس نے خاندان کے دو ٹکڑے کر دئے اور رسم و رواج کی پرانی عمارت کو ٹھکرا کر گرا دیا۔ صحیح اور ضروری ثابت کر دیتے ہیں۔ اُن کی تقریروں میں غور و فکر کی جو گہرائیاں ہیں وہ مصنف کی پیدا کی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، اور اگر یہی باتیں ذرا سادہ دیہاتی انداز سے بتائی گئی ہوتیں تو ڈرامے میں اس قدر اونچ نیچ نہ ہوتی لیکن شیخ جی کی بلند پروازیوں کے مقابلے میں محمد جواد بھی اپنی قابلیت کی نمائش کرتا رہتا ہے، اور کہیں وہ ایسے موقع پر ہنسا دیتا ہے کہ شیخ جی کا فلسفہ ہمیں اڑا نہیں

بے جانے پاتا۔

"پردۂ غفلت" کے تمام کیرکٹر اپنی اپنی جگہ پرنئے اور پرانے لوگوں کے صحیح اور دلچسپ نمونے ہیں۔ اُس کی زبان میں لطافت بھی ہے اور زور بھی، اور اگرچہ قصے میں دو تین پشتوں کی سرگزشت چند مہینوں کے اندر ختم ہوتے دکھائی گئی ہے اور انجام میں ہیرو اور ہیروئن کے ساتھ ایسی رعایتیں کی گئی ہیں جو زمانہ بہت کم کرتا ہے۔ اس میں کوئی چیز ایسی خلاف معمول نہیں ہے کہ گھڑی ہوئی معلوم ہو، یہ بات تو چھپی ہوئی نہیں رہتی کہ مصنف نے کیرکٹروں، واقعات اور گفتگو کو جان بوجھ کر ایک خاص رنگ دیا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ڈرامے کی لوازم کا اتنا لحاظ رکھا گیا ہے کہ یہ رنگ ڈرامے میں اچھی طرح کھپ جاتا ہے، اور یہ تو ہو بھی نہیں سکتا کہ ڈراما ارادے یا مقصد سے بالکل خالی ہو، ہاں اتنا ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انسانی فطرت کے بھید بتانے اور جذبات کی کشمکش دکھانے کے مقصد کو اور تمام مقاصد یا ارادوں پر غالب رہنا چاہیئے۔ اس اعتبار سے "پردۂ غفلت" میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے۔ اور اگر کوئی کسر رہ بھی گئی ہے تو مصنف کی سنجیدگی اور ظرافت کی دھوپ چھاؤں میں وہ نظر نہیں آتی۔

دنیا میں جتنے تعلیم کے طریقے ہیں، سب اسی لئے ہیں کہ بہتر سے بہتر انسان پیدا کئے جائیں، اور یہ سب اسی قدر کامیاب ہوتے ہیں جہاں تک کہ وہ انسان کی فطرت اور زمانے کی مصلحت کا صحیح اندازہ کرتے ہیں . . . .

. . . .

. . . . ڈراما بھی اگرچہ وہ فن لطیف میں شمار ہوتا ہے، اسی طرح انسان کی فطرت اور زمانے کی ضرورت اور مذاق کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن اس کا خاص منصب یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس کے رسم و رواج اور معاشرت سے علیحدہ کرکے دیکھے، اور اس طرح یہ ظاہر کرے کہ زندگی میں کونسی رکاوٹیں ہیں جو انسان کو پورا انسان بننے سے روکتی ہیں، اس وقت تک ہمارے ڈرامے کا معیار رسم و رواج کی پابندیوں سے آزاد نہیں ہوا ہے۔ یعنی اس میں انسان اپنی اصل صورت میں کم دکھائی دیتا ہے، اس کی باتیں معلوم ہوتا ہے کہ دل سے نہیں نکلتی ہیں بلکہ ڈاڑھی مونچھ اور لباس کی طرح خاص کیرکٹر یا تماشے کے لئے موزوں کی گئی ہیں اور اس میں اب تک یہ لازمی سمجھا جاتا ہے کہ میاں بیوی بچھڑنے کے بعد ملیں تو بیوی شوہر کے پیر چومے یا اُس کے قدموں سے لپٹ کر جان دے دے۔ تنقید کا فن بھی، جو آرٹ کے لئے کسوٹی کا کام دیتا ہے، اسی طرح معاشرتی احاطہ بندیوں میں گھرا ہوا ہے۔ انسان کی ہستی ان سب سے بالاتر ہے، ہم اگر اسے دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی نظر بہت اونچی کرنی پڑے گی۔

شعلہ کی طرح ادھر لپکتا کیوں ہے
صورت سے حسین کی ابھرتا کیوں ہے
کانٹے کی طرح مری نظر میں سکھ ہیں
ہر پھول گلستاں کا کھٹکتا کیوں ہے

(رشید لکھنوی)

دشمن پھولا پھلا سبب آزادی کا
ہو جو نہ سبب تو اپنی بربادی کا
غافل ہیں یہ زلزلہ سا ہو جائے
ہو سکے سینۂ فریادی کا

(رشید لکھنوی)

نعرۂ انقلاب

مشرق و مغرب کی دیکھی اے تصوّرِ کائنات
اُس طرف پُر نور دن ہے اِس طرف تاریک رات

اِس طرف ہے روزِ روشن میں رواجِ کافری
اُس طرف تاریک شب ہے پردہ دارِ نیات

اِس طرف ہے قاریٔ قرآن اِک پیرِ خراب
اُس طرف زہرہ سے ہے رُوح الامین کا التفات

اِس طرف جعفر بنا ہے مرکبِ رُوحِ مسیح
اُس طرف محمودیوں نے آلیا ہے سومنات

اِس طرف داؤد ہیں عیسیٰ کے دھوبی گھاٹ پر
اُس طرف ہے گوپیوں میں اک کنہیا کی حیات

اِس طرف لنکا میں سیتا کو صلائے قید و بند
اُس طرف خود رام سے اپنوں نے چاہی ہے نجات

اِس طرف ہے ڈاروِن میں ملک و ملت کا خیال
اُس طرف ہے ابنِ آدم پیرِ نفسانیات

اِس طرف ہے رند مشرب ساجدِ بیت الحرام
اُس طرف ریش و برُوت اور نشۂ کُل کائنات

اِس طرف یونانیوں کی عقل ہے ہر چرچ میں
اُس طرف کُل شاستر ہیں غرقِ گنگ بے ثبات

الغرض مغرب کا ہے ہر ایک ذرّہ آفتاب
اور تختِ شاہِ مشرق ہو چکا ہے غرقِ آب

پھر ضرورت ہے صدا گونجے یہاں الہام کی
اے خدا مشرق پہ بارش ہو ترے پیغام کی

وائے ناکامی کہ ذوقِ زندگی باقی نہیں
ابتدا سے ایک سی ہیں صورتیں انجام کی

پھر اگر کوشش ہو، آسکتا ہے دورِ کامیاب
انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب

عبید اللہ خان، قدسی

مسائلِ حیات

جوشؔ ملیح آبادی

سیاست

(۱) تمام اعمال و افعال درحقیقت افراد یا مختلف فرقوں کے رجحانوں اور آسانیوں کے زیر ہدایت صادر ہوتے ہیں، اور دراصل یہ سب سے بڑی ایمانداری ہوگی۔ اگر ان اعمال و افعال کو انفرادی و اجتماعی میلانات ہی سے منسوب رکھا جائے، سیاست، اس متذکرۂ بالا حقیقت کے چھپا دینے سے نہایت ہی پیچیدہ شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

جب ہم "انسانیت" پر نگاہ کرتے ہیں تو حبِّ وطن، ایک خود کامانہ سرگرمی سے مشابہ ہونے لگتی ہے، کیا کسی فرد کے حق میں اس خود کامانہ سرگرمی کے جرم کا مرتکب ہونا جائز ہوسکتا ہے۔

(۲) ہم نے ایک دوسرے کو نوچنے کھسوٹنے کا فتنہ کب سے برپا کیا؟ میرے خیال میں تو یہ فتنہ اُسی لمحے سے برپا ہوا، جب قوی نے کمزور کو آنکھیں دکھا کر یہ آواز دی کہ "دیکھ یہ حصہ میرا ہے اور وہ تیرا"

(۳) حدیثِ امن کی اطمینان بخشی اُسی وقت دوبالا ہو جائے گی جس وقت قومیں ایک دوسرے کی طرف اشارہ کر کے یہ صدا نہ دیں گی کہ "دیکھو یہ ہے ہمارا شاندار مستقبل"

(۴) عصری سیاست (Modern Politics) ہمارے دامنِ تمدن پر ایک بہت بڑا داغ ہے جس قدر زیادہ ہم اُس پر نگاہ کرتے ہیں اتنا ہی وحشت و بربریت کے احترام پر ہمیں مجبور ہونا پڑتا ہے۔

(۵) اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ جب تک دنیا میں جنگ کا وجود ہے انسان ایک خونخوار درندے کے سوا اور کچھ نہیں، تو تمہیں اُس پر معترض ہونے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

حضرتِ انسان کے علاوہ کیا تم دُنیا کے کسی ایسے حیوان کا پتہ دے سکتے ہو جو انسان کی طرح بے رحمی کے ساتھ اپنی ہی جنس کے خون اور گوشت پر زندگی بسر کرتا ہو؟

(۶) سیاسیات میں عقلِ عامہ (Common sense) کی سی کسی شے کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔ یہاں تو حکومت کرنے کی محض ایک تنہا عقل ہی پائی جاتی ہے۔ سیاست، کیا اُن حیوانی قوتوں کی بازی گری نہیں ہے جو کہیں ٹھہرنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اور اپنے مقصدِ اصلی کی طرح ہوسِ حکمرانی کو کلیجے سے لگائے رہتی ہیں؟

(۷) انسانی امکانات کی ایک حدود نہایت ہوا کرتی ہے۔ لیکن اربابِ سیاست کی ہولناکیاں قطعی طور پر کوئی انتہا نہیں رکھتیں۔

(۸) حکومت ایک مشین ہے جو صرف اپنے خفیہ مفاد کی مطابقت میں حرکت کیا کرتی ہے۔

اس مشین کو خدا یا انصاف کے نام پر چیلنج دو، اور پھر دیکھو کہ یہ مشین تمہیں پیش کر کے کتنے بے شمار ذروں میں تقسیم کر دیتی ہے۔

اگر تم سیاست کا بہت قریب سے علم حاصل کر لو گے تو پھر انسان اور خدا دونوں پر تمہیں اعتقاد باقی نہ رہے گا۔

(۸) ہماری سیاسی زندگی کی باگ صرف اُن چند افراد کے ہات میں رہتی ہے، جن کی نا امیدیاں ہی اُن کا اقتدار اور کامرانی ہوا کرتی ہیں۔ کیونکہ دانا، ایمانداری کو پسند کرتے ہیں اور ناکارہ افراد بے ایمانی کے ذریعے سے سیاسی رفعت حاصل کرتے رہتے ہیں۔

اِن ناکاروں کو اُن کے سیاسی اقتدار سے محروم کر دو، اور پھر دیکھو کہ اِن میں سے اکثر و بیشتر مقتدر ہستیاں، جو ہماری زندگیوں کو دہشت زدہ رکھتی ہیں حقارت کے بگولوں میں کس طرح رقص کرتی نظر آتی ہیں۔

(۹) کیا یہ بات آئے دن ہمارے مشاہدے اور تجربے میں نہیں آیا کرتی ہے کہ اُن خودکام ریاکاروں کا ایک گروہ جو "آنریبل" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اور ذہانت کے بل پر وہ لوٹنے والی جماعت جسے "گورنمنٹ" کہتے ہیں جس وقت یہ دونوں طاقتیں اپنے باہمی مفاد کی خاطر متحد ہو جاتے ہیں تو انتہائی ایماندار دل کو بھی اہانت کے غاروں میں دھکیل کر دم لیتی ہیں؛

(۱۰) اکثریت کی مکاری ایک قفل ہے جو پبلک کی زبان پر لگا رہتا ہے۔ اور بے ایمانوں کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے ایمان سوز منصوبوں کو پورا کرتے رہیں،

کیا تمہیں علم ہے کہ یہ اکثریتیں کس بنا پر مستقل و محفوظ رہتی ہیں؟

(۱۱) تدیّن اور لیڈری دونوں چیزیں کبھی یکجا نہیں ہوا کرتیں۔

لیڈر کی حیثیت سے ایماندار آدمی ہمیشہ ناکام رہتا ہے اور صرف اِس بنا پر ناکام رہتا ہے کہ وہ ایمانداری کا "صیدِ زبوں" ہے۔

(۱۲) اگر تم پبلک لیڈر بننا چاہتے ہو تو تمہیں کچھ رفتاری اختیار کرنا پڑے گی۔ پوری قوت کے ساتھ شور مچانا ہوگا، تاکہ لوگ حیرت زدہ ہو جائیں، اُچھل پڑیں۔

(۱۳) ہر فرد قدرتی طور پر توقع رکھے گا کہ لیڈر اپنے گلّے کی محافظت کرے گا، لیکن کیا یہ ہمیشہ گلّہ ہی نہیں ہوا کرتا جو اپنے لیڈر کی حفاظت کرتا رہتا ہے!

(۱۴) یہ نام نہاد لیڈر تو اپنے مداحوں کی جہالت سے تجارت کیا کرتے ہیں، جہاں یہ لیڈروں کی خاص فطرت ہوا کرتی ہے کہ وہ اپنے ہی گلّے کو نوچا کھسوٹا کرتے ہیں، وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود اُن کے گلّے بھی اسی میں خوش رہتے ہیں کہ وہ اپنے لیڈروں کی دست درازیوں کے مطیع و شکار بنے رہیں، یہ ہے حقیقت میں سیاست۔

(۱۵) سیاست کے پھنجوڑے ہوؤں کو کوئی شکایت کا موقع نہیں۔ اُنھیں تو اپنی تقدیروں کو دعا دینا چاہیئے کہ حکومت کے کارندوں نے اُنھیں خیر سے اتنی اجازت تو دے رکھی ہے کہ وہ سانس لے رہے ہیں۔

(۱۶) اگر انسانوں کا خون پینا ایک مستوجبِ قتل جرم ہے تو غریبوں اور کمزوروں کو دُوہنا اُس سے عظیم تر جرم کیوں نہیں سمجھا جاتا؟

(۱۷) غریب غذا چاہتا ہے، لیکن امیر اُسے اپنے معدے میں رکھ لیتا ہے۔

(۱۸) کیا امیر اپنی عمارتیں غریبوں کے خون سے تعمیر نہیں کرتے، اور برائے خدا بتاؤ امیروں کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ غریبوں کو نچوڑ لیں؛ میرا مدعا یہ ہے کہ وہ کون ایسا مقدس اخلاق اور مذہب تھا، جس نے اِس مجرمانہ کارنامے پر مہرِ تصدیق ثبت کی تھی؛

وہ مقدس اخلاق اور مذہب، کہیں سوسائٹی اور قانون تو نہیں!

(۱۹) امیر، امیر ہیں۔ غریبوں کی بدولت، غریب، غریب ہیں۔ امیروں کے باعث غریب کی مصیبت، اُس کی عسرت ہے، اور امیر کی مصیبت ہے اُس کی دولت

(۲۰) کیا وایہ خانوں میں کسی بچے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خالص اپنی تفریح کی خاطر دوسرے بچوں کے کھلونے غصب کرلے؟

(۲۱) ہمارے تمام ادارے بالعموم، اور سوسائٹی، سیاست و مذہب بالخصوص "ذاتی ملکیت" کی پیداوار ہیں۔

(۲۲) لعنت اُس مُلک پر جہاں کام کرنے والے کوڑی کوڑی کو محتاج ہوں۔ اور کاہل فیشن پرست مزے اُڑائیں۔

(۲۳) خواجگی و خسروی اپنے غلاموں سے خوف زدہ ہے۔ لیکن کیا غلام اپنے معدوں سے ڈرے ہوئے نہیں ہیں؟

(۲۴) اگر آج کہیں کوئی ایسا آدمی موجود ہے جو دنیا کے موجودہ نظم و نسق سے مطمئن ہے۔ کیا وہ اِس قابل نہیں ہے کہ اُسے پاگل خانے میں ٹھونس دیا جائے؟

(۲۵) دنیا کے کسی حصّے میں بھی آدمی، آدمی پر کیوں کر اعتبار کر سکتا ہے، جبکہ تمام افراد معاشری و اقتصادی ہی اعتبار سے درجۂ مساوات پر فائز نہیں ہیں؛

کیا اشتراکیت اعتمادِ باہمی کا مذہب نہیں ہے؟

(۲۶) اب وقت آگیا ہے کہ ہر انسان غور کرے کہ "میں مصیبت زدہ کیوں ہوں"

(۲۷) ایک کامیاب انقلاب ہی نجات دہندہ ہو سکتا ہے، اور اگر انقلاب ناکام رہا تو وہ محض ایک باغی ہوگا اور بس۔

ایک نجات دہندہ اور باغی، کو اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا جاتا کہ درحقیقت یہ دونوں ہیں کیا۔ بلکہ فیصلہ اس بنیاد پر ہوا کرتا ہے کہ اُن کی سرگرمیوں نے اُنھیں کیا بنا دیا ہے۔ انقلابی ہونے کی حیثیت سے کیا ایک نجات دہندہ ویسا ہی بُرا یا اچھا نہیں ہوتا، جیسا کہ ایک باغی!

(۲۸) آزادی کوئی زنِ بازاری نہیں ہے جو ہر عیش پسند کا پہلو گرم کر سکتی ہے، یہ تو ایک ایسی شرمیلی دوشیزہ ہے کہ تن من دھن سب کچھ قربان کر چکنے کے بعد بھی یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ضرور اس کے پہلو میں جگہ مل سکیگی۔

یہ کتنی حد سے گزری ہوئی حماقت ہے کہ آزادی کی سی شے کو بھیک میں مانگا جائے۔

گدا اپنا کاسۂ گدائی لئے تختِ شاہی کے روبرو کھڑا ہوا ہے اور بھیک میں تاج مانگ رہا ہے۔ اس گستاخ کی جگہ سولی ہے، یا قید خانہ۔

کیا ہم اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہیں؟

(۲۹) اگر کوئی آزادی کی خاطر اپنے آپ کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتا تو اس دنیا میں وہ کونسا دوسرا انسان ہے جو اس کی خاطر اس کاروبار کو سنبھالے گا، اور آزادی کو اس کی جیب میں ڈال دے گا؟

(۳۰) اس وقت کیا یہ ہم پر فرض نہیں ہو گیا ہے کہ آزادی کا سودا سر میں اور سر ہتھیلی پر لے کر ہم میدانِ عمل میں نکل آئیں؟

(۳۱) بزدلو، اپنے کو تسکین دے لو، اس خیال سے کہ سیاسی حالات آخرکار ایک چلتی پھرتی چھاؤں ہوتے ہیں۔ ثقافتی ارتقا (....... political evolution) ہی کو دراصل ترقی کی ایک صحیح علامت کہا جا سکتا ہے، اس لئے ہمیں موجودہ دردمندیوں پر صبر کرنا چاہیئے۔

(۳۲) مجھے دراصل دُکھ پہنچتا ہے جب کوئی مجھے ہندو یا مسلمان کہتا ہے، کیونکہ میں اِن دونوں سے ایک بھی بننا پسند نہیں کرتا۔

لوگ مجھے اشتراکی، ویدانت اور صوفی کہتے ہیں۔ ہر شخص اپنے قیاس سے مجھے کوئی نہ کوئی نام دے دیتا ہے۔ یہ انسانوں کی بہت پُرانی عادت ہے کہ وہ لوگوں کے نام کسی نہ کسی ایسے رجسٹر میں، اور کسی نہ کسی ایسے خاص نام کے تحت لکھ لیتے ہیں جو اُن کے سطحی دماغوں کی پیداوار ہوا کرتے ہیں۔

لیکن میں اِن سے کچھ بھی نہیں ہوں۔

نہیں معلوم یہ اہلِ دنیا مجھے میری مرضی کے خلاف اپنے تفرقہ پرور ناموں کی طرف کیوں گھسیٹتے ہیں اور مجھے اپنے پروپاگنڈا کی چیز بنانے میں اُنھیں کیوں لطف آتا ہے؟

یہ مجھے "اشتراکی"، "ہندو" اور "رعیتِ برطانیہ" کہنے والے، یہ کیوں نہیں پسند کرتے کہ میں صرف ایک "انسان" کی حیثیت سے زندگی بسر کروں؟

اب زمانہ وہ آ گیا ہے کہ انسان، اپنے کو "انسان" کے علاوہ سب کچھ بتانے پر آمادہ رہتا ہے۔

(۳۳) حُبِّ وطن ایک تنگ ظرفی ہے، اپنے وسیع معنی میں ہمیں اپنے کو "ہندو"، "عیسائی"، "ہندی"، "ایرانی" اور "فرانسیسی" کہلانے سے انکار کر دینا چاہیئے اور ہر اُس شے سے مُنہ موڑ لینا چاہیئے جس سے بوئے فرقہ داری آتی ہو۔

ہمیں اپنے کو صرف "انسان" کہلوانا چاہیئے۔ ہم اوّل بھی انسان ہیں آخر بھی انسان ہیں۔

ہمیں اب انسانیت کو تقسیم کرنے اور آویزشِ باہمی کے مواقع نکالنے کے لئے جدید الفاظ اور نئی اصطلاحیں مشکوک نہ کرنا چاہیں۔

(۳۴) کیا یہ مسخرگی نہیں ہے کہ ہم جماعتوں میں تقسیم ہو کر اور "مشرقی"، "مغربی" لیبل اپنے ماتھوں پر لگا لگا کر اپنے حقوق کی خاطر ایک دوسرے سے ہاتھا پائی کرتے نظر آئیں، درآنحالیکہ "انسانی حقوق" حاصل کرنے کی عظیم مہم ہمارے سامنے ہے؟

کسی کو مردِ حق آگاہ نظر آتا ہے
کسی کو فردِ گمراہ نظر آتا ہے
ایک ہی سہرا ہے [illegible]
[illegible] اللہ نظر آتا ہے

(راجنیش)

مردِ مُضحک

(گذشتہ سے پیوستہ)

(جملہ حقوق محفوظ)

(از جناب اسرائیل احمد صاحب سکندرآباد دکن)

باب ۲

کامپرشیکو کی کشتی سطح بحر پر

(۱)

جبتک کشتی خلیج پورٹ لینڈ میں رہی طوفان کے آثار کچھہ برائے نام ہی نظر آتے تھے، چہرۂ بحر اگرچہ قدرے مکدر تھا لیکن تھا عموماً ساکن، مطلع بھی صاف تھا کشتی نے جس وقت بادبان اٹھایا ہے، ہوا اس قدر کمزور تھی کہ بمشکل کشتی کو کوئی جنبش دے سکتی تھی، چنانچہ وہ ساحل سے بالکل ہمکنار ہوکر چل رہی تھی سنگستانی لب سے متصادم ہو جانے کا کوئی خطرہ نہ تھا، ساحل کے زیرِ دیوار چلنے میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ وہ اہل کشتی کے فرار کے لئے اک گونہ پردہ داری کا کام دے رہا تھا۔ اس جرائم پیشہ جماعت کی نقل و حرکت امن و حفاظت کے ساتھ اس طرح بصیغۂ راز جاری تھی۔

راکبانِ کشتی تعداد میں دس نفر ہیں۔ ان میں سے تین اہل عملہ ہیں، اور سات مسافر، ازاں جملہ دو عورتیں۔ بیرونی سمندر کی روشنی میں جہاں غروب آفتاب کا چھپنا بھی قبل طلوع کی سی آسمان تابی کا جلوہ رکھتا ہے، سب لوگ صاف صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ اب ان کو اخفائے راز کی ضرورت بھی نہیں رہی ہے، اس وقت وہ پانی کی "محفوظ سرزمین" میں ہیں۔ "ارض غیر مملوکہ" ہیں! اک "وقفِ عام" "ملک خدا" کے "حریماً آسنا" میں! چنانچہ وہ بالکل بے غل و غش ہیں۔ اور کھلے سمندر میں کھل کھیلے ہیں، یعنی خوب گا بجا رہے ہیں۔ اور "درمیان قعر دریا" انہیں "تردامنی" کی کوئی پروا نہیں ہے، بندرگاہ سے ان کی رخصتی ان کی نجات یا فنگی کے ہم معنی تھی۔ خلیج سے ان کا خروج ساحل مراد کی رسائی کے مترادف تھا۔

اس معجون مرکب جماعت کی بوقلموں نوعیت دور سے نظر آتی تھی عورتوں کی عمر کے متعلق کچھہ کہنا مشکل ہے ممکن ہے قیاس غلطی کرے، آوارہ گردی و اسیری کی زندگی صنفِ نازک کے قوئے میں قبل از وقت اضمحلال، اور ان کے پر شباب چہروں میں حسن کا زوال پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ کشتی والی عورتوں کے مرجھائے ہوئے گالوں کی جھریاں گویا فلاکت و مصیبت کی تحریریں تھیں ان میں سے ایک عورت ان ساحلی شہروں میں سے کسی ایک کی رہنے والی تھی، جو "خشک بندرگاہ" کا "لب تشنہ بہ آب اندر" قسم کا نام رکھتے ہیں دوسری عورت اپنے خط و خال سے آئرستانی معلوم ہوتی تھی۔

کشتی میں سوار ہو جانے کے بعد سب لوگ ان صندوقوں پر یکجا ہو کر بیٹھ گئے جو کشتی کے سطوان کی جڑ میں رکھے ہوئے تھے، بعض ہمسفروں کی زبانیں بھجنس تھیں۔ چنانچہ وہ آپس میں ہمکلام تھے، ملاحوں میں سے ایک کوہستان پیرینیز کے شمالی خطے کا رہنے والا تھا، اور دوسرا اسی کے جنوبی علاقے کا متوطن اس طرح یہ دونوں ہم قوم تھے، اگرچہ جغرافیائی و وطنی نقطہ نظر سے اول الذکر فرانسیسی تھا اور آخر الذکر ہسپانوی، اہل کشتی میں سے دو آدمی خالص فرانسیسی النسل تھے۔ اور ایک شہر جنیوا کا باشندہ تھا، ان کے علاوہ ایک بوڑھا شخص تھا، جو ایک لبادے میں از سرتاپا ملفوف تھا، ٹوپی میں پائپ وغیرہ کے لئے کسی جگہ کوئی شگاف یا روزن نہ تھا۔ اپنے حلیے کی غمازی کی بنا پر یہ شخص المانوی الاصل معلوم ہوتا تھا۔ پانچواں آدمی وہ ہے جو اس گروہ کا سرغنہ ہے۔ یہی وہ شخص ہے جس نے یاد ہوگا کشتی میں سوار ہوتے ہوئے بچے کو چڑھنے سے باز رکھا تھا۔ اسی نے کشتی میں پہنچ کر اپنی لات سے تختے کو گرا دیا تھا۔ اور کشتی ساحل کے مابین کے راستے کو منقطع کر دیا تھا، یہ شخص بہت قوی الجثہ و طویل القامت چست و چالاک، بیقرار و سیماب وش واقع ہوا تھا، اس کی پوشش بڑی زرق برق تھی۔ یہ ایک مضطرب فطرت کا آدمی تھا، اس سے ایک گھڑی بھی نچلا نہ بیٹھا جاتا تھا، کبھی جھکتا، کبھی کھڑا ہو جاتا، اور کبھی کشتی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور دوسرے سرے سے پہلے تک مسلسل گردآوری کرتا اس وقت اس کی سرگرمی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ماضی قریب میں جو کچھ گذر چکا ہے اور مستقبل قریب میں جس کے پیش آنے کی توقعات ہیں، اس پر وہ "تمشا ئیانہ شان" سے بحث کر رہا ہے۔

یہ آدمی اور وہ شخص جو کشتی میں ناخدا کے فرائض ادا کر رہا ہے، اپنے دو دوسرے اہل عملہ کے ساتھ، باوقاتِ مختلف ہسپانوی، فرانسیسی، اور اسی نواح کی ایک تیسری زبان میں گفتگو کر رہا ہے۔ کوہستان پیرینیز کے جنوبی دامنوں میں یہ تینوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ تاہم اس جماعت کی مشترکہ زبان، عورتوں کو مستثنےٰ کر کے فرانسیسی ہی ہے جسے وہ اپنے مخصوص لب ولہجہ میں کسی قدر متغیر صورت میں بولتے ہیں۔ فرانسیسی زبان اسی عہد سے یورپ کے مختلف ممالک کے درمیان باہمی مبادلۂ خیالات کا آلہ بننی شروع ہو گئی تھی، براعظم کے تجارتی حلقوں کی مستعملہ زبان بھی یہی تھی، آوارہ گرد جرائم پیشہ توں میں بھی فرانسیسی ہی کی شستگی سے اپنے راز و نیاز کی باہمی افہام و تفہیم کا کام لیا کرتی تھیں۔ شہر لندن کا ایک آشوب شہر چور ایک ایسی زبان سے آشنا پایا گیا جو فرانسیسی کی ایک شاخ سے تعبیر کی جاسکتی تھی۔

کشتی بہت خوش ساخت ہے، اور سطح بحر پر بڑی سبکروی سے چلی جا رہی ہے۔ لیکن راکبان کشتی کی تعداد اور ان کا مجموعی حجم و مقدار اک ہلکی کشتی کی بساط سے زیادہ ہے۔

کشتی کے ملاحوں کا کاسپرشیکو کے فرار میں مدد بہم پہنچانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ بھی ان لوگوں کی مجرمانہ زندگی میں ملوث ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کشتی کے ناخدا اور جتھے کے سرغنہ کے درمیان کوئی مفاہمت نہیں ہے۔ مگر اس تناصر باہمی کے لئے اس قدر کافی ہے کہ دونوں قوم "باسکے" کے نجیب الطرفین فرزند ہیں۔ باسکے لوگ اپنی "باسکیت" سے شدید عصبیت رکھتے ہیں۔ اک باسکے پر فرض ہے کہ وہ دوسرے باسکے کی مدد کرے۔ اور اس ملت نوازی میں وہ شریف و غیر شریف کی مطلق تمیز نہیں کرتی، اہل پیرینیز کی یہ اخوت ضرب المثل ہے۔

جب تک کشتی خلیج کے حلقے کے اندر رہی کوئی موسمی خطرہ نظر نہ آتا تھا، سمندر کے بعض تیور اگرچہ بعض ممکن خطرات کو مضمر رکھتے معلوم ہوتے تھے۔ تاہم چہرۂ بحر ہنوز ایک دفعہ بھی "چیں بجبیں" نہ ہوا تھا، اہل کشتی کو مستقبل قریب میں کسی غیر خوشگوار موسمی نیرنگی کا قرینہ نہ دکھائی دیتا تھا، قطع نظر اس سے ان کے لئے بہرحال سفر کرنا اور جلد از جلد ساحل کو چھوڑ دینا اک ناگزیر ضرورت تھی، وہ ایک شدید خطرے سے اپنی جانیں لے کر بھاگے تھے خشکی سے، ہر قربانی پر رستگاری ان کے لئے اک جشن فتح کا پیام تھا۔

چنانچہ وہ قہقہے مار رہے ہیں۔ اور گیت الاپ رہے ہیں، اگرچہ کسی قدر دبی دبی آواز میں۔ تاہم حقیقی زندہ دلی کے لہجے میں۔

یکبارگی ایک شخص نے اک نعرہ مارا، جو قلبی فرحت کا ہم نوا تھا، یہ ایک کارآزمودہ کشتی راں تھا، جو دور دراز سواحل بحر چھان مار چکا تھا کھلے سمندر میں قطب نما کے اصطلاحی استعمال کے ساتھ جہازرانی کی قابلیت وہ بلا شبہ نہ رکھتا تھا، لیکن کشتی کا لغوی معنی میں "ناخدا" تھا۔ طویل تنگ اور پیچیدہ

خلیجوں اور آبناؤں کی انتہائی تپلی گردنوں تک جا پہنچا، اور وہاں سے مچھلیوں سے بھری ہوئی جال بے تکلف کھینچ لانا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ اس ملاح کا فلک شگاف نعرہ اہل کشتی کے جوش مسرت کی معراج تھا۔

ایک نے ایک آہنی چولھے میں آگ جلائی، اور ایک خاص قسم کے کھانے کے پکانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس نسخے کا جزو اعظم مچھلی کا گوشت تھا، لحم الخنزیر کی کچھ بوٹیاں بھی ڈالی گئیں، بقولات میں اک مرغوب قسم کی لوکی تھی جو اس زمانے میں بہت کھائی جاتی تھی، ہانڈی دراصل متعدد و مختلف کھانوں کا طرفہ معجون تھی۔ جس کی ترکیب و ترتیب میں سارے شرکائے دسترخوان نے ایک دوسرے کی رعایت میں تھوڑی تھوڑی اپنے انفرادی ذوق کی قربانی منظور کرلی تھی، خام جنس کا اک منہ کھلا ہوا تھیلا پکانے والے کے پہلو میں رکھا ہوا تھا۔ ایک لالٹین اک کہے سے اس کے سر کے اوپر لٹک رہی تھی، اسی کے قریب وزاہٹ کرکشتی کا "مرغ بادنما" اپنی جائے نشست پر قائم تھا۔ یہ ایک مردہ "ہیلسین" داک چڑیا تھی، جس کے متعلق اس زمانے کے ملاحوں کا یہ توہم تھا کہ وہ ہوا کا رخ بتانے کے لئے ہوا کی سمت آمد میں اپنا سینہ خود بخود پھیر لیتی ہے۔ ہانڈی کے پکنے کے دوران میں لوگ بار بار چکھا چکھی کر رہے تھے اور مزے میں آآکر بھینی دیہاتی گیت گارہے تھے۔ جنگل کے مختلف درخت زوال آفتاب کے وقت چیزوں کا طوالت پذیر سایہ۔ پگڈنڈی پر چلنے والی گاڑی، بس یہی پیش پاافتادہ چیزیں کافی "شاعرانہ لمحات" پیدا کر رہی تھیں۔

کسی جگہ سے روانگی کا وقت اپنے اپنے حسیات کے اعتبار سے رنج یا خودکشی کا موقع ہوا کرتا ہے۔ کسی کے لئے وہاں سے عقب گذاری اک راحت کی سانس ہوتی ہے، اور کوئی سدھارتے ہوئے افسردہ ہوجاتا ہے، یہاں ساری جماعت کے واردات قلب اول الذکر نوع میں داخل تھے، البتہ صرف ایک فرد جماعت کا معاملہ اس سے مستثنےٰ تھا۔ یہ وہ پیر مرد تھا جسے قبل ازیں کئی موقعوں پر ہم دیکھ چکے ہیں یعنی جس کے ہیٹ میں کوئی پاپ نہ تھا۔

اس بڈھے کی وضع قطع میں المانوی علامات نسبتہً بہت اجاگر تھیں، مگر چلیے کی گہرائیاں اس درجہ ناقابل پیمائش تھیں کہاں میں قومیت کی مابہ الامتیاز خصوصیات بالکل گم ہوگئی تھیں، اس عجیب شخص کو کسی ایک سررشتہ نسل سے قطعی طور پر وابستہ کرنا مشکل تھا۔ یہ حضرت چہرے سے گنجے واقع ہوئے تھے لیکن جذبہ "فارغ البالی" کا حال یہ تھا کہ بے بال سر والے چہرے میں چار ابرو کا صفایا اور کیا گیا تھا کشتی کے مہرے پر جس جگہ حضرت مریم کی تصویر تھی اس موقع سے جب یہ شخص گذرتا تھا تو اظہار عقیدت میں اپنی ٹوپی اتار لیتا تھا، اُن اوقات میں کہ اس کا سر اونچا اُٹھ جاتا تھا اس کے چہرے کی ضعیفاً پھولی ہوئی رگیں "پختہ حکمت" کی بلیغ سطریں بن کر نمایاں ہوتی تھیں۔ دھڑ سے پاؤں تک ایک لبادے میں لپٹا ہوا تھا۔ جو بہت خستہ ہوگیا تھا۔ دریدہ روزنوں سے جابجا نیچے کا چست ترکوٹ نظر آتا تھا، اس کہن سال بزرگ کے ہاتھ ہر وقت بلا اختیار صلیبی شکل بنانے رہتے تھے، جو عیسائیوں میں اقامت نماز کے وقت کی وضع ہے۔

بڈھا عموماً اک عالم خواب میں پایا جاتا ہے۔ وہ اس قلب و روح کا انسان ہے جسے جرائم و مظالم کے ارتکاب کا مشاہدہ خون در جگر رکھتا ہے۔ خود اس کے چہرے کی ہیئت اک ایسے "آتش زن" کی سی ہے جس کے اندر آنکھیں صرف "پادری" کی نصب کردی گئی ہوں۔ جو اک عمیق تابانہ احساس کی آئینہ دار ہوں۔ بڈھے کی بھوری نہ لفوں کی لٹیں، جو اب بالکل سفید براق ہوگئی ہیں اس کی کنپٹیوں پر لٹک رہی ہیں۔ اس کے تمام سراپا سے روح مسیحیت منعکس ہے۔ جس پر اک "ترک" کی شان تسلیم و رضا مستزاد ہے۔ دبلی اور سوکھی انگلیوں کا ایک ایک ریشہ دکھائی دیتا ہے بلند و بالا قامت، پیرانہ سری سے تاج پوش ہے۔ وہ کشتی کے عرشے پر ادھر ادھر خراماں نظر آتا ہے۔ لیکن نہ کسی کی طرف ملتفت ہوتا ہے، نہ کسی سے ہمکلام عالم آب کی اس متحرک آبادی میں وہ بالکل "باہمہ و بے ہمہ" ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سینے کے عمق میں کوئی خاص خیال دل نشین ہے۔ جس پر وہ اپنے سارے تفکر و تدبر کو مرکوز کئے ہوئے ہے۔ آنکھوں کے حلقے رقت سے لبریز ہیں۔ وہ اپنے گردو پیش کی سیاہی و سیاہ کاری سے مکدر ہے۔ خود اپنے مجرم ضمیر کی ملامت بھی اس کے لئے سوہان روح ہے۔

وقتاً فوقتاً جتھے کا سرغنہ جو اک پرکالۂ آتش واقع ہوا ہے۔ اور اک شعلۂ جوالہ کی طرح کشتی کی ساری فضا میں جولاں و رقصاں نظر آتا ہے، پیر مرد

کے نزدیک ایک کہر سرگوشی کیا کرتا ہے۔ جس کا جواب سکون پیری کی زبان صرف اک اشارۂ ابرو سے دے دیتی ہے۔

یہ گویا بحق کا اضطراب ہوتا تھا، جو "سکینت سحر" کے ساتھ مصروف مشورہ ہوا کرتا تھا۔

(۴)

راکباں کشتی میں سے دو شخص وقف فکر و نظر ہیں۔ ایک یہی بڈھا۔ اور دوسرا وہ کشتی کا کپتان۔ جس کی شخصیت کو کاپرنیکو جماعت کے سردار سے مخلوط نہ کرنا چاہیئے، آخرالذکر سمندر پر نگراں او ساں سے دست و گریباں ہے۔ اور اول الذکر سماوی آثار کے مطالعے و مراقبے میں اپنی روح کو غرق ریز کر رہا ہے۔ وہ ایک ایک روزن ابر سے کسی نجم ہدایت کو دیکھ لینا چاہتا ہے۔

وقت وہ ہے جبکہ روز و شب کے ہر دو اوقات باہم وصل ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ دن اپنے دم واپسیں میں نظر آتا ہے، اور رات کا "جنین" رحم مستقبل میں ہوتا ہے۔ خال خال ستارے آنکھیں کھول رہے ہیں سطح عجیب آثار کا جلوہ گاہ بنا ہوا ہے۔ اس پر ابر و غبار مسلسل گردش میں ہیں۔ زمین فدات آبی کے ایک حجاب میں ملفوف ہے۔ اور سطح بحر بادل کے "بادلے" میں ملبوس ؛

خلیج پورٹ لینڈ کے دھانے سے نکلنے سے پہلے ہی۔ سمندر کی برہمی مزاج کے بعض مبہم تیور دیکھ کر کپتان نے کشتی کے کل چوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا، اس نے مستول اور بادبان کو ٹھیک ٹھاک کر لیا تھا۔ اور وہ تمام تیاریاں اور پیشبندیاں کر لی تھیں جو اک ایسے ناخدا کے لئے ضروری ہو جاتی ہیں۔ جو اضطراب پذیر موسم کی ساری تنبیہوں کے علی الرغم بہرحال سمندر میں کود پڑنے کا عزم بالجزم کر چکا ہو۔

کشتی اگرچہ اچھی خاصی تھی۔ مگر پھر بھی اک حقیر قد و قامت رکھتی تھی۔ پرشور بحر اعظم کے تلاطم کی وہ حریف نہ ہو سکتی تھی کشتی کا کمزور پہلو بس یہی تھا، "کہتری قامت" کم از کم یہاں "بہتری قیمت" کے ہم معنی نہ تھی۔

کپتان متواتر نقل و حرکت میں ہے، ساتھ ہی اس کی ایک آنکھ ساحل کے مناظر پر ہے۔ میٹیو شنا کو شروع ہی سے اگرچہ کافی تند ہوا سے سابقہ پڑا تھا۔ مگر کوئی اندیشہ ناک صورت ہنوز خارج از بحث تھی، تاہم اب کشتی کو تھوڑی تھوڑی لغزش ہوتی جاتی ہے۔ اور اسے اپنی رفتار کا بالکل خط مستقیم میں قائم رکھنا قدرے مشکل محسوس ہو رہا ہے۔ کپتان اپنے معینہ مقام پر جا کھڑا ہوا ہے۔ اور بڑی تندہی اور گہری نظر بازی سے کشتی کی سربراہی کر رہا ہے۔ اس وقت وہ کسی پر اعتماد کرنا نہیں چاہتا اور اپنی "غیر منقسم ذمہ داری" کو اگر اس نے کہیں تقسیم کیا بھی ہے تو اپنے ہی دونوں شانوں پر۔ کشتی کی رفتار اور طوفان کی امواج کے درمیان اک سلسل کشتی برپا ہے۔

الغرض کپتان بڑی ہوشمندی اور بلند آہنگی کے ساتھ کشتی بانی کے فرائض ادا کر رہا ہے۔ وہ کشتی کو تابمقدور لغزیدہ ہونے نہیں دیتا۔ اس کو اس امر کی احتیاط بھی منظور رہے کہ کشتی کو وہ سمت رفتار اختیار نہ کرنے دے۔ جس میں وہ کرۂ ہوا کی پر زور امواج سے متصادم ہونے لگے، کشتی کے ایک قدم پر اس کی نظر ہے۔ "میٹیو شنا" کے اندر اگرچہ قطب نما موجود تھا لیکن یہ آلہ اس قدر چھوٹا تھا کہ موجودہ طوفانی ہنگامے میں اس کی سوئی بالکل متزلزل ہوئی جا رہی تھی۔ اور وہ کسی قابل اعتماد صحت کے ساتھ سمت کو نہیں بتا رہی تھی، تاہم کپتان کی آنکھیں چہرۂ بحر کے ایک ایک تیور پر جمی ہوئی ہیں، اور اس کی انگلیاں کشتی کی ایک ایک حرکت نبض پر، اور طوفان کی ایک ایک ضرب قلب پر۔

اسی خلفشار میں ایک دفعہ کپتان نے آسمان پر اک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ تو اس کو وہ تین ستارے ایک جگہ نظر پڑے، جو جہازرانی کے نقطہ نظر سے اک خاص پیام اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اور جن کے لئے فلکیات میں ایک مخصوص اصطلاحی تسمیہ پایا جاتا ہے۔ ہسپانیہ کے جہازراں انہیں "مجوس ثلاثہ" کے نام سے پکارتے تھے۔ اور ان میں قدیم الایام سے ایک روایت مشہور تھی کہ جب یہ تین مجوسی یکجا نظر آئیں تو "سماوی تثلیث" کی یہ "توحید" ایک شگون نیک ہے۔ جس کی تعبیر یہ ہے کہ دیکھنے والے "نجات دہندہ" کی رحمت و حمایت سے دور نہیں ہیں۔

تاہم عین ان ہی لمحات سعادت کے وقت بڈھے کی ذہانت اک دوسری ہی داستان تھی، وہ کہہ رہا تھا "سمت نما ستارے احساس خود نمائی

سے بھی دکھائی نہیں دیتے ۔ اس تارے کا منظر بھی نادیک ہے جو بحالت طلوع اک سرخ تنویر رکھتا ہے۔ کیا نور آسمانی کی ساری آنکھیں پھری ہوئی ہیں ؟ ۔

مگر کشتی کے دوسرے ساکنین اس تمام نظر بازی و جگر کاوی سے بے غل و غش ہیں ۔ انہیں " جہالت " کی " جنت " نصیب ہے ۔

کامیاب فرار اور عارضی نجات کی فاتحانہ مسرت کا احساس جب ذرا کم پڑا تو بعض اہل کشتی کو چند غیر خوشگوار آثار کا شعور ہونا شروع ہوا ۔ موسمی حالت کے اعتبار سے سارے : ماہ جنوری کے سے تھے ۔ اور ہوا برف میں ڈوبی ہوئی چل رہی تھی کشتی کے تنگ زیرین بطن (کیبن) کے اندر ان سب لوگوں کا پناہ لینا ممکن نہ تھا ، اول تو اس میں اتنی مکانیت نہ تھی ، دوسرے وہاں اتنا سامان بھرا ہوا تھا کہ آدمیوں کے لئے کوئی مزید گنجائش باقی نہ رہی تھی ۔ اس میں گرہستی کی چیزیں تو کامپرشیکو کی تھیں ۔ لیکن اس بار گراں کی اکثریت اسباب تجارت کے وہ گٹھے تھے ، جو خود مالکان کشتی کی ملکیت تھے ۔ اس لئے کہ یہ کشتی محض سیر و گشت کی اغراض کے لئے نہ تھی ، بلکہ وہ باضابطہ بعض اجناس تجارت کی خرید و فروخت کیا کرتی تھی ۔ جسے وہ لوگ مخفی طور پر بلا محصول بحری ادا کئے ساحل کے مختلف موقعوں پر بار کرتے اور اتارتے تھے ۔ بس مجبوراً مسافروں کو کشتی کے بالائی عرشے ہی پر قیام کرنا پڑا ۔

اس لاعلاج مصیبت پر انہوں نے بآسانی سر تسلیم خم کر دیا ، آوارہ گرد خانہ بدوش لوگ آسمانی شامیانے کے نیچے رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں اس لئے ان کو رات کا موسم کی ایسی بے رحمیوں کی ہمکناری میں گزار لینا چنداں دشوار نہیں ہوتا ، کھلی ہوا ان کی ہمیشہ کی ہواخواہ ہوا کرتی ہے ، اور ویران میدان ان کا محفوظ مکان ۔ جس میں وہ بے تکلف سو جاتے ہیں اگرچہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ یہ خواب راحت ان کے خواب مرگ ثابت ہوئی ہے ۔

شام کے کھانے کے انتظار میں بعض لوگ عورتوں کے گرد جمع ہو گئے ہیں ۔ لیکن اس بڈھے کے لئے کچھ اس قدر خون جگر پینے کو ہے کہ دستر خوان کی اس کشش کو اس نے قطعاً محسوس نہ کیا ۔ وہ بالکل بے حس و حرکت ہے اور اپنے خیالات میں محو و مستغرق ۔ بظاہر اس کو ہوا کی بیدار کن سردی کا ابھی تک ادراک نہیں ۔

کپتان نے اپنے موقع سے کھڑے کھڑے اعماق حلق سے اک مہیب آواز بلند کی ، یہ اس امریکی بحری طائر کی سی آواز تھی جس سے ملاح اچھی طرح آشنا ہیں ۔ اس آواز پر کامپرشیکو کا سردار قریب آیا اور کپتان نے اس سے اس طرح خطاب کیا ۔

" کوہستان کے کاشتکار ! "

یہ وہ کلمات ہیں جو بطور دیباچے کے اس وقت کہے جاتے ہیں جبکہ کوئی نہایت اہم و سنگین مضمون چھیڑنا منظور ہوتا ہے ۔ جو مخاطب کی ہمہ تن گوش توجہ کا متقاضی ہو ۔

کشتی کے ناخدا اور جرائم پیشہ جماعت کے سرغنہ کے درمیان اس عجیب الخلقت بڈھے کے متعلق ایک مکالمہ شروع ہو گیا جس زبان میں وہ گفتگو کر رہے تھے وہ ایک غلط العام قسم کی ہسپانوی بولی تھی جو کوہستانی اضلاع میں رائج تھی ۔ مندرجہ ذیل سوالات و جوابات ہوئے ۔

" کشت زار کوہستان کے کسان ! یہ آدمی آخر کون ہے ؟ "

" بس اک آدمی ، "

" اس کی زبان کیا ہے ؟ "

" ہر زبان "

" اس کا ذخیرۂ علوم ؟ "

" ہمہ علوم "

" وہ کس قوم کا آدمی ہے ؟ "

" ہر قوم کا ! اور پھر کسی کا بھی نہیں "

" یہ کس خدا کا قائل ہے ؟ "

" اسی عام خدا کا ! — خالق ارض و سما کا "

" خلق خدا اسے غائبانہ کیا کہا کرتی ہے ؟ "

" خبطی ، دیوانہ "

" آپ اسے کیا کہتے ہیں ؟ "

" خرد مند ، فرزانہ "

مختلف کی جماعت کے حلقے میں اس کی نشست کیا ہے؟
"وہ جس کا تصور بھی غیر معمولی ہے"
"کیا رئیس جماعت؟"۔
"نہیں، روح جماعت"
اس قدر گفتگو کے بعد کپتان اور سردار جدا ہو گئے، دونوں مراجعت کر کے اپنے اپنے عالم خیال میں پہنچ گئے۔ سینیوتنا اب خلیج سے باہر آگئی ہے۔

سمندر کا طوفان اب قریباً پورا با پرو بال ہو گیا ہے۔ لہروں اور موجوں کے درمیان شفق کی گریز پا خفیف تنویر میں جا بجا تارے تارے یا "مینا کے ریزے" سے نظر آ رہے ہیں۔ بعض بعض جگہ فاسفورسی عناصر کے ذرات کی تابش ایسی معلوم ہوتی ہے، جیسے رات کی تاریکی میں الّو کی آنکھیں چمکتی ہیں۔

سینیوتنا ایک خطرناک گرداب سے اک بیباک تیراک کی طرح سفروارانہ گذر گئی، خلیج پورٹ لینڈ کے دہانے کے قریب، ریگ بحری کا اک عریض و طویل سد نما تودہ زیر آب مخفی تھا۔ اس کی بناوٹ آڑی آڑی واقع ہوئی تھی اس کی ہیئت اک نیم دائرہ کی سی کہی جا سکتی تھی، اس تحت البحر بند میں موجوں کے مخصوص عمل سے نشستیں سی کٹ گئی تھیں، ان طبعی تصرفات سے ساختہ و پرداختہ ہو کر وہ اک تماشا گاہ کی منشکل بن گئی تھی۔ تھوڑے سے تاریخی تخیل سے کام لیکر سے "بحر اعظم کا کولیسیئم" (اہل روما کا مشہور تھیٹر یا اکھاڑا جو نصف دائرہ کی شکل رکھتا تھا) کہا جا سکتا تھا، غوطہ خوروں کے لئے سمندر کے شفاف پانی میں فطرت کی اس عمارت کا نظارہ عام تھا۔ اس بحری معرکہ گاہ میں آبی جانوروں کے بڑے بڑے "دنگل" ہوا کرتے تھے، جہاز رانوں کی روایات بیان کرتی ہیں کہ اس ورطۂ ہلاکت کے ارد گرد تباہ شدہ جہازوں کے ملبے کے عظیم انبار جمع ہو گئے ہیں۔ جن کو اس عجیب و غریب کوہ پیکر مچھلی نے غرق کیا ہے جو اپنی قہارانہ ضربت کے باوجود "بیت عنکبوت" والے مکین کی جسمانی ساخت کے مشابہ واقع ہوئی ہے۔ قعر بحر کی پرہول ظلمات میں سمندر کی تباہ کاریوں کی یادگاریں آثار قدیمہ کے باقیات الصالحات کی طرح پڑی ہوئی ہیں، عام طور پر لوگوں کے لئے یہ تاریخی ذخیرہ اک "کتاب غیر مفتوح" کی حیثیت رکھتا ہے لیکن طوفان کے اوقات میں جبکہ سمندر تہ و بالا ہوا کرتا ہے تو اس محفوظ عجائب خانۂ فطرت کی اک جھلک نظر آ جایا کرتی ہے۔

آج انیسویں صدی میں یہ مخفی سد بحری بہت کچھ مسمار ہو چکی ہے مصنوعی بندرگاہ کی تعمیر کے سلسلے میں اس کا معتدبہ حصہ قطع و برید کی زد میں آ گیا ہے۔ سمندر کے روزانہ مد و جزر کے پیہم ہجوم کو بھی اس عمل تخریب میں کافی دخل رہا ہے۔

مادر فطرت اور اس کے سب سے زیادہ کھلنڈرے بچے انسان کے درمیان جو کد و کاوش جاری رہا کرتی ہے وہ ضمیر کائنات کے بہت سے اسرار کی آئینہ دار ہے۔

(۳)

بڈھا آدمی جسے کاپر شیکو سردار نے پہلے اک مخبوط الحواس شخص کہا تھا اور پھر اک مجذوب عارف، اب مستقلاً کشتی کے اگلے حصے میں مقیم ہے۔ "بحری سد" کو عبور کرنے کے بعد اس کے تخیلات بھی اک خاص حد کے پرے جا چکے ہیں۔ اس کی توجہ زمین اور آسمان کے درمیان منقسم ہے، اس کی ایک نظر ساعت فلک پر ہے اور دوسری سطح بحر پر، وہ یکے بعد دیگرے اوپر اور نیچے نگراں ہے۔ لیکن شمال و مشرقی گوشے پر بار بار اس کی نظر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے۔

کپتان نے اپنے مقام پر ایک دوسرے ملاح کو متعین کیا اور کشتی کے مختلف حصوں کو قطع کرتا ہوا سب سے اگلے حصے میں جا پہنچا، وہ پیرمرد کے نزدیک آیا لیکن سامنے سے نہیں، پیچھے سے، وہ اس کے پس پشت تھوڑے فاصلہ پر کھڑا ہو گیا، اس کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے، سر ایک طرف کو جھکا ہوا تھا، آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، کہنیاں محراب کی شکل بنا رہی تھیں، اور گوشہ ہائے دہن میں اک مبہم تبسم! ــ مختصر یہ کہ اک ایسی وضع تحیر جو استہزا و احترام کے درمیان مذبذب ہو۔

بڈھے کو اپنے جی سے باتیں کرنے کی عادت تھی، معلوم نہیں کہ اس مذاق کے تقاضے سے یا کسی آدمی کے قدموں کی چاپ اپنے پیچھے سن کر اس نے اپنی "بڑ" جاری کر دی، اس کی آنکھیں خلائے مطلق میں نگراں تھیں اس کی "خود کلامی" یہ تھی۔

سمت الراس کا تعین، جس کے ذریعہ سیاروں کا صحیح صعود و ہبوط

پیمائش کیا جاتا ہے۔ اس صدی میں چار ستارہ اِں کے موقعوں سے ہو گزتا ہے ان کا صدر نشین جوم فلکی ستارۂ قطب ہے۔ اس محفل انجم کے تین رکن، اور ہیں لیکن اس وقت یہ "چار یار" صحن فلک سے غائب ہیں"

علامۂ دہر بڈھے کی زبان سے یہ الفاظ اک اضطراری رو میں پے در پے نکلے، اس نے انہیں مکمل صحیح مخرج و تلفظ سے ادا کیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ارادتاً اپنی تقریر کو متوہوم اور مرموز رکھنا چاہتا ہے "خود خطابی" بھی اک عجیب پُراسرار داعیۂ نفس ہے۔ اس قسم کی ہذیانی و نیم سی گفتگو کو "روح کے عمیق ترین افق کی برق کے لمعات سحابی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

کپتان اک ناقابل ضبط جاذبہ جستجو سے بیتاب ہو گیا، وہ بڈھے کے مُاقلّ و دلّ خطبے کے خاتمے کے بعد ہی بولا: "جناب والا!"

لیکن بڈھے نے مطلق کوئی التفات نہ کیا، وہ بدستور اپنی جگہ غرق فکر اور صرف تکلم رہا۔ اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے وہ اب یوں گویا ہوا۔

"خال خال ہی ستارے نظر آرہے ہیں، اور جو باقی ہیں انھیں بھی استشداد پذیر طوفانی فضا غرق کئے دے رہی ہے۔ ہوا مختلف سمتوں میں مصروف دوا دوش ہے۔ اس کی عام مستقل رفتار خشکی کی جانب ہے جہاں وہ ساحل سے ٹکرا کر عمودی ہیئت میں بلند ہو رہی ہے۔ زمین پانی کے مقابلے میں گرم تر ہوتی ہے۔ اس سے مس ہونے والے کرۂ باد کا حصہ نسبتاً ہلکا ہوتا ہے۔ یہ ہوا اوپر اٹھتی ہے۔ اس کی قائم مقامی کے لئے سمندر پر ہلکی سرد تر و کثیف تر ہوا آتی ہے۔ اسی ناموس فطرت کے عمل کے تحت "ریاح بحریہ" دنیا کے ہر حصے میں قبلۂ خشکی کی طرف منہ کر کے چلا کرتی ہیں؟

"باضابطہ جغرافیائی معائنے اور باقاعدہ فلکی ترصید سے جو عرض البلد معلوم ہو، اس میں اور قیاسی تخمینے میں حسب برائے نام فرق پایا جائے۔ مثلاً تیس میل کے اندر صرف تین منٹ کا تفاوت پڑے تو سمجھنا چاہیئے کہ سمندر میں ہم کم و بیش صحیح راہ پر ہیں؟

ان حقائق و معارف پر ناخدا پھر خراج عقیدت پیش کرتا ہے لیکن بڈھا بدستور خود فراموش رہتا ہے۔

یہ مجہول الحال پیر مرد جامعہ آکسفرڈ یا کانگن کے فضلاء کی سی عبا و قبا پہنے ہوئے ہے۔ وہ اپنی خالی سر دُم بیزاری کی حکیمانہ نخوت کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا۔ وہ "بحریات" اور "بشریات" کا بیک وقت متبحر معلوم ہوتا ہے۔ وہ سمندر کی لہروں اور موجوں کی جست و خیز کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پھر ان مظاہر کی تعبیر کرتا ہے، جس کا خطاب خلاء کی کسی مخلوق ہی سے ہو سکتا ہے۔ وہ مرشد برحق اور مخبر صادق ہر دو مناصب کا جامع بنا ہوا ہے۔ کیا وہ ظلمات آب کا خضر راہ ہے؟

بڈھے کی بڑ پھر جاری ہو گئی، اس مرتبہ اس کی آواز ذرا بلند اور لہجہ واضح تر ہے۔ اس کا طرز خطاب بتاتا ہے کہ اب اس کا منشا یہ ہے کہ لوگ اس کی تقریر کو سنیں اور سمجھیں، اس نے فن کشتی رانی، رفتار طوفان کی پیمائش، کشتی اور سمندر کی باہمی کشمکش اور اس دو طرفہ مزاحمت کی صورت میں کشتی کی شرح رفتار کا تخمینہ، کشتی کی حرکت کو حسب مرضی تیز اور سست کرنے کے طریقے، — غرض بحریات کے بے شمار معارف و اسرار پر اک دریا بہا دیا۔

کپتان ایک دفعہ پھر سربسجود ہو گیا، اور پھر نیاز کیشانہ لب کشا ہوا، "حضور عالی!"

بڈھے نے اب آنکھیں چار کیں، تاہم وہ اپنی جگہ پر اپنی معلومہ نشست سے بیٹھا رہا۔ اور صرف اپنی گردن کو موڑ کر مستفسر کی طرف دیکھا۔

"مجھے طبیب کہیئے!" اس کا فرمان صادر ہوا۔

"بہت خوب جناب حکیم صاحب! اور یہ بندۂ ناچیز صرف کشتی کا کپتان ہے"

"بجا ہے" طبیب نے تصدیق کی۔ (باقی)

یہ کس کا تبسم ہے فضا میں ساقی
یہ کس کی جوانی ہے گھٹا میں ساقی
یہ کون بجا رہا ہے شیریں بربط
بھیگی ہوئی بارش کی ہوا میں ساقی

جوشؔ

ہو کے بی اے پیٹ بھرنا ہو گیا مشکل مجھے

کرلیا ہے عاشقوں کی لسٹ میں شامل مجھے
جان کر اس شوخ نے مخبوط و لایعقل مجھے

کر دیا قابل بنا کر تم نے ناقابل مجھے
ہو کے بی. اے پیٹ بھرنا ہو گیا مشکل مجھے

میری کشتی کب ہوئی موج حوادث کا شکار
وائے حسرت جب نظر آنے لگا ساحل مجھے

حضرت دل دیکھنے میں ہیں جو اتنے مرد نیک
ہے انھیں قبلہ کے ہاتوں زندگی مشکل مجھے

روکھی روٹی کس طرح کھاؤں گا چٹنی کے بغیر
دق نہ کیجیے، جایئے، لا دیجئے اک بیل مجھے

یا تو میں تھا ایک دن سارے جہاں کا ستر پوش
یا پنھاتی ہے لنگوٹی ماں چھٹر مل مجھے

کیا خبر تھی ورنہ کہہ دیتا سر روز جزا
اور سب چیزیں عطا کرنا نہ دینا دل مجھے

خدمت دیں کے لئے میں نے کمر باندھی تو ہے
کرنے دے دنیا اگر اپنی طرف مائل مجھے

جیب سے میری نکلوا ہی لئے چندے میں دام
آج تو واعظ نے اپنا کرلیا قائل مجھے

تیزی رفتار میں میری نہیں آنے کا فرق
کیوں ڈرانا چاہتی ہے دوری منزل مجھے

میں نے اپنی شاعری کی داد پالی شکر ہے
آج احمق کہہ دیا اس شوخ نے جاہل مجھے

مداح ۔ (احمق پھپھوندی)

تم پھر اسی طرح سو جاؤ

از سید حسن ریاض

فریدوں اور خورشید دونوں ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور اتفاق سے دونوں کو کمرے بھی متصل ہی ملے۔ دونوں پونا کی ریس اور پونا میں برسات کا خوشگوار موسم گزارنے کے لئے آئے تھے۔

خورشید برجس، کوٹ، ہیٹ پہنے اور ہاتھ میں سواری کا چابک لئے اپنے کمرے سے برآمد ہوئی۔ اونچی ایڑی کا لیڈی شو اور کانوں میں نیلم کے آویزے نسائیت کے آثار میں بس یہی دو چیزیں نمایاں تھیں۔ ہاں اور ایک حسین چہرہ بھی جس پر خود اس کو بھی ناز تھا۔ پیشانی اونچی، چوڑی ہموار، آئینے کی طرح روشن، آنکھیں نشیلی چمکدار، رخسار گلرنگ، ناک سارے حسن کی ناک، لمبی ڈھلواں گردن پر اس کا سر و چہرہ ایسا زیبا جیسے بلوریں گلدان پر گلدستہ۔ اس چست سپاہیانہ لباس نے اس کے حسن کو کیسا فروغ دیا ہے! جسم کے سارے ڈھلاؤ اور ابھار نمایاں ہوگئے ہیں۔ طاقتور اور تندرست جسم کی تمام زینتوں کے ساتھ اس کا دراز قد ایک متحرک فتنہ بن گیا ہے۔

فریدوں ابھی اپنے کمرے کے دروازہ میں کھڑا ہوا ٹائی باندھ رہا تھا کہ خورشید سامنے سے گزری۔ فریدوں متحیر رہ گیا۔ جب تک وہ برآمدے اور صحن سے گزر کر زینے میں نہ چلی گئی وہ یونہی بت بنا ہوا تکتا رہا۔ "بڑی حسین عورت ہے! کون ہے؟"

فریدوں کے پاس پورے سیزن کا فرسٹ کلاس ٹکٹ تھا۔ جس وقت وہ انکلوژر (Enclosure) میں داخل ہوا اس کو ڈگلس مل گیا۔ ڈگلس اور فریدوں نے اکسفورڈ میں ساتھ تعلیم پائی تھی۔ دونوں نے بڑے جوش سے بڑھ کر ہاتھ ملایا اور جوش سے جھٹکا دیا اور دونوں ساتھ ساتھ کرسیوں کی اگلی قطار کی طرف بڑھے۔ کرسیوں پر ٹوپیاں رکھ کر دونوں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ دوڑ شروع ہونے میں ابھی دیر تھی مگر گفتگو دوڑ ہی کے متعلق ہوتی تھی۔ فریدوں نے کہا فیری کوئین اس دوڑ میں اوّل آئے گی۔ ڈگلس نے اس پر قہقہہ لگایا اور بولا آپ کو شاید گھوڑوں کی ہسٹری نہیں معلوم ریکا جیتیگا بڑا طاقتور جانور ہے۔ اتنے میں ڈگلس کے شانے پر کسی نے پیچھے سے ہاتھ رکھا اُس نے پلٹ کر دیکھا "آئیں خورشید، تم کب آئیں؟"

"کل رات کو"

"کراچی میں تو تم نے بالکل ذکر نہیں کیا"

"مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ تم بھی یہاں آنے والے ہو"

"خوب، آؤ تمہیں اپنے دوست فریدوں سے ملائیں" اور فریدوں کی طرف مڑ کر ڈگلس نے کہا "فریدوں! مس خورشید سے ملو یہ ٹینس کی مشہور کھلاڑی ہیں اور ریس سے انہیں جیسی دلچسپی ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ کراچی سے پونا تک سفر کرکے آئی ہیں۔ گھوڑے پر خوب بیٹھتی ہیں، پولو بھی کھیلتی ہیں۔ بہت لائق ڈاکٹر ہیں نشتر اور دوا علاج کے ان دونوں طریقوں میں انہیں پوری مہارت ہے مگر ملازمت سے متنفر ہے اپنے طور پر مطب کرتی ہیں"

پھر خورشید سے مخاطب ہو کر بولا "فریدوں میرے پرانے دوست

ہیں۔ آکسفورڈ میں ہم دونوں نے ساتھ تعلیم پائی ہے۔ یہ اب کوئینس کالج بمبئی میں انگلش لٹریچر کے پروفیسر ہیں۔ گھوڑے کے معاملہ میں ان کی اور تمہاری دلچسپیاں ایک ہیں۔"

دونوں نے ہاتھ ملایا۔ فریدوں نے ازراہ تپاک سر جھکا کر کہا "آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔" خورشید نے بہت ہی شیریں آواز میں کہا "مجھے بھی بہت خوشی ہوئی۔"

خورشید، فریدوں اور ڈگلس تینوں بیٹھ گئے، اس طرح کہ خورشید بیچ میں فریدوں اور ڈگلس دائیں بائیں۔

پہلی دوڑ ہوئی۔ واقعی فیری کوئین آگے آئی۔ فریدوں ایک ہزار روپیہ جیتا۔ ڈگلس سو روپے ہارا۔ خورشید نے کچھ نہیں لگایا تھا۔ خورشید اور ڈگلس نے فریدوں کو مبارکباد دیں۔

پھر متواتر دوڑیں ہونے لگیں۔ فریدوں کا اندازہ اکثر صحیح نکلا۔ خورشید اس معاملہ میں اس کی ایسی معتقد ہوئی کہ جب کسی گھوڑے پر اس نے کچھ لگایا فریدوں سے مشورہ ضرور کیا۔ خورشید اور فریدوں دونوں جیت کر اُٹھے ڈگلس ڈھائی سو روپئے ہارا۔ فریدوں نے خورشید اور ڈگلس کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ ڈگلس کہیں اور ٹھہرا تھا وہ اپنی قیامگاہ پر چلا گیا۔ فریدوں اور خورشید اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل میں آ گئے۔ خورشید کو یہ وہیں ریس کورس (دوڑ کا میدان) پر معلوم ہوا کہ فریدوں بھی برج ہوٹل (Bridge Hotel) میں مقیم ہے۔

ٹھیک آٹھ بجے خورشید ایک ہلکے اُودے رنگ کی زرّیں ساری پہنے ہوئے لونڈر میں نہائی ہوئی آئیں۔ فریدوں نے بڑھ کر بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ دو چار منٹ کے اندر ہی ڈگلس بھی آ گیا۔ ذرا دیر کے بعد تینوں کھانے کے کمرے میں گئے۔ میز پر دوڑ ہی کی گفتگو رہی۔ خورشید نے کل کی دوڑ کے متعلق بڑے اشتیاق سے سوالات کئے اور فریدوں نے اعتماد کے ساتھ پیشین گوئیاں کیں۔

خورشید نے ایک مرتبہ جوش سے کہا "گھوڑوں کے متعلق آپ کی رائے حیرت انگیز ہے آپ نے آج ہی کئی مرتبہ عام توقعات کے خلاف رائے دی اور وہ صحیح نکلی۔"

ڈگلس نے مسکرا کر کہا "اچھا اب خوشامد ہونے لگی ہے بہت سا روپیہ جیتنے کو جی چاہ رہا ہے۔ فریدوں مشورہ کی فیس مقرر کر دو۔"

"اچھا خوشامد ہی سہی تمہیں کیوں جلن ہوئی" خورشید نے یہ ایسی شوخی سے کہا کہ فریدوں، ڈگلس اور پھر خود ہی خورشید بھی، تینوں خوب ہنسے۔ کھانے کے بعد تینوں اسموکنگ روم میں جا بیٹھے۔ فریدوں نے کہا "افسوس ہے کوئی چوتھا آدمی نہیں ہے، برج کھیلتے"

ڈگلس نے طعن سے کہا "جی نہیں دو آدمی اور چاہئیں انہیں برج سے دلچسپی نہیں ہے۔"

فریدوں حیرت سے خورشید کی طرف دیکھ کر بولا "برج سے دلچسپی نہیں ہے؟"

خورشید نے ذرا منھ بنا کر جواب دیا "جی ہاں بالکل نہیں۔ میں اس کی قائل نہیں ہوں کہ ہر مروّجہ چیز سے شغف پیدا کیا ہی جائے۔"

ڈگلس نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا "اس پر آپ کو دعوٰے ہے کہ بیسویں صدی کی آپ بہترین عورت ہیں۔"

خورشید نے بے باکی سے جواب دیا "کیوں نہیں میں سوسائٹی کے عام میلانات کی رَو کے ساتھ نہیں بہتی۔ ہر چیز کے متعلق میری ایک اپنی رائے ہے اُسی کی پابند ہوں"

ڈگلس خوب ہنسا "فریدوں تم نے سنا جتنی اچھی چیزیں ہیں آپ کو سب سے نفرت ہے، شراب سے نفرت، برج سے نفرت، عشق سے نفرت، ناچ سے نفرت!"

بیشک مجھے ان چیزوں سے نفرت ہے اور اس کی معقول وجوہ ہیں۔ جب لوگوں کا پاگل ہونے کو جی چاہتا ہے تو وہ شراب پیتے ہیں، شراب نوشی سے بالآخر صحت خراب ہو جاتی ہے۔ میں جسمانی صحت کو ہر چیز پر مقدم رکھتی ہوں۔ ورزش کی عادی ہوں۔ برج محض جوا ہے۔ یورپین ناچ سے بھی مجھے نفرت ہے۔ مجھے اس میں کوئی ہنر اور حُسن نہیں معلوم ہوتا۔ میرے خیال میں تو لوگ اس کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اس سے جذبات ردیہ میں ایک اشتعال پیدا ہوتا ہے اور یہی اعصاب کے لئے سخت مضر ہے۔ عشق سے مجھے نفرت ہرگز نہیں

لیکن اس کے متعلق میرا نظریہ کچھ اور ہے" خورشید یہ کہہ کر مسکرائی اور پہلے ڈگلس کی طرف اور پھر فریدوں کی طرف اُس نے معنی خیز نظر سے دیکھا

ڈگلس نے شرارت سے کہا "نہیں نہیں فرماتے جائیے شرمانے کی کوئی بات نہیں آپ تو ہر چیز کو طبی نظر سے دیکھتی ہیں"

خورشید پہلے تو نہ شرمائی تھی لیکن ڈگلس کے اس فقرے پر وہ واقعی شرما گئی اس نے بمشکل اپنی نسائی فطرت کو مغلوب کر کے پھر بولنا شروع کیا" یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی مرد نے کسی عورت کو دیکھا یا کسی عورت نے کسی مرد کو دیکھا اور بس عشق ہو گیا۔ ہُو، ہا کرنے لگے۔ میرے خیال میں یہ دونوں ایک دوسرے کو اور شاید اپنے اپنے نفس کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔ یہ تیر نظر اور پیکان ابرو میری سمجھ میں نہیں آتے۔ پھر یہ ہوں بھی تو لگتے کہاں ہیں وہ جگہ مجھے کہیں نظر نہیں آتی"۔ یہ کہہ کر خورشید خوب ہنسی اور پھر ذرا سنبھل کر متانت سے اس نے بولنا شروع کیا" میں جسم انسانی کی تشریح سے اچھی طرح واقف ہوں۔ سائیکالوجی (فلسفہ جذبات) اور اناٹمی (علم تشریح) کا میں نے خوب مطالعہ کیا ہے۔ مجھے اس قسم کے بے غرض جذبہ کا کہیں پتہ نہیں لگتا ہے جسے لوگ عشق کہتے ہیں جسم کی تمام رغبتیں جسمانی ہیں۔ محبت بھی اُنھیں میں سے ایک ہے، اور یہ شدت سے جسمانی ہے"

اس تقریر سے فریدوں کے دل میں ایک چوٹ سی لگی اعصاب اس طرح جھن سے ہو کر رہ گئے جیسے ستار کے تاروں پر کسی نے بے قاعدہ ہاتھ مار کر چھوڑ دیا۔ اس نے دل میں کہا یہ حکیم سے عشق کیونکر نبھے گا!"

خورشید نے فریدوں کی اس حالت کو محسوس کیا اور دل میں ہنسی۔ مگر فریدوں بھی جوان رعنا تھا۔ کیسا جسیم اور کیسا حسین! خورشید محبت کی قائل نہ ہو، اس کو نفسانی میلان کہے لیکن اس کی نسائیت بھی فریدوں کی رعنائی اور وجاہت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ خورشید نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی اور ساتھ جمائی بھی آئی۔ اس کے بھرے ہوئے سینے کا پورا اُبھار نمایاں ہو گیا سینہ پر ہاتھ رکھ کر جو سیدھی ہوئی تو نیند کے خمار سے آنکھوں کی پتلیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ فریدوں کے دل پر بجلیاں گر پڑیں۔ ڈگلس نے خورشید کی طرف ہوسناک نظروں سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہدیا۔ خورشید نے میز کی آڑ سے اس کو ٹھینگہ دکھایا۔ ڈگلس قہقہہ لگا کر بولا" ارے توبہ! فریدوں تم نے کچھ اور بھی سُنا انہوں نے انگلستان میں لٹھ بازی کی مشق کی ہے اور اپنے دوستوں کے کان پر اکثر اس مشق کو تازہ کرتی ہیں۔ میں تمہیں متنبہ کئے دیتا ہوں"

فریدوں نے حیرت سے پوچھا" کیا واقعی؟"

ڈگلس نے کہا" واقعی" اور پھر خورشید کی طرف دیکھا۔

خورشید نے مسکرا کر نظر نیچی کر لی اور آہستہ سے بولی" بوکسنگ لٹھ بازی! کیا میں نے تو فینسنگ (تلوار کا فن) بھی سیکھا ہے۔ ہر شخص کو حفاظت خود اختیاری کے فنون سیکھنے چاہئیں"۔ خورشید یہ کہتی ہوئی اُٹھی" اب اجازت دیجئے نیند آرہی ہے۔ گیارہ بجنے کو ہیں"۔ اس کے ساتھ ہی ڈگلس اور فریدوں بھی اُٹھے فریدوں نے دونوں کو رخصت کیا۔

ڈگلس دو چار روز کے بعد چلا گیا لیکن فریدوں اور خورشید ٹھہرے گھوڑدوڑ کے علاوہ سیر و تفریح بھی اُن کا مقصد تھا۔ اس دوران میں فریدوں اور خورشید کے تعلقات بہت بڑھ گئے۔ دونوں نے بنگلور کا سفر بھی ساتھ ہی کیا ساتھ ہی ساتھ ریس دیکھنے جاتے، ساتھ ہی ساتھ ٹہلنے جاتے۔ دن کا زیادہ حصہ ایک جگہ بیٹھ کر گزرتا۔ کبھی فریدوں کے کمرے میں اور کبھی خورشید کے کمرے میں۔

فریدوں خورشید کے عادات و خصائل دیکھ دیکھ کر حیران تھا۔ ایک عجیب قسم کی خودداری کہ اُس کو اگر تکبر بھی کہدیں تو بے جا نہیں۔ حرکات و سکنات میں کچھ مردانہ بیباکی سی، ہر معاملے میں خود رائے، اپنے دماغی اور جسمانی قوٰی پر پورا اعتماد، استے تعلقات کے باوجود فریدوں کا چھوٹا سا احسان بھی گوارا نہیں۔ پھر نہایت خوش وضع ہونے کے باوجود نسائی دل آویزیاں بدرجۂ اتم موجود۔ فریدوں خورشید سے مرعوب ہو گیا۔ مگر ہوسیں روز بروز ترقی پر تھیں اپنے خیال میں فریدوں صاحب خورشید پر عاشق ہو گئے۔ لیکن خورشید فریدوں سے اسی دوستانہ بے باکی سے ملتی رہی۔ جب جی چاہتا فریدوں کو بُلا بھیجتی۔ اُس کے ساتھ ٹینس کھیلتی، اس کے ساتھ میلوں ٹہلتی مگر صنفی رغبتوں کا اُس کی طرف سے کوئی اظہار نہ ہوا۔

فریدوں دن میں دس دس مرتبہ ہمت باندھتا کہ آج جو دل میں ہے سب کہدوں گا، خورشید نہ کھنچتی تھی نہ شرماتی تھی، نہ اس کو کسی گفتگو سے باک تھا مگر فریدوں ہر دفعہ اظہار تمنا میں ناکام رہا۔ خورشید کا ہر بات کو نئے زاویۂ نگاہ

سے دیکھنا فریدوں کو سہانے ہوئے تھا۔

ایک روز شب کو، کھانے سے بہت دیر بعد، فریدوں معمولی مطالعے سے فارغ ہو کر سونے کا ارادہ کر رہا تھا کہ خورشید آ گئی۔ ایک مہین سوتی سفید ساری پہنے ہوئے۔ اسی کپڑے کی بٹنوں دار پھنسی ہوئی چولی، کپڑا نہیں محض کپڑے کا دھوکا۔ اس کے جسم کا گلابی رنگ اُس میں سے صاف جھلک رہا تھا۔ لاأبالی انداز سے شانوں پر ساری کا آنچل پڑا ہوا۔ وہ بے تکلفی سے آرام کرسی پر دراز ہو گئی اور ساری کا آنچل جو شانوں پر پڑا ہوا تھا ہاتھ میں لے لیا اور اسکو چوری کی طرح ہلانے لگی۔ فریدوں کو نشہ سا ہو گیا یکبارگی وہ کرسی سے اٹھا اور خورشید کے پیروں پر اس نے سر رکھدیا۔ خورشید زور سے ہنسی "ہائیں یہ کیا، ارے سیدھے ہو کر بیٹھو یہ کیا حماقت ہے! ارے ارے بات تو کہو" خورشید نے جھک کر فریدوں کا سر اپنے پیروں پر سے اُٹھایا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "کیا جنون ہو گیا ہے؟"

"مجھے تم سے عشق ہے"۔

'مجھے تم سے عشق ہے' منہ چڑا کر تحقیر کے لہجے میں خورشید نے فریدوں کی نقل کی "احمق آدمی' یہ فضول باتیں کسی شاعرہ سے کرنا وہی تمہیں خوب داد دے گی۔ وہ تمہیں احمق بنائے گی تم اسے احمق بنانا میں ان بے معنی باتوں کی قائل نہیں ہوں۔ عشق ہے تو عشق کرو۔ میں نے عشق کرنے کو کب منع کیا ہے۔ مجھے دیکھا کرو، شعر کہا کرو، یہ بے قراریاں کا ہے کے لئے ہیں' یہ پیروں پر سر کیوں رکھا جا رہا ہے۔ وہی جسمانی ضرورت، وہی نفسانی طلب، میں حیران ہوں لوگوں کو حقیقت سے اس قدر گریز کیوں ہے؟۔ فریدوں، ادھر میری طرف دیکھو اور میری ایک ایک بات کا جواب دیتے جاؤ"

فریدوں کچھ سہما ہوا سا اُٹھ کر مسہری کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

خورشید:۔ تمہیں مجھ سے کیوں عشق ہے؟

فریدوں:۔ (آہستہ سے) "تم بہت خوبصورت ہو"

خورشید:۔ (مسکرا کر) "خوبصورتی کا تعلق صرف دیکھنے سے ہے تم مجھے جب چاہو دیکھ سکتے ہو میرا تم سے پردہ کرنے کا ارادہ نہیں ہے"

فریدوں نے کوئی جواب نہ دیا

خورشید:۔ (ہنسی کو ضبط کر کے) کیا آپ شرما رہے ہیں؟

فریدوں بدستور چپ ہے۔

خورشید کو ہنسی آ گئی وہ اضطراراً کرسی سے اُٹھی۔ اس کی ساری کا بالائی حصہ شانوں سے ڈھلک کر کچھ کرسی کے بازو میں اُلجھا اور کچھ فرش پر گرا وہ اسی طرح آگے بڑھی۔ ایک ہاتھ اس نے فریدوں کے شانے پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کو کیا۔ فریدوں نے دونوں ہاتھ خورشید کی کمر میں ڈال دیئے۔ خورشید نے دونوں ہاتھوں سے فریدوں کو پیچھے دھکیلا۔ دونوں چت کر مسہری پر گرے اور دیر تک اس طرح پڑے رہے جیسے بے ہوش ہوں۔

بالآخر خورشید نے ایک نرم قہقہے کے ساتھ کہا "بس اب سیدھے ہو کر بیٹھو بہت عشق ہو لیا"۔ اس نے بمشکل فریدوں کو الگ کیا۔ سانس چڑھی ہوئی، دل دھک دھک کر رہا ہے، ہاتھ پیروں میں سن سناہٹ، بال بکھرے ہوئے، ساری پیروں میں لپٹی ہوئی، اس حال سے وہ کرسی پر آ کر گر گئی۔

ایک ہاتھ سے اس نے بال درست کئے دوسرے ہاتھ سے ساری سمیٹ کر بے پروائی سے سینے پر ڈال لی۔ فریدوں وہیں مسہری کے تکیے سے لگ کر بیٹھ گیا۔

جب ذرا حواس بجا ہوئے تو خورشید ہنس کر بولی "فریدوں اب بتاؤ یہ وہی عشق ہے جسے تم کوئی روحانی یا دماغی رفعت سمجھتے ہو یا جیسا میں کہتی ہوں محض جسمانی طلب ہے؟ اگر تم اب بھی یہ کہدو کہ تم بس اسی حد پر قناعت کرو گے تو میں بہت سی مخالف دلائل کے باوجود میں عشق کے اس شاعرانہ تخیل کی قائل ہو جاؤں جس پر تمہارے ادب اور شاعری کی بنیاد ہے۔ کہو"

فریدوں نے مسکرا کر نیچے نظر کر لی

خورشید نے اپنے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر پھر کہنا شروع کیا۔

"تم کہو گے کیا تمہارے دل و دماغ میں اور رہر بن مو میں خواہشوں کا ایک جہنم بھڑک رہا ہے۔ میں تمہیں ملامت نہیں کرتی، خود میری بھی یہی حالت ہے میں اپنی حالت ہی سے تمہاری حالت کا اندازہ کر رہی ہوں۔ تم جانتے ہو میں نے ساری عمر انسان کی جسمانی حالت کا مطالعہ کیا ہے۔ محض پیشے کے طور پر

نہیں بلکہ شوق سے، طالبعلمانہ، محققانہ، اور اب بھی اسی میں مصروف ہوں۔ ابھی یہ جو کچھ ہوا سب مطالعہ تھا۔

فریدوں معنی خیز انداز میں مسکرایا خورشید جھینپ گئی مگر پھر سنبھل کر اس نے سلسلۂ تقریر شروع کیا " میں نے جس وقت سے تمہیں ریس کورس میں دیکھا ہے مجھ پر بھی وہی کیفیت طاری ہے جسے تم عشق کہتے ہو مگر میرا یہی رغبتوں اور میلانات کے دھوکے میں نہیں آتی۔ میں نے اپنی خواہشوں اور تمناؤں کا خوب تجزیہ کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ کسی نامعلوم جسمانی مناسبت اور نفسانی پسند کی وجہ سے میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمہیں اپنے لئے مخصوص کر لوں۔ یہی تمہارا بھی حال ہے۔ تم اپنے نفس کو اور مجھے دھوکا دیتے ہو میں یہ نہیں کرتی "

فریدوں نے طعن سے کہا" محض جسمانی ضرورت کے لئے تخصیص اور انتخاب کی کیا ضرورت ہے ؟"

خورشید نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا" ہاں اگر سطحی نظر سے دیکھئے تو یہ اعتراض ہو سکتا ہے مگر غلط ہے۔ جسم ہر قسم کے کپڑے سے ڈھک جاتا ہے پھر یہ کیوں ہے کہ پوری دوکان میں سے آپ نے سوٹ کے لئے کسی خاص ہی وضع کا کپڑا پسند کیا۔ تمہیں گھوڑے کا شوق ہے۔ اگر تم گھوڑا خریدنے جاؤ تو ہر اس گھوڑے کو نہیں خرید و گے جو پہلے تمہارے سامنے آجائے حالانکہ ہر گھوڑا سواری دینے کی قابلیت رکھتا ہے۔ گھوڑا خریدنے کے ارادے کے ساتھ تمہارے ذہن میں بلا ارادہ اس گھوڑے کا تصور پیدا ہوگا جو تمہیں مرغوب ہے اور پھر اسی تصور کے مطابق تم تلاش کرنا شروع کرو گے یہاں تک کہ ویسا ہی یا قریب قریب ویسا ہی نہ مل جائے۔ اور جس وقت وہ مل جائے گا تم اس پر فریفتہ ہو جاؤ گے۔ ہر شخص ہر چیز کا انتخاب اپنے مذاق طبیعت کے مطابق کرتا ہے۔ مذاق طبیعت اسی تصور کا نام ہے جو ہر مطلوبہ چیز کی ضرورت پیدا ہونے کے ساتھ دماغ میں آتا ہے۔

میں نے سارے یورپ کی سیر کی ہے ہندوستان میں بھی بہت پھری ہوں۔ کونے کونے کی بیٹھنے والی شرمیلی کنواری لڑکی نہیں ہوں۔ گو کنواری ضرور ہوں" یہ کہہ کر وہ بہت ہی شریر انداز سے ہنسی " ہر طبقے کے مردوں سے میرے دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے حسین و رعنا جوان بھی تھے اور بعض عورتوں کے نزدیک وہ تم سے کہیں زیادہ دلفریب ہوں گے ان میں سے بعض نے میری طرف دست ہوس بھی دراز کیا مگر (ٹکہ دکھا کر) میں نے اُن کی اس سے تواضع کی۔ وہ میرے مذاق طبیعت کے مطابق نہ تھے۔ مذاق طبیعت کی تشریح یہ ہے کہ سارڈین مچھلی پر انگریز جان دیتا ہے۔ اس کی بُو سے اس کو بھوک لگتی ہے۔ لیکن اگر ہندوستانیوں کے مجمع میں تم اس کا ٹین کھول دو تو کئی کو استفراغ ہو جائے گا۔ ان کی طرف سے اظہار رغبت پر میری بھی یہی حالت ہوئی "

" مگر میں نے جس وقت سے تمہیں دیکھا ہے جسمانی اشتہا ترقی پر ہے۔ تم اسی کیفیت کو یوں بیان کرو گے کہ دل ہاتھ سے جاتا رہا، تیر مژگان نے کلیجہ چھلنی کر دیا، سوز فراق سے جل رہا ہوں "

میں نے جو غور کیا تو تم اس تصور سے بہت مشابہ ہو جو مرد کے متعلق میرے ذہن میں تھا۔ اگر تمہاری رغبت ہنگامی نہیں ہے تو تم بھی ذرا دماغ پر زور ڈالو بہترین عورت کے متعلق جو تمہارا تخیل ہے میں اُس سے قریب تر نکلوں گی "

اس دوران میں مجھے بھی ایک مرتبہ دھوکا ہوا کہ مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے اور یہ جذبہ جسمانی اور نفسانی میلانات سے بالکل الگ ہے اور کچھ ایسا معلوم ہوا کہ میرا ساری عمر کا نظریہ غلط ہوا جا رہا ہے مگر میں نے فوراً تہیہ کر لیا کہ بغیر کامل تفتیش کے اپنی رائے نہ بدلوں گی "

" میں آج نا وقت اور راس وجہ سے" یہ کہہ کر وہ پھر ہنسی مگر اس مرتبہ حیا کے ساتھ " تمہارے کمرے میں اسی تفتیش کی تکمیل کے لئے آئی تھی۔ ابتدائی منازل سب میرے ذہن میں ہیں ان میں ہر ایک آپ کے سے لوگوں کے لئے مضمون شعر ہے۔ تمہارے ہی الفاظ میں اُن منازل کا نام یوں تو وہ یہ ہوئیں۔ شوق دیدار، بس ایک جھلک، پھر نظر بھر کر، پھر جی بھر کر، تصور کئے بیٹھے رہیں اسی میں ساری عمر گزر جائے، اس کے بعد میں تجھے دیکھا کروں اور تو مجھے دیکھا کرے، گویا مشاہدۂ دوام۔ اس سے بھی تجاوز کرنے کو جی چاہا اور نفس نے یہ دھوکا دیا کہ پھر کوئی تمنا نہیں ہو سکتی۔ میں جانتی تھی کہ یہ جھوٹ ہے مگر میں آئی اور میں نے اس فریب کو بھی دور کر دیا " خورشید مسکرائی اور نیچی نظر کر کے شوخی سے بولی" شاید تمہیں تو اب کوئی اور تمنا نہ ہوگی؟ کیوں؟ -

فریدوں نیچے کا ہونٹ دانتوں میں دبا کر مُسکرایا اور خورشید کو اُس نے پُرہوس نظروں سے دیکھا۔

"نہیں نہیں آپ کو تو محض عشق ہے! حُسن کا پاکیزہ اشتیاق، دل کی لطیف وارفتگی، خیال کی رنگین مصروفیت" یہ کہہ کر خورشید زور سے ہنسی اور پھر بولی "کیوں فریدوں تم نے وینس کا بُت تو دیکھا ہے۔ کیا اس کا ہر عضو میرے ہر عضو سے زیادہ حسین نہیں ہے؟ کیا تمہارے دل میں اُس کے لئے بھی یہی بیقراریاں پیدا ہوئیں۔ جن کا ابھی اظہار ہو رہا تھا۔ جب عشق نفسانی طلب اور جسمانی ضرورت سے کوئی بلند تر چیز ہے تو تم نے وہیں دھونی رمائی ہوتی۔ اُسی کے پیروں پر سر رکھا ہوتا، اسی کو سینے سے لگایا ہوتا۔ اور اُسی کے بوسے لئے ہوتے۔ مگر وہ ٹھنڈا سفید پتھر تمہارے گرم جذبات کا جواب دینے کے قابل کہاں تھا۔ ذرا مجھے بتاؤ، تم نے کبھی سُنا ہے کہ کسی بوڑھی عورت نے اپنے بوڑھے شوہر کی موت پر خودکشی کرلی، یا بوڑھے مرد نے بوڑھی بی بی کی ناگہانی موت کو ناقابل برداشت محسوس کیا اور گولی مار لی۔ حالانکہ ان میں سے اکثر اپنی جوانی میں لیلےٰ مجنوں اور شیریں فرہاد ہوتے ہیں۔ یہ کیوں ہے کہ اس قسم کے حادثات صرف نوجوانوں ہی کے متعلق سُنے جاتے ہیں؟ یہ سب اسی آب و رنگ اور جوانی کی ترنگ کے کرشمے ہیں، جہاں یہ موج فرو ہوئی یہ جذبات کی طغیانی پایاب ہو جاتی ہے۔ جسم کے تمام میلانات جسمانی ہیں۔ ان کا وجدان اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ یقیناً روح کی رغبتیں بھی کچھ ہوں گی مگر میں ان سے واقف نہیں" خورشید نے فتحمندانہ تیور سے فریدوں کی طرف دیکھا اور ہنسکر بولی "میری جسمانی اور مادّی تحقیقات ختم ہولے تو پھر روحانی میلانات کی بھی تفتیش کروں گی۔ کسی صوفی کی شاگرد بنوں گی"

چھت کا برقی پنکھا برابر چل رہا تھا مگر کمرے کے وسط میں چونکہ مسہری بچھی ہوئی تھی اس لئے خورشید کی کُرسی تک ہوا اچھی طرح نہیں پہنچ رہی تھی۔ ذرا حبس جو ہوا تو خورشید کو پسینہ آگیا۔ اس نے گھبرا کر پہلے اِدھر اُدھر تلاش کیا اور پھر اپنے بائیں پہلو کے نیچے سے رومال کھینچا "اُسے ہے کیسی گرمی ہوگئی ہے!" پیشانی اور رخساروں کا پسینہ پونچھا اور پھر گورے گورے گول گداز بازوؤں پر، سڈول کلائیوں پر اور ڈھلواں شانوں پر اس کو پھیرنے لگی۔ جسم کے جس حصے میں ذرا سا پسینہ آگیا تھا وہ حباب سی ساری چھٹ کر معدوم ہوگئی تھی۔ فریدوں نے جلدی سے میز کے پنکھے کا رُخ خورشید کی طرف کرکے اس کو تیز چلا دیا مگر ہاتھ کہیں اور نظر کہیں اور۔ فریدوں کی یہ حالت دیکھکر خورشید کو ہنسی آگئی۔ اُس نے دانتوں میں اپنا ہونٹ دبالیا اور اس طرح جیسے دیکھا ہی نہیں دونوں ہاتھ سر سے اوپر کُرسی کے تکئے پر دراز کرکے آنکھیں بند کرلیں۔ گویا پسینہ تھا ٹھنڈی ہوا بہت ہی اچھی معلوم ہوئی۔

فریدوں وہیں میز سے لگ کر چُپ کھڑا ہو گیا۔ اِدھر بھی عالم تصویر، اُدھر بھی عالم تصویر۔ خورشید کی آنکھیں بند تھیں اور فریدوں متحیر اُس کو تک رہا تھا۔ فریدوں نے دل میں کہا "احمق کہتی ہے کہ میں وینس کے پیر کے تلوے کی بھی پرستش نہیں ہوں" اور اس خیال کے ساتھ اُس نے سینے پر ہاتھ رکھکر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ خورشید کو پھر ہنسی آئی مگر اُس نے پھر ضبط کیا اور اس طرح ایک طرف کو سر ڈھلکا دیا جیسے سو گئی۔ سانس کی آمد و رفت کا بھی وہی انداز جو نیند میں ہوتا ہے۔ رات زیادہ گزر چکی تھی اس طرح نیند آجانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اس حالت کو بھی ایک بیس منٹ گزر گئے۔ فریدوں کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ اس تلاطم جذبات میں جس کا خورشید سے اضطراراً کئی دفعہ اظہار ہوا نیند کیسے آگئی۔ اس نے آہستہ سے ایک چھوٹی بید کی کُرسی اُٹھا کر خورشید کے قریب بچھائی اور اس پر خاموش بیٹھ گیا۔

جب اس طرح بھی کوئی دس منٹ گزر گئے تو انگڑائی لیکر خورشید نے اپنی خمار آلود آنکھیں کھولدیں اور دونوں ہاتھ فریدوں کی طرف بڑھا کر اُس کو پُرمحبت نظروں سے دیکھا۔ فریدوں اُٹھا اور جسم بیجان کی طرح خورشید کے اوپر گر پڑا۔ خورشید نے ایک ہاتھ فریدوں کی پُشت پر رکھ لیا اور دوسرا ہاتھ اُس کے بالوں پر پھیرنے لگی۔ وفورِ جذبات سے فریدوں کی آنکھیں بند ہونے لگیں دماغ پر ایک نیم خوابی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

فریدوں کے اس اشتیاق اور شدتِ جذبات سے خورشید کے دل میں ایک عجیب مسرت اور انبساط کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس نے یکبارگی فریدوں کے گداز طاقتور بازو پکڑ کر اوپر کھینچا اور اس کا سر اپنے سینے سے اُٹھا کر دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر اپنی پیشانی فریدوں کی پیشانی سے متصل کرکے بولی "بہت محبت ہے" اور مُسکرائی۔ فریدوں نے اپنا سر خورشید کے شانے پر رکھدیا۔

وہ بغیر اس خوشبو کے اب ایک سانس بھی نہیں لینا چاہتا تھا جو کسی عمدہ قسم کے فرانسیسی پوڈر اور خورشید کے پسینے سے مرکب ہو کر آرہی تھی۔ خورشید نے بھی اپنے دونوں ہاتھ فریدوں کے گرد حلقہ کر دیئے اور اس اُمنگ کی کیفیت میں گم ہوگئی جو اس کی رگ و پے میں ساری تھی۔

بڑی دیر کے بعد خورشید نے اپنی کلائی نظر کے سامنے کر کے گھڑی دیکھی "اُو دو بج گئے" نرمی سے اُس نے فریدوں کا شانہ ہلایا "بس اب ہٹو میں جاؤں گی۔"

فریدوں نے اس کے جواب میں اضطراری حرکات شروع کیں۔

"آئے واہ واہ کیا خوب!" یہ کہہ کر خورشید نے فریدوں کو دونوں ہاتھوں سے پوری قوت کے ساتھ دھکیلا اور کُرسی کے بازو پکڑ کر سیدھی بیٹھ گئی۔ فریدوں پھسک کر فرش پر آرہا اور کھسیانہ ہو کر ہنسنے لگا "تم ہی تو کہتی ہو کہ یہ سب جسمانی طلب ہے۔"

خورشید نے تیور پر بل ڈال کر طنز سے کہا "جی ہاں اس لئے کہتی ہوں کہ آپ آزادی سے اپنی ہوسیں پوری کریں" یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوگئی، ساری درست کی، بال یکجا کر کے آدھے آدھے کئے اور دونوں شانوں پر ڈال لئے، ساری کے سوٹ کے ساتھ بھی بالوں کے متعلق اس کا اس کی یہی دستور تھا، اور چلنے لگی۔ فریدوں نے بیٹھے ہی بیٹھے پیچھے سے اُس کی ساری کا آنچل پکڑ لیا۔ خورشید نے پلٹ کر دیکھا اور بظاہر غصہ سے بولی "چھوڑو جی جانے دو" فریدوں نے کچھ نہ کہا اور سر جُھکا کر ساری کو اور زور سے پکڑ لیا خورشید پھر پیچھے ہٹ کر اپنی کُرسی پر بیٹھ گئی "اچھی بات ہے میں بھی یونہی بیٹھی ہوں دیکھوں کب تک نہ چھوڑو گے" لہجے میں ابھی تلخی باقی تھی۔ فریدوں نے اپنا سر خورشید کے گھٹنوں پر رکھدیا، خورشید کو ہنسی آگئی "عجیب آدمی ہو!"

فریدوں نے آہستہ سے کہا "تم خفا ہوگئیں"

"نہیں میں خفا نہیں ہوں، باؤلے مت بنو سامنے کُرسی پر جا کو بیٹھو، میں جاؤں گی نہیں۔ تم سے باتیں کرتی ہوں"

فریدوں اس کی ساری چھوڑ کر خاموش کُرسی پر جا بیٹھا۔

خورشید بہت متانت سے بولی "فریدوں شاید تمہیں تعجب ہوگا مردوں سے اس قدر اختلاط کے باوجود میں نے اور کسی کو تپاک کی عام حدود سے بھی تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دی۔ میں نے ہمیشہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ کچھ گناہ کے خوف سے نہیں۔ میں کسی مذہب کی پابند نہیں ہوں۔ مگر چونکہ ماں باپ کا مذہب زرتشتی تھا اس لئے لوگ مجھے بھی اسی مذہب کا پیرو سمجھتے ہیں۔ مجھے اس کی تردید کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوئی، مگر میں اس اجتماعی خلفشار کی بھی نہیں ہوں جو شاید کمیونزم کے اثر سے روز بروز ذہن میں مقبول ہو رہا ہے۔ سوسائٹی نہ ہوئی جانوروں کا غول ہوگئی میں شادی کو بہت ضروری سمجھتی ہوں اور طرفین کو طلاق کا حق حاصل ہونے کے ساتھ زن و شوہر کے معاملے میں دائمی تخصیص کی مؤید ہوں۔ اور دوسری اہم اصولوں سے قطع نظر یہ بالخصوص اس لئے کہ اولاد کے حقوق کی حفاظت ہو جائے۔ میں عورتوں اور مردوں کے غیر مُعین تعلقات کی شدت سے مخالف ہوں، جُرم سمجھتی ہوں۔ ماں اس کی ذمہ دار ہے کہ اولاد کو اس کے باپ کا پتا بتائے اور امکان ولادت سے قبل اس کا قانونی تحفظ کرے کہ باپ پدری فرائض انجام دینے سے انکار نہ کر سکے۔ میں ان غیر ذمہ دارانہ اور اضطراری حرکات کی قائل نہیں ہوں جن کے آپ در پئے ہیں۔"

فریدوں نے نادم ہو کر کہا "میں تو تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"

خورشید نے مستعدی سے جواب دیا "میں آمادہ ہوں۔ میں نے پہلے ہی بلا تصنع تم پر اپنے جذبات کا اظہار کر دیا ہے۔ میں خود اپنے میلان کی بنا پر تمہیں اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتی ہوں لیکن چند شرائط ہیں اگر وہ تمہیں منظور ہوں تو کل یہیں معاہدہ رجسٹری ہوگا اور شادی ہو جائے گی۔"

فریدوں نے نہایت بے صبری سے کہا "مجھے سب شرائط منظور ہیں۔"

"نہیں نہیں ایک ایک غور سے سُنیئے اور منظور کیجئے وہ شرائط رجسٹری ہونگی"

"اچھا کہئے صاحب کہئے۔ آپ آدمی نہیں جن ہیں۔"

خورشید نے مسکرا کر کہا "جی ہاں آج میں جن ہوں پرسوں سے آپ جن ہو جائیں گے" اور پھر چہرے پر متانت پیدا کر کے بولی "اچھا سُنیئے"

(۱) میں اپنا نام ترک نہیں کروں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنے نام کے ساتھ تمہارا نام بھی شریک کر لوں۔ یعنی خورشید فریدوں کہلاؤں۔

(۲) میں تمہارے خانگی انتظامات کی ذمہ دار نہ ہونگی۔ ایک ہی مکان میں

یا علیحدہ علیحدہ مکان میں میرے اور تمہارے خانگی انتظامات بالکل
جداگانہ ہوں گے۔

(۳) میں اپنا مطب (پریکٹس) جاری رکھوں گی۔ جو کماؤں گی اسے جس طرح
چاہوں گی صرف کروں گی۔ میں تم سے اپنی ضروریات کے لئے کچھ نہ لوں گی۔

(۴) میں جن لوگوں سے چاہوں گی ملوں گی۔ سفر کے لئے یا کسی کام کے لئے
تمہاری اجازت حاصل کرنا ضروری نہ ہوگا۔

(۵) بچوں کی پرورش، تعلیم اور ان کے جملہ اخراجات کے ذمہ دار تم ہوگے
اور ان ذمہ داریوں کے اندازے اور تعین کا حصر مجھ پر ہوگا۔

(۶) زن و شو کے طبعی تعلقات میں مجھے اور تمہیں مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔
تم کسی اور عورت کو میرا شریک نہ کرو گے اور میں بھی تمہیں اپنا تنہا
حقدار سمجھوں گی۔ اگر اس جرم خیانت کا ہم میں سے کوئی مرتکب ہوگا تو
ثبوت ملنے پر فوراً میرے اور تمہارے تعلقات منقطع ہو جائیں گے اور
ہم میں سے جو شخص قصوروار ہوگا وہ اپنی پوری دولت کا نصف حصہ
جس میں نقد، منقولہ اور غیر منقولہ ہر قسم کی جائداد شامل ہے فریقِ
ثانی کو دیگا۔ اس صورت میں بھی اولاد کی پرورش کی ذمہ داری
تم ہی پر عائد رہے گی۔

اتنا کہہ کر خورشید خاموش ہوگئی۔

فریدوں نے مسکرا کر کہا "بس"

خورشید نے متانت سے جواب دیا "بس"

فریدوں نے ذرا سوچکر کہا "مجھے سب شرائط منظور ہیں مگر تین شرائط
کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں"

خورشید سنبھل کر بیٹھ گئی اور بہت ہی سنجیدگی سے جیسے کوئی اہم معاملہ
درپیش ہے اور واقعی یہ معاملہ اُس کے نزدیک اہم ہی تھا بولی "کیا"

"دو دفعات کی ترمیم چاہتا ہوں اور ایک کی تشریح۔ ترمیم یہ کہ اگر
میں اضطراراً (مسکرا کر) خیانت کا مرتکب ہوں تو تم الگ نہ ہوگی۔ جرمانے میں
نصف دولت مجھے دینا گوارا ہے اور دوسرے یہ کہ میرا اور تمہارا بادرچیخانہ اور
خانگی انتظام ایک ہوگا۔ یہ اس لئے نہیں کہ خانگی ذمہ داریوں کا تم پر بار ڈالنا
مقصود ہے بلکہ بغیر اس کے لطفِ زندگی حاصل نہیں ہوسکتا"

خورشید نے ذرا تامل کے بعد کہا "اور تشریح کس دفعہ کی مطلوب ہے؟"

"تشریح اس کی چاہتا ہوں کہ میرے روپے سے اپنی ذات کے لئے
اسقدر پرہیز کیوں اور پھر ان سخت حد بندیوں کے ساتھ بچوں
کے جملہ اخراجات کا ذمہ دار تنہا مجھی کو کیوں قرار دیا"

"تمہارے روپے سے پرہیز نہیں ہے بلکہ میں نے اس معاملے میں انصاف
کیا ہے۔ جب میں تمہارے خانگی انتظامات کا بار اپنے سر لینے کے لئے تیار نہیں
ہوں اور اپنا مطب جاری رکھنا چاہتی ہوں تو تمہارے روپے پر میں اپنا کوئی حق
نہیں سمجھتی۔ بچوں کی پوری ذمہ داری تم پر اس لئے رکھی گئی ہے کہ اگر میں اس میں
بھی شرکت کروں تو تم اپنا سب روپیہ ضائع کرو گے اور میں ماں ہونے کی حیثیت
سے جو زیادہ سے زیادہ ممکن ہوگا وہ بچوں کے لئے محفوظ رکھوں گی۔ اس طرح پر تمہارے
روپے سے ان کی پرورش اور تعلیم ہوگی اور میرا بچایا ہوا روپیہ ان کا سرمایہ ہوگا"

فریدوں نے زور سے قہقہہ لگایا "اچھا آپ کے خیال میں اولاد سے
باپ کو بالکل محبت نہیں ہوتی"

خورشید نے پُر زور لہجے میں کہا "بالکل نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنی
اضطراری حرکات کے نتائج کا بھی اسی طرح ذمہ دار ہوتا جس طرح وہ غریب مائیں
ہوتی ہیں جو جذبات کے ہنگامی دور سے مغلوب ہوکر اپنی زندگیاں خراب کر لیتی ہیں"

"بہت اچھا صاحب اب ترمیمات کے متعلق فرمائیے"

"پہلی ترمیم کے متعلق میرا جواب قطعی صاف ہے" خورشید نے اپنے سر
کو حرکت دیکر نہایت متانت سے کہا "میں اضطراری اور عارضی حرکات کی نہ
قائل ہوں نہ ان کا استثنٰی کر سکتی ہوں اور اگر آپ کوئی استثنٰی چاہتے ہیں تو وہ
میرے لئے بھی ہوگا" آخری جملہ اس نے مسکرا کر ادا کیا۔

"نہیں نہیں نہیں، ارے توبہ، نہیں ہرگز نہیں" فریدوں نے آخری
الفاظ کہتے وقت اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور پھر ذرا توقف کے بعد اس طرح
جیسے اس بات سے کوئی تعلق ہی نہیں دھیمی آواز میں مگر جوش کے ساتھ یہ گایا۔

با سایہ ترا نمی پسندم
عشق است و ہزار بدگمانی

خورشید مسرت سے ہنسنے لگی۔

فریدوں نے پھر ذرا تامل کے بعد سوال کیا "اچھا دوسری ترمیم کے متعلق

کیا کہتی ہو؟

خورشید نے مسکرا کر مگر استقلال کے ساتھ جواب دیا " معاہدے میں تو وہ قائم رہے گی لیکن عملاً اگر مجھے خوشگوار معلوم ہوا تو اشتراک ممکن ہے "

اور پھر تشفی آمیز لہجہ میں بولی " فریدوں میں تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں کرنی چاہتی صرف مجھے اپنی ذات کو اور بچوں کو ناانصافی سے محفوظ کرنا منظور ہے ۔ میں عشق کی یقیناً قائل نہیں لیکن ساتھ رہنے اور باہمی دلداری سے جو اخلاص پیدا ہوتا ہے اس کو مانتی ہوں ۔ جس وقت میرے اور تمہارے درمیان یہ حالت پیدا ہو جائے گی تو یہ معاہدہ از خود بیکار ہو جائیگا ، تمہیں پریشانی کیوں ہے ؟ "

فریدوں نے ذرا ندامت سے کہا " نہیں نہیں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے سب شرائط منظور ہیں " اور پھر لجاجت سے بولا " مگر ایک شرط میری بھی منظور کرو "

خورشید اپنی ساری کو درست کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی لبوں پر مسکراہٹ نظریں ترچھی " کیا ؟ "

فریدوں اٹھ کر اس کے پاس آ گیا ۔ گلے میں باہیں ڈال دیں اور کان کے قریب منہ کر کے آہستہ سے بولا " اسی کرسی پر پھر تم اسی طرح سو جاؤ میں دور سے بیٹھ کر دیکھتا رہوں گا ۔ اب میں تم سے ایک لمحہ بھی الگ نہیں رہ سکتا "

جی ہاں اگر تم سے ہمیشہ کے لئے الگ ہونے کا ارادہ ہو تو یہ کروں اور پھر فریدوں کے ہاتھ اپنے گلے سے نکال کر شوخی سے بولی " کل سے دیکھوں گی کہ مجھے سوتا ہوا دیکھنے کا کتنا شوق ہے اور کب تک قائم رہتا ہے " فریدوں کو شرارت سے دھکا دیکر خورشید جلدی سے باہر چلی گئی ✚



محبّت کا گیت

دیارِ عشق پہ مہتاب بن کے چھائے جا
شباب و شوق کی وادی میں جگمگائے جا

نقاب اُٹھا کے مرے دل کو لالہ زار بنا
ریاضِ خُلد کی رنگینیاں دکھائے جا

گلوئے حُسن سے نکلی ہوئی صداؤں کو
فضائے عشق میں وجد آفریں بنائے جا

سرور و نور میں ڈوبی ہوئی اداؤں سے
حریمِ عرصۂ آفاق کو سجائے جا

پلا پلا کے مئے حُسن دل کو گرما دے
دکھا دکھا کے جھلک روح میں سمائے جا

کہیں فلک کے ستاروں میں رقص فرما ہو
کہیں بہار کے پھولوں میں مُسکرائے جا

خموشیوں میں بیاباں کو دلنواز بنا
چمن کے جوئے سرود آفریں میں گائے جا

غرض کسی نہ کسی طرح اے نشاط افروز!
دلوں سے داغِ غمِ دو جہاں مٹائے جا

سرورِ جاں ہے محبّت کا گیت اے تاثیر
تمام عمر یہی گیت گنگنائے جا

حمید احمد تاثیر

خمارستان کا ایک ورق

جوئی اور بارش کا قطرہ

آغا شاعر قزلباش دہلوی

(جوئی۔ ننھے قطرے سے) آؤ پیارے آؤ! ایک مدّت سے آنکھیں بچھائے تمہارا راستہ دیکھ رہی تھی۔ اچھی۔ بولو۔ بتاؤ۔ آخر تم تھے کہاں؟۔ اللہ! اتنی بے رُخی۔ آج تک تم نے میری خبر بھی نہیں لی۔ مگر چلو جانے دو ان گلوں شکووں کو اب خوشی کا سماں ہے۔ مسرّت کی گھڑیاں اور بالکل پاگل ہو جانے کا وقت ہے۔ میرے سرتاج.... میرے پیارے تم آگئے؟۔ بس بس اب تو ساری دُنیا کی خوشیاں گویا میرے ہی لئے ہیں صرف میرے لئے۔

بیلا (چنبیلی سے) دیکھتی ہو بوا! اس چھوکری کا دیدہ؟۔ اوئی بِتکی پڑی ایسے چاؤ پر۔ وہ جو کہتے ہیں جس کی اُترہی لوئی اُس کا کیا کریگا کوئی؟۔ ایک ننھا سا مینھ کا قطرہ کیا آگیا کہ یہ بے شرم جیسے دیوانی ہی ہوگئی دیوانی۔ بلکہ اُودھل پڑی۔ نوج بُوا اس کا پرچھاواں بھی نہ پڑے کسی پر؟۔

چنبیلی۔ ہاں بہن! سچ کہتی ہو۔ یہ کس کا ذکر کررہی تھیں تم؟۔

بیلا۔ اے بُوا۔ یہی جوئی۔ یہہ اتنی سی فتنی؟ اور یہ بے شرمی! میں تو حیران ہوں یہ کونسا وقت آگیا ہے؟ تم نے دیکھا نہیں ابھی ابھی ذرا دیر پہلے۔ یہ کیسی مُنھ پُھلائے بیٹھی تھی کہ میں تم سے کیا کہوں؟

اے لو۔ آن کی آن میں بس جو ہی کہ یہ مُوا بارش کا ننھا سا قطرہ آکر گرا بس یہہ کنواری کنیا آپے سے باہر ہوگئی۔

چنبیلی۔ ہاں بُوا کلجگ ہے یہ کلجگ۔ دوسرے یہ نادان اکنواری بالی ہے نا۔ وہ کمبخت کیا جانے کہ اس سنسار میں کوئی بھی اعتبار کے قابل نہیں۔

جوئی۔ (پھر اپنی اُسی دُھن میں محو ہوکر) بولو۔ بولو!۔ پران ناتھ کیا اب تک مجھ سے خفا ہو؟۔ آخر تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟۔

ننھا قطرہ۔ آہ پیاری۔ میں کیا بولوں؟ میں اپنے اختیار میں نہیں ہوں۔ چاہے تمہیں یقین آئے یا نہ آئے۔ پیاری میں تو یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اُڑ کر تمہارے پاس پہنچوں۔ لیکن آہ۔ تم نہیں جانتیں کہ ہم سب مینھ کے قطروں کو دراصل کیسی کیسی مجبوریاں ہیں؟۔ پیاری جوئی۔ ہم قطروں کا آسمان سے ایک دم نیچے اُترنا بے حد مشکل اور بڑا کٹھن کام ہے کیونکہ اوّل تو ہم میں سے ہر ایک کو چھڑے دم آنے کا بوتا ہی نہیں۔ جب کبھی اُترتے ہیں ہم سب اکٹھے ہوکر ایک ساتھ اُترتے ہیں۔ دوسری مصیبت یہ ہے کہ سب کی طبیعتیں یکساں نہیں۔ ایک کہتا ہے ہم تو اوپر ہی اوپر ہوا کھائیں گے۔ نیچے کیا کرینگے جاکے؟۔ دوسرا کہتا ہے۔ نہیں بھئی چلتے ہیں۔ ابھی تو نچلی تہ ہوا کی بہت گرم ہے ذرا ہوا اور ٹھنڈی ہو جائے جب چلیں گے۔ کسی کو ضد ہوتی ہے کہ وہاں سوائے ذلّت کے خواری کے دھرا ہی کیا ہے۔ حق ناحق اپنی لعل سی جان کی مٹی عزیز کرنے سے فائدہ؟۔ تیسرا کہتا ہے۔ ابھی ادھر تو دیکھو۔ اور اوپر چلو۔ سورج کی شعاعوں کو ڈھونڈنے چلیں۔ ہم کو تو دھوپ کی چمک دمک اچھی معلوم ہوتی ہے۔ چوتھا کہتا ہے نہیں بھئی سورج کے قریب جانا بھی ایک قسم کی موت ہے۔ چلو قوسِ قزح (یعنی دھنک) میں چل کر آنکھ مچولی کھیلیں۔ کوئی بجلی کی شوخی کا دیوانہ ہے وہ کہتا ہے۔ دیکھو دیکھو۔ بجلی کو تو دیکھو۔ آہا ہا وہ کبھی اس

بادل میں جگمگاتی ہے کبھی اُس ابر میں مچلتی ہے ۔ اُف کیسی کڑکتی ہے ۔ کتنی گرج ہے اس میں ۔

جُوئی ۔ بجلی ۔ بجلی ! تو یہ کہئیے ۔ آپ سب بجلی کے عاشق ہیں ۔ جبھی ۔ جبھی ! آ ہاہ ۔ مجھ غریب سے دعوٰئے محبت محض ایک بناوٹ تھی بناوٹ ۔ تو یہ کہئیے کہ آپ دراصل بجلی کے پرستار ہیں ۔ جائیے ۔ جائیے تو تشریف لے جائیے ۔ ہائے میری تقدیر ؎

بسر ہو جائے گی ہر طرح ہم سے خاکساروں کی
فقیروں کو غرض کیا ہے ترے خورشید منزل سے

قطرہ ۔ واہ رے بھولی مخلوق ۔ ہائے میں نے کیا کہا اور تم کیا سمجھیں ؟ نہیں پیاری میں بوالہوس عاشق نہیں ۔ میں اُس کھنڈے کا فریبی نہیں ہوں جو ہرجائی کہلائے ۔ آہ ۔ پیاری ۔ میں صرف تمہاری صورت کا پجاری ہوں ۔ ہائے تمہیں معلوم نہیں ۔ میں کیسے کیسے شدید انتظار کی گھڑیاں کاٹ کر آج کن مشکلوں سے تم تک سب سے پہلے پہنچا ہوں ۔ اصل میں ذرا بھاری بھرکم تھا اور سب ہلکے پھلکے تھے وہ اوپر ہی رہ گئے دیکھتی نہیں ہو ۔ یہ فقط تمہاری ہی کشش تھی جو مجھے آسمان سے زمین تک کھینچ لائی ۔ (کنولنی) (پاس کے تالاب سے) واہ چھوٹے بھیّا ۔ بھاری بھرکم اور تم ؟ آؤ ذرا ادھر تو آؤ ۔ میں بھی دیکھوں تم کتنے بھاری بھرکم ہو ؟ ۔ آؤ آؤ ۔ میں تم جیسے سیکڑوں کو اپنے ایک پتے پر بٹھا لوں اور پھر خبر نہ ہو ۔

قطرہ ۔ ارے ! یہ کون بولا ؟ کنولنی ؟ چڑنی بھی کہے مجھے گھی سے کھاؤ ۔ چل بے شرم ۔ بے حیا ! ۔ اصل بات کو تو بھول ہی گئی ۔ شیخی بازکہیں کی ؟ ۔ کیوں ری ۔ اگر ہم نہ ہوتے تو تیرا یہ اتنا بڑا تالاب بھرتا کون ؟ ۔ یہ ہمارا ہی صدقہ ہے جو تو اس طرح اپنی گیلی اپنے پتوں کو پھیلائے بیٹھی ہے ۔ کیچڑ کی بیٹی ! ڈوب مر چلّو بھر پانی میں ۔ کمبخت ! پانی کے خاندان کو بٹّا لگا کر اب آپ سورج دیوتا کی عاشق بننے چلی ہیں ۔

جوئی ۔ اُونہہ ۔ جانے بھی دو بیتم ! پھر تم کس کے منہ لگتے ہو ؟ جسے اتنی بھی شرم نہیں کہ ساری خلقت کے سامنے جدھر سورج جاتا ہے یہ احمق سٹرت دِوانی بھی اُدھر ہی اُدھر چک پھیریاں لگایا کرتی ہے ۔ اسے تو اس کا بھی ہوش نہیں کہ کتنی مکھیاں ۔ بھنگے اور بھونرے اس کی گندی چندیا پر منڈلایا کرتے ہیں ۔

بیلا ۔ ارے واہ ری دادی اماں ۔ تم بھی چڑ گئیں ۔ سچ ہے ساری دُنیا کا تجربہ تو بس تم ہی پر ختم ہو چکا ۔ ارے چھوکری بھلا مکھیوں ۔ بھنگوں اور بھونروں کا آنا جانا کونسی ذلت یا بدنامی کی بات ہے ۔

جوئی ۔ چُپ رہو بڑی بی ۔ دیکھو تم کتنی دیر سے برابر بڑبڑ کئے جاتی ہو اور میں نے ایک کا جواب نہیں دیا ۔ میں بیچاری تو اوندھائے چلی جاتی ہوں ۔ بس خاموش خاموش

قطرہ ۔ ہیں ۔ ہیں پیاری ! یہ تم کس سے زبان لڑاتی ہو ۔ تم جیسی پری جمال نازک اندام کو ایسوں سے بات کرنے میں بھی لاج ہے ۔

کنولنی ۔ واہ میاں فتنے ۔ بس زیادہ بڑا بول نہ بولو ۔ یہ کمبخت نگوڑی ننھی جوئی تمہارے ان چھلاسڑوں پر دیکھ کر ایسی ہو چلی ہے ۔ ہشیار ہشیار ۔ وہ دیکھو ۔ ہوا کا تیز جھونکا کس شدومد سے تمہاری طرف چلا آتا ہے ۔ ذرا ادھر تو دیکھو ۔

جوئی ۔ (ہوا کے فرّاٹے کو آتا دیکھکر) ۔ ہے ہے ۔ غضب ۔ یہ ظالم کہاں سے آن مرا ۔

قطرہ ۔ اُف غضب ہوا ۔ لو پیاری خدا حافظ ۔ اب میرا یہاں ٹھہرنا ناممکن ہے ۔ ہائے میں چلا ۔

جوئی ۔ اوخدا ! خدا ۔ بچا اس میرے پیارے کو بچا ۔

کملنی ۔ لے لڑکی ۔ ٹھیرا ۔ ٹھیرا ۔ اب تو اپنے اس چاہیتے کو ٹھیرا لے ۔ میں بھی تو دیکھوں ۔ مواتھوتھا چنا باجے گھنا ۔

قطرہ ۔ لو پیاری اب میں جاتا ہوں ۔

جوئی ۔ نہیں نہیں ٹھیرو ۔ خدا کے لئے ٹھیرو ۔ ابھی ابھی نہ جاؤ ۔ نہیں میں مرجاؤں گی ۔ قطرہ ! ۔ ناممکن قطعی ناممکن ۔ میں چلا ۔ میری جان اب تو مر کر بھی نہیں بچ سکتا

(ہوا کا جھونکا سر پر آجاتا ہے اور قطرہ کانپنے لگتا ہے)

ہوا کا جھونکا ۔ کیوں او ننھی سی بوند تیری بھی یہ مجال کہ تو ایسی پری جمال نازنین پر ڈورے ڈالے ۔

قطرہ ۔ ابی ابی ۔ جناب ! ۔

جھونکا ۔ بدنظر خانہ خراب ۔ جانتا نہیں یہ بہار میرے لئے ہے نہ تجھ سے آوارہ مزاج کمینے کے لئے ۔ اپنی اوقات تو دیکھ نامراد تو کھاری پانی کا فضلہ ۔ چل دُور یہاں سے ۔ اس آسمانِ عیش پر تیرا کوئی حق نہیں ۔

قطرہ ۔ مگر ۔ ۔ ۔ مگر ۔ ۔ ۔ میں تو ۔ ۔ ۔ ادھر سے ۔ ۔ ۔ آسمان سے آیا ہوں حضرت ۔

جھونکا ۔ جا جا ۔ گندی موریوں میں ریتیلی زمینوں میں جذب ہو جا ۔ جا جا ۔ غلاظت تیرا انتظار کر رہی ہے ۔

جوئی ۔ ہائے ظالم تو نے میرا عیش مجھ سے چھین لیا ۔ تجھے خدا ہمیشہ پریشان ہی رکھے ۔ (قطرہ گر پڑتا ہے)

دہقان

از احسن احمد اشک رکن "بزم وارفتگان ادب" کلکتہ

تپتے سورج کی گرمی سے جب نخلِ چمن مرجھاتے ہیں
جب تیز نگاہیں پڑتی ہیں دُنیا پر مہرِ تاباں کی
ماتھے سے پسینہ بہتا ہے' بہہ کر قدموں تک آتا ہے
تقدیر پہ اپنی شاکر ہے تکلیف کا کچھ احساس نہیں
جب اُس کی جبینِ محنت پر افکار کے بل پڑ جاتے ہیں
جب جھوم کے بدلی اُٹھتی ہے جب زور ہوا کا ہوتا ہے
بجلی کوندے بادل گرجے یہ "مردِ عمل" کب ڈرتا ہے

جب قسمت کے پیارے بیٹھے پنکھوں کی ہوائیں کھاتے ہیں
اُس وقت کوئی حالت دیکھے قسمت کے ستائے دہقاں کی
کچھ اپنی دُھن میں گاتا ہے اور ہَل کو چلائے جاتا ہے
دل اُس کا ہے گھر اُمیدوں کا اُمید کے گھر میں یاس نہیں
"فطرت" کا کلیجہ کھولتا ہے اور بادل گھر کر آتے ہیں
اس وقت یہ کشتِ محنت میں تقدیر کا دانہ بوتا ہے
جب "فطرت" برہم ہوتی ہے "فطرت" سے جنگ بھی کرتا ہے

اے قطرۂ اشکِ مہجوراں انجام ترا اچھا ہوتا
اے گوہرِ تاجِ سُلطانی تجھ سے یہ سوالِ فطرت ہے
سُن اے دہقاں شاعر تجھ کو کہتا ہے فرشتہ رحمت کا
ہے تجھ سے رگوں میں خونِ عمل چہروں کی ہے زیبائی تجھ سے
لعنت اس دُنیا پر جس میں آسودہ نہ ہو محنت تیری
اے کاش زمانے میں چلتی اک ایسی تُند و تیز آندھی
دستاریں سروں سے گر گر کر خاشاک وخس میں مِل جاتیں

پیشانیِ دہقاں سے تو اگر موتی بن کر ٹپکا ہوتا
ٹپکیں جو جبینِ محنت سے ان قطروں کی کیا قیمت ہے
سب تجھ سے روزی پاتے ہیں تو سایہ ہے دستِ قدرت کا
تعمیر کے ہنگامے تجھ سے تہذیب کی رعنائی تجھ سے
اے کاش تمدّن نے دہقاں سمجھی ہوتی قیمت تیری
پُر ہَول و تلاطم خیز آندھی پُر شور و شر انگیز آندھی
قصرِ سرمایہ داری کی مضبوط بنائیں ہل جاتیں

غارت ہو جاتی یہ بستی خونخواروں کی حیوانوں کی
عالم ہوتا مزدوروں کا دُنیا ہوتی دہقانوں کی

مشاہیر کے دستخط

ملو راڈریٹ شی ورچ کے خودنوشت حالات

مترجمہ از ملک حسیب احمد بی۔اے۔آنرز۔ ایل ایل۔بی

مشاہیر کے دستخط اکٹھا کرنے کا شغل اگر اسے سنجیدہ ترین صورت دیدی جائے تو یہ سب مشاغل میں مشکل ترین ہے۔ نیلام گھر ایسی جگہ ہے جہاں ڈاک کے ٹکٹ، پرانے ظروف اور دیگر اشیاء آسانی سے دستیاب ہوجاتی ہیں لیکن جس شخص کو زندہ مشاہیر کے دستخط درکار ہوں اس کے لئے تکمیل ذوق کچھ آسان کام نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ شوق اُسے دیارِ غیر میں ٹھوکریں کھلوائے، وہ پُرخطر اور اجنبی علاقوں میں سفر اختیار کرے ایک ایسی چیز کی تلاش میں جسے روپیہ خرید نہیں سکتا۔ اور ان زحمتوں کے باوجود ممکن ہے کہ وہ پھر بھی ناکام رہے۔ اب آپ خود ہی اندازہ فرمالیجئے کہ وہ شخص جس نے تیس ہزار مشاہیر کے دستخط جمع کئے ہوں کس بلا کا انسان ہوگا؟

حقیقت یوں ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا ایک گراں بہا حصّہ اس شوق کی نذر کردیا اور اس کے علاوہ دس ہزار پونڈ کی رقم کثیر اس وعدے کے ایفا کرنے میں صرف کردی جو میں نے شہزادۂ پال کے عجائب گھر کے منتظمین سے کیا تھا کہ ایک دن اس عجائب خانے میں مشاہیر کے دستخطوں کی ایک نادر کتاب موجود ہوگی۔ یقیناً یہ وعدہ جلد بازی پر مبنی تھا کیونکہ مجھے اس وقت آنے والی دقتوں کا بالکل اندازہ نہ تھا۔

یوں تو مشاہیر کے دستخط اکٹھا کرنے والوں کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں تک پہنچتی ہے جو معمولی معمولی انسانوں کے دستخط حاصل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اس قسم کا شغل میرے نزدیک بازیچۂ اطفال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن دستخطوں کی ایک ایسی کتاب جو زندگی کے ہر شعبہ کی پوری پوری نمایندہ ہو انتھک کوششوں، صبر و استقلال، انتہائے ہوشیاری اور بیدار مغزی سے ہی ترتیب پاسکتی ہے۔ جہاں ان چیزوں کی ضرورت ہے وہاں دستخط اکٹھا کرنے والے میں مختلف انسانوں کی قابلیت اور جوہر پرکھنے کا مادہ بھی بدرجۂ اتم موجود ہونا چاہئے۔ مجھے اپنے وسیع تجربے نے جہاں اور باتیں سکھائی ہیں وہاں یہ گُر بھی سکھا دیا ہے کہ وہ افراد جو قوموں کی موت و حیات پر قادر ہیں اور ان پر حکومت کرتے ہیں صرف اپنے دستخط ہی کرنے پر قانع ہیں مگر ان لوگوں کے برعکس دنیا میں ایسے بھی موجود ہیں جو شوق: بدیت میں اپنے خرافات سے پورا صفحہ کا صفحہ برباد کردینا چاہتے ہیں۔

مسولینی نے اسی کو کافی سمجھا کہ وہ اپنے دستخط ہی گھسیٹ ڈالے۔ لیکن مسولینی کے منصرموں نے اپنے حاکم کے دستخطوں کے ساتھ ہی ساتھ اپنے رطب و یابس سے ایک پورا صفحہ سیاہ کر ڈالا۔ حالانکہ رومانیہ کے تمام شاہی خاندان نے اپنے لئے ایک صفحہ کافی خیال کیا مگر سان فرانسسکو کے میئر کو صرف اپنے لئے ہی ایک صفحہ درکار تھا۔

بڑے آدمی عام طور پر دستخط دینے سے گریز کرتے ہیں مگر جس کا مقصد زندگی ہی ان دستخطوں کا حاصل کرنا ہو اُسے بلا کا صابر انسان ہونا چاہئے۔ اسی صبر اور ہوشیاری

کے طفیل میں سولینی، غازی مصطفےٰ کمال اور مہاتما گاندھی کے سے مشاہیر روزگار کے دستخط لینے میں کامیاب ہوگیا۔

اُس بڑے کمرے میں جہاں سولینی دن رات اٹلی کی قسمت سے کھیلتا رہتا ہے صرف ممتاز ترین آدمی ہی بار پا سکتے ہیں۔ حالانکہ خود میرے وطن یوگوسلافیہ کے وزیر خارجہ نے ہمارے سفیر کو میری آمد کی اطلاع دیتے ہوئے استدعا کی تھی کہ وہ مجھے اپنی دوستانہ مدد سے محروم نہ رکھے لیکن اس کے باوجود مجھے روم میں چار ہفتے گزر گئے تب کہیں جاکر سولینی کے ہاں باریابی نصیب ہوئی۔

سولینی کے ملاقاتی کو سب سے بڑا نقصان جس چیز سے پہنچتا ہے وہ اس کمرے کی بے پناہ لمبائی ہے جہاں سولینی ملتا ہے۔ سولینی تک پہنچنے کے لئے ملاقاتی کو ایک جہازی قالین طے کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک عظیم نفسیاتی امتحان ہے گر امتحان شاید اس شخص کے لئے ہوگا جو کوئی سیاسی معاہدہ لیکر وہاں پہنچے یہاں تو جو کائنات تھی وہ دو دستخطوں کی کتابیں تھیں جنہیں میں بغل میں دبائے ہوئے وہاں پہنچا تھا۔

ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی زبان میں سولینی نے میرے آنے کا مقصد دریافت کیا۔ جب میں نے اپنے مطلب کا اظہار کیا تو سولینی ایک فیصلہ کن انداز میں کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا "مجھے افسوس ہے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ اچھا خداحافظ" روم ایسے پرصعوبت سفر کے بعد اور پھر یہ جواب! اس پر طرّہ یہ کہ ایسے آدمی کا جواب جو عام طور پر اپنے فیصلوں پر نظرثانی کرنا جانتا ہی نہیں! ——— چند لمحوں کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا جیسے سروش نے میرے کان میں کچھ کہہ دیا۔ میں پندرہ زبانیں بلاتکلف بول سکتا ہوں۔ بہترین اطالوی زبان میں میں نے اس کے دلی جذبات سے اپیل کی "مجھے توی امید ہے کہ ہمارا قائد اعظم ایک ادنےٰ فاسیسٹ کے جذبات کو مجروح کرنے کی نیت نہیں رکھتا؟" ——— سولینی مسکرا دیا۔ دستخطوں کی ایک کتاب کو ایسی مضبوط گرفت میں لے لیا کہ اگر دو چار دستخط کنندہ مشاہیر ایسی ہی مضبوطی سے تھام لیتے تو یہ اوراق کبھی کے پریشان ہوچکے ہوتے۔ سولینی نے ایک جگہ اپنے دستخط گھسیٹ ڈالے

Benito Mussolini
Roma, luglio 1920

اور پیشتر اس کے کہ سولینی مجھ سے میرے فاسی ازم کے لگاؤ کے متعلق دریافت کرتا میں اجازت خواہ ہوا اور وہاں سے چلدیا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مجھے ایسے مشاہیر سے واسطہ پڑا ہے جو سولینی سے بھی زیادہ تند و ترش تھے اور ان میں غازی مصطفےٰ کمال پیش از پیش ہیں۔

چونکہ غازی موصوف کو اپنے قتل ہو جانے کا خدشہ لگا رہتا ہے اس لئے وہ انگورہ سے چودہ میل کے فاصلے پر رہتے ہیں اور یہیں سے وہ ترکی کی قسمت پر حکومت کرتے ہیں۔ تقریباً ہر روزانہ امیروں، وزیروں اور سیاست دانوں کے قافلے کے قافلے انگورہ سے شاہی محل کی جانب رواں نظر آتے ہیں اس لئے کہ غازی موصوف اپنے مکان سے بہت ہی کم برآمد ہوتے ہیں۔ یہاں چپے چپے پر پہرہ رہتا ہے اور کسی اجنبی کی مجال نہیں کہ ادھر کا رُخ کر سکے۔

——— انگورے میں جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ میں غازی کمال پاشا کے دستخط حاصل کرنے کی غرض سے آیا ہوں تو عجیب عجیب قسم کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی ان باتوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس سفر کو حماقت اور بے نتیجہ خیال کرنے لگا۔

خوش قسمتی سے انگورے میں ایک با اثر آدمی سے میری دوستی ہوگئی جس نے مجھے غازی موصوف کے حضور میں پہنچنے کا ایک ٹکٹ دیدیا۔ میں جب اس ٹکٹ کو لیکر گیا تو اسے پہرے والوں نے کوئی ایک درجن مرتبہ ناقدانہ نگاہوں سے جانچا تب کہیں میں ملاقات کے کمرے میں پہنچ پایا جہاں ترکی کا قائد اعظم دوسرے لوگوں کی معیت میں کھڑا تھا۔ میرے دوست نے مجھے پہلے ہی سے سمجھا دیا تھا کہ آداب محفل کو بالائے طاق رکھ کر مجھے دستخط حاصل کرنے کے لئے جلد بازی سے کام لینا چاہئے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن میری یہ جسارت آمیز بہادری صرف سطحی تھی اس لئے کہ کوئی پانچ منٹ کے بعد مجھے اس کا شدید احساس ہونے لگا کہ اس مجمع میں صرف میں ہی اجنبی تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ احساس بھی کہ غازی موصوف مجھے اشتباہ کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے مجھے ڈرا دینے کو کافی تھا۔ غازی کمال نے میری دونوں کتابوں کو غور سے دیکھا اور جب انہوں نے بلغاری زبان میں مجھ سے گفتگو شروع کی تو میری جان میں جان آئی۔ ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ میں نے اچانک سوچا کہ ہم دونوں جرمن زبان میں بات چیت کر رہے ہیں۔ ایک زبان بولتے بولتے دوسری زبان میں گفتگو شروع کر دینا غازی موصوف کی خاص ادا ہے۔

"آپ اپنے سفر کو کب تک جاری رکھیں گے؟" انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔

"حضور! میری جہاں گردی کو پندرہ برس ہو چکے ہیں۔ امکان ہے کہ میں دس برس اور اس سیاحت میں صرف کر دوں۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے خیال کیا کہ غازی موصوف اس سفر کو تضیع اوقات خیال کر کے ضرور ہنس دیں گے لیکن نہیں! انہوں نے مجھ سے کتاب لیکر اس زور سے اپنے دستخط کئے

کہ میرا قلم توڑ دیا۔

لیکن جب میں سویڈن پہنچا تو شاہ گسٹاؤ کے حضور میں باریابی کچھ مشکل معلوم نہ ہوئی مگر یہاں اس سے بھی بڑی دقت کا سامنا تھا یعنی بادشاہ خود بخود فیصلہ کئے ہوئے تھا کہ وہ کبھی کسی کو اپنے دستخط نہ دیگا۔ اور جب میں نے دریافت کیا تو مجھے یہی جواب دیا گیا۔ میں نے اپنی مایوسی کا اظہار سویڈن کے مشہور ادیب سیون ہیڈن سے کیا جو بادشاہ کا خاص دوست اور ٹینس میں اس کا مدِمقابل تھا۔ جب سیون ہیڈن نے میری داستان سنی تو کہنے لگا "بیوقوف ہو تم بھی، ایک بار پھر کوشش کرو" لیکن میری اس حوصلہ افزائی کو وزیر حضوری نے اپنے الفاظ سے پاؤں تلے روند ڈالا۔ کہنے لگا "یاد رہے بات ہے کہ سرکار اپنے دوستوں سے ٹینس کھیل لیں لیکن یہ کہ اپنے اصول کو بھی خیرباد کہہ دیں ناممکن ہے" لیکن میرے بار بار کے اصرار سے مجھے بادشاہ کی حضوری نصیب ہو گئی۔ اسوقت ایک ایسے شاہی دستخط نے میری مدد کی جو برسوں سے میری کتاب میں محفوظ تھا۔ شاہ موصوف نے شہزادہ آرتھر آف کناٹ کے دستخطوں کو پہچان لیا اور اس بنا پر بادشاہ نے خود بھی دستخط کر دیئے۔ جب مجھے وزیر حضوری خیرباد کہنے کے لئے آیا تو بہت حیران ہو کر کہنے لگا کہ "اپنی چالیس سال کی ملازمت میں یہ پہلا موقع ہے کہ بادشاہ نے اپنے اصول کی پاسداری نہ کی ہو"۔

مگر جب مجھے زوغو شاہ البانیہ سے ملنے کا اتفاق ہوا تو میں نے انسانی فطرت اور جذبات کا وہ مظاہرہ دیکھا کہ بایدوشاید۔ شاہ البانیہ خود بھی دستخطوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ جب انہیں میری کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا تو وہ بہت دیر تک پریذیڈنٹ ہنڈنبرگ کے دستخطوں کو دیکھتے رہے۔ کہنے لگے "کیا دستخط ہیں! ممکن ہے کہ پریذیڈنٹ مرحوم نے خاص قسم کا قلم استعمال کیا ہو"۔

"جی ہاں جہاں پناہ انہوں نے نیزرے کے قلم سے دستخط کئے ہیں" میں نے جواب دیا۔

"اچھا تو میں بھی نیزرے ہی کے قلم سے دستخط کر دونگا" بادشاہ نے کہا۔ ایک نوکر کو طلب کیا گیا جس نے بتایا کہ قصر سلطانی میں نیزرے کا قلم نہیں ہے۔ چند دن کے بعد جب قلم دستیاب ہوا تو ایک معزز عہدہ دار نے مجھے بتایا کہ ایک خاص ہوائی جہاز کے ذریعہ سے قلم روم سے منگوایا گیا ہے۔ بادشاہ نے دستخط کر دیئے۔

مگر اہل بصیرت کے نزدیک پریذیڈنٹ ہنڈنبرگ اور شاہ زوغو کے دستخطوں کے طرز نگارش میں زمین آسمان کا فرق موجود ہے۔ پریذیڈنٹ مرحوم کے دستخطوں میں فوجی وجاہت اور عسکری قوت موجود ہے اور وہ دستخط اُسی انداز سے کرتے تھے جیسے کسی جنگ کا نقشہ مرتب کر رہے ہیں۔

مجھے وہ دن اب تک یاد ہے جب ہنڈنبرگ لکڑی کا سہارا لئے اس کمرے میں داخل ہوا جس میں مجھے بٹھایا گیا تھا۔ اس کی آواز بلند اور طبل جنگ کی طرح گونجدار تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہنوز جوان ہے مگر اس کے دستخط اس کے بڑھاپے کی گواہی دے رہے تھے اور ان طویل بےغرضانہ خدمات کا اعتراف کر رہے تھے جو اس عظیم شخصیت نے اپنے وطن کی خاطر انجام دیں۔

اور جب میں امریکہ کے پریذیڈنٹ روزولٹ کے دستخط حاصل کرنے کی غرض سے کانگریس ہاؤس میں پہنچا اور میرے یقین دلانے پر کہ میں پریذیڈنٹ موصوف کے دستخطوں سے کوئی تجارتی منفعت حاصل نہ کرونگا انہوں نے میری کتاب میں دستخط کر دیئے۔

گو میں دستخط حاصل کرنے کے سلسلے میں متعدد بادشاہوں سے ملاقی ہوا ہوں لیکن مہاراجہ میسور کے طلائی ساز و سامان کو دیکھکر میری آنکھیں کھل گئیں اور میں اس سامانِ آرایش کو نہایت بدتمیزی سے گھورتا رہا۔ اور ہاں اسوقت میری حالت دگرگوں کی سی ہوگئی۔ جب نظام شاہ دکن نے مجھے ایک قدیم، بیش قیمت اور مرصع تلوار دینا چاہی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں دنیا کے دولتمند ترین انسان کے حضور میں ہوں۔ میں نے وہ تلوار شکریئے کے ساتھ قبول کرلی کیونکہ مجھے یاد آگیا کہ جنگ عظیم کے دنوں میں جب شاہ دکن نے حکومت برطانیہ کو ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ دیئے تھے تو خزانہ شاہی میں کونسی کمی آگئی تھی!

مگر مہاتما گاندھی کے دستخط حاصل کرنا کچھ کم مشکل کام نہ تھا۔ اول تو گاندھی جی کا ڈھونڈھ نکالنا ہی دشوار ہے۔ آج یہاں کل وہاں، اور جب میں آخرکار اُن سے دہلی میں ملا تو انہوں نے دستخط کرنے سے صاف انکار کردیا۔ مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی اور میں نے مشاہیر کے نام گنوانا شروع کردیئے اور اس پر مہاتما جی نے ہنستے ہوئے ہندی میں دستخط کر دیئے۔ البتہ ٹیگور نے انکار نہ کیا بلکہ یہ کہتے ہوئے کہ "دنیا بھر کا سفر اور دستخطوں کے لئے۔ کیا خوشگوار مشغلہ اور کیسی اچھی زندگی ہے" اپنے دستخط کر دیئے۔

اس طویل سیاحت کے بعد اب میں اپنے وطن جا رہا ہوں۔ میری کتاب میں دنیا کے تیس ہزار مشاہیر کے دستخط ہیں۔ جن میں تیرہ بادشاہ، دس پریذیڈنٹ اور تمام دنیا کے وزراء شامل ہیں۔ صرف فرانس کے پریذیڈنٹ اور ہٹلر کے دستخط باقی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میں ہٹلر کے دستخط آسانی سے حاصل کرسکوں گا اس لئے کہ ہٹلر اور میں لکڑی پر پالش کرنے کا کام اکٹھا کرتے رہے ہیں۔ جب ہمیں چار شلنگ یومیہ مزدوری ملا کرتی تھی۔ ہم پہروں باتوں میں مشغول رہتے تھے ہٹلر کا موضوع سیاست تھا اور میرا سیاحت۔ کیا ہم دونوں کے خواب شرمندۂ تعبیر ہیں؟۔

حُسن

(۱)
چمن کے ہر گُل میں تو شگفتہ
ہے چشمِ نرگس میں نور تیرا
سکوتِ صحرا میں یا حرم میں
بھرا ہوا ہے سرور تیرا

(۲)
کمانِ ابرو میں تو ہے پنہاں
کمر کے ہر بل میں تو ادا ہے
چہکتا بلبل جو خوش گلو ہے
وہ رنگ و بو پر تری فدا ہے

(۳)
نسیمِ صبحِ بہار میں ہے۔
مُدام تیرا ہی رقص جاری
بہ شانِ آبِ رواں کے اوپر
نکل رہی ہے تری سواری

(۴)
تری ہی ضو سے ہے عشق تاباں
سفینۂ دل کا ناخدا ہے
ہر اک شجر میں ہر اک حجر میں
کمال تیرا جُدا جُدا ہے

مصوّر ہند رام گوپال وجے ودگی

نِفاق

(حکیم آشفتہ لکھنوی)

سازِ فطرت ہے شکستہ حسنِ فطرت اب کہاں
پھوڑ ڈالی تو نے قسمت زورِ قسمت اب کہاں

بھر لئے ہیں دل میں نشتر زہر کے ڈوبے ہوئے
سادگی فطرت کی کھو ڈالی صداقت اب کہاں

جوہرِ انسانیت کو کھا چکا زہرِ نفاق
پیکرِ بے حس ہے تو روحِ حقیقت اب کہاں

خود پرستی کی ہوا سے بجھ چکا اشراقِ دل
کالبد تاریک ہے تیرا، نظارت اب کہاں

تیری فطرت خضرِ منزل تھی جسے ٹھکرا دیا
دور ہے منزل سے کوسوں دور قربت اب کہاں

جانتا ہے ناوکِ بیداد تجھ میں دم نہیں
یہ سنبھالا موت کا ہے ورنہ قوت اب کہاں

قوتیں ٹکرا کے تو نے ختم کر لی زندگی!
موت کے پنجے سے بچ جانے کی صورت اب کہاں

فرقہ بندی ہے شعارِ زندگی تیرے لئے
تفرقہ انداز ملت، پاسِ ملت اب کہاں

قوتوں کو منتشر کر کے ابھرنا ہے محال
جب یہ رسوائی کے لچھن ہیں تو عزت اب کہاں

دوڑتا پھرتا ہے رگ رگ میں غلامی کا لہو!
تیری فطرت سرنگوں ہے تاجِ رفعت اب کہاں

بندۂ تقلید ہے، آزادیاں زہراب ہیں
ذلتیں سر تاج ہیں، تاجِ حکومت اب کہاں

طالبِ انصاف ہے غیروں سے اور اپنوں سے بیر
تجھ میں پیدا ہو سکونِ دل یہ صورت اب کہاں

تجھ پہ قدرت کی نگاہِ لطف پڑنا ہے محال،
غم ہی غم کا سامنا ہے غم سے فرصت اب کہاں

بیکسی پر ہنس رہی ہے تیری دنیائے نشاط
غم کے پہروں میں نوائے سازِ عشرت اب کہاں

شمعِ ایواں پہ تیرے چھا گئیں تاریکیاں
وہ دمکتے چاند کی رنگیں نظافت اب کہاں

پیار کی باتوں میں تو نے بھر دیا زہرِ نفاق
وہ صداقت کے مزے لطفِ محبت اب کہاں

آگ پانی بن گئے ہندو مسلماں ہند کے
ایک مرکز پر بھلا امکانِ شرکت اب کہاں

بجھ چکا آشفتہ زہریلاں سے سینے میں دل
اس کے پہلو کہاں جینے کی صورت اب کہاں

شواعر العرب

(جلیل الرحمن صاحب اعظمی)

یہ مضمون رسالہ جوہر کے سالنامہ میں جو جامعہ ملیہ یونیورسٹی کا ارگن ہے ناتمام حالت میں شائع ہو چکا ہے، قابل مضمون نگار نے اب اسے ضروری اضافوں کے ساتھ "کلیم" میں اشاعت کے واسطے روانہ کیا ہے۔ جسے شکریہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

خدا کی تمام مخلوقات میں زمانہ کی نیرنگیوں کا جو نظارہ ملکۂ کائنات (عورت) نے دیکھا ہے، دنیا کی کسی مخلوق نے نہیں دیکھا۔ نسائیات کی قدیم تاریخ ایک عجیب وغریب داستان ہے، قدرت کی نیرنگیوں اور بوالعجبیوں کا جس قدر تماشا یہاں نظر آتا ہے کسی دوسرے اسٹیج پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ کسی نے اگر اس کی فتنہ سامانیوں اور ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے اس کو مرد کے دامن تقدس کا داغ سمجھا۔ اسے فتنہ و فساد کی جڑ اور امن و سلامتی کا دشمن بتایا، فریب نشاط اور شیطان اور فتنہ و فساد کی جڑ سمجھ کر لعنتِ ابدی کا مستحق قرار دیا، تو دوسرے نے اس کی آفرینش کا خیال کرتے ہوئے اس کو پیکر راحت اور مجسمۂ محبت سمجھا۔ اور اس وجہ سے کہ نوع انسانی کے بقا کی باعث ہے، اس کی آزادی میں انتہا سے زیادہ غلو کیا، تا آنکہ ان کی حقیقی نسائیت آزادی کی بھینٹ چڑھ گئی، اور اخلاق کی پاکیزگی ترقی کی راہ پر قربان ہو گئی۔

ازمنہ قدیم میں مصر، بابل، ایران، یونان، اور ہندوستان تہذیب و مذہب کے گہوارہ سمجھے جاتے تھے، مگر ان کے چمنستان تمدن میں عورت کی آبیاری کو کچھ دخل نہ تھا اسلام نے اگر نہ صرف عورتوں مردوں دونوں کی جد و جہد کو قابل ستائش تسلیم کیا بلکہ عورتوں کی تعلیمی، سیاسی اور اخلاقی ارتقاء کے لئے ایک ایسا باقاعدہ نظام بھی پیش کیا کہ اس کی برکت سے مسلمانوں میں ایسی ایسی خواتین پیدا ہوئیں، جن کے علم و فضل، عظمت و شوکت کا آج بھی تمام عالم میں شہرہ ہے۔ اور جن کے کارنامے تاریخ کے صفحات پر نمایاں طور سے نظر آتے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں خواتین عرب کے صرف ان ادبی شہ پاروں کا تذکرہ کیا جائے گا، جو شعر و شاعری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے حسیات لطیفہ اور جذبات عالیہ کے حامل ہیں۔

شاعری کا دراصل احساسات و جذبات سے چولی دامن کا تعلق ہے۔ خود شاعری کے لفظی معنی صاحب شعور کے ہیں۔ اور شعور اصل میں احساس یا (feeling) کو کہتے ہیں یعنی شاعر وہ شخص ہوتا ہے جس کا احساس قوی ہو۔ اس اعتبار سے عورت مجسمۂ شاعری ہے۔ اس لئے کہ اس کے جذبات و احساسات فطرتاً نہایت نازک، لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں۔ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ کسی شخص کی مصیبت کا حال اگر درد انگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس کا اثر جس قدر صنف نازک پر ہوتا ہے مردوں پر نہیں ہوتا، دوست کی جدائی ہر شخص پر اثر کرتی ہے۔ لیکن ایک عورت اس موقع پر بالکل بے تاب ہو جاتی ہے۔ دریا کی روانی، سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، صبح کی شگفتگی، اور شام کی دلآویزی ایسے مناظر ہیں جن سے ہر شخص لطف اندوز ہوتا ہے۔ لیکن یہی چیزیں ایک عورت پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں جس سے وہ سرشار اور خوش ہو کر جھوم جاتی ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ وہ بعض وجوہ کی بنا پر اپنی کیفیات کو الفاظ کا جامہ نہ پہنا سکے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اثر و انفعال میں وہ مردوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اور یہی اثر و انفعال شعر کی کائنات اور شاعری کی حقیقی بنیاد ہے۔ عورتوں نے علوم و فنون، شاعری و انشا پردازی، نقاشی اور تصویر کشی وغیرہ میں مردوں سے بارہا مقابلہ کیا۔ اور کبھی ان سے پیچھے نہیں رہیں۔ (اور کوئی انعام ایسا نہ تھا جو انھوں نے بھی حاصل نہ کیا ہو) حتیٰ کہ زمانہ قدیم میں جب عورتوں کو شاذ ہی کسی فن میں حصہ لینے کا موقع ملتا تھا۔ اس وقت بھی کم از کم

شاعری میں دجو درحقیقت ایک فطری فن ہے، ایسی ایسی قابل عورتیں گذری ہیں جن کے کارنامے دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ عربوں کے بڑے زبان آور شعراء میں خنساء کا نام بھی مشہور ہے۔ جو ایک عورت تھی، اسی طرح لیلیٰ الاخیلیہ بھی ایک بڑی نامور شاعرہ گذری ہے۔ جو اپنے زمانہ کے بڑے شعراء سے بار بار بازی لے گئی۔

یوں تو دنیا کا کوئی طبقہ ایسا نہیں جہاں ہر زمانہ اور ہر دور میں کوئی نہ کوئی شاعرہ اور ادیبہ نہ پیدا ہوئی ہو۔ مگر جس قدر نامی گرامی سرزمین عرب نے پیدا کی ہیں شاید کوئی دوسرا ملک پیدا نہ کرسکا ہو۔ شعر گوئی اور زبان آوری عرب کے خمیر میں داخل تھی۔ قدرت نے جذبات اور مدرکات کے اظہار پر ان کو ایسی قوت عطا فرمائی تھی کہ اس زمانہ کی بڑی بڑی مہذب قومیں بھی ان کی ہمسری کا دعوی نہیں کرسکتی تھیں۔ وہاں کے مرد، عورت۔ بوڑھے۔ بچے سب ہومر اور شکسپیر کی شان رکھتے تھے۔

حرب بسوس میں اُمامہ بنت کلیب کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ جب اس کے باپ کلیب کو جساس اور عمرو بن حارث نے دھوکے سے قتل کردیا۔ تو وہ روتی پیٹتی اپنے چچا مہلہل کے پاس پہنچی۔ دیکھا تو وہ شراب کے نشہ میں مدہوش اور عیش و نشاط کے جلسوں میں سرشار ہورہا ہے۔ اس کو سخت غصہ آیا، مہلہل کو لعنت وملامت کرتے ہوئے اس وقت اس نے فی البدیہہ یہ اشعار کہے تھے۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔ جس سے عربوں کی فطری بلاغت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

(۱) اَتَلهوُ بِالملاهِي والخمورِ — کیا تم لہو لعب اور شراب وکباب میں مشغول ہو؛
وَلاَ تدرِي بِعاقبةِ الامورِ — اور تمہیں انجام کی کچھ خبر نہیں۔

(۲) ولا تدری بان کلیب اضحیٰ — تمہیں معلوم نہیں کہ کلیب
قتیلاً عند جساس الغدر — غدار جساس کے ہاتھوں مارا گیا۔

(۳) فواعجبًا لجساس وعمرو — جساس اور عمرو پر تعجب ہے۔
لقد جسرا علی امر نکیر — بیشک انہوں نے ایک فعل قبیح پر جرأت کی۔

(۴) ویا ویلا لجساس وعمرو — افسوس ہے جساس اور عمرو پر
لقد رمیا اخاک بعنقفیر — انہوں نے تمہارے بھائی کو بڑے فریب سے قتل کیا

(۵) فبادروا نزعن الرمح منه — جلدی پہنچو اور اس کے جسم سے نیزہ نکالو
فما احد علینا بالجسور — ہمارے مقابلہ میں کسی کو سرکشی کی جرأت نہ ہونا چاہیئے

(ریاض العرب فی مراثی شواعر العرب جلد اول صفحہ ۶)

عمرۃ خثعمیہ ایک بڑھیا ہے، اہل وعیال سب ختم ہوچکے ہیں۔ صرف دو بچے ہیں جو اس کی ٹمٹماتی ہوئی شمع زندگی کے آخری سہارا ہیں۔ جب وہ ان کی جواں مرگی کی خبر سنتی ہے تو فرط غم میں پاگل ہوجاتی ہے۔ اور درد میں ڈوبا ہوا مرثیہ کہتی ہے۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

(۱) ابی الناس الا یقولوا هما هما — لوگوں کو اصرار ہے کہ یہی دونوں (میرے بچے) مرے ہیں اگر ہمارا
ولو اننا اسطعنا لكان سواهما — بس چلتا تو ہم ثابت کردیتے کہ وہ نہیں بلکہ کسی اور کا انتقال ہوا ہے

(۲) بنيًا عجوز حرم الدهر اهلها — ہائے ایک بڑھیا کے دو بچے جس کے شوہر کو زمانہ نے پہلے ہی
فلیس لها الا الا له سواهما — مٹا دیا تھا اور خدا کے علاوہ وہی اس کے سرمایۂ حیات تھے

(۳) هما اخوا فی الحرب من لا اخا له — وہ دونوں معرکۂ جنگ میں اس شخص کے مددگار ہوتے تھے جس کا کوئی نہیں
اذا خاف یومًا نبوةً فدعاهما — ہوتا تھا جب اسکی ناسازت کا کسی کو ڈر ہوتا تھا تو وہ ان دونوں کو بلاتا تھا

(۴) ھما یلبسان المجد احسن لبسۃ — وہ دونوں عزت اور مجد کے لباس فاخرہ سے مزین تھے ،
شحیحان ما اسطاعا علیہ کلاھما — اور حتی الامکان اس کے حصول میں کوشاں رہتے تھے۔

(۵) شہابان منا اوقدا ثم اخمدا — ہائے وہ دونوں ہمارے چمکتے ہوئے ستارے تھے جو پہلے روشن کئے گئے اور
وکان سنا للمجد لین سوھما — پھر بجھادئے گئے، ان دونوں کی آگ مہمانوں کے لئے ہمیشہ روشن رہتی تھی۔

ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول صفحہ ۱۴۲

جس ملک کے بچے اور بوڑھوں کی زبان آوری اور سحر بیانی کی یہ کیفیت ہو تو پھر قیاس کر لیجئے کہ وہاں کی جوان اور عورت، پھر وہ بھی شاعرہ کے جذبات اور احساسات کا کیا عالم ہوگا۔

جزیرۂ عرب کے ان خانہ بدوش قبائل میں جو اپنے پاکیزہ احساسات اور عاشقانہ جذبات میں کمال رکھتے تھے، ایک ممتاز قبیلہ بنو عذرہ کا بھی تھا، جس کے حسن وعشق کے افسانوں نے اس درجہ شہرت حاصل کر لی تھی کہ عرب میں "حبا عذریا" کا ایک لطیف محاورہ پیدا ہوگیا تھا۔ جو آج تک ضرب المثل ہے، اسی مقدس سرزمین کے دو جانباز عاشق ومعشوق زرعہ اور ظریفہ بھی تھے۔ ظریفہ جس طرح حسن وجمال میں رشک حور تھی شاعری اور زبان آوری میں بھی فطری ذوق اور کمال رکھتی تھی، ایک مرتبہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ قبیلہ ایک تالاب پر گئی ہوئی تھی، کہ اتنے میں زرعہ بن خالد شکار کھیلتا ہوا اس طرف آنکلا۔ دیکھا تو سامنے ظریفہ تھی، نگاہیں چار ہوتے ہی دل ہاتھ سے کھو بیٹھا۔ سر چکرایا اور بے ہوش ہوکر وہیں گر پڑا۔

مہ جبین ظریفہ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ اٹھی اور اس کے پاس گئی، ہوش میں لانے کی بہت سی تدبیریں کیں لیکن جب کسی طرح ہوش نہ آیا تو تالاب سے پانی لائی اور محبت بھرے ہاتھوں سے پانی کے چھینٹے دینے لگی، چند منٹ میں مریض عشق نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو دلدار کا چاند سا مکھڑا سامنے تھا، آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اور کہنے لگا ھل مقتول بلا دیہ قاتلہ۔ کیا قاتل ہی مقتول کا معالج بھی ہوسکتا ہے؟ ظریفہ بھی دل پر چوٹ کھا چکی تھی، مسکرا کر بولی، پھر آپ کو شکایت کیا ہے؟ اب کیا تھا، پیمان محبت استوار ہوا اور شعلہ نے عشق ومحبت کی شراب ناب سے مخمور ہوکر یہ اشعار پڑھنا شروع کئے۔

(۱) خرجت اصید الوحش صادفت قانصا — میں وحشیوں کا شکار کھیلنے نکلا تھا، مگر سفید رنگ کی غزالہ
من الرھیم صادتنی سریعا حبائلہ — نے خود مجھے بہت جلد دام محبت میں پھنسا لیا۔

(۲) فلما رمانی بالنبال مصادعا — جب تیر مار کر مجھے پچھاڑ چکی تو خود ہی دعا اور پھونک جھاڑ
رقانی وھل میت بلادیہ قاتلہ — کرنے لگی، کیا یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی مقتول کا علاج خود اس کا قاتل کرے

(۳) الا فی سبیل الحب صب قد انقضی — ہاں! راہ محبت میں ایک عاشق تھا، جو جلد ہی ختم ہوگیا۔ اور
سریعا ولم یبلغ سوادا یحاولہ — اس آرزو میں کامیاب نہ ہوا جس کا اس نے ارادہ کیا تھا۔

الدر المنثور فی طبقات الخدور صفحہ ۲۷۰۔

جب ان دونوں طالب ومطلوب کے عشق محبت کا چرچا قبیلہ میں پھیلا تو بے بجا ل ظریفہ کے اعزا نے غریب زرعہ کے قتل کی ٹھان لی۔ عشق کا مارا زرعہ جان بچا کر بھاگا، مگر چلتے چلتے چند اشعار اپنے ایک دوست کو یاد کرا دیئے، اور کہا کہ یہ اشعار کسی طرح موقع دیکھکر ظریفہ کو سنا دینا۔ اشعار کا مفہوم یہ تھا۔

"ایک مریض عشق ہے جو قبیلہ کے گھروں کے قریب ایک گوشہ میں پڑا تڑپ رہا ہے۔ نہ اس کی دوا ہے اور نہ علاج، لوگ مایوس ہوکر کہتے ہیں کہ تم اس کی عیادت کو آؤگی تو وہ جی جائے گا۔ اور جب وہ تم سے مہربانی کی درخواست کریں گے تو تم بخل نہ کروگی"

مہ جبین ظریفہ نے جب یہ اشعار سنے تو فوراً سمجھ گئی کہ ہو نہ ہو یہ میرے عاشق زار زرعہ کا پیام ہے جو اس نے اس طرح میرے پاس پہنچوایا ہے۔ روتی پیٹتی گھر سے

بالآخر کل آتی سا اور جواب میں اس نے فی البدیہہ یہ چند شعر کہے۔ جو بلاغت کی جان کہے جانے کے مستحق ہیں۔

(۱)	رعی اللّٰہ من ھام الفواد بحبہ	خدا اس کی حفاظت کرے جس کا دل محبت میں بے چین ہے، اور جس
	ومن کدت من شوق الیہ اطیر	کے لئے میرا جی چاہتا ہے کہ میں اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں۔
(۲)	لئن کثرت بالقلب انواع لوعۃ	اگرچہ دل میں کثرت سے محبت کے شعلے اٹھ رہے ہیں مگر مجبور
	فان الوشاۃ الحاضرین کثیر	ہوں، چغلی کھانے والے بھی بہت ہیں۔
(۳)	فان لم اذد بالجسم خیفۃ معشر	اگرچہ قبیلہ کے ڈر کی وجہ سے تم سے بظاہر نہیں مل سکتی مگر دل
	فللقلب انی نحوکم فیزور	روزانہ تمہارے پاس آتا ہے اور زیارت کرتا ہے۔

الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۲۷۰۔

زمانہ جاہلیت میں جب کہ اہل عرب کی شاعری بلاغت کے معراج پر پہنچی ہوئی تھی، سخن گئی، سخن فہمی، شعر گوئی اور زبان آوری کا ہر طرف بازار گرم تھا صدہا ایسی خواتین پیدا ہوئیں جن کے کارنامے ادبیات کے وہ زریں صحیفے ہیں، جن کا جواب دنیائے شاعری تا قیامت نہ دے سکے گی۔ اس دور کی مایۂ ناز شاعرہ خنساء کا دیوان جس نے گہری نظروں سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ آج بھی دنیائے ادب اس کی مثال پیش کرنے سے ویسی ہی قاصر ہے۔ جیسا کہ صدیوں پیشتر تھی۔

سوق عکاظ میں جو زمانہ جاہلیت میں نازک خیال اور رنگین طبع شعراء کا دنگل سمجھا جاتا تھا، شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ اور دل کھول کر داد سخن دی جاتی تھی ان میں شعراء کے ساتھ ساتھ اس زمانہ کی صاحب علم و فضل خواتین بھی شریک ہوتی تھیں، جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر خنساء رہی ہے۔ جب وہ آتی تھی تو اپنے بھائی صخر کے کارنامے کو یاد کر کے خود بھی روتی تھی اور سارے مجمع کو بھی رلاتی تھی۔ اس کے ہودج پر ایک سیاہ جھنڈا نصب ہوتا تھا۔ جو اس بات کا نشان سمجھا جاتا تھا کہ اہل عرب میں وہ سب سے زیادہ مظلوم ہے۔

عہد بنو امیہ کے مشہور استاد جریر سے کسی نے پوچھا اشعر العرب کون ہے، اس نے جواب دیا کہ اگر خنساء نہ ہوتی تو میں کہتا کہ "میں ہوں"۔ اسی طرح ایک مرتبہ عہد بنو عباس کے جلیل القدر شاعر بشار نے تذکرۃً کہا کہ عورتیں جب شعر کہتی ہیں تو اس میں ان کی فطری کمزوری کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ کسی نے کہا کیا خنساء کے کلام میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ اس نے کہا۔ تلک فوق الرجال اس کا درجہ مردوں سے بلند ہے۔

نابغہ ذبیانی جو زمانہ جاہلیت کا بڑا زبان آور شاعر تھا خنساء کا بڑا احترام کرتا تھا۔ جب وہ سوق عکاظ کے مشاعروں میں شریک ہوتی تھی، تو نابغہ اس کے لئے خاص انتظامات کرتا تھا، سرخ چمڑے کا ایک عمدہ خیمہ لگایا جاتا تھا، جس میں بڑی عزت و وقار کے ساتھ صدر مقام پر اس کو بٹھایا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ وہ آئی تو حسن اتفاق سے امام فن ابو بصیر اعشٰی، حضرت حسان اور اس زمانہ کے دوسرے مشہور شعراء موجود تھے، سب سے پہلے ابو بصیر اعشٰی نے اپنا کلام سنایا۔ پھر حضرت حسان نے پھر اوروں نے، سب کے آخر میں خنساء نے اپنے دل ہلا دینے والے اشعار سنائے۔ اور خوب خوب داد حاصل کی، نابغہ پر تو وجد کیفیت طاری ہو گئی، بے اختیار بول اٹھا۔

لولا ان ابا بصیر انشدنی آنفاً	اگر ابو بصیر نے ابھی پہلے اپنا کلام نہ سنایا ہوتا تو میں یہی کہتا کہ
لقلت انک اشعر الجن والانس	تم جن و انس سب سے زیادہ باکمال شاعرہ ہو۔

(کتاب الشعر والشعراء مطبوعہ لندن صفحہ ۱۹۰)

حضرت حسان نے خیال کیا کہ نابغہ نے در اصل مجھ پر چوٹ کی ہے، خفا ہو گئے اور کہنے لگے "نابغہ تم نے کیا کہا! خدا کی قسم میں تم سے، تمہارے باپ سے اور تمہارے دا

ملہ الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۱۱۱۔

اچھا شاعر ہوں۔

نابغہ نے حضرت حسان کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا، خفا ہونے کی بات نہیں۔ لو سنو، اور انصاف کرو، پھر خنساؔ سے دوبارہ اشعار سنانے کی درخواست کی، اور کہا میرا مطلب یہ تھا کہ وہ عورتوں میں سب سے بڑی شاعرہ ہے۔ خنساؔ نے یہ سنا تو ناگوار ہوا۔ اور چیخ کر بولی، خوشامد مت کرو، میں مردوں سے بھی زیادہ اچھی شاعرہ ہوں۔

خنساء کا اصلی نام تماضر بنت عمرو بن الشرید السلیمیہ ہے۔ خنساء لقب تھا، جو بعد میں اس قدر مشہور ہوا کہ لوگ اس کا اصلی نام بھول گئے، اس کے دو بھائی صخر بن عمرو۔ اور معاویہ بن عمرو۔ صخر کو بنو اسد نے اور معاویہ کو بنو مرہ بن غطفان نے قتل کر دیا تھا۔ اس کا سارا دیوان انہیں دونوں کے مرثیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ایک جگہ وہ اپنے بھائی صخر کو یاد کر کے آنسو بہاتی ہے۔ اور کہتی ہے۔

(۱) اعینی جودا ولا تجمدا — اے میری دونوں آنکھ آنسو بہا اور خشک نہ ہو
الا تبکیان لصخر الندا — کیا تم دونوں صخر کی داد و دہش پر نہیں روتیں؟

(۲) الا تبکیان الجری الجمیل — کیا تم دونوں ایک بہادر اور خوبرو پر آنسو نہیں بہاتیں؟
الا تبکیان الفتی السیدا — کیا تم دونوں ایک نوجوان سردار پر نہیں روتیں؟

(۳) طویل النجاد رفیع العماد — جو کہ لمبے پرتلہ والا اور بلند مرتبہ تھا۔
وساد عشیرتہ امردا — اور بچپن ہی سے اپنے قبیلہ پر سرداری کرتا تھا۔

(۴) اذا القوم مدوا بایدیھم — جب لوگ استعانت کا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے تھے تو
الی المجد مد الیہ یدا — وہ عزت اور مجد کی طرف اپنا ہاتھ دراز کرتا تھا۔ (کتاب الاغانی مطبوعہ مصر جلد بیزدہم صفحہ ۱۴۰)

شاعری میں کمال رکھنے کے علاوہ خنساء کا شمار جاہلیت کی ان بہادر خواتین میں تھا، جو میدان جنگ میں ہمیشہ مردوں کے دوش بدوش شریک رہتی تھیں، مجروحین کی مرہم پٹی کرتی تھیں، اور مردوں کی لاشیں اٹھاتی تھیں، خنساء کے چار بیٹے تھے، چاروں جنگ قادسیہ میں شریک ہوئے تھے، خنساء نے انہیں وصیت کر دی تھی کہ وہ جنگ سے کسی حالت میں بھی پیٹھ نہ دکھائیں، چنانچہ وہ سب یکے بعد دیگرے شہید ہوئے اس کی اطلاع جب خنساء کو ہوئی تو اس نے کہا۔ الحمد للہ الذی شرفنی بقتلہم۔ (ادب اللغۃ العربیہ جلد اول صفحہ ۱۴۰)

خنساء کی ایک پھوپھی کا نام بھی تماضر بنت الشرید السلیمیہ ہے، وہ بھی اپنے زمانہ کی بڑی زبان آور شاعرہ تھی۔ قبیلہ غطفان اور ہوازن کا سردار زہیر بن جذیمہ اس کا شوہر تھا، جس کو خالد بن جعفر عامری نے جنگ نفرادات میں قتل کر دیا تھا، باپ کے بعد اس کا بیٹا قیس بن زہیر کے بھائی مالک بن زہیر کو غداری سے قتل کر دیا، تماضر نے جب یہ خبر سنی تو بیٹے کی جواں مرگی پر ایک دلدوز آہ کھینچی اور ایک پُر درد مرثیہ کہا۔ جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

(۱) کان العین خالطھا قذاھا — گویا آنکھیں غبار آلود ہوگئی ہیں۔
لحزن واقع افنی کراھا — ایک غم کی وجہ سے جس نے آنکھوں سے نیند اچاٹ کر دی ہے

(۲) علی ولد وزین الناس طرا — میں ایک ایسے بچہ پر آہ و زاری کر رہی ہوں جو تمام لوگوں کے
اذا ما النار لم ترمن صلاھا — لئے زینت اور فخر کا باعث تھا، مہمانوں کیلئے اس کی آگ روشن رہتی

(۳) لئن حزنت بنو عبس علیہ — اگر بنو عبس اس پر رنج کریں تو کوئی تعجب نہیں، اس لئے کہ انہوں
فقد فقدت بنو عبس فتاھا — نے اپنے ایک نوجوان کو کھو دیا ہے۔

(۴) حذیفۃ لا سقیت من الغوادی — حذیفہ خدا کرے تو صبح آنیوالے بادلوں سے کبھی سیراب نہ
ولا روتک ھاطلۃ نداھا — کیا جائے، اور نہ ابر کرم کی تجھ پر کبھی بارش ہو۔

([illegible])

(۵) کما فجعتنی بفتی کریم — تونے ایک شریف نوجوان کو قتل کر کے مجھے دکھ پہنچایا ہے جو
اذا وزنت بنو عبس علاها — اگر تمام بنو عبس کے مقابلہ میں رکھاجاتا تو وہی گراں قدر ثابت ہوتا۔

(۶) فدمعی بعدہ ابداً ھطول — میرے آنسو اس کے بعد ہمیشہ جاری رہیں گے،
وامیرقاء من عینی بکاها — اور میری آنکھوں سے اس پر کبھی آنسو خشک نہ ہوں گے۔

(ریاض الادب فی مراثی شعراء العرب جلد اول صفحہ ۲۴۲)

علامہ جرجی زیدان نے زمانہ جاہلیت کی ان مشہور خواتین میں جن کی شاعری اور ادبیانہ بذلہ سنجی پر ساری صنف نسوان کو ناز تھا خنسا کے بعد لیلی العفیفہ - جلیلہ بنت مرہ، خرق اخت طرفہ کا نام لیا ہے - اور ان کو اس دور کی باقی ماندہ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والی عورتوں پر ترجیح دیا ہے - ذیل میں ہم انھیں کے کلام کا نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

لیلی العفیفہ لکیز بن مرہ کی بیٹی تھی، بچپن ہی میں اس کی براق بن روحان مری کے ساتھ شادی ہوگئی، براق بن روحان اور اس کا چھوٹا بھائی غرثان بن معصان بنو ربیعہ کے نامور شہسوار اور بہادر سردار تھے - غرثان اس جنگ میں مارا گیا جو سنہ ۔۔۔ء میں بنو ربیعہ اور بنو ایاد ولخم کے درمیان واقع ہوئی تھی لیلی العفیفہ غرثان کی جواں مرگی پر آنسو بہاتی ہے۔ اور اس کو میدان جنگ میں تنہا چھوڑ جانے پر بنو ربیعہ کو ملامت کرتی ہے - مرثیہ کے چند شعر درج ذیل ہیں -

(۱) لما ذکرت غوثیا زادنی کمدی — جب میں غرثان کو یاد کرتی ہوں تو میرے دل میں رنج و غم کا ایک طوفان
حتی ھممت من البلوی باعلان — برپا ہوجاتا ہے حتی کہ میں چاہتی ہوں کہ اس مصیبت کو آشکار کروں

(۲) تربع الحزن فی قلبی فذبت کما — غم میرے قلب کے چاروں طرف چھا گیا ہے میں رنج و غم میں اس طرح
ذاب الرصاص اذا اصلی بنیران — پگھل رہی ہوں جس طرح سیسہ پگھلتا ہے جب وہ آگ پر تپایا جاتا ہے

(۳) فلو ترانی و الا شجان تقلقنی — اگر تم مجھے دیکھو دراں حالیکہ رنج و غم مجھے تکلیف پہنچا رہے ہیں
عجبت براق من صبری وکتمانی — تو براق تم میرے صبر اور ضبط پر تعجب کرو۔

(۴) یا عین فابکی وجودی بالدموع ولا — اے آنکھ رو اور آنسو بہا اور اے دل طول مت ہو، جبکہ تو رنج
تمل یا قلب ان تبلی باشجان — والم سے پگھلا جارہا ہے۔
فذکر غرثان مولی الحی من اسد — غرثان کے تذکرہ نے جو قبیلہ بنو اسد کا سردار تھا مجھے اور
انسی حیاتی باہ شاث واشانی — میری زندگی کو مجھ سے بھلادیا ہے۔

(ریاض الادب فی مراثی شعراء العرب جلد اول صفحہ ۲۶۰)

جلیلہ بنت مرہ، جساس بن مرہ کی بہن اور کلیب بن ربیعہ کی بیوی تھی، بدقسمتی سے جساس اور کلیب میں ان بن ہوگئی، اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے، کلیب کہا کرتا تھا کہ میں بزدلوں کی باتوں کی کچھ پروا نہیں کرتا، مرد ہو تو میدان میں آجائے، جس کا جواب جساس یوں دیتا تھا کہ گھبراؤ نہیں میدان جنگ جلد ہی فیصلہ کر دے گا کہ ہم میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا یہ سب کچھ شاعری میں سوال و جواب ہوا کرتے تھے، مگر جب کبھی سامنا ہو جاتا اور دونوں جان دینے اور جان لینے کے لئے تیار ہو جاتے تو غریب جلیلہ بیچ میں پڑکر دونوں کو قسمیں دیتی اور رو رو کر کسی نہ کسی طرح دونوں کو اس خونچکاں جنگ سے باز رکھتی، جس کا نتیجہ بہر صورت اس کے لئے اندوہناک تھا۔ مگر یہ روک تھام تابکے، آخر ایک دن ایسا آیا کہ یہ ساری تدبیریں بیکار گئیں، اور قسمت کا لکھا ہوا پورا ہوا، جساس اور عمرو بن حارث نے مل کر کلیب کو قتل کر دیا، کلیب اپنے قبیلہ کا سردار تھا، اس کی موت کوئی معمولی موت نہ تھی، قبیلہ کی جوان اور بوڑھی تمام عورتیں گریباں چاک سر پر خاک اڑائے ہوئے کھڑی ماتم کر رہی تھیں کہ دفعتہً کسی کی نگاہ ناکردہ گناہ جلیلہ پر جا پڑی سب کے دلوں میں شعلۂ انتقام بھڑک اٹھا، انہوں نے کلیب کی بہن اسماء سے کہا، ہمارے ماتم کدہ میں جلیلہ کی موجودگی ہمارے لئے باعث ننگ و عار ہے۔ یہ تو کلیب کے قاتل کی بہن ہے، اسے یہاں سے فوراً نکالو۔ اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی - اور مصیبت کی ماری جلیلہ روتی پیٹتی وہاں سے چل کھڑی ہوئی۔ اس وقت اس نے جو شعر کہے تھے ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) یا ابنۃ کلا قوام ان ملت فلا
تعجلی باللوم حتی تساء لی
اے خاتون اگر تو ملامت ہی کرنا چاہتی ہے تو ذرا جلدی نہ کرتا کہ
تو لوگوں سے دریافت نہ کرلے۔

(۲) فاذا انت تبینت الـذی
یوجب اللوم فلومی واعذ لی
اگر تجھے کوئی ایسی چیز معلوم ہو جائے جس کی وجہ سے ملامت
کرنا ضروری ہو تو شوق سے ملامت کر اور برا بھلا کہہ۔

(۳) ان تکن اخت امرئ لیمت علی
شفق منہا علیہ فا فعلی
اگر کسی کی بہن محض اس لئے ملامت کی جاتی ہو کہ اسے اپنے
بھائی سے محبت ہے تو ضرور کر۔

(۴) یا کلیب انت لی ذخر المنی
کنت عزی ورداء المسبل
کلیب تو ہی میری آرزوؤں کا مرکز تھا، تو ہی میری
عزت تھا۔ اور میرے فخر کا سرمایہ تھا۔

(۵) ما اظن الدھر یاتی مثلہ
فارس الحرب ومردی البطل
میں نہیں خیال کرتی ہوں کہ زمانہ اس کا جیسا اب پھر پیدا کریگا
جو سر کہ جنگ میں یہا شہسوار تھا، اور بڑے بڑے نوجوانوں کو تباہ کرکے چھوڑتا تھا۔

(۶) جل عندی فعل جساس فیا
حسرتی عما انجلت او تنجلی
مجھ پر جساس کی یہ حرکت بہت گراں گذری ہے، جو کچھ ابتک ہوا یا
جو کچھ ہونے والا ہے اس پر مجھے افسوس ہے۔

(۷) فعل جساس علی وجدی بہ
قاطع ظہری ومدن اجلی
باوجودیکہ مجھے جساس سے محبت ہے مگر تاہم اس کی اس حرکت نے
میری پیٹھ توڑ دی اور میری موت کو مجھ سے قریب کر دیا۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول صفحہ ...)

خرنق بنت بدر بن ہفان الثعلبی زمانہ جاہلیت کے مشہور شاعر طرفہ بن عبد کی اخیافی بہن تھی۔ یہ اپنے زمانہ کی بڑی قادر الکلام شاعرہ تھی، اس کے اشعار کا مجموعہ دیوان کی شکل میں بیروت میں چھپ گیا ہے۔ اس کا زمانہ عہد اسلام سے تقریباً ستر سال پیشتر تھا۔

اس کا بیٹا عبد عمرو بن بشر بادشاہ حیرہ عمرو بن ہند کا مصاحب تھا جب اس کا انتقال ہوا تو دنیا اس کی نظروں میں تاریک ہوگئی، وہ اس کے خاندانی فضائل کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتی ہے۔

(۱) الا ھلک الملوک وعبد عمرو
وخلیت العراق لمن بغاھا
ہاں سلاطین مٹ گئے اور عبد عمرو بھی ہلاک ہوگیا اور عراق کی زمین
اس شخص کے لئے خالی کر دی گئی جو اس پر دھاوا بول دے۔

(۲) فکم من والد لک یا ابن بشر
تأزر بالمکارم وارتداھا
ابن بشر تیرے باپ جیسے کم لوگ ہوں گے جو سر سے پیر تک شرف
بزرگی کے لباس فاخرہ سے آراستہ تھا۔

(۳) بنی لک مرثد وابوک بشر
علی الشم البواذخ من ذراھا
مرثد اور تیرے باپ بشر نے تیرے مفاخر پہاڑی کی چوٹیوں
سے بھی زیادہ بلند کر دیئے ہیں۔

(ریاض الادب فی مراثی شواعر العرب جلد اول صفحہ ۳۶)

زمانہ جاہلیت کی ان مشہور خواتین میں جن کا کلام کتب ادب و شاعری میں کثرت سے ملتا ہے۔ خنساء۔ جلیلہ بنت مرہ۔ لیلی العفیفہ۔ خرنق اخت طرفہ العبدی۔ امیمہ بنت امیہ بن عبد شمس خالدہ بنت ہاشم۔ کبشہ بنت اخت عمرو بن معدی کرب۔ جبہ بنت جابر۔ سلمی بنت المہلہل۔ سلمی بنت مالک بن بدر۔ ہند بنت حذیفہ۔ فاطمہ بنت عبد الاعجم۔ زینب بنت مالک۔ ہند بنت معبد فارعہ بنت شداد۔ آمنہ بنت عتیبہ۔ اروی بنت حباب۔ رقیہ بنت العباس۔ صفیہ بنت عمرو۔ میتہ بنت ضرار۔ ہند بنت اسد۔ لیلی بنت وہب۔ مریم بنت طارق۔ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جن پر صنف نسواں کو جس قدر بھی فخر ہو کم ہے۔ (باقی)

شباب کی بغاوت

یحییٰ نقوی

ہر تعمیر کے لئے تخریب ضروری ہے۔

شباب کا عظیم ترین کارنامہ ایک عالمِ نو کے حصول میں اِن تنگ و خودغرضانہ مقاصد کی غارتگری ہے جس پر قدیم گروہ کا مدار تھا۔

شباب کی نظروں میں اُن کی ساکھ باقی نہ رہی۔ شباب اُن کے غیر مشروط انہدام کا طالب ہے۔

شباب نے شیب کی نفس پرستی، تعصب اور سنگدلی کی بدولت کافی مصائب برداشت کئے، لیکن اب شباب اس کو گوارا نہیں کرے گا۔

شباب مسمار کرے گا اور پھر تعمیر کرے گا۔

شباب ایک جدید جماعت کی طرح ڈالے گا، قدما کی بنیاد کی عمارت پر نہیں بلکہ طرزِ نو پر۔ کیونکہ شباب ایک جدید تاریخ کی تخلیق کرے گا۔ ایک حیاتِ نو لائے گا۔

شباب اسلاف کو پکارتا ہے کہ تم نے ہمارے لئے کیا کیا۔

— تم اپنے مقصد تفریق کے ماتحت تنگ فرقہ بندی کو اُبھار کر نوعِ انسان میں تنفر و اختلاف کا بیج بوتے ہو، تمہارے مذاہب کی تاریخ کیا ہے؟ ایک متواتر نزاع، ایک لامتناہی جنگ، ایک دوامی کشاکش عقائد، اور اس کے پیچھے نادان فریب خوردگان کی ایک قطار، ایک درباری تنفر۔ ایک مستقل تذلیل پاکیزہ روح صداقت کی۔

تم اپنی حرص اور خودغرضی سے مذہب کو جد وجہد کا مانع قرار دے کر اُس کے ستھرے مقاصد کو محض سہولت کی بے کیف خوشی سے آلودہ کرتے ہو۔ ہم اس تاسف انگیز حالت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، تم ہماری نہیں سنتے۔ تم بندگانِ خدا کو خدا کے دروازہ سے نہیں نکالتے۔

اپنی جہالت کے ساتھ تم غلط فہمی کی ظلمت اور دُکھ کے آنسو لاتے ہو۔

تم کہتے ہو خدا تک صرف یہی ایک راہ جاتی ہے، لیکن ہم اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہیں کہ ایسی بہت سی راہیں ہیں جو اُس وجودِ اکبر تک لے جاتی ہیں ہم انسان کی ہر سعی کو خدائی کتاب کا ایک باب سمجھتے ہیں اور حقیقت کو پہچاننے کے لئے ہر باب کو جاننا ضروری ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگر واقعی کوئی صحیح راہ خدا تک پہونچنے کی ہے تو وہ راہ استقلال اور تشنۂ تحقیق حق کی ہے۔ باہمی رواداری و اتحاد کی ہے۔ بھائی چارہ اور محبت کی ہے۔ یہی باب صحیفۂ خدا کا تنہا باب ہے۔ صرف یہی وہ راستہ ہے جو خالقِ اکبر تک لیجاتا ہے۔

تم ہم کو عدم رواداری کا سبق دیتے ہو۔ تم انسانوں میں تفریق کی روح پھونکتے ہو۔ تم ہر انسان کو اُس کے بھائی کے خلاف اُکساتے ہو۔

تمہاری جہالت ہمارے حوصلوں کو اوہام و عقائد کے ہاتھوں تباہ کر دیتی ہے۔

تمہاری جہالت ہمارے افقِ علم کو فرسودہ عقائد اور سطحی خود رائی سے محدود کر دیتی ہے۔

تمہاری جہالت ہماری آنکھوں کو رسم و رواج سے دھندلا کر دیتی ہے۔

تمہاری جہالت ہماری بصیرت کو اصنام و مجسمہ سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔

تم ہم کو فرقہ بندی کے تنگ اُصول کی تعلیم دیتے ہو۔

تم جذبۂ تحقیق کی تحقیر کرتے ہو اور ہماری آنکھوں کو ظاہری چمک دمک سے چند کے حسنِ باطنی سے محروم کردیتے ہو۔

تم طفلِ سعی، تو ہمارے سینوں میں مار کر ہماری انفرادی (ذاتی) پیش روی کا گلا گھونٹ دیتے ہو۔

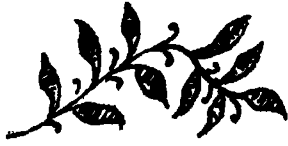
تم ہماری طرف جھوٹے ترجمان بھیجتے ہو جو ہمارے شباب کو ہدف بناتے ہیں۔ خود غرض مکاروں کو بھیجتے ہو جو اپنی حرکتوں سے دغابازی اور ظاہرداری سکھاتے ہیں۔

تم ہمارے آگے بت پرستی کی بدنمائی پر روغن چڑھاتے ہو
تم ہمیں خودداری کا گیت سناتے ہو۔

تم ہمارے سامنے عدم رواداری۔ تنفر اور خود غرضی کی برائیاں پیش کرتے ہو۔

یہ ہیں ہماری شکایات۔ ہم انھیں کے خلاف چلاتے ہیں۔ تم ہماری نہیں سنتے۔ ہم اُن کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ تم ہماری مدد نہیں کرتے۔

اِس لئے، ہم مسمار کریں گے اور تب تعمیر کریں گے۔ ہم ایک نئی دنیا قایم کریں گے۔ ہم ایک نیا زاویۂ نگاہ بنائیں گے۔ ہم نئی زندگی لائیں گے۔



نقشِ عبرت

زمانے کے موافق کب زمانے کے بشر ہوں گے — الٰہی وہ بھی دن ہوگا کہ سب شیر و شکر ہوں گے
چلیں گی آندھیاں بغض و حسد کی ہند میں کب تک — ہم اوراقِ پریشاں بن کے کب تک منتشر ہوں گے
سلامت ہے جو فقر و جہلِ موجود تو آئندہ — نہ ہم اہلِ دول ہوں گے نہ ہم اہلِ ہنر ہوں گے
خبر گھر کی نہیں، لیکن نظر ہے نجد و صنعا پر — بہت کم، دور بیں ہم سے کہیں اہلِ نظر ہوں گے
اگر سینچی گئی کشتِ عمل، خونِ مشقت سے — تو اشجارِ امل سرسبز ہوں گے بارور ہوں گے
رواداری، ملنساری، خوش اطواری، گراں ہی رہی — انھیں سے بین الاقوامی مفاسد بے اثر ہوں گے
ہمیں دورِ تغیر سے مٹیں گے، ورنہ دنیا میں، — یہی شام و سحر ہوگی، یہی شمس و قمر ہوں گے
قطعہ
حوادث زلزلوں کے قحط کے، امساکِ باراں کے — ہماری ہی بداعمالی سے ہوں گے جس قدر ہوں گے
اثر قربِ قیامت کا ہے ظاہر ان عذابوں سے — کہ ہوتے تھے بہت کم پیشتر، اب بیشتر ہوں گے

رہیں گی نقشِ عبرت بن کے احسنؔ تیری یہ باتیں
نہ ہوگا تو جہاں میں، تذکرے تیرے مگر ہوں گے

(احسن مارہروی)

حُسن و عشق

میکش اکبر آبادی

حسن و عشق مادرِ فطرت کے توام بچے ہیں، ایسے توام کہ ایک کے بغیر دوسرے کا نہ تصور کیا جاسکتا ہے نہ تعریف، اور پھر رات، دن، نیکی بدی کی طرح آپس میں اضداد بھی نہیں ہیں، بلکہ

ہمارا عشق اک صورت ہے اُن کے حُسنِ کامل کی
وہ ہوتے ہیں تو اُن کا چاہنے والا بھی ہوتا ہے

حکما کا عقیدہ ہے کہ ایک ذرّہ عشق سے خالی نہیں جس طرح کسی چیز کا وحدت سے معرّا ہونا محال ہے۔ علمائے سائنس کے ذرّوں کی کشش باہم کا نامعلوم راز محبت ہی ہے کاش محبت اُن کو نظر آسکتی، یا کسی آلے سے معلوم کی جاسکتی۔

اسلامی نظریے کی رُو سے دنیا کی پیدائش محبت ہی کی مرہونِ منت ہے ورنہ حسن کا کنزِ مخفی راز ہی رہتا۔ عشق کی بے چینی حُسن کی خواہش ذاتی ہے۔ اور اس بت خانے کی تعمیر کا ملزم خود وہی ہے۔

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں — میرؔ

ہم جب کسی چیز کو سمجھانا چاہتے ہیں تو دوسری چیزوں کی مدد سے سمجھاتے ہیں وہ دوسری چیزیں جن کو ہمارا مخاطب جانتا ہے یا جاننے کے زعم میں ہے اس لئے جو چیزیں اپنی مثال نہیں رکھتیں اُن کی تعریف نہ ہوسکی نہ ہوسکے۔

آہ غریب انسان تیرا علم اور تیرے دعوے۔

اب ذرا فلسفے کی موشگافیاں بھی سُن لیجے۔ پھول کا عرق کھینچئے، اُس کی پنکھڑیوں کا گلقند بنائیے۔ سب کام کی چیزیں ہیں لیکن بیماروں کے لئے۔

دو چیزیں جب ایک جنس کی ہوتی ہیں تو آپس میں ضم ہونے اور ملنے کی خواہش رکھتی ہیں اس لئے لطیف طبیعتوں کی خواہش اور میلان نفیس صورتوں اور اچھی چیزوں کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ انسان کے مزاج میں اعتدالِ حسن قدر زیادہ ہوگا اسی قدر اس کا میلان اچھی صورتوں، لطیف نغموں اور نیک عادتوں کی طرف زیادہ ہوگا۔ اس لئے کہ یہ سب نہال ایک ہی چشمے سے سیراب ہوتے ہیں۔ اس اتحاد کی خواہش کا نام محبت ہے۔ یہ شریف نسبتیں یعنی اعتدالِ مزاج اور حسن جب دو مظہروں اور دو انسانوں میں ظاہر ہوں گی، تو لازمی طور پر ایک میں کم ہونگی اور ایک میں زیادہ، اس لئے کہ استعدادوں اور قابلیتوں میں باہم اختلاف ہے۔ عاشقی اس طرف سے ظاہر ہوتی ہے جس طرف یہ نسبتیں کم ہوں اور معشوقیت اس طرف سے جلوہ گر ہوتی ہے جس طرف زیادہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ کم اور کمزور چیز کو زیادہ اور طاقت ور چیز اپنی طرف کھینچتی اور جذب کرلیتی ہے۔ اسی لئے عاشقی فنا چاہتی ہے اور معشوقیت بقا۔

ہوں طالبِ فنا میں بہ عنوانِ ہر جنوں
ہستی مری گناہِ محبت کا راز ہے

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح مادیات اور عناصر ہر وقت اپنے مرکزوں کی طرف متوجہ اور ان میں مِل جانے کے لئے کوشاں ہیں، یہی اصول مجردات میں بھی کار فرما ہے۔ روح یا نفسِ ناطقہ جو مجردات میں سے بلکہ مجردات کی ایک

لطیف تجلی ہے، اور اس عالم آب و گل میں وارد اور مقید یا متجلی ہے، ہر وقت اپنی اصل کی طالب ہے۔ حسن، مناظر لطیف، نغمہائے دلکش۔ یہ بھی مجردات ہی کے عکس ہیں۔ روح جب ان جلوہائے دلربا کو محسوس کرتی ہے تو ان میں جذب ہوجانا چاہتی ہے۔ یہ کیفیت کمی زیادتی۔ موقع۔ محل کے اعتبار سے سرور۔ اضطراب۔ سکر۔ بیخودی۔ وجد عشق مختلف ناموں سے موسوم ہوتی ہے اور اپنے انجام کے اعتبار سے فنا و موت یعنی لقا و حیات دوام۔

"موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست تک پہنچا دیتا ہے۔" (حدیث)

جو روح مادیات کے جس قدر زیادہ زیر اثر ہوگی اسی قدر اس میں قوت پرواز کم ہوگی اور اسی قدر یہ کیفیات و احساسات اس میں کم ہوں گے۔

فلسفیوں کے نزدیک اعتدال اس نسبت وحدت کا نام ہے جو دویا چند چیزوں کے تناسب سے حاصل ہوتی ہے، روح کا بدن سے تعلق اسی نسبت وحدت و اعتدال کے سبب سے ہے جو عناصر کے اجزا میں ہے۔ اسی نسبت کے زائل ہونے کا نام موت ہے۔ لطیف نغموں اور اچھی صورتوں میں جو تاثیریں ہیں وہ وحدت تناسب ہی کے سبب سے ہیں۔ درحقیقت روح اسی کی عاشق ہے اور یہی سبب ہے کہ یہ شریف نسبت جہاں کہیں بھی ہو روح کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مثلاً حسن جو اسی خاص تناسب کا نام ہے جو اعضا میں ہو، بلاغت و فصاحت بھی وہی تناسب ہے جو اجزائے کلام اور کلام اور مقتضائے کلام میں ہو، اسی طرح نغموں کی تاثیریں بھی اسی تناسب کی رہین منت ہیں جو مختلف آوازوں میں پایا جاتا ہے۔

غرض وہی ایک شے ہے جو اگر عنصری مرکبات کے اجزا میں ظاہر ہو تو اعتدال مزاج ہے اور اگر ملکات نفس میں ہو تو عدالت ہے۔ کلام میں واقع ہو تو فصاحت و بلاغت اور آوازوں میں نغمۂ دلکش ہے۔ حرکات میں لَے اور رقص موزوں اور اعضا میں حسن نظارہ سوز ہے۔

روح اسی کی عاشق ہے کسی صورت سے سامنے آئے اور کسی لباس میں ظاہر ہو۔

زلف مشکبو کا غم دل کو وقف کیوں کرے
دل کو جو کرے برہم زلف مشکبو ہی ہے

حدیث میں ہے۔ "خدا جمیل ہے اور جمال سے محبت کرتا ہے" شیخ ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "جو خدا سے مانوس ہے وہ ہر دلربا صورت سے مانوس ہے"

جو حکم اصل کا ہے وہی فرع کا ہے اس لئے ازلی محبت کا راز ہر شے میں ہے اور سرمدی عشق کا پرتو ہر ذرے کے آئینے میں نمودار، اسی محبت کا پرتو ہے کہ عناصر میں میل طبعی، نباتات میں مبدء نشو و نما، حیوانات میں قوت شوقی اور جذبۂ الیم اور کامل انسانوں کے نفوس میں عشق پاکیزہ کی صورت میں متجلی ہے۔

سیہ فام

اے کہ گیسو کی طرح نرم و سیہ فام ہے تو
چشم بد دور کہ خال رخ ایام ہے تو

تیرے چہرے کی سیاہی ہے غلاف کعبہ
شب تاریک میں رعنائی الہام ہے تو

تیرے چہرے میں ہے افسانۂ ایماں بالغیب
نقطۂ دائرۂ مسلک اسلام ہے تو

تشنۂ گیتی کے لئے تو ہے سیہ مست سحاب
خستۂ دنیا کے لئے نیند کا پیغام ہے تو

تیرے عارض میں ہیں ساون کی اندھیری راتیں
صبح وعدہ کی دل افروز و خنک شام ہے تو

جوش

" کلیم " دھلی



سیدمحمد علی شاہ صاحب میکش اکبرآبادی

Coronation Printing Works Delhi

"کلیم" دہلی



اے کہ کاکل کی طرح نرم و سیاہ فام ہے تو
چشم بد دور کہ خال رخ ایام ہے تو

رفتارِ وقت

ادارۂ کلیم

اٹلی اور حبش

ماہ اپریل میں سرزمین حبشہ نے جس کے سیاہ رنگ حبشیوں کو سفید فام یورپ "غیر مہذب" "جنگلی" اور "وحشی" کے خطاب سے یاد کر رہا ہے، یورپ کی ایک نام نہاد مہذب ترین قوم کی ایسی ہیبتناک درندگی اور دنائت کا مشاہدہ کیا ہے جو اس صدی میں اور اس صدی سے قبل ظالم سے ظالم اور خونخوار سے خونخوار اور غیر مہذب قوم سے سرزد نہ ہوئی تھی۔ اس درندگی پر جو زہریلی گیس چھوڑ چھوڑ کر، فضائے آسمانی سے شیطانی گولے غیر مسلح آبادیوں پر برسا کر زخمیوں کے ہسپتالوں کو تباہ و برباد کر کے صرف نیرو اور سیزر ہی کے خون آشام فرزندان فروغ ناز کر سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اٹلی کے قاہر، جابر، ظالم اور انسانیت کے جذبات سے ناآشنا خونی سپاہی آج فاتحانہ نعرے لگا رہے ہیں۔ اُنھوں نے شہنشاہِ حبش کی "وحشی" فوج کو درندوں سے زیادہ خونخوارانہ قتل و غارت کر کے شکست دیدی ہے۔ وہ آج دیسی پر قابض ہیں۔ ججیکا پر اُن کی حکومت ہے اور ممکن ہے کہ حرار پر بھی اُن کا جھنڈا لہرانے لگے۔ مگر اہل حبش نے بھی ملک کے تحفظ کے لئے جانوں کی بازی لگا رکھی ہے۔ وہ شاہِ حبشہ جس کو روما کی اطلاعات "کبھی قتل کرتی ہیں اور کبھی تختِ سلطنت سے "دست بردار" ہنوز اپنے "سفید فام" درندہ صفت دشمن" کے مقابلہ میں سرگرم پیکار ہے۔ اٹلی کی افواج "تمدن" اور "انسانیت" کے تمام آئین و ضوابط کو یک قلم فراموش کر کے عدیس ابابا کو چاروں طرف سے گھیرنے میں مصروف ہے اس کی افواج کے آگے آگے مکر و فریب سے بھرے ہوئے جھوٹے اعلان "ہوائی جہاز کے گولوں کے ساتھ ساتھ پھینک رہے ہیں۔ عورتیں، بچے، بوڑھے اپنے اپنے گھروں کو خالی کر کے جنگلوں اور پہاڑی چٹانوں میں چھپنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر حبش کی مایۂ ناز ملکہ لوہے کی لاٹھ کی طرح اپنی جگہ پر قائم ہے اور اپنے نازک جسم کو اٹلی کے ظلم و جور کا شکار بنانے کے لئے آمادہ ہے اُسے شاید اِس جلوسِ فتح میں بھی پابہ زنجیر شرکت کرنے سے انکار نہ ہو جو سیزر اور نیرو کے قائم مقام موسیولینی روم میں حبش کی کامل شکست کے بعد نکالے گا۔

حبش کو یورپ کی فرنگی مسیحی اقوام پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ اٹلی کی بہیمیت کے روکنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔ مگر لیگ اقوام ابھی مجالسِ صلح کی تشکیل ہی کر رہی ہے۔ اٹلی گولہ بارود لئے عدیس ابابا کے قرب میں منڈلاتا پھر رہا ہے۔

اٹلی نے موجودہ جنگ پر جو کثیر اخراجات کئے ہیں اُن کا اندازہ مندرجۂ ذیل تخمینہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

فوجی اخراجات جو سال رواں میں منظور کئے گئے	۱۳۹،۰۰۰،۰۰۰	پونڈ
مزید اخراجات جو " " "	۲۳،۰۰۰،۰۰۰	"
میزان	۱۶۲،۰۰۰،۰۰۰	پونڈ
۱۲ر اکتوبر ۳۵ء سے اب تک اٹلی جو خرچ کر چکا ہے	۱۱۶،۰۰۰،۰۰۰	پونڈ
فوجی اخراجات فی ہفتہ	۴،۵۰۰،۰۰۰	پونڈ

اِن اعداد و شمار کے مقابلہ میں حبش بالکل غریب ہے۔ اس غریب کو قرض بھی میسر نہ آسکا۔ اور لیگ اقوام کے کسی ممبر نے اِسے کوئی امداد نہیں پہنچائی محض

کمیٹیوں کے انعقاد اور الفاظی الجھنوں میں تمام وقت ضائع کر دیا۔ شہنشاہِ حبش کو قرضے کی اپیل میں صرف ۵۰۰ ا پونڈ موصول ہوئے اور وہ بھی صرف اپنے دوستوں سے۔

تاہم اہلِ حبش کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ جبتک ایک حبشی بھی زندہ ہے وہ اٹلی کو چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ چنانچہ ڈیسی اور عدیس ابابا کے درمیان جو سڑک ہے وہ عساکرِ حبشہ نے بالکل اڑا دی ہے اور اُسے ناقابلِ استعمال کر دیا ہے۔ سڑک مذکور کو ٹھیک حالت میں لانے کے لئے کم از کم دو ماہ لگ جائیں گے اور جب تک بارشیں شروع ہو جائیں گی۔ اٹلی کی شکست اور فتح کا انحصار صرف انہی بارشوں پر موصوف ہے کیونکہ اس کا جملہ سامانِ حرب گیس بارود وغیرہ سب بےکار ہو جائیں گے۔ اور حبشہ کو پہاڑوں کے دروں میں سے حملہ کرنے کا اطمینان سے موقعہ مل جائے گا۔

موجودہ حالات میں لیگ اقوام بھی بے دست و پا ہے اٹلی کے موجودہ روّیہ سے کسی قسم کی شرائطِ صلح کو ناممکن بنا دیا ہے۔ اٹلی کے خلاف لیگ اقوام نے جو پابندیاں عاید کی تھیں اُن پر بھی عمل نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ممبرانِ لیگ کے درمیان تفرقہ اور نااتفاقی پیدا ہو گئی ہے جو نئی مصیبت وارد ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جرمنی نے رائن لینڈ پر قبضہ کر لیا ہے اور لیگ کے دو زبردست ممبروں یعنی انگلینڈ اور فرانس کی تمام تر توجہ اس طرف مبذول ہو گئی ہے اور حبش اٹلی کے رحم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایسے حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ دستِ غیب حبش کی مدد کرتا ہے یا ملکہ سبا بلقیس کا یہ مایۂ ناز وطن اٹلی کے غلام ملکوں کی فہرست میں جگہ پاتا ہے۔

جنگِ یورپ

حبشہ اور اٹلی کی آویزش سے جرمنی کو جو خداداد موقعہ سابقہ عہد و مواعید کے توڑنے کا ملا ہے اس سے اس نے پورا فائدہ اُٹھایا ہے اور رائن لینڈ سے اُس کو بے دخل کرنے کی سب مساعی ناکام ہو چکی ہیں۔ لیکن جرمنی کے اس اقدام نے یورپ کے تمام ملکوں کے لئے اعلانِ جنگ کے بگل کا کام دیا ہے۔ آسٹریا ہنگری میں ہر بالغ کی بھرتی ہو رہی ہے۔ پولینڈ۔ ہالینڈ۔ بلجیم اپنی اپنی تلواروں کو صیقل کر رہے ہیں۔ انگلستان کی بری فوج اور بحری اور ہوائی بیڑے کی برق رفتار توسیع عمل میں آ رہی ہے۔ ترکی دردانیال اور گیلی پولی کے قلعوں کے استحکام کا حق دار

بن چکا ہے۔ اور بعض خبروں کے بموجب اس بین الاقوامی وغیر فوجی علاقہ میں جرمنی کی طرح اپنی فوجیں اتار چکا ہے۔ اس فعل کو سویٹ روس حق بجانب قرار دے رہا ہے۔ شام کے فرانسیسی مقبوضے کے خلاف عراق و حجاز کے معاہدے ہو چکے ہیں۔ روس و جاپان ایک دوسرے کا کشت و خون کرنے کے لئے بالکل تیار منگولیا کی حدوں پر کھڑے ہیں۔

غرض ایک عالمگیر جنگ کے برپا ہونے کے لئے تمام اسباب جمع ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے دن اور وقت تعین کرنے کا اختیار صرف انگلستان کو حاصل ہے جو اس وقت تمام دنیا کی بین الاقوامی سیاست کا ٹھیکیدار ہے دیکھنا چاہئیے کہ جنگِ عظیم کی طرح کس واقعے کو بنائے فساد بنایا جائے گا جس سے آتشِ جنگ کے شعلے تمام دنیا میں بھڑک اٹھیں گے۔ اور دنیا کا کوئی ملک اُن کی لپیٹ میں آئے بغیر نہ رہ سکیگا۔ مگر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئیے کہ پچھلی جنگِ عظیم کی طرح آنے والی جنگ بھی محض اقتصادی مشکلات کی رہینِ منت ہو گی۔ کیونکہ ہر ملک میں جو شدید جذبہ۔ سرمایہ داری کی جمہوری اور آئینی حکومتوں کا تختہ پلٹ کر اُس کی جگہ اشتراکی نظام کے قائم کرنے کا کارفرما ہے وہ صرف اقتصادی مشکلات سے پیدا ہوا ہے جس کا حل وہ حکومتیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی ہیں اور تاشیٹ کی کڑوی گولی بھی اس مہلک مرض کا مداوا نہ کر سکی اب اِن سب کے لئے ایک ہی چارۂ کار رہ گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ صرف ایک عالمگیر جنگ۔ جو کچھ عرصے کے لئے اس اقتصادی انقلاب کو روک سکیگی جو دنیا کے ہر ملک کو دھمکا رہا ہے۔

جاپان کا تازہ انقلاب

۲۶ فروری کو صبح ۵ بجکر ۳۰ منٹ پر امپیریل جاپانیز آرمی کے پہلے ڈویژن کے سپاہیوں نے کپتان نوناکا کی سرکردگی میں بغیر اپنے ڈویژن کے کمانڈر کو مطلع کئے غدر کیا اور حکومت کے وزراء اور بڑے عہدہ داروں کو قتل کر دیا۔ کیوں؟ اس کا جواب خود انہی فوجی افسروں کے اعلان میں بہت صاف ہے جو اس غدر کے ذمہ دار تھے۔

"ہم نے یہ کارروائی اس لئے کی کہ جو پرانے ماہرینِ سیاست، بڑے عہدہ دار، اقتصادی، فوجی اور سیاسی گروہ ملک کو خرابی میں مبتلا کر رہے ہیں اور برائی کا سرچشمہ ہیں اُنھیں مٹا کر قوم کی حفاظت کریں اور اُن کے اثر سے قوم کو

نجات دیں۔ اور یہ بیان ہم جاپان کی قومی پالسی کا تحفظ کرنے اور اس فرض کی بجا آوری کے لئے دے رہے ہیں جو تاج کی طرف سے ہم پر عاید ہے " گویا یہ حادثہ جس میں جاپان کے تین سابق وزرائے اعظم اور بڑے بڑے ماہرین سیاست قتل ہوئے قوم اور ملک کی محبت ہی میں وقوع پذیر ہوا۔ مقتولین کی مجموعی تعداد ۸۰ بتائی جاتی ہے۔

دنیا متحیر رہ گئی کہ قوم اور ملک کی خدمت کا یہ کون طریقہ تھا۔ مگر جاپان میں یہ نئی بات نہیں۔ جاپان میں سیاسی اختلافات کی بنا پر قتل قومی معمول ہے موجودہ جاپان جس کی عظمت اور شوکت نے ساری دنیا کو متحیر کر دیا ہے اس قسم کی ایک قاتلانہ مہم کی بنیاد پر تعمیر ہوا ہے۔ ایک پروگرام بنا کر شاید ایک رات میں وہ سب لوگ قتل کر دیئے گئے تھے جو جاپان میں نیا نظام قایم کرنے کے مخالف تھے۔ ۱۹۲۱ء سے لے کر اس وقت تک بہت سے ماہرین سیاست قتل ہو چکے ہیں۔

وزیر اعظم ہاماگچی کو اس توہین کا باعث قرار دیا گیا جو معاہدہ واشنگٹن سے جاپان کے نوجوان فوجی گروہ نے محسوس کی۔ اور ۱۹۲۱ء میں قتل کر دیا گیا۔

وزیر اعظم ہاماگوچی اور بیرن واکت سوکی جو لندن کی بحری کانفرنس میں جاپان کے خاص نمائندے تھے ۱۹۳۰ء میں اس لئے قتل کر دیئے گئے کہ وہ ۳۔ ۵۔ ۵ کے تناسب کے موید تھے۔

لیگ اقوام منچوریہ پر جاپان کے قبضے کی سخت مخالف تھی۔ لیگ کے اس طرز عمل پر احتجاج کرنے کے لئے ۱۹۳۲ء میں وزیر اعظم اینوکائی اور وزیر مال انوئی کو قتل کر دیا گیا۔

بیرن ڈان ایک بہت بڑا مہاجن تھا۔ اس کو ۱۹۳۲ء میں اس لئے قتل کر دیا گیا کہ مالداروں کو تنبیہ ہو جائے اور وہ سیاست میں دخل نہ دیں۔

میجر جنرل ناگاتا افسر دفتر امور عساکر کو ۱۹۳۵ء میں اس وجہ سے قتل کیا گیا کہ اُس نے سیاسی خیال کے افسروں کا تنزل کر دیا تھا۔

اسی سلسلے میں یہ اسّی قتل بھی ہیں جو ۲۶ فروری کو ہوئے۔

جاپانی روایات اور قومی معمول

جاپان ایک عسکریت پسند قوم ہے اور اس کا نظام حکومت بھی عسکری ہے۔ بظاہر گورنمنٹ اور اس کے تمام لوازم نظر آتے ہیں۔ لیکن واقعی جاپان کی سیاست فوجیوں کے ہاتھ میں ہے کسی کی طاقت نہیں ہے کہ جاپان کی فوج اور بیڑے کے بجٹ میں ترمیم کر سکے۔ فوجی قائد اپنے آپ کو جاپان کی قومی روایات اور وقار کا محافظ سمجھتے ہیں۔

شہنشاہ جاپان کے ساتھ اُن کو اور تمام قوم کو انتہا درجے کی عقیدت ہے وہ اُس کو درجہ الوہیت دیتے ہیں اور تمام برکتوں اور نعمتوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ دوسرے ممالک پر فوج کشی اور فتوحات اُن کے نزدیک ایک عبادت ہے اور شاید سب سے بڑی۔ گویا وہ اپنے شہنشاہ کی اُن برکتوں کو جو خود انھیں حاصل ہیں۔ تمام دنیا میں فتوحات کے ذریعہ پہنچانا اپنا فریضہ دینی سمجھتے ہیں۔

اب وہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ جاپان میں اعتدال پسند ماہرین سیاست کا اثر بڑھ رہا ہے اور یہ اثر جاپان کی فوجی مہمات اور فتوحات کے لئے مضر ہے۔ پھر وہ اُن لوگوں سے بہت ہی ناخوش ہیں جنھوں نے یورپین طور وطریق اختیار کر لئے ہیں اور جن کی وجہ سے یورپین معاشرت، اخلاق اور دلچسپیاں جاپان میں ترقی کر رہی ہیں۔ مثلاً سینما اور ناچ وغیرہ۔ وہ زراعت پیشہ طبقے کی اقتصادی خوشحالی کو ہر چیز پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور شہریوں کی سرمایہ دارانہ ثروت کو بہت بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔

اِن مقاصد کی تکمیل اور بُرے اثرات کے انسداد کے لئے جاپان میں خفیہ انجمنیں قائم ہیں جن کا فوج سے گہرا تعلق ہے۔ جب کسی شخص کو جاپان کے قدیم نظریات روایات اور فاتحانہ اسکیم کا وہ مخالف پاتے ہیں اُس کو قتل کر دیتے ہیں۔ ان خفیہ انجمنوں میں قابلِ قتل لوگوں کی ایک فہرست رہتی ہے جس کا نام اس فہرست میں درج ہو جاتا ہے وہ خواہ اپنے تحفظ کے لئے کچھ کرے۔ بچ نہیں سکتا۔

ان مقاصد کی تکمیل کے لئے جنھیں جاپانی اچھا سمجھتے ہیں کسی کو قتل کر دینا جائز سا ہے۔ بہت ہی اچھی بات سمجھی جاتی ہے۔ خودکشی جسے اُن کی زبان میں 'ہراکری' کہتے ہیں اسی قدر معزز اور مقدس فعل ہے جیسے بعض قوموں میں شہادت۔ چنانچہ اس قاتلانہ ہنگامے میں جو لوگ سرغنہ تھے اُن کو حکومت نے 'ہراکری' کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ اور اُنھوں نے جدید طریقے پر یعنی ریوالور سے 'ہراکری' کی۔ اب انھیں مجرم کوئی نہیں کہہ سکتا۔ حکومت نے 'ہراکری' کی اجازت دے کر خود اُن کی نیک نیتی اور اخلاص کا اعتراف کر لیا۔ ساری دنیا اِن سپاہیوں اور افسروں کو جنھوں نے یہ قتل کئے قاتل سمجھتی ہے۔ اور شاید نفرت کی نظر سے دیکھتی ہو۔ مگر جاپانی ہمیشہ

اُنھیں ہیرو سمجھیں گے اور اُن کے اِس کارنامے پر فخر کریں گے۔

جاپان کا قومی لٹریچر اسی قسم کے قتل اور بہادری کے افسانوں سے بھرا ہوا ہے۔ بچوں کا کیرکٹر بنانے کے لئے اور اُن کا اخلاق بلند کرنے کے لئے یہ افسانے اُنھیں پڑھائے اور سنائے جاتے ہیں۔

دوشنبے کو جاپانی انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا۔ اس انتخاب میں اعتدال پسند گروہ کے لوگ زیادہ کامیاب ہوئے۔ چہارشنبے کو اعتدال پسندوں میں جو بڑے بڑے آدمی تھے قتل کر دئے گئے۔

جاپان کا فوجی پروگرام

اس خونریزی کے وجوہ اور نتائج بالکل صاف ہیں۔ جاپان میں کوئی ایسی گورنمنٹ کامیاب نہیں ہو سکتی جو عسکریت پسند نہ ہو اور فتوحات کے ذریعہ ساری دنیا میں شہنشاہِ جاپان کی برکات کو عام کرنے کی اسکیم کو پورا کرنے کے لئے مصروفِ عمل نہ رہے۔ یہ فتوحات کی اسکیم بھی کوئی مبہم اور مختصر سی اسکیم نہیں ہے ایک مرتب پروگرام ہے جس میں وقت اور ذرائع تک کا تعین کر دیا گیا ہے۔ پہلے سارا چین فتح کیا جائے گا پھر ہندوستان اور اس کے بعد شاید ساری ایشیا۔ یہ پروگرام شہنشاہِ جاپان کی فرمائش سے بنایا گیا۔ کسی چینی کلرک کے ذریعہ سے چروایا گیا اور چین میں شائع ہوا۔ جاپانی گورنمنٹ نے اس کے غلط ہونے کا اعلان کیا مگر یہ اعلان جھوٹا تھا اسی پروگرام پر جاپان عامل ہے اور وہی حکومت اور ماہرینِ سیاست مقبول ہوں گے جو اس پروگرام کو جلد اور قوت کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کریں گے اور جو اس کے خلاف یا عمل میں سست ہوں گے قتل کئے جائیں گے۔

ہندوستان

اس مہینے میں بڑی دھوم دھام سے سیاسی جماعتیں اپنے اجلاس ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں منعقد کرنے میں مصروف ہیں۔ مگر سارے سیاسی ہندوستان کی نظریں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس کی کارروائیوں پر لگی ہوئی ہیں۔ جو کچھ ان مجالس میں ہوا ہے وہ قریب قریب تمام تعلیم یافتہ جماعت کے علم میں آ چکا ہے۔ اس لئے ان تفصیلات کا تذکرہ تضیع اوقات کے مرادف ہوگا۔ لیکن ایک حقیقت بنہایت نمایاں طور پر جلوہ گر ہو گئی ہے کہ ہندوستان کی تمام وہ سیاسی جماعتیں جو منظرِ عام پر بہت عرصے سے جلوہ فرما ہیں ہندوستان میں ایک معاشرتی انقلاب کے امکان سے خوفزدہ ہو گئی ہیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے صدر سر وزیر حسن کے خطبۂ صدارت کو اگر غور سے پڑھا جائے تو ہمارے اس خیال کی تصدیق ہوگی۔

"دوسرے ممالک کی طرح ہمیں بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری موجودہ حالت میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور جب تک یہ تبدیلی جلد ظہور میں نہ آئے گی ہمارے اس معاشرتی نظام کی عمارت دھڑ سے نیچے گر جائے گی۔ اور اس انہدام کے ساتھ نہ صرف ہماری قوم کا تعلیم یافتہ طبقہ بلکہ ان تمام جماعتوں کی ہستی حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گی جو "ذات" "زمین" یا "روپے" کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔"

سر وزیر حسن نے اپنے خطبے میں آگے چل کر بہت دبی زبان سے کہا کہ ہمارے اس قدیم مستحکم نظام کی جگہ جو دوسرا نظام انقلاب لا رہا ہے اس کی تعمیر میں ہمیں بھی دلچسپی لینی چاہئے۔ کیونکہ اس صورت میں ہماری بقا ممکن ہے۔

اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو صدر کانگریس نے بھی بڑے زور شور سے اشتراکیت کی حمایت کی گئی ہے اور اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ ہندوستان کے مسئلہ کو بین الاقوامی مسائل کا ایک جزو قرار دیا جاوے اور کہ اگر ہندوستان کی تحریک کو اس عام بین الاقوامی تحریک سے علیحدہ رکھا گیا جو سرمایہ دار اور سامراجی قوتوں کے خلاف دُنیا میں ایک نیا جمہوری نظام قایم کرنے کے لئے جاری ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان اِس زبردست قوت کے سہارے سے محروم ہو جائے گا۔ جو اس عالمگیر تحریک کی پشت پر ہے اور ہندوستان کو اپنی جنگ یکہ و تنہا ہی لڑنی پڑے گی۔ یقیناً ہندوستان اور کانگریس کی سیاست میں یہ ایک نیا پیغام ہے۔ نیا نقطۂ خیال ہے اگر ہندوستانیوں کے تخیل میں اس سے تبدیلی پیدا ہوئی اور اپنی سیاست کو بین الاقوامی نقطۂ نظر سے دیکھنے لگے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے بہت سے پیچیدہ مسائل حل ہو جائیں گے۔

کانگریس کے رزولیوشن

کانگریس کے اجلاس سے کئی روز قبل سبجکٹس کمیٹی میں رزولیوشنوں پر بحث شروع ہو گئی تھی۔ سوشلسٹ اور قدیم خیال کے کانگریسی یہ دو گروہ تھے۔ جن میں ابتدا سے آخر تک کشمکش رہی حتیٰ کہ اجلاسِ عام میں بھی سوشلسٹوں نے

(بقیہ دیکھو صفحہ [illegible])

نقد و نظر

ادارۂ کلیم

سالنامہ سہیل سنہ ۱۹۳۶ء

انجمن اردوئے معلیٰ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا یہ سہ ماہی رسالہ ۱۹۲۷ء کے بعد سے معرض التوا میں تھا۔ اور اب سالنامے کی صورت میں شائع ہوا ہے، کارکنان انجمن مستحق شکریہ اور قابل مبارکباد ہیں کہ "صورت حال کو امید افزا دیکھ کر جلد سے جلد آمادۂ کار ہوگئے" اور اس سفید مجلے کو پھر جاری کر دیا، اگر دیگر تمام وجوہ سے قطع نظر کر بھی لی جائے تو محض یہ وجہ کافی ہے کہ کسی دار العلوم سے ایک ذی وقعت علمی و ادبی رسالہ کا شائع ہونا نہایت ضروری ہے۔

زیر نظر سالنامے کی ترتیب و تدوین اور مضامین کا تنوع اور لہجے کی متانت اردو صحافت میں ایک مثال ہے۔

شذرات میں رشید صاحب نے بہت سی کارآمد باتیں لکھی ہیں اور نہایت معقولیت کے ساتھ۔

"مصوری کے میلانات نو" ایک اہم اور سبق آموز مقالہ ہے۔ صاحب مقالہ اس کو آسان تر بنا سکتے تھے۔ نقاشی کی اصطلاحات کے متعلق یہ بات فیصلہ طلب ہے کہ آیا ہم کو اپنی اصطلاحات وضع کرنا ہیں یا انگریزی کی اصطلاحیں اختیار کرنا ہیں۔ ڈاکٹر سلیم الزماں نے اس مضمون میں کہیں ترجمہ دیا اور کہیں انگریزی کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہ ایک طریقہ اختیار کرکے اس فن کی تمام اصطلاحوں کے مترادفات بھی شائع کر دیتے۔ چونکہ نقاشی کی تعلیم انگریزی میں دی جاتی ہے، اور اس لئے بھی کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور نقاشی کے مختلف اسکولوں میں اصطلاحات کے باب میں اتحاد رہے ہم ڈاکٹر صاحب سے توقع رکھتے ہیں کہ مختلف سوسائٹیوں سے مراسلت کرکے انگریزی مصطلحات میں تار بدنے کا کام لے کر ان کو عام کرنے کی سعی کریں گے۔

"دیوانے (ڈراما)" غالباً ترجمہ ہے، اور ایک اعلیٰ ادب پارہ۔ جعفر صاحب کا ترجمے کے لئے اس ڈراما کو انتخاب کرنا اُن کے ذوقِ ادب کی دلیل ہے۔ ترجمہ شستہ و رفتہ ہے۔ لیکن بعض جگہ اصل مفہوم کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا مثلاً سفید چہرے کی تشبیہ "خالی صراحی" سے دی گئی ہے۔ "صراحی" کا مفہوم ہمارے ذہن میں چہرے کی سفیدی کا تصور پیدا نہیں کرتا۔ صراحی کی جگہ بوتل کا لفظ یقیناً غیر ادیبانہ تھا۔ لیکن "مینا" کہہ دینے سے بوتل کی سفیدی کی طرف ذہن منتقل ہو سکتا تھا۔ کنستر بھی اردو لفظ ہے اور استعمال کیا جا سکتا ہے۔

"تعلیم اور اسلامی معاشرت" خواجہ غلام السیدین کا ایک عالمانہ مقالہ

"اُردو کے تاریخی ماخذ" ابو لیث صاحب کا تحقیقی مقالہ ہے، لیکن آج نظریہ ایک عام نظریہ ہے۔ یعنی تاریخ اردو سے متعلق دور اول سے قبل کے کسی متین اور سلیس شعر کو اس نام اور عہد سے متعلق تسلیم نہ کیا جائے۔ یہاں تک کہ "ڈوم گا کیوں نہیں، گوشت کھا یا کیوں نہیں؟ گلا نہ تھا" کو بھی امیر خسروؒ کی زبان نہ مانا جائے۔ اس لئے کہ یہ تو آج کل کی زبان ہے۔ حالانکہ اسمار و افعال ہر عہد میں کم و بیش اسی طرح ترکیب پا سکتے ہیں۔

"غزل گوئی پر ایک نظر" جناب سہیل نے نہایت معقول اور مناسب باتیں لکھی ہیں، اور وقت آگیا ہے کہ ہمارے غزل گو شعرا اپنا مسلک بدل ڈالیں۔

"روز جزا" سجاد انصاری مرحوم کے "باقیات الصالحات" ادبی ہے اور ادارۂ سہیل نے اس ناتمام ڈراما کو شائع کرکے مرحوم کی قدر دانی اور زبان و ادب کی خدمت گزاری کا ثبوت دیا ہے۔

"مادر زاد" جناب سلطان حیدر جوش کا افسانہ ہے جس میں انسانی

اور جذبات کی تقریریں واقعیت نگاری (Realism) کے تحت نہایت تکمیل کے ساتھ نقش کی ہیں۔

"حافظ کے کلام میں کلام" ڈاکٹر صدیقی کا تنقیدی مقالہ ہے۔ ادارے کی طرف سے اس مقالے پر عمدہ نوٹ دیا گیا ہے۔

"حالی ایک محب وطن کی حیثیت سے" ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا ایک اہم مضمون ہے۔

"قومی ادب اور ہندی سمیلن" پر ڈاکٹر اشرف نے نہایت معقول جرح و تعدیل کی ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اس بحث کو سلیس ترکر کے لکھتے تو زیادہ بہتر تھا۔

"کرتب" جناب رشید کا طنزاحیہ مضمون ہے۔ اور طرز عبارت و خیال کے اعتبار سے رشید صاحب کے بہترین مضامین شمار کئے جانے قابل تھے۔ لیکن ہمیں رشید صاحب سے شکایت ہے کہ وہ ہنسنے ہنسانے سے اتنے دور کیوں ہوئے جا رہے ہیں۔ کرتب کو پڑھ کر ہمیں ادبی لطف و انبساط تو بہت حاصل ہوا۔ مگر ہنسی نہ آئی۔

انتخاب تصاویر میں ادارۂ سہیل نے بلند ذوق کی داد دی ہے۔ ہندوستان میں مذاق صناعت (آرٹ) نے ایک حیثیت حاصل کر لی ہے۔ لیکن کلام اس میں ہے کہ کیا من حیث ہم میں یہ مذاق پیدا ہو چکا ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ عام طور پر وہی نسوانی تصویریں پسند کی جاتی ہیں جن کی شکلیں حسین اور ادائیں دل کش ہوں۔ اور بحالات موجودہ ایسی تصاویر کی اشاعت کا اقدام جو عام طور پر سمجھی نہ جائیں ایک جرأت اقدام ہے اور قابل ہزار تحسین۔

لیکن اس خیال سے کہ ابھی تک ہمارے خواص بھی تصویر کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے، ان تصاویر کے ساتھ مختصر شذرے لکھ دینا زیادہ مفید و مناسب ہوتا۔

المختصر ہم ارکان ادارہ کو اس کامیاب اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ سہیل ہر سال بہتر سے بہتر صورت میں جاری رہے۔

رسالے کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے اور انجمن کے دفتر سے مل سکتا ہے۔

جالینوس

مدیر۔ (انیس الاطبا) حکیم سید جعفر علی عشقی نقوی
قیمت سالانہ دو روپے، فی پرچہ تین آنے۔

مقام اشاعت۔ جالینوسی دواخانہ رجسٹرڈ۔ ساجد اسٹریٹ سیالکوٹ

یہ طبی ماہنامہ سیالکوٹ سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ تحقیقاتی مضامین، اور دوسرے حفظان صحت و تحقیق الادویہ پر قابل قدر مضامین دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کے اجراء کا مقصد لوگوں کو مفید معلومات طبی سے روشناس کرانا ہے۔ دوسرے رسائل کی طرح صرف دواؤں کا فروخت کرنا اس کا مقصد نہیں ہے۔ [illegible] اس میں درج ہے کہ امریکہ کی ایک بیگم صاحبہ کے پیٹ میں درد تھا۔ عمل جراحی کیا گیا تو دنیا بھر کی تعداد میں ۲۲۴ طبیات اس میں سے نکل پڑیں جن میں خصوصیت سے، سیفٹیں، چار کے تنکے، پن، موٹروں کے ٹائروں کے ٹکڑے، اور شیشوں، زنجیروں اور چارپائیوں کی کمانیوں کے ٹکڑے تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ بیگم صاحبہ آدم زادی تھی، یا مگر مچھ زادی۔ کہ اکثر شکاریوں کی روایتوں سے تو اس جنس عجیب الخلقت کے پیٹ سے ایسے دفینوں کے نکلنے کا پتہ ضرور لگتا رہا ہے۔ مگر انسان کے متعلق یہ معلومات بالکل جدید ہیں۔ رسالے کا حجم ۵۰ صفحات کا ہے۔

اجتماع

ایڈیٹر۔ ہلال احمد زبیری   قیمت سالانہ عہ۔ قیمت فی پرچہ ۳ر

اجتماع کا ماہوار ایڈیشن دنیائے صحافت کے درخشندہ ستارے ہلال احمد صاحب زبیری ایم اے کی ایڈیٹری میں دارالسلطنت دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ دہلی کے کم قیمت رسالوں میں اپنی قسم کا پہلا رسالہ ہے جس میں مشاق ادیبوں کے مضامین اور اچھے شعرا کا کلام زینت پاتا ہے۔ اعلیٰ پایہ کے مذہبی۔ ادبی۔ سیاسی۔ معاشرتی مضامین اس کا طرۂ امتیاز ہیں۔ کارکنان اجتماع سے ہمیں قوی امید ہے کہ وہ موجودہ بلند معیار کو قائم رکھیں گے۔

الموسیٰ

مدیران۔ محمد فضل حسین و سید مہدی حسین۔ مقام اشاعت۔ دفتر الموسیٰ سٹی کالج حیدرآباد دکن

سالانہ چندہ۔ طلبائے حال سے عار۔ طلبائے سابق سے عہ۔ عام خریداران سے للعہ

$\frac{20 \times 30}{8}$ سائز پر ۸۰ صفحات کا یہ ماہی رسالہ سٹی کالج حیدرآباد (دکن) سے نکلتا ہے سٹی کالج کی عمارت چونکہ موسیٰ ندی پر واقع ہے اسی نسبت سے نام الموسیٰ رکھا گیا ہے۔ طلبائے فاضل اساتذہ کی نگرانی میں اس کی ادارت کرتے ہیں۔ مضامین، نظمیں و غزلیں طلبا کی بھی ہوتی ہیں اور اساتذہ و دیگر اہل قلم کی بھی۔ زیر ریویو نمبر ماہ اسفندیار ۱۳۴۵ف کا ہے جو بوجہ گذشتہ

حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر جو دہلی کے ایک مشہور اور کامیاب طبیب ہیں۔ اُن چند افراد میں سے ہیں جو خاموشی سے علمی کام کیا کرتے ہیں۔ حکیم صاحب کو نہ شہرت کی تمنا ہے نہ مال و زر کی آرزو۔ "علم الحروف" انھیں کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب کو حکیم صاحب نے نہایت کاوش اور تحقیق کے ساتھ مرتب فرمایا ہے اور مختلف ممالک کے رسم الخط اور اُن کی تدریجی تبدیلیوں کو نہایت خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

کتاب کے آخر میں تمام خطوط کے نمونے اور بلاک بھی مہیا کئے ہیں۔

یہ کتاب دراصل اردو زبان میں ایک نایاب اضافہ ہے۔ اور ہم اردو دنیا سے پُر زور سفارش کریں گے کہ وہ اس قابل قدر کتاب کے مطالعے سے محروم نہ رہے جس سے اُس کی معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوگا۔

بھگوت گیتا منظوم

موسومہ

نسیمِ عرفاں

مصنفہ منشی بشیشور پرشاد صاحب منوّر لکھنوی

قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ۔ شبلی خانہ بازار سیتارام دہلی و کلیم بکڈپو کٹرہ مریاں دہلی

اکثر سمجھدار صوفی منش مسلمانوں اور سخت آزاد خیال ہندوؤں کے نزدیک بھی ہندو مذہبیات میں اگر کوئی ٹھوس اور علم و عمل کی مدعی آواز ہے تو وہ کرشن جی کا وہ صوفیانہ اپدیش ہے جو بھگوت گیتا کے نام سے موسوم ہے۔ یہ اپدیش بزرگِ محترم نے کورکشیتر کے خونی میدان میں اُس وقت دیا تھا جب کہ آریہ ورت کے سورما حق و ناحق کا فیصلہ کرنے کے لئے شمشیر بکف وہاں جمع ہو گئے تھے، وہ سب آپس میں عزیز تھے۔ دشمنی حق پرستی و ناحق پرستی میں تھی۔ حق و ناحق کی اس جنگ میں آلۂ کار بن جانے کے باوجود اُن کی رگوں میں ایک ہی رنگ اور نسل کا خون دوڑ رہا تھا، ارجن پانڈوں کا مشہور مایۂ ناز سردار جو حق پرستی کا بھی علمبردار تھا۔ عزیزوں، بزرگوں، استادوں کی خون ریزی کے بُرے نتائج کے خوف سے کانپ اُٹھا، اُس نے اپنے ہتھیار ایک پھینک دئے۔ جنگ کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ضروری نہیں ہم اپنوں کو

محض اس لئے کہ وہ ناحق پرست ہیں، قتل کر کے اپنے ہاتھ خون میں رنگیں جس سے صدہا عورتیں رانڈ ہو کر، اپنی عصمتیں تباہ کر دیں نسلیں برباد ہو جائیں، اور اس حق پرستانہ جنگ کا یہ انجام ہو کہ دھرم کی جگہ ادھرم دنیا پر مسلط ہو جائے۔ یہ وقت تھا جبکہ کرشن جی نے وہ اپدیش دیا جس کو ہندو آج تک جوں کا توں سمجھتے ہیں۔ اور جو بھگوت گیتا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب تک دنیا میں روح اور جسم کی جداگانہ حیثیت تصور کی جاتی رہے گی یا مسئلہ آواگون جزو مذہب رہے گا، اور ایک لافانی، ابدی و سرمدی، خالق و مالکِ کُل، ستار و غفار، عالم الغیوب وحدہٗ لاشریک لہٗ کا تصور ذہنِ انسان میں باقی رہے گا، اس اپدیش کا فنا ہونا ناممکن ہے۔

گیتا میں فلسفۂ ہمہ اوست کی تعلیم دی گئی ہے، اور ساتھ ہی مسئلہ تناسخ کو حیاتِ عالم کا ایک ضروری جزو قرار دیا گیا ہے۔ گو افعالِ نیک و بد کا صدور صرف "ذاتِ بے ہمتا" کی مصلحتوں سے منسوب کیا گیا ہے۔ مگر بُرائی سے انسان کو بچنے کی ہدایت کی گئی ہے اور اس کے ذریعے اور راستے سمجھائے گئے ہیں۔ وصال ذاتِ باری کو ارواح کا کمال قرار دیا گیا ہے اور سرچشمۂ تخلیق عالم جسم و روح بھی اُس سائر و دائر کل کو ہی ٹھہرایا گیا ہے

کرشن جی نے اکثر بلکہ تمام تر مقامات کلام میں اپنے آپ کو ذاتِ الٰہی سے منسوب کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ "جب ضرورتِ اصلاح مجبور کرتی ہے تو میں قالبِ انسانی میں جلوہ افروز ہوتا ہوں" اس دعوے میں ہمارے نزدیک وہی ہمہ اوست کا نظریہ کار فرما ہے۔ گیتا حق پرستی، فرض شناسی اور عشقِ الٰہی کی نہایت زبردست تبلیغ کرتی ہے۔

اس فلسفۂ ہنود کی مایۂ ناز کتاب کا سب سے پہلی دفعہ دربارِ اکبری کے درخشاں نورتن علامۂ وقت فیضی نے فارسی میں ترجمہ کر کے ہندو تصوف سے مسلمانوں کو روشناس کیا تھا۔ اردو میں بھی اس کتاب کے متعدد تراجم ہوئے جو زیادہ تر نثر میں ہیں۔ اس کے بعد نظم کی متعدد شرحیں اردو میں بھی لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن حال ہی میں لکھنؤ کے مشہور خاندان حضرت خانم کے چشم و چراغ منوّر صاحب نے گیتا کو اردو میں نظم فرمایا ہے اور گلزارِ نسیم کی بحر میں گیتا کے ادق صوفیانہ مضامین و مطالب کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کہنا کہ وہ اپنی اس کوشش میں بلحاظ مترجم کامیاب ہوئے یا نہیں ہمارے لئے بہت دشوار ہے کیونکہ نفس ترجمے کے متعلق نقد کا حق سنسکرت جاننے والوں کو حاصل ہیں۔ تاہم جس قدر اردو ترجموں سے

شاعرانہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی بنا پر یہ کہنا غالباً درست نہ ہوگا کہ منور صاحب نے گو بالکل لفظی ترجمہ تو نہیں کیا ہے۔ لیکن ہر اشلوک کا پورا پورا مدعا اس قدر پاکیزگی سے ادا کیا ہے کہ اگر نثر میں بھی ترجمہ کرنے والے شرما جائیں تو بیجا نہ ہوگا۔

گلزارِ نسیم کی بحر اختیار کر کے حضرتِ منور نے اس خشک زمین پر جو گلکاری کر دکھائی ہے وہ ضرور قابلِ داد ہے۔ شروع کرتے وقت غالباً شاعر کو تردد تھا کہ یہ کام ہو سکے گا یا نہیں اور گو احوالِ واقعی کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اُس میں ابتداءً فرماتے ہیں۔

یہ کام نہیں اگرچہ آساں   پھر بھی میں ذرا نہیں ہراساں   رگ رگ میں ہے فن کا خون دوڑا   ہمت ہے بلند دل جواں ہے

لیکن دو اشعار کے بعد ہراس نمایاں ہوتا ہے۔

اک راہروِ شکستہ پا ہوں   محتاجِ دعائے رہنما ہوں   جامی ہوں میں نہ ہوں نظیری   کیا کوئی کرے گا حرف گیری

پھر آگے کہا ہے کہ شاید لوگ معترض ہوں کہ "نظم حسنِ بیان سے معرا ہے اور دامنِ سخن پر ایک داغ ہے۔ اس بحر میں سخن آرائی کرنا نسیم کا منہ چڑانا ہے"۔ اور پھر خود ہی اس کا جواب دے کر اپنی مشکلات کا اظہار کرتے ہیں۔

گو ٹھیک ہے معترض کا ارشاد   لیکن یہ بات بھی رہے یاد   گیتا فرضی بیاں نہیں ہے   قصہ نہیں داستاں نہیں ہے
آئینہ یہ اک ہے فلسفے کا   گنجینہ یہ اک ہے فلسفے کا   ور شہوارِ معرفت ہے   بحرِ ذخّارِ معرفت ہے
نغمہ یہ نہیں ترانۂ شوق   نظم اس میں نہیں فسانۂ شوق   گیتا کا نہیں کوئی بھی حصہ   دلچسپ و شگفتہ کا قصہ
جوہرِ سحرِ بیاں ہو جس کا   زیورِ حسنِ بیاں جس کا

پھر گلزارِ نسیم کی تعریف کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

لیکن مرا باغ دوسرا ہے   مشکل مری اور بھی سوا ہے   کیا اس میں کمالِ فن دکھاؤں   خاک ایسی زمیں میں گل کھلاؤں
بایں ہمہ ہے مجھے یہ امید   ذرّے کو ملے گا اوجِ خورشید

ہمارے خیال میں شاعر کی اُمید جو درحقیقت اُس کی آرزو تھی اور جس کی کامیابی کا اُسے شبہ تھا پوری ہوئی ہے کہ اُس نے باوجود موضوع کی خشکی اور ترجمے کی بندشوں اور پابندیوں کے ایک قابلِ ستائش نظم کی صورت میں گیتا کو پیش کیا ہے۔

کسی مضمون کا ایک زبان سے دوسری زبان میں منظوم ترجمہ آورد کہلا سکتا ہے۔ مگر نسیمِ عرفاں میں جو روانی اکثر و بیشتر نظر آتی ہے اس لحاظ سے آورد کہنا ظلم ہے۔ اقتباساتِ ذیل کے ملاحظے کے بعد اربابِ ذوق غالباً ہماری ہمنوائی کریں گے۔

پہلا ادھیائے

(۲۱ لغایت ۲۴)

جب ہو گیا معرکہ یہ درپیش   ارجن نے کہا کہ اے رشی کیش[1]   محسن، عالی صفات ہیں آپ   آزادِ تغیرات ہیں آپ
میدان میں رتھ ذرا بڑھائیں   کیا حال ہے چل کے دیکھ آئیں   آنکھیں ہیں یہ دیکھنے کی خواہاں   ہیں کون یہاں نبرد میداں
جن کو شوقِ نبرد ہے آج   جن کو ذوقِ نبرد ہے آج   ہیں کون وہ ساختہ صف آرا   جن سے ہے مقابلہ ہمارا
جن سے ہم پر ہے زندگی تنگ   جن سے کرنا ہو اب ہمیں جنگ   ہیں کون وہ آج مرد جانباز   دریودھن فتنہ جو کے دمساز
دعوائے سپاہ گری ہے جن کو   نازِ فنِ صفدری ہے جن کو   بیٹھے نہیں آج جو سماتے   ہم کو جو نہیں نظر میں لاتے
آئینۂ اضطرابِ ارجن   تھا کرشن سے یہ خطابِ ارجن   سن کے رتھ آپ نے بڑھایا   جس پر بجرنگ کا تماشا تھا
خورشید اساس نیر آثار   تیزی میں شرار تھا یہ برق رفتار   شان و شوکت دکھا کے ٹھہرا   رتھ بیچ میں اب یہ جا کے ٹھہرا

(۲۶ لغایت ۳۲)

جب ارجن نے نظر اٹھائی   حیرت سی تھی ایک اُس پہ چھائی   میدان میں بہرِ جنگ تیار   تھے جمع عزیز، دوست احباب
دادا، ماما، چچا تھے اُن میں   استاد تھے رہنما تھے اُن میں   ماما، پھوپا، چچا کے فرزند   ناتی، پوتے، رفیق دلبند
پہنے بانا سپاہ گری کا   تھا کوئی خسر وہاں کسی کا   اظہارِ بہادری کو بیتاب   تھے اور بھی نیک پاک اصحاب
منظر یہ عجیب و پرشکن تھا   بے حد سببِ غم و محن تھا   وقفِ بیم و ہراس ارجن   تھا اک تصویرِ یاس ارجن
نظارۂ غم فضا سے مجبور   دل کی حالت سے کچھ معذور   ارجن نے کرشن سے کہا یہ   میں دیکھ رہا ہوں آہ کیا یہ
خود اپنے ہی رشتہ دار احباب   ہیں جنگ و جدل کو آج بیتاب   یہ دیکھ کر سخت خستہ تن ہوں   وقفِ غم و خشکیِ دہن ہوں
از سر تا پا ہے تھرتھری سی   چھائی جاتی ہے بیہشی سی   وقفِ سوزش مرا بدن ہے   استادہ ہر ایک موئے تن ہے
ایسی تاب و تواں ہے رخصت   ہاتھوں سے مرے کماں ہے رخصت   ہمت افتادہ، حوصلہ پست   تفتیدہ الم سے ہے کف دست
میدان میں حال ہو گیا غیر   اکھڑے جاتے ہیں خود بخود پیر   چھوڑا سا جگر میں پک رہا ہے   دل چار طرف بھٹک رہا ہے
توسیعِ عذاب دیکھتا ہوں   آثارِ خراب دیکھتا ہوں   ہر خواب عجیب بخش تاثیر   ہر چیز ہے فالِ بد کی تعبیر
یہ قتلِ عزیز و اقربا کیا   اپنے جو ہوں اُن کو مار ڈالا   جچتا نہیں اب نگاہ میں کچھ   لذت نہیں اس گناہ میں کچھ
مطلب تیر و تفنگ سے کیا   ہل جائے گا فتحِ جنگ سے کیا   راحت کی نہیں مجھے تمنا   ہوں تاج شہی کا میں نہ جویا

(۳۴ لغایت ۳۷)

ہوں خواہ وہ نیک پتا ماما[2]   پوتے، ناتی، خسر کہ ماما   بھائی بی بی کا ہو کہ سمدھی   ہو خواہ عزیز اور کوئی
ہیں قتل کو میرے سب جو تیار   کچھ اس میں نہیں ہے مجھ کو انکار   ہوں میں اے کرشن دل سے مجبور   مجھ کو نہیں اُن کا قتل منظور
ہے اُن کے بغیر مملکت ہیچ   تینوں عالم کی سلطنت ہیچ   پھر سلطنتِ ارض کی حکومت   معلوم نہ کیوں ہو بے حقیقت
کاوش ہے پئے تحت و تاج کرنا   خون اُن کا بہا کے راج کرنا   دانشمندی سے دور تر ہے   ہر طرح سے باعثِ ضرر ہے
مانا کہ گنہگار ہیں یہ   سرکش ظالم ہیں خوار ہیں یہ   قتل اُن کا بہت خراب ہوگا   میرے حق میں عذاب ہوگا
دھرتراشٹر کے گو پسر ہیں غاصب   قتل اُن کا نہیں ہمیں مناسب   مادھو[3] انہیں کر کے نیست و نابود   ہاتھ آئے گا کیسے دُرِّ مقصود

(۳۹ لغایت ۴۵)

ہیں فردِ یگانہ دہر میں آپ   سوچیں تو بھلا جنار دھن آپ   کیا اُن کے گناہ میں ساتھ دینا   اندھیر ہے دنیا اس سے پھر لینا

[1] مراد کرشن جی سے ہے۔

[2] یعنی بھیشم پتاما جو ایک نیک سیرت بزرگ تھے۔ [3] کرشن جی سے مراد ہے۔

کنبہ برباد کو فنا ہو جائے　غمگیں ناشاد کوئی ہو جائے　کام اس کے سوا خراب کیا ہے　اس سے بدتر عذاب کیا ہے

ہوتا ہے کسی کا گھر جو برباد　پڑتی ہے کسی پہ جب یہ افتاد　پایہ نہیں برقرار رہتا　باقی نہیں پھر وقار رہتا

فتنہ ہوتی ہے شانِ ملت　ہوتا ہے بادھرم پریشاں　دستور رہے ہوئے منحرف　کرنے لگتے ہیں طرزِ مذہب

مٹ جائیں گے دھرم کرم جب　غالب ہوگا ادھرم جس وقت　ہو جائیں گی عورتیں سب آزاد　عصمت کریں گی اپنی برباد

باقی نہ رہے گی لاج گھر کی　مٹ جائیگی آبرو اس گھر کی　ہوگی اِن دن کی رات پیدا　ہو جائے گا نقص ذات پیدا

جب ذات میں آئیگی خرابی　ہر بات میں آئے گی خرابی　برپا افساد کرنے والا　گھر کا برباد کرنے والا

خود بھی دوزخ نصیب ہوگا　اولاد کا بھی رقیب ہوگا　پائیں گے نہ پتر پنڈ کا دان　پڑ جائیگی اک عذاب میں جان

اس ذات کے نقص کا نتیجہ　آگے چل کر خراب ہوگا　نابود آئین قوم ہوں گے　مفقود آئین قوم ہوں گے

ہو جائے گی آن بان کافور　مٹ جائیں گے خاندان کے دستور　ہے آج جو دھرم جاودانی　بن جائیگا کل وہ نقشِ فانی

سنتا ہوں میں جناردن یہ　مشہورِ زمانہ ہے سخن یہ　بگڑا جن وہ مکان وہ گھر　جس میں نہیں دھرم کا ٹھکانا

انجام اس کا ہے روسیاہی　ہے اس کے نصیب میں تباہی　پاداشِ گناہ اسے ملے گی　دوزخ میں جگہ اسے ملیگی

افسوس یہ مجھ کو ہو گیا کیا　حیراں ہوں کہ ہے یہ ماجرا کیا　مائل ہوا بے شعور سرپا　آمادہ گناہ پر ہوا ہوں

جاہلِ غفلت شعار ناداں　آسائشِ سلطنت کا خواہاں　میں آج اٹھا رہا ہوں تلوار　اپنوں ہی کے قتل کو ہوں تیار

انسان جس طرح دوست جانی　پوشاک اتار کر پرانی　کرتا ہے بہ شوقِ دلفریبی　اک خلعتِ نو سے جامہ زیبی

یہ ساکنِ پیکرِ عناصر　یہ حاملِ دفترِ عناصر　ہو کر ملکِ عدم کا رہرو　کرتا ہے قبول قالبِ نو

دوسرا ادھیائے

(۱ و ۲ و ۳)

کی دیکھ کے اس کی سرگرانی　مدھوسودن نے یہ گل فشانی　ارجن، ارجن، عزیز ارجن　سب تم کو کہیں گے ہیز ارجن

کیوں حسرت و یاس سے ہو مغلوب　یہ طرزِ عمل ہے سخت معیوب　ہمت جرأت یہ چھوڑنا کیا　منہ جنگ سے اب یہ موڑنا کیا

کر دیگا تمہیں یہ فعلِ مذموم　فردوس کی راحتوں سے محروم　تم مرد ہو مردمی سے لو کام　نامردی کا زبوں ہے انجام

یہ ضعفِ عقل و آگہی کیا　دانا ہو کر یہ گمرہی کیا　کھولو آنکھیں روش یہ چھوڑو　ہنگامِ جدال منہ نہ موڑو

(۹ لغایت ۱۵)

وہ فاتحِ دشمنانِ گڈاکیش　ارجن عالی صفت وفاکیش　ہو کر وقفِ غم و محن یوں　کہہ کر رشی کیش سے سخن یوں

بولا میرے عکس رگوبند　اے بانیِ روزگار گوبند　کرتا ہوں میں جنگ سے کنارا　تقریر کا اب نہیں ہے یارا

ارجن چپ ہیں، ملول و دلگیر　جس وقت یہ کر رہا تھا تقریر　بھگوان کرشن خاص ادا سے　خاموش تھے مسکرا رہے تھے

ارجن سے یہ کیا کلام آغاز　اس طرح سخن کیا باز　تم ان کے لئے ہو مائلِ رنج　باتیں جو نہیں ہیں قابلِ رنج

بیکار ملول ہو رہے ہو　اور اس پہ سمجھ رہے ہو یوں　دانا ہو بہت بڑے خبردار　ہر حرف ہے معرفت یہ گفتار

لیکن جو ہیں محوِ حق پرستی　ان کو نہیں فکرِ مرگ و ہستی　تھا میں نہ کہیں جہاں میں نا تو　ہر وقت تھا ہر زماں تھا ہو تو

تم بھی نہ کبھی یہاں تھے معدوم　پنہاں نہ تھے مثلِ سرِ مکتوم　انساں ہیں یہ با وقار جتنے　پیکر نہ کبھی تھے نیستی کے

میں ہوں تم ہو کہ اور کوئی　فطرت ہی نہیں نیستی کسی کی　قالب میں قیام کرنے والا　اس نقش میں رنگ بھرنے والا

جیسے ہوتا ہے وقتِ تغیر　کودک سے جواں جواں سے پیر　بالکل اسی طرح محوِ ترحیل　کرتا ہے یہ قالبوں کو تبدیل

ہوتے نہیں لیکن اہلِ عرفاں　تبدیلیِ جسم سے پریشاں　محسوسات و حواس کا کھیل　دونوں کا یہ قدرتی میل

سردی گرمی کا اک سبب ہے　وجہِ غم و باعثِ طرب ہے　لیکن ہیں نقش بنقشِ فانی　دونوں باتیں ہیں آنی جانی

ہمت جرأت دکھاؤ ارجن　اس جنگ میں کام آؤ ارجن　اے منتخبِ خلائق ارجن　اے نوعِ بشر میں فائق ارجن

دل جس کا نہیں ہے ان سے بیتاب　ہے ان کی قیود سے جو آزاد　جن کو دل پر ہے اپنے قابو　ہر راحت و رنج میں جو یکسو

ہے وہ صدق و صفا مجسم　انساں ہے وہ بقا مجسم

(۷ لغایت ۲۰ و ۲۲)

جلوہ جس کا ہے سائرِ کل　ہستی جس کی ہے دائرِ کل　محال جس کو ہمیشگی ہے　وہ عین حیاتِ سرمدی ہے

کوئی اس کو مٹا سکے گا کیا　نقشِ باطل بنائے گا کیا　کس طرح ہو آدمی کے بس کی　یہ بات نہیں کسی کے بس کی

ہر نقش با دوام جس کی ہستی　قائم ہے مدام جس کی ہستی　فرضی شے ہے زوال جس کا　اندازہ بھی ہے محال جس کا

ہر ان اجسام میں وہ موجود　ہونا ہے جنھیں ضرور نابود　جب یہ سچ ہے تو جوش میں آؤ　ارجن معروفِ جنگ ہو جاؤ

دل میں ہے جس کے وہمِ باطل　ساکن اس جسم کا ہے قاتل　ہے جس کا گماں یہ غیر معقول　ساکن اس جسم کا ہے مقتول

(۲۴ و ۲۵ و ۲۶)

کٹنا اس کا محال تر ہے　گھلنا اس کا محال تر ہے　جلنا اس کا نہیں ہے ممکن　گلنا اس کا نہیں ہے ممکن

خشکی کے اثر سے ہے یہ آزاد　نیرنگِ دگر سے ہے یہ آزاد　ساکن، ہمہ دست، جاودانی　جنبش، قدیم، غیر فانی

بے اندازہ نگاہ سے دور　آنکھیں اسے دیکھنے سے معذور　برتر وہم و قیاس سے ہے　بالا فہم و حواس سے ہے

قیدِ تبدیل سے بری یہ　ہوتا نہیں منقلب کبھی یہ　ارجن یہ رموز خوب سمجھ کر　غمگیں نہ ہو وہم میں الجھ کر

جو مائلِ سیرِ زندگی ہے　اس کے لئے موت لازمی ہے　جو عازمِ کشورِ عدم ہے　اس کے لئے زیست بھی بہم ہے

یہ نظم ہے ایک ضابطہ ایک　دونوں باتوں میں ربط ہے ایک　دونوں میں یہ لازمی تعین　پھر کس لئے اس قدر ہو غمگیں

مورِ رنج و قلق ہیں دونوں　بے بہرۂ امرِ حق ہیں دونوں　دانا نہیں اس گماں کے قائل　مقتول نہ ہے نہ ہے وہ قاتل

پیدائش و مرگ سے ہے آزاد　ہوتی نہیں زیست اس کی برباد　اب تک نہیں ہوا ہے پیدا　ہے اپنی قدامتوں سے پیدا

اس کی کہیں ابتدا نہیں ہے　اس کی کہیں انتہا نہیں ہے

(۶۸ و ۶۹)

عالی کردار نیک اعمال　اے ارجن مقتدر و قوی بال　جو طالبِ این و آں نہیں ہے　دلدادۂ دو جہاں نہیں ہے

وہ مردِ فہیم یگانہ ہے　عقل اس کی سلیم بیگماں ہے　دنیا سوتی ہے بے خبر جب　بالکل ہوتی ہے بے خبر جب

---

[1] مراد کرشن جی سے ہے۔ [2] یعنی ارجن۔ [3] یعنی کرشن جی۔

ہر طرح سے ہو شیار و شاغل دیکھتا ہے نظر یہ کا شاغل جس وقت زمانہ جاگتا ہے بیگانہ یگانہ جاگتا ہے
اس وقت یہ شاغل خرد مند کرلیتا ہے چشم سیر میں بند

نہایت دشوار اور پیچیدہ مضامین کو کس خوبی و سلاست سے پاکیزہ روزمرّہ میں بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا ادھیائے

(۱ لغایت ۷)

ارجن نے کہا یہ سن کے اپدیش بھگوان جنا ردن و شری کیش دیتے ہیں عمل پہ اس کو ترجیح جب آپ کی جب آپ کرکے تشریح
کیوں مجھکو بنا رہے ہیں ہرکارہ دیتے عمل زبوں کا اختیار جب خود ہی نہیں عمل کے قائل کیوں کرتے ہیں مجھکو اس پہ مائل
گیسو ہر رنگ زلف شبگیر پُر پیچ ہے آپ کی یہ تقریر ہر چند اسے سمجھ رہا ہوں لیکن پھر بھی اُلجھ رہا ہوں
مختل ادراک عقل حیراں برہم ہیں حواس دل پریشاں سرمایۂ پند وہ عطا ہو باعث جو سکون قلب کا ہو
گویا ہوئے کرشن یوں کہ او کد ارجن ہے تمہاری ذات یکجیب پہلے یہ میں کر چکا ہوں اظہار ہیں دہر میں دو طریقہ کار
اوّل ہے طریق علم و عرفان اس راہ پہ سانکھیہ گامزن ہیں ہے راہ عمل طریق ثانی جوگی اس راہ کے ہیں بانی
اعمال جہاں سے ہاتھ اٹھا کر آغاز عمل سے باز آکر افعال سے دور رہ کے انساں ہوتا نہیں رستگار دوراں
دل میں کرکے ارادہ ترک لے خواہ کرے وہ جا دُ ترک پابوس وصال ہی رہیگا محروم کمال ہی رہے گا
ارجن ممکن نہیں یہ زنہار انساں رہے اک نفس بھی بیکار حرکت سے ہے قیام عالم ہے یہ روح نظام عالم
حرکت فطرت کا مقتضیٰ ہے اس سے نہیں کوئی بھی بچا ہے لیکن جو غلام آرزو ہو جس کے گلشن میں اُس کی بو ہو
دل جس کا کشندہ عنان ہو ہر شے کی طرف دوان دواں ہو پُتلا ہے وہ مکر کاریا کا بندہ ہے فریب کا دغا کا
ارجن برعکس اس کے انساں رکھکر یکسو دل پریشاں کرتا ہے حواس کو جو بس میں اُڑتا نہیں عالم ہوس میں
بنتا ہر فعل کا ہے فاعل کرتا نہیں اس میں دل کو شامل وہ سر خفی سے باخبر ہے اونچا اس کا جہاں میں سر ہے

(۱۴-۱۵-۱۸-۳۰-۳۸)

غلّے سے عیاں ہوئیں جاندار اور اُس کے وجود کا یہ اظہار ہے بارش آب کا نتیجہ پروازِ سحاب کا نتیجہ
پروازِ سحاب و بارش آب ثمرہ اک یگیہ کا ہے نایاب یہ یگیہ زمانۂ ازل سے وابستہ ہے دامن عمل سے
تعمیر عمل کی ہے بنا علم اس کی کرتا ہے ابتدا علم ہے علم اُس آئینہ کا جوہر ہوتا جو نہیں کبھی مکدر
ہے وصف عیاں صدام جس کا لافانی ہے قیام جس کا جس کا جلوہ ہے غیر محدود رہتا ہے جو یگیہ میں بھی موجود
کرنا کوئی کام یا نہ کرنا اس کی پروا ذرا نہ کرنا ایسے انساں کا خاصہ ہے مست عرفاں کا خاصہ ہے
استغنا ہے شعار اس کا آزاد ہے کاروبار اس کا بیگانۂ احتیاج دوراں ہوتا نہیں وہ کبھی پریشاں
طالب ہو کر نہ خود نمائی کے ہر فعل مرے سپرد کرکے ہر طرح سے جز دیت مٹاکر جو کل ہے اسی سے دل لگا کر

نہ. اداوُن وہ صورت ہے جن کا انجام دینا تسکین دوام کے حصول یا تکمیل نجات کے لئے جاتا ہے۔

امید سے بے نیاز ہو کر مستغنی سوز و ساز ہو کر اب تیر کمان پر چڑھاؤ لڑنے کے لئے قدم بڑھاؤ
شعلہ جس طرح کوئی پُر نور ہو چاروں طرف دھوئیں سے مستور آئینہ پُر آب جیسے کوئی آلائش گرد سے ہو مخفی
جھلّی ہو غلاف ہلکا ہلکا جس طرح سے تکیہ حمل کا بالکل اسی طرح علم عرفاں پردے میں ہوس کے ہے پنہاں

چھٹا ادھیائے

(۱۸ و ۱۹)

ہوتا ہے عیاں کمال انساں بندھتا ہے جب خیال انساں ہوتا ہے جب اک جگہ پہ قائم رہتا ہے صفائے ذات دائم
اس وقت ہوس کی گرد کو پاک لذات جہاں پہ ڈال کر خاک ہوتا ہے وہ کامران منزل پا جاتا ہے نشان منزل
جیسے ہنگام بارش ضو پلمسوہ کر چراغ کی لو جنباں نہ ہو بند ش ہوا میں لرزاں نہ ہو بندش ہوا میں
بالکل اسی طرح سے وہ شاغل ہے جس کو سکون قلب حاصل رہتا ہے فنائے قلزم ذات کرتا ہے بسر اسی میں اوقات

ساتواں ادھیائے (۴)

مٹی اور اس کے بعد پانی پھر آگ کا پردۂ نہانی عالم بعد اس کے ہے ہوا کا پھر کرۂ محیط ہے خلا کا
پھر ہیں دل و عقل سلسلہ وار اُن کے آگے ہے ستر پندار ہیں یہ آٹھوں صفات میری مجبور ہے ان سے ذات میری

طوالت کے اندیشے سے ہمیں مزید اقتباسات درج کرنے سے احتراز کرنا پڑ رہا ہے ورنہ حق یہ ہے کہ ہر ادھیائے (باب یا فصل) میں سے ایک دو نہیں بیسیوں شعر یہاں نقل کرنے کی ضرورت تھی۔ مثنوی گلزار نسیم کے بعد اس چھوٹی سی بحر میں منوّر صاحب نے نہایت خوبی و کامیابی سے شناوری کی ہے۔ مضامین کی خشکی اور نفس مضامین کی گہرائی کے باوجود حسن کمال سے یہ پاکیزہ نظم اوّل سے آخر تک سراسر مرصّع ہے۔ اس پر اس کے مصنف کو بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ بقول شخصے، "بے عیب ذات صرف اُسی کی ہے" اگر کوئی کہیں باعث گرفت نقص نظر آتا ہے تو اس کی حرف گیری کرنا مناسب نہیں۔ کہ نفس مضمون نظم کے لئے خود موزوں نہیں ہے۔

شاعر نے اس بحر کو اختیار کرکے ذہانت اور ہوشیاری کا ثبوت دیا ہے۔ کیونکہ دوسری کسی بحر میں غالباً اس قدر روانی پیدا کی جا سکتی تھی اور نہ ایسی شگفتگی۔ سچ تو یہ ہے کہ گیتا کو شاعر نے روزمرّہ کی زبان میں نظم کرکے اپنے نام کو حیات جاوید بخشنے کا انتظام کر لیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جو صاحب ذوق حضرات منوّر کی اس مرصّع نظم کو ملاحظہ فرمائیں گے وہ ان سے داد سخنوری ضرور دے کر رہے گی۔

ڈاکٹر بھگوان داس۔ علامہ کیفی اور مسز سروجنی نائیڈو نے مقدمات لکھے ہیں۔ اور منوّر صاحب کی کامیاب کوشش کی ستائش کی ہے۔

اپنا نقطۂ خیال پورے زور اور قوت سے پیش کیا۔

کانگریس میں بہت سے اہم رزولیوشن پیش ہوئے اور منظور ہوئے۔ ہر معاملے میں قدیم خیال کے کانگریسیوں کو کامیابی ہوئی۔ لیکن جس رزولیوشن پر سب سے زیادہ کشمکش رہی وہ اس مسئلہ کے متعلق تھا کہ آیا نئے دستور کے ماتحت کانگریسی عہدے قبول کریں یا نہ کریں۔ سوشیلسٹ الیکشن لڑنے کے موافق اور عہدے قبول کرنے کے مخالف تھے۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے بھی اپنے خطبۂ صدارت میں اور سبجکٹس کمیٹی کی تقریر میں عہدے قبول کرنے کی مخالفت کی تھی۔ قدیم خیال کے کانگریسی یہ چاہتے تھے کہ اس وقت اس مسئلہ کو طے نہ کیا جائے کہ کانگریسی عہدے قبول کریں یا نہ کریں۔ بلکہ اس کا فیصلہ الیکشن کے بعد یا کچھ ہی قبل ہو۔ سوشیلسٹ گروہ کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ اس وقت طے کر دیا جائے کہ کانگریسی عہدے قبول نہ کریں گے۔

اگر ملک کے بلند ترین مقاصد کو پیشِ نظر رکھکر اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ عہدے نہ قبول کرنا بہتر ہے اور اس التوا سے لوگوں کے دلوں میں جو تذبذب رہے گا وہ اُن کے عزم اور ہمت کے لئے مفید نہیں ہے لیکن طے یہی ہوا کہ اس وقت اس مسئلہ کا تصفیہ نہ کیا جائے۔ بیشک، اس سے یہ نفع ضرور ہوا کہ اس مسئلہ کے تصفیئے کے التوا کے ساتھ وہ افتراق بھی ملتوی ہو گیا جو کانگریسیوں کے درمیان اُس صورت میں یقینی تھا۔

اگر کانگریس کی تمام کارروائیوں کو غور سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ گو شیلسٹوں کو ہر معاملے میں شکست ہوئی لیکن ہر اہم رزولیوشن کانگریس کے قدیم خیال اور سوشیلزم کے درمیان ایک سمجھوتہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کانگریس کی صدارت اور اشتراکیت کی حمایت دو قطعاً متضاد عناصر کا اجتماع ہے اور ممکن ہے کہ پنڈت جی کی اس سیاست کو اُن کے مداح قابلِ ستائش قرار دیں۔ لیکن ایک ایسا بھی گروہ ہے جو اس اجتماعِ ضدین سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ پنڈت جواہرلال کا یہ رویہ "کجامے نمائی، کجامے زنی" کے مرادف ہے اور کانگریس نے کسانوں اور مزدوروں کو کسی اشتراکی اصول و ضوابط کی حامل جماعت کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے سے روکنے کے لئے ایک سیاسی چال چلی ہے۔

اس سلسلے میں اینگلو انڈین اخبار "سٹیٹسمین" کا تبصرہ جو حکومتِ ہند کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرتا ہے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

"ہم نے پنڈت جواہرلال نہرو کے مکمل ایڈریس کا جو اُنھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے صدر کی حیثیت سے پڑھا بغور مطالعہ کیا اور اس کے مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے دل اور دماغ پر یہ خیال غالب آیا کہ یہ کسی ہندوستانی کی تقریر نہیں ہے۔ بہرحال کسی طریقہ پر یہ کسی ہندوستانی کے الفاظ نہیں ہو سکتے۔ اس میں ذرا بھی کلام نہیں ہے کہ پنڈت جواہرلال نہرو پیدائشی طور پر ہندوستانی ہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ برطانی تمدن اور طرزِ معاشرت کے پروردہ ہیں۔

وہ کئی قسم کے انگریز ہو سکتے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ اُنھیں صرف یوپی میں دلچسپی ہوتی۔ وہ ایک دیہاتی انگریز بھی ہو سکتے تھے جو زرعی توسیع کے کام میں خاص دلچسپی لیتے۔ یہی نہیں بلکہ وہ تعلیمی مسائل میں ماہر۔ ایک قدامت پسند انگریز اور ایک انتہا پسند انگریز ہو سکتے تھے۔ لیکن قسمت نے اُنھیں موجودہ زمانہ نے ایک انتہا پسند انگریز ایک انقلاب پسند سوشلسٹ اور ایک تھیوریٹیکل کمیونسٹ بنا دیا۔ لیکن ایک قدامت پسند انگریز۔ ایک انتہا پسند انگریز اور ایک سوشلسٹ انگریز۔ ان تینوں کے نظریہ کے درمیان کسی حد تک اتحاد ہو سکتا ہے۔ اور اس کی وجہ انگریزی ماحول ہے جسے وہ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اور جس سے وہ نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر پنڈت جواہرلال نہرو کو بھی یہ سہولت حاصل ہے اور وہ انگریزی ماحول سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے ہم کو یہ بتلایا ہے کہ میں سوشلسٹ ہوں۔ اور میں کمیونسٹ ہوں۔ وہ ایک انقلاب چاہتے ہیں اور ذاتی ملکیت کے حق اور مخصوص مفاد کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں انھوں نے روس پر ریب کی نئی کتاب پڑھی ہے۔ اور اُس کا اُن پر بہت اثر پڑا ہے۔ اور اُنھیں انڈی پنڈنٹ لیبر پارٹی کے ہر ممبر کی طرح یہ یقین ہو گیا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت ملوکیت پرستارانہ ظلم ہے اور نوکرشاہی حکومت قطعی نکمی ہے۔ اور ہندوستانی مظلوم قوم ہیں اور اُنھیں آزاد ہونے کے لئے جدوجہد رکھنی چاہئے پنڈت جواہرلال نہرو کسی قلبی تبدیلی کے منتظر نہیں ہیں وہ تو سر سوسلے اور سر سٹیفرڈ کرپس کی طرح انقلاب چاہتے ہیں۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے ہندوستانی انگریزی حکومت اور والیانِ ریاست کی جو تصویر کھینچی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ لیکن انگریز محض اس وجہ سے اُس کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جس شخص نے یہ تصویر کھینچی ہے وہ نیک نیتی اور صدق دلی کا مجسمہ ہے اور اُنھوں نے جو نظریہ پیش کیا ہے وہ انگریزی تمدن

اور انگریزی طرزِ حکومت میں پرورش پانے کا نتیجہ ہے۔ آج ہمارے سامنے ایک قابل، ذہین اور نوجوان آدمی ہے جو ان ہندوستانیوں کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے جنھیں خود انگریزوں نے پیدا کیا ہے۔ یہ لوگ انگریزوں کی طرح بولتے اور لکھتے ہیں، اور انگریزوں کی طرح سوچتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ انگریز نہیں ہیں یہ ہندوستانی ہیں۔ انگریزی تمدن اور تہذیب کے ماحول میں اُن کی پرورش نے اپنے ہموطنوں کے لئے بُرائی یا بھلائی کرنے کے لئے اُن کی صلاحیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

اگرچہ اس طرح وہ اپنی ہندوستانی آتما سے محروم ہو گئے ہیں، لیکن ان میں قوم پرستی کا جذبہ زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔ پنڈت جی پر الزام لگانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی انگریزوں پر الزام لگانا سودمند ثابت ہوگا۔ جو حالات ہیں وہ رہیں گے۔ اور اُن کے نتائج بھی جو رونما ہونے ہیں رونما ہو کر رہیں گے۔ لیکن اس سے ہیں کچھ نہ کچھ امداد ملے گی۔ اگر ہم نے ایک دوسرے کے سامنے اپنی پوزیشن واضح کر دی۔ کیونکہ جب ایک مرتبہ ہم نے سچائی کو سمجھ لیا اور باہمی صفائی ہو گئی تو اسی صورت میں ایک فراخ دل انگریزی قوم اور ایک صدق دل اور غیر مطمئن شخص کے درمیان جو ہندوستان کے ساتھ برطانی تعلق کا نتیجہ ہے کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کی صورت نکل سکتی ہے۔

شاہ فواد

اعلیٰحضرت ملک احمد فواد شاہ مصر نے بالآخر طویل علالت کے بعد ۲۸ اپریل کو ایک بجے دن کے اس جہان فانی سے رحلت فرمائی رسم تجہیز و تکفین مسجد الرفاعی میں ادا کی جائے گی' یہ مسجد شاہ موصوف نے خود تعمیر کرائی تھی اور جو کہ صحرائے اعظم اور وادیٔ نیل کے مقابل میں واقع ہے۔

بیماری کے دوران میں شاہ موصوف نے حیرت انگیز قوتِ ارادی کا ثبوت دیا۔ دم توڑنے سے تین گھنٹے پہلے تک شاہ موصوف بھلے چنگے معلوم ہوتے تھے۔ صبح کے وقت وزیر اعظم کو طلب کر کے انہوں نے ان تمام ہمدردی کے تاروں کا جواب دینے کے واسطے حکم فرمایا جو کہ ایام علالت میں اُن کو موصول ہوئے تھے۔

بادشاہ کی موت کا سب سے بڑا سبب ایک گولی بیان کیجاتی ہے جو کہ شاہ فواد کے بھتیجے سیف الدین نے تیس سال ہوئے خدیو کلب میں شاہ موصوف پر چلائی تھی اس کی وجہ سے گلے میں کمزوری واقع ہو گئی اور شاہ فواد کو ہر وقت کھانسی رہنے لگی اس کھانسی کی وجہ سے خون کا اخراج زیادہ ہو گیا اور اعلیٰحضرت اس بیماری کے حملہ کی تاب نہ لا سکے۔

ولیعہد پرنس فاروق کے بادشاہ ہونے کا اعلان ہو چکا ہے آپ انگلینڈ سے بذریعہ جہاز" وائسرائے اوف انڈیا" ۸ مئی کو الگزینڈریا پہنچیں گے۔ چونکہ شہزادۂ فاروق نابالغ ہیں اس لئے ایک ریجنسی کونسل مقرر کی جائے گی اس کا انتخاب شاہ فواد نے ۱۹۲۲ء میں کیا تھا۔

شاہ فواد نے یورپ کی متعدد یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی۔ مغربی تعلیم و تربیت کی وجہ سے وہ دنیا بھر کے سیاسی معاملات میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے لیکن ۱۸۹۵ء میں شہزادۂ فواد نے اس سیاسی زندگی کو خیرباد کہدیا اور آپ یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں سائنس اور ادب کی تعلیم حاصل کرنے چلے گئے۔ آپ اعداد و شمار کے بڑے ماہر تسلیم کئے جاتے تھے اور اسی قابلیت کی وجہ سے شاہ موصوف نے "سوسائٹی آف پولیٹیکل اکنومکس" کی مصر میں بنیاد ڈالی' اس سوسائٹی نے ملک کے لئے نہایت ہی مفید کام کیا۔ آپ نے عورتوں میں صنعت و حرفت اور تربیت اطفال کا شوق پیدا کیا اور اس کے ساتھ ہی تعلیم نسواں کو ترقی دی۔

۱۹۲۲ء میں ملک مصر جو کہ اب تک ایک پروٹیکریٹ شمار کیا جاتا تھا' کو ایک خود مختار ملک تسلیم کیا جانے لگا۔ کنگ فواد کو اب سخت محنت کرنی پڑی، زاغلول پاشا کی رہائی اور قوم پرست لیڈروں کے کارناموں کا یہ نتیجہ نکلا کہ سرلی سٹیک کو سوڈان میں قتل کر دیا گیا لیکن ۱۹۲۷ء میں شاہ فواد انگلستان گئے اور مصر و انگلینڈ کے درمیان ایک عہدنامہ ہو گیا مگر ناش پاشا کی مداخلت سے اُس پر کوئی عملدرآمد نہ ہو سکا۔ اسی اثناء میں وفد پارٹی بھی برسر اقتدار آگئی اس انتظامیہ برہمی سے لاچار ہو کر جولائی ۱۹۲۸ء میں بادشاہ نے پارلیمنٹ توڑ دی۔ اور احکام صادر کر دیئے کہ تین سال تک پارلیمنٹ کا کوئی اجلاس نہ ہوگا۔ اس دوران میں کنگ فواد نے اپنے ہی احکام سے انتظام قائم رکھا چونکہ انتظامیہ عملہ میں ہم آہنگی کا فقدان تھا اس لئے گورنمنٹ کی مشنری قابل اطمینان طریقہ سے کام نہ کرتی تھی۔ اس کے لئے محلات کی سازشیں، وفد پارٹی

کا عروج، محلات اور کابینہ میں ان بن ذمہ دار تھیں۔ بالآخر بادشاہ نے برٹش گورنمنٹ کے دباؤ اور ملکی بدنظمی کی وجہ سے پارلیمنٹ کو توڑ دیا۔ اور حکم دیدیا کہ تین سال تک پارلیمنٹ کا کوئی اجلاس نہ ہوگا۔ اس کے بعد شاہ فواد نے ملک کی عنان حکومت خود سنبھال لی۔ نومبر سنہ ۱۹۳۵ء میں سر ہور کی تقریر سے ملک میں ناراضگی کے شعلے بھڑک اُٹھے وفد پارٹی اور لبرل پارٹی نے ایک متحدہ مقابلہ کے لئے تیاری شروع کر دی اور وہ دستور اساسی طلب کیا جو کہ نحاس پاشا نے سنہ ۱۹۳۰ء میں مسترد کر دیا تھا مگر بادشاہ فواد نے ایک حکم نامہ جاری کر دیا اور سنہ ۱۹۲۳ء کے دستور اساسی کو منظور کر دیا۔ ۲۰ جنوری کو ہائی کمشنر اعلیٰ حضرت کے پاس آیا اور کہا کہ برٹش گورنمنٹ مختلف پارٹیوں کی متحدہ درخواست پر گفت و شنید کرنے کے لئے تیار ہے اور پرانے قضیے کو طے کرنا چاہتی ہے مگر شرط یہ ہوگی کہ دونوں طرف کے ماہر موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے فوجی دستور پہ پہلے گفت و شنید کریں گے۔ نسیم پاشا نے اس شرط کو قبول نہیں کیا اور انہوں نے ۲۱ جنوری کو اپنا استعفا داخل کر دیا۔

چونکہ وفد پارٹی مشترکہ کابینہ میں کام کرنے کے لئے رضامند نہیں تھی اس لئے اعلیٰ حضرت نے ایک غیر جانبدار کابینہ بنا دی جو کہ الیکشن کے واسطے قوانین وضوابط مرتب کرے گی۔ یہ الیکشن ۲ مئی کو ہوں گے اور ساتھ ہی برٹش گورنمنٹ سے گفت و شنید جاری رکھنے کے لئے مہر پاشا کو نیا وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا۔ مصر کے ڈیلیگیشن میں ۷ وفد پارٹی کے ممبران اور ۵ مختلف پارٹیوں کے نمایندے ہیں اور نحاس پاشا ان کے لیڈر ہیں۔ سر لیمپسن برٹش کی طرف سے نمایندے ہیں۔ یہ گفت و شنید ۲ مارچ سے شروع ہوئی ہے اور اب تک جاری ہے۔

شاہ فواد کے عہد کا نہایت ہی اہم واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ابن سعود کے مملکت عربیہ کے ساتھ دوبارہ تعلقات قائم کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ چنانچہ مہر پاشاہ وزیر اعظم کی دعوت پر شیخ فیود حمزہ جو کہ وزیر خارجیہ ہیں قاہرہ میں تشریف لائے ہیں تاکہ ان تمام بدمزگیوں اور تفرقات کا خاتمہ کر دیا جائے جو کہ پچھلے دس سال سے عرب اور مصر کے درمیان ناخوشگوار واقعات کی بناء پر ظہور پذیر ہوگئے ہیں۔ یہ قضیہ سنہ ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوا اور ہر دو ممالک نے ایک دوسرے سے قطع تعلق کر لیا۔ بدمزگی کا موجب یہ واقعہ ہوگیا کہ حکومت مصر ہر سال ایک غالیچہ مقدس سنگ اسود پر چڑھانے کے لئے کعبہ شریف روانہ کرتی تھی۔ یہ غالیچہ امراء وارکین کی نگرانی میں نہایت شان وشوکت کے ساتھ ملک مصر سے روانہ ہوتا تھا۔ اور یہ رسم سال کے بڑے تہواروں میں شمار کی جاتی تھی سنہ ۱۹۲۶ء میں ایک ناگہانی حادثہ پیش آیا۔ مصری کارواں جبکہ مقدس غالیچہ کو لے کر کعبہ شریف کو روانہ ہوا تو چند راسخ الاعتقاد وہابی اس شان وشوکت کی تاب نہ لاسکے انہوں نے ناراضگی کے اظہار کے لئے مصری وفد پر گولی چلا دی۔ مدافعانہ کارروائی کے طور پر مصری وفد کو بھی گولی چلانی پڑی۔

اس واقعہ کے بعد سے دونوں ممالک میں کشیدگی چلی آرہی ہے مگر اب امید کی جاتی ہے کہ موجودہ گفت و شنید کا نتیجہ دونوں ممالک کے لئے نہایت ہی مفید ہوگا اور ان حل طلب معاملات کا بھی جو کہ مصر اور ابن سعود کی گورنمنٹ کے درمیان اب تک چلے آئے ہیں، تسلی بخش فیصلہ ہو جائے گا۔

دنیائے ادب میں ایک تازہ ترین اضافہ

خمارستان

کیا ہے؟

یہ اساتذۂ حال کے گلِ سرسبد، نثر و نظم کے لاثانی قلمکار، وجدانیت کے حقیقی معجز نگار، جہان استاد، افسر الشعراء، حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی کا تازہ شاہکار ہے۔ یہ دراصل اُن جمالیات کا مجموعہ ہے جن سے آج تک نثر عاری تھی۔ یہ وہ مضامین ہیں جنھیں شمس العلماء مولانا آزاد۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ علامہ شبلیؔ نعمانی کے بعد ہندوستان کا لٹریچر آج تک نہ پیش کرسکا۔ خمارستان قلعۂ معلّی کی ٹکسالی اردو اور شستہ و رفتہ بولی سے آراستہ ہے۔ صاحبانِ ذوق کی ضیافتِ طبع کے لئے شائع کی جارہی ہے۔ ع

اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

ابھی سے اپنا اسمِ گرامی خریداروں کی فہرست میں لکھوا لیجے۔

منیجر کلیم بک ڈپو کوشہ ٹہریاں فتح پوری دہلی

قسم

بوئے لبِ گلرنگ جوانی کی

دل و دماغ کی قوّت

اور

دیگر طبی فوائد کیساتھ ساتھ

اگر حقیقت میں مہکتی ہوئی سانس بجائے خود کوئی نعمت ہے اور لبوں سے منہ اندھیرے کھلتی ہوئی کلیوں کی سی خوشبو کا آنا اگر دراصل اپنی جگہ ایک دولت بیدار ہے تو ہم آپ کو مشورہ دیں گے کہ ہمارے کارخانہ کی روپہلی سنہری گولیاں، ہمارا لاجواب زردہ اور ہمارا معطّر قوام آپ پان کے ساتھ ساتھ ضرور استعمال فرمائیں اور دیکھیں کہ آپ میں مسیحا نفسی پیدا ہوتی ہے کہ نہیں؟

احمد حسین دلدار حسین تاجر تمباکو خوردنی

چوک لکھنؤ

مُسدّس حالی کا صدی ایڈیشن

مرتبہ ڈاکٹر سیّد عابد حسین صاحب۔ ایم۔ اے پی ایچ ڈی

مسدس حالی کا صدی ایڈیشن سب سے اعلیٰ اور سب سے شاندار، مولانا حالی کی صدسالہ سالگرہ کی واحد یادگار، جناب مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر سیدراس مسعود، مولوی سید سلیمان ندوی، نواب صدر یار جنگ بہادر، مولوی عبدالماجد صاحب دریاآبادی۔ اور خواجہ غلام السیدین صاحب کے مقدمات اور تقریبات سے جو خاص اسی اڈیشن کے لئے لکھوائے گئے ان سے مزین علامہ اقبال کا قطعہ فارسی مولانا حالی کی شان میں اس کا عکسی بلاک سرسید کے تاریخی، اور مولانا حالی کے خودنوشتہ سوانح حیات میں سے ایک صفحہ کا فوٹو، سرسید اور حالی کی تصاویر دنیائے اسلام کا نقشہ، اعلیٰ کاغذ، بہترین طباعت اور کتابت عمدہ جلد اس اڈیشن کی ممتاز خصوصیات ہیں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے اُردو ہندی اور انگریزی اخباروں اور رسائل نے بہترین ریویو کئے ہیں ملک کے بڑے بڑے آدمیوں، مثلاً نواب صاحب بھوپال سر تیج بہادر سپرو، علامہ اقبال، نواب محی الدین یار جنگ بہادر، سر سید راس مسعود، نواب صدر یار جنگ بہادر وغیرہ وغیرہ حضرات نے اس کو بے پسند فرمایا ہے، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ۲۴۰ صفحات قسم اعلیٰ آرٹ پیپر پر چرمی جلد قیمت صرف عہ/ قسم اول ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد عہ/

ہتیا اور دوسرے افسانے

از جناب مجنوں گورکھپوری تقریباً دو سو صفحات، اُردو زبان میں ایک بیش بہا اور شاندار اضافہ، فن افسانہ نگاری کی عمدہ مثال قیمت صرف ۱۲/

ناشران حالی پبلشنگ ہاؤس

زادراہ:۔ منشی پریم چند صاحب کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ قیمت عہ/ صفحات ۲۲۴۔ ناشران حالی پبلشنگ ہاؤس

اُردو کی عمدہ کتابیں ملنے کا واحد پتہ

حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر لال کنواں، دہلی

اگر آپ کو دُنیا کے لاثانی

اور

مقدّس صحیفہ

بھگوت گیتا

کا کامیاب ترین منظوم ترجمہ اُردو میں دیکھنا ہو تو

نسیمِ عرفان باتصویر

ملاحظہ فرمائیے جناب مُنوّر لکھنوی خلف ملک الشعراء حضرت آنجہانی نے گلزارِ نسیم کی مترنم اور شگفتہ بحر میں یہ ترجمہ فرما کر دنیائے ادب میں بیش بہا اضافہ کردیا ہے۔ ترجمہ کی شگفتگی، سلاست، روانی، فصاحت اور شعریت ملاحظہ فرما کر آپ کو یقیناً روحانی مسرت حاصل ہوگی کسی اہلِ نظر کا کتب خانہ اس نسخہ سے خالی نہیں رہنا چاہئے اس وجہ سے اور بھی کہ عالیجناب ڈاکٹر بھگوان داس ایم اے، نے اس کا پیش نامہ تحریر فرمایا ہے اور عالی جناب علامہ کیفی اس کو دنیائے ادب میں ایک ہیرا ایک کوہ نور پاتے ہیں۔ کاغذ اعلیٰ لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت عہ/ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ

کلیم بک ڈپو کٹڑہ بڑیاں فتح پوری دہلی

عورتوں کا بہترین اور سب سے سستا

رسالہ لیلےٰ

دورِ جدید

جو پہلے نیرنگِ خیال بک ڈپو لاہور سے شایع ہوا کرتا تھا۔

اب

ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی سے بہترین صورت میں شایع ہوگا۔
دورِ جدید کا پہلا پرچہ یکم مئی تک شایع ہوجائیگا۔

سالانہ چندہ صرف تین روپیہ بذریعہ منی آڈر۔ بذریعہ وی پی ۳؍ علاوہ محصول فی پرچہ ۵؍ ہر ماہ حجم ۸۶ صفحات، تصویر آرٹ ۱۔ ڈبلاک تصویر ۴ عدد۔ سائز نہایت خوبصورت
ادارہ۔ نگران۔ مصورِ درد سید فرید جعفری مچھلی شہری آنریری ایڈیٹر حکیم یوسف حسن صاحب چیف ایڈیٹر نیرنگ خیال لاہور۔ ایڈیٹرس بیگم عبدالحفیظ لکھنوی معاونین۔ وزیر بیگم ضیاء (لاہور) آمنہ دیوی پرباگی و مس اختر حسن (الہ آبادی) شوکت دولت (لکھنؤ) گوہر اقبال حور (میرٹھ) مس محمودہ عباسی بی اے (شملہ) مس شکنتلا دیوی (بنارس)، خط وکتابت کا پتہ: منیجر رسالہ لیلےٰ دہلی

آنسو

ہندوستان کے مشہور صحافی ادیب اور افسانہ نگار حضرت فرید مچھلی شہری مصورِ درد کے ۲۴ دردبھرے افسانوں کا نہایت حسین وجمیل مجموعہ ہے جس میں
ادیب العصر حضرت احمد اکبرآبادی :۔ حضرت سلطان حیدر جوش۔ بی اے ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ لسان القوم ساغر نظامی کے مقدمات شامل ہیں، ہر افسانہ انقلاب کا پیامی ہے اور جدید حیات کا صحیح رہنما اسلوب بیان میٹھی خالص ہندوستانی زبان اور نہایت دردناک پلاٹ
چند افسانوں کے عنوان۔ مزدور کی بیوی بی اے پاس۔ روٹی کا ٹکڑا۔ پھول کی راکھ۔ مرجھایا ہوا پھول ٹھنڈی کلی۔ پریم کی بھینٹ۔ انسان۔ بجارن۔ دل کا سنگم۔ پوجا کا پھل۔ جوانی کی پیاس۔ نصیب کا ہیر شکست کی ہنسی، سماج کی گود میں۔ شاہ صاحب، مرون، چمنستان کی شکاری وغیرہ وغیرہ
خوبصورت سائز۔ سہ رنگ سرورق رنگین آرٹ کی تصاویر۔ دو رنگ کے کئی نقوش

ولایتی جلد

قیمت دعائتی مجلد دو روپے علاوہ محصول

لیلےٰ بک ڈپو کلائیو روڈ نئی دہلی

حکیم آشفتہ صاحب لکھنوی کا بنایا ہوا

مرہم سیماب

ہر قسم کے بدترین دانوں اور چھوت دار کھجلی کے واسطے اکسیر ہے۔ اکوتے کے لئے تیر بہدف ہے لگاتے لگاتے ہر قسم کی سوزش اور جلن کا فور کر دیتا ہے قیمت فی تولہ ۴؍
عرق شمسی :۔ یہ عرق عجیب الخاصیت ہے۔ دردِ شکم، درد قولنج۔ درد معدہ۔ بدہضمی خصوصاً ریاح بواسیری کے واسطے اکسیر ہے۔ اختلاج قلب اور دافع حبس طمث کے لئے بھی بہت مفید ہے ۶ ماشہ سے ایک تولہ تک بعد غذا استعمال کیا جاتا ہے قیمت فی بوتل ۵؍ فی شیشی ۱۰؍
روغن عنبرین :۔ حکیم مسیح الدولہ مرحوم کا نہایت مجرب وکامیاب نسخہ ہے۔ اس دماغی بیماریوں کی خاص رعایت ہے۔ خصوصاً بے خوابی۔ سوزش۔ دردسر۔ آنکھوں کی جلن وغیرہ اور بڑھاپے میں تو آپ ہی اپنی نظیر ہے قیمت فی شیشی ۵ تولہ ۱۲؍

المشتہر

سید جعفر حسین منیجر دواخانہ کیمیائی اودھ، لکھنؤ

ہندوستانی زبان کا سب سے سستا آرگن

باغ وبہار دہلی

ہندوستان کے مشہور ادیب مصورِ درد سید فرید جعفری مچھلی شہری کی زیر سرپرستی شایع ہوتا ہے۔ مدیر :۔ سعد مچھلی شہری۔ چندہ سالانہ صرف ۲؍ بذریعہ منی آڈر، قیمت فی پرچہ ۱؍ آنہ

مئی کا پرچہ مچھلی شہر نمبر ہوگا

جس میں ہندوستان کی نہایت قدیم تہذیب کی یادگار مچھلی شہر کی تاریخ ہوگی اور مچھلی شہر کے شاہکار ادبی کارنامے ہونگے، پرچہ مصور ہوگا اور مستقل خریداروں کو مفت نظر ہوگا علیحدہ پرچہ کی قیمت صرف ۴؍ آنہ ہوگی۔

خط وکتابت کا پتہ

مہتمم رسالہ "باغ وبہار" نمبر ۵، کلائیو روڈ۔ نئی دہلی۔

نئے افسانے

پندرہ افسانے ایک جلد میں، سب طبع زاد، نئے عاشقانہ
گویا نثر میں غزلیں
مگر

زندگی کی سچی تصویریں ہیں جن میں نہ بناوٹ ہے، نہ مبالغہ ہے۔ بالکل زندگی کی طرح بے ساختہ، برجستہ، لاؤبالی اُمنگ بھری۔

تم ذرا کوئی افسانہ شروع کرو بس اسی میں گم ہو جاؤ گے۔ وہ سچ مچ تمہیں بیتا ہوا معلوم ہوگا اور تم اپنے آپ کو اس میں شریک سمجھو گے۔ کردار تمہیں واقعی چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے ہوئے معلوم ہوں گے۔ اُن کے جذبات کی گرمی تمہیں محسوس ہوگی۔

طرزِ بیان لطیف، نازک، جادوانہ، ادبیت کی ساری زینتوں سے آراستہ۔ دُنیا کے کسی بڑے مصنّف کے افسانوں سے مقابلہ کیجیے برابر رہیں گے۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اردو میں اچھے افسانے نہیں ہیں۔

(مصنّفہ سید حسن ریاض سابق اڈیٹر ہمت و نوید)

نئے افسانے، قیمت فی جلد عہ۔ مع محصول ڈاک ۱۲؍

نوٹ :۔ قیمت فرمائش کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر آنی چاہیئے۔

ملنے کا پتہ

منیجر مدنی نیشنل پبلشنگ بیورو (دفتر اخبار نوید) لکھنؤ

مصوّرِ درد سید فرید جعفری مچھلی شہری کی

تازہ تصنیفات

شعلۂ حیات — نصف درجن آتشیں افسانوں کا پہلا مجموعہ۔ ہر افسانہ سماج کے خلاف مکمل باغیانہ پیام ہے جسے نوجوان فسانہ نگار نے اپنی انقلابی رجحانات کے تحت قوم کے نوجوانوں کو سنانے کی کوشش کی ہے۔ شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا عالمانہ تبصرہ بھی شریک کتاب ہے۔ قیمت آٹھ آنے (۸؍) علاوہ محصول۔

مزدور دُلہن — بیکس مزدوروں کی دل ہلا دینے والی داستان اُردو میں روسی طرز کی طبع زاد کوشش، دو کہانیاں ہیں اور دونوں میں جہدِ حیات، سرمایہ اور محنت، طاقت اور غلامی کی کشمکش پوری بے باکی اور آزادی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ محترمہ شکنتلا دیوی ایم۔ اے، ایم ای ڈی (لنڈن) کا طویل مقدمہ بھی شریک کتاب ہے۔ قیمت ۴؍ علاوہ محصول۔

دل کی رانی۔ بہار کی بھکارن — دو جگر گداز کہانیاں۔ پہلی کہانی ایک ہریجن لڑکی کی دردبھری داستانِ حیات ہے۔ دوسری کہانی ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کے زلزلۂ بہار کا ہولناک مرقع ہے۔ حکیم یوسف حسن چیف ایڈیٹر نیرنگ خیال لاہور کی تقریظ بھی شاملِ کتاب ہے۔ قیمت ۴؍ علاوہ محصول۔

ملنے کا پتہ۔ لیلیٰ بک ڈپو، کلاؤ روڈ۔ نئی دہلی

برائے توجہ ایجنٹ حضرات! براہ کرم ہر مہینہ کے اختتام تک دفتر میں اطلاع دیجیے کہ آپ کو کس قدر کا پیاں مطلوب ہیں۔ اور بل موصول ہوتے ہی اپنا حساب بے باق کر دیجیے تاکہ دوسرے مہینے کا رسالہ آپ کو فوراً بھیجا جائے۔

جملہ خط و کتابت و ترسیل زر

منیجر رسالہ کلیم کٹرہ نڑیاں دہلی کے پتہ پر ہونی چاہیئے۔

انشائے لطیف

ادیب العصر حضرت لطیف الدین احمد اکبر آبادی کے افسانے

اُردو ادب میں صاحبِ "لالہ رُخ" کا نام محتاجِ تعارف نہیں اور افسانہ نویسی کا جو معیار ل احمد نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ تنہا ایک مثال ہے۔ ان کا افسانہ علم و حکمت، جذبات، واردات اور نفسیاتِ حُسن و عشق کے نازک ترین اشارات کا حامل ہوتا ہے انکا طرزِ انشا، شعریت اور تفلسف اردو ادب میں مستقل اضافات ہیں۔

ل احمد صاحب کے افسانے بلا شائبۂ تغلیط ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ انشائے لطیف ل احمد صاحب کے پندرہ شہ پاروں کا مجموعہ ہے جو اکثر نگار اور دیگر مجلاتِ علمیہ و ادبیہ میں طبع ہوکر مقبولیت دوام حاصل کر چکے ہیں اس لئے اگر آپ کو سلاست و نفاست زبان کیساتھ نفسیاتِ شباب اور جذباتِ حسن و عشق کی صحیح نقاشی سے کوئی خاص لگاؤ ہے اگر آپ ادب و شعریت کا ذوق سلیم رکھتے ہیں تو اس مجموعہ میں آپ کو اپنی طلب و تشنگی کے لئے مکمل سامان سیری نظر آئیگا۔ طباعت و کتابت روشن و بہترین ہونے کے ساتھ کراؤن سائز پر تقریباً دو سو صفحات کی ضخامت نفیس جلد اور قیمت صرف دو روپے (عمہ) علاوہ محصول۔

نغمات

(نثر کی شاعری)

ادب اُردو میں جناب ل احمد کی تنہا وہ ہستی ہے جس نے حُسن و عشق کی واردات اور نفسیات کو انتہائی مطالعۂ فکر کے ساتھ اپنے ذاتی تاثرات و تکیفات کے ماتحت شعریت تو سیقی یا موسیقیت شعر کی صورت میں صفحات سادہ کو فردوس خیال بنا دیا ہے۔ اس مجموعہ میں جناب لطیف کے ساٹھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے شامل ہیں جسے نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک جدّت آفریں کارنامہ کہا جا سکتا ہے یہ کتاب بھی مکمل ترتیب تہذیب کے بعد زیرِ طباعت ہے اگر آپ اپنی زبان کی نزاکت و لطافت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کے خریداروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرا دیجئے۔

قیمت صرف عہ، علاوہ محصول۔ ملنے کا پتہ

منیجر کلیم بکڈپو کٹرہ بڑیاں۔ دھلی

ساغر نظامی کا کلیاتِ نظم و غزل

بادۂ مشرق

وہ تاریخی کتاب جس کے دیباچے مشرقی و مغربی علوم کے ماہرین و سرپرآوردہ انشا پردازوں نے تحریر فرمائے ہیں مثلاً بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو۔ مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی مدظلہٗ۔ ڈاکٹر سید محمود ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی بار ایٹ لا۔ امام ادب علامہ عبدالحق (بی۔ اے علیگ)

گیارہ ابواب قومی۔ مذہبی۔ متصوفانہ۔ منظریاتی، روحانی اور رنگا رنگ نظموں پر مشتمل ہیں۔ بارہویں باب میں صرف منتخب غزلیں ہیں۔ ساری کتاب خالص ہندوستانی شاعری کے جدید و پاکیزہ تخیل کی حقیقی تصویر ہے۔ زندگی اور جوانی، حُبِ وطن اور آزادی کے وہ آتشیں لمحات اس کتاب میں پائے جاتے ہیں جن کے اثر نے قوم میں نئی زندگی پیدا کر دی ہے اس کے باوجود اس کی قیمت چھ روپئے علاوہ محصول ہے جو کتاب کے حُسن و جمال اور ضخامت کے لحاظ سے بالکل حقیر ہے۔ نہایت سرفرازی سے دعوےٰ کیا جاتا ہے کہ اسوقت تک اردو نظم کی کوئی کتاب حسن و جمال اور اپنے کام کے لحاظ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ قیمت چھ روپے مجلد (علاوہ محصول)

ملنے کا پتہ: **منیجر کلیم بکڈپو کٹرہ بڑیاں دہلی**

پشاور میں کلیم

ایجنسی کے صدر مقام کے علاوہ حسب ذیل اشخاص سے مل سکتا ہے:-

زریں خاں سب ایجنٹ اخبارات پشاور شہر۔ محمد اسماعیل اعوان سب ایجنٹ اخبارات پشاور شہر۔ دُرّانی شاہ سب ایجنٹ اخبارات پشاور شہر۔ سید ابراھیم ہاون مرچنٹ پشاور چھاؤنی۔ محمد اکرم خاں سب ایجنٹ اخبارات۔ اسلامیہ کالج پشاور۔

سول ایجنٹ:۔ صادق کمیشن ایجنسی بازار قصہ خوانی پشاور شہر

ایک نفیس مزاج مہارانی

[illegible]

توشہ خانہ نے اصغر علی محمد علی سے [illegible] مہارانی کے معقول [illegible]

[illegible] جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب [illegible] واپس آگیا۔

اصغر علی محمد علی تاجران عطر لکھنؤ و دہلی

REGD. No. L. 3694

REGD. No. L. 3694



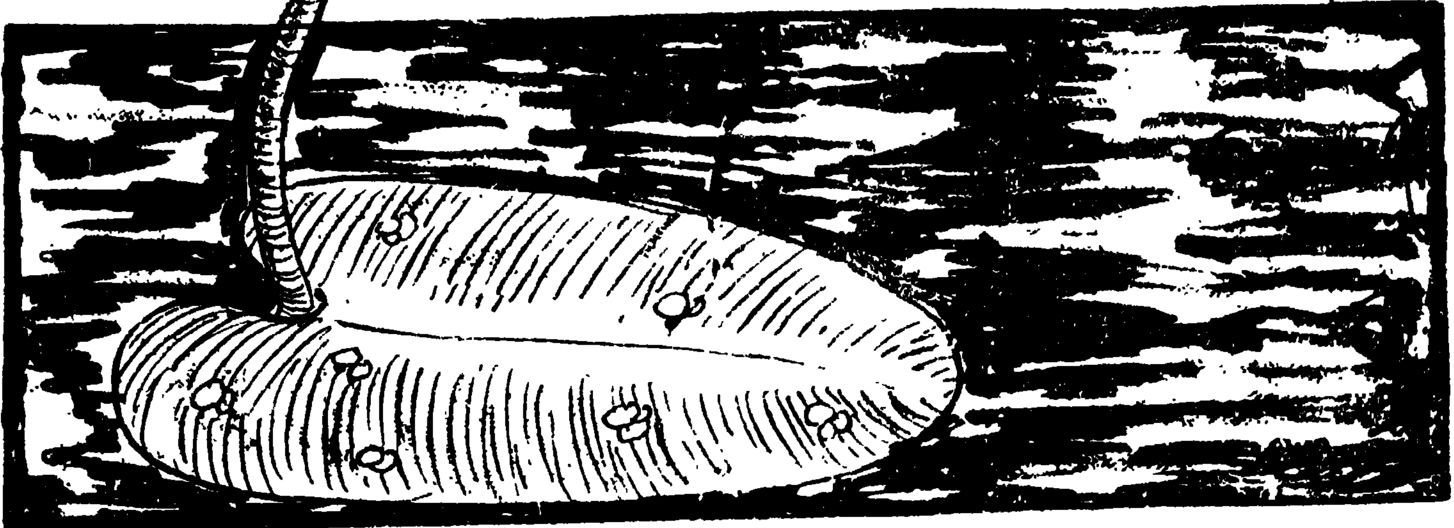
شعلہ و شبنم

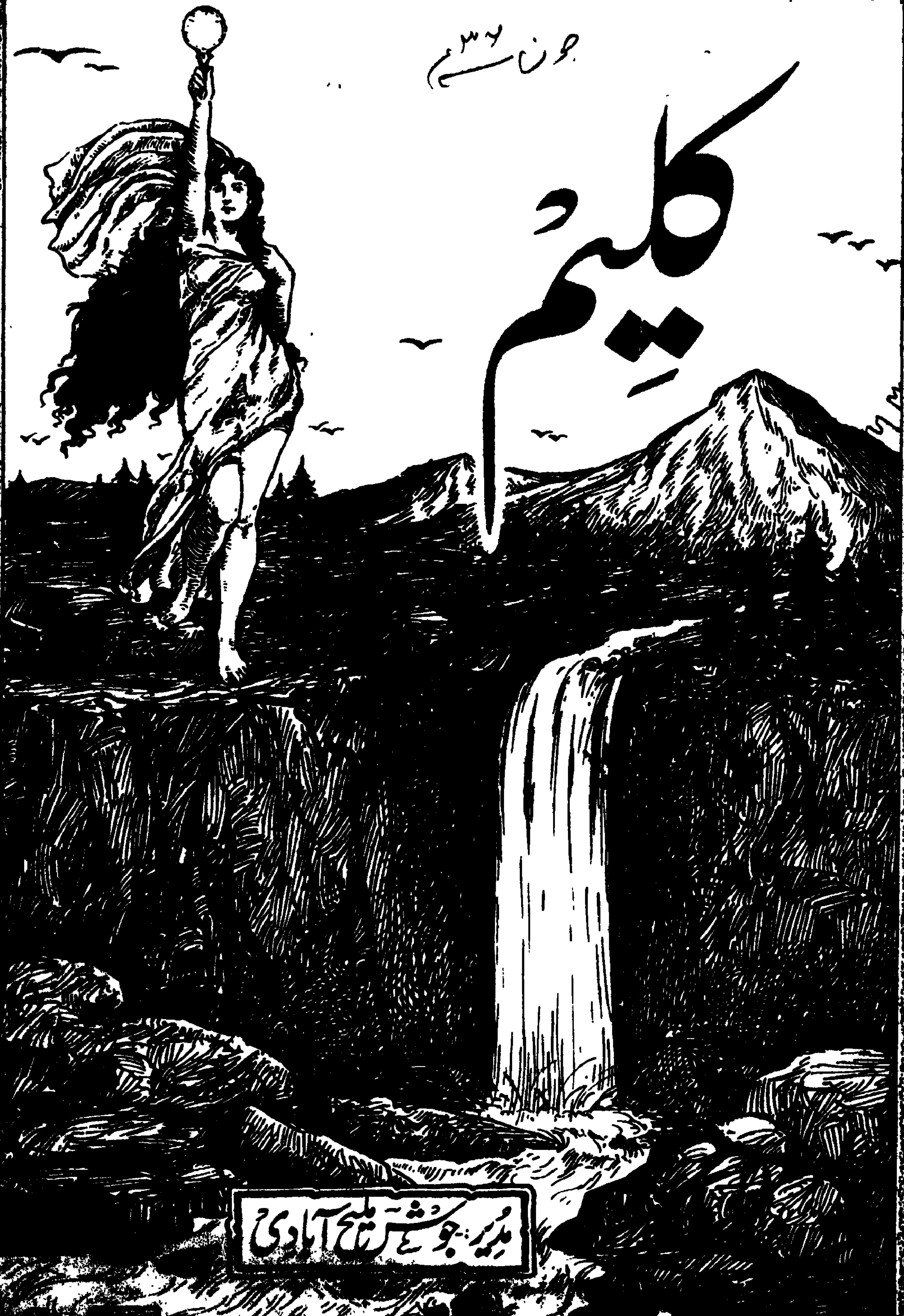
شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

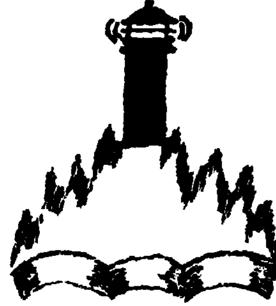
قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ

کلیم بک ڈپو کٹرہ بڑیاں فتح پوری دہلی




جون ۳۶ء
کلیم
مدیر: جوش ملیح آبادی



چیرمین۔ آنریبل سرہومی مہتہ

زینتہ لائف

جنرل منیجر مسٹر بہرام جی، ہرمز جی

تحفظ

صدر مشاورت۔ مسٹر جی۔ ایس۔ مراٹھی

ایم اے۔ اے۔ آئی، اے

انشورنس

ہیڈ آفس۔ اپا اسٹریٹ۔ ساوتھ

فورٹ بمبئی

خوش معاملگی

سکرٹری۔ مسٹر ایم۔ آئی۔ ڈگشٹ

بی اے۔ ایل ایل بی

کمپنی لمیٹڈ

سپرنٹنڈنٹ برانچیں۔ مسٹر بی اے انصاری

کوروشین ہوٹل بلڈنگ دہلی

دیانتداری

بمبئی

اعتماد

دی ایوری مین پالیسی

نے پبلک کی آنکھیں کھول دی ہیں اور ہندوستان بھر کی دنیائے بیمہ میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ بحالت بیماری کوئی چندہ دینا نہیں پڑتا۔ بلکہ ہر ماہ ایک معقول رقم بطور امداد ملتی ہے



بنال آبلبل ، اگر بامنت سریاری ست ـ که مادو عاشق زاریم وکار ما زاری ست

(حافظ)

بنام قوت و حیات



آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجکو صد حیف یہ حکم
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
جملہ حقوق محفوظ

ششماہی چندہ تین روپے
اردو زبان کا ہر جہت سے قیمتی ماہنامہ
قیمت فی پرچہ۔ نو آنے

فہرست مضامین ماہ جون سنہ ۱۹۳۶ء

جلد (۱) | نمبر (۶)

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے کورونیشن برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم گلی کندرکشاں سے شائع کیا)

اشارات

جوش ملیح آبادی

"کلیم" کی نیم سالہ زندگی پر ایک سرسری نظر

بفضلِ قوت و حیات "کلیم" کا چھٹا نمبر ختم ہو رہا ہے۔ بعض احباب کا خیال تھا کہ "کلیم"

خوشش درخشید وے دولتِ مستعجل بود

ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ اس کساد بازاری کے باوجود، اور اُردو داں طبقے کی اس ہمت شکن ناقدرشناسی کے باوصف "کلیم" نے اپنی زندگی کے ابتدائی چھ مہینے کس خوش اسلوبی سے ختم کر لئے۔

ہر کام کا آغاز صعوبت انگیز و ہولناک ہوا کرتا ہے۔ لیکن شکر ہے اُس قوتِ کارساز کا جس تک ہنوز فکرِ انسانی کو رسائی حاصل نہیں ہوئی ہے کہ "کلیم" نے

صد منزل است و منزلِ اوّل قیامت است

کی مہم بہ احسن الوجوہ سر کر لی۔

صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ رسالہ خود بخود ایک ایسی بہتر صورت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے کہ اس کے مستقبل سے بجا طور پر بہترین امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

اُردو میں اس وقت تک جتنے پرچے نکل رہے ہیں ہم نام بنام اعداد و شمار کے ساتھ اُن سے "کلیم" کا تقابل پسند نہیں کرتے۔ لیکن قارئین کرام سے اس قدر ضرور عرض کریں گے کہ وہ اپنی جگہ تمام اُردو کے پرچوں کو یکجا کر کے خود اندازہ لگائیں کہ اس چھ مہینے کی قلیل مدت میں "کلیم" نے ملک کی کیا خدمت کی، اور ابنائے وطن کے سامنے کس نوعیت کا تحریری مسالا پیش کیا۔

کلیم کی تقطیع $\frac{18 \times 22}{4}$ ہے۔ اتنی بڑی تقطیع کے ساتھ اس پرچے نے صرف چھ ماہ کے اندر تقریباً چھ سو صفحے کا تحریری مسالا پیش کیا ہے۔ اور اسی کے دوش بدوش تینتیس تصویریں شائع کی ہیں۔

رسالے کے بلند مقاصد اور مضامین کی معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اگر اس تقطیع کے ساتھ رسالے کی ضخامت اور اُس کی تصویروں پر نظر کی جائے تو بجا طور سے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ "کلیم" اُردو زبان کے تمام پرچوں میں سب سے زیادہ ارزاں پرچہ ہے۔

چھ روپے سالانہ میں کون ہندوستان کا پرچہ اس تقطیع پر شائع ہوتا ہے؟ کس پرچے کی اس تقطیع پر اتنی ضخامت ہوتی ہے؟ کون پرچہ اس قدر اعلیٰ تصاویر اور اس کثرت سے شائع کرتا ہے؟ اور کون پرچہ ایسے بلند پایہ مضامین پیش کرتا ہے؟

نامرادِ اُردو کا ہر ایڈیٹر یہ رونا رویا کرتا ہے کہ اُردو داں طبقہ بلا کا بےحس واقع ہوا ہے، اور آئے دن رسالوں میں اپیلیں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ

برائے خدا و رسول ہر خریدار کم سے کم ایک ایک خریدار تو مزید بہم پہنچا دے۔ لیکن نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ غریب ایڈیٹر کی ہر فریاد اور ہر صدا، صدا بصحرا ہو کر رہ جاتی ہے اور اُردو داں طبقہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔

شکایت کے موقعے پر انجمنوں کے پلیٹ فارموں پر تو یہ "مُربّیانِ" اُردو بڑی بلند آہنگیوں اور کامل جوش و خروش سے "اُردو، اُردو" کے نعرے لگاتے ہیں، اور ہندی پرچار سے بیزاری کا اعلان فرماتے ہیں۔ مگر عمل اگر دیکھا جائے تو مایوسی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

"کلیم" نے اب تک تو "ہر خریدار کم سے کم ایک خریدار تو مزید بہم پہنچا دے" کی صداؤں سے کافی پرہیز کیا ہے اور آئندہ بھی حتّی الوسع وہ ان اپیلوں اور فریادوں سے آلودہ ہونے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ یہ اس لئے نہیں کہ "کلیم" کی ملکیت میں خدانخواستہ کوئی تعلقہ یا خزانہ آگیا ہے، بلکہ محض اس نقطۂ نگاہ سے کہ اندھوں کے آگے آئینہ پیش کرنا، اور بہروں کے روبرو گانا اُس کے نزدیک کوئی عاقلانہ فعل نہیں ہے۔

"کلیم" میں جب تک زندہ رہنے کی قوت ہے شاید کچھ اس سے بھی زیادہ زندہ رہے گا۔ اور جب حامیانِ اُردو اس کی زندگی ناممکن بنا دیں گے تو کامل اطمینان کے ساتھ بغیر روئے پیٹے رخصت ہو جائے گا۔ پھر وہ اس کی طرح یہ دعویٰ تو کیا نہیں جا سکتا کہ

"ہم مرے تو ہم مریں، ہم ری مرے بلائے"

پھر بھی دبی زبان سے اس قدر ضرور عرض کیا جائے گا کہ

"آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا"

"کلیم" پر اس شش ماہی میں مختلف اُردو انگریزی رسالوں کے اندر جو ریویو نکل چکے ہیں اُن کے اقتباسات پیش کرنا طوالت سے خالی نہ ہوگا۔ اس لئے ہم صرف اُن پرچوں اور اخباروں کے نام درج کئے دیتے ہیں جن میں "کلیم" پر ریویو ہوا ہے۔ تاکہ اگر قارئین کرام چاہیں تو بطورِ خود اُن پرچوں کو ملاحظہ فرمالیں۔

عبرت کلکتہ۔ ساربان لاہور۔ صدق لکھنؤ۔ پانیر۔ الجمعیۃ دہلی۔ سفینہ۔ کنول آگرہ۔ شاعر آگرہ۔ ہندوستان ٹائمس دہلی۔ اُردو اورنگ آباد۔ یونائیٹڈ انڈیا۔ مشرق گورکھپور۔ ذوالقرنین بدایوں۔ ہمایوں لاہور۔ نظام المشائخ دہلی۔ سرگزشت علی گڑھ۔ زمانہ کانپور۔ پرتاپ لاہور۔ آسد لکھنؤ۔ ہمدرد سری نگر۔ سرفراز لکھنؤ۔ اقدام دہلی۔ تیج دہلی۔ وطن دہلی۔ شیر رنگون۔ کوثر بنگلور۔ رومان لاہور۔ غور ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔ اودھ پنچ لکھنؤ۔ معارف اعظم گڑھ۔ استقلال دیوبند۔ ہند کلکتہ۔ رہنما مرادآباد۔ مجاہد ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔ پیسہ اخبار لاہور۔ متوالا پشاور۔ اور حقیقت لکھنؤ۔

ہم ان تمام اخباروں، اور رسالوں کے مدیروں اور نقد نگاروں کے دل سے شکرگزار ہیں کہ اُنھوں نے ازراہِ اخوت و کرم اپنے اپنے انتقاد سے بہرہ مند ہونے کا ہمیں موقع دیا۔ اور اُن کے نزدیک جو صحیح مشورے تھے اُن سے بھی انھوں نے دریغ نہیں فرمایا۔

ہمارے نزدیک متعصبانہ نکتہ چینی جہاں ایک بہت بڑا صحافتی گناہ ہے وہاں دوستانہ تقریظ نگاری بھی انتہائی جرم ہے۔ اور ان دونوں سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ اگر علمی حیثیت سے خوردہ گیری کی جائے تو یہ صورت ہر حال اور حیثیت سے موجبِ برکت ہوتی ہے۔

"کلیم" پر جو ریویو خالص متعصبانہ نکتہ چینی کی بنا پر نکلے ہیں اُن پر ایک لمحے کے واسطے بھی توجہ یا خامہ فرسائی کرنا بے سود ہے۔

البتہ اُن تنقیدوں پر ایک نظر ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو خالص علمی نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہیں۔

ایک پرچے میں یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ جنوری نمبر میں ایک عُریاں تصویر شائع کی گئی ہے۔ میں اس کے متعلق پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور آج بھی تحریر کرتا ہوں کہ نفسِ برہنگی کوئی عیب نہیں ہے۔ البتہ اگر برہنہ تصویر شائع کی جائے اس مقصد سے کہ اُس سے حیوانی جذبات اُبھر پڑیں اور جنسی اُمنگیں حرکت میں آجائیں تو بیشک اخلاقی نقطۂ نگاہ سے یہ ضرور معیوب ہے۔ لیکن اگر کوئی تصویر، جیسا کہ "کلیم" کے جنوری نمبر کی تصویر کا معاملہ ہے، اس غرض سے شائع کی جائے کہ پڑھنے والوں کے دل میں اعلیٰ جذبات مشتعل ہو جائیں، اور ایک غلام قوم یہ غور کرنے لگے کہ آزادی حاصل کرنے کی خاطر زندہ قومیں کیا کیا قربانیاں کر چکی ہیں، تو ایسی تصویر کا شائع کرنا کوئی

عیب نہیں، بلکہ اُس کی اشاعت فرائض میں داخل ہو جاتی ہے۔

دوسرا اعتراض آدم و حوّا کی تصویریں شائع کئے جانے کے متعلق ہے جس کا جواب "کلیم" کے اپریل نمبر میں دیا جا چکا ہے۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ "بسم اللہ" کے عوض "بنامِ قوّت و حیات" کیوں لکھا گیا۔ یہ ایک ایسا طفلانہ اور قدامت پرستانہ اعتراض ہے کہ اِس کے جواب میں صرف مُسکرا دیا جا سکتا ہے۔

چوتھا اعتراض میرے مضمون مطبوعہ جنوری نمبر "اُردو ادب میں انقلاب کی ضرورت" کی تمہید پر ہے۔ جہاں میں نے نوعِ انسانی کی اصلاح کے خیال کو مضحکہ خیز کہا ہے اور پھر دُنیا کو انقلاب کی دعوت دی ہے۔

میں ناقد صاحب کی خدمت میں بصد ادب عرض کروں گا کہ وہ اپنے اعتراض پر نظرِ ثانی فرمائیں۔ اور اس نظرِ ثانی کا موقع یوں نکالیں کہ میرے اُس مضمون کو کامل غور و فکر سے کم از کم دوبار ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ اور اُس کے ہر باریک پہلو پر نگاہ کر کے فیصلہ کریں کہ اُن کا اعتراض کہاں تک صحیح ہے۔

کسی مضمون یا کتاب کا پڑھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مطالعہ ایک فن ہے۔ اور ہر شخص مطالعہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

صحیح مطالعے کے معنی ہیں پڑھنا، پڑھ کر مطالب کا ہضم کرنا، اور ہضم کر کے اُس سے خونِ صالح پیدا کرنا اور پھر اُس خون کو اپنی رگ و پے میں دوڑا لینا۔ اگر اس صورت سے میرے اُس مضمون کا مطالعہ کیا گیا تو غلط فہمی رفع ہو جائے گی، اور اگر اس کے بعد بھی غلط فہمی باقی رہے گی تو میں تفصیلی جواب دینے پر بخوشی طیار ہوں۔

پانچواں اعتراض یہ ہے کہ میرے مضامین اور اشعار کے علاوہ دوسرے مضامین متعلّمِ انقلاب نہیں ہوتے۔ اِس اعتراض میں ایک حد تک سچائی ضرور ہے۔ ہر چند یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مضامین کا غالب حصّہ انقلابی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بالکل درست ہے کہ تمام مضامین حسبِ مراد نہیں ہوتے۔

میں کوشش کر رہا ہوں کہ "کلیم" کے معیار کے مطابق مضمون نگار پیدا کروں۔ ظاہر ہے کہ ہر پرچہ جیسا کہ پہلے بھی لکھ چکا ہوں سال دو سال کے بعد اپنے مخصوص مضمون نگاروں کا حلقہ پیدا کیا کرتا ہے اور کوئی کام ابتدا میں انتہا نہیں دکھا سکتا۔

مجھے اس کی خوشی ہے کہ رفتہ رفتہ میرے احباب میں یہ جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ اور تھوڑے ہی دن میں "کلیم" کی سطح کے مطابق کافی مضامین نگار پیدا ہو جائیں گے۔

چھٹا اعتراض یہ ہے "یا یوں کہئے کہ اس کا اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ جس طرح اقبال سیاسیات اور انجمنِ حمایتِ اسلام کے قضیوں میں پڑ کر اپنی شخصیت کو مجروح کر چکے ہیں اُسی طرح "کلیم" کی مصروفیتیں میری شخصیت (شاعری) کو بھی مجروح کر دیں گی۔

یہ اندیشہ میرے نزدیک بالکل صحیح ہے۔ جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے میں خود محسوس کر رہا ہوں کہ "کلیم" کی مصروفیتیں کسی حد تک مُضر ضرور ثابت ہو رہی ہیں لیکن دو وجوہ کی بنا پر میں اس کی چنداں پروا نہیں کرتا۔

اوّل تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، وہ غلط ہو یا صحیح، کہ قدرت نے شاعری کا ایسا زبردست، تُند اور شدید مادہ مجھے ودیعت فرمایا ہے کہ وہ دُنیا کی ہر مصروفیت کا کامیاب مقابلہ کر سکتا ہے اور ایک رُبع سے زائد مجروح نہیں ہو سکتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ میں ہندوستان کا اپنے پر کم سے کم اس قدر حق ضرور سمجھتا ہوں کہ اپنی شاعری کے ایک رُبع حصّے کی قربانی کر کے اُس کی خدمت میں لگا رہوں۔

ساتواں اعتراض یہ ہے کہ خطابت میں میرا لہجہ بہت سخت ہو جاتا ہے جس سے اصلاح کے عوض بدظنی اور ضد پیدا ہو جانے کا خوف ہے۔

یہ اعتراض حرف بحرف صحیح ہے۔ لیکن میں اپنا سینہ کھول کر کیونکر دکھاؤں کاش کوئی میرے دل کو دیکھ سکتا۔

ہر کسے از ظنِ خود شُد یارِ من
واز دُرونم کس نجست اسرارِ من

میں تو ہندوستان کو عروج کے اُس نقطۂ آخر پر دیکھنا چاہتا ہوں جہاں انسانی حد بندیاں ختم ہو جاتی ہیں، اور جب یہ دیکھتا ہوں کہ ہندوستان اُس مقام پر ہے جہاں انسانی پستیوں کے امکانات کی منزل ختم ہو جاتی ہے

تو غصّے کے مارے میرے سر کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں اور دیوانہ وار جو مُنہ میں آتا ہے بکنے لگتا ہوں۔

جذبات کی انتہائی یا معراجی شدّت کے وقت مصلحت اندیشی اور حکمت مآبی کا مطالبہ کرنا، انسانی نفسیات سے مکمل بیگانگی نہیں تو اور کیا ہے؟

میرے جسمانی حیثیت سے زندہ اور ذہنی حیثیت سے مرحوم دوست حضرت مانی جائسی نے جذبات کی شدت کے وقت حکمت مآبی کے مطالبے کا کیا خوب مذاق اُڑایا ہے، فرماتے ہیں۔

یعنی عاشق، کوئی بقراط ہے، ناصح! کہ جسے
جوشِ آغاز میں اندیشۂ انجام رہے!

آخر وہ کون ایسی بے عزّتی ہے جو ہمارے لئے اُٹھا رہی ہے، اور وہ کون ایسی بے غیرتی ہے جس سے ہم مصالحت نہیں کر چکے ہیں؟

قوّت و حیات کی قسم، اگر میرا بس چلے تو میں ہندوستان کے بدخواہ اور اغیار کے دست و بازو قوی کرنے والے سکھوں، عیسائیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو جو مذہب کی آڑ لے کر ایک دوسرے کا خون بہایا کرتے ہیں ایسی ہولناک سزائیں دوں کہ تعزیر و عقوبت کے تمام پارینہ افسانے، اور قہر خداوندی کی تمام پیشین روایتیں انگشت بدنداں ہو کر رہ جائیں۔

ہندو، اور مسلمان ہندوستان کی پُشت پر دو خطرناک سرطان ہیں۔ جنھیں لیپ اور مرہم کی حاجت نہیں۔ سر تیز نشتر کی ضرورت ہے اور انصاف سے کہئے کہ وہ شخص جو نشتر کی سی سخت چیز استعمال کرنے کی آرزو رکھتا ہے اُس سے نرم الفاظ کا مطالبہ کہاں تک جائز ہے؟

"کلیم" کی افادیت اور دلچسپیوں میں اضافہ کرنے کی خاطر آئندہ سے سائنس کے مضامین کا خاص اہتمام کیا جائے گا۔ اور مُلکی و غیر مُلکی صحائف کے تراجم، نیز دیہاتی شاعری کے نمونے بھی پیش کئے جائیں گے۔

قوّت زندہ باد!

حبش ختم ہو گیا، سیاہ فام حبش ختم ہو گیا۔ کمزور بیچارہ نیم مسلح اور نیم شائستہ حبش ختم ہو گیا۔

سفیدی نے سیاہی کو نگل لیا۔ دن نے رات کا گریبان چاک کر ڈالا۔ اور عقل و حکمت کے زلزلے نے سحر و افسوں کی سرزمین کا سینہ پھاڑ ڈالا۔

قُوّت۔ قُوّت۔ قُوّت، جو کچھ ہے قُوّت ہے۔ اور کمزوری ہی وہ تنہا جرم ہے جسے دُنیا نے آج تک کبھی معاف نہیں کیا ہے۔

ہمارے قابل، اُونچی، اُونچی کرسیوں پر "گون" پہنکر بیٹھنے والے شاندار جج، جن "مجرموں" کو روز جیلوں میں ٹھونسا کرتے، اور ہمارا بلند بانگ و پُرہول قانون جن "قاتلوں" کو آئے دن سُولیوں پر چڑھایا کرتا ہے، وہ تمام "مجرم" اور وہ تمام "قاتل" اس اخلاقی یا قانونی بِنا پر قید و قتل کی سزا نہیں پاتے کہ وہ "بد اخلاق" اور "قانون شکن" ہیں۔ وہ تو اس اور صرف اس خالص اور تنہا خطا پر جیلوں میں ٹھونسے اور سُولیوں پر چڑھائے جاتے ہیں کہ بدبختی یا اتفاق سے وہ کمزور واقع ہوئے ہیں۔

دُنیا کا سب سے بڑا نظام، سب سے بڑا قانون، سب سے بڑا اخلاق اور سب سے بڑا مذہب، قُوّت اور صرف قُوّت ہے۔

خدا بھی صرف اس لئے اب تک زمانے کی دست بُرد سے بچا ہوا ہے کہ قُوّت کا تصوّر ہنوز اُس سے وابستہ ہے۔

دُنیا کی تمام و کمال تاریخِ تعزیر و عقوبت کا ایک ایک ورق اُلٹ جاؤ، ایک ایک حرف پڑھ ڈالو، شاید ایک نظیر بھی ایسی نہ مل سکے گی کہ اس مقدّس نوع نے جسے نوعِ بشر کے شاندار خطاب سے پکارا جاتا ہے کسی کو اس بنا پر سزا دینے کی زحمت گوارا کی ہو کہ وہ مذہب و اخلاق کی رُو سے مستوجبِ تعزیر و عقوبت تھا۔

بلکہ اس وقت تک جتنی سزائیں دی گئی ہیں، وہ محض اس تنہا اور

خاص بنیاد پر دی گئی ہیں کہ تم قوی کیوں نہیں۔ کمزور کیوں ہو۔

اٹلی نے حبش کو نگل لیا۔ ختم کر ڈالا۔ کیا اٹلی کا یہ فعل۔ قانون، اخلاق اخلاق اور مذہب، اور سب سے زیادہ یورپ کی حامیٔ امن عالم تہذیب نوکی نظر میں جائز تھا، شریفانہ تھا؛

اٹلی نے چھپ کر نہیں، روز روشن میں اور ڈنکے کی چوٹ پر ڈاکہ مارا، قتل کیا۔ بم برسائے۔ گیس سے آنکھیں پھوڑ ڈالیں، ہوائی جہازوں سے آبادیوں کو بھون ڈالا۔ ہزاروں اللہ کے بندوں کو موت کے گھاٹ اتار کر، ہزاروں ماؤں کے کلیجے پھاڑ ڈالے۔ ہزاروں بچّوں کو بے والی و وارث بنا دیا، اور ہزاروں دولہنوں کا سہاگ لوٹ لیا۔

یہ بھی واضح رہے کہ یہ شقاوت ایک دن میں شروع ہو کر ختم نہیں ہو گئی بلکہ یہ آگ، اور خون کا کھیل ایک سال تک کھیلا جاتا رہا۔

مہذّب دنیا میں اخباروں کے ذریعے سے اس کی ڈکیتی۔ خونریزی شقاوت اور لوٹ مار کی، خبریں روز ٹھیک وقت پر پہونچتی رہیں——
اخبار فروشوں نے ایک ایک خونی واقعے کو سڑکوں پر پکار پکار کر بیان کیا۔

اس ظلم و جبر کی خبروں کو "اچھوں" نے بھی سنا، "بُروں" نے بھی۔ اُن لوگوں نے بھی سنا جو "معلّمِ امن" ہیں۔ اور انھوں نے بھی جو "مفسد" ہیں۔
یہ خونین داستان اُن کے کانوں تک بھی پہونچی جو دنیوی دولت کے لحاظ سے "مقتدر" ہیں۔ اور اُن کے بھی گوش گزار ہوئی جو دینی بصیرت کے لحاظ سے "مقدس" کہے جاتے ہیں۔

یورپ کی عالم پناہ مجلسِ اقوام نے بھی دیکھا کہ حبش بے خطا پامال ہو رہا ہے۔
یورپ کی مسلّمۂ امن پرور تہذیب نے بھی دیکھا کہ حبش کو بے خطا تباہ کیا جا رہا ہے۔

اور یورپ کی دو ہزار برس کی دشمنوں تک سے محبت کرنے والی، مقدّس مسیحیّت نے بھی دیکھا کہ حبش بے گناہ ذبح کیا جا رہا ہے۔
لیکن کسی نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ شاہِ حبش نے امداد کے واسطے تہذیب، مسیحیت اور مجلس اقوام۔ بلکہ تمام عالم کو پکارا۔ لیکن سب نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ اس لئے کہ وہ کمزور کی آواز تھی۔ اور کمزور کی آواز کو حق نہیں پہونچتا کہ وہ سنی جائے۔

دُنیا قوّت پرست ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ قوت سے ٹکر کھانے کا تصور بھی کرے۔

جس طرح بڑے درخت سے آج تک یہ نہیں پوچھا گیا کہ تو اپنے سائے میں پیدا ہونے والے پودے کو کیوں سُکھا دیتا ہے اور کسی بڑی مچھلی سے یہ دریافت نہیں کیا گیا کہ تو چھوٹی مچھلیوں کو کیوں نگل لیتی ہے۔ اسی طرح دنیا نے کسی قوی سے یہ سوال کرنے کی کبھی جرات نہیں کی کہ تو کمزور کو کیوں ہضم کر لیتا ہے؛

یہ مذہب و اخلاق کے تمام ضابطے اور شرافت و تمدّن کے تمام دکمال دفعات۔ سب کے سب سراسر ہیچ۔ پوچ اور لچر ہیں، اگر اُن کی پشت پر کارفرما قوت موجود نہ ہو۔

اس لئے دنیا کو کیوں ہندوستان اور صرف ہندوستان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کمزور کے علم سے قوی کا جہل۔ کمزور کی شرافت سے قوی کی رذالت کمزور کی عبادت سے قوی کا فسق و فجور۔ کمزور کے دین سے قوی کی بے دینی۔ اور کمزور کے خدا سے قوی کا شیطان بہتر، بدراجہا بہتر ہوتا ہے، اور اس قدر بہتر کہ ان میں تقابل کرنا، عقل و شعور کی جناب میں گستاخی کرنے سے بدتر ہے،

قانون نہیں ہے کوئی فطرت کے سوا
دُنیا نہیں کچھ نمود طاقت کے سوا
قوت حاصل کر اور موسےٰ بن جا
معبود نہیں ہے کوئی قوّت کے سوا



آدمی دے اے خدا

اے خدا ہندوستاں کو بخش ایسے آدمی
جن کے سر میں مغز ہو، اور مغز میں تابندگی

جن کی فکرِ تازہ میں ہو اجتہادی بانکپن
جن کی عقلوں پر نہ ہو بارِ روایاتِ کہن

جن کی رگ رگ میں ہزاروں بجلیاں ہوں بیقرار
جن کے دل مضبوط ہوں، جن کی اُمنگیں شعلہ بار

موت کو پُوجیں جو عُمرِ جاودانی کی طرح
خُون جو اپنا بہا سکتے ہوں پانی کی طرح

عزم جن کے خندہ زن ہوں ثابت و سیّار پر
ذہن جن کے سانس لیں اوجِ سرِ کہسار پر

جو جئیں تدبیرِ تسخیرِ جہاں کے واسطے
اور مریں بھی تو فقط ہندوستاں کے واسطے

جن کے آگے ہوں گرجتی بدلیاں چنگ و رباب
زندگی کیا کھیلتا ہو موت سے جن کا شباب

جن کی ہر موجِ نفس میں ہو خروشِ زندگی
جن کا ہر نقشِ قدم ہو اک ستونِ روشنی

جن کے سینوں میں ہوں روشن حُبِّ ملّت کے چراغ
دِل تو دل، دل کی طرح جن کے دھڑکتے ہوں دماغ

جن کے بربط میں دہکتی زندگی کا راگ ہو
جن کے دل میں ولولے ہوں، ولولوں میں آگ ہو

جن کی شمعِ فکر ہو روشن تر از مہرِ منیر
سبحہ و زُنّار میں جکڑے نہ ہوں جن کے ضمیر

ناسزا اوہام کر سکتے نہ ہوں جن کا شکار
گائے باجے پر نہ ہو جن کے عقاید کا مدار

اے خدا ہم کو نزاعِ کفر و ایماں سے بچا
اپنے ہندو سے بچا، اپنے مسلماں سے بچا

رُوح کی رفعت سے ہوں جو آسمانی آدمی
دے ہمیں بارِ خدا "ہندوستانی" آدمی

الغرض میرے وطن کو زندگی دے اے خدا
آدمی دے، آدمی دے، آدمی دے اے خدا!

جوش ملیح آبادی

ڈاکٹر انصاری کی موت

اِس عالم کون و فساد میں جینے مرنے کا کھیل آئے دن نہیں، بلکہ ہر روز، اور ہر روز نہیں، ہر لمحہ کھیلا جاتا ہے۔ جانے والے جا رہے ہیں اور آنے والے آتے ہی چلے جاتے ہیں۔

موت کوئی ایسی غیر معمولی یا مہیب شئے نہیں جس پر خاص توجہ مبذول کی جائے یا اُس سے ڈرا جائے۔

بعض افراد ہر ملک و ملت میں ایسے ضرور ہوتے ہیں جو اپنی موت کی اہمیت کو منوا کر رہتے ہیں۔

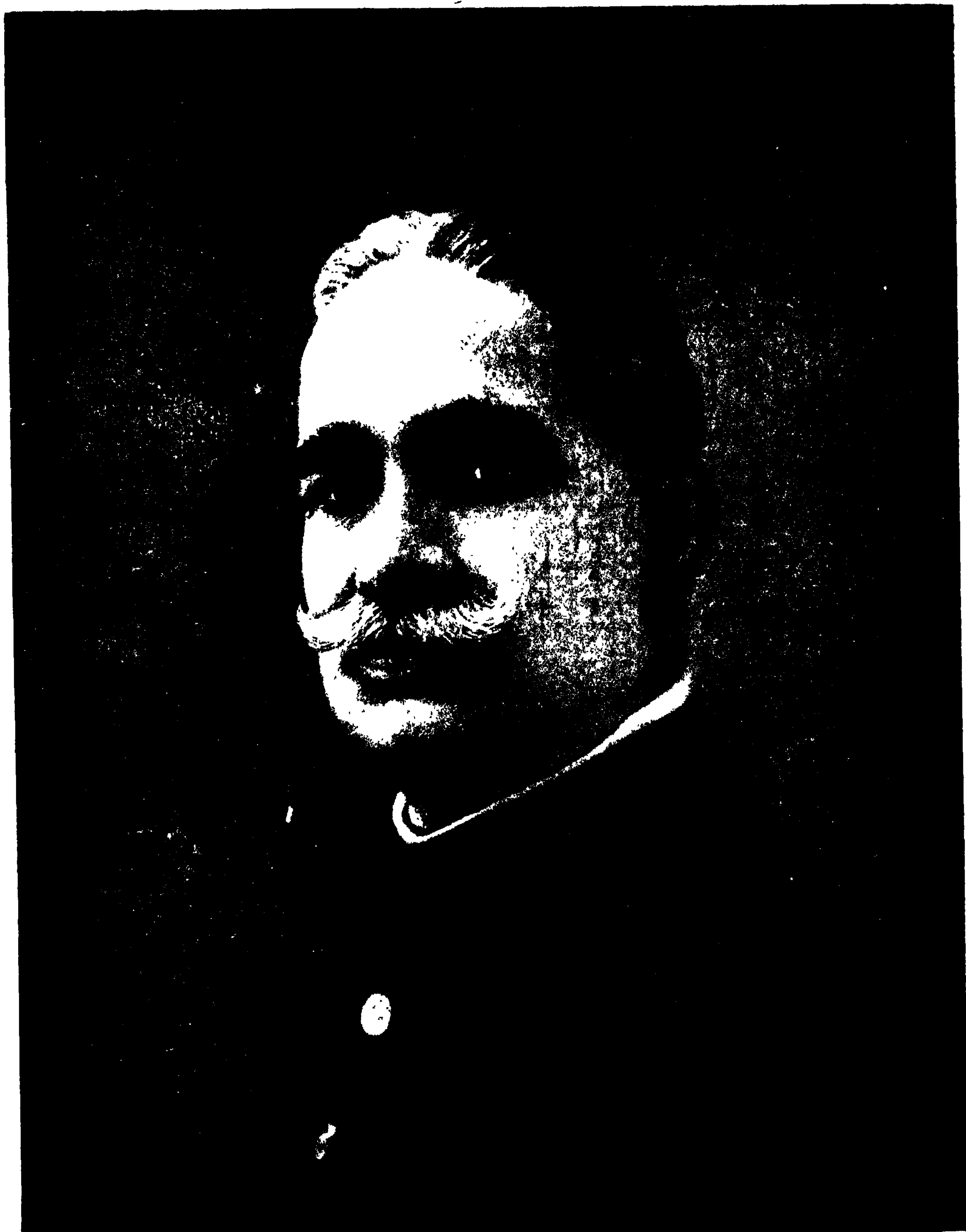
اگر یہ صحیح ہے کہ زندگی وہی زندگی ہے جس کے ختم ہونے سے سوسائٹی میں کوئی خلا واقع ہو جائے، اور انجمن میں ایک ایسی جگہ خالی ہو جائے کہ اُس کی خانہ پُری ہی نہ ہو سکے تو ہم بلا خوفِ ابطال کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندگی ڈاکٹر انصاری کی زندگی تھی جس کے ختم ہو جانے کے بعد ہمیں بظاہر اسباب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی جگہ کی ایک زمانۂ دراز تک خانہ پُری نہ ہو سکے گی۔

یہ صحیح ہے کہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے مسلمان من حیث القوم کانگریس سے علیحدہ ہو چکے ہیں، اور کانگریس میں ڈاکٹر مرحوم کی شرکت محض ایک انفرادی حیثیت کی شرکت تھی۔ مگر یہ انفرادی شرکت بھی اس قدر اہم اور مفید تھی جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے سیاسی عقائد میں اشد راسخ تھے کہ دنیا کا کوئی خوف اور زر و گوہر کا کوئی انبار اُنہیں اُن کی جگہ سے ہلا نہیں سکتا تھا۔ اُن کی ذات ایک ایسی زبردست اور مضبوط چٹان تھی جس سے طوفان اپنا سر ٹکرایا کرتے ہیں اور اُس میں ایک لمحے کو بھی جنبش نہیں ہوتی تھی۔

اس کے علاوہ پرائیویٹ حیثیت سے بھی مرحوم ڈاکٹر نہایت ہی خوش خلق، متواضع اور بُردبار فرد تھے، اور سیاست کے سے سنجیدہ تلخ مشاغل کے باوجود اِن کے دل میں فنونِ لطیفہ اور جمالیات کا بھی بدرجۂ اتم میلان پایا جاتا تھا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے سینے میں ایک زندہ، حساس، شگفتہ اور تندرست دل تھا۔

اِس ہولناک زمانے میں جب کہ ہندوستانی لیڈر اپنی قوم کے واسطے ایک مستقل خطرہ بنے ہوئے ہیں ایک ایسے نیک نفس اور مخلص رہنما کا اُٹھ جانا ایک ایسا دردناک سانحہ ہے جس پر جس قدر بھی آنسو بہائے جائیں کم ہے۔

چونکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسے سانحۂ عظیم پر صبر نہیں کیا جا سکتا ورنہ ہم دعا کرتے کہ خدا ڈاکٹر صاحب کے متعلقین اور اُن کے ملک کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔





پتھر میں آوازوں کی گونج

شاعرانہ بصیرت اور منتر

شری اروِند گھوش (پانڈیچری)

طرزِ بیان اور سلاست وروانی، جو شاعرانہ اثرانگیزی کا طرّۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے، ایک ایسا نقطۂ اتصال ہے جہاں سے کلام کی پرواز و رفعت، سخن کی حیات افروزی اور شعریت کا ذہنی عنصر، روحانیت کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کی اہمیت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب وہ ایسے عمیق، بلند، یا وسیع روحانی تصورات کا حامل ہوتا ہے جن میں شعورِ حیات، پروازِ تخیل اور اشیائے مکشوفہ کا جمالی پہلو، شاعرانہ الہامات کی موجوں پر رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

"اشیائے مکشوفہ" اس لئے کہا گیا کہ شاعرانہ پیامات اگر مکاشفہ نہیں تو اور ہو کیا سکتے ہیں؟

چھوٹے شاعروں کی زندگی میں یہ لمحے بہت ہی شاذ آتے ہیں، اور آتے بھی ہیں تو اتنی تیزی کے ساتھ گزر جاتے ہیں جیسے عجلت پسند فرشتوں کا نزول، یا درخشاں اتفاقات کا وقوع۔

البتہ بڑے شاعروں کی زندگی میں یہ لمحات بکثرت آتے اور اکثر و بیشتر اپنی شعلہ فشانیوں سے اُس کے دل کو جگمگاتے رہتے ہیں۔

لیکن عظیم ترین شعراء کا حال ان دونوں سے مختلف ہوتا ہے اُس پر تو یہ الہامی لمحے پھٹ پڑتے ہیں۔ اور کبھی جدا ہونے کا نام تک نہیں لیتے۔

چونکہ ان الہامات کا سرچشمہ وہ مسلسل و متصل شاعرانہ تصورات و کمالات ہوتے ہیں، جو اپنے عمل میں کبھی بھولے سے بھی کوتاہی یا غفلت نہیں کرتے۔ اس لئے ان کا مظاہرہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ تمام مظاہرے ہمیشہ مساوی شدت کے ساتھ نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ کبھی شدت سے رونما ہوتے ہیں اور کبھی کمی کے ساتھ۔

جس طرح فلسفی کی مخصوص صفت، "قوتِ میزہ" اور عالم (سائنٹسٹ) کا جوہر "تحلیلی مشاہدہ" ہے، بالکل اُسی طرح "بصیرت" شاعر کی خصوصی طاقت مانی جاتی ہے۔

زمانۂ قدیم میں شعراء کو کاشفِ حقائق، اور ناظرِ اسرار کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

ہرچند اب ہم اِس مطمحِ خیال، اور بلند معیار سے اس قدر دور ہو چکے ہیں کہ شعراء سے صرف ذوقِ سماعت کی دعوت اور جذبۂ حسن پرستی کی خدمت کے مطالبے ہی پر اکتفا نہیں کرتے۔ پھر بھی اس حقیقت نا شناسی کے باوصف اعلیٰ درجے کی شاعری اپنے اصلی مقصد و مفہوم کے بلند حقائق کا کچھ نہ کچھ عنصر اب بھی اپنے خزانے میں پوشیدہ کئے ہوئے ہے۔

شاعری چونکہ صناعت ہے۔ اِس لئے اُسے لازم ہے کہ ہماری آنکھیں کھولنے کی سعی کرے اور چونکہ یہ انسان کے حواسِ باطنی ہی ہیں جن سے شاعری خطاب کرتی ہے، اور کان، داخلے کا محض ایک مادّی دریچہ ہونے کے باوصف

شعر کی اپیل کو اندرونی سماعت تک پہونچانے کا ذریعہ ہیں۔ اور اس کے دوش بدوش چونکہ شاعری کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے بطون میں اُن خیالات کی پرورش کریں جنھیں شاعر کلمات موزوں میں پیش کرتا ہے۔ اس لئے بجا طور سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعری کا کام دل کی آنکھیں کھولنا ہے اور ظاہر ہے کہ جو دوسروں کی باطنی نظر کو تیز کرسکتا ہے خود اُس کی بصیرت کس قدر شدید ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ شعرائے کبیر وہی لوگ ہوتے چلے آئے ہیں جنھیں فطرت، حیات، اور انسان کے متعلق وسیع و محکم مفسرانہ اور انقائی قوتیں بخشی گئی تھیں اور جن کی شاعری اُن قوتوں کے آغوش میں پروان چڑھ کر اُن کا اعلیٰ مکاشفانہ اظہار کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی تھی۔

ہومر، شکسپیئر، ڈینٹے، والمیک، اور کالیداس کے درمیان دیگر امور میں خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ لیکن جہاں تک اُن کی عظمت و بزرگی کے نشان کا تعلق ہے۔ وہ متذکرہ بالا امور میں بالکل متحد و متفق پائے جاتے ہیں۔

اِن شعرا کی فوقیت و عظمت کا مدار صرف اسی بنا پر نہیں ہے کہ اُن کی فکر قوی، تخیلات جہاں پیما، جذبات شعلہ فشاں اور اُن کے ولولے سینوں کو تراش دینے والے تھے۔ ہر چند یہ صحیح ہے کہ یہ تمام اوصاف اُن کے اندر موجود اور بدرجۂ اتم موجود تھے۔ اور کوئی اِن جوہروں میں سے ایک کے لحاظ سے زیادہ بہرہ یاب تھا۔ اور کوئی دوسرے علقے سے زیادہ فیض یافتہ۔ لیکن یہ تمام جوہر حقیقت میں اُن کے ملکۂ سخنوری کے محض معاون و مددگار ہی تھے۔ انھیں اُن کی شاعری کا سرچشمہ اور اُن کے الہامات کی بنیاد نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

شکسپیئر کے تمام و کمال ڈرامے کے مقابلے میں اکثر بیکن (Bacon) کے ایک مختصر سے مقالے میں زیادہ قوتِ فکر پائی جاتی ہے۔ لیکن ہزاروں پُرمغز تصنیفات اور کروروں پُراسرار حروف و حکایات اُسے (شکسپیئر کے سے) ڈراموں کا مصنف نہیں بناسکتے جس کا ثبوت یہ ہے کہ بیکن نے جب شاعری کے میدان میں قدم اُٹھایا تو خود اُس کے افکار کی حقیقی فطرت، اور ایک پیدائشی مفکر کی سی مخصوص روشن نگارش نے شاعرانہ طرزِ بیان کے میدان کی طرف مڑتے ہی اُس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں۔

فراوانیٔ تماشائے کائنات اور افراطِ مشاہدۂ حیات کی وادیوں سے [تشکیل] تشکیل، تخیل اور مصوری کے چشموں کے پھوٹ نکلنے اور بار بار پھوٹ نکلنے ہی نے شیکسپیئر کو اُس کی تمام دیگر کمزوریوں کے باوجود، ڈراما نگار شعرا کا شاہنشاہ بنادیا تھا بصیرت، اصلی و بنیادی شاعرانہ جوہر ہے ——————

ہم کہہ سکتے ہیں کہ خسروانِ شعر و سخن وہ روح ہیں جو اپنے ہی آئینے میں نہایت صفائی کے ساتھ مشاہدہ کرتی ہے، خدا کا، دنیا کا، اپنے عالم اور دوسرے عالموں کا، نیز اس تمام مخلوق کا جو ذی حیات ہے، اور جو اپنے مرکز کے سرچشمے سے تخلیقی ترنم اور شعورِ عالم کی ایسی لہروں کو جاری کرتی ہے جو شاعرانہ تصورات کو مجسم کردینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

عظیم شعرا وہی ہیں جو کسی نہ کسی پیمانے پر اپنی اِس عملی تخلیق کی ہمیشہ تکرار و مزاولت کرتے رہتے ہیں اور اُنھیں کو ناظرِ حقائقِ شعری، اور سامعِ کلماتِ موزوں کا خطاب زیب دیتا ہے۔

آج کل کا عصری دماغ (Modern Mind) شاعری میں تفکر کو تمام قوائے شعری پر نمایاں فوقیت دینے کی طرف مائل نظر آتا ہے جس کی کھلی ہوئی وجہ یہ ہے کہ ہم ہنوز ایک ایسے دَور سے گزر رہے ہیں جو ایک عظیم ذہنی کشمکش میں گرفتار، درمیانِ حیات میں سراسیمہ اور فکرِ عالم میں سرگرداں ہے۔

اور اسی بنا پر حیات سے دست و گریباں ہو کر اُس نے فتح کرلینے کی خاطر، یہ دَورِ انسانی ذہانت و فکر کے فروغ دینے میں سب سے زیادہ وقت صرف کررہا ہے اور اِس سلسلے میں یہاں تک غُلو سے کام لیا جارہا ہے کہ اُن دیگر قوا کے پامال کردینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا جو علمِ ذات کے واسطے تفکر و ذہانت کے مقابلے میں کچھ کم مفید و اہم نہیں ہیں ——————

ہم ہمیشہ کچھ نہ کچھ تلاش ہی کرتے رہتے ہیں۔ مختلف ذہنی میدانوں میں اشیائے عالم کے معمے حل کرنے کی دُھن میں سرگرداں رہتے ہیں —— اور لوحِ کائنات کے پُراسرار حروف کے پڑھ لینے اور تفکر کے ذریعے سے اُن کے معنی سمجھ لینے پر ہمیشہ اپنے کو مجبور پاتے ہیں —— جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی اور ہمارے قوائے فکر اِس ہولناک اتصال و تسلسل کے ساتھ مصروف و مشغول رہتے ہیں کہ ہمیں خاموشی سے بیٹھنے اور دنیا کا مشاہدہ کرنے کی فرصت ہی کبھی میسر نہیں ہوتی۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم شاعر سے بھی یہ امید کرتے ہیں کہ وہ اس جد و جہد اور کشمکش میں اپنی عظیم لسانی قدرت و مہارت کے ذریعے سے ہماری امداد کرے۔

ہم اس سے مکمل ترنم اور دل افروز نغمہ سرائی اور تخلیقی بصیرت و شعور کی پہنائیوں کا اتنا مطالبہ نہیں کرتے جتنا کہ اُس سے اپنی پراگندہ اور سرگرم تلاش ذہانت و فکر کے واسطے کسی عقلی پیغام کے طالب رہتے ہیں۔

یہ نے یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ پیش پا افتادہ اور روزمرہ کی معمولی چیزوں کے ادنیٰ سراہنے والوں تک کے کلام پر اُن کے مداح خواہ مخواہ کسی نہ کسی "فلسفے" یا "پیغام" کا لیبل زبردستی چسپاں کر دیتے ہیں، اور جو شے کہ قدرت نے اُنھیں بخشی ہی نہیں ہے، یہ حضرات اُس شے کو زبردستی اُنھیں عطا فرما کر دم لیتے ہیں۔

ٹیگور کا "پیغام" وھٹ مین (Whitman) کا "پیغام" اور خدا جانے اور کس کس کا پیغام!

غرضکہ اِن "فلسفوں" اور اِن "پیغاموں" نے شاعری کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔

یہ کیا اندھیر ہے کہ ہم شاعر سے یہ مطالبہ کرنے لگے ہیں کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کا نغمہ سنج یا ایک عظیم الہامی ناظرِ کائنات ہونے کے عوض، فلسفی، پیغمبر، معلمِ اخلاق اور مصلحِ دین و مذہب بن کر رہ جائے۔

اس موقع پر اِس امر کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب میں شاعر کے متعلق "ناظرِ حیات" کے مرتبے کا دعویٰ کرتا ہوں اور عظیم تر شاعری کا سرچشمہ، حیات، یا خدا، یا دیوتاؤں، یا انسان، یا فطرت کے متعلق ایک عظیم اور کاشفِ اسرار بصیرت کو ٹھہراتا ہوں۔ اُس وقت میرا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ شاعر کے واسطے کسی نہ کسی عقلی فلسفۂ حیات، یا نوعِ بشر کے واسطے کسی خاص پیغام کا حامل ہونا لازمی و ضروری ہے، اور اُسے کسی فلسفے یا پیغام کو محض اس وجہ سے نظم کا جامہ پہنانا چاہیئے کہ موزونیٔ طبع، اور پروازِ تخیل کا جوہر اُسے ارزانی ہوا ہے، یا وہ اس پر مجبور ہے کہ مسائلِ وقت کو سلجھائے اور نوعِ انسانی کے عملِ ترقی کا مددگار بن کر اس مقولے پر عمل پیرا ہو جائے کہ "دنیا کو اس سے بہتر بنا کر جاؤ، جب کہ تم نے اسے پایا تھا۔"

بیشک ایک انسان کی حیثیت سے وہ اِن تمام امور کا حامل ضرور ہو سکتا ہے، مگر وہ اپنی ذات پر ان چیزوں کو جس قدر کم حاوی ہونے دے گا اتنا ہی اس کے شاعرانہ جوہر کے واسطے مفید ہوگا۔ اور اُس کی شاعری تر و تازہ رہے گی۔

البتہ اگر اِن متذکرۂ بالا چیزوں کو شاعرانہ رُوح کے تصرف سے بصیرت و حیات کے سانچے میں ڈھال لیا جائے تو اس قدر فائدہ ضرور پہونچ سکتا ہے۔ کہ ان چیزوں سے شاعرانہ طرزِ بیان کی اثر انگیزی بڑھ سکتی ہے، اور یہ چیزیں شاعرانہ طرزِ بیان کے واسطے مسالہ ضرور فراہم کر سکتی ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ چیزیں شاعری کی رُوح اور اس کا مقصد کبھی نہیں بن سکتیں۔ اور نہ شاعر کی تخلیقی سرگرمیوں اور لفظی خوبیوں کے واسطے شمعِ ہدایت کا کام دے سکتی ہیں۔

ناظر شاعر (THE POET-Seer) تمام فلسفیوں اور پیمبروں سے ہٹ کر ایک قطعی مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھتا، سوچتا اور بولتا ہے۔

پیغمبر، حق و راستی کا اعلان "فرمانِ الٰہی" اور "کلمۂ ربانی" کی شکل سے کرتا ہے اور مبلغِ پیام کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ لیکن شاعر کا وظیفۂ فطری اس سے قطعاً مختلف ہوتا ہے۔ اس کا کام تو صرف اس قدر ہے کہ حق و راستی کو اُس کی جمالی قوت کے ساتھ دکھائے۔ اُس کے آیات و علامات پیش کرے، قدرت کی دل فریبیوں اور حیات کے مختلف پہلوؤں میں اس کی صناعیوں اور کارکردگیوں کو منظرِ عام پر لے آئے۔ اور جس لمحے میں شاعر اِن فرائض سے عہدہ برآ ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ بس اُس نے اپنے تمام کام ختم کر دیئے، اس سے زیادہ کی اُسے ضرورت نہیں، کیونکہ حق و راستی کا مستقل خطیب اور حقائق و اسرار کا محکم ترجمان بننا اُس کے دائرۂ عمل سے قطعی خارج ہے۔

فلسفی کا کام، حق و راستی کے مختلف نازک پہلوؤں میں امتیاز پیدا کرنا، اور اُس کے مختلف اجزائے ترکیبی، اور صُوَرِ معنوی کو عقلی تعلقات کے لحاظ سے باہمدگر پیوستہ و ہم رشتہ کر دینا ہے۔

لیکن شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ حق و راستی سے ہم آغوش ہو جائے اور اس کے علامات و اشکال کو اُن کے زندہ تعلقات کے لحاظ سے مجتمع و متشکل کر دے یا اس پیچیدہ فلسفیانہ طرزِ بیان سے گریز کر کے سادے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کا یہ کام ہے کہ وہ حق و راستی کا مشاہدہ کرے اور شاعرانہ ولولوں سے بیخود ہو کر اُسے ایک مجسمۂ حسن و جمال کی شکل میں ڈھال دے۔

یہ بہت ممکن ہے کہ پیمبر کا باطن ایک شاعرانہ شخصیت کو بھی اپنے خلوتکدے میں پوشیدہ رکھتا ہو، ورنہ پیمبر کے پردے میں پھر یہ ہے کون جس کے سینے سے

کبھی کبھی حیرتناک خطابت کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں، اور جس کی آواز حیات کے شوخ و تابناک ماحول کے ساتھ ساتھ رسالت کے کلماتِ راست، اور پیامِ معصوم کا احاطہ کرلیتی ہے۔

پیغمبر اُس جمالِ حقیقت کے ایک کاشفِ اسرار مجسّمے کی نقاب کُشائی کے ذریعے سے (جس کا وہ منادی ہے) یہ بات بہ سبیلِ حرف و حکایت بیان کرکے اپنے فرائض پورے کرسکتا ہے کہ فطرت کی حیات میں اور جلوۂ لالہ و گل کے اندر، نیز حیاتِ انسانی کے پسِ پردہ، روحِ کائنات کیوں کر سرگرمِ عمل رہتی ہے۔

اسی طرح فلسفی، شبستانِ شاعری کی صحت آفریں فضا سے آب و رنگ لیکر اپنے دلائل کی دھندلی اور غیر دلچسپ روشنی کو ایک حد تک دلکش بنا سکتا ہے، اور چشمۂ سخنوری سے بھیک مانگ کر اپنی سنسان اور خشک کھیتی کی آبیاری کرسکتا ہو

لیکن پیمبروں اور فلسفیوں کی یہ تمام شاعرانہ کاوشیں، اُن کے واسطے زیب و زینت کا ساز و برگ تو ہوسکتی ہیں۔ لیکن اُن کی بنیاد کبھی نہیں بن سکتیں۔ اور جیسے ہی کہ پیمبر اور فلسفی، شاعری کو اپنی روحانی و عقلی اساس اور بنیاد بنالیتے ہیں تو اُن کی رسالت و حکمت کی حیثیت اُس لمحے ختم ہوجاتی ہے اور وہ پیمبرانہ سیرت اور حکیمانہ تفکر سے عاری ہوکر ایک حقیقت نگر شاعر کے روپ میں جلوہ گر ہوجاتے ہیں۔

اسی بنا پر بعض سخت گیر علمائے الٰہیات نیٹشے کو حکیم کا خطاب نہ دینے کے باب میں غالباً برسرِ حق ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ نیٹشے تفکر و تدبر سے کام لینے کے عوض مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی تو اُس کا مشاہدہ دھندلا ہوجاتا تھا، کبھی درخشاں، کبھی سیدھا ہوتا تھا، اور کبھی پیچیدہ و ناہموار۔ لیکن وہ ہمیشہ مشاہدہ ہی کیا کرتا تھا۔ اور مشاہدہ بھی فلسفی کے دماغ سے نہیں بلکہ شاعر کی نگاہ سے۔

اس کے برعکس عظیم شاعری کے ایسے نمونے بھی مل سکتے ہیں جو یا دیانہ جوشِ تکلم اور پیمبرانہ آتشِ خطابت سے بھرپور، یا اپنے مواد کے لحاظ سے، ایک بڑی حد تک یا تمام تر، فلسفیانہ ژرف نگاہیوں سے معمور ہوں۔ لیکن یہ پیمبرانہ شاعری بھی کوئی براہِ راست پیغام نہیں دیتی۔ یہ تو محض اعلیٰ ترین الہامی تصورات و محاکات کا ایک زبردست مجموعہ ہوا کرتی ہے اور بس۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پیمبرانہ و فلسفیانہ شاعری صرف اُس وقت تک شاعری کہی جاسکتی، اور شاعری کی حیثیت سے زندہ کرسکتی ہے جب تک کہ اس میں فلسفیانہ روش، حکیمانہ طرزِ بیان، اور تفکر پرست دل و دماغ کے خصوصیات قطعی طور پر نہ پائے جائیں۔

ایسی شاعری کے واسطے یہ امر ناگزیر ہے کہ اثنائے بیان میں وہ عظیم تخیل کے چہروں پر اپنی ذاتی درخشاں فضاؤں سے ضیا پاشیاں کرے، اور محققانہ تخیل کے پیدا کردہ حقائق کے مشاہدے سے گریز کرتی ہوئی اشیائے عالم میں حکیمانہ امتیازات قایم کرنے کی جسارت سے باز رہے۔

قدیم زمانے میں یہ فلسفیانہ اور شاعرانہ امتیازات صاف طور سے قطعی نہیں سمجھے جاتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر بڑی طاقت رکھنے والے شعراء تک موسیقی میں ایک فلسفیانہ نظام قایم رکھنے کی سعی کیا کرتے تھے۔ اور یہیں تک نہیں بلکہ فلسفیانہ مضامین سے بھی خشک تر ایک رُوکھے پھیکے نثر نما طرزِ بیان پر پل پڑا کرتے تھے۔

ہیسیوڈ (Hesiod) اور ورجل (Virgil) نے تو یہاں تک ستم ڈھایا کہ کاشتکاری پر ایک منظوم کتابچہ ہی لکھ مارا۔

روم کے (وہ روم جو نقصِ ادراک و فراست کے باعث، جمالی شعور میں ہمیشہ کسی قدر مفلس ہی رہا ہے) سب سے بڑے دو شاعر بھی اسی نامراد مغالطے کا شکار ہو کر ایسی نظیر قایم کرگئے ہیں کہ آئندہ نسلیں سبق لیں۔ اور عبرت حاصل کریں۔

لکریشس (Lucretius) کا کلام صرف تاریخ کے اوراق میں اب تک زندہ ہے، اور اُس شاہانہ ترتیبی کس بَل کے باوجود جو اُس کی پشت پناہی کر رہا ہے، وہ کب کا فنا ہوچکا ہوتا۔ اگر بعض شاندار خالص شاعرانہ وسیع خوبیاں اُسے سہارا دئے ہوئے نہ ہوتیں۔

ورجل کی جارجکس (Georgics) محض اپنے فصیح قطعوں مناظرِ قدرت کی تصویروں، اور الفاظ و محاکات کی خوبیوں کی بدولت اب تک معدوم نہیں ہوئی ہے۔ ہرچند اُس کا تخلیقی مسالا بالکل بے روح ہے۔ مگر اعلیٰ نشست الفاظ کی ناخدائی کی بدولت اب بھی وہ وقت کے دھارے پر بہتی ہوئی ہم تک پہنچ رہی ہے۔

ہندوستان اور صرف ہندوستان نے اس فلسفیانہ قسم کی سعی کو کامیابی کے ساتھ حقیقی شاعری کے سانچے میں ڈھالنے کا ایک یا دو مرتبہ بندوبست کیا تھا۔

گیتا، اُپنشد اور اسی قسم کی بعض دیگر مختلف کتابیں اس نمونے پر تصنیف کی گئی تھیں۔

لیکن ان میں اور دیگر ممالک کی مماثل کوششوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

گیتا کی شاعرانہ کامیابی کا راز تھا اُس کا زندگی کی ایک عظیم اور خطرناک صورتِ حال سے شروع ہونا۔ اپنے نقطۂ آغاز کو پیشِ نظر رکھنا اور ہمیشہ اُس کی طرف بار بار مراجعت کرنا ——— نیز ایسی شائستہ روش کا اختیار کرنا جس کا کام تھا روحانی تجربوں، واردات، اور اندرونی زندگی کے مرحلوں کو گرفت میں لینا، اور پھر اُنھیں تخیل کی صورت میں بدل دینا۔

ہر چند یہ اجرائے کار کی ایک نہایت نازک اور دشوار صورت تھی۔ پھر بھی اس میں اس قدر ضرور صلاحیت تھی کہ یہ شاعرانہ آداب کلام کے حدود کے اندر بہ احسن الوجوہ رہ سکے۔

البتہ صرف اُن مواقع پر جب گیتا مابعد الطبیعاتی مسائل سے اپنے کو بہ غایت بوجھل بنا لیتی ہے، اور خالص فلسفیانہ تعریفات و امتیازات کے خارزار میں الجھ جاتی ہے۔ جیسا کہ خاص طور سے دو تین آخری ابواب سے ظاہر ہے تو اُس وقت اُس کی شاعرانہ آواز مسائل کے بوجھ سے دب جاتی ہے۔ اور بعض اوقات تو ایک نہایت ہی بھدی نثر منظوم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

اب رہے اُپنشد سو وہ گیتا کے مقابلے میں فلسفیانہ افکار سے قطعی معرا اور روحانی مشاہدات سے زیادہ بہرہ ور ہیں۔

ان کے اندر القاء و الہام کی ایک لگاتار اور بیباکانہ دوڑ پائی جاتی ہے جو آگ اور بجلی کی بنی ہوئی شاعرانہ زبان سے ہم آغوش نظر آتی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ شاعرانہ زبان ہی ان الہامات کی فطری زبان ہو سکتی ہے۔

اگر اس کے برعکس ان کے طرزِ بیان میں ادراک و تعقل کا آوازہ زیادہ بلند کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ اُپنشد کی شاعرانہ بصیرت اور وجدانی طاقت کی تکذیب ہو کر رہ جاتی۔

اب ہمارا ذوقِ جمال اس قدر کافی حد تک صاف و درخشاں ہو چکا ہے کہ روحِ شعراء کی غلطیوں سے بہ آسانی بچا سکتا ہے۔ پھر بھی یہ ایک بڑی خطرے کی علامت ہے کہ وہی روحِ شعراء کے شعریت سوز فلسفیانہ میلانات حقیقی شاعری کی حریمِ ناز میں، ہر چند پہلے کی طرح دلیرانہ نہ سہی، پھر بھی کسی نہ کسی طرح دبے پاؤں داخل ہو جانے کے خطرناک جذبات کا آج بھی مظاہرہ کر رہے ہیں۔

شاعری کے متعلق آرنلڈ (Arnold) کی اس تعریف سے زیادہ کہ "شاعری انتقادِ حیات کا نام ہے" اور کوئی شے خطرناک نہیں ہو سکتی۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ شاعری کی حقیقی زمزمہ سنجیوں سے رُوگردانی کر کے حیات کے متعلق ناقدانہ اور فلسفیانہ خیالات کو موزونیتِ محض کا لباس پہنا کر ہماری تخیل و بصیرت کو مجروح کر دیا جائے۔

اسی کے ساتھ تمثیل و تشبیہ کی دیوی، اپنی ذہنی استعداد کے لشکروں اور مجرّد خیالات اور منجمد اشکال کو مخلوط کر دینے کے سہل فن کی فوجوں کو لئے ہوئے فلسفۂ شاعری پر پھر حملہ کر دینے کا رجحان ظاہر کر رہی ہے۔

اس کے علاوہ بعض اور بھی ذہنی امراض ہیں جن میں تقریباً ہم سب مبتلا ہیں اور جن سے گریز کرنا ہمارا فرض ہے۔

اس لئے اس بات پر زور دینا چاہئے کہ شاعری کی خلقی قوت، وجدان و بصیرت ہے۔ نہ کہ ذہنی مادۂ افکار، اور اس اصول وجدان و بصیرت سے وابستہ رہنے ہی میں شاعری کی سلامتی کا راز مضمر ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ شعراء کا یہ بھی فرض ہے کہ شاعرانہ تخیل، فکر، احساسات طرزِ بیان اور شاعرانہ ہیولوں کو ہدایت و بصیرت ہی سے پیدا ہونے کا موقع دیں۔ یا قبل اس کے کہ شعر مکمل صورت اختیار کرے۔ اس کے واسطے یہ امر ناگزیر بنا لیں کہ وہ ہدایت و بصیرت ہی کے رنگ میں ڈوب کر منظرِ عام پر آئے۔

حیات کا شاعرانہ تصور، حیات کے نقادانہ، عالمانہ یا حکیمانہ نقطۂ نگاہ سے وابستہ نہیں ہوتا۔ وہ تو روح کی نظر اور حواسِ باطنی کی گیرائی پر مبنی ہوتا ہے۔ شاعری کا سحرِ حلال یا منترِ معنوی یا صوری، کسی حیثیت سے بھی حکیمانہ حقائق کا شاعرانہ اظہار نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ تو اُس روحانی نظر کا جو خدا، فطرت، دنیا، اور پوشیدہ حقائق کا مشاہدہ کرتی ہے، محض ایک ترنم انگیز انکشاف یا زمزمہ آمیز اظہار ہوا کرتا ہے۔ جسے عام نگاہیں دیکھ ہی نہیں سکتیں۔

اس باب میں کہ صناع (آرٹسٹ) کو زندگی کے کس پہلو پر نگاہ ڈالنا چاہئے

بڑی بڑی چہ میگوئیاں ہوتی ہیں۔ کوئی عقلی نقطۂ نگاہ پر زور دیتا ہے کوئی انفعالی زاویۂ نظر پر۔ کسی کا خیال ہے کہ صناع کو حقیقت نگر ہونا چاہیئے تو کوئی وجدان کی طرف دعوت دیتا ہے۔ کوئی خارجی اشیاء کو موضوع قرار دینا پسند کرتا ہے، اور کوئی داخلی کو۔ لیکن یہ تمام بحثیں، اُس قدر رہنمائی نہیں کرتیں جس قدر کہ گمراہ کرتی ہیں۔

یہ قطعی ممکن ہے کہ ایک شاعر، خارجی اشیاء کے اظہار میں زیادہ کامیاب رہتا ہو، اور داخلی اُمور کے جادۂ بیان پر اُس کے قدم ڈگمگا جاتے ہوں، اور اس کے برعکس دوسرا شاعر، داخلی شاعری میں زیادہ کامراں رہتا ہو اور خارجی شاعری میں اس کا رخش فکر ٹھوکریں لینے لگتا ہو۔ مگر اس تضاد کے باوصف دونوں شاعر مساوی طور سے اعلیٰ درجے کے شاعروں میں شمار کئے جاسکتے ہیں، کیونکہ جب قریب سے مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ بات صاف نظر آنے لگتی ہے کہ ہر خارجی شاعری میں، داخلی شاعری کے اور ہر داخلی شاعری میں خارجی شاعری کے عناصر ضرور پائے جاتے ہیں اور دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی شاعری ان چیزوں سے خالی ہے تو وہ محض الفاظ کا ایک انبار ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اُسے زندہ یا حقیقی شاعری کا خطاب نہیں دیا جاسکتا۔

قطعی اور خالص خارجی یا بیانی شاعری، انسان کو آرٹ کے مرتبۂ بلند سے گرا کر مصوری کی سطح پر لے آتی ہے۔ کسی شے کو بصیرت و وجدان سے قطعی معرّا کرکے محض اُس کی ظاہری صورت میں پیش کر دینا سائنس کے لئے تو موزوں ہوسکتا ہے، مگر شاعری کے واسطے نازیبا بلکہ مہلک ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اس طرزِ عمل سے ہم کسی عظیم راستی یا اہم حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے، بلکہ اس کے برعکس ناراستی و باطل سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

اشیاء کا عالمانہ اظہار و انکشاف، خواہ وہ حواسِ ظاہری اور دلائل مشاہدہ کی رُو سے اپنے دائرے میں کتنا ہی استوار و محکم کیوں نہ ہو، رُوح سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتا۔ نہ اُسے کامل حق و راستی، اور اشیاء کے تمامی تصورات ہی سے وابستہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خالص عالمانہ اظہار و انکشاف اشیاء کی ترکیب عمل، مشینری، اور اُن کا میکانی قانون تو پیش کرسکتا ہے لیکن اشیاء کی اندرونی زندگی، اور اُن کی رُوح کے اظہار میں ہمیشہ قاصر رہتا ہے، اور دراصل نظریۂ حقیقت نگاری کی یہی سب سے بڑی کمی اور غلطی ہے۔

حقیقت یا واقعہ نگاری کا فن، سائنٹیفک تحقیق کے ساتھ زندگی کا مرقع نہ تو پیش کرتا ہے نہ پیش کرسکتا ہے، کیونکہ فن، بہرحال فن ہے، وہ نہ تو سائنس ہوتا ہے اور نہ سائنس بن سکتا ہے۔

واقعہ نگار صرف اس قدر کرسکتا ہے کہ انتہائی بازیگری کے ساتھ شعرو محرکات، اشکال اور الوان کو زبردستی چُن لے، اور کبھی تو اُن پر ہلکا سیاہ، بادامی، نیلا، ہلکا سفید، یا بے روح زرد رنگ چڑھادے اور کبھی اُن پر شدید سیاہی یا سُرخی کی پالش کردے، اور نتیجہ یہ نکلے کہ کبھی تو اُس کی شاعرانہ پندار کسی حد تک دل آویز برآمد ہو اور کبھی ایک ڈراؤنا خواب بن کر رہ جائے۔

تخیُل نگاری کا فن، واقعہ نگاری کے فن کے مقابلے میں ایک مختلف اور جداگانہ راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ یا تو ایک محکم و خوبصورت شے پیدا کرتا ہے یا محض ایک جھوٹا بیداری کا خواب، وجود میں لاتا ہے۔

اس لئے واقعہ نگاری یا تخیل نگاری کے یہ تمام امتیازات خطروں سے خالی نہیں ہیں۔

اگر شاعر اپنے اندرونی جیتے جاگتے شاعرانہ مرکزی نقطے کے دائرے میں حرکت کرے گا اور مصنوعی نقطۂ فکر کی جانب بھٹک کر چلے جانے سے محترز رہے گا تو وہ اس پر مجبور ہوگا کہ اُسی راستے پر گامزن رہے جو اُس کا حقیقی اور فطری راستہ ہے، اور جس کی جانب اُس کی مشاہدہ کرنے والی بصیرت رہنمائی کرتی رہتی ہے اس لئے شاعر کے واسطے کوئی ضابطہ یا قانون بنانا محض ایک فعلِ عبث ہے، اور کچھ نہیں۔

چنانچہ متذکرۂ بالا نقطۂ نگاہ کی رُو سے شاعر آزاد ہے کہ اپنے جوہرِ اصلی کو صدمہ پہنچائے بغیر جو راستہ چاہے اختیار کرلے۔

وہ چاہے تو اپنے کلام میں مادۂ تفکر کو زیادہ اُبھارے یا جوہرِ حیات کو نمایاں جگہ دے۔ اُسے اجازت ہے کہ وہ خالص بیانیہ قوتوں سے کام لے یا براہِ راست اپنے ترجمانی قوار کو حرکت دے۔ وہ اس دنیا کو اپنا موضوعِ سخن قرار دے۔ یا اُس کے ماورا چلا جائے ــــــ یا براہِ راست لامحدود فضاؤں اور عرشِ بریں کی سمت پرواز کر جائے۔

اُسے رخصت حاصل ہے کہ اپنے کلام میں سحرِ حلال یا منتر پیدا کرنے کی خاطر وہ برگِ گل کے رنگ و بُو سے اپنے سخن کا آغاز کرے۔ یا کسی سیرت کی دل آویزی و

قوت سے متاثر ہوکر اُسے موضوعِ سخن قرار دے۔ یا کسی کردار کے فلسفے پر اپنے کلام کی بُنیاد رکھے۔ یا پھر اِن سب سے مُنہ موڑ کر اپنی محض رُوح اور اپنے پنہاں ترین احساسات و محرکات کے حلقۂ اسرار میں داخل ہو جائے۔

لیکن ہر حالت میں یہ ایک نہایت ضروری بات ہے کہ شاعر اُن تمام الفاظ اور نقوش سے بالا ہو جائے۔ جو اُس نے استعمال کئے۔ یا بنائے ہیں۔ اور اُن تمام اشکال سے بے تعلق ہو جائے جو اُس نے مشاہدہ کئے ہیں۔ اور اُس نُور میں گم ہو جائے جس کا اظہار و انکشاف وہ الفاظ کے ذریعے سے کرتا ہے۔ اور ایک ایسے دریائے معانی میں ڈوب جائے۔ جس میں الفاظ کے سفینے غرق ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا غوطہ اس قدر مکمل ہو کہ وہ قطعی طور پر نگاہوں سے اُوجھل ہو جائے۔ یعنی نظارگی کی شخصیت، نظارے کی ابدیت میں اپنے کو فنا کر دے اور رُوحِ کُل شاہانہ افتخار کے ساتھ خود سرگرم افشائے راز نظر آنے لگے۔

لیکن، دوسری تمام چیزوں کی طرح شاعرانہ بصیرت بھی انسانی دماغ کے سلسلۂ ارتقا کی پابند ہوتی، اور عہد و ماحول کی مطابقت میں اپنی سطح، اپنے صعُود و نزول، اور اپنی بازگشت کو مرتب کرتی ہے۔

ابتدائی دَور کے انسان کی نظر، اسی طبعیٔ و مادی دنیا اور اس دنیا کے افسانہائے حیات کی دلچسپیوں اور بدوی تصوّرات و احساسات تک محدود تھی۔

وہ صرف انسانوں، اور انسانوں کے گرد و پیش کی دنیا ہی کا مشاہدہ کرتا تھا، اور اگر ماورائے عالم کے دیوتاؤں اور باشندوں کو دیکھتا بھی تھا تو مبالغہ آمیز انسانی صورتوں اور گرما گرم اوہام کی شکل میں۔

اس لئے ابتدائی دَور کا انسان، شاعر سے شاعری کا اس قدر مطالبہ نہیں کرتا تھا جس قدر اس امر کا کہ وہ ان تمام دیوتاؤں اور باشندگانِ عالمِ غیب کے حالات اِس قوت کے ساتھ بیان کرے کہ وہ انھیں بالکل قریب سے دیکھنے لگے۔ اور اُن کے وجود کو بہ شدّت تمام محسوس کرنے لگے۔ نیز وہ چاہتا تھا کہ شاعر اُس کے قلب میں ایک ایسی الہامی قوت بھر دے کہ وہ اِن دیوتاؤں کے نقوش کو اور زیادہ استواری کے ساتھ اپنے قلب میں قائم رکھ سکے۔

اس کے بعد جب انسان میں تھوڑی بہت عقل آنے لگی تو وہ کسی حد تک وسعت کے ساتھ دُنیا کو دیکھنے لگا۔ لیکن پھر بھی اُس کا موضوعِ فکر وہی رہا جو پہلے تھا اور اب وہ شاعروں سے یہ مطالبہ کرنے لگا کہ وہ دیوتاؤں اور دینی ہستیوں کے نظریات کو الہامی منطق سے منوّر و تاباں بنا دے۔ اور اپنے فوزائیدہ و ترقی پذیر احساس جمالیات کی محکم و بے داغ مسرتوں کے ذریعے سے اِن نظریات کو بہ تمام حسن و خوبی متشکل کر دے۔

یہی وہ دَور ہوتا ہے جب کہ ایک ایسی تندرست قسم کی شاعری پیدا ہوتی ہے جو حسیاتی ذہنیت (Sense Mind) اور احساسات کے ذریعے سے تخیل کو مطمئن کرتی اور حیات کی ترجمانی کرکے ادراک کو مسرور بناتی ہے اور یہ موخر الذکر ترجمانی شاعری، ایک نہایت بالیاقت ذہنیت اور وسیع تر تجربۂ حیات کے ساتھ بار بار مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے۔

کوئی شک نہیں کہ اس متذکرۂ بالا بُنیاد پر شاعری سے بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں، لیکن چونکہ یہ کوچہ خارجی شاعری کا کوچہ ہے۔ اس لئے اس موقع پر عمیق تصورات میں غوطہ لگانے میں شاعر کو ایک نوع کی زحمت ضرور پیش آئے گی۔ اور چونکہ اُس کا تمامتر انحصار خارجی اشیاء پر ہوگا، اور خارجی اشکال و خیالات ہی کا اُسے اتباع کرنا پڑے گا۔ اس لئے شاعر کو اُس تجلی کے مشاہدے میں بڑی دشواری پیش آئے گی۔ جو خارجی اشیاء کے دبیز حجابات میں پوشیدہ رہتی ہے۔

لیکن بلند سطح کی شاعری اُس وقت معرضِ وجود میں آتی ہے، جب انسانی دماغ، زندگی کی اُن مستور طاقتوں کا قریب سے مشاہدہ شروع کر دیتا ہے جو ہمارے طبعی وجود کے پسِ پشت مخفی رہتی ہیں۔ اور اُن قوائے مخفی کے براہِ راست انکشاف کی سعی میں مصروف ہو جاتا ہے یا کم سے کم طبعیٔ، حیاتی اور تخیلی چیزوں کی خارجی علامتوں کو عظیم و اہم اشیاء کی وساطت سے استعمال کرنے لگتا ہے۔

لیکن شاعری کا اس سے بلند تر ایک مقام اور بھی ہے، اور وہ مقام اُس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ انسانی نگاہ بہ شدت تمام عمیق ہو جائے اور اشیائے عالم کی روح بالکل قریب آکر جلوہ گری کرنے لگے اور اس طبعیٔ دنیا کے علاوہ دوسرے عالم بھی انسانی بصیرت پر منکشف ہونے لگیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ شاعرانہ بصیرت مکمل آزادی کے ساتھ مشاہدہ کرتی اور شاعرانہ قوت سب سے زیادہ عمل پیرا ہونے پر مچلی نظر آتی ہے اور عظیم ترین قلب، کائنات کی روح کو کامل

لو سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اور زمانہ اپنے اسرار کے بیان کر دینے پر تُلا ہوا نظر آتا ہے۔

اس لئے یہ کافی نہیں ہے کہ شاعری میں الفاظ و اوزان کی شدت فراوانی کے ساتھ پائی جائے۔ گو یہ چیزیں شاعری کے اجزائے لاینفک میں سے ہیں۔ پھر بھی شاعری کی بنیاد محض وجدان و بصیرت کی وسعت اور شدت ہی پر ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہ وجدان و بصیرت کی شدت، شاعر کی انفرادی قوت پر مبنی نہیں ہوتی اس کا انحصار در اصل شاعر کے عہد اور اس کے ملک کی دماغی نشو و نما۔ اس کے زمانے کی سطح افکار و تجربہ، اس کے عہد کے عمومی علامات کے مقتضیات اور اس کے دور کے روحانی اکتسابات کے عمق پر ہوا کرتا ہے۔

عظیم عہد کا ایک صغیر شاعر، محض اپنے زمانے کے برکات سے بہرہ مند ہونے کے باعث، بعض اوقات ایک ایسی نظم پیش کر سکتا ہے، جو اگر بڑے ہیں، تو عہد پیشیں کے چھوٹے لافانی شعراء کے کلام پر تو ضرور سبقت لے جا سکتی ہے۔

ہندوستان کی موخر زبانوں (برج بھاشا وغیرہ) میں مذہبی شاعری کے ایسے کارنامے پائے جاتے ہیں جن کی سی کاشفانہ گرمجوشی، شعر و سخن کے عظیم و مستند دفاتر میں نہیں مل سکتی۔ پھر بھی اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ والمیک اور کالیداس کے سے متقدمین کی کبریائی اور قدرت کے آگے قرون متوسط کا کوئی شاعر ٹھہر نہیں سکتا۔

یورپ کا جدید ادب ہر چند یونانی ادب کی ہم آہنگی، لطافت اور تکمیل کے سامنے ناقص معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی اس میں وہ جوہر موجود ہے جسے یونان کے عظیم ترین شعراء تک پیش نہیں کر سکتے۔

اور خود ہمارے عہد میں ایک ثانوی درجے کا شاعر اپنے الہامی لمحوں میں ایک ایسی بصیرت کا انکشاف کر کے ہمیں مطمئن و مسرور کر سکتا ہے جو شکسپیر یا ڈانٹے سے کہیں وسیع تر ہو سکتی ہے۔

اور آخر میں جو سب سے بڑی بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ آنے والے زمانے کے امید افزا علامات اور فاتحانہ قرائن کے متعلق ہے۔ یعنی اگر مستقبل نے جیسی کہ امید کی جا رہی ہے، اپنے امکانات کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا اور قدرت نے اس کی راہ میں روڑے نہ اٹکائے تو شاعری وہاں جانے والی ہے جس کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ جس دور سے ہم سب گزر رہے ہیں، یہ ایک ایسا عظیم دور ہے جس میں تمام کرّے انسانی نظر کے سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ اور اُسے تجربہ و تحقیقات کی دعوت دے رہے ہیں اور انسانیت اُس روحِ اعظم کے انکشاف کے قریب آ چکی ہے۔ یہ تمام کرّے جس روح کے معنی خیز آیات و اشکال یا محض ایک ایسے باریک ملبوسات ہیں جن کے آر پار نظر آ جا سکتی ہے۔



مفلس ہوں، مگر وارثِ فطرت ہوں میں
سرمایۂ پیمبری کی دولت ہوں میں
اے لمحۂ موجود ادب سے پیش آ
آئندہ زمانے کی امانت ہوں میں

(جوش ملیح آبادی)

تمدّن اور مذہب

سید انور علی - فرید آبادی
(بی اے)

تمدّن کے معنی کسی انسانی جماعت کی وہ حالت ہے جس میں سب افراد مل کر مشترکہ مقاصد کی پیروی میں مصروف کار ہوں۔ کمزور کے حقوق طاقتور کے مقابلے میں یکساں طور پر محفوظ ہوں۔ اور سب لوگ مستقل مسکنوں میں بود و باش رکھتے ہوں اس حالت پر پہنچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سوسائٹی میں ایک حد تک دولت جمع ہو جائے جس کے بغیر متمدّنی زندگی کا آغاز نہیں ہو سکتا۔ دولت کی فراہمی کے لئے جغرافی اور طبعی حالات کی موافقت اور مساعدت ضروری ہے۔ یہ جغرافی اور طبعی حالات تمدّن کے تمام پہلوؤں سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہر قوم کا تمدّن تمام تر اس کے مرز بوم ہی کے اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمدن کا آغاز پہلے گرم ممالک میں ہوا۔ مثلاً ایشیائے کوچک مصر چین۔ ہندوستان وغیرہ اس کی وجہ ظاہر ہے زمین کا سرسبز و شاداب اور زرخیز ہونا۔ بہت تھوڑی محنت سے ضرورت سے زیادہ پیداوار کا بہم پہنچ جانا۔ انسانی ضرورتوں اور احتیاجوں کے پورا کرنے والے سامان کا کافی سے زیادہ اور بسہولت میسّر آجانا۔ فطرت کی فیاضی کے باعث ہر چیز کی فراوانی۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ گرم ممالک میں زیادہ قیمتی خوراک کی ضرورت نہیں۔ سبزی اور گھاس پات حرارت غریزی کو قایم رکھنے کے لئے کافی ہیں جو بہت افراط سے اور بآسانی میسّر آجاتی ہیں۔ لباس بھی زیادہ قیمتی درکار نہیں۔ سکونت کا سوال بھی بہت سادے اور معمولی مکانوں سے پورا ہو جاتا ہے۔ غرض گرم ممالک میں زندگی کی کشمکش ایسی نہیں ہوتی جو سرد ممالک میں دیکھی جاتی ہے۔ وہاں فطرت غیر معمولی طور پر بخیل واقع ہوتی ہے اس لئے آذوقہ کی بہم رسانی کا سوال وہاں بہت دشوار ہوتا ہے اور آدمی کو اس کے لئے بہت جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ پھر سردی میں حرارت غریزی کو مشتعل رکھنے کے لئے قیمتی غذا قیمتی لباس اور قیمتی مکانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تلاش معاش کے لئے غیر معمولی سرگردانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ غرض ایک طرف فطرت کا کنجوس ہونا اور دوسری طرف احتیاج کا شدید ہونا ان دوگونہ مصیبتوں سے سرد ممالک کے باشندوں کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے وہاں دولت کی فراہمی اس حد تک بہت دیر میں ہوتی ہے۔ جو تمدن کے آغاز کے لئے ضروری ہے اور جہاں پہنچ کر سوسائٹی کے افراد انفرادی ضرورتوں سے ایک حد تک بے نیاز ہو کر دوسرے مشاغل کی طرف متوجہ ہو سکیں اور علمی تفکّر اور تحقیق کی ابتدا ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ تمدّن کا دور دورہ سرد ممالک میں بہت دیر میں ہوا ہے۔ لیکن گرم ممالک فطرت کی فیاضی اور افراط کے باعث اور نیز احتیاج کے خفیف ہونے کے سبب سے اس درجہ پر بہت جلد پہنچ گئے ہیں۔ اور وہاں کا تمدّن تاریخ کے نہایت ابتدائی زمانے سے شروع ہو گیا ہے۔ دونوں طرح کے یہ طبعی اختلافات ان دونوں کے تمدن کے فرق کے بھی ذمہ دار ہیں۔ گرم ممالک کے تمدّن میں تن آسانی۔ عیش پرستی۔ نمود و نمائش۔ اسراف۔ شان و شوکت۔ تزک و احتشام نمایاں ہے اور سرد ممالک میں محنت۔ جد و جہد۔ استقلال۔ کفایت شعاری اور سادگی آشکار ہے۔

گرم ممالک میں قدرتی مناظر بہت عظیم اور ہولناک ہوتے ہیں۔ مثلاً بڑے بڑے دریا۔ پُرہیبت پہاڑ اور دہشتناک جنگل وغیرہ۔ اور چونکہ یہ چیزیں انسان کے قابو اور قدرت سے باہر ہوتی ہیں اور وہ اُن پر حاوی نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے آپ کو اُن کے مقابلے میں ہیچ اور عاجز پاتا ہے۔ اس لئے اُن کو زبردست اور مافوق العادت قوت اور ہستی کا تصرف گردانتا ہے وہ اُن سے مرعوب اور خائف ہوتا ہے اور اپنے عجز و انکسار اور اُن کی عظمت اور شوکت کا اظہار اس کی طرف سے پرستش کی صورت میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی پرستش کا جذبہ مذہب کی بنا ہوتا ہے۔ جو تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ مختلف المدارج طے کرتا رہتا ہے۔ یہ مذہبی عنصر تمدن کے تمام شعبوں میں جلوہ گر ہوتا ہے اور معاشرتی اصلاح میں مذہب ہی کے تحت ہوتی رہتی ہیں۔

سرد ممالک میں قدرتی مناظر اس قدر عظیم اور ہولناک نہیں ہوتے اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے وہاں فطرت کے بخل اور احتیاج کی شدت کے باعث انسان تلاشِ معاش کی سرگردانی اور جد و جہد میں دریا اور پہاڑ جنگل اور میدان سب چھان ڈالتا ہے۔ اس لئے وہ ان مناظر سے مرعوب اور خائف ہونے کے عوض اُن کو اپنی تحقیقات کا تختۂ مشق بنا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرد ممالک کے تمدن میں مذہبی عنصر بہت کم ہوتا ہے جس کو عام طور پر رُوحانیت کی کمی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تمدن میں مذہبی عنصر کی سُراغ رسانی جس طور سے اوپر کی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ مذہب گرم ممالک کے تمدن کا طغرائے امتیاز ہے۔ دونوں ملکی آب و ہوا جغرافی و طبعی حالات اور ماحول کا نتیجہ ہیں۔ دونوں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے بلکہ ایک دوسرے کے جزو لاینفک ہیں۔ حامیانِ مذہب کا یہ قول کہ مذہب قدرتی چیز ہے۔ اور انسانی فطرت کا تقاضہ ہے اس کی توجیہہ بھی یہی ہے جو بیان ہوئی۔ اس توجیہہ کے مطابق مذہب کی بنا یا ابتداء جذبۂ پرستش ہے جو قدرتی مناظر کی فوقیت اور انسانی عجز و انکسار کے احساس سے گرم ممالک کے انسان کی ابتدائی نسلوں میں برانگیختہ ہوا ہے۔ اس خیال کے مطابق مذہب۔ جہالت لاعلمی اور اوہام پرستی کا حامل ہے۔ چنانچہ تمدن کے ابتدائی زمانوں میں مذہب کا چرچا بہت تھا۔ اور اوہام پرستی عروج پر تھی۔ مذہب زندگی کے ہر پہلو پر تام و کمال چھایا ہوا تھا۔ پھر جُوں جُوں علم کی روشنی بڑھتی گئی اس میں کمی آتی گئی۔ اعلیٰ متمدن ملکوں میں مذہب برائے نام ہے۔ اجتماعی حیثیت سے مذہب وہاں دوسرے بلکہ تیسرے درجہ کی بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ ملکی اور اقتصادی تحریکوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مگر اُن ممالک میں جہاں اب بھی تاریکی اور جہالت زیادہ ہے اور روشنی کم پھیلی ہے اور مذہب کا زور و شور زیادہ ہے۔

چونکہ مذہبی معتقدات (جن کا تعلق مادی یا طبعی قوانین سے اس قدر نہیں ہے جتنا ایک فرضی روحانی عالم سے ہے) طبعی حقائق کی طرح ثبوت پذیر نہیں ہوسکتا اس لئے اُن میں تخیل اور تصور کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اور ایسی چیزیں جن کا تعلق تصورات سے ہے ، علم کی روشنی پھیلنے پر وہ تمام چیزیں اپنی خوبصورتی کشش اور دلچسپی قدرتاً کھو دیتی ہیں اور وہ گرویدگی اور فریفتگی اُن کے ساتھ نہیں رہتی جو قدیم ایام میں پائی جاتی تھی۔ جس قدر علمی دُنیا کے انکشافات ہر چیز کو آہستہ آہستہ عُریاں اور بے نقاب عیاں اور آشکار کرتے جاتے ہیں۔ تصورات کی گنجائش کم ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ شاعری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں اُس کی نشو و نما ترقی اور عروج کے لئے جس قدر موافق حالات تھے وہ جدید دَور تمدن مہیا نہیں کرتا۔ تصورات اور حقائق میں قدرتی اور ازلی دشمنی ہے۔ ایک چیز نقاب چاہتی ہے۔ دوسری عریانی۔ مذہب ایک غیبی چیز ہے۔ اور وہ مذہبی فلسفہ جس پر بعض مذاہب اس قدر نازاں ہیں محض قیاسات اور تصورات پر مبنی ہے۔ جو مذہب جتنا قدیم اور پُرانا ہے اُس میں اوہام پرستی کا عنصر اسی قدر زیادہ ہے۔ نیم وحشی قوموں کا مذہب اب بھی خالص اوہام پرستی ہے۔ نیم متمدن ممالک میں مذہب کی شد و مد اب بھی باقی ہے۔ عورتوں میں جو عموماً مردوں کی بہ نسبت زیادہ کم علم ہوتی ہیں مذہبی جذبہ یا لگاؤ زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہ تمام باتیں ایک ہی نتیجے کی طرف رہبری کرتی ہیں اور آفرینشِ مذہب کے مذکورہ نظریئے کی تصدیق کرتی ہیں۔ چنانچہ مذہب کی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ قدامت پرستی کا حامی ہے۔ مذہب میں ترمیم و تبدیلی کفر ہے۔ متقدمین یعنی ہمارے آباؤ اجداد اس کے نزدیک عقل کل تھے۔ اس کے نزدیک روایات کی پیروی کے بغیر انسان گمراہ ہو جاتا ہے۔ ذاتی اجتہاد۔ آزادی رائے اور علمی تحقیق جو مذہب کے خلاف ہو جرم ہے۔ مختصر یہ کہ مذہب اپنے عمومی خصائص کے لحاظ سے غلامانہ ذہنیت کا علمبردار اور تعصب اور تنگ نظری کا حامل ہے۔ اور جو قوم مذہبی الجھنوں میں گرفتار ہے وہ

شاہراہ ترقی پر سب سے پیچھے ہے۔

جو کچھ اُوپر لکھا گیا ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مذہب قطعی طور پر قابلِ مذمت ہے۔ مذہب نے دنیا میں جو کارہائے نمایاں کئے اُن کا اعتراف نہ کرنا یا اُن سے اغماض کرنا کمال تعصب اور بے انصافی ہے ؎

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو
نفیِ حکمت مکن از بہر دلِ عامے چند

اوسط درجے کے متمدن انسان میں مذہب، انفرادی طور پر تسکین قلب کا باعث ہوتا ہے۔ عسرت۔ تنگی۔ دکھ درد۔ مظلومیت۔ اور ہر قسم کی دنیاوی تکالیف اور مصائب میں ایک آئندہ زندگی کا خیال اور وہاں نعم البدل پانے کا اعتقاد یہاں کی کلفتوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اجتماعی طور پر مذہب نے تمدن کے متوسط دور میں معاشرت کو درست کرنے میں نمایاں حصّہ لیا ہے بلکہ اس دور کا تمدن تمام تر مذہب ہی کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ اور یہی نہیں کہ اس نے گناہ۔ بدی اور جرم کے انسداد میں کوشش کی۔ بلکہ سیاسی، ملکی اور اقتصادی پہلوؤں پر بھی بہت گہرا اثر ڈالا۔ مذہب محض پرستش تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اس نے سوسائٹی کے نظم و نسق اور عام فلاح و بہبود کے ترقی دینے میں بہت کام کیا۔ سچ پوچھو تو مذہب کا انسانی تمدن پر بڑا احسان ہے۔ جو کام تدریجی طور پر ارتقائی قوانین کے ماتحت صدیوں میں ہوتا، وہ مذہب نے بہت تھوڑے عرصے میں کر ڈالا۔ مصلحین کے گروہ نے اس مذہبی جذبے کی وساطت سے سوسائٹی میں انقلاب پیدا کر دئے۔ اور قوموں کو پستی کی تحت الثریٰ سے نکال کر آنِ واحد میں ترقی کی معراج پر پہنچا دیا جہاں پہنچنا معمولی اسباب کے ساتھ قرینِ قیاس نہ معلوم ہوتا تھا۔ غرض مذہبی عنصر نے تمدن کی ترقی میں بہت مدد کی۔ لیکن یہی تمدن پھر اُس کی تباہی کا بھی باعث ہوا۔ بقول شاعر ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

لوگوں کی مذہبیت جب شدید ہو کر جادۂ اعتدال سے متجاوز ہو جاتی ہے تو فساد اور بگاڑ پیدا ہو کر پستی اور نکبت کی صورتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ مذہبی ردوکد۔ اختلافِ رائے۔ فرقہ بندی۔ ناروا جوش۔ تعصب۔ خانہ جنگیاں اور قتل و خونریزی آہستہ آہستہ نمودار ہوتی ہے اور پھر رسوم پرستی۔ اوہام پرستی۔ باطل پرستی کے خس و خاشاک جن سے مصلحین مذہب کو پاک کرتے ہیں وہ پھر اس میں داخل ہونے لگتے ہیں اور اس طرح رجعت قہقری یا ترقی معکوس شروع ہو جاتی ہے۔

مشرقی تمدن میں تمام اصلاحی کام مذہبی رنگ میں کیا جاتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کی زندگی میں یہی پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اور وہ قبیح رسوم جن کی اصلاح کی جاتی ہے اسی کی بگڑی ہوئی صورت ہوتی ہیں۔ اس لئے اسی جذبے کی مدد سے اُن کو درست کیا جاتا ہے۔ لوگوں کے درجۂ تمدن کا لحاظ رکھنا اصلاحی امور میں ناگزیر ہے۔ تاریکی و جہالت کی حالت میں انسان کو سنوارنے کے لئے اگرچہ اس مذہبی جذبے سے بہت مدد ملتی ہے۔ مگر جب تمدنی ترقی ارتقائی منازل طے کر کے تعلیم و تہذیب۔ روشنی اور شائستگی کی اُس حد پر پہنچ جائے جہاں قبیح حرکات طبعًا اور فطرتًا ناگوار معلوم ہونے لگیں اور گناہ و جرم سے باز رکھنے کے لئے تعزیری قانون یا حیات بعد الممات کی سزا و جزا کی تہدید کی ضرورت نہ رہے۔ تو پھر مذہب کا وعظ زیادہ خوش آئند نہیں رہتا۔ اگرچہ عمدہ اخلاق اور پاکیزہ زندگی کی تعلیم کی ہر وقت ضرورت ہے۔ مذہب محض اخلاقیات کا نام نہیں ہے۔ بلکہ مخصوص طریقۂ پرستش یا عبادت۔ مخصوص اعتقادات اور مخصوص رسوم مذہب کی مرادف ہوتی ہیں اور اخلاقی پہلو اُن کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی مخصوص مذہبی شعائر ایک مذہب کو دوسرے میں تمیز کرتے ہیں اور اس لئے اختلافات اور تعصبات ناگزیر ہیں۔ اِن حالات میں تمام مذاہب کے متفق الاصول ہونے کی تلقین مناقشات کو رفع کرنے میں لوگوں کو اپیل نہیں کرتی۔ چنانچہ ہندوستان کے موجودہ حالات اس کی شاہد ہیں۔

ہندوستانی معاشرت میں اُن طبعی حالات کی وجہ سے جن کا شروع میں ذکر ہو چکا ہے مذہبی پہلو قدرتی طور پر بہت نمایاں ہے اور تمدن کا سب اہم جزو ہے۔ اس کے مقابلے میں ملکی۔ معاشرتی اور اقتصادی ضرورتیں اور مصلحتیں سب ہیچ ہیں۔ یہاں پولٹیکل آزادی۔ آبائی مذہب کے مقابلے میں کوئی کشش نہیں رکھتی اور جب مذہب ہماری زندگی پر اس طرح مسلط ہو اور پھر مذہب بھی ایک نہ ہو بلکہ مختلف ہوں اور اُن کے تصادم کے موقعے مذہبی وعظ

کہنے اور مذہبی تعلیم پر زور دینے سے اور دیگر ذرائع سے روز بروز بڑھتے جائیں اور مذہبی جذبات تیز سے تیز تر ہوتے جائیں تو ان حالات میں ملکی آزادی کا خواب دیکھنا کہاں تک درست ہے۔ جہاں مذہبی بھوت اس طرح سروں پر سوار ہو کہ قتل و خونریزی ایک عام بات ہو۔ جہاں مذہبی دیوانگی نے دماغ کو اچھے اثرات قبول کرنے کے ناقابل کر دیا ہو۔ غلامانہ ذہنیت مذہب کی بدولت اس قدر بڑھ گئی ہو کہ مذہب کی سلامتی اور حفاظت کا خیال یا اندیشہ قومی تحریکوں کو ہر وقت پاش پاش کرنے کے در پے رہتا ہو وہاں سمجھ لیجئے کہ قضا و قدر نے محکومیت کی دائمی مہر ثبت کر دی ہے۔ دائمی اس لئے کہ نہ مذہب چھوٹ سکے گا نہ باہمی باطنی منافرت قرار واقعی طور پر رفع ہو سکے گی۔ جہاں لوگ تہذیب سے دور بھاگتے ہوں۔ جہاں تعلیم کی روشنی میں آنکھیں بند کر لی جاتی ہوں۔ جہاں سب سے بڑا لیڈر اور پیشوا مذہب ہو جو نامعلوم زمانے سے عقبیٰ میں اُن کی نجات کا ضامن بنا ہوا ہو جہاں روایات نے آزادی کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ جہاں ایک مذہب دوسرے مذہب والوں کو اچھوت قرار دیتا ہو۔ جہاں مذہب کی قربان گاہ پر ملکی آزادی کو بھینٹ چڑھایا جاتا ہو۔ جہاں مذہب سے استغنا جرم ہو۔ وہاں اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ غلامی اُن کے واسطے ہمیشہ کے لئے مقدر ہو گئی ہے۔ اور آزادی کی امید کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ سچی بات گو کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ حقیقت واضح ہے کہ جب تک بڑھتے ہوئے مذہبی محسوسات کو تعلیم کے ذریعے سے کُند نہ کیا جائے گا خلاصی معلوم۔

اگرچہ مذہبی اثرات مدت سے ہماری رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہیں اور ہمارے تمدن کا جزو لاینفک ہیں۔ اور ہمارے ملک کی ہوا اس شعلے کو ہمیشہ مشتعل کرتی رہتی ہے اور اس لئے مذہب کا قلع قمع ہندوستان کی سی سر زمین میں ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ مگر تعلیمی نشر و اشاعت کے ذریعے سے یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے مذہبی جذبات و احساسات کو ایک حد تک کُند کر دیں اور اس کی طرف سے ایک قسم کا استغنا اور بے پروائی برتنے لگیں۔ حتیٰ کہ اُس کی پبلک حیثیت اور جوش و خروش زائل ہو کر محض خانگی حیثیت رہ جائے۔ بیرونی زندگی میں اس کا کوئی مظاہرہ نہ کیا جائے اور جس طرح ہم دوسری باتوں میں محض اختلافِ رائے کی بنا پر ہمیشہ لڑنے مرنے پر کمر بستہ نہیں ہوتے اسی طرح مذہب کے معاملے میں بھی طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ مگر یہ جب ہی ممکن ہے جبکہ تعلیم کے ذریعے سے اس نام نہاد مذہب کی اہمیت کو ہمارے ذہن سے بتدریج کم کر دیا جائے۔ اور مذہبی تحریکات کو فروغ دینے کے عوض اُن میں حصہ لینے سے اغماض کیا جائے اگرچہ یہ مشکل بات ہے مگر ناممکن نہیں۔ تہذیب اور شائستگی کا مقتضیٰ یہی ہے۔ کہ ہم معاشرتی طور پر ایسی حرکات اور اعمال کے ارتکاب سے اجتناب کریں جن میں ہمارے ابنائے جنس کے لئے نفرت اور حقارت کی جھلک پائی جائے یا جو اُن کی برہمی کا باعث ہوں اور اُن کے تعصب کو اُبھارنے میں مدد دیں۔ اگر یہ بات حاصل ہو جائے تو ہر قسم کا اتحاد ممکن اور آسان ہو جائے۔ اختلافِ مذہب نفاق کی جڑ ہے۔ مگر اس اختلاف کے انسداد کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال دیا جائے یا ہندوؤں کا قلع قمع کر دیا جائے۔ بلکہ ٹھیک علاج یہ ہے کہ خود مذہب ہی کو اُس حد تک معطل کر دیا جائے جس حد تک فساد کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ مذہب ہی اختلاف کا باعث ہے اور تمام رکاوٹوں کا ذمہ دار مذہب سے استغنا پیدا ہو جائے تو کامیابی کا راستہ بہت آسان ہو جائے۔ اس کا مطلب لوگ یہ نہ سمجھیں کہ دنیا کی خاطر اُن کو عاقبت سے محروم کیا جا رہا ہے اور خدا اور اس کے برگزیدہ پیغمبروں سے اُن کو منحرف کیا جا رہا ہے۔ نہیں۔ بلکہ اُن غلط اثرات کو دور کرنا مدنظر ہے جو مذہب کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ اس زمانے میں مذہب ایک ایسا خطرناک لفظ ہو گیا ہے کہ اُس کے نام سے کسی اصلاح کا ارادہ کرنا خالی از اندیشہ نہیں۔ جب تک حُسنِ اخلاق اور پاکیزہ اور بے لوث زندگی انسان میں موجود ہے وہ دنیا و دین دونوں میں فائز المرام ہے۔ اُس سے خدا بھی خوش اور بندے بھی۔ اور یہ بات عمدہ تعلیم سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہی مذہب کی غرض و غایت ہے۔ مذہب کے نام سے خدا اور اس کے پاک رسولوں کو بدنام کرنے والے دنیا میں بھی ذلیل ہیں اور عاقبت میں بھی رسوا ہوں گے۔

خالی پرستش بے معنی ہے اگر اس کا کوئی ماحصل نہیں۔ اور ماحصل یہی ہو سکتا ہے کہ پرستار کی زندگی پاک اور بے لوث ہو اور بندگانِ خدا کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آیا جائے۔ تاکہ دنیوی زندگی اُن کے لئے کٹھن نہ ہو جائے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہم نے ایامِ جہالت کی پرستش سے اب تک مذہب میں کوئی ترقی نہیں کی۔ مذہب زندگی کا دستور العمل ہے۔ ایسا دستور العمل جس کا مقصد حسنِ معاشرت ہو

جس میں دنیوی آلام کو رفع کرنے کی کوشش ہو۔ مثلاً مسلمانوں میں سود کا حرام ہونا اور زکوٰۃ کا فرض ہونا اخوت اور مساوات کی تعلیم پر زور دینا ان سب مذہبی امور کا مقصد یہ ہے کہ سوسائٹی میں دولت کی تقسیم کا ایسا انتہائی تفاوت نہ ہو سکے جس میں ایک شخص کے پاس دولت کے انبار ہوں۔ اور ایک شخص نان شبینہ کو محتاج ہو۔ سرمایہ دار اور مزدور دست وگریباں ہوں۔ ان مصائب میں مدد کرنا انسان کی اصلی نجات کا باعث ہے جنھوں نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ مگر ان مذہبی اوامر پر کوئی عمل نہیں کرتا ہاں نماز چاہے جتنی پڑھوالو۔ ایسی نماز جو حضورِ قلب۔ خلوص۔ ایثار۔ خوفِ خدا اور محبت خلقِ خدا سے بالکل عاری ہوتی ہے۔ اور نماز کے سلسلے میں بے شمار لڑائی جھگڑے حتیٰ کہ اپنے ابنائے جنس کی قتل و خونریزی بھی روا سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ عبادت اور پرستش کی تاکید اسی لئے تھی کہ اُن مذہبی احکام کی بجاآوری میں کوتاہی نہ ہونے پائے جو حسنِ معاشرت سے متعلق ہیں۔ اور آئندہ زندگی کی سزا اور جزا کی تہدید اسی لئے تھی کہ حکومت اور سیاست کے دباؤ کے بغیر انسان از خود خوف عقبیٰ کے خیال سے اُن پر عمل درآمد کرتا رہے اور خدا کی یاد سے بندگانِ خدا کی یاد تازہ ہو کر دل میں قایم رہے۔ مگر موجودہ زمانے کی مسخ شدہ مذہبی ذہنیت نے مذہب کی غرض و غائت اور اس کے محاسن پر پردہ ڈال دیا ہے اور اس کے معائب اور بدنما پہلوؤں کو نمایاں کر دیا ہے جس کی بیخ کنی میں حتی کوشش سے دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ تاکہ عوام میں مذہب کا مفہوم وسیع ہو جائے اور تعصب و تنگ نظری کی جگہ رواداری اور ہمدردی پیدا ہو سکے۔

اس تمام بحث کا لبِ لباب یہ ہے کہ مذہب کے دو پہلو ہیں، ایک وہ جس کا تعلق پرستش یا عبادات۔ اعتقادات اور رسوم سے ہے۔ اور دوسرا وہ جس کا تعلق اصلاح معاشرت اور عام تمدن سے ہے۔ اول الذکر انسان کی ابتدائی حالت سے شروع ہوا ہے اور ادنیٰ درجے میں اوہام پرستی۔ جہالت و تعصب سے وابستہ ہے اور جو کچھ مذہب کے خلاف اس کی قباحتوں اور خرابیوں کے ضمن میں لکھا گیا ہے وہ مذہب کے اسی پہلو سے متعلق ہے۔ دوسرا پہلو مذہب کی ضرورت اور مقصد کے مفہوم کی ترقی یافتہ صورت ہے اور بڑھے ہوئے تمدن سے تعلق رکھتا ہے اول الذکر پہلو پر زیادہ زور دینا اور اس کی شدومد مذہبی دیوانگی کا باعث ہوتی ہے اور ترقی معکوس کی رہنما۔ آخر الذکر پہلو پر زور دینا ہر قسم کی فلاح و بہبود اور ترقی کا موجب ہوتا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ اور اس لئے ضروری ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک جس حد تک توجہ کا مستحق ہے اس کا لحاظ رکھا جائے اور دونوں کے واجبی توازن کو قایم رکھنے کی کوشش ہو۔ اول الذکر پہلو کی زیادتی کے نقصانات اور خرابیاں تو ظاہر ہی ہیں، اور دوسرے پہلو پر حد سے زیادہ زور دینا الحاد۔ دہریت اور مادہ پرستی کی طرف لے جاتا ہے۔



فرقت کی یہ ہنگامہ طرازی کیسی؟
پیمانِ نیاز و ناز سازی کیسی؟
سجدہ میں ہے گردن پہ دو عالم کے حقوق
اللہ سے یہ شعبدہ بازی کیسی؟

(نجم آفندی اکبرآبادی)

کردار و گفتار

ل - احمد اکبر آبادی

ایک شام کو ممتاز جمالی مشہور فسانہ نگار اور مستند ادیب، متعدد مقبول کتابوں کا مصنف اور اس کا نوجوان دوست و معنوی شاگرد یوسف جاوید کشمیری دروازے کے ڈیویکو رسیٹوران میں برآمدے میں آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ یوسف کی درخشاں آنکھوں سے نکلنے والی شفاف نگاہیں اپنے استاد دوست کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ کیونکہ ابھی ابھی اس نے ایک نہایت اہم مبحث پر گفتگو شروع کی تھی ایک ایسا سنجیدہ موضوع جو اس کے خیال میں مقدس الہامات سے مملو تھا لیکن جمالی اس موضوع پر غیر متعلقانہ اور سرسری گفتگو کے سوا کسی گہری اور تفصیلی بحث کے لئے آمادہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس نے اپنی بے التفاتی کے سکت انداز سے اس کا اظہار بھی کر دیا بلکہ بہ تکرار موضوع کلام بدلنے کا ایما بھی کیا۔ مگر اس کا نوجوان دوست اس پر راضی نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ یوسف کی مردانگی بروئے کار آئی اور اس نے جمالی کے منشا کو نظر انداز کر کے اسے اس بحث سے ہٹنے نہ دیا۔

یوسف کو دردانہ حمید الزماں سے مخصوص محبت تھی یا وہ اسے مخصوص محبت یاد کرتا تھا۔ اس لئے اس کی خواہش و آرزو کا تقاضا یہی تھا کہ اس کے شیون الفت میں سے ایک ایک شان اور ایک ایک پہلو کا تذکرہ ہوتا رہے اور دیر تک ہوتا رہے۔ تاکہ وہ اس ذکر کی جاں نوازیوں سے عرصے تک شاد کام ہو سکے۔ وصل جاناں نہ سہی ذکر تو ہو، کی مطابقت میں وہ اس عزیز و محبوب ہستی کے متعلق ہر وہ بات کہنے اور سننے کے لئے بیتاب تھا جس کا اس کے ساتھ دور کا لگاؤ بھی ہو یا جو بالآخر اس سے متعلق کی جا سکے۔ اس لئے تہذیب و عوائد کے نازک اشاروں کو جو جمالی کی طرف سے پیش ہوئے تھے۔ یوسف نے نظر انداز کر دینا ہی مناسب سمجھا۔

یوسف جاوید کا ابھی ریعان شباب تھا اور اس کے بشرے کی نرمی اور خد و خال کی نزاکت اس کے شاعرانہ مزاج کی بھی دلیل ہو سکتی تھی۔ اس کی کشادہ اور کسی قدر ڈھلواں پیشانی اگر ذرا اور بلند ہوتی تو ایک متقدر بینک کا اکاؤنٹنٹ ہونے کے عوض وہ ایک مسلمہ شاعر ہوتا اور غیر فانی اشعار نظم کر رہا ہوتا۔ فطرت کی یہی غلط کاریاں، مقدر کی ایسی ہی کجرویاں تو ہیں جو ابتدائے آفرینش سے جوشیلے حزن والے انسانوں کی گالیوں کا جواز قایم کر دیتی ہیں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ سن لیجے۔ معلوم کہ مقدر پر تبرا کرنے کے مسلک کی بانی دراصل عورت تھی۔ اس غار مسکن خاتون نے پہلی بار جب چشمے کے آبی آئینے میں اپنے "جمالِ جہاں آرا" کا عکس دیکھا اور اسے معلوم ہوا کہ وہ ویسی نہیں جیسی کہ وہ اپنے تئیں سمجھتی تھی تو بحالتِ مایوسی فطرت کی اس ناشناس غلطی پر سخت برہم ہوئی تھی۔ یہ ہے وہ مذہب جس کے پیرو بعد میں مرد بھی ہونے لگے۔ اور اب ہر متنفس جب آئینہ دیکھتا ہے تو دل ہی دل میں یہ سنت ادا کر لیتا ہے۔ آپ تسلیم کریں گے کہ یہ اطلاع آپ کے لئے نئی اور آپ کے علم میں اضافہ کرنے والی ہے، نیز یہ کہ اہم بھی اسی قدر ہے، کیونکہ ابھی تک آپ کو خود اپنے مرشدِ طریقت کا علم نہ تھا!

غرض کہنا تو یہ تھا کہ حضرت جاوید غزل گوئی سے بھی دل بہلایا کرتے تھے۔ اور اپنے تئیں روحانی طور پر غالب کے تلامذہ میں شمار کرتے تھے۔ پھر آپ جانتے ہیں کہ لغات میں الفاظ کی کمی نہیں اور اضافت کے استعمال پر کوئی ٹیکس

بھی نہیں۔ چنانچہ ضروری نہیں کہ میں اُن کے کلام کے نمونے بھی پیش کروں۔ اگر آپ اندازہ وقیاس سے کام نہیں لے سکتے تو کوئی رسالہ اُٹھا لیجیے۔ حضرتِ جاوید کے کلام کا نمونہ نظر آجائے گا۔

جمالی اس وقت مجہولانہ طریق پر نیچے، سڑک پر گزرنے والوں کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ وہ دراز قد، زرد رو اور مرتاضانہ بشرے کا انسان تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی اور متشائم تھیں۔ اس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ اس کی باتوں میں ایک گونہ انانیت چھپی ہوتی تھی۔ اور اس کا اندازِ کلام تحکمانہ تھا۔ اس کے پرواز کی سوفسطائیت میں بجز فا ایک ڈورا شامل تھا۔ وہ اپنے نوعمر ساتھی کی طرف متوجہ ہوا۔ ہاتھ سے خالی گلاس میز پر رکھا اور سگریٹ کے دھوئیں کے غبار میں سے کہنے لگا۔

تو تمہاری نسبت ٹھہر گئی ہے۔!"

ہاں، علاً، یوسف نے جواب میں کہا۔ ہر چند میں نے ابھی رسمی انگشتری خریدی بھی نہیں ہے"

میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا عہدِ معاشقہ سراسر رومانی ہے۔ جمالی نے کہا۔

میرا تو ایمان ہے کہ ہماری محبت یکسر شعر ہے۔ یقین مانئے کہ دردانہ حُسن و خوش خوئی کا ایک معجزۂ مجسم ہے۔

کوئی وجہ نہیں کہ میں مبالغے کو بھی حقیقت نہ سمجھوں۔ معتقد مصنف نے طنزیہ تبسم کے ساتھ کہا۔

دہلی میں مجھے بڑی بڑی رانیوں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن ہنوز مجھے کسی ایسی مہارانی کو دیکھنا باقی ہے جو دردانہ کے پاؤں دھلا سکے۔

اوہ وہ! جمالی نے استعجاب کا اظہار کیا۔

باور کیجے کہ دردانہ بالکل مختلف لڑکی ہے ——— اب تک جتنی لڑکیاں میری نظر سے گزریں وہ ان سب سے یکسر مختلف ہے۔ یوسف اپنی خواب آلود نگاہوں سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا اور کہتا رہا: وہ اتنی ذہین ہے اور اس کی بیشمار ادائیں اس قدر دلکش ہیں کہ تمہارے بہترین افسانے کی ہیروئین ہو سکتی ہے؛

مجھے پورا یقین ہے! جمالی نے متفکرانہ انداز میں کہا، گویا وہ اس اشارے کے امکانات پر غور کر رہا تھا۔ شادی ——— ہوں ں ں! کم از کم تم ذکی الحس اور سریع الخیال آدمی کے لئے پُرخطر ضرور ہے۔

" اوہ وہ ماہر بھی بڑا خلاق ہے! یوسف نے کچھ بدمزہ ہوکر جواب دیا۔

" بہر گونہ میں فیصلہ کر چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ عام لوگوں کے مقابلے میں میرے جذبات زیادہ شدید ہیں۔ اور دردانہ میرے حسیات کی شدت کو قایم رکھنے کی اہل بھی ہے۔ دردانہ میں ہمدردی ہے۔ وہ فہمیدہ ہے اور بالذات سکون بخش ہے ——— !" یوسف عادتاً اپنے بیان میں لطف اور گرمی کی کمی کو اپنا جوش و ولولہ شامل کرکے پورا کیا کرتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں شرارت جھلکی اور اس نے جمالی سے سوال کیا۔

آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟

میں! شادی کرلوں؟

" کیوں نہیں! بہترین ادیب و مصنف گاہ بگاہ، اس کے مرتکب ہوئے ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ مس قمر زمانی کو پسند کرتے ہیں:"

"بیشک قمر ایک اچھی لڑکی ہے اور اس کا طبعی و ذہنی ارتقا بے مثال ہے"

نامور ادیب نے اس طرح بے تعلقی کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گویا قمر اس کی دنیا کی کوئی چیز نہ تھی۔

مگر کسی قدر بیباک! یوسف نے کہا، آپ اس سے کب کے ملے ہیں؟"

آخر مرتبہ وہ لاہور سے مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس کو بھی مدتیں ہوگئیں۔

عزیز یوسف میرے لئے شادی کا مسئلہ ورائے سوال ہے۔ میں شادی کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھتا۔ شادی کا خیال اور چاند تک پہنچنے کا خیال میرے نزدیک دونوں ایک سی باتیں ہیں۔

میں آپ کے فسانے پڑھکر کبھی کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا کہ اس باب میں آپ کا نظریہ کیا ہے۔ کہیں تو آپ اس آزادی کے طرفدار نظر آتے ہیں اور کہیں اس کے جانی دشمن۔

اصل بات یہ ہے کہ اس عہدِ ریاکاری میں کم از کم بعض موقعوں پر، ایک شخص اپنے عقائد پر پردہ ڈالنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ اتنا صحیح ہے کہ بعض مقامات پر میں ازدواج کو برداشت کرتا معلوم ہوتا ہوں۔ اس مسئلے کے مخالفین بقائے نسل کے سوال پر چپ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ دلیل حامیانِ ازدواج کی کمزور ترین دلیل ہے۔ البتہ جب خانگی زندگی کا الزامی جواب میرے سامنے پیش کیا جاتا

تو میں اس کی تردید کرنے کے عوض لاجواب ہو جانے کو ترجیح دیتا ہوں اور اس کی برکتوں کو بصورت تدبیر گوارا کر لیتا ہوں" جمالی نے ایک بے مثال شگفتگی کے ساتھ کہا۔ جس نے کسی حد تک اس کے بیان کی ناہمواری کو ہلکا کر دیا۔

لیکن تدبیر تو کھانا بھی ہے اور حد سے زیادہ مرغوب طبع تدبیر ہے۔

ہے، مگر اسی وقت تک جب تک تمہارا ہاضمہ صحیح ہو اور اشتہا بھی ہو۔

لیکن محبت کی اشتہا ——— اوہ! اس کو درست رکھنا ذرا دشوار کام ہے"

کچھ بھی دشوار نہیں؛ لوگ میری تدبیر پر عمل کیوں نہیں کرتے؛ میرے ہاضمے میں اگر کوئی خرابی نمودار ہوتی ہے تو نمک سلیمانی بہترین شے ثابت ہوتی ہے۔

یوسف نے شوخی کے انداز میں کہا

محبت کا نمک سلیمانی! یوسف تمہاری جودت و شوخی کفر و محبت کی حد تک جا پہنچتی ہے۔ جمالی نے ہنسکر کہا۔

"مگر ایمان محبت کے استحکام کے لئے یہ علاج ضروری ہے" نوجوان ساتھی نے کہا

"نمازوں میں خضوع اور دعاؤں میں تضرع ارتکاب کبائر کے بعد پیدا ہوتا ہے"۔

ادیب عز آسیدہ ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے معنوی شاگرد کو توصیفی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"یوسف تمہاری یہ کج بحثی ہے نہایت پرلطف! جمالی نے کہا اور جیب سے نوٹ بک نکالی": اجازت دیتے ہو میں اسے یادداشت میں لکھ لوں؟"

بڑی خوشی کے ساتھ!" نوجوان ساتھی نے کچھ کھسیانا ہو کر جواب دیا۔

واقعی ایک ذہانت آمیز کج بحثی ہے۔ جمالی نے لکھتے ہوئے مکرر کہا۔

جمالی! میں چاہتا ہوں کہ اپنے کسی افسانے میں آپ اپنے عقائد کی توضیح کر دیں کہ ازدواج کے متعلق آپ کے عقائد کیا ہیں؟

جمالی نے نوٹ بک جیب میں رکھ کر ادھر اُدھر نظر ڈالی۔

برسوں کی تکلیف دہ کوشش اور مشق کے بعد" جمالی نے کہنا شروع کیا میں اپنے دماغ کو سدھار سکا ہوں کہ وہ اشیاء و معاملات کو ان کی مکمل شکل و صورت میں دیکھ سکے۔ زندگی کو اس کی تمامی حالت میں دیکھ سکے؛ تم غور کرو گے تو نظر آ جائے گا کہ ایک ادنیٰ واقعہ بھی طویل سلسلۂ اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک اتفاقی فقرہ پوری زندگی کے فلسفے کا خلاصہ ہوتا ہے۔ اس میں اس ادنیٰ واقعے اور اتفاقی فقرے کو ان کی جگر گداز کلیت میں دیکھ سکتا ہوں۔ یعنی وہ طویل زمانہ۔ جس میں اس واقعے یا فلسفے کی تکمیل ہوئی اپنی مجموعی حیثیت میں مری نظر کے سامنے آ جاتا ہے۔ اور اپنی تمام ہا سامانیوں کے ساتھ۔

ازدواج اگرچہ حد سے زیادہ فرسودہ بحث ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جو غیر تربیت یافتہ ذہن و دماغ کے سامنے نہیں آتے۔ ہم دونوں جدید معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے میں تمثیل کے لئے اسی معاشرت کے نمونے سے بحث کروں گا۔ ورنہ ازدواج کے نتائج قدیم و جدید، دونوں معاشرتوں میں بالکل یکساں ہیں۔ گو اسباب کیسے ہی مختلف ہوں۔ مگر نتیجہ وہی ایک ہوتا ہے۔ چنانچہ جب میں ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کو باغ میں بیٹھے باہم دگر مستغرق دیکھتا ہوں جنہوں نے ماسوا کو بالکل بھلا دیا ہے، تو واقعات مابعد کا ایک سلسلہ میرے سامنے آ جاتا ہے۔ نسبت قرار پائی۔ نکاح ہوا۔ اور بالآخر اپنے تخیلات کو لئے ہوئے یہ دونوں ایک مختصر سے مکان میں سکونت پذیر ہو گئے۔ اب میں ان کو شاہراہ حیات پر غیر متزلزل عزم اور بے نہایت آرزوؤں کے ساتھ گامزن دیکھتا ہوں کہ گویا زندگی کی ساری رنگینی لذتیں حاصل کئے بغیر دم نہ لیں گے۔

یہ جوڑا ابھی یہ دیکھنے کے قابل نہیں اور نہ ان سے اس کی توقع کرنا چاہئے کہ محبت ایک علوی جذبہ ہے۔ جس میں نصف روحانیت اور ایک حصہ اور سب کچھ۔ مگر ادارۂ ازدواج اپنی روایات کہنہ کی آلائشوں کے باعث اس روحانیت کو بروئے کار نہیں آنے دیتا۔

پھر میں ان دونوں جوان ہستیوں کے ادعائے صاف باطنی و صاف گوئی سنتا ہوں۔ اُن کے پرجوش اعلان سنتا ہوں کہ اُن کی محبت کے سامنے کوئی محنت اور کوئی قربانی ناممکن العمل نہیں ہے۔ اور پھر میں ان اعلانات کی توثیق بوسوں سے ہوتی دیکھتا ہوں۔ اس کے بعد پہلی تکرار کی جھلک سایہ فگن نظر آتی ہے۔ روحانیت کے حجابی نقاب کا تانا بانا بکھر جانے کی پہلی علامت رونما ہوتی ہے ——— وہ روحانیت جس نے ابھی تک واقعیت پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ اور یہ دونوں اپنی حقیقی حیثیت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ اب ان کی رنگین

زندگی میں آہستہ آہستہ صدہا بے مزہ سوالات در انداز ہونا شروع ہوتے ہیں جن سے معاملہ کرنا ان کا فرضِ زندگی ہے اور پھر اس ہمہ گیر محبت کی تجلیاں ماند پڑنے لگتی ہیں۔ پہلا بچہ پیدا ہونے کے بعد اس لڑکی کی طویل بیماری بھی میرے سامنے آتی ہے۔

ایک بڑے دفتر کے دھندلے کمرے میں ایک بھدی میز کے سامنے وہ نوجوان غیر ادا شدہ بلوں کے خیال میں سامنے کے پلندوں کو بھلائے بیٹھا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بے چین رات گزارنے کے بعد وہ غریب کس طرح جھپٹا ہوا دفتر پہنچا ہے۔ اس کی آنکھوں میں مایوس نگاہیں قایم ہو کر رہ گئی ہیں اور اس کا چہرہ ستا گیا ہے۔ اب وہ جس دل سے دفتر کا کام انجام دیتا ہے وہ کسی معقول ترقی کی گنجائش کا امکان باقی نہیں رہنے دیتا۔ بالآخر اُس کے مزاج کی شگفتگی چڑچڑے پن سے بدل جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اب میں ہر روز کے جھگڑے دیکھتا ہوں۔ اور اُس صاف باطنی کا کوسوں پتہ نہیں ملتا۔ ایک دوسرے سے کچھ چھپائے رکھتا ہے۔ وہ لڑکی جب اپنی بات منوانا چاہتی ہے تو اسی نسوانی طریقِ کہنہ پر عمل کرتی ہے۔ یعنی آنسو بہانا۔ اور عورت کی یہ ادا مرد کو کبھی پسند نہیں آئی۔ ہر چند اُس نے ہمیشہ اس حربے کے سامنے سر خم کر دیا ہے۔

یہ باور کر لینا ایک معقول بات ہوگی کہ مجبور کر دینے والے حالات نے نوجوان کو جستجو پر مجبور کیا اور اسے اپنی حالت بہتر بنانے کا ایک موقع مل بھی گیا۔ چنانچہ اب وہ ایک بہتر مکان میں رہنے لگتے ہیں۔ خوشنما میز پر بلوں کی تعداد میں بہت کمی ہے اور اب وہ نسبتاً مسرور اور ایک نوع کی قناعت میں بسر کر رہے ہیں۔ لیکن در پردہ اور احساس کئے بغیر دونوں اپنی اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی تسکین میں ساعی ہیں۔ یوں سمجھو کہ وہ نوجوان اس کامیابی کے بعد کسی بہت بڑی تجویز کی تکمیل میں منہمک رہنے لگا ہے اور وہ لڑکی معاشری سربلندی کے خیال میں کسی زیادہ شاندار مکان وساماں، اپنے اور بچوں کے لئے بہتر ملبوس۔ نوکروں کی تعداد میں اضافہ، موٹر کار اور ان تمام اضافیات کی خواہشمند ہے جو خوشحالی اور مسرت کے اعلان و اشتہار ہو سکتے ہیں۔ اب وہ محبت کی لغویت۔ پرسرور معیت اور فوری تفہیم جن سے محبت کا تغذیہ ہوتا ہے ——"

بس بس رہنے دو۔ تمہاری مثال اکثریت کی مثال نہیں ہے،" یوسف نے قطع کلام کر کے کہا، تم مستثنیات کی مثال دے رہے ہو۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں ——"

عزیز یوسف، جمالی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ہماری گفتگو کا موضوع ازدواج میں محبت کا استقلال ہے۔ میں ایک اوسط نمونے سے بحث کر رہا ہوں۔ ہم دونوں ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جو سوسائٹی میں اپنی ازدواجی محبت کا ریاکارانہ اعلان کرتے رہتے ہیں اور جسے میں دودھ کی لسّی سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ لوگ جا و بیجا اپنی اہلیہ کے اقوال و افعال کا ذکر کر کے تفاخر کی شان دکھاتے ہیں۔ لیکن حقیقتِ حال کچھ اور ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ ہم دونوں ایسے لوگوں سے بھی واقف ہیں جن کو اس ادنیٰ درجے کی خود بینی کا بھی موقع میسر نہیں اور جن کا تباہ شدہ ازدواج ہر شخص کے سامنے ہے۔ میاں بیوی اور محبت! استغفر اللہ۔ انسان کو اگر کبھی یہ نعمت حاصل تھی تو اس عہد کو گزرے ہوئے بہت سی صدیاں گزر گئیں۔ تم اور میں اور ہر ذہین شخص جان سکتا ہے کہ عام طور سے جسے زن و شوہر کی محبت کہا جاتا ہے وہ باہم بسر کرنے سے ایک دوسرے کا عادی ہو جاتا ہے اور بس، یا کہو کہ وہ ایک دوسرے کے لئے ضروری ہو جاتے ہیں۔ سو یہ زن و شوہر پر ہی کیا منحصر ہے۔ نوکر اور دوست بھی ضروری ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہ بھی نہیں تو ایک معاشری فرض کی غلط تعبیر کر کے اُس کی بندشوں میں جکڑے ہوئے ایک ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن ان حالتوں کو محبت کے نام سے یاد کرنا عقل و ذہانت کی توہین ہے۔

مجھے تسلیم ہے کہ پروازِ خیال فطرتِ انسانی کا ایک جز ہے۔ لیکن یہ حقیقت کم لوگ جانتے ہیں کہ انسان کی یہی صفت اس کی حزنیۂ حیات کا موجب بھی ہو جاتی ہے۔ جو طبیعتیں اپنے اس جوہر کو مکروہات سے مغلوب نہیں ہونے دیتیں وہ وہ چند بیروانہ فطرتیں ہوتی ہیں، جو حاصلِ محبت یعنی قربِ مسلسل کے مطالبات پر غلبہ پا سکتی ہیں —— اور یہی ان کی حزنیہ ہے! ان چند فقید المثال طبیعتوں کے علاوہ وہ انسانی طبقہ بھی میری گفتگو سے خارج ہے۔ جن کے لئے نفس و ذہن کی ہر حالت ایک ہی مفہوم رکھتی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر جو قناعت یعنی چوپایوں کی زندگی گزارتا ہے۔ میرا مقصدِ کلام سوسائٹی کا صرف وہ گروہ ہے جس کی نبضیں جینے کے لئے قوی و سریع ہوتی ہیں —— جیسے تم ہو۔ میں ہوں، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے پاس روپیہ پیسہ ہو یا نہ ہو۔ ان کو کوئی معاشری مرتبہ حاصل ہو یا نہ ہو۔

وہ جدوجہدِ حیات کے لئے مجبور ہوں یا نہ ہوں۔ ایک دوسرے کے مزاج و مذاق میں اخلاقی خوبی و خرابی کے جراثیم کو دیکھ سکتے ہیں۔

اس لئے عزیز یوسف، میں کسی ایسی محبت و ہم نشین کا خواستگار نہیں جو خود میری خوبیوں کو فنا کر دے۔ میں اگر محبت کا قائل ہوں تو اس کی جوہری صورت کا ——— ایسی محبت جو انسان کو ولولہ ناک اور ارفع بنا دے! اور اگر ایسی محبت کوئی ناممکن الحصول شے ہے تو میں اپنے مرتاضانہ تخیل میں اس کے حسین تصور سے دل بہلا سکتا ہوں۔ جو اپنی دروغ بافیوں اور بہلاوے پھسلاوے سے مجھے ایسے اتحاد کے گڑھے میں نہ لے کر میں نسلِ حمقا کی افزائش کا آلۂ کار بن جاؤں!

جمالی نے دم لیا اور سڑک پر گزرنے والی "نسلِ حمقا" کو غور و فکر کے ساتھ دیکھنے لگا۔ یوسف سکوت کے عالم میں سوچتا رہا۔ اور جمالی مسئلہ ازدواج کے متعلق مزید افکار و خیالات سے مسلح ہو گیا۔ پھر اس نے اپنی ادیبانہ بلاغت و زور و بیان کے ساتھ وہ دقتیں اور پریشانیاں بیان کیں، جو اکثر و بیشتر پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً بچوں کی بیماریاں اور امکانی موت کا خطرہ، مالی مصیبتوں سے دوچار ہونا، اولاد کی طرف سے مایوسیاں، قرابت داروں کے چرچے اور فقرے اور سب سے بڑھ کر ساس کی دخل در معقولات وغیرہ۔ پھر اس نے نہایت صراحت کے ساتھ میاں بیوی کے درمیان اختلاف کی تدریجی وسعت اس حد تک بیان کی جبکہ آزردہ روح کو لئے ہوئے شوہر کسی "وحیدۂ عصر" عورت اور بیوی کسی "یگانہ" مرد[1] کی طرف متوجہ ہو جانے کے لئے طیار ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اُس نے نہایت قابلیت کے ساتھ اپنے ہم عصروں میں جمالی جس کا تنہا مالک تھا۔ بعد کی صورت واقعات کا خاکہ پیش کیا اور بالآخر معاشری فرضیے پر ختم کلام کیا جس کے بعد فرار یا طلاق کا درجہ آ جاتا ہے۔

بس رہنے دو اتم پھولوں کے عوض کانٹے پیش کر رہے ہو۔ یوسف نے گلاس ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

یہ واقعہ ہے کہ حقیقت و واقعیت کو پیش کرتے وقت جمالی ادیبوں کا ہلاکو تھا۔ جو نقشہ اُس نے اس وقت پیش کیا تھا وہ ہنوز آخری لمسوں کا محتاج تھا، اور اس کی تکمیل کرنے کے لئے پہلے تو اس نے ایک تازہ سگرٹ سلگایا اور پھر "نسلِ حمقا" پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور کہا:۔

"عزیز یوسف یاد رکھو اور ہمیشہ یاد رکھو کہ عورت کی طبیعت و مزاج کی تھاہ کسی نے نہیں پائی ہے ——— بلکہ میرا تو قول ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی طبیعت و مزاج کو کبھی نہیں سمجھ سکا ہے! میں بالیقین کہہ سکتا ہوں کہ تم بار وجود بیدار کا بڑا جز و اور لاکھوں مردوں کی طرح جو لاعلمی کی حالت میں اُس سرور آفریں حالتِ ازدواج میں داخل ہوتے ہیں۔ نتائج غور و فکر، اس کے ناقابلِ فہم ہونے اور اس کے عدمِ توازن کی نذر ہو جائے گا۔ میری رائے ہے کہ تاوقتیکہ تم میری طرح مرتاضانہ طریق پر بکثرت عورتوں کا مطالعہ نہ کر لوگے تم کبھی عورت کو اس حیرتناک تلوّن کا تصور کرنے کے قابل نہ ہو سکو گے جس سے اس کی فطرت کی ترتیب ہوئی ہے۔ عورت صاف و صریح استدلال کی قابلیت سے کتنی عاری ہے تم اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے! وہ کسی طفلانہ بات یا متخالف حال یا توہم پرستی کا جواز ثابت کرنے کے لئے کتنا غیر متعلق استدلال اور کس قدر کج بحثی کر سکتی ہے تم قیاس بھی نہیں کر سکتے۔

عورت دراصل جبلت اور ولولہ ان دو عناصر سے بنی ہے اور پہاڑی موسم کی طرح ناقابلِ اعتبار ہے۔ وہ کسی ادنیٰ ترین بات پر شدید غصہ کر سکتی اور تمہیں سم آلود الزاموں کے انبار میں دفن کر سکتی ہے۔ عزیز من۔ ان باتوں کا علم حاصل کرنا بڑا پیشہ ہے۔ میری جستجو و تحقیق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جمالی چپ ہوا۔ اور اپنی کرسی پر ٹیک لگا کر آرام کرنے لگا۔ وہ اس وقت خود ستائی کی حد تک اپنے آپ سے خوش معلوم ہو رہا تھا۔ کیونکہ بخیالِ خویش اس نے اپنے نوجوان دوست کی نظر میں ازدواج کے ادارے کی بنیادیں ہلا دی تھیں اور اس کا ذخیرۂ استدلال ہنوز پُر تھا۔ وہ ابھی اتنی ہی دیر تک ایسے ہی وزنی دلائل کے ساتھ مزید گفتگو کر سکتا تھا۔

یوسف اب بلاشک وہی یوسف نہ تھا جو آدھ گھنٹہ قبل تھا۔ اس کا ذہن مایوسی اور تذبذب کے سیاہ بادلوں میں ملفوف تھا۔ نوجوانی کی خندہ جبینی افسردہ تھی اور وہ ایک تصویرِ تشائم نظر آ رہا تھا۔ جمالی جانے کے لئے اٹھا اور رکنے لگا۔

"اس وقت مجھے ایک باب پورا کرنا ہے۔ مطبع والوں نے جان مصیبت میں ڈال رکھی ہے!"

آپ جا رہے ہیں؟

---

[1] اس لفظ کو میں اس کی اردو صورت میں اسی طرح لکھنا مناسب سمجھتا ہوں۔

"یوسف" جمالی نے لطف آمیز لہجے میں کہا "تم جانتے ہو کہ بحیثیت مصنف میرا مقدس فرض ہے کہ حقیقت و واقعیت کو جس صورت میں دیکھوں اسی طرح پیش بھی کروں۔"

"آپ کو جانا ہے تو جائیے" یوسف نے فوری غصّے میں مبتلا ہو کر کہا "آپ ایک بے اصولے انسان اور مسرّت کے ہلاکو ہیں اور بس!"

یوسف! جمالی نے گونہ مجروح حیرت کے ساتھ جواب میں کہا اور یوسف کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ادیب جلیل اپنے معنوی شاگرد کو ایک لمحہ تک آزردہ سکوت کی حالت میں دیکھا کیا۔ اور پھر اس کے بشرے پر رد اقیافہ حق پرستی کا اظہار نمودار ہو گیا۔ شاید اسے اپنی گفتگو پر افسوس تھا۔ مگر محض اس وجہ سے کہ اس سے یوسف کو ملال ہوا۔ نہ اس لئے کہ اس نے جو کچھ کہا صحیح نہ تھا۔ اس لحاظ سے اس کا ضمیر بالکل مطمئن تھا۔ غرض وہ رخصت ہو کر چلا گیا۔

اس کے بعد چند روز تک یوسف کا حال اس کا معمولی حال نہ تھا۔ وہ بدحال تھا۔ اشتہا خراب ہو گئی تھی اور اس کے والدین متفکر تھے۔ مگر وہ کسی طرح اپنی کیفیت بیان کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اسکو سخت کوشش کرنا ہی پڑی کہ گھر والے اس کے بستر پر پڑے رہنے اور ڈاکٹر کو بلانے کے لئے ضد نہ کریں۔

ایک ہفتہ گزر گیا اور وہ دردانہ سے نہ ملا۔ اور بالکل ممکن تھا کہ ایک ہفتہ اور گزر جاتا اگر خود دردانہ ٹیلیفون پر اسے عدم توجہی کا ملزم نہ بناتی۔ اُس نے کہا کہ فون پر تفصیلات بیان نہیں ہو سکتیں۔ وہ اس سے ملنے کے لئے اسی وقت آ رہا ہے۔ چنانچہ وہ دردانہ کے مکان پر پہنچا۔ لیکن بباطن سخت تذبذب میں مبتلا تھا۔

جب وہ گھر سے روانہ ہوا تو سوچتا جا رہا تھا کہ بالآخر وہ دردانہ ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں جانتے ہیں اور واقعات کی رفتار خود اُس نے تیز کر دی تھی۔ دردانہ جب کسی بات کو پسند نہیں کرتی تو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب نگاہ پیدا ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا مزاج مشتعل ہو جانے والا ہو۔

اور جب وہ اس کے مکان میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ تخیل صباحت ایک اسٹیچو کی طرح سامنے کھڑی ہے۔ وہ اس کی منتظر تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی تھی جو عارضِ صبیح کے بالمقابل نمایاں ہو گئی تھی۔ اسے دیکھکر وہ بعد مبالغہ خوش نظر آئی۔ اور یوسف نے جو کچھ کہا نہایت توجہ کے ساتھ سنا کی۔ لیکن بتدریج اس کے انداز میں ایک کشیدگی پیدا ہوتی رہی ہے۔ بہرحال یوسف کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ دردانہ کسی جذبے کو دبا رہی ہے۔ اور اس کی موجودگی و ملاقات سے دردانہ کی خفگی بالکل دور نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اُس کی ہر حرکت اور لہجے میں برہمی چھپی ہوئی تھی۔ اُسے اندیشہ تھا کہ نسوانی ہدایت نے اس کے مافی الضمیر کو پڑھ تو نہیں لیا ہے اور اگر ایسا ہے تو اس کی دقت میں گونہ سہولت پیدا ہو گئی ہے۔

تخلیے کے خیال سے یہ دونوں باغیچے کی ایک روش پر ہو لئے جہاں گھنے درختوں کی شاخوں میں سے چھن چھن کر آفتاب کی کرنیں خوشگوار ہو گئی تھیں فضا یاسمن کی خوشبو سے بسی ہوئی تھی اور اس کا سحر یوسف پر مستولی ہونے لگا جیسے اب سے پہلے ہو جاتا تھا۔ اس فضا میں جب اس نے اپنے حواس کا جائزہ لیا تو سب سے پہلے اُسے یہ محسوس ہوا کہ بہرحال وہ دردانہ سے محبت کرتا ہے ——— وہ بغایت قابل پرستش ہے۔ تاہم یوسف نے اپنے احساس کی حقیقت کو جس قدر زیادہ سمجھنا چاہا وہ اسی قدر زیادہ ہیجان و تذبذب میں مبتلا ہوتا گیا۔ تخیل بھی کس درجہ عجیب شے ہے! اس کے ذہن میں جو تعصبات پیدا ہو چکے تھے ان کو دردانہ کی موجودگی تمام و کمال باطل نہیں کر سکی۔ تو کیا یہ محبت نہیں بلکہ اتحاد عارضی تاثر ہے؟ لیکن اگر یہ دردانہ کا محض سحر جمال ہے تو اندازہ و قیاس سے باہر ہے یوسف انتشارِ خیال میں مبتلا تھا۔

وہ جو کچھ خیال کر رہا تھا، جو کچھ محسوس کر رہا تھا، اس وقت شدید ہو جاتا تھا۔ جب گفتگو دفعتہً بند ہو جاتی تھی اُسے دردانہ کی بات کا جواب دینا پڑتا تھا۔ اور اس کے لئے وہ ہمہ آمادگی تھا۔ حالانکہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے جوابات اکثر لغو و بے معنی تھے۔ دردانہ مصر ہوئی کہ وہ اپنی غیر حاضری و بے توجہی کی توجیہہ کرے۔ اور یوسف نے اپنی تمام لطافت لسانی اس میں صرف کر دی کہ بیان طویل ہو کر اصل مطلب غائب ہو جائے۔ کیونکہ وہ مذبذب تھا اور چاہتا تھا کہ عقل و شوق کی جو جنگ اس کے بطون میں جاری ہے اس کا تصفیہ ہو جائے۔ اس لئے وہ سکون و سہولت کے ساتھ اُن مضامین کو دُہراتا رہا جو اس نے آتے وقت گھڑ لئے تھے اور جو دفتر کی غیر معمولی مصروفیت، دوستوں کی ضروری ملاقاتوں اور اس کے باپ کی بیماری سے متعلق تھے۔ لیکن اُس کی مایوسی کی حد نہ تھی جب اس نے محسوس کیا کہ دردانہ کی نظر میں اس کی گفتگو لاطائل

اور ترغیبی استدلال سے عاری تھی۔ اس کی بیچارگی کا اندازہ نہیں ہوسکتا جب اُسے یہ یقین ہوگیا کہ دردانہ اس کی قصہ طرازی کو سمجھ گئی ہے۔ دردانہ کی عین تمنا تھی کہ اُسے یقین دلا دیا جائے۔ اس نے اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کر رکھا تھا۔ لیکن یوسف کی غلط بیانی نے اس کے غیظ و غضب کے میگزین کو آگ دکھا دی۔ اور آخر ہوا یہ کہ نسوانی غصے کی حالت میں دردانہ نے اسے فریب دہی کا ملزم کہا۔ اور فریب بھی اس قسم کا کہ کسی دوسری لڑکی سے اس کی ملاقات کا علم دردانہ کو نہ ہوسکے۔

"میں جانتی ہوں کہ تمہیں اس حرافہ یاسمین سے الفت ہے۔ میرے ساتھ تمہیں کبھی بھی محبت نہ تھی۔ تم مجھے دھوکا دے رہے تھے۔ دردانہ نے رو کر کہا اور ہیجان کی حالت میں تنگ روش پر ادھر سے اُدھر ٹہلنے لگی، اور اس کی ساری کے الجھنے سے پھولوں کی پنکھڑیاں بکھرتی رہیں: تم میرے ساتھ صرف اس لئے کھیل رہے تھے کہ یاسمین کی توجہ حاصل کرسکو!"

اب یوسف کی باری تھی۔ اس کی مزاج میں ابتری پیدا ہو جانے کے لئے بھی صرف ایک چھیڑ کی ضرورت تھی۔ اور دوسری لڑکی سے اختلاط کا غلط الزام! معاذ اللہ!

"یہ غلط اور بالکل غلط ہے! اور تم خوب جانتی ہو کہ مجھے یاسمین کو دیکھے ہوئے بھی مہینے گزر گئے۔ لیکن تمہیں کسی دوسری لڑکی کے متعلق کچھ کہتے ہوئے اپنی زبان پر قابو رکھنا چاہیئے!" اس نے تیز لہجے میں جواب دیا۔

دردانہ اسی انداز میں بہت کچھ کہتی رہی اور جو کچھ اس نے کہا یوسف کے لئے سب غیر متوقع تھا۔ اُس کے گلابی رخساروں پر آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ زمین پر پاؤں مار رہی تھی۔ ہاتھ مل رہی تھی۔ اور اس حال میں جب اُس سے بات کرسکنا ممکن ہوتا تو یوسف کو فریبی اور دغاباز کہتی۔ یوسف کے سامنے جمالی کے بیان کا ایک جزو بصورت مثالی آموجود ہوا تھا۔ اور اب اُسے یقین سا ہونے لگا کہ جمالی نے جو کچھ کہا ہے وہ سب صحیح ہوسکتا ہے۔ وہ باتیں بھی صحیح ہوسکتی ہیں جن کے متعلق یوسف نے دوران گفتگو ہی میں خلاف واقعہ اور ناقابل قبول ہونے کا قطعی فیصلہ کرلیا تھا اس کا جو نتیجہ ہوا وہ یہ تھا کہ یوسف نے مردانہ انداز اختیار کیا اور دردانہ کے پاس سے بغیر کچھ کہے چلا آیا۔ گھر پہنچ کر اس نے ایک مختصر اور اپنے موضوع پر واضح خط لکھا۔ اور صاف الفاظ میں لکھ دیا کہ باہمی تعلقات کو یک قلم ختم سمجھنا چاہیئے۔

کم و بیش ایک مہینے کے بعد یوسف پارک میں گھوم رہا تھا۔ گھومنا غلط لکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد و مدعا گلگشت نہ تھی، بلکہ اس کے وہاں ہونے کا کوئی مقصد و مدعا نہ تھا اور جس روش اور راستے پر اُس کے پاؤں اُٹھ جاتے وہ اُدھر کو ہو لیتا تھا۔ درحقیقت ان دنوں اس کا بے مقصد و مدعا جینا بھی اجیرن ہو رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی زندگی مایوسانہ ہے۔ اور تاریک گلاب کے ایک تختے کی طرف جانے کے لئے چند سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ یوسف نے جیسے ہی اوپر کی سیڑھی پر قدم رکھا اُس نے ایک نہایت خوش قطع خوش وضع انسان کو اپنے برابر سے گزر جاتے دیکھا۔ ہرچند اندھیرا کافی ہو گیا تھا۔ مگر وہ گزر جانے والا شخص دفعتہً رُکا اور کہنے لگا۔

یوسف!

اوہ، جمالی۔

جمالی وہی پہلا جمالی تھا۔ فرق اتنا تھا کہ اس کا انداز دلباس ظاہر کر رہا تھا کہ اس پر زیادہ توجہ صرف ہوئی ہے۔

میں تمہیں کئی روز سے فون کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ تم اتنے عرصے کہاں چھپے رہے۔ ادیب شہیب نے اپنے نوجوان دوست سے سوال کیا۔

"میں نہایت مصروف رہا ہوں" یوسف نے جواب دیا۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ یوسف نے کم از کم کچھ عرصے تک جمالی سے نہ ملنے کا تہیہ کرلیا تھا، کیونکہ یوسف کے اندازے میں جمالی انسانی تخیل کے ہر طلسم کو باطل کر دینے کا اہل تھا۔ اور یوسف اس وجہ سے خائف تھا کہ کہیں جمالی اس پر کوئی اور حملہ نہ کر دے۔

میں اس وقت کی اتفاقیہ ملاقات سے خوش ہوں" جمالی نے خندہ پیشانی کے ساتھ کہا۔ میں سمجھتا ہوں تم نے ابھی تک نہ سنا ہوگا۔

کیا نہ سنا ہوگا! یوسف نے پیشانی پر شکن ڈال کر سوال کیا۔

میری شادی کی قرار داد! اس وقت جمالی خلاف عادت کچھ خجل سا تھا۔

"شادی" یوسف کے منہ سے ایک بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

ہاں قمر زمانی کے ساتھ میرے نکاح کی ۲۶ ر تاریخ مقرر ہے" جمالی نے اسی انداز میں کہا۔

خدا کی سنوار! یوسف نے ہیجان کی حالت میں کہا کیا واقعی "عورت اور ازدواج کے متعلق آپ جو کچھ کہہ چکے ہیں اس کے بعد شادی؟"

میرے نوجوان دوست! میں نے جو کچھ کہا تھا وہ عام عورتوں کے متعلق کلیے کی شکل میں تھا۔ مس قمر، صرف ایک بلند پایہ شاعرہ ہے۔ بلکہ وہ "مستثنےٰ" عورتوں میں سے ہے۔ کاش میں اس روز سے قبل اس کی ان خصوصیات سے آگاہ ہوتا۔ وہ بالکل مختلف اور عجیب و غریب لڑکی ہے۔ اس کے اندر نازک و جمیل ہونے کی نسوانی تخصیص کے ساتھ مردوں کی سی قوت متصورہ اور وسعت خیال بھی ہے۔

لیکن ازدواج کے متعلق تم نے کونسا "استثنےٰ" نکالا؟ اس کی ضعیف بنیادوں کے نظریئے کیا ہوئے؟ یوسف نے طنزیہ سوال کیا۔

"یوسف!" جمالی نے ایک جج کے انداز میں جواب دیا "ہم سب جس دنیا میں رہتے ہیں وہ اگر کچھ ہے تو محض مادی ہے۔ ایک عملی اور سطحی دنیا ہے مس قمر زمانی نے خود خواہش کی۔ اور وہ بھی بعض معاشری مصلحتوں کی بنا پر اور میں با خاطر و ناخواستہ کہہ یا اس کی دلداری کے خیال سے راضی ہوگیا۔ لیکن یقین مانو کہ ہم دونوں ازدواج کی عدم اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں اور ہم دونوں کے باہمی تعلق پر اس رشتے کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔ اور دونوں کو کامل آزادی حاصل ہوگی۔ اس طرح ہم مسئلہ ازدواج کا ایک آئیڈیل پیش کرنا چاہتے ہیں۔ رہ گیا مس قمر کی مزاجی خصوصیات کا سوال ———— " گھڑی دیکھکر

"عزیز من! مس قمر سے ملنے کا وعدہ ہے اور وقت تقریباً پورا ہو چکا ہے خدا حافظ! تمہیں دعوت کا رقعہ پہنچے گا۔ ضرور شریک ہونا۔ خدا حافظ!"

یوسف سوچتا رہ گیا کہ دروازہ کے پاس اگر جائے تو کون سا منہ لے کر۔





"شمع" کہتی ہے کہ فانوس میں کیا ہوتا ہے؟

میں جو جلتی ہوں تو "محفل" کا بھلا ہوتا ہے

آج دنیا کی حقیقت مجھے معلوم ہوئی

اپنی راحت کے لئے ظلم روا ہوتا ہے

میرے جلنے سے سما جاتی ہے ہر چیز میں روح

سینکڑوں بنتے ہیں، جب ایک فنا ہوتا ہے

(سیفی ملیح آبادی)

دردِ فراق

میں ہوں اور اضطرابِ دردِ فراق — ہے قیامت عذابِ دردِ فراق

اُدھر آرائشِ خمِ گیسو — اور اِدھر پیچ و تابِ دردِ فراق

حشر تک، رات دن تڑپنا ہے — ہے یہ تعبیرِ خوابِ دردِ فراق

ہر مصیبت ہے دل شکن، لیکن — نہیں کوئی جوابِ دردِ فراق

نالہ ہے ہم ردیف، تبِ خالہ — سوزِ دل ہم رکابِ دردِ فراق

عہدِ گُل کی ہوائیں کھا کھا کر — زور پر ہے شبابِ دردِ فراق

ہر نفس دل سے لب تک آ آ کر — لکھ گیا اک کتابِ دردِ فراق

سننے والا کوئی نہیں ملتا — خاک چھیڑوں رُبابِ دردِ فراق

چشمِ تر نے بہا دیے دریا — نہ مٹا التہابِ دردِ فراق

اب تو مرنے کی ہم نے ٹھانی ہے — کہ نہیں دل کو تابِ دردِ فراق

گھر کہاں احسنؔ اور کہاں راحت
میں ہوں خانہ خرابِ دردِ فراق

(احسن مارہروی)

جدید آئین پر ایک تنقیدی نظر

سید شریف حسین آرزو

اس مفید سلسلے کو جناب سید شریف حسین صاحب آرزو نے جیوڈ کر قارئین "کلیم" کے لئے سیاسی معلومات کا باب کھول دیا ہے جس کے واسطے ہم آرزو صاحب کے شکر گزار ہیں۔ امید کہ صاحب موصوف اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔ (جوش)

تمہید

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ملک کا ہر سیاسی انقلاب قوم کے افراد کی اقتصادی معاشری، اخلاقی و مجلسی زندگی پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے اثرات نتائج و عواقب کے لحاظ سے یا تو تعمیری ہوتے ہیں یا تخریبی۔ اس امر کا فیصلہ آسان نہیں کہ کسی ملک کے سیاسی نظام میں تبدیلی، قوم کی فلاح و بہبود عروج و ترقی، خوش حالی و فارغ البالی، اور آزادی و حریت کے استقلال و استحکام میں ممد و معاون ثابت ہوگی یا قوم کو ہلاکت آفرین افلاس و غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دے گی۔ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ سیاسیات کا ہر مسئلہ متنازعہ فیہ ہوتا ہے۔ اس کے کسی اصول کو عمومیت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ ہر قوم اور ہر فرد کا سیاسی نظریہ جدا ہے۔ حق، صداقت اور جواز حالانکہ سیاسیات کے تین ابتدائی بنیادی اصول ہیں۔ لیکن ہر قوم اور اس کے انفرادی اداروں کے نزدیک اُن کا معیار مختلف ہے۔ نہ ماضی اپنے شاندار دور کے باوجود اس اختلاف کو دور کر سکی اور نہ حال ہی کروڑوں انسانوں کا خون بہا کر اس کا خاتمہ کر سکا۔ اور مستقبل کی مُسلّمہ تاریکیوں سے اس متنازعہ فیہ مسئلے کے حل کی توقع ہوائی قلعوں کی تعمیر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

سنہ ۱۴-۱۹۱۸ء کے محاربۂ عظیم کی ہولناک تباہکاریوں اور ہلاکت آفرینیوں کی جگر پاش یاد تازہ ہونے کے باوجود اقوام عالم حق، صداقت و جواز کے حقیقی معیار کا فیصلہ کرنے کے لئے انسانیت و تہذیب کے نام پر پھر ایک بار عالمگیر جدال و قتال کے واسطے تیار ہو رہی ہیں۔ ہر قوم کا یہ خیال ہے کہ وہ کرۂ ارض میں مفسد و امن سوز عناصر کا خاتمہ کرکے انسانیت ہی کی نہیں بلکہ خدا کی ایک اہم ترین خدمت انجام دے گی۔ اس خیال کے پیش نظر ہر قوم اپنے اپنے نظام حکومت کو حق، صداقت و جواز کے ذاتی معیار کے مطابق مستحکم و مضبوط بنانے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔

آئین حکومت کے مطالعے کی ضرورت

کسی قوم کا سیاسی نقطۂ نگاہ معلوم کرنے اور اُس نے حق، صداقت و جواز کا جو معیار اپنی ذاتی ذہنیت کے زیر اثر قائم کیا ہے، اس کی نوعیت و کیفیت دریافت کرنے کے لئے ہمیں اس نظام العمل کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ جو اُس قوم نے اپنے ذاتی نقطۂ نگاہ کو بروئے کار لانے کے لئے مرتب کیا ہے۔ اس نظام العمل کو سیاسیات کی اصطلاح میں "آئین" یا "دستورِ اساسی" کہتے ہیں۔

سیاسیات سے بڑھ کر اس دنیا میں "زمانہ سازی" کوئی نہیں جس قوم کا سیاسی نظام العمل زمانہ سازی کے تعمیری عناصر سے خالی ہوتا ہے وہ زمانے کی "دست درازی" کی بدولت اس قوم کے سپرد کر دی جاتی ہے جو زمانہ ساز ہے۔ ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ اسی قدرتی اصول کے ماتحت قایم ہوا تھا اور اب تک قایم ہے۔ اور جب تک ہندوستان زمانہ سازی کے فن میں ماہر نہ ہو جائے گا اس وقت تک قایم رہے گا۔ اکبر مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

رہی نہ قلب میں طاقت زمانہ سازی کی
دعا کرو نہ مری عمر کی درازی کی

ہندوستان کا جدید آئین

آج ہندوستان برطانیہ کے زیر سایہ ایک نئے سیاسی دور میں داخل ہو رہا ہے۔ اپریل ۳۷ء تک جدید آئین موسومہ "قانون حکومت ہند مجریہ ۳۵ء" کا ابتدائی حصہ صوبوں کی خود اختیاری کی صورت میں نافذ ہو جائے گا۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئین نو میں تعمیری قوتیں پنہاں ہیں۔ یا تخریبی طاقتیں۔ تاہم نتائج و عواقب کے متعلق تحقیقات سے قبل اس آئین کے روشن خدّ و خال سے واقفیت ضروری ہے۔ میری رائے میں ہندوستان کے جدید دستور اساسی کے بنیادی اصول و ہیئت ترکیبی بیان کرنے سے پیشتر برطانوی آئین پر بحث نہایت مفید ہو گی۔ کیونکہ اس طرح ہم ہندوستان کے جدید نظامِ حکومت کی حقیقت و افادیت کا "دنیا کے سب سے زیادہ جمہوری آئین" کی روشنی میں (جیسا کہ برطانوی آئین کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے) صحیح اندازہ لگا سکیں گے۔ اور اس طرح ایک بڑی حد تک ہم ہندوستان کے متعلق برطانوی سیاسی ذہنیت معلوم کر سکیں گے۔

رسالے کی تنگ دامنی کے باعث میں نے انتہائی اختصار کو ملحوظ رکھا ہے اور برطانوی و ہندوستانی دساتیر کے صرف روشن خدوخال بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ ہندوستانی دستور کی بعض اُن ذیلی و ضمنی خصوصیات کو بھی شامل کر لیا ہے۔ جن کے بغیر جدید آئین کے چند بنیادی اصول کے سمجھنے میں دقّت ہوتی۔

چند ابتدائی امور

اصل موضوع کی طرف رجوع کرنے سے قبل "آئین" کی تعریف۔ آئین کی غرض و غائت "وحدانی" و "وفاقی" آئین۔ "تحریری" و "غیر تحریری" آئین۔ "پارلیمنٹری" و "غیر پارلیمنٹری" طرزِ حکومت۔ مجالس قانون ساز اور شعبۂ عدل و انصاف کی عام نوعیت پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

آئین کی تعریف

آئین سے مراد اُن اصول کا مجموعہ ہے جن کے تحت حکومت کے اختیارات۔ محکوم کے حقوق۔ اور ہر دو کے درمیان مفاہمانہ تعلقات کی تخصیص کی جاتی ہے ان اصول کے اجزائے ترکیبی قدیم مذہبی۔ اخلاقی و اقتصادی روایات۔ رائج الوقت رسم و رواج اور رفتار زمانہ سے پیدا شدہ ضروریات میں پائے جاتے ہیں۔

حکومت و آئین ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں۔ آئین کے بغیر خواہ وہ کتنا ہی نامکمل و نا تمام ہو۔ حکومت کا وجود غیر ممکن ہے۔ جس طرح جسم کی زندگی کے لئے روح ضروری ہے اسی طرح حکومت کے وجود کے لئے آئین لازمی ہے۔

آئین کی غرض و غائت

آئین کی غرض و غائت دوہری ہے۔ ایک جانب وہ حاکم کے انفرادی اختیارات کے رضاکارانہ استعمال کو معین حدود سے متجاوز ہونے سے روکتا ہے۔ اور دوسری جانب وہ محکوم کے بعض حقوق کا ضامن و محافظ رہتا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ "طاقتِ بالادست" (حکومت) اور "طاقتِ زیر دست" (محکوم) کے درمیان ایک صاف و روشن حدِ فاصل قایم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابلِ غور ہے۔ کہ سیاسیات کے جدید ترین نظریہ کے ماتحت عامۃ الناس "طاقتِ زیر دست" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی طاقتِ بالادست کے مقابلہ پر عامۃ الناس کو بھی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ طاقتِ بالادست کے مفاد کے زیر اثر رہتی ہے۔

گو فی الحقیقت بالادستی کی طاقت ایک ایسی امانت ہے جو عامۃ الناس حکومتِ وقت کو اپنی خوشی سے محض اس بنا پر سپرد کرتے ہیں کہ ملک و قوم فلاح و ترقی کی راہ پر گامزن رہیں۔ لیکن اگر وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس امانت میں خیانت کی جا رہی ہے تو ہمہ گیر انقلاب کر کے اپنی امانت واپس لے لیتے ہیں۔ اور کسی دوسرے نظامِ حکومت کے سپرد کر دیتے ہیں جو اُن کے نزدیک اپنے پیش رو سے زیادہ امین و قابل ہوتا ہے۔ اسی خیال سے عامۃ الناس کو طاقتِ زیر دست کہا جاتا ہے۔ یہ طاقت آزاد قوم کو بھی حاصل ہوتی ہے اور غلام قوم کو بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آخر الذکر کے اجتماعی قویٰ کمزور ہوتے ہیں۔ جن میں طاقتِ بالادست کی خیانت کے خلاف صف آرا ہونے کی روح پھونکنی بہت مشکل ہوتی ہے۔

وحدانی و وفاقی آئین

آئین طرزِ حکومت کے لحاظ سے دو قسم کا ہوتا ہے (۱) وحدانی (Unitary) اور (۲) وفاقی (Federal)

وحدانی آئین کے ماتحت، ایک واحد اعلیٰ طاقتِ بالادست واحد مختارِ کُل قوت کا استعمال کرتی ہے اور باقی تمام طاقتیں خواہ وہ حکومت کے کسی حصہ یا شعبہ سے تعلق رکھتی ہوں (مثلاً مجالس قانون ساز و مقامی ادارات) صرف اعلیٰ طاقت بالادست کے قائم کردہ ضابطہ یا منتقل کردہ اختیارات کے ماتحت معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ اور کام کرتی ہیں۔

وحدانی طرزِ حکومت کے ماتحت فی الحقیقت مقامی ادارات یا مجالس قانون ساز کو آئین سازی کے اختیارات حاصل نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ دراصل ضمنی قواعد و ضوابط یا قوانین مرتب کرتی ہیں۔ جن کی آخری منظوری یا نامنظوری کا اختیار طاقت بالادست یا اس کے مخصوص نمائندے کے ہاتھ میں محفوظ رہتا ہے۔

برطانیہ۔ فرانس۔ ہسپانیہ۔ جاپان وغیرہ ممالک میں وحدانی قسم کا آئین نافذ ہے۔ جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے اس کی آزاد و خود مختار نوآبادیات بھی طاقت بالادست کے حقوقِ قانون سازی سے مستثنیٰ نہیں۔ بلاشبہ ان نوآبادیات کو قانون سازی کے حقوق حاصل ہیں۔ لیکن یہ حقوق صرف طاقتِ بالادست کی رضامندی سے اُن کی جانب منتقل کئے گئے ہیں۔ جو ناپسندیدہ و ناخوشگوار حالات کی صورت میں کسی حجت کے بغیر واپس لئے جا سکتے ہیں۔

وفاقی آئین کے ماتحت ملک کے نظم و نسق کے اختیارات مرکزی و مقامی حکومتوں کے درمیان طے پاتے ہیں ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ جرمنی۔ سوئٹزرلینڈ۔ اور روس وغیرہ میں وفاقی طرز کا آئین نافذ ہے۔ ہندوستان کا جدید آئین بھی وفاقی طرز کا ہے۔ لیکن ہندوستانی وفاق Indian Federation میں مرکزی حکومت کے آخری اختیارات عوام کی نمائندہ جماعت یعنی وفاقی مجلس قانون ساز کے ہاتھ میں نہیں ہوں گے۔ بلکہ تاجِ برطانیہ کے نمائندے گورنر جنرل کے قبضہ میں ہوں گے۔ جو برطانوی حکومت کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ اس لحاظ سے ہندوستانی وفاق کی آخری مرکزی طاقت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ برطانوی حکومت یا بالفاظِ دیگر برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھ میں ہوگی۔

تحریری و غیر تحریری آئین

آئین اپنی نوعیت کے لحاظ سے دو قسم کا ہو سکتا ہے (۱) تحریری (Written) اور (۲) غیر تحریری (Un-Written)

تحریری آئین ایک ایسے آئین کو کہتے ہیں جس کے تمام قواعد و ضوابط کسی خاص و اہم دستاویز یا دستاویزات میں جمع کر دیئے گئے ہوں۔ اور ملک کا ادنیٰ و اعلیٰ نظم و نسق صرف انہی دستاویزات میں درج شدہ قواعد و ضوابط کے ماتحت بروئے کار لایا جائے۔

غیر تحریری آئین وہ ہے جو تحریری قانون کی بجائے ملکی رسم و رواج پر قائم ہو۔

تحریری آئین کا ایک ظاہری فائدہ یہ ہے کہ وہ اربابِ اختیار کی ناجائز کارروائیوں کا سدِ باب کر سکتا ہے۔ گو عملی طور پر اس کے برعکس بھی نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

ہندوستان کے قدیم و جدید دساتیر سب تحریری ہیں جن کے تمام ظاہری فوائد ان کے قومیت کُش نتائج کے پیشِ نظر بالکل بے حقیقت ثابت ہوئے۔

سخت و نرم آئین

اگر ہم دساتیرِ عالم کا بنظرِ تعمق معائنہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ تمام دساتیر اپنی ذاتی خصوصیت کے لحاظ سے دو قسموں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ (۱) سخت (Rigi d) اور (۲) نرم (Flex ble)

سخت آئین سے مراد ایک ایسا آئین ہے جو انتہائی غور و فکر اور بحث و تمحیص کے بعد حکومت کے کل پرزوں کو "چالو" رکھنے کے لئے مرتب کیا جائے۔ اور اس میں آسانی کے ساتھ ہنگامی انقلاب یا وقتی جوش کے ماتحت کوئی تبدیلی نہ کی جاسکے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا دستورِ اساسی اسی لحاظ سے "سخت" کہا جاتا ہے۔ ہندوستان کا جدید دستور بھی بلاشبہ "سخت" ثابت ہوگا۔

"نرم آئین" سے مراد ایک ایسا دستورِ اساسی ہے جس کی نشو و نما انسانی ارادہ یا جبریہ تشکیل کی بجائے قدرتی حالات میں ہوئی ہو۔ اور جس میں ضروریات زمانہ کے مطابق کسی خاص دشواری کے بغیر مناسب تبدیلی پیدا کی جاسکے۔ انگلستان کا آئین اس لحاظ سے معیاری حیثیت رکھتا ہے۔ روس اور زمانہ حال میں جرمنی۔ اٹلی اور جاپان بھی برطانیہ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سخت آئین کے ماتحت مجالس قانون ساز کا دائرۂ عمل صرف قانون سازی تک محدود رہتا ہے۔ جبکہ نرم آئین کے ماتحت مجالس قانون ساز کا فرض صرف قانون سازی ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ قوانین نافذ کرسکتی ہیں۔ ان میں ترمیم کرسکتی ہیں۔ اور انھیں منسوخ کرسکتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ پرانے آئین کو منسوخ۔ نئے آئین کا نفاذ۔ یا موجودہ آئین میں بنیادی ترمیم یا انقلاب انگیز اصلاح بھی کرسکتی ہیں۔

فرانس کا آئین درمیانی حیثیت رکھتا ہے "سخت" ہونے کے باوجود مجالس قانون ساز کے ہر دو ایوانوں کی معمولی اکثریت کے فیصلہ سے اس میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔ جبکہ امریکہ کے آئین میں معمولی تبدیلی کے لئے بھی سخت ترین آئینی مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس برطانوی آئین میں دارالامرا و دارالعوام کے معمولی متفقہ فیصلہ سے ہر قانون میں بہ آسانی ترمیم کی جاسکتی ہے۔ اور اُن کا فیصلہ بالکل ناطق ہوتا ہے۔

پارلیمنٹری و غیر پارلیمنٹری حکومت

"پارلیمنٹری حکومت" سے مراد ایک ایسا آئین ہے جس میں اربابِ اختیار عوام کے نمائندوں یعنی مجالس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہوں، اور صرف اس وقت تک اپنے عہدوں پر قایم رہیں جب تک کہ عوام کے نمائندوں کو ان پر اعتماد ہو۔

"غیر پارلیمنٹری حکومت" سے مراد ایک ایسا آئین ہے جس کے ماتحت اربابِ اختیار مجالس قانون ساز کے سامنے جواب دہ نہ ہوں۔ بلکہ اس کے برعکس مجالس قانون ساز اربابِ اختیار کے سامنے اس معنی میں جواب دہ ہوں۔ کہ اگر ان کا منظور کردہ کوئی قانون اربابِ اختیار کے ذاتی فیصلہ کے منافی ہو تو اُسے ٹھکرا دیا جائے۔ اور وہ بالکل بے بس رہیں۔

ہندوستان کا موجودہ آئین غیر پارلیمنٹری ہے۔ جدید آئین بھی ایک بڑی حد تک غیر پارلیمنٹری ہوگا۔ جیسا کہ آئندہ مضمون میں واضح کیا جائے گا۔

مجالسِ قانون ساز کی نوعیت

مجالس قانون ساز اپنی نوعیت کے لحاظ سے دو قسم کی ہوتی ہیں۔

(۱) ایسی مجالس قانون ساز جو صرف ایک ایوان پر مشتمل ہوں۔

(۲) ایسی مجالسِ قانون ساز جو دو ایوانوں پر مشتمل ہوں۔

ایک ایوان والی مجلس قانون ساز اس زمانے میں زیادہ جمہوریت پسند خیال کی جاتی ہے۔ جبکہ دو ایوانوں والی مجلس قانون ساز کو رجعت پسندانہ طاقتوں میں محصور سمجھا جاتا ہے۔ آئرش فری سٹیٹ کے وزیر اعظم نے اسی خیال سے آئرستان کی مجلس قانون ساز کے ایوانِ بالا کو توڑ دیا ہے جرمنی اٹلی ہسپانیہ بھی اسی زمرے میں شامل ہیں۔

حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان کے جدید دستور اساسی کے ماتحت بعض صوبجات میں دو ایوان والی مجالس قانون ساز قایم کی ہیں اور بعض میں صرف ایک ایوان والی مجالس قانون ساز کو کافی سمجھا گیا ہے۔ گو صوبائی مجالس قانون ساز پر آئندہ سطور میں مفصل بحث کی جائے گی۔ لیکن یہ بتا دینا..............

ضروری ہے کہ حکومت برطانیہ نے دو ایوان والی مجالس قانون ساز صرف ان صوبوں میں قایم کی ہیں جہاں اُسے یہ خدشہ ہے کہ قوم پرور عناصر طاقتور ہونے کے باعث حکومت کے کل پرزوں میں جمود پیدا کر دیں گے۔ اس خطرہ کا سدباب کرنے کے لئے ایوان بالا کا رجعت پسندانہ عنصر شامل کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ ایوان بالا میں صرف سرمایہ دار و سرکار پرست لوگ ہی منتخب ہو کر آسکتے ہیں۔ معیار برائے رہی و معیار امیدواری انتہائی بلند ہونے کے باعث غریب طبقہ کے نمائندوں کا داخلہ غیر ممکن ہے۔

شعبۂ عدل و انصاف کی نوعیت

شعبۂ عدل و انصاف حکومت کی مشینری کا اہم ترین پُرزہ ہے۔ اگر یہ پُرزہ بے کار ہو جائے تو سرکاری مشینری کی چال خراب ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بند ہو جاتی ہے۔ شعبۂ عدلیہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ (۱) ایسا شعبہ جس کا واسطہ صرف عدل و انصاف سے ہو حکومت کی انتظامیہ حکمت عملی کو اس میں بالکل دخل نہ ہو۔ اور نہ شعبۂ عدل و انصاف کے ارباب اختیار حکومت کے عام نظم و نسق میں حصّہ نہ لیں۔ (۲) ایسا شعبہ جس کا واسطہ عدل و انصاف کے علاوہ عام امور کے نظم و نسق سے بھی ہو۔ اور حکومت بوقت ضرورت اپنے مفاد کے پیشِ نظر عدل و انصاف کی حکمت عملی میں مداخلت نہ کر سکے۔

مذکورہ بالا باتیں ہر ملکی دستور کے بُنیادی اصولوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد ہم کسی ملک کے دستور کے نشیب و فراز عیوب و محاسن اور تعمیری و تخریبی طاقتوں کا آسانی کے ساتھ مطالعہ کر سکتے ہیں۔

سیاسیات ایک خشک مضمون ہے۔ اس لئے عام فہم نہیں۔ تاہم میں نے آئینی امور کو سیدھی سادی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن بُنیادی اصول کو بیان کرنے کے بعد جو دنیا کے ہر دستور میں قدرتی طور پر مشترک ہوتے ہیں۔ لیکن تفصیلات اور طریقۂ کار کے لحاظ سے مختلف بن جاتے ہیں۔ برطانیہ کے آئین کا ایک مختصر خاکہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

آئین برطانیہ

آئین برطانیہ "جمہوری بادشاہی" ہے جو دو اجزائے لاینفک سے مرکب ہے (۱) بادشاہی (۲) پارلیمنٹ۔

بادشاہ کی "امداد" کے لئے پریوی کونسل ہے۔ پارلیمنٹ کی "رہنمائی" کے لئے "کابینہ وزارت" ہے۔ جو بذاتِ خود پارلیمنٹ کی سب سے بڑی جماعت کے نمائندوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض اوقات کابینۂ وزارت پارلیمنٹ کی مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندوں سے ترکیب پاتا ہے۔ پہلی صورت میں اُسے جماعتی حکومت (PARTY GOVT) اور دوسری صورت میں اُسے اتحادی یا مخلوط حکومت (Coalition Govt) کہتے ہیں جیسی کہ آج کل مسٹر بالڈون کی رہنمائی میں قایم ہے۔

کابینۂ وزارت۔ بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان ایک اتحادی رشتہ تسلیم کیا گیا ہے۔ جو پارلیمنٹ کی خواہشات کو بادشاہ تک پہنچاتا ہے اور اس کی منظوری حاصل کرتا ہے۔

چونکہ برطانیہ کے آئین کا ایک بہت بڑا حصّہ غیر تحریری ہے۔ اس لئے ہمیں اس کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے کے لئے اُن ابتدائی ارتقائی مراحل کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جو آج بھی دستور برطانیہ کا جزو اعظم بنے ہوئے ہیں۔

برطانیہ کی جمہوری بادشاہت کا آغاز ۱۵ / جون ۱۲۱۵ء سے ہوتا ہے۔ جبکہ بادشاہ جوہن نے رنی میڈ کے مقام پر "دستاویز اعظم" (Magna Charta) پر اپنے دستخط ثبت کئے تھے۔ اور اس طرح قوم شاہی جور و استبداد سے ایک بڑی حد تک آزاد ہو گئی تھی۔ اس دستاویز اعظم کی رو سے قوم کو حسب ذیل حقوق حاصل ہوئے۔ جو آج تک حاصل ہیں۔

(۱) زمینداروں اور جاگیرداروں کے حقوق کا تحفظ۔

(۲) لندن اور دیگر شہروں کی تمدنی و سیاسی آزادی۔

(۳) مجلس عظمیٰ (Great Council) کا قیام اور اس کے دستور کی تدوین۔

(۴) کوئی شخص بلا سماعت مقدمہ قید و حراست میں نہیں رکھا جا سکتا۔

(۵) انصاف کو فروخت نہیں کیا جا سکتا ہے۔ نہ اس سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ اس میں تاخیر کی جا سکتی ہے۔

(۶) کسی شخص پر نہ جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔ نہ اُسے قید کی سزا دی جا سکتی ہے اور نہ اُسے جلاوطن کیا جا سکتا ہے۔ تاوقتیکہ اس کے اپنے رفیق اس قسم کا کوئی فیصلہ نہ کر دیں۔

(۷) رفیق سے مراد وہ شخص ہے جو شخص متعلقہ کے مساوی درجہ کا ہو۔ (اس کا مطلب یہ تھا کہ امراء کے فوجداری مقدمات کا فیصلہ صرف امراء ہی کر سکیں گے۔ یہ دستور ۱۹۴۸ء کی ابتدا تک جاری تھا۔ لیکن اب پارلیمنٹ نے اُسے منسوخ کر دیا ہے)

اس دستاویز اعظم کی تصدیق کیے بعد دیگرے بادشاہوں نے کی اور آج وہ برطانوی قصرِ سیاست کی سب سے مضبوط بنیاد ہے۔

مذکورہ دستاویز کے ماتحت شاہی اختیارات محدود کر دیے گئے۔ اور عوام کے آزاد حقوق کو تسلیم کر لیا گیا۔

۱۵۳۴ء ہنری ہشتم نے انگریزی کلیسہ کی عنانِ اختیار اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس طرح پادریوں اور مذہبی ٹھیکہ داروں کا زوال شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۶۰۰ء میں انگریزی کلیسہ پاپائے روم کے ہمہ گیر اثر سے آزاد ہو گیا۔ اور اس کی جگہ شاہِ انگلستان نے لے لی۔ اب بادشاہ کو "محافظِ دین" کا خطاب مل گیا۔

شاہ چارلس اول کے قتل کے بعد کروم ویل نے دولتِ مشترکہ کی بنیاد رکھی اور اس طرح جمہوریت کے قدم اور بھی مضبوط ہو گئے۔ گو ۱۶۶۰ء میں بادشاہی بحال ہو گئی۔ لیکن چارلس دوم نام کا بادشاہ تھا۔ تمام بنیادی اختیارات عوام کے نمائندوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکے تھے ۱۶۷۳ء میں کیتھولک عیسائیوں کو تمام سرکاری ملازمتوں سے خارج کر دیا گیا۔ یہ ایک طرح کی مذہبی آزادی تھی۔ اس سے بڑھ کر قدم ۱۶۷۹ء میں اُٹھایا گیا جبکہ قانون حفاظت شخصی (Habeas corpus act) جاری کر کے خلاف قانون نظربندیوں کا قطعی طور پر سدباب کرایا گیا۔ اسی سال میں جماعتی حکومت (پارٹی گورنمنٹ) کا طریقہ جاری ہوا۔

۱۶۸۸ء کے انقلاب نے بادشاہ کے رہے سہے اختیارات کا بھی خاتمہ کر دیا شاہ جیمز ثانی کی ہجرت کے بعد ولیم ثالث تخت انگلستان کا وارث ہوا۔ لیکن اس کی حیثیت کٹھ پتلی کی سی تھی جو صرف پارلیمنٹ کے اشارے پر نقل و حرکت کر سکتی تھی۔ کیونکہ بادشاہی کا دائرۂ عمل قانون حقوق (Rights Act) کے ماتحت بالکل محدود کر دیا گیا تھا۔

اقتصادی آزادی

۱۷۸۳ء میں امریکہ کی جنگ آزادی نے برطانوی پارلیمنٹ کو ایک نیا اصول اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اور وہ یہ تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ اپنی کسی نوآبادی یا مقبوضہ ملک پر براہِ راست کوئی نیا ٹیکس عاید نہیں کر سکے گی۔ اس اصول کو عام طور پر اقتصادی آزادی کے ارتقا کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۱۸۳۲ء، ۱۸۶۷ء، ۱۸۸۵ء اور ۱۹۱۱ء میں پارلیمنٹ کے دستور میں اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ دارالامراء کے اختیارات نسبتاً کم ہو گئے۔ جب کہ دارالعوام صحیح معنوں میں جمہوری جماعت بن گئی۔

بادشاہ کے اختیارات

بادشاہ کو آئینی طور پر حق استرداد (Right of Veto) حاصل ہے۔ لیکن عملی طور پر بادشاہ اس حق کو استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ پارلیمنٹ وکابینہ وزارت کی پیش کردہ تجاویز و قوانین پر صرف مہر توثیق ثبت کر دیتا ہے۔

پریوی کونسل

ازمنہ ماضی میں پریوی کونسل بادشاہ کے خاص مشیروں (اور بعض حالات میں جاسوسوں اور مخبروں) پر مشتمل ہوتی تھی۔ جو ملکی نظم و نسق میں اس کی امداد کرتی تھی۔ لیکن اب صرف بعض عدالتی مرافعات کی آخری سماعت اور کابینۂ وزارت و پارلیمنٹ کے بعض ہنگامی قوانین کو شاہی فرمان کی صورت میں نافذ کرنے کے لئے منعقد کی جاتی ہے۔ گو اس کے ارکان کی تعداد تین سو سے زائد ہے لیکن ایک بادشاہ کی موت کے بعد دوسرے بادشاہ کی تخت نشینی کا

اعلان کرنے کے علاوہ کسی اور موقع پر تمام ممبران جمع نہیں ہوتے۔ بلکہ صرف چند ممبران بادشاہ کی موجودگی یا عدم موجودگی میں ضروری کارروائی انجام دینے کے لئے کافی سمجھے جاتے ہیں۔

طریق انتخاب

پارلیمنٹ کے ایوان زیرین (دارالعوام) کے ارکان کا انتخاب براہِ راست ہوتا ہے۔ ہر بالغ مرد اور ہر بالغ عورت کو رائے دینے اور امیدوار کھڑے ہونے کا حق حاصل ہے۔ چونکہ مخصوص نمائندگی کو دخل نہیں اس لئے ہر حلقۂ انتخاب کو اپنا امیدوار منتخب کرنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح دارالعوام میں ملک کی رائے عامّہ صحیح طور پر منعکس ہوتی ہے۔

ہر دو ایوانوں میں حدِ فاصل

دارالامراء کو ۱۹۱۱ء سے یہ اختیار حاصل نہیں رہا ہے کہ وہ مسودۂ مالیات میں کوئی ترمیم کردے۔ یا اُسے مسترد کردے۔ اس بارے میں دارالعوام کا فیصلہ ناطق سمجھا جاتا ہے۔ مزید برآں اگر دارالعوام کسی مسودہ قانون کو تین بار منظور کردے تو پھر اُس کے لئے دارالامراء کی منظوری کی ضرورت نہیں ہوگی۔ مسودہ مالیات پر ابتدائی بحث صرف دارالعوام میں ہوسکتی ہے۔ دارالامراء میں نہیں۔ جب کہ دیگر مسودات کسی ایوان میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔

سول سروس

برطانوی سول سروس سیاسی اثرات سے بالکل پاک ہے۔ وہ کسی خاص سیاسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتی۔ اس کا فرض یہ ہے کہ وہ کابینۂ وزارت کی جاری کردہ ہدایات اور رائج الوقت قوانین کی پوری پابندی کرے۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ برطانوی سول سروس ملکی نظم و نسق میں اپنی ذاتی خواہشات یا ذاتی حکمت عملی کو کبھی عملی جامہ نہیں پہناتی۔ اگر سول سروس کا کوئی ممبر ایسا کرے تو وہ فوراً خارج کردیا جاتا ہے۔ لیکن ایسے واقعات شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستانی سول سروس کو "حسبِ مرضی" اور "حسبِ ضرورت" اپنی ذاتی رائے کو عملی جامہ پہنانے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ جس کا نتیجہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ مرکزی یا صوبائی مجالس قانون جس غرض و غایت کے ماتحت کوئی قانون نافذ کرتی ہیں وہ سول سروس کے ہاتھوں پوری نہیں ہوتی اور بسا اوقات ایسے قانون کو اپنے ذاتی نقطۂ نگاہ کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ ہے مختصر سا خاکہ برطانوی آئین کا جو جمہوری بادشاہی کی بہترین مثال متصور کیا جاتا ہے۔ آئندہ صحبت میں ہندوستان کے جدید آئین پر روشنی ڈالی جائے گی۔

(باقی دارد)



اے وارثِ دولت و امارت سن لے
زیبا ہے غریب سے اگر کچھ سن لے
مزدوری کی تشنہ ہیں اب جس میں
جب جانیں کہ اس فضا میں تو سانس لے

نجم آفندی اکبرآباد

پیامِ کیفی

ملکِ ہندوستاں کے خاص و عام — آج ہے صاف صاف تم سے کلام
سب اشارے کنائے ختم ہوئے — بے کم و کاست آج کا ہے پیام
میں بھی رکھوں گا اب نہ لاگ لپیٹ — کیونکہ ہر بات اب ہے طشت از بام
آخر ایسے بھی کیا وطیرے ہیں؟ — کہ کریں لوگ دُور سے ہی سلام
سننے والوں کی چڑھ گئی تیوری — کان میں جب پڑا اتہام انام
کیا نہیں جانتے جو کہتے ہیں — تم کو باہر کے لوگ اور اقوام
یہ کہاوت کبھی سنی تو نہ تھی — بد سے بدتر جہاں میں ہے بدنام
اور جو اس کے ساتھ بد بھی ہو — اس کو کیا دیجئے گا آپ انعام
نہ ہمیشہ کبھی چلے نہ چلیں — چار دن کے ہیں سب یہ چام کے دام
ذاتی غرضیں بھی کر چکے پوری — ہو چکا ہے وطن کا بھی نیلام
جو یہاں ہے وہی ہے شعلہ زباں — جو یہاں ہے وہی ہے برقِ خرام
یہ چلن ہے تو پھر خدا کی پناہ — اس ادا سے ضرور غیر ہو رام
کوئی پھانسی کوئی چھرے سے مرا — کئی گھر ہیں جہاں مچا کہرام
کیا غرض آپ کی بلا جانے — کتنی بیوہ ہوئی ہیں اور ایتام
اس زمانے کا صفحۂ تاریخ — خونِ اخواں سے پا چکا ارقام
تیرا قشقہ کلنک کا ٹیکہ — تیرا بہروپ جامۂ احرام
کر گیا چٹ وہ سر اہنسا کا — کاف لام اس کا ٹھہرا ہے اسلام

شیخ اور برہمن یہ سُن رکھیں — ہے بُرے کام کا بُرا انجام
بات اب کیا نئی ہوئی پیدا — جس پہ یوں باندھنے لگے ہو لام
مسجدیں کیا یہاں نہ تھیں پہلے — اور سنا تھا نہ چنگ و دف کا نام
یا نہ مندر رہتے اور گائے یہاں — اور جلوسوں کا بھی نہ تھا اعلام
کیا تھے ہندو ہی ہند و ہند میں سب — یا تھے سب ہی مقلدِ اسلام
ہند کے اب بھی چند حصوں میں — قوم کی ہے حکومتوں کا نظام
کسی حصے میں تو ہے ہندو راج — اور کسی میں ہے شاہیٔ اسلام
وہاں رہتی ہے کیونکہ خلق اللہ — کیونکہ کرتے ہیں سب وہاں بسرام
نہ یہ جھنجھٹ نہ خرخشے ہیں وہاں — شیخ اور برہمن ہیں باآرام
یہاں کیا آگئی ہے یہ شامت — ہوگیا ہے جو امن تم پہ حرام
کیا اسی پیسے کی ہے یہ تاثیر — قدما جس کو جانتے تھے حرام
وہ فقط اک روائتی ہے گھڑنت — اِس میں سچائی کا نہیں او غام
کس شرافت کے یہ عناصر ہیں — لاٹھی، خنجر، طمنچہ اور دشنام
کچھ سنا اور جامے سے باہر — اتنے احساس کے ہوئے ہو غلام
یہ تمہارا شعار اور اس پر — بھر کے منہ حریّت کا لینا نام
ہاں سوراج آپ کو ملے گا ضرور — جو یہی دن ہیں اور یہی صبح و شام
یہاں ہندو ہیں یا مسلماں ہیں — ہند ہندی کا اب رہا نہ مقام
وطنیت ہوئی ہے ملک بدر — گو یا شملہ سے آئے ہیں احکام
جب نہ اپنے کو سمجھیں اہلِ وطن — کہاں حبِّ وطن کرے گا قیام
خارجی بھی ہیں اس کے چند اسباب — امن کا جن سے کام ہی ہے تمام
سب سمجھتے ہیں جاننے والے — حیف پھنستے ہیں دیکھ بھال کے دام

کہتے ہیں یہ فساد کی جڑ ہے
کونسلوں کا جو ہے جدید نظام

جو نہ ہوتی موافق اس کی زمیں
کیونکہ اس جڑ کو ملتا استحکام

سردی گرمی ہمیشہ آتی ہے
اُن کو ہو ضعفِ معدہ اور زکام

جسم پہلے سے جن کے ہوں کمزور
جن کی صحت میں ہوں چھپے اسقام

نزلہ عضوِ ضعیف پر ہی گرے
یہ مثل حجتوں کا ہے اتمام

کچھ ہی اسباب اور بواعث ہوں
اُن سے ہم کو نہیں ذرا بھی کام

اب مرض کا ازالہ واجب ہے
ورنہ پھر قوم کا ہے مرگ انجام

میں کہوں گا اسے سمجھ کا پھیر
جس کو سمجھے ہو گردشِ ایام

کام کرنے کے جو ہیں گُر وہ کرو
تو زمانہ بھی ہو تمہارا غلام

ذرا قابو میں رکھو جذبوں کو
اور اپنی زبان کو دو لگام

کر چکے خون بھائیوں کا بہت
کیجئے اب تو تیغ کیں کو نیام

بند اب کیجیے یہ مہابھارت
بھائی بند آ چکے بہت سے کام

کربلا میں لہو کی نہروں سے
کی تھی کیا خوب خدمتِ اسلام

لا کے آلِ رسولؐ پر آفت
کیا سیادت کا میٹ ڈالا نام

کربلا اور کورکشیتر کو اب
دقت ہے دیجئے وداعِ دوام

خلق میں نیکی اور رواداری
ہو نمایاں تو سب مٹیں آلام

دین بھی اس سے سدھرے دنیا بھی
ہر کسی کا ہو دل دھرم کا دھام

ہاتھ اُٹھے تو بس مدد کے لئے
غم و غصہ کو دو جو دو دشنام

یہ وطیرے تھے اُن بزرگوں کے
جن کا لیتے ہو تم ادب سے نام

اب بھی سنبھلو تو کچھ نہیں بگڑا
نہیں پابندِ وقت اچھا کام

اُس کو بھولا ہوا نہیں کہتے
صبح جو جائے اور آئے شام

اس کو مانو نہ مانو ہو مختار
یہی کیفی کا ہے تمہیں پیغام

کیفی (دتاتریہ)

بےکسی میں عشق کا پیغام!

سید حسن ریاض. لکھنؤ

شنکر اور مہ جیت نے ایک ایک قدم بڑھا کر لکیر پر پیر رکھا اور شنکر نے کہا "وَن ٹو. تھری!" دونوں دوڑے۔ کوئیں کی من تک پہنچتے پہنچتے شنکر مہ جیت سے کوئی دو گز آگے ہو گیا۔ کوئیں کی من دوڑ کی حد تھی۔

شنکر نے کہا "ٹوپی اُتار دو" مہ جیت نے ٹوپی اتار لی۔ شنکر نے مہ جیت کی چاند پر چٹاخ چٹاخ تین چپتیں لگائیں۔ مہ جیت نے منہ بنا کر کہا "یار جی اتنے زور سے مارنے کی نہیں ہے" یہ شرط تھی کہ جو دوڑ میں آگے نکلے وہ تین چپتیں لگائے۔ اس طرح تین دوڑیں ہوئیں۔ تینوں دوڑوں میں شنکر ہی جیتا اور ہر دفعہ شرط پوری کی گئی۔

اس کے بعد اونچی کُدائی شروع ہوئی اور یہی شرط اس پر ہوئی۔ اس میں مہ جیت کامیاب رہا۔ تین کُدائیاں ہوئیں۔ اُس نے بھی اپنی شرط کی چپتیں وصول کیں۔

شنکر اور مہ جیت کا سن اس وقت دس دس گیارہ گیارہ برس کا تھا۔ دونوں چھوٹے چھوٹے زمینداروں کے لڑکے تھے۔ جن کے وہاں کاشت بھی ہوتی تھی۔ دوڑ اور کُدائی ختم ہونے کے بعد دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر چلے گئے۔

~~~

ایک روز صبح کو گلی ڈنڈا ہاتھ میں لئے ہوئے دونوں جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ شنکر جیب سے نکال نکال کر کچھ کھا رہا تھا۔ مہ جیت نے پوچھا۔

"ابے کیا کھا رہا ہے؟" شنکر نے مٹھی بھر کر مونگ پھلیاں نکالیں اور بولا۔ "مونگ پھلیاں ہیں" مہ جیت نے مونگ پھلیاں لے کر کہا "بس؟ اچھا جیب دکھاؤ، ہیں کتنی؟" مہ جیت نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ شنکر قہقہہ لگا کر پیچھے ہٹ گیا "ابے ہٹ. کُرتا پھٹ جائیگا، اور دیتا ہوں"

شنکر نے دونوں جیبوں سے مونگ پھلیاں نکالیں، دو تل کے لڈو نکالے، ایمانداری سے مونگ پھلیاں آدھی آدھی کیں، ایک لڈو اور آدھی مونگ پھلیاں مہ جیت کو دے دیں۔ دونوں مونگ پھلیاں اور لڈو کھاتے ہوئے آگے بڑھے۔ میدان آگیا۔ شنکر نے گلی زمین پر ڈال کر ایک ٹُلّا لگایا۔ دونوں گلی کی طرف دوڑے۔ کھیل شروع ہو گیا۔

~~~

تیرہویں برس دونوں میں فراق ہوا۔ فراق اس دنیا کا معمول: مگر پہلا فراق کھیل کے یاروں کا چھٹنا، بڑے بڑے رُوح فرسا فراقوں کا دیباچہ۔ مہ جیت کو شنکر کے جانے سے بڑی تکلیف ہوئی۔ کھیل کے یار اور بھی بہت تھے۔ مگر ان دونوں کا ساتھ ہر وقت کا ساتھ تھا۔ مہ جیت اکیلا سا ہو گیا۔ اب اس کے خاص کھیلوں اور تفریحوں کے منصوبے شنکر کی تعطیلوں پر منحصر رہنے لگے۔

شنکر جب آتا اور شہر کے اور اسکول کے قصّے سناتا، اپنے مدرسے کے دوستوں کی باتیں کرتا تو مہ جیت کو یہ پرستان کی باتیں معلوم ہوتیں۔ وہ حیرت اور استعجاب سے سنتا۔ اور اُس کے دل میں تمنّا پیدا ہوتیں "کاش میں

بھی شنکر کے ساتھ پڑھنے جاتا! کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، اچھے اچھے کپڑے وہ خیال میں ان سب کا نقشہ جاتا۔ اور اس میں اپنے آپ کو دوڑتا، بھاگتا، بٹ لگاتا اور بلک لگاتا ہوا تصور کرتا۔ چھوٹے سے دل پہ ان تفریحوں سے محرومی کا بڑا قلق تھا۔ مگر مرجیت کا باپ بہت ہی پرانی وضع کا بہت چھوٹا سا زمیندار تھا۔ بسر زمینداری کی آمدنی پر نہیں بلکہ کاشت پر تھی۔ مرجیت نے لاکھ ضدیں کیں کہ ہم بھی شنکر کے ساتھ پڑھنے جائیں گے۔ مگر باپ نے توجہ نہ کی۔

~~~~~~~~~~

جب مرجیت اور شنکر سترہ سترہ اٹھارہ اٹھارہ سال کے ہوئے تو مرجیت کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب واقع ہوا۔ وجیہ گڑھ کے زمیندار راجہ مادھو سنگھ کا انتقال ہوا۔ راجہ مادھو سنگھ بہت بڑے زمیندار تھے۔ پانچ لاکھ کا منافع۔ خزانے میں بے قیاس چاندی اور سونا۔ اُن کے ہاں کے جواہر پر بڑے بڑے امرا کو رشک تھا۔ ساٹھ برس جئے مگر اولاد کوئی نہ ہوئی۔ تین رانیاں چھوڑیں۔ وصیت نامہ جو دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ مرجیت سنگھ پسر نرپت سنگھ کو راجہ نے متبنٰی کر کے اپنا جانشین قرار دیا ہے۔

~~~~~~~~~~

مادھو سنگھ اور نرپت سنگھ ایک خاندان سے اور ایک ہی دادا کی اولاد میں تھے۔ مگر دونوں شاخیں اتنی دور سے الگ ہوئی تھیں کہ ان دونوں امیر اور غریب گھروں میں یہ رشتہ محض افسانے کے طور پر یاد رہ گیا تھا۔ نرپت سنگھ کو کبھی راجہ مادھو سنگھ سے ملنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن جب راجہ مادھو سنگھ اس جنگل میں شکار کو آتے تو مرجیت ان کے لشکریوں میں شریک ہو جاتا۔ وہ شکار کا جوش و خروش مرجیت کو بہت پسند تھا۔ بس ایک کھیل کے طور پر۔

راجہ نے اپنے آدمیوں میں اس کو اکثر دیکھا۔ خوبصورت۔ قوی ہیکل، ہنس مکھ، ایک مرتبہ راجہ نے پوچھا یہ کون لڑکا ہے۔ کسی نے بتایا کہ نرائن پور کے ٹھاکر نرپت سنگھ کا بیٹا ہے۔

راجہ نے اس کو اپنے پاس بلایا۔ مرجیت نے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ راجہ نے پوچھا "نام کیا ہے؟" اس نے کہا "مرجیت سنگھ"

راجہ نے بزرگانہ انداز سے مسکرا کر کہا "نام تو بہت اچھا ہے۔ بندوق چلانی آتی ہے؟"

مرجیت نے کہا "تھوڑی سی آتی ہے۔ میرے پاس بندوق نہیں ہے۔"

راجہ نے ذرا متانت سے کہا "تمہارے لئے بندوقیں بہت ہیں۔"

مرجیت کی سمجھ میں اس وقت اس فقرے کے معنی نہیں آئے۔ اُس نے سوچا بھی نہیں۔ اس واقعے کے بعد سے یہ دستور ہو گیا کہ مادھو سنگھ جب شکار میں آتے پہلے سے مرجیت کو اطلاع کرا دیتے۔ اور اپنے ساتھ رکھ کر اس کو شکار کھلاتے۔ مرجیت بلا تکلف اُن کی ہر بندوق استعمال کرتا۔

مگر نرپت سنگھ نے اس طرزِ عمل کو محض راجہ کی بزرگانہ دلچسپی سمجھا۔ یہ اُس کے ذہن میں کبھی نہ آیا تھا کہ راجہ مادھو سنگھ کو مرجیت اس قدر پسند ہے کہ وہ اُسے اپنا جانشین بنائیں گے۔ یہ بالکل خلافِ توقع ہوا۔

~~~~~~~~~~

جس وقت مرجیت کے گھر اطلاع پہنچی سب متحیر رہ گئے۔ حیرت اور مسرت کا اشتراک۔ سب گھبراہٹ میں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مسرت کا اظہار کس طرح کرے۔

دوپہر تک کارپردازانِ ریاست نرائن پور آ گئے اور بڑے شاندار جلوس کے ساتھ مرجیت کو وجیہ گڑھ لے گئے۔ نرپت سنگھ گاؤں کی سرحد تک بیٹے کے ساتھ گیا۔ اور ماں چھت پر چڑھ کر اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ نظر آیا۔

~~~~~~~~~~

مرجیت کی زندگی اب نئی پرواز پر شروع ہو گئی۔ اختیارات ابھی نہیں ملے۔ عمر ۲۱ سال سے کم تھی۔ علاقے کا انتظام کورٹ آف وارڈس کے سپرد ہوا۔ مرجیت کی تربیت شروع ہو گئی۔ اتالیق اور استاد مقرر ہو گئے۔ شکار، گھوڑے کی سواری، ٹینس، کرکٹ یہ روز کی تفریحات تھیں۔ دو ہزار روپیہ جیب خرچ مقرر ہوا۔

تھوڑے ہی دن میں مرجیت کا مزاج بدل گیا، عادتیں بدل گئیں۔ وجیہ گڑھ کی بڑی ریاست کو وہ اب ایسا سمجھتا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے اسی کی ہے۔ اور وہ اس کا مالک ہی پیدا ہوا ہے۔ ماں کے بڑے تقاضوں سے وہ برسوں

ہیں ایک مرتبہ نرائن پور گیا۔ اُس کو ماں کے کپڑوں میں بُو آئی۔ جھونپڑے سے گھر میں اُس کا دم گھٹا۔ پلنگ پر بیٹھنے سے قبل اُس نے دو مرتبہ اس پر ہاتھ مارا کہ گرد جھڑ جائے۔ اُس کو اپنی نشینی برجس کا خیال تھا۔ ماں نثار اور قربان ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ کم از کم ایک دن اور رات مرجیت کو ٹھہرائے۔ مگر مرجیت کو وحشت ہو رہی تھی۔ اس نے ماں سے یہ تو کہا کہ "تم میرے ساتھ دہلی چلو" مگر ٹھہرا نہیں۔ دو گھنٹے کے اندر ہی واپس چلا گیا۔

~~~

شنکر نے جب یہ سنا کہ راجہ مادھو سنگھ نے اس طرح مرجیت کو اپنا جانشین قرار دیا تو اس کو واقعی بڑی مسرت ہوئی۔ اس نے بڑے جوش سے مرجیت کو مبارکبادی کا خط لکھا اور ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔

وہ خوش ہو ہو کر اپنے دوستوں سے مرجیت کا ذکر کرتا اور فرصت کے اوقات میں یہ منصوبے باندھتا کہ پاس ہو گیا تو مرجیت کے ہاں پندرہ روز رہوں گا۔ خوب تفریح کروں گا۔ مگر اتفاق کی بات کچھ ایسی صورتیں نکلتی رہیں کہ شنکر کا وہاں جانا نہ ہوا۔ ارادہ ہی کرتے کرتے برس گزر گئے۔ شنکر مرجیت کو خطوط لکھتا تھا اور مرجیت اُن کا جواب دیدیتا تھا۔ مرجیت نے نہ کبھی شنکر کو بلایا نہ خط لکھنے میں کبھی اپنی طرف سے پیش قدمی کی۔

اس دوران میں شنکر نے یہ بھی سنا کہ مرجیت بڑا متکبر ہو گیا ہے۔ اس کا مزاج بالکل بدل گیا ہے۔ خود مرجیت کے باپ سے اس کی شکایت سنی۔ "ارے بھئی وہ تو مجھے اب اپنا باپ کہتے ہوئے شرماتا ہے۔ وہ ماں رو رو کر جان دئے دیتی ہے۔ اس کو ماں کا بھی خیال نہیں کہتا ہے کہ وجیہ گڈھ آجاؤ۔ ہم کیوں وجیہ گڈھ جانے لگے تھے۔ ہم اپنے اسی جھونپڑے میں خوش ہیں"

مرجیت کے متعلق یہ باتیں سن کر شنکر کو بڑا قلق ہوا۔ "بڑا کم ظرف نکلا، دولت آنی جانی چیز ہے۔ اس کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ دماغ ہی الٹ گیا۔ نرپت سنگھ کے گھر میں نہ پیدا ہوا ہوتا۔ تو راجہ مادھو سنگھ اس کو کیوں گود لیتے۔ ملے ذرا اُسے تو مزاج درست کروں گا"۔ اب شنکر کو بھی اس کا خیال آنے لگا کہ "میں نے بار بار وجیہ گڈھ جانے کے لئے لکھا، اتفاق سے نہ جا سکا۔ مگر اس نے اس پر بھی کبھی اتنا نہ لکھا کہ ضرور آؤ، میرا بھی ملنے کو جی چاہتا ہے۔ پھر وہ مجھے کبھی اپنی طرف سے خط بھی نہیں لکھتا"

اسی میں مرجیت کی مسند نشینی کا زمانہ بھی آ گیا۔ شنکر کو توقع تھی کہ اس موقع پر مرجیت اس کو ضرور بلائے گا۔ وہ جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ مگر شنکر کے پاس خط نہ آیا۔ اس پر شنکر کو اپنے دوستوں میں بڑی ندامت ہوئی۔ اُس نے مرجیت کو سخت شکایت کا خط لکھا۔

مرجیت نے بہت ہی مختصر جواب دیا: "اس تقریب کے اہتمام میں مجھے کوئی دخل نہیں تھا۔ منیجر ریاست نے صاحب کلکٹر کے مشورے سے جن لوگوں کو مناسب سمجھا بلا لیا"۔

~~~

اس واقعے کو بھی ایک عرصہ گزر گیا۔ شنکر کو بھی کچھ ضد سی آ گئی۔ "جب اسی کو اپنی ریاست پر اتنا غرور ہے تو مجھے بھی کیا ضرورت ہے کہ اس کے پاس دوڑتا ہوا جاؤں، کوئی اس کا محتاج ہوں۔ مادھو سنگھ نے گود نہ لیا ہوتا تو ہل جوتتا۔ کوئی ذاتی ہنر بھی ہے"

~~~

شنکر قانون پاس کر کے وکالت کرنے لگا اور فرصت کے اوقات میں کچھ پبلک کام۔ اس کو جلد سب لوگ جان گئے۔ مرجیت کے ہاں پارٹیوں اور حکام کی دعوتوں کا مشغلہ تھا وہ اس سلسلے میں مشہور ہوا۔ مگر زمیندار کی حیثیت سے لوگ اُسے جابر کہتے تھے۔ وہ اپنی ان دلچسپیوں کے اخراجات جرمانوں کی مد سے وصول کرتا تھا۔ اس لئے جرمانے خواہ مخواہ کئے جاتے تھے۔ راجہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ریاست کے ملازموں میں یہ مقابلہ رہتا تھا کہ کس کے حلقے میں جرمانوں کی رقم زیادہ وصول ہوئی۔

شنکر یہ قصے سنتا تھا اور جلتا تھا۔ "کہیں اتفاق سے مل جائے تو مرمت کروں"

~~~

ہنسیا، نرائن پور کے متصل ایک اوسط درجے کا گاؤں تھا۔ یہاں بڑی اعلیٰ ذات کے ٹھاکر آباد تھے۔ روایت یہ تھی کہ اصل مالک کسی زمانے میں وجیہ گڈھ کے یہی لوگ تھے۔ مگر اب صرف کاشتکار رہ گئے تھے۔ اور وجیہ گڈھ

کی ، مایلتے ۔ نرائن گڈھ سے ان لوگوں کے بڑے تعلقات تھے ۔

ساون کی فصل کٹ چکی تھی ۔ کسی طرح کھلیانوں میں آگ لگی ۔ کھلیان آبادی سے بالکل متصل تھے ۔ کھلیان اور ہنسیا کے تمام خس پوش مکانات جل گئے ۔ سب ہی مکانات خس پوش تھے ۔ گاؤں کے لوگ پریشان حال مرجیت کے باپ کے پاس آئے ۔ اُس روز اتفاق سے شنکر بھی نرائن پور ہی میں تھا ۔ اس کو بھی لوگوں نے گھیرا کہ راجہ صاحب سے سفارش کرکے ہمارا اس ششماہی کا لگان معاف کرادو اور تقاوی دلوادو تاکہ ہم پھر سے اپنا کاروبار شروع کرنے کے قابل ہو جائیں ۔

شنکر گاؤں کی حالت دیکھنے کے لئے خود ہنسیا گیا ۔ اس کا تو یہ کام ہی تھا ۔ واقعی سارا گاؤں تباہ ہو گیا تھا ۔ جو کپڑے تن پر تھے ان کے سوا لوگوں کے پاس کچھ نہ رہا تھا ۔ گاؤں کی عورتوں نے آکر شنکر کو گھیر لیا ۔ سب دیکھی بھالی تھیں ۔ سب سے یگانگی کے تعلقات تھے ۔ شنکر اور مرجیت ساتھ اُن کے گھروں میں کھیلے تھے ۔ اُن کی مصیبت اور بربادی کو دیکھکر شنکر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ اس نے اُن سے کہا ”مرجیت ایسا بھی کیا قصائی ہو گیا ہے ۔ وہ ضرور خیال کرے گا گاؤں کے دس پانچ آدمی پہلے اس کے پاس جائیں اور اس سے سب حال بیان کریں ، یہاں آکر گاؤں کی حالت دیکھنے پر آمادہ کریں ، پھر میں بھگت لوں گا وجہ گڈھ میں نہیں جاؤں گا“

~~~

ہنسیا کے سربرآوردہ کاشتکار وجہ گڈھ گئے ۔ دو دن پڑے رہے ۔ راجہ صاحب کے سلام کی بھی نوبت نہ آئی ۔ نائب ریاست کے ذریعے سے صرف یہ کہلوا دیا ”ہم لگان نہیں چھوڑ سکتے آگ ہم نے نہیں لگائی ہے ۔ تقاوی ہم نہیں دیں گے ۔ ریاست کے خزانہ میں روپیہ نہیں ہے “

~~~

لوگ روتے ہوئے واپس چلے آئے اور شنکر سے آکر سب حال بیان کیا ۔ شنکر غصے کے مارے سرخ ہو گیا ۔ جو گالیاں زبان پر آئیں وہ اس نے مرجیت کو دیں اور ہنسیا کے کاشتکاروں سے کہا ”تم اطمینان رکھو ۔ میں بھی تمہارا انتظام کرتا ہوں ۔

شنکر نے دو چار روز سخت محنت کی دن رات گھوڑے کی پیٹھ پر رہا قرب جوار کے با اثر لوگوں کو جمع کرکے ایک جلسہ کیا اور اُن کے سامنے ہنسیا کے لوگوں کی مصیبت کا حال بیان کیا ۔ راجہ وجہ گڈھ کی سنگدلی کا تذکرہ کیا اور بیس ہزار روپے کے چندے کی اپیل کی ۔ شنکر کو یہ کام کرنے خوب آ گئے تھے ۔ وہ تقریر بڑی اثر دار رکھتا تھا ۔ تقریر میں اثر کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ اُسے حاصل تھی ۔ یعنی اس کی زبان اس کے دل کی سچی ترجمان تھی ۔ وہ جو واقعی محسوس کرتا تھا وہی کہتا تھا ۔ اور جو کہتا تھا اس کے کرنے کا پہلے عزم کر لیتا تھا ۔ اس چندے میں سب سے پہلے شنکر نے پانسو روپے دیئے ۔ اپنی حیثیت سے بہت زیادہ ۔ اس کے بعد اوروں نے دیئے ۔ اسی جلسے میں کوئی تین ہزار روپیہ جمع ہو گیا ۔ بقیہ رقم کی تحصیل کے لئے معتبر لوگ ذمہ دار ہو گئے ۔ شنکر نے سرمایہ کی فراہمی اور اس کے خرچ کا انتظام درست رکھنے کے لئے ایک دفتر قایم کر دیا ہنسیا میں مصیبت زدوں کے لئے عارضی جھونپڑیاں ڈلوانے کا کام شروع کیا ۔ کھانے اور کپڑے کی تقسیم کے لئے ہنسیا میں ایک بھنڈار قایم کیا ۔ ہنسیا کے جتنے نوجوان تھے شنکر کی نگرانی میں رضاکارانہ خدمت انجام دینے لگے ۔ نرائن پور کے نوجوان بھی اُن کا ہاتھ بٹانے کے لئے آ گئے ۔ شنکر نے خود اپنے لئے بھی وہیں ہنسیا میں ایک جھونپڑی ڈلوائی ، وہیں رہنے لگا ۔ اپنے پیشے کا کام بھی سردست ترک کر دیا ۔

اس دوران میں شنکر کلکٹر ضلع سے بھی ملا ۔ اس نے ہنسیا کی بربادی کا اور مرجیت کی سختی کا اس سے ایسے موثر انداز میں ذکر کیا کہ کلکٹر نے خود بنفس نفیس گاؤں کی حالت دیکھنے کے لئے آنے کا وعدہ کیا ۔ اور راجہ وجہ گڈھ کو بھی لکھدیا کہ تاریخ مقررہ پر وہ ہنسیا آ جائیں ۔

اب راجہ صاحب کیوں نہ تشریف لاتے ! ریاست کی طرف سے خیمے ڈیرے ۔ رسد ، کلکٹر کے لئے ہر قسم کی راحت کا انتظام ہو گیا ۔ شنکر وہیں موجود تھا جس وقت صاحب کلکٹر اور مرجیت گھوڑوں پر سوار آئے ۔ شنکر ہنسیا کے لوگوں کو لے کر اُن کے استقبال کے لئے جھونپڑیوں کے عارضی کیمپ سے باہر نکلا اُس نے بڑھ کر کلکٹر سے ہاتھ ملایا ۔ اور پھر مرجیت کی طرف مڑ کر طعن سے بولا ۔ ”راجہ صاحب مزاج اچھا ہے ۔ یہ آپ نے کیسے تکلیف فرمائی “

مرجیت شنکر کے یہ بُرے تیور دیکھکر سہم گیا ۔ شاید مرجیت اس وقت

اس سے بڑی خصوصیت سے ملتا۔ مگر شنکر ہی نے اعتنا نہ کیا۔ وہ صرف کلکٹر سے مخاطب رہا۔

گاؤں کی حالت کا مفصل معائنہ کرانے کے بعد اس نے نقصانات کی وہ فہرست پڑھنی شروع کی جو اس نے بڑی احتیاط سے بنائی تھی۔ ایک گاؤں کے لئے وہ بہت بڑا نقصان تھا۔ اس نقصان کی مقدار کم ہو یا زیادہ حالت اب یہ تھی کہ کسی کے پاس ایک وقت کے لئے کھانے کو نہ تھا۔ اور دوسرا کپڑا بدلنے کو نہ تھا۔ گاؤں کے مویشی بھی اکثر آگ سے مر گئے تھے۔

رپورٹ پڑھنے کے بعد شنکر نے صاحب کلکٹر سے کہا "یہ گاؤں راجہ صاحب وجہہ گڈھ کی زمینداری میں ہے۔ یہ لوگ اُن کی رعایا ہیں۔ لہٰذا میں ان کی طرف سے اور اُن کا نمائندہ بن کر کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ لیکن عوام کے خادم اور اُن کا پڑوسی ہونے کی بنا پر مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ یہ لوگ بالکل تباہ ہو گئے ہیں اور اس امداد کے ساتھ جو میں اپنے اور اُن کے ہمسایوں کی فیاضی سے اُن کے لئے حاصل کر سکا ہوں۔ یہ لوگ بمشکل تین برس میں اپنے کاروبار کو بحال کرنے کے قابل ہوں گے اور وہ بھی اس صورت سے کہ گورنمنٹ سے ان کو بقدر ضرورت تقاوی ملے۔ راجہ صاحب وجہہ گڈھ جو آپ کے برابر کھڑے ہیں، کسی قسم کی امداد دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ انکار کر چکے ہیں۔ حالانکہ خصوصیت سے اس گاؤں کے ان پر بڑے حقوق ہیں۔ ان کا وطن یہ نرائن پور ہے، جہاں کا میں رہنے والا ہوں۔ میرا اور ان کا بچپن ساتھ گذرا ہے۔ اس مجمع میں اکثر مرد اور عورتیں وہ ہیں جو ہمارے ساتھ کھیلے ہیں۔ یہاں وہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں بھی موجود ہیں، جنھوں نے مجھ پر اور ان راجہ صاحب پر، جب یہ صرف مرجیت اور نرائن پور کے ٹھاکر نرپت سنگھ کے بیٹے تھے۔ جو اب تک کاشتکاری کرتے ہیں اور جنھیں اب بھی اپنے ہاتھ سے ہل چلانے میں عار نہیں ہے شفقتیں کی ہیں۔ نہیں، جنھوں نے ہماری طفلانہ شرارتوں پر ہمارے کان بھی کھینچے ہیں۔ جب دوپہر کو ہمیں یہاں کھیل میں دیر ہو جاتی۔ یا دوپہر کو آتے اور ہمیں یہیں تیسرا پہر ہوتا تو ہم ان کے ہاں دودھ نہ مٹھا اور جوار کی روٹیاں کھاتے تھے"۔ اس موقع پر مرجیت کی طرف دیکھ کر شنکر نے بے ساختہ کہا "کیوں راجہ صاحب یاد ہے نا" مرجیت کے لبوں کو حرکت ہوئی، مگر آواز نہ نکلی شنکر نے مسکرا کر پھر بولنا شروع کیا۔ ہنسیا کے لوگوں کی گذشتہ خوش حالی، مرجیت کے خاندان سے ان کے تعلقات ایک ایک بات اُس نے تفصیل سے بیان کی۔ کچھ مرجیت کی مخالفت سے نہیں بلکہ اہلِ ہنسیا کی مصیبت سے وہ متاثر ہی اس قدر تھا کہ یہ سب باتیں از خود اس کی زبان سے نکل رہی تھیں گاؤں کے نوجوان منہ پھیر پھیر کر ہنس رہے تھے، بوڑھے رو رہے تھے اور شنکر بکتا ہی چلا جاتا تھا۔

شنکر خاموش ہوا تو گاؤں والوں نے کلکٹر کے پیر پکڑ لئے۔ کلکٹر شنکر کی تقریر ہی سے کافی متاثر تھا۔ اس نے ایک سال کا پورا اور ایک سال کا نصف لگان معاف کر دیا۔ اور تقاوی دینے کا وعدہ کر لیا۔

مرجیت اور کلکٹر گھوڑوں پر سوار ہو کر چلے گئے اور ہنسیا کے مرد اور عورتوں نے شنکر کی جے کا نعرہ مارا۔

~~~~~~~~~~

سورج غروب ہو چکا تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگے۔ شنکر یہ دیکھنے کے لئے رات کے کھانے کا انتظام رضاکاروں نے ابھی کیا یا نہیں ان جھونپڑیوں کی طرف چلا، جہاں اُس نے سامان خوراک کا بھنڈار قایم کیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک جوان لڑکی اپنے دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی ایک طرف تنہا جا رہی ہے۔ چال ڈھال سے شناسا معلوم ہوئی وہ بڑھکر اس کے قریب گیا۔ "کون سرلا"، اُس نے مڑ کر دیکھا۔ سرلا ہی تھی۔ شنکر نے نرمی سے کہا "کیوں؟ رو کیوں رہی ہے؟"

سرلا نے کہا "شنکر تم نے دیکھا میں مرجیت کے پاس گئی وہ منہ سے بھی نہ بولا۔ اس نے میری طرف سے دور سے پیٹھ پھیر لی۔ میں کیا اس سے کچھ مانگنے گئی تھی؟"

شنکر کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ یہ سادہ الفاظ، مگر ان آنسوؤں کے ساتھ جو واقعی سرلا کے دل کا خون تھے۔ ایک نوحہ بن گئے۔ شنکر کو یاد آگیا۔ مرجیت نے اپنے عہدِ دہقانیت میں اس سے ذکر کیا تھا۔

شنکر آگے بڑھا اور برادرانہ شفقت سے وہ سرلا کے کاندھے پر ہاتھ رکھکر بولا "باؤلی یہ وہ مرجیت نہیں ہے، اب تو وہ راجہ ہے۔ امیر اور غریب کی کیا محبت تو ابھی اُنھیں باتوں کو ڈھونڈھ رہی ہے"

سرلا اور بھی بے قرار ہو کر رونے لگی۔ شنکر کی شفقت آمیز تشفیوں سے
~~~~~~~~~~

اس کا دل بھر آیا۔ شنکر نے جیب سے رومال نکال کر سرلا کے آنسو پونچھے اور
س کو تسکین دینے لگا۔

مرجیت کی طرح شنکر بھی بچپن میں سرلا کے ساتھ کھیلتا تھا۔ مرجیت
اور شنکر جب بنسیا آتے تو سرلا سارے سارے دن انھیں کے ساتھ رہتی۔
تینوں کمسن تھے۔ سرلا کی عمر ان دونوں سے بھی کم تھی۔ مرجیت اور شنکر کی
سب سے زیادہ خاطر سرلا ہی کے وہاں ہوتی تھی۔ سرلا کا باپ متمول کاشتکار
تھا۔ شنکر اور مرجیت کے خاندان سے اس کے بڑے تعلقات تھے۔ راٹھور
ٹھاکر تھا۔ نرائن پور کے ٹھاکروں سے بھی ذات میں اونچا۔ سرلا نے بڑی
بے کسی سے کہا "شنکر اب ہم کیا کریں گے۔ باپ نے سات ہزار روپے کے
نوٹ چھوڑے تھے وہ سب جل گئے" یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

سرلا بڑی خوبصورت اور بڑی تندرست تھی۔ کھلتا ہوا
گندمی رنگ۔ کچھ سنہری سا۔ بڑی سیاہ ہرنی کی سی آنکھیں، اونچی پیشانی، کمان
ی بھویں۔ لمبی خمدار پلکیں۔ کچھ قدرتی کاجل سا لگا ہوا۔ اب جو ہر دفعہ ہاتھ اونچا
ر کرکے اس نے بار بار آنسو پونچھے تو شانے سے کلائی تک شنکر نے اس کے
ہاتھ کو استعجاب سے دیکھا۔ کس قدر خوبصورت۔ گداز، سڈول۔ کسا ہوا۔ شنکر
نے اب سر سے پیر تک اس پر ایک نظر ڈالی۔ وہ تو ایک پیکرِ زیبا تھا۔ جسے دیکھنے
کو مصور اور صنم ساز تمنا کریں۔

شنکر نے سرلا کو پہلے بھی بارہا دیکھا تھا مگر اس وقت نہ شنکر کا دل
بیدار تھا اور نہ سرلا کا حسن۔ یہاں آنکھیں نہ تھیں وہاں یہ رنگینیاں نہ تھیں۔
بچپن کی آنکھوں سے ایک کھیل کے رفیق کے سوا شنکر کو اور کچھ نظر نہ آیا تھا۔ تیرہ
ں برس کا تو سن تھا جو شنکر پڑھنے چلا گیا اور سرلا اس وقت ۹ برس کی تھی۔
تنے دن کے بعد آج دیکھا۔ شنکر کے دل میں عشق چونک پڑا۔ سرلا کے لاابالی
سن نے اُسے اچانک جگا دیا۔ شنکر نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا "سرلا تو مرجیت
سے اُس کی بے مروتی کا بدلہ لے گی؟"

سرلا نے آنکھیں پھاڑ کر شنکر کی طرف دیکھا "میں! مرجیت سے بدلا
لوں گی؟ کیس برتنے پر، وہ راجہ، میں اُس کے رعیت کسان کی بیٹی، اور اب تو
وہ کنی بھی نہ رہی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے آنسو امنڈ کر آئے۔

ایک ہاتھ سرلا کے گلے میں ڈال کر شنکر نے دوسرے ہاتھ سے اُس کے
پھر آنسو پونچھے۔ اور بولا "سرلا میں جو ہوں"
سرلا نے شنکر کے کاندھے پر سر رکھ دیا اور دونوں ہاتھ گلے میں ڈال
دیئے۔ مگر سادگی سے، اپنی مصیبت میں اُس کو شنکر کے جذبات سمجھنے کی بالکل
فرصت نہ تھی مصیبت زدہ کا ہاتھ محسن کے گلے میں۔ اُجڑی ہوئی۔ بے کس و ناچار
سرلا کا سر بچپن کے رفیق شنکر کے کاندھے پر۔ ہچکیاں اور سسکیاں لے کر اس نے
شکستہ آواز میں کہا "تو اکیلا کس کس کی مصیبت ٹالے گا۔ اور کہاں تک"
شنکر نے سرلا کے نرم پریشان بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر کمر کو
تھپک کر بولا "نہیں سرلا میں تیرا ساتھ دوں گا اور آخر دم تک"
سرلا ابھی یوں ہی اُس کے گلے سے لپٹی ہوئی رو رہی تھی۔ شنکر نے دونوں
ہاتھ اس کے گرد حلقہ کئے۔ آہستہ سے دبایا اور یہ کہہ کر چلنے لگا "آ اب بڑھیا
کی خبر لیں، وہ اکیلی جانے کس حال میں ہوگی"
سرلا جو اب تک نہ سمجھی تھی، شنکر کی اس ایک حرکت سے سمجھ گئی۔ اُس کے
دل کی دنیا پھر آباد ہونے لگی۔ اس کے جذبات میں ایک خوش گوار تحریک پیدا ہوئی۔
اور بڑھ کر وہ طغیانی اور طلاطم بننے لگی۔ وہ لڑکپن کا خیال تھا اور یہ جوانی کا میلان
ہے اس نے آج ہی شام دونوں کو بالمقابل دیکھا تھا۔ شنکر مرجیت سے زیادہ
خوش رو، وجیہہ اور رعنا معلوم ہو رہا تھا اور واقعی تھا بھی۔ وہ پانچ فٹ گیارہ انچ
کا قد، چھریرا جسم۔ دھوپ سا گورا رنگ، فاتحانہ چتونیں، وہ ایک مرتبہ جوشِ تقریر میں
گھنی چوڑی بل کھائی ہوئی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر مردانہ اعتماد سے صاحب کلکٹر
سے یہ کہہ دیتا تھا "میں آپ کو آپ کے فرض کی طرف متوجہ کر رہا ہوں ورنہ یہ نہیں ہے
کہ سرکاری امداد بغیر بنسیا پھر آباد نہ ہوگا۔ اور ان لوگوں کی حالت بحال نہ ہوگی"
وہ لوگوں کی مصائب اور پریشانی کا ذکر کرتے وقت اس کی آنکھوں کا نم ہو جانا،
سرلا کچھ اور طرح پہلے ہی شنکر سے متاثر تھی اب جو اسی کی طرف سے پیغامِ عشق ملا تو
اُس کے دل میں ایک اُمنگ پیدا ہو گئی۔
وہ شنکر کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی اگر اس وقت شنکر پلٹ کر دیکھتا تو دل پکڑ لیتا
وہ جوان ہتھنی کی طرح جھک جھک، جھک جھک جھوم جھوم کر چل رہی تھی۔
"میں جو ہوں! میں تیرا ساتھ دوں گا۔ آخر دم تک" یہ جملے اس کو یاد آئے،
کانوں میں گونجنے لگے۔ ان میں ساون کے ملہار کا سا لوچ اور اثر پیدا ہو گیا۔

طوفانِ شہر

پھر حسنِ یار مائلِ اظہار ہو گیا
ہر ذرہ ایک مصر کا بازار ہو گیا

پھر زلف یوں کھلی کہ دل و دیدۂ جہاں
زنجیرِ رنگ و بو میں گرفتار ہو گیا

خوابیدہ بختیوں کا ستایا ہوا فراق
پھر روشناسِ دولتِ بیدار ہو گیا

پھر جلوۂ نگار بنا میرِ انجمن
پھر حسنِ یار قافلہ سالار ہو گیا

پھر موتیوں کو گوشِ نگار رولنے لگا
پھر لعلِ گل فروشِ گہربار ہو گیا

پھر تابشِ تبسمِ جاناں کے سامنے
کھلنا کلی کو باغ میں دشوار ہو گیا

پھر کم نگاہیوں کو ملی رخصتِ نظر
پھر نازِ التفات پہ طیار ہو گیا

پھر تولنے لگا خمِ گردوں متاعِ ناز
پھر لوچ شاخِ نرم کا تلوار ہو گیا

وہ خونِ دل کہ سرد تھا نبضِ حیات میں
پھر آشنائے گرمیٔ رفتار ہو گیا

خلوت سے انجمن میں در آتے ہیں وہ نگار
طوفانِ شہر فتنۂ بازار ہو گیا

آواز دو کہ جوشؔ بہ فیضِ شرابِ ناب
ساقی کی مرحمت کا سزاوار ہو گیا

جوش ملیح آبادی

ہندوستانی!

دیوانہ مصطفیٰ آبادی

ایک خوبصورتی ہے کہ پژمردہ، اک شباب ہے کہ مضمحل، اک جوانی ہے کہ ڈھلی ہوئی۔

یہ ہے اس ہندی جوان کا سراپائے حیات، جو اپنے شاندار ماضی کے روشن کارناموں اور فتح یابیوں کے تصور بے ضرورت پر اشک بہاتا ہے اور جو حال کی کلفتوں اور مصیبتوں کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرنے سے اک بزدل کی طرح ہچکچاتا ہے جس نے اپنے مستقبل کو تابناک بنانے کے بجائے اس کو اپنی تدبیروں اور سعیِ پیہم سے بے نیاز کرکے تقدیر بے سعی کے ہاتھوں میں چھوڑ رکھا ہے۔

وہ فکرِ بلند اور علوئے تخیل سے بے پروا؛ اظہار بیان کی آزادی کی خاطر بھی کچھ نہیں کرتا۔ ہاں مذہب کے اپنے ہی بنائے اور تبدیل کردینے والے راستوں پر دوسروں کو زبردستی چلانے کے لئے ان سے لڑنے اور اُن کا خون بہانے سے بھی اس کو دریغ نہیں ہوتا۔ اس کے خیالات اپنی ہی تنگ تاریکیوں تک محدود ہیں یا کردئے جاتے ہیں۔

اپنے ہی ملکی بھائیوں کی کاٹ کرنا اُسے آتا ہے لیکن سماج میں اک طرح نو ڈالنے کی اُسے جرأت نہیں ہوتی۔

~~~~~~~~~~~~~~~

نزاکتِ مجسم، حسن و رعنائی، ناز و محبوبی کا اک پیکرِ لطیف، اپنے برق پاش مسکراہٹوں سے کائنات کو جگمگا دینے والا مظہرِ جمیل!

یہ ہے اک دوشیزۂ ہند کی شانِ جمیل، جو محدود چار دیواریوں میں اپنے شباب و جوانی کے تلخ گھونٹ پی پی کر زندہ رہتی ہے۔ اور جو خواہشات نفسانی میں جکڑے ہوئے مرد کے فریبِ محبت میں پھنس کر اپنی تمام کائنات اس کو سونپ دیتی ہے۔ لیکن عیاش دیوتا اس وقت اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ جب دیوی کے چرنوں میں اس کے لئے کوئی سامان دلبستگی نہیں رہتا۔ جب اس کی قندیلِ شباب بجھنے کو ہوتی ہے، جب اُس کی شمعِ حسن و جوانی کی لو تھرا رہی ہوتی ہے تو یہ مرد دیوتا اس سے اس طرح دور بھاگتے ہیں جیسے اس کی آتشیں لپٹیں اُن کو جلا کر بھسم کردیں گی، اس لئے اور بھی کہ انھیں پروانہ وار نثار ہونا نہیں آتا ہے، یا وہ ایسا ہونا نہیں چاہتے۔

وہ سب کچھ دیکھتی ہے لیکن اس سے کہا کچھ نہیں جاتا۔ اس کی روح روتی ہے لیکن اس کے لبوں پر تبسم کھیلا کرتا ہے۔ وہ قدامت پسند ہے تنگ نظر بھی، دربیر رسموں میں اتنی محصور، بارِ قرض سے اتنی مقہور، بارِ قرض سے گراں بار کہ حقیقی مسرت اس کو کبھی حاصل نہیں ہوتی، یہاں تک کہ وہ کامرانیوں و شادکامیوں کے خواب دیکھتے دیکھتے آخری نیند سو جاتی ہے۔ اس کی توقعات کبھی پوری نہیں ہوا کرتیں۔

رشک و حسد کی آگ میں جلتے رہنا اُسے آتا ہے، لیکن اپنی حالت کو سدھارنے کی کبھی اس کو توفیق نہیں ہوتی۔

~~~~~~~~~~~~~~~

چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے جسم مردہ میں اک روحِ زندہ کا مالک، ہڈیوں کا ڈھانچہ لیکن انقلاب کا ڈھانچہ، لیکن انقلاب کا حامی، عالم انسانیت کا اک فرد بلند ترین لیکن سرمایہ دار کا مظلوم شکار۔

یہ ہے اک ہندی مزدور کا خاکہ، جو مشین کی طرح دن بھر گردش میں رہتا ہے اور مجبور ہے اس وحشیانہ سلوک کے لئے جو جانوروں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے منہ میں زبان ہے جواب قدرے گفتگو کی عادی ہو چلی ہے اور وہ اپنے حقوق کی نگہبانی پر مصر ہے۔ ہڑتال اس کا بہترین ہتھیار ہے۔ لیکن بعض اوقات اس کا وار بھی اوچھا پڑتا ہے اور یہ خود ہی شکار ہو جاتا ہے کہ ابھی اس کی تیز اندازی عالم طفلی میں ہے۔ لیکن مفکر جانتے ہیں اک روز یہی ننگِ انسانیت اُٹھے گا انقلاب کا پرچم لئے ہوئے، اور دنیا کو دکھا دے گا کہ آزادی یوں حاصل کرتے ہیں ——— عورت بیدار ہو چکی، مزدور بیدار ہو رہا ہے، اور وہ وقت بہت جلد آنیوالا ہے جب یہ دونوں مل کر ہندوستان کو بیداری اور آزادی سے ہمکنار کرکے چھوڑیں گے۔۔

ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے میں بیکاری

عبدالرحیم شبلی - بی - کام

ہندوستان میں بیکاری دو قسم کی ہے۔ ایک وہ جو زراعت پیشہ لوگوں کے اندر پائی جاتی ہے اور دوسری وہ جو متوسط تعلیم یافتہ طبقے یا غیر تعلیم یافتہ دستکاروں اور مزدوروں وغیرہ کو درپیش ہے، جو بیکاری زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان پائی جاتی ہے اُس کی وجہ زیادہ تر مونسونوں کی بے قاعدگی ہے اور کچھ پیشۂ زراعت کی نوعیت جو زمینداروں کو سال کے بارہ مہینہ میں سے چھ مہینے بیکار رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ مثلاً جب ایک دفعہ فصل بو دی جاتی ہے تو پھر اُس کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لئے بیکار کھیتوں کے کنارے پر بیٹھ رہنا پڑتا ہے۔ پھر بعض مہینے سال میں ایسے آتے ہیں جب کیسی بھی فصل کے بونے کا موسم نہیں ہوتا۔ یہ وقت بھی زمیندار مقدمہ بازی اور مذموم رسومات کی ادائیگی میں صرف کر دیتے ہیں جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ ماہرین اقتصادیات کے نزدیک اس موسمی بیکاری کا علاج یہ ہے کہ زمیندار اپنا وقت گھریلو مصنوعات کی ترقی اور اُن کے فروغ میں صرف کریں۔

دوسری قسم کی بیکاری وہ ہے جو متوسط تعلیم یافتہ طبقہ یا غیر تعلیم یافتہ مزدوروں اور دستکاروں وغیرہ کے اندر پائی جاتی ہے، اس میں سے مزدوروں اور دستکاروں کی بے روزگاری کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتی۔ اس لئے ہم اُس پر فی الحال کوئی بحث کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ متوسط تعلیمیافتہ طبقے کی بے کاری ہمارا اصلی موضوع ہے۔ اس کی اہمیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اور مسئلہ خطرناک صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

متوسط تعلیم یافتہ طبقے کا مفہوم

بظاہر متوسط اور تعلیم یافتہ طبقہ، نہایت آسان اور عام فہم الفاظ ہیں لیکن اُن کی منطقی تعریفیں کرنی آسان کام نہیں۔ یہ تاہم اظہر من الشمس ہے کہ اگر "تعلیم یافتہ" کے اہرن پر پرکھا جائے تو ہمیں غیر تعلیم یافتہ دستکاروں اور ہوشیار اور متمول زمینداروں کو اپنی بحث سے خارج کر دینا پڑے گا۔ اسی طرح "متوسط طبقہ" کی عام اصطلاح کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں لازم ہوگا کہ ہم خوشحال دستکاروں اور امیر زمینداروں کو اپنی بحث میں نہ لائیں۔ مگر ہم تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ یا متوسط اور غیر متوسط طبقات میں کوئی صریح اور قاطع فرق نہیں بتا سکتے۔ بمبئی اور مدراس کی تفتیشی کمیٹیوں نے تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کا اطلاق ایسے لوگوں پر کیا ہے جو اتنے امیر نہیں ہیں، یا یوں کہئے کہ اُن کی اپنی جائداد اس قدر نہیں ہے کہ وہ اپنی ملازمت یا کاروبار چھوڑ کر با فراغت بیٹھ کر کھائیں۔

اور اُن کو کسی قسم کی ثانوی یا اعلیٰ تعلیم بھی میسر نہیں ہے۔ مادری زبان جاننے والوں کو بمبئی کمیٹی نے خارج از بحث قرار دیا ہے کیونکہ اُس کے خیال میں مسئلہ زیادہ تر انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں کے درمیان خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے۔ نیز چھوٹی چھوٹی تجارتوں یا دوکانوں پر کام کرنے والوں کے مسائل بیان کرنا اور اُن تک پہنچنا بھی سخت مشکل کام ہے۔ بہرحال پنجاب کی کمیٹی نے اینگلو ورنیکلر یا مکمل مادری زبان کے جاننے والوں کو بھی اپنی بحث میں شامل کر لیا ہے۔

بہرحال اس مضمون میں متوسط تعلیم یافتہ طبقہ ہم اُس جماعت کو قرار دیں گے جو نہ بہت امیر ہے اور نہ بہت غریب۔ اور جس نے ایک معیارِ معینہ تک تعلیم حاصل کی ہے زیادہ تر ہمارے مدِنظر میٹرک ایف اے اور بی اے پاس نوجوان ہوں گے کیونکہ وہ کالج میں پڑھنے کے اہل ہونے کی وجہ سے متوسط طبقہ بھی ہیں اور زیادہ تر یہی لوگ روزگار کے متلاشی نظر آتے ہیں۔

بے روزگاری کی انتہا

جنگِ عظیم کے بعد بے روزگاری کا مسئلہ خطرناک صورت اختیار کر گیا اس لئے گورنمنٹ نے مختلف مقامات پر مسئلہ بیکاری کی تحقیقات کے لئے مجالس قایم کیں جن کی رپورٹوں کا مطالعہ اس مسئلہ کی بخوبی وضاحت کرتا ہے۔

مدراس کمیٹی نے لکھا ہے کہ متلاشیٔ روزگار تعلیم یافتہ طبقہ اعداُن کے لئے مطالبہ کے درمیان قریباً دو اور ایک کی نسبت ہے۔ یعنی اگر ملازمت ایک ہے تو اُس کے مانگنے والے دو ہیں۔ پھر اُس کی رائے میں ہر تین طلبہ میں سے دو نوکری کے خواہشمند ہوتے ہیں اور صرف ایک تجارت یا کسی ہنر میں لگنا چاہتا ہے ایک دوسری تحقیقات کی رُو سے اُس کے خیال میں سو فیصدی طلبہ نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں۔

پنجاب کمیٹی ۱۹۲۷ء بھی اسی نتیجہ پر پہنچی ہے اُس نے معلوم کیا ہے کہ جہاں ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۷ء کے درمیان اینگلو ورنیکلر اسکولوں اور کالجوں کی پیداوار دوگنی سے زائد ہوگئی ہے وہاں گورنمنٹ کے محکموں یا پرائیویٹ تجارتی اداروں میں روزگار کی اسی تناسب سے ترقی نہیں ہوئی۔

ان تفتیشات کے باوجود ہمارے پاس کوئی صحیح اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جن کی مدد سے ہم بے روزگاری کی اصلی انتہا معلوم کر سکیں ۱۹۳۱ء کی مردم شماری سے گورنمنٹ نے ایک اور خانہ کا اضافہ کیا ہے۔ جس میں بیس سے چالیس برس کی عمر تک تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد درج کی جایا کرے گی۔

بعض مصنفین نے اشتہاروں کے جواب میں عرضیوں کی تعداد سے بیکاری کی انتہا معلوم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ طریق بھی قطعی نہیں کیونکہ بہت ممکن ہے کہ بعض ایسے لوگ بھی عرضی بھجوا دیں جو پہلے ملازم تو ہیں لیکن وہ اپنا مستقبل زیادہ شاندار بنانا چاہتے ہیں پھر قدرتی طور پر حکومت کی ملازمت کے لئے زیادہ عرضیاں بھیجی جاتی ہیں بہ نسبت پرائیویٹ اداروں کے لئے۔ کیونکہ گورنمنٹ کی نوکری میں استقرار کی وجہ سے حفاظت زیادہ ہے۔ پھر رجحانات مختلف ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ایک گریجویٹ جس کی ذہنیت CLERICAL و منشیانہ ہو کسی چالیس پچاس روپے کی نوکری کے لئے عرضی بھیج دے اور ایک دوسرا نوجوان بی اے کسی ایسے اشتہار کا انتظار کرے جس میں ٹیچر یا ایڈیٹر کی ضرورت ہو۔

ان تمام باتوں کے باوجود مدراس کمیٹی نے اس کا تجربہ دو اشتہار ایک ۵۳ روپے کی آسامی کے لئے پی ڈبلیو ڈی کی طرف سے اور دوسرا ایک تجارتی ادارہ کی طرف سے دے کر کیا جس کے نتیجہ میں ۷۸۰ اور ۶۶۶ عرضیاں علی الترتیب موصول ہوئیں۔

اسی طرح حال ہی میں ریزرو بنک آف انڈیا کے لئے اسّی محرروں کی ضرورت تھی جس کے لئے تقریباً دس ہزار عرضیاں وصول ہوئیں۔

معمولی کانسٹیبل بھرتی ہونے کے لئے پان پانسو عرضیاں آجاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ملک میں ایک کثیر حصہ نوجوانوں کا کسی معقول روزگار کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

طبقۂ متأثرہ

ہمارے لئے یہ بھی دیکھنا ضروری ہوگا کہ کونسا طبقہ زیادہ تر بیکار رہتا ہے۔ بمبئی کمیٹی کی رائے میں عمروں کے لحاظ سے زیادہ تر ستائیس سال کے نیچے عمروں والے نوجوان بیکار ہوتے ہیں۔ میرا اپنا قیاس یہ ہے کہ ۲۴ سال سے اوپر کے نوجوان ضرور بیکار ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس عمر کے بعد گورنمنٹ کے محکموں میں اُنکی بھرتی کا امکان بالکل جاتا رہتا ہے۔ پرائیویٹ اداروں کی ملازمت اُن کے نزدیک

قابلِ قبول نہیں ہوتی اور اپنے پاس اس قدر سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ کوئی کاروبار شروع کر دیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بوجہ کسی بھاری شورش کے کسی اعلیٰ کام پر لگ جائیں جہاں عمر کا خیال نہ ہو۔ لیکن بالعموم وہ اِدھر اُدھر متحیّر نظر آتے ہیں۔

بمبئی کمیٹی نے علاقۂ بمبئی کے بے روزگار نوجوانوں کی تعلیم کے متعلق بعض دلچسپ حقائق درج کئے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتی ہے کہ جملہ بیکاروں میں سے ۴۸٫۶۰ فیصدی نوجوانوں نے دسویں جماعت بھی پاس نہیں کی تھی ۱۳٫۶۲ فیصدی نے دسویں یا اس کے برابر کوئی امتحان پاس کرلیا تھا۔ ۴٫۹۵ فیصدی ایف اے پاس تھے ۷٫۵۷ فیصدی گریجویٹ تھے ۵٫۰۸ فیصدی کو ٹائپ آتا تھا۔ ۱۱٫۷۳ فیصدی کو مختصر نویسی میں مہارت تھی۔ باقی قریباً ۳۶٫۹۵ فیصدی لوگ ایسے تھے جن کے پاس یا تو کوئی قابلیت نہ تھی اور یا ادھوری خصوصیات کے حامل تھے۔

اسی طرح پیشوں کے لحاظ سے اندازہ کیا گیا ہے کہ سند یافتہ کی نسبت غیر سند یافتہ ٹیچروں میں زیادہ بیکاری ہے۔ وکالت کا پیشہ بلاشبہ ہر دل عزیز نہیں رہا کیونکہ اب وکیلوں کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے اور لوگ بھی ہوشیار ہوگئے ہیں وہ مقدمات کے لئے زیادہ روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ڈاکٹروں کی تعداد شہروں میں زیادہ ہوگئی ہے مگر دیہاتوں میں اُن کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن اعلیٰ ڈگریوں والے تعلیم یافتہ ڈاکٹر دیہات میں جاکر اپنا معیارِ زندگی پست کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ جب تک کہ اُن کو باقاعدہ گورنمنٹ کی طرف سے معقول تنخواہ پر نہ بھیجا جائے۔

انجینیروں میں بے روزگاری نسبتاً کم ہے اور جو تھوڑی بہت تھی وہ بھی کوئٹہ اور بہار کے زلزلوں کی وجہ سے بہت حد تک دُور ہوچکی ہے۔ بنکوں انشورنش کمپنیوں اور دیگر تجارتی فرموں میں تجربہ کار آدمیوں کے سوا گذارا نہیں۔ اس لئے جن لوگوں نے حساب کتاب ٹائپ اور اکاؤنٹسی وغیرہ کی تعلیم حاصل کی ہے وہ بھی بیکار رہتے ہیں۔ گورنمنٹ کی ملازمت کے لئے عمر کی روک ہے۔ دوسرے ٹائپ کا جاننا بھی لازمی ہے۔ تیسرے کم درجہ کے امتحان کے لئے زیادہ تر ایم اے۔ بی اے مقابلہ کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے میٹرک کے لئے میدانِ ترقی بالکل مسدود ہے۔

تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے کسی

تعلیم حاصل کرنے کے بعد یورپ میں کم و بیش سولہ ہزار پیشے ہیں جہاں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کھپت ہوسکتی ہے۔ لیکن شومیٔ قسمت سے ہندوستان میں صرف چالیس ہیں۔ (ڈراؤ نگور رپورٹ)۔ ان چالیس میں سے بھی اکثر ایسے ہیں جہاں ہر ایک کے لئے ترقی کا میدان نہیں۔ مثلاً ٹیچری۔ انجنیئرنگ۔ جرنلزم وغیرہ۔ یہاں صرف خاص خصوصیات کے مالک کھپ سکتے ہیں۔ صرف دو پیشے ایسے ہیں جہاں ایک اوسط درجہ کی خصوصیات کا مالک کوشش کرسکتا ہے۔ تجارت یا محرّری۔

تجارت کے لئے سرمایہ اور کاروباری ذہنیت کا ہونا لازمی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک ایسے شخص کے پاس کافی سرمایہ ہو، لیکن وہ تجارتی ذہنیت کا مالک نہ ہو۔ اسی طرح بعض آدمی تجارتی شغف رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہوتا۔

محرّری کے لئے تجربہ ضروری ہے اور یہ حاصل کرنے کے لئے انسان کے پاس اتنا روپیہ ہونا چاہئیے کہ وہ کسی مشہور فرم میں جاکر مفت ٹریننگ حاصل کرے یا کم از کم ٹائپ اور شارٹ ہینڈ ہی سیکھ لے۔ لیکن جس غریب نے وظیفہ لے کر میٹرک یا ایف اے کیا ہو یا جس کے ماں باپ نے پہلے ہی قرض لے کر اِتنا پڑھایا ہو اُس کے لئے کب ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ چھ مہینے یا ایک سال شہر میں رہنے کے لئے چالیس پچاس روپے ماہوار مزید خرچ کرے۔

پھر محرّری گورنمنٹ کے محکمہ جات میں مل سکتی ہے۔ لیکن وہاں بھی مقابلہ ہے اور مقابلہ بھی بی اے اور ایم اے پاس امیدواروں سے۔ پہلے تو داخلہ ہی بہت ہے اور پھر دو دو ہزار آدمیوں میں اچھے نمبر حاصل کرلینا ہر ایک کا کام نہیں۔ اِس کے علاوہ وہاں عمر کی بھی تعین ہے۔ مثلاً چوبیس سال کی عمر سے زیادہ والا نوجوان کسی گورنمنٹ سروس کے لئے اہل نہیں ہوسکتا۔ پس نوجوانوں کی بے کسی میں مندرجہ ذیل قوتیں کارفرما ہیں۔

۱۔ عمر

۲۔ غربت

۳۔ رجحانِ طبع

مشکل یہ ہے کہ یہ تینوں اجزا ر قابلِ اصلاح نہیں ہیں۔ عمر اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔ بعض اوقات ماں باپ نے زیادہ لکھوائی ہوتی ہے۔ بعض اوقات غربت کی وجہ سے درمیان میں تعلیم بند کرنی پڑتی ہے۔ اور بعض اوقات اپنی کند ذہنی اور کھیلوں وغیرہ کی طرف رجحان کی وجہ سے آدمی فیل ہوجاتا ہے۔ غربت کے خلاف آدمی

کیا کرے۔ اگر ماں باپ ہی غریب ہیں تو وہ خود کیا کر سکتا ہے۔ اگر خود کمانا چاہے تو امتحانوں کے لئے روپیہ درکار ہے اور کم از کم ایک سال بیکار بیٹھ کر گھر کے اخراجات لینے ضروری ہیں جو ہر ادسط آدمی کے لئے ممکن الحصول نہیں۔ رجحان طبع کے خلاف جنگ آزمائی کی جا سکتی ہے لیکن بسا اوقات خلاف از طبیعت کام کرنے میں ناکامی ہی میسّر آتی ہے۔ پھر بعض آدمیوں کا تجارت کی طرف رجحان بھی ہوتا ہے لیکن اُن کے پاس کسی کاروبار کو شروع کرنے کے لئے روپیہ نہیں ہوتا۔

بے روزگاری کے اسباب

میرے نزدیک بے روزگاری کا کوئی سبب بھی نہ ہو، اگر مندرجہ ذیل خصوصیات کسی امیدوار میں موجود ہوں۔

(۱) - عمر
(۲) قابلیت
(۳) روپیہ
(۴) صحت

لیکن اِس کے باوجود بعض وجوہات عام مفکّرین کی طرف سے پیش کی جاتی ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔

۱- مابعد جنگ کساد بازاری اور تخفیف

جنگ کے بعد ایک عام اقتصادی انحطاط اور عالمگیر کساد بازاری کا دَور دورہ ہوا جس کے نتیجہ میں بہت سی تخفیفیں ہوئیں اور گورنمنٹ کے اخراجات گھٹا دئے گئے۔ اِس کے نتیجہ میں بہت سے عارضی اور نئے محررین کو جواب مل گیا۔ لیکن اب گورنمنٹ اُن کو واپس بلا رہی ہے اور آہستہ آہستہ اُن میں سے اکثر نئی ملازمتوں میں کھپ چکے ہیں۔ بہرحال یہ سبب کوئی مستقل وجۂ بے روزگاری نہ تھا۔

ناقص طریقۂ تعلیم

بعض مفکّرین ہمارے موجودہ طریقۂ تعلیم کو بھی قابلِ مذمّت خیال کرتے ہیں۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہمارا موجودہ نظام اتنا خراب نہیں ہے جتنا کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد صرف وسعتِ نظر اور دماغ کی ترقی ہونا چاہیئے نہ کہ اُس کی قیمت روپیہ پیسہ کی شکل میں معلوم کی جائے۔

مثلاً سائنس اور آرٹ پڑھانے کی بجائے اگر صرف روپیہ پیسہ کے حصول کے طریق بتائے جائیں تو مجھے سمجھ نہیں آتا کہ دنیا میں علم و ہنر کی ترقی کیسے ہوگی۔ اگر ہم شکسپئر کے ڈرامے پڑھکر تیس روپے کی محرری حاصل نہیں کر سکتے تو اِس میں ڈراموں کا کیا قصور ہے اُن کا فائدہ تو صرف یہ ہے کہ ہمارے دماغ میں وسعتِ نظر پیدا کریں۔ نہ کہ روپیہ پیسہ وصول کرنے کے طریقے بتلائیں ہم نے مانا کہ ہمیں بڑے ہو کر خود کمانا کمانا چاہیئے لیکن اِس سے یہ کب مستلزم آتا ہے کہ ہم ڈرامے یا پوئٹری کی کتابیں نہ پڑھیں۔ ہم نوکری کے حصول کے لئے جو خصوصیات درکار ہیں علم و فنون کی تحصیل کے دوش بدوش بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ پس یہ خیال غلط ہے کہ ہمارے طریقۂ تعلیم میں کوئی نقص ہے۔ اگر کوئی طالب علم صرف امتحانوں کی خاطر پڑھتا ہے تو یہ اُس کی غلطی ہے۔ اور اربابِ یونیورسٹی کا اِس میں کوئی قصور نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یونیورسٹی کے گریجویٹوں کو اپنی کتابوں کے سوا کچھ علم نہیں ہوتا۔ لیکن یہ تو شخصی بات ہے۔ طریقۂ تعلیم کا اِس میں کیا قصور ہے؟ کیا اخبارات، رسالے اور کتابیں اُن کی لائبریریوں میں نہیں منگوائے جاتے۔ اگر کوئی طالب علم استفادہ نہیں کرتا تو طریقۂ تعلیم بچارہ کیا کرے۔ یہ خود طالب علم یا اُس کے ابتدائی ماحول کا قصور ہے۔

پھر کہا جاتا ہے کہ موجودہ طرزِ تعلیم طالب علموں کے اندر غلامانہ ذہنیت پیدا کرتی ہے اور اُن کو سوائے نوکری کے کچھ مدِّ نظر نہیں ہوتا۔ لیکن میں اس سے بھی متفق نہیں ہوں۔ جہاں تک غلامانہ ذہنیت کا تعلق ہے یہ بھی بعض انفرادی طالب علموں کی کوتہ چشمی ہوگی ورنہ میں نے تو اکثر دیکھا ہے کہ طلبأ کے اندر قومی خیالات کا کافی جذبہ ہوتا ہے اور دوسرے یہ چیز عام تعلیم کے دوش بدوش بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

سرکاری ملازمت کی خواہش

باقی رہا یہ کہ ہمارے نوجوان امتحان پاس کرکے بجز سرکاری نوکری حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے اِس کی وجوہات میرے خیال میں دو ہیں۔

(۱) سرکاری ملازمت میں حفاظت اور استقرار زیادہ ہے۔ پرائیویٹ سروس میں جب کبھی مالکان کی مرضی ہوتی ہے کسی محرر کو جواب دیا جا سکتا ہے لیکن

گورنمنٹ سروس میں ایسا کرنا سخت محال ہے۔ پھر گورنمنٹ سروس میں گریڈ اور سالانہ ترقی کی بھی باقاعدگی ہے لیکن تجارتی اداروں وغیرہ میں ایسا نہیں ہے۔

۲۔ سرکاری نوکری کا سہل ہے اوقاتِ کار کم ہیں اور زیادہ دیر تک محنت نہیں کرنی پڑتی۔ مجھے پرائیویٹ سروس کا خود تجربہ ہے۔ صبح نو بجے سے شام کے سات بجے تک عام وقت ہوتا تھا اور اس کے علاوہ چونکہ افسروں کی خوشنودی مدِنظر ہوتی، اس لئے ذرا پہلے آنا پڑتا تھا۔ اور بعد میں جانا ہوتا تھا۔ گورنمنٹ سروس میں سپرنٹنڈنٹ وغیرہ کے ساتھ کوئی بندھا نہیں ہوتا۔ آپ وقت پر آئیں اور وقت پر چلے جائیں۔ لیکن پرائیویٹ سروس میں اُس وقت تک بیٹھنا پڑتا ہے جب تک کہ سپرنٹنڈنٹ بیٹھا رہے۔

انہی وجوہات کی بنا پر اگر ہم نوجوان گورنمنٹ سروس کی خواہش کرتے ہیں تو ہم حق بجانب ہیں۔ باقی رہا یہ کہ ہم تجارت وغیرہ کیوں نہیں کرتے۔ اس کا جواب میں پہلے ہی دے چکا ہوں کہ تجارت کے لئے سرمایہ چاہیئے اور پھر کاروباری ذہنیت اور یہ چیز ہر آدمی میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ رجحانات اور طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔

بس موجودہ طریقۂ تعلیم میں کوئی نقص نہیں ہے۔ گورنمنٹ سروس کی ذہنیت تعلیم پیدا نہیں کرتی بلکہ اس کی وجہ وہ جاذبیت اور کشش ہے جو سرکاری ملازمت میں پائی جاتی ہے۔

معاشری وجوہات

معاشری وجوہات صرف مدراس وغیرہ میں کارفرما ہیں۔ جہاں ہر شخص کو اپنی پسند کے مطابق پیشہ جات کے انتخابات کی اجازت نہیں۔ اس کی وجہ ذات پات اور خاندان کی محبت ہے۔ لیکن اب یہ جذبہ تعلیم یافتہ طبقہ میں دور ہو رہا ہے اس لئے ہم اس کو بے روزگاری کے اسباب میں شامل نہیں کر سکتے۔

صناعت کا فقدان

چوتھی وجہ ہماری بے روزگاری کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ ملک میں مصنوعات اور کارخانے بدرجۂ اتم موجود نہیں ہیں اور اس وجہ سے ہمارے نوجوانوں کی کھپت نہیں ہو سکتی۔ یہ وجہ بہت حد تک درست ہے اور اس کے لئے ہمیں انتظار کرنا ہوگا کہ ملک کی اقتصادی اور صنعتی ترقی معرضِ وجود میں آئے۔

بے روزگاری کا تدارک

بے روزگاری کو دور کرنے کے کئی طریقے بیان کئے جاتے ہیں جن میں سے اکثر ناقابلِ عمل اور بعض بالکل بعید از قیاس ہیں۔ مثلاً ہم چند کا ذکر کرتے ہیں۔

گورنمنٹ بدل دی جائے

پنڈت نہرو وغیرہ کا خیال ہے کہ اگر ہم موجودہ نظامِ حکومت کو بدل دیں تو بے روزگاری بہت حد تک دور ہو سکتی ہے۔ مثلاً اس وقت کئی ملازمتیں غیر ملکی لوگوں نے سنبھالی ہوئی ہیں جو ہندوستانیوں کو دی جا سکتی ہیں۔ پھر جرمنی روس اور ٹرکی کی مثالیں بیان کی جاتی ہیں کہ جب ان لوگوں نے خارجیوں کو باہر نکال دیا تو ملکی شعبہ جات ترقی پذیر ہوئے اور نوجوانوں کو نوکریاں میسر ہوئیں۔

یہ طریقہ خواہ کس قدر ہی کارگر کیوں نہ ہو، لیکن بہرحال بعید از قیاس ہے۔ ہم یہ طریقہ تجویز کر کے ملک کے سامنے کوئی ٹھوس اور سریع الاثر لائحہ عمل پیش نہیں کر سکتے بلکہ صرف ایک جنت دکھاتے ہیں، جو فی الحال ناقابلِ قبول ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ملازمتوں کا حصول روز بروز مشکل ہوتا گیا تو نوجوانوں کے اندر بغاوت کے جراثیم پیدا ہو جائیں گے اور جو معرضِ وقوع میں آئے گا اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہمیں اس کی ترغیب دینے کی حاجت نہیں۔ کیونکہ یہ جذبہ از خود پیدا ہوتا ہے۔ بہرحال موجودہ زمانہ میں اس کو بطور علاج پیش کرنا حماقت ہے کیونکہ یہ جب تک معرضِ وجود میں آئے گا کئی لوگ بے روزگاری کی وجہ سے خودکشیاں کر چکے ہوں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے سامنے کوئی قابلِ عمل اور سریع الاثر لائحہ عمل رکھا جائے۔

ٹیکس ہلکے کئے جائیں

سر تیج بہادر سپرو وغیرہ کی تجویز ہے کہ ٹیکس ہلکے کئے جائیں یا اکثر جگہ لگان معاف کر دیا جائے۔ لیکن یہ تو صرف بڑے بڑے سرکاری ملازموں یا زمینداروں کو مالی آرام بہم پہنچانے کی تجویز ہے۔ ورنہ اس سے نوجوانوں کی بیکاری دور نہیں ہو سکتی۔

طریقہ تعلیم کو یکسر بدل دیا جائے

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوگا صنعتی اور فنی تعلیم دینے کا کوئی فائدہ نہیں جب تک کہ ملک میں پہلے کارخانے اور فیکٹریاں نہ جاری کی جائیں۔ یہ خیال غلط ہے کہ پہلے فنی تعلیم ہونی چاہیئے اور پھر کارخانے جاری ہوں گے۔ جب کارخانے جاری کرنے میں بعض خارجی مشکلات ہیں تو ماہرین بیٹھے کیا کریں گے پہلے سیاسی مصالح، اور حکومتی مشکلات کو دور کرو۔ پھر فیکٹریاں جاری ہوں گی جس کے لئے ہم طلبہ کو فنی تعلیم دلوائیں گے۔

نوجوانوں کو زراعت کی طرف راغب کیا جائے

اکثر تجویز پیش کی جاتی ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو زراعتی زمینیں دی جائیں تاکہ وہ زراعت کی طرف مائل ہوں۔ لیکن کوئی صحیح الدماغ آدمی اس تجویز سے متفق نہیں ہوگا کیونکہ ہماری آبادی کا ۹ حصہ پہلے ہی کاشتکاری میں لگا ہوا ہے اور زمین پر آبادی کا بوجھ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ پس ایسی حالت میں بجائے اور آدمیوں کو زراعت کی طرف مائل کرکے ہمیں پہلے آدمیوں کی حوصلہ فرسائی کرنی چاہیئے اس کے علاوہ اگر ہم اس تجویز پر عمل کریں تو اُن لوگوں میں بے روزگاری پھیلنے کا اندیشہ ہے جو پہلے ہی اس پیشہ میں لگے ہوئے ہیں، دوسرے الفاظ میں اگر ایک جماعت باروزگار ہوتی ہے تو دوسری بے روزگار ہو جائے گی۔ پس یہ کوئی بیکاری کا حل نہیں ہے۔

نوجوان فی الحال کیا کریں؟

پس مندرجہ بالا پروگرام فی الحال ناقابل حصول ہے، اور جب تک یہ عملی صورت میں جلوہ گر ہوگا اُس وقت تک نوجوانوں کو کسی سریع الاثر تعمیری پروگرام کو اختیار کرنا ہوگا۔ وہ تعمیری پروگرام کیا ہے۔ میرے خیال میں اُس میں صرف دو چیزیں ہیں۔ یا تجارت کی جائے اور یا گورنمنٹ سروس اور محرری کی جائے۔

تجارت کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے جو صرف متوسط یا امیر طبقہ کو میسر ہو سکتا ہے۔ اگر کسی نوجوان کے پاس سرمایہ ہو لیکن تجارتی شغف نہ رکھتا ہو تو اُسے چاہیئے کہ اپنا روپیہ کسی ایسی تجارت میں لگا دے جہاں اُسے باقاعدہ طور پر معقول نفع ملتا رہے۔ بہتر ہوگا کہ تجارت پہلے سے چلی ہوئی ہو تاکہ ابتدائی مشکلات کے خطرے سے آدمی بچ جائے۔ پھر اگر اُس کے پاس تجارتی رجحان ہو تو اُسے چاہیئے کہ کسی سرمایہ دار کو اپنی سکیم سے آگاہ کرے اور اُسے اپنی کامیابی کا قائل کر دے۔

اگر کوئی سرمایہ نہ دے تو پھر کنویسنگ کا کام سب سے بہتر رہے گا۔ مثلاً کسی چیز کو لے کر مختلف آدمیوں اور دوکانداروں کے پاس لے گئے اور اُن سے اُس کی خوبیاں بیان کیں تاکہ وہ خرید لیں۔ اگر آدمی پڑھا ہوا ہو تو اس طریق سے معقول رقم ہاتھ لگ سکتی ہے۔ اگر صرف کسی ادبی رسالہ یا کتابوں ہی کی تجارت کی جائے تو کافی نفع کی امید ہو سکتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ لاہور میں میرے ایک دوست بی اے نے صبح سویرے سائیکل پر روزانہ اخبارات پہنچانے کا ذمہ لیا تھا۔ یہ کام اکثر اَن پڑھ پھیری والے کیا کرتے تھے اور بظاہر اس طرف کوئی میدان نظر نہ آتا تھا۔ لیکن چونکہ پڑھا ہوا تھا اس لئے جس کے پاس بھی وہ گیا اُس نے بی اے دیکھ کر اپنے پہلے اخبار والے کو بند کر دیا اور اس کو لگا لیا جس کے نتیجہ میں بہت سا علاقہ اخباری لینے والا اُس کے ہاتھ آگیا اور آہستہ آہستہ وہ ملازموں کے ذریعے ایک بہت بڑا ایجنٹ بن گیا۔

یہ کام مشکل نہیں ہے صرف ہمت کی ضرورت ہے۔

کلرکی کے لئے میں کہہ چکا ہوں چوبیس سال سے کم عمر۔ کچھ لیاقت اور داخلہ دینے کے لئے چند روپیہ درکار ہیں۔ پھر خدا چاہے تو اس میں کبھی ناکامیابی نہیں ہو سکتی پبلک سروس کمیشن کی طرف متعدد امتحانات ہوتے ہیں جن کی تفصیل وہاں سے منگوائی جا سکتی ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ ایک دل سے چاہنے والا نوجوان چند ماہ میں ہی نوکری حاصل نہ کرلے۔

اصل میں نوکریوں کا اس قدر کال نہیں ہے جس قدر کہ ہمت اور قوتِ عمل کا فقدان ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اکثر نوجوان صرف اسی امید پر گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں کہ شاید اُنھیں کوئی غائبانہ طاقت نوکری کا پروانہ ہاتھ میں دے جائے۔ حالانکہ یہ عبث اور خام اُمید ہے۔ اگر وہ باہر جا کر ذرا کوشش کریں تو اپنی روٹی کا انتظام ضرور ہو سکتا ہے۔ اگر آپ صرف کلیم کے پیچھے ہی لیکر اُس کی خریداری کے لئے تحریک کریں تو آپ کو معقول کمیشن مل سکتا ہے۔ اسی طرح اکثر کتب فروشوں

میں اپنے دوست حضرت منوّر کا شکریہ کیوں کر ادا کروں کہ انھوں نے مجھے اس محبت سے یاد فرمایا ہے۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ میرا لہجہ اکثر مقامات پر تلخ ہو جاتا ہے، لیکن میں بقول حضرت لطیف اکبرآبادی بعض اوقات اپنے تلخی مزاج سے مجبور ہو جاتا ہوں اور بالخصوص ابنائے وطن کی روش کو جب مفادِ وطن کے خلاف دیکھتا ہوں تو فرطِ غیظ سے میرا سینہ دہکنے لگتا ہے۔ اعتراض کرنے والوں کو میرے دل کا حال کیا معلوم جس دل سے خون کی بوندیں ٹپک رہی ہوں وہ گرم الفاظ کے استعمال پر مجبور ہے۔ اگر وہ آگ جو میرے دل میں بھڑکی ہوئی ہے آج معترضین کے دل میں بھی بھڑک اٹھے تو وہ بھی میری ہی طرح تلخ گفتاری پر مجبور ہو جائیں۔ یا تو جلوۂ رخ جاناں نہ دیدہ! (جوش)

حضرتِ جوش سے خطاب

(رسالہ کلیم بابت ماہ فروری کے ایک مضمون پر)

ہے قابلِ فخر و ناز ہستی تیری
دریا طبعی فراغ دستی تیری
توڑی ہیں حدودِ تنگ تو نے اے جوش
ہے مجھکو پسند دل سے مستی تیری

اے شاعرِ کامیاب عہدِ حاضر
اے شاعرِ انقلاب عہدِ حاضر
تسلیم کہ آیا ہے سمٹ کر تجھ میں
یہ عالمِ اضطراب عہدِ حاضر

ہاں باعثِ صد گرمیٔ بازار ہے تو
ہاں جنسِ محبت کا خریدار ہے تو
تجھ کو ہمہ تن جوش سمجھتا ہوں میں
جامِ صہبا کی طرح سرشار ہے تو

دل سے وطنیت کا پرستار بھی ہے
ذہنیتِ عامہ سے بیزار بھی ہے
میں تیرے عقائد کو سمجھتا ہوں خوب
قربانیٔ جسم و جان کو تیار بھی ہے

میرا بھی وہی ہے جو ہے ایماں تیرا
معبود ہے میرا جو ہے "انساں" تیرا
اے جوش تجھے میں دل کا دریا سمجھوں
اپنی حد میں رہے جو "طوفاں" تیرا

اس وحی، اس الہام کا کیا ہی کہنا
اس درسِ خوش انجام کا کیا ہی کہنا
ہو امن کے انداز میں اے جوش اگر
مشفق، ترے پیغام کا کیا ہی کہنا

منوّر لکھنوی

اپنی زبان کی کتھا

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

شوق کی بے خودی بھی عجیب چیز ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم مختلف سبجکٹ پر مضامین لکھتے اور دل سے لکھتے لیکن اب جو کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ محض اردو زبان کے متعلق بہار ہو۔ خزاں ہو۔ شب ماہ ہو۔ شب تار ہو۔ ہم کو ذکر معشوق کے بدلے جو مزہ اردو کے تذکرے میں آتا ہے وہ کسی میں نہیں ملتا۔ یہ اس لئے کہ ہمارا اعتقاد ہو گیا ہے کہ ہندوستان کی کشتی جو ڈگمگا رہی ہے اس کا سبب تمام ہندوستانیوں کی جہالت ہے۔ جب تک ہندوستانیوں کی پیشانی سے یہ داغ نہ مٹے گا اُس وقت تک ہندوستان فلاح کا منہ نہیں دیکھ سکتا۔ اس ناؤ میں ہم سب سوار ہیں اور جب یہ کشتی ڈوب جائیگی ہم سب تہ و بالا ہو جائیں گے۔ اس عذاب سے بچنے کی جو صورت ہو گورنمنٹ اور مقتدر لوگوں کی طرف سے ہو رہی ہے۔

اس کا ہم کو شکر گزار ہونا چاہیئے جس کی بدولت لوگ انگلش زبان میں ترقی کر رہے ہیں۔ قوم کے لیڈر علماء ہم کو علوم عربیہ سے مالا مال کر رہے ہیں لیکن یہ احسان مختصر لوگوں کے لئے مفید ہو تو ہندوستان کی مفلس اور فاقہ مست قوم کو تو اس وقت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ جب ان کو اپنی مادری زبان میں تکمیلِ علوم کا موقع دیا جائے۔

یہ بات تو طے ہو جائے گی کہ غیر ملکی زبان مادری زبان کی طرح نہیں آسکتی ہے۔ ہماری آنکھوں کی دیکھی بات ہے کہ ایران کا مستند شاعر حاجی شیخ عبداللہ رشتی سیاح بیس بائیس برس سے ہندوستان میں پڑا ہوا ہے اور اب تک صحیح اُردو نہیں بول سکتا۔

ایسے ذہین ہزار میں دو نکلیں تو نکلیں جو غیر زبانوں کے استعمال پر مثل مادری زبان کے قادر ہو جائیں۔ پھر تمام ہندوستانی بیچارے کس طرح دوسری زبان میں تکمیلِ علوم کر سکتے ہیں۔ ان کے لئے تو یہ صورت مفید ہو سکتی ہے کہ اُن کی مادری زبان اردو خزائن علمی سے آراستہ کی جائے۔ اور مختلف علوم کا ترجمہ کر کے اردو کا نصاب معیّن کیا جائے۔ اردو کی یونیورسٹی قایم کی جائے۔ اردو کے ڈاکٹر اردو کے طبیب اردو کے جوتشی اردو کے محدّث اردو کے فقیہہ اردو کے بید اردو کے فلسفی منطقی ریاضی داں سند یافتہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل جائیں۔

یہ کیا غضب کی بات ہے کہ رہیں تو ہندوستان میں اور جب عجم اور عرب اور انگلستان کی زبان سیکھ لیں اُس وقت ہم تعلیم یافتہ کہے جائیں۔ دنیا میں کسی ملک کسی قوم پر یہ سختی نہیں ہے کہ وہ اپنی زبان چھوڑ کر غیر ملکی زبان اختیار کرے۔ جاہل ہندوستان تاریکی میں پڑا ہے اور کوئی خبر نہیں لیتا۔

ہندوستان کے افلاس کے لئے کمیشن مقرر ہوا اور اس کی جہالت آمیز زندگی کی تحقیقات ہوئی۔ ملکی ریفارمر پولیٹکل نقصانات کی غرض سے گرم کوششیں کر رہے ہیں۔ علماء درس کے لئے وقف ہیں دنیاوی ترقی ڈھونڈھنے والے لوگ انگریزی تعلیم کو معراجِ کمال سمجھتے ہیں۔

مگر کوئی خدا کا بندہ یہ تحریک نہیں کرتا کہ ہندوستان کی مادری زبان کار آمد بنائی جائے۔ یہ زمانہ علمی گھوڑ دوڑ کا ہے۔ بحر و بر پر کاغذ حکومت کر رہا ہے پھر بھی ہماری زبان عضوِ معطّل کی طرح بیکار شے تصوّر کی جاتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ اردو زبان اس وقت ترقی کر رہی ہے اور ہندوستان کے اطراف میں ایسے رسالے نکلنا شروع ہو گئے۔ جن کی عموماً قدر کی جائے تو اردو زبان کو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان رسالوں کا یہ بھی فرض ہے کہ اردو زبان فصاحت اور سلاست کا پہلو لئے ہوئے باقاعدہ ترقی کرے۔ ایک زبردست اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اردو لٹریچر میں اصطلاحات بہت کم ہیں۔ اس کمی کو بھی اردو رسائل پورا کر سکتے ہیں۔ علمی اصطلاحات کے متعلق دو فرقے ہیں مسلمان کہتے ہیں کہ علمی اصطلاحات عربی سے اخذ کئے جائیں اور ہندو کہتے ہیں کہ سنسکرت سے لئے جائیں اس دعوے میں ہم موخر الذکر کی تائید کرتے ہیں۔ اس واسطے کہ اردو کے انشا پردازوں کی ابتدا سے یہ کوشش رہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے اردو میں ہندی الفاظ سے مدد لی جائے۔ بلکہ اچھے انشا پرداز فارسی کے جملوں اور ترکیبوں سے پرہیز کرتے ہیں ابتدا میں اردو کے شاعر حروف روابط اپنے کلام میں کرتے تھے۔ لیکن متاخرین نے اس کو بھی ترک کیا۔ اسی وجہ سے بیگمات کی زبان مستند کہی جاتی ہے کیونکہ اس میں فارسی عربی الفاظ کا زیادہ شمول نہیں ہوتا۔

اردو کی خوبی اسی میں ہے کہ وہ سنسکرت کے الفاظ میں مناسب ترمیم کر کے اُس کو اردو لب و لہجہ میں موافق بنائے۔ ملک کو احسان ماننا چاہئیے اگر ایسے لوگ مل جائیں جو سنسکرت زبان سے ہر قسم کے علمی اصطلاحات لے کر اُردو کے علمی خزانے میں اضافہ کر دیں۔

مگر ہم کو جہاں تک معلوم ہے وہ یہ ہے کہ سائنس اور فلسفۂ جدید کے علمی اصطلاحات کا بدل سنسکرت سے ملنا محال ہے۔ اس کمی میں عربی کا خزانہ کچھ مدد دے سکے تو دے سکے۔ یہ شکایت بھی بے جا ہے کہ انگریزی ترجمہ کرنے کے لئے اردو میں الفاظ نہیں ملتے ہمارے نزدیک لفظی ترجمہ علمی کتابوں کا کبھی بکار آمد ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ علمی کتابوں کے ترجمہ کرنے کا بہترین قاعدہ یہ ہے کہ اُن کے مطالب اردو زبان میں ادا کئے جائیں۔

پھر زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کا تعلیم یافتہ گروہ اپنی اس زبان کی قدر ہی نہیں کرتا جس میں اُس نے زبان کھلتے ہی بات چیت کرنا شروع کی ہے۔ کیا یہ اردو کی بدقسمتی نہیں ہے کہ انگریزی جاننے والا گروہ اردو رسالوں کا دیکھنا کفر سمجھتا ہے یہ بات اُردو کے واسطے بہت نقصان دہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انگریزی جاننے والے اردو سے محروم ہوتے جاتے ہیں۔ جو اردو کے زوال کا باعث ہے۔

غریب اردو پر ایک یہ بھی اعتراض ہے کہ علمی کتب عربیہ کے تراجم اس میں نہیں آسکتے۔ اس کا جواب ہمارے پاس یہ ہے کہ ہم نے جہاں تک دیکھا ہے علمائے کرام ادق کتابوں کے مطالب اردو میں سمجھاتے ہیں۔ اور بے وقت طلبا کے سمجھ میں آتے ہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ اردو ترجمہ پڑھانے سے لوگ نہ سمجھیں گے۔ اور یہ کہ اردو زبان میں ان ادق کتابوں کے ترجمے نہ آسکیں گے یہ محض بہانہ ہے۔ بہی خواہان ملک اردو زبان کی قوت بڑھانے میں کاہلی کرتے ہیں۔

زمانے نے ہمیشہ غیر ملکی زبانوں کو مٹا دیا ہے اور مٹاتا رہے گا۔ بنگالی۔ مدراسی پشتو۔ کشمیری۔ جو غیر ملکی زبانیں ہیں ان ملکوں کی عام قوتوں پر نظر کرو۔ تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ملک کی بربادی کے آثار اس کی مادری زبان کی کمزوریاں ہیں۔ اردو کی قوت نے اپنے ہمسایہ کی تین سو پچیس زبانوں کو اپنے پیٹ میں ہضم کر لیا اور ڈکار بھی نہ لی۔ مرہٹی۔ پشتو۔ بنگالی۔ کشمیری۔ گجراتی۔ چینی۔ سنسکرت وغیرہ زبانیں اس میں شامل ہیں۔ اسی خیال سے کہا جاتا ہے کہ تمام ہندوستان کی یہ مادری زبان ہے۔

اس کی عالمگیر قوت نے اس کو ہندوستان کی زبان بنا دیا۔ مگر خوف ہے کہ ہماری بے پروائی سے کہیں مٹ نہ جائے۔ کیونکہ تمام غیر ملکی زبانوں کا یہی انجام ہوا ہے اردو کی علمی کمزوری کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے کروروں نام لیوا فاقہ کشی اور جہالت سے اپنی جان دے رہے ہیں۔ اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ غریب ہندوستانی چاہے اپنی زبان کے مجتہد ہوں مگر اُن کو کوئی شخص تعلیم یافتہ نہیں کہتا نہ اُن کو کسی ملازمت کے صیغے میں جگہ نصیب ہوتی ہے۔ یہی ایک زبان ہے جس کے عالم کو بھی ہم جاہل کہتے ہیں۔ اسی صدمے نے ہمارے دل کو بے چین کر دیا اور ہم کو معلوم ہو گیا کہ ہماری تباہی اور بربادی زبان کی کمزوری سے ہے۔ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ سب لوگ اردو کے دیوانے ہو جائیں۔ لیکن ملکی بہبودی کی خدمت اردو کی خدمت ہے۔ اگر اپنی قوم کو مصیبت کے جیل سے نکالنا ہے تو ہم سب کو لازم ہے کہ اردو کی حقیقی خدمت کریں۔

اردو کی خدمت کرنے والوں میں منشی امیر مرحوم بھی تھے۔ اردو کی زبان کی جس بیش بہا لغت کی ابتدا مرحوم نے کی اگر اس کی تکمیل ہو جاتی تو اردو میں بہت

وسعت ہو جاتی۔ اسی طرح علمی کتابوں کے ترجمے کی اشد ضرورت ہے اور اس امر کی احتیاج ہے کہ اردو مدارس کثرت سے قایم کئے جائیں اور اردو کا علمی نصاب اعلیٰ پیمانہ پر قایم کیا جائے۔ فلسفۂ جدید کا نصاب بِتعلیم اردو۔ منطق کا نصاب تعلیم اردو۔ طب یونانی کا نصاب بِتعلیم اردو۔ فقہ کا نصاب بِتعلیم اردو۔ حدیث کا نصاب بِتعلیم اردو۔ بیدک کا نصاب تعلیم اردو۔ ڈاکٹری کا نصاب بِتعلیم اردو۔ سرجری کا نصاب تعلیم اردو۔ ہومیوپیتھک کا نصاب بِتعلیم اردو۔ تفاسیر کا نصاب بِتعلیم اردو۔ پوران کا نصاب تعلیم اردو۔ وید کا نصاب بِتعلیم اردو۔ انجیل مقدس کا نصاب تعلیم اردو مختصر تمام علوم اور تمام مذاہب کا ایسا جامع نصاب بِتعلیم اردو مقرر کیا جائے جس میں کسی مذہب والے کو اپنی مذہبی کتب پڑھنے میں دقت نہ واقع ہو۔ مسلمان اپنے مذہب کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اور عیسائی اپنے مذہب کی اور ہندو اپنے مذہب کی۔ علوم کی تعلیم کا نصاب جب سب کا ایک ہو گا اس تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ تمام ہندو مسلمان اپنی مادری زبان میں علوم کی تکمیل سے فراغ حاصل کریں گے۔

یہ بہت اچھی بات ہے کہ اب ادنیٰ اردو کے پرچے اشاعت پذیر ہونے لگے ہیں۔ اور اگر ملک کے اعلیٰ لوگ اُن سے کام لینا چاہیں تو بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ہماری ترقی کا زینہ یہی ہے کہ ہم اپنی مادری زبان کو تمام علوم سے مالا مال کریں۔ جس قوم نے ترقی کی ہے اپنی زبان کو وسعت دے کر ترقی کی ہے۔ نظیر کے لئے بہت سی ترقی یافتہ قومیں موجود ہیں جو اپنی مادری زبان کو علمی معلومات سے لبریز کر چکی ہیں۔ اور اپنی زبان میں تحصیل علوم کرتی ہیں۔ اُن کی زندگی کا بہت حصہ تحصیلِ علوم میں صرف ہوتا ہے۔ اس لئے اپنی زبان میں تکمیلِ علوم کرنا بہت سہل ہے۔ بخلاف دوسری زبانوں کے۔ دوسرے اپنے ملک میں بھی سرسبزی ہے۔ اِن میں قومیت کا مادہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایک زبان ہونے سے لوگ ہم خیال ہو جاتے ہیں۔ اُن کی رائے بھی ایک ہو جاتی ہے۔ اُن کے لباس ایک ہوتے ہیں۔ اُن کا طرزِ تمدن قریب قریب یکساں ہو جاتا ہے۔

اِس وقت ہم کو عربی فارسی کی اس قدر ضرورت نہیں جس قدر اردو کے مکمل کورس کی احتیاج ہے۔ کیونکہ اردو کی تکمیل پر تمام ہندوستان کا مدار ہے۔ ہمارے کروروں ہندی بھائی اردو جانتے ہیں اور جاہل و غیر تعلیم یافتہ کہے جاتے ہیں اس کا اصلی راز اردو کی کمزوری ہے۔ اگر اردو زبان اس قدر کمزور نہ ہوتی تو ہم ہندوستانی بھی اتنی پستی میں نہ ہوتے۔ اے قومی درد رکھنے والے ہندو مسلمان عیسائی اُٹھو اور اپنی مادری زبان کے اُبھارنے میں کوشش کرو کہ یہی سوراج کا معراج ہے۔ اگر ہندی اردو کے لئے لڑتے رہو گے اور یہ سمجھ کر کہ یہ زبان مسلمانوں کی ہے۔ زبردستی اردو کو ہندی حروف میں لکھ کر سوراج کی امید رکھو گے تو کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔ اب اردو وہ نہیں رہی جیسے تم سب مل کر کچل دو اردو نے جو کچھ ترقی کی وہ اپنی قوت سے کی۔ گورنمنٹ نے اِس کی قوت کو مان لیا۔ ہندوستان میں قدم رکھتے ہی کھلتے میں اسی زبان کو اپنے لئے ضروری سمجھا اور حاصل کیا۔ اور تم سب بولتے ہو اور اسی زبان میں بات چیت کرتے ہو۔ لیکن حرفوں کے لئے لڑتے ہو۔ اور اپنے نزدیک تم یہ حماقت کر کے ایسا خیال کرنے لگے ہو کہ ہم بڑے "حرفوں کے بنے ہوئے ہیں" اُردو پر کسی کا احسان نہیں ہے اس نے اپنی قوت سے انگریزی کا مقابلہ کیا اور ترقی کی۔

چراغے راکہ ایزد بر فروزد کسے کو پف زند ریشش بسوزد

تبدیل فضائے نیر عالم نہ کرو
اس جنت ارضی کو جہنم نہ کرو
مہمان ہو مہمان کی حد سے نہ بڑھو
دنیا کا نظامِ امن برہم نہ کرو

[illegible] اکبر آبادی

میکدے کی رات

تخمیس بر غزلِ عکاسِ فطرت حضرت جوشؔ ملیح آبادی

(از مولینا محمد الیاس صاحب آفاق رئیس اعظم بھیڑی)

دریائے کیف جوش پہ اے ہمنشیں ہے آج پہلوئے شوق میں مرے اک حورِ عین ہے آج
ساغر بدست غیرتِ ماہِ مبیں ہے آج کیا میکدے کی رات نشاط آفریں ہے آج
رنگین موجِ بادہ سے اُن کی جبیں ہے آج

کوسوں ہیں دُور حلقۂ رنداں سے کلفتیں محفل میں بج رہی ہیں جوانی کی نوبتیں
نکھری ہوئی ہیں چاندنی راتوں کی طلعتیں ہر شئے پر آسماں سے برستی ہیں زینتیں
ہر ذرّہ کائنات کا اک نازنیں ہے آج

میں ہوں حریمِ ناز ہے اور لذّتِ کلام جوشِ مئے شباب سے آنکھیں ہیں لالہ فام
مہکی ہوئی ہوائیں ہیں چھلکے ہوئے ہیں جام شیر و شکر میں غرق ہیں کام و دہن تمام
خم میں شرابِ تلخ نہیں، انگبیں ہے آج

اک خواب ہو چکا ہے خیالِ بلند و پست اب دل میں شوقِ فتح، نہ ہے دہشتِ شکست
محفل میں ہے برنگِ دگر آج بند و بست لبریز شوخیوں سے ہے چشمِ حیا پرست
تمکیں سے بے خبر نگہِ شرمگیں ہے آج

محفل میں مست جام بدستوں کی دھوم ہے آئینِ اتقا کی شکستوں کی دھوم ہے
آزادیٔ خیال کے مستوں کی دھوم ہے ہر سو دلیر بادہ پرستوں کی دھوم ہے
چھپ چھپ کے پینے والوں کی پرسش نہیں ہے آج

ہر گوشۂ نشاط میں گونجے ہیں قہقہے ہر کنجِ دل فریب میں رقصاں ہیں ولولے
ہر چشمِ مے فروش میں غلطاں ہیں میکدے ہر لغزشِ قدم سے ٹپکتے ہیں زمزمے
ہر جنبشِ نگاہ سرود آفریں ہے آج

جس سمت آنکھ اٹھائیے اک سرخوشی کا جوش جس پر نگاہ ڈالیے سرمست نائے و نوش
جس سرو قد کو دیکھئے صد گلستاں بدوش جس ظرفِ مے کو چومئے لعلِ شکر فروش
جس غنچے کو دیکھئے زہرہ جبیں ہے آج

صد محشرِ نشاط ہے مطرب کی ایک لے ڈوبی ہوئی ہے موجِ طرب میں ہر ایک شے
ہر مست آج بادۂ عشرت سے چور ہے لرزش ہر ایک ہاتھ میں ہے گر رہی ہے مے
ڈوبی ہوئی شراب میں ہر آستیں ہے آج

دوشِ ہوا پہ جھومتی پھرتی ہے تازگی خاکِ چمن پہ لوٹتی پھرتی ہے دلبری
ڈوبی ہوئی ہے رنگِ جوانی میں زندگی پھیلی ہوئی ہے فرش سے تا عرش چاندنی
نیلم ہے چرخ، لعلِ بدخشاں زمیں ہے آج

آمادۂ وداع ہیں سب صبر اور شکیب   ہونے کو تار تار ہیں دامان اور جیب
رنگِ شرابِ ناب سے پُر ہے ذقن کا سیب   اُس پنکھڑی سے لب پہ تبسّم ہے دل فریب
دل میں کسی کے ضبط کی طاقت نہیں ہے آج

مےٗ نوش و مے فروش ہیں آغوشِ فضل میں   مجبورِ وجد ہوش ہیں آغوشِ فضل میں
یارانِ جرم کوش ہیں آغوشِ فضل میں   رندانِ بادہ نوش ہیں آغوشِ فضل میں
رحمت سے دُور زاہدِ خلوت نشیں ہے آج

شمعوں سے چھن رہا ہے رُخِ تازہ کا نکھار   ذرّوں میں آفتاب کا جوہر ہے بے قرار
پھولوں سے جلوہ ریز ہے معشوقۂ بہار   مینا سے رنگ عارضِ سلمٰی ہے آشکار
ساغر میں حسنِ لیلیٰ محمل نشیں ہے آج

مے خانہ اک نمونۂ ایوانِ خُلد ہے   منظر میں انعکاس گلستانِ خُلد ہے
تاباں سوادِ ارض میں سامانِ خُلد ہے   رقصاں فضا میں پرتوِ حورانِ خُلد ہے
جُنباں ہوا میں دامنِ روح الامیں ہے آج

ساغر میں حُسنِ یوسفِ کنعاں ہے کیف دوز   کلیاں مہ دو ہفتہ ہیں، گُل مہرِ نیمروز
ساقی کی مے ہے چشمۂ حیوانِ دل فروز   مُطرب کی لے میں بربطِ داؤد کا ہے سوز
صہبا کی بُو میں نکہتِ خلدِ بریں ہے آج

آفاق آسمان پہ ہے شعر کی کمند   جکڑا ہوا ہے اوجِ دو عالم کا بند بند
کس طرح آئے ذِلّتِ پستی مجھے پسند   مینارِ میکدے کا ثُریّا سے ہے بلند
پائے سبو پہ جوشِ سخن آفریں ہے آج

مردِ مُضحک

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

(اسرائیل احمد خاں سکندر آباد دکن)

(گذشتہ سے پیوستہ)



(۴)

اب یہ پیرِ مرد جسے آئندہ ہم "حکیم" کے نام سے یاد کریں گے۔ سیر حاصل گفتگو کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے!

"کپتان صاحب!" اُس نے سوال کیا: "کیا آپ کے پاس وہ آلہ زاویہ پیما ہے جو انگریزی رصد گاہوں پر استعمال کیا جاتا ہے!"

"جی نہیں!"

"مگر بغیر اس آلہ کے تم سطح بحر پر مختلف چیزوں کا ارتفاع کیسے معلوم کرسکتے ہو؟"

قبل اس کے کہ انگریز لوگ بحریات کی دُنیا میں قدم رکھیں بآسکے لوگ اِن حسابات کے ہفتخواں طے کرچکے تھے! "کشتی کا، بابکے" شیر بحر بولا!

"ذرا کشتی کا خیال رکھئے، کہیں یہ ہفتخواں طے کرنے کے بعد بھی آپ قلابازی نہ کھاجائیں!"

"جی نہیں جناب! میرا ہاتھ کشتی کی باگ پر ہے! جہاں وہ ایک قدم بھی بے راہ روی اختیار کرتی ہے میں معاً اُسے سنبھال لیتا ہوں!"

کیا تم نے یہ معلوم کیا کہ کشتی اس وقت کتنے ناٹ (بحری میل) کی رفتار سے جا رہی ہے؟

جی ہاں!

کب؟

ابھی ابھی!

کس طرح؟

لٹھے کی مدد سے۔

تم نے اُس کے زاویے کو بھی دیکھنے کی تکلیف اُٹھائی؟

بلا شبہ

کیا تم نے دیکھ لیا کہ ریت کانچ میں سے ہوکر ٹھیک تیس ثانیہ (سیکنڈ) میں گزری؟"

جی ہاں، دیکھا"

کیا تم کو اطمینان ہے کہ ریت کے ذروں نے متعلقہ ظرف کے وسطی سوراخ کو خراب تو نہیں کردیا ہے؟"

میں نے اُن جملہ جزئیات کے بارے میں پوری تشفی کرلی ہے!

اچھا، تم نے ساعتِ ریگ کی آزمائش بھی کی، اک لنگر کی گردش کے ذریعے؟

"یہ بھی کرلیا ہے"

تم نے ڈوری کو موم بھی لگالیا تھا؟ بغیر اس پیش بندی کے وہ تجربے کے دوران میں کھنچ جایا کرتی ہے!"

"لٹھے کی بھی جانچ کرلی تھی؟"

"جی ہاں، ایک گولی کے ذریعے سے!"

یہ گولی کتنے حجم کی تھی ؟

"یوں سمجھئے کہ اُس کا قطر ایک فٹ کا تھا۔

کافی وزنی بھی تھی ؟

جی ہاں، بلکہ یہ وہ گولی تھی جو ہمارے جنگی جہاز ــــ لاکیسے ڈی پار گراند ــــ میں استعمال ہونے کا تاریخی شرف رکھتی ہے۔"

یہ جہاز وہی ہے نا جو آرمیڈا، (ہسپانیہ کا عظیم الشان، تاریخی یادگار، بیڑۂ جہازات جو سواحلِ انگلستان پر حملہ آور ہوا تھا) میں شریک تھا؛

جی ہاں وہی "

" اور جس کا عرشہ چھ سو سپاہیوں، پچاس ملّاحوں، اور پچیس توپوں کی ہنگامہ آرائی کا منظر تھا؛" حکیم نے اپنے زنبیلِ معلوماتِ عامّہ کی تھوڑی سی نمائش کرتے ہوئے پوچھا!

اس بات کو تو آپ کا پیٹ جلنے یا سمندر کا پیٹ جس کا وہ لقمہ بنا؟ــــ کپتان نے بحرِ اعظم اور اس متبحر عالم ہر دو کے ناقابلِ پیمائش عمق کی داد دیتے ہوئے کہا!

اِس کے بعد حکیم نے گوناگوں اور سوالات کئے، انواع و اقسام کے بحری آلات کے نام لئے، جو جہاز رانی میں کام آتے ہیں۔ پھر ہر ایک کے طریقِ استعمال پر بحث کی، اور استخراجِ نتائج کے اصول بیان کئے۔ مختلف ممالک کے مروجہ پیمانوں میں حساب کتاب کئے، اور سب سے اور ماہرانہ معلومات اور عارفانہ ملفوظات ارزانی فرمائے۔ جن پر کپتان نے لفظ بہ لفظ آمنّا و صدقنا کہا۔ بعد ازاں حکیم نے اپنا موضوعِ گفتگو کشتی کے سفر اور اس کی منزلِ مقصود کی طرف پھیر دیا۔ چنانچہ اُس نے سوال کیا۔

اب کشتی کس طرف لے جا رہے ہو؟

ایک خاص گودی ہے جس کا موقع و محل میں جانتا ہوں۔ اس وقت ہم اُسی کے عازم ہیں۔"

اچھا تو اس بندرگاہ کے جغرافیائی جائے وقوع کا جلد از جلد تعین کیجئے!"

مرشدِ کل کا فرمودہ صادر ہوا۔

بہت خوب

مگر اس اثنا میں برابر ہوشیار رہئے، اور ہوا کے ناگہانی جھونکوں کے متعلق حفظ ما تقدم کی ساری تدابیر کو ملحوظ رکھئے! کرۂ باد کے یہ جھونکے بعض اوقات بحرِ ہند کی مہلک امواج کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ــــ حکیم کی غیر مختتم عقلِ کُل کی ضمنی ہدایت تھی۔

سمندر کے سفر میں یہ چیزیں بڑی غدار واقع ہوئی ہیں؛ کپتان نے کہا

لَا تَسُبُّوا الدَّھْرَ! دریا ہم گوش دارد! دشنام دہی مناسب نہیں! بحرِ اعظم کا نفس اپنی اہانت کو پورے زندہ شعورِ غیرت سے محسوس کرے گا! حالات کا مشاہدہ اور تغیرات کا مطالعہ کرتے رہئے، اور خاطر جمع رکھئے!ــــ ہادیٔ برحق نے فرمایا:

بجا ہے، میں اس انتباہ پر کاربند رہونگا۔ اس وقت سمندر کا مد اور ہوا کا دھارا متضاد سمتوں میں جاری ہیں جس وقت یہ دونوں باہم یکجہتی اختیار کریں گے کشتی کی رفتار زیادہ محفوظ و متوازن ہو جائے گی"

حکیم کی نظر یکبارگی شمالی مشرقی گوشے پر جم گئی! اُس کے کافوری چہرے پر تاریک آثار ظاہر ہوئے۔ غیر معمولی دہشت و وحشت کے علامات اُس سنگین نقاب چہرے کو رقیق کرنے لگے! پھر دفعتہً اُس کے منہ سے نکلا، "خوب"

اُس کی آنکھیں جو چغد کی طرح گول گول تھیں۔ بدحواسی سے پھیل گئیں! اور افق پر جو فوق العادۃ منظر نظر آیا تھا۔ دوبارہ اُس پر مرکوز ہو گئیں۔ اُس کی زبان نے ان کلمات کی تکرار کی۔

بہت خوب ہے۔ میں بالکل رضا بقضا ہوں۔ مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ"

کپتان، حکیم کے واردات و خواطر کی طرف شدت سے متوجہ ہوا۔ آخر الذکر کی بڑ برابر جاری تھی۔ اپنی گفتگو کا یا تو وہ خود مخاطب تھا، یا پھر یہ سرگوشیاں رُوحِ بحر سے ہو رہی تھیں۔

مطلع پر ایک نظر ڈال کر اُس نے پھر کہا،

یہ چیز اگرچہ بہت دُور سے آرہی ہے۔ مگر اُس کے وجود میں نہ شک ہے نہ اُس کے آنے میں کلام۔

یہ قوسِ نُماشے جو اُفق پر نمایاں تھی، اور جو حکیم کے تارِ نظر اور سلسلۂ تخیلات کو اپنے سے ہم رشتہ کئے ہوئے تھی۔ شفقی تنویر میں صاف نظر آرہی تھی۔ اسی چیز کی طرف کپتان کی توجہ کو منعطف کراتے ہوئے حکیم نے استفسار کیا۔

کپتان: تم دیکھتے ہو؟

کیا چیز؟

وہ!

وہ فاصلے پر!

اچھا، وہ کبود ی رنگ کا دھبا سا! ہاں ہاں!"

یہ کیا شے ہے؟

سقفِ آسمانی میں ایک دریچہ سا!" کپتان نے شاعرانہ تشبیہہ پیش کی۔

اور غالباً اُن لوگوں کے لئے جو عازمِ بہشت بریں ہوتے ہیں: نیز اُن بزرگوں کے لئے بھی جن کی منزلِ مقصود، بہشت کے ساتھ اک رشتۂ انضمام رکھتی ہے ——— مگر خیر یہ اور معاملہ ہے:" حکیم نے ہمیرانہ تفسیر کی!

ہولناک پُراسراریت سے گرانبار جب یہ الفاظ حکیم کی زبان سے نکلے تو اُس کے چشم و ابرو پر دہشت و خشیت کے کچھ عجیب آثار نمودار ہوئے! مگر چونکہ تاریکی اب تک کافی ہو چکی تھی اس لئے حکیم موصوف کے اس وقتی چہرے کے تغیرات پر روشنی ڈالنا ناممکن تھا۔

اک سکوت طاری ہو گیا۔ کپتان کو بے اختیار وہ دو لقب یاد آئے جو کامپرلیشیکو جماعت کے سردار نے اس عسیرالفہم ہستی کے متعلق استعمال کئے تھے۔ اُس نے اپنے دل سے سوال کیا۔

یہ شخص واقعی کوئی خبطی و مراقی ہے یا کوئی دیوانہ نما دانا؟ ———

جس کے مبلغ علم و نظر تک ہم عوام کالانعام کی رسائی نہیں"

حکیم کی خشک و سخت استخوانی اُنگلی برابر اُس شے کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو مطلع پر اب اک حجابِ غبار میں رقصاں نظر آ رہی ہے۔

بلاشبہ یہ کوئی بادل کا ٹکڑا ہے۔ نیلے بادل کا!" بالآخر کپتان نے فیصلہ کر دیا۔

لیکن نیلا بادل کالے بادل سے زیادہ بلا ہائے آسمانی کا حامل ہوتا ہے" حکیم نے اپنی تعبیر میں "شانِ جلال" پیدا کر دی۔

کپتان نے اس جملے کو اپنی مخلوط فرانسیسی و ہسپانوی زبان میں دوہرایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اُس کا ترجمہ کرکے وہ اس کی پوری معنویت و سنگینی کو ذہن نشین کرنا چاہتا ہو!

حکیم بارِ دگر لب کشا ہوا۔

یہ اک برفانی بادل ہے! کپتان، تم جانتے ہو کہ برفانی بادل کیا ہوتا ہے؟

جی بالکل نہیں!" کپتان کا اعترافِ عجز تھا۔

شاید حالات کا اک برق رفتار تغیر اِس ابر برف کے ابہام کو منور کر دے!"

حکیم نے اپنے کلام میں اک مزید لہجۂ وعید پیدا کرتے ہوئے کہا۔

افق کا معلومہ پارۂ ابر بتدریج و بہ تسلسل اپنے قد و قامت کو بڑھا رہا ہے۔

حکیم نے ایسی حالت میں کہ اُس کی آنکھیں برابر اس چیز پر جمی ہوئی تھیں کپتان سے سوال کیا۔

"تمہارا گزر اس سے پہلے کبھی آبنائے انگلستان سے ہوا ہے؟

جناب، اُس کے عبور کا یہ پہلا ہی موقع ہے!"

حکیم کے بشرے پر اس اطلاع سے اک خاص قسم کی تشویش نظر آئی! اُس کے شانوں کو اضطراراً اک جنبش ہوئی! کپتان کے اس جواب پر اُس نے مزید سوال کیا۔

اس کے کیا معنی؟

میرے آقا! عام طور پر اپنے بحری سیر و گشت میں میرے دورے سواحل آرستان تک محدود رہے ہیں۔ اُس نواح میں میں اکثر سیاہ بندر پر لنگر انداز ہوا کرتا ہوں۔ وینزکے ساحل کے بعض نقاط کو بھی کبھی کبھی میری کشتی مس کیا کرتی ہے۔ مگر جس بحیرہ میں جزائر ہسپلی واقع ہیں اُس سے میں بالکل نابلد ہوں۔ یہاں جانے کا مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔

یہ تو بہت نازک معاملہ ہوا۔ حکیم بولا۔ سطح بحر پر ایسی سادہ لوحی اندوہناک نتائج پیدا کر سکتی ہے:

اُس نے مزید کہا۔

آبنائے انگریزی کی طبعی خصوصیات اور موسمی تغیرات کی واقفیت جہازرانوں کے لئے ازبس ضروری ہے۔ یہ آبی تنگنائے وسیع بحر محیط کا اک خوفناک دہانہ ہے! کم از کم اُس کی زیرِ آب چٹانوں سے خبردار رہئے:"

اس کے بعد تھوڑی دیر تک سمندر کا عمق ناپنے، اُس سے نتائج مستنبط کرنے اس سے نیک و بد شگون لینے کے حرف و حکایات رہے۔ لیکن سلسلۂ گفتگو پھر بدلا،

اور آبنائے انگلستان از سر نو موضوعِ ذکر و فکر بن گئی۔

حکیم نے پھر جتایا۔ "آبنائے کوئی معمولی گوشۂ بحر نہیں! جب اس میں طوفان و تلاطم ہوتا ہے تو اک منظر محشر سامنے ہوا کرتا ہے۔ سمندر کی موج پچاس پچاس فیٹ اونچی جاتی ہے! بحالتِ خیر ابھی اُس کی بلندی اس کے نصف سے کم نہیں ہوتی۔

آج رات کو سمندر کی تھاہ لینا چاہیئے" کپتان کا شوقِ عزم متحرک ہوا۔

پیمائش کے اس عمل کے لئے سمندر کے سکون کی ضرورت ہے، اور وہ مفقود ہے حکیم نے تنبیہہ کی۔

تاہم کوشش کریں گے" کپتان نے بات کی تیچ کی۔

کوشش چہ معنی دارد! ہم ایسی حالت میں اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے"

بہرحال، تن بتقدیر ہم ایسا کریں گے۔ خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔

ذرا ہوشیار ہو کر بات کیجے! یہ برگزیدہ اسم اعظم ایسی بے تکلفی سے مُنہ سے نکالنے کا نہیں ہے۔

میں اپنے الفاظ کو ہرگز واپس لینا نہیں چاہتا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میں ضرور پیمائش کی کارروائی کروں گا:" کپتان کی بالک ہٹ جاری رہی۔

ذرا عقل کے ناخن لو صاحبزادے! چند ہی لحظے کے اندر طوفان کے اِک تند جھونکے سے تمہیں سابقہ پڑتا ہے جس سے تمہیں اپنے پُرہول ماحول کے عمق کی پیمائش کا تھوڑا موقع البتہ ضرور ملے گا۔

کچھ بھی ہو، بندہ اس ارادے سے باز نہیں رہ سکتا۔" لاعلاج کپتان بولا۔

اچھی بات ہے۔ تو پھر سنو۔

سنو کا تنبیہی صیغۂ امر حکیم نے کچھ ایسے تمرد شکن اور تحدی خیز لہجے میں ادا کیا کہ کپتان کی پھونک نکل گئی! اُس نے نیاز کیشانہ کہا۔

میں ہمہ تن گوش ہوں، قبلہ!"

اچھا، اگر میری بات سنتے ہو تو کشتی کا رُخ ایک دم پچھم کی طرف پھیر دو۔

پچھم کی طرف! بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ کپتان کا شورِ تشکیک پھر اُبھر آیا!

جیسے بھی ممکن ہو: حکیم کا جواب تھا۔

لیکن میرے آقا! مغرب کی جانب؟ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔

ہاں ہاں، کپتان صاحب۔ میں یہی کہتا ہوں، اور یہ سب آپ ہی لوگوں کی خاطر! ورنہ خود مجھکو اپنی ذات کی مطلق پروا نہیں"

تو کیا جناب کا خیال ہے کہ اِس سمت میں آگے چل کر کرۂ فضائی کا اک نسبتہً پُرسکون حلقہ مل جائے گا؟

میری یہی امید ہے۔

کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ اس شیطانِ غرّاں (طوفان) کا کلیجہ تھوڑی دیر میں پھٹ جانے والا ہے؟ کپتان نے فاتحانہ استفسار کیا۔

اپنی زبان کو لگام دیجے اور رُوحِ طوفان سے معذرت کیجے! حکیم نے پھر صدائے احتجاج بلند کی۔

خیر ہو گا۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ مغرب کی طرف کشتی کو جنبش دینا بھی ناممکنات سے ہے! وہ یقیناً ہوا کے پہلے تھپیڑے پر پلٹ جائے گی۔ طوفان کا رُخ ہمیں بجائے مغرب کے مشرق کی سمت اختیار کرنے کی صلاح دیتا ہے۔

مگر سمتِ مشرق اور حادثۂ غرقابی ہم معنی الفاظ ہیں"

الغرض مشرق و مغرب کی رَدّ و کد عرصے تک جاری رہی۔ حکیم اپنی رائے میں ذرّہ برابر ترمیم کرنا نہ چاہتا تھا اور اُدھر اس تجویز کی غائت و مصلحت کو سمجھنا کپتان کے علم و فہم سے بالاتر تھا۔ وہ محض "مالک باخبر" کے کہنے پر بلا شرح صدر "بے سجادہ رنگیں کن" پر آمادہ نہ تھا: بالآخر اس نے کہا۔

بہتر ہے، میں مغرب ہی کی طرف چلوں گا۔

اس پر حکیم کپتان کی طرف پورا مُڑ کر بیٹھ گیا۔ اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، اس انداز سے کہ گویا اپنی قلبی بصیرت تمام و کمال مؤخر الذکر کے سینے میں منتقل کر دینا چاہتا ہے۔ اُس نے الفاظِ ذیل کو آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے ادا کیا۔

"اگر ..... آج رات کو ..... ہم ..... سمندر میں ..... کسی گھنٹی کی آواز ..... سنیں ..... تو ہم کو سمجھنا چاہیئے کہ ..... یہ کسی جہاز کی غرقابی کی صدائے بازگشت ہے!!"

کپتان تصویرِ حیرت بن کر رہ گیا:

کیا معنی؟

حکیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب وہ پہلے کی طرح پھر اپنی داخلی فکر کے گوشۂ خمول میں مراجعت کر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ ایک مرتبہ پھر اپنے ہی سے

مخاطب تھا اور خود کلامی کی زیرِ لب آواز میں کہہ رہا تھا۔

باغی روحوں کو توبہ و انابت کی طرف رجوع ہونا چاہیئے! اب وقت آگیا ہے کہ لوگ اپنے خالق سے مصالحت کرلیں۔

کپتان نے اس پیغمبرانہ اتمامِ حجت پر منہ چڑا دیا۔ اس نے (اپنے جی میں) کہا کہ یہ ضرور پاگل ہے۔

تاہم کشتی اب مغرب ہی کی جانب کشاں کشاں لے جا رہی ہے۔

(۵)

سطح کا ابر و غبار اک ہیولائی نور رکھتا تھا۔ مختلف موقعوں پر بادل میں آتی پاؤں سے نکلے ہوئے دکھائی دیتے تھے! طوفان کی شوراشوری یہ تخیلی توہم پیدا کر رہی تھی کہ گویا بے شمار غیر مرئی منہ ہوا کے تھیلوں کو پھونک رہے ہیں۔

افق کے مناظر مخدوش ہیئت اختیار کر رہے ہیں۔ مشرق و مغرب، ہر دو جانب فضا کی بعید ترین پہنائیوں تک، نیلے بادلوں کی یورش ہو رہی ہے۔ بعض اوقات یہ بادل ہوا کی متقابل سمت میں حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ موسم کی نیرنگیوں اور کرشمہ سازیوں کے بھی عجیب انداز ہیں۔

سمندر کی سطح نے کسی بحری جانور کی جلد کی سی ہیئت اختیار کرلی ہے؛ یہ جلدِ بدن اپنی علامات کے اعتبار سے مرضِ جذام میں مبتلا نظر آتی ہے۔ اچھلتے ہوئے پانی سے جو جھین اٹھتا ہے وہ گویا انشقاقِ جلد کی سی کیفیت پیدا کر رہا ہے۔

کپتان نے حکیم کی تلاش کی جو اب عرشے پر موجود نہ تھا۔ وہ نیچے کیبن میں چلا گیا تھا۔ یہاں وہ چولہے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اور اپنے لبادے سے اک جیبی بیاض نکالی تھی۔ اس کتابچی میں سے اس نے ایک چرمی کاغذ کا پرزہ برآمد کیا جس کی چار تہیں کی ہوئی تھیں اور جو نہایت کہنہ و فرسودہ، سیاہ و کثیف تھا۔ اس کاغذ کو کتاب پر جما کر اس نے اپنے گھٹنے پر رکھا اور قلم دوات نکال کر باورچی کی لالٹین کی روشنی میں کچھ لکھنا شروع کیا۔ طوفان کا شور و تزلزل اس کے اس مشغلے میں قطعاً مخل نہیں، وہ باطمینانِ تمام مطلوبہ تحریر لکھ رہا ہے۔

باورچی کھانا پکا رہا ہے اور ہانڈی کے نمک و ذائقہ کے چکھنے اور مسالے کے تناسب کے درست کرنے میں مصروف۔

حکیم یکبارگی باورچی کی طرف متوجہ ہوا اور جھک کر بولا۔

یہ لڑکی ——— یہ لڑکی تمہارے پہلو میں میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی! یہ ہارڈکینن کی ہے نا؟

جی ہاں، یہ ہمارے بد انجام رفیق ہارڈکینن ہی کی ہے۔

جو کہ قید خانے میں ہے؟

جی ہاں!

یعنی زندانِ جہیم کے اک محبس سیاہ میں!

جی ہاں۔ بیچارہ میرا بڑا دوست تھا۔ اس کی اب یہی یادگار باقی رہ گئی ہے۔ دیکھیئے اب کبھی ملتا بھی ہے یا نہیں! وہ کیسا اس لڑکی کو بوتل کی طرح اپنی کمر سے لٹکائے پھرا کرتا تھا"

حکیم اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ وہ کاغذ پر ادھر ادھر دور دور کچھ لکیریں کھینچ رہا ہے مگر اسے اس بات کا خاص خیال ملحوظ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تحریر صاف اور واضح رہے۔ طوفان زدہ کشتی کی پیہم جنبشوں اور پیری کی رعشہ دار انگلیوں کی مسلسل لرزشوں کے علی الرغم اس نے خاطر خواہ طور پر یہ کام سرانجام کیا۔

ناگہاں بحرِ اعظم نے اک کروٹ لی۔ اور پُرخروش امواج کے ہجوم نے کشتی کو نرغے میں لے لیا۔

کشتی کا رقص بیتاب دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ بالکل اک خسِ حقیر نظر آنے لگی۔ اک پرِ کاہ کی طرح اس نے اپنے آپ کو تلاطم کے رحم پر چھوڑ دیا۔

لیکن اسی اثنا میں حکیم پوری استقامتِ قلب کے ساتھ استادہ ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ آگ کے پاس گیا اور اپنی لکھی ہوئی تحریر کو وہاں سکھایا بعد ازاں اس نے چرمی کاغذ کو دوبارہ تہ کیا، اور بدستور جیبی کتاب کے اندر رکھ لیا۔

کشتی کے چولھے کی ساخت میں کسی ایجادی جدت یا اقتصادی لطافت کا التزام نہ کیا گیا تھا، چنانچہ تھوڑی دیر میں ہانڈی کے اندر اک زور کا ابال آیا۔ اپنی زبانِ شاکرہ سے باورچی بولا۔

کیا خوب مچھلی کا شوربہ ہے۔

جی ہاں، مگر شاید مچھلیاں ہی اسے نوشِ جان بھی کریں گی ———

حکیم کی زبانِ حقیقت ترجمان نے اک تنبیہہ رسید کی۔

یعنی؟ یعنی؟ ——— باورچی پوچھتا ہی رہ گیا۔ اور حکیم اک طرف کو چل دیا۔

(۶)

حکیم جن مشاغل میں قبل ازیں مصروف رہا تھا انھوں نے اُس کے قلب کے اندر رقت و معرفت کی اک خاص قسم کی فضا پیدا کردی تھی جس کی روشنی میں اُس نے موجودہ صورتِ حال کا مطالعہ کیا تھا۔ اپنی مرموز گفتگو کے بعض کلمات میں اُس نے اس حقیقتِ مضمرہ کی طرف وقتاً فوقتاً کنایات بھی کئے تھے۔

ہوا کا رُخ اب ٹھیک شمال کو ہو گیا ہے۔ یہ اک بامراد تھی۔ جو عین ان کی منہ مانگی دعا تھی، کشتی انگلستان کے ساحل سے گریزاگریز دور ہونے لگی۔ یہ ہوا مسافرین کو خطرے کے حلقے کے آخری حدود سے ایسے مؤثر اور خاطرخواہ طریقے سے نکال رہی تھی کہ کپتان نے ارادہ کرلیا کہ کشتی کے سارے بادبانوں کو کھول دے۔

طوفانی امواج کے کفِ سفید پرسے ریلتی ہوئی اور بیتاب لہروں پر جست وخیز کرتی ہوئی کشتی اک مستانی چال سے چلی جارہی ہے۔ اہلِ کشتی پھر ہشاش بشاش ہیں۔ وہ طوفانوں کی تندی ہوا کی طرفداری اور کشتی کی تیز رفتاری غرض ہر چیز کو شاباش کہہ رہے ہیں۔ اور بار بار اپنی تالیوں سے ان سب چیزوں کو داد دے رہے ہیں۔ پردۂ غیب میں اُن کے لئے جو کچھ چھپا ہوا ہے اُس سے وہ بالکل بے خبر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکیم اِن لوگوں کو اس وقت نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس لئے کہ وہ پھر اپنے خوابِ مراقبہ میں پہنچ گیا ہے۔

دن کا آخری نام و نشان بھی معدوم ہو چکا ہے۔ بچہ جو دور کی پہاڑی چوٹی سے نظر جمائے دیکھ رہا تھا اُس کو پہلی دفعہ کشتی آنکھوں سے اوجھل ہوتی دکھائی دی۔ کشتی جس حشر سے دوچار ہونے والی تھی اُس میں اِس مظلوم معصوم کی غیر مشہود نگاہِ یاس اور اُس کی غیر مسموع آہِ دلدوز کو کہاں تک دخل تھا۔

بہرحال کشتی کے ساتھ بچے کا تارِ نظر ٹوٹا اور بچہ شمال کی طرف اور کشتی جنوب کی جانب چلی گئی۔

ہر چیز غرقِ تاریکی ہو گئی ہے، تاہم کشتی کے اندر جشنِ مسرت کا فروغ ہنوز باقی ہے۔ جانستان اور روح فرسا سرزمین انگلستان کا ناشدنی ساحل اُن کے پس پشت دور پڑتا جا رہا ہے۔ اور ہر لمحہ اپنے ہیبت ہیئت قد و قامت کو کم کر رہا ہے۔ رفتہ رفتہ کشتی کے گرداگرد بحرِ محیط کا سیاہ حلقہ حصار بند ہو گیا، خشکی پر کی پہاڑیاں بھی اک فضائے تاریک میں ملفوف ہو گئیں۔ سواحلِ انگلستان کے تمام خط پر "لائٹ ہاؤسوں (منارہائے جہازی) کا" چراغاں" جلوہ گر ہو گیا۔ اب یہ سارا ملک اک حلقۂ آتشین کی آغوش میں تھا اور یہ حلقۂ آتشین بحرِ اعظم کے محاصرۂ آبی سے محصور!!

آخرکار ارضِ انگلستان کے سارے آثار غائب ہو گئے۔ کشتی اب چہار اطراف میں سمندر کی امواج سے پابزنجیر ہے۔ رات کا منظرِ ظلمات یکبارگی ہیبتناک تر ہو گیا ہے۔

اِس وقت اِس عالمِ آب میں خلائے مطلق کا نظارہ کن کن وارداتِ قلب کے الہامات سے لبریز ہے۔ سارا آسمان اک ناپیدا کنار "بحرِ اسود" بن گیا ہے جس نے کشتی کو اپنی بغل میں گم کرلیا ہے۔ برفباری بھی آہستہ آہستہ شروع ہو گئی ہے اور جابجا برف کی قلمیں منجمد ہو گئی ہیں۔ سطحِ بحر پر اُن کا کرمہائے شب تاب کی سی پرواز کا تماشا بھی کتنا نظر نواز ہے۔ الغرض اب سمندر صحیح معنی میں اک "بحرِ ظلمات" ہے۔ راکبانِ کشتی کی برخود غلط خوشی نے بھی بالآخر اپنے خطرناک موقف کو محسوس کیا ہے اب اُن کو امواجِ طوفان پر اک دامِ تحت بچھا ہوا نظر آتا ہے۔

بحرِ اعظم کے اس خطے میں ایسے ہی دار و گیر کے موقعوں پر "فوارۂ قطبینی" والا منظر بھی نظر آیا کرتا ہے۔

اک وسیع و عریض ابرِ غلیظ، مضطرب فرشِ بحر پر ایک سایۂ عفریتی کی طرح چھا گیا، بعض مقامات پر موجوں کی تاریکی سے اُس کے زیریں دامنوں کی جھالریں ہمکنار ہو رہی تھیں۔ یہ ہم آغوشی اک کُشتی سے نسبتہً زیادہ مشابہ تھی، زمین و آسماں باہم دست و گریباں ہو رہے تھے۔

طوفان نے اب براہِ راست کشتی کی مزاج پرسی شروع کی۔ آخرالذکر بھی اپنے حریف سے نبرد آزما ہونے کے لئے بڑھی! دونوں ایک دوسرے سے مبارز طلبی کرنے لگے۔

کشتی اپنے فرار کی ہیبت میں دیوانہ وار رفتار سے چلی جارہی تھی کہ ناگہاں مستول چرّایا اور پیچھے کی طرف مڑ کر رہ گیا! ع

پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ پڑی

لیکن یہ سمجھنا غلطی ہو گی کہ کشتی کو غرقابی کا کوئی فوری خطرہ ہے۔ ڈنمارک کے نہنگ آہنگ ملّاح اور بحرِ شمال کے ماہی مثال غوّاص و سیاح بڑے بڑے قیامت خیز طوفانوں سے عین قطبِ شمالی کے نواح میں پنجہ کشی کر چکے ہیں۔ اور بارہا اُن کی کلائی موڑ چکے ہیں۔

الغرض کشتی اور طوفان باہم دگر بُری طرح متصادم ہیں۔ باوجود اپنے "دلِ ناتواں" کے کشتی "خوب مقابلہ" کر رہی ہے۔ وہ فاتحانہ شان سے بادبان کا پھریرا اُڑاتی چلی جا رہی ہے۔ تاہم کشمکش اتنی سخت ہے کہ دو مجنونوں کی باہم آویزی کا نقشہ پیدا ہے۔ کشتی کے وہ تیور ہیں کہ بڑے بڑے امیر البحر بڑے بڑے خونریز بحری معرکوں میں بھی ایسی رُستمانہ بیباکیوں سے کام نہ لیتے ہوں گے۔

میٹو لنا تیزی سے بڑھی چلی جا رہی ہے۔ ہوا کا دباؤ کبھی کبھی اُسے اتنا جھکا دیتا ہے کہ سطحِ آب کے ساتھ پندرہ درجے کا خطرناک زاویۂ حادّہ بنانے لگتی ہے: مگر تلی کا نکیلا سرا کیل کی طرح سمندر کی نافِ شکم میں پیوست ہے اور کشتی کے مرکزِ ثقل کو متزلزل ہونے نہیں دیتا۔ اگلے حصّے میں لالٹین بھی برابر نصب ہے اور اس منزلِ تاریک میں ہر ممکن شعاعِ تنویر بہم پہنچا رہی ہے۔

تاہم تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد قہر انگیز رعد و برق کا دورہ پڑا کرتا ہے جس سے ابرِ سیاہ کا تاریک منظر بے نقاب ہو ہو جاتا ہے۔ آتشین شعلۂ برقی آنی طور پر قصرِ آسمانی کو بقعۂ نور بنا دیتا ہے۔ برق کی قلمیں انحرافِ نور کے مخصوص عمل سے اپنے بعض گوشوں میں بالکل سیاہ نظر آتے ہیں۔ برق کی تنویر پذیر فضا میں وہ کالی کالی تتلیاں بن کر اُڑتی دکھائی دیتی ہیں۔

اور پھر اک لمحے کے بعد یہ سارا مظہرِ نور و نار اک ہیولائے ظلمات میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔

طوفانی سمندر کے ناہموار "کوہستان" پر کشتی کی یہ دلیرانہ چڑھائی بڑی مخدوش ہے۔ بعض اوقات موجیں مستول کے سرے سے بھی اونچی نکل جاتی ہیں۔ پانی کے بے پناہ چھینٹے بار بار سارے عرشے کو "غسلِ میّت" دیتے نظر آتے ہیں۔ کشتی کے اندر گھس آنے والا پانی اس کے مختلف منافذ سے ایک پُر زور حقّے کی صورت میں باہر جا گرتا ہے۔ برفباری نے جو قیامت برپا کر رکھی ہے وہ اس پر مستزاد ہے۔ بیتابِ قلب

تاریکی نے اپنی سرد مہری کو درجۂ زمہریری تک پہنچا دیا ہے۔

یکبارگی جماعت کا پیر شیکو کا سردار کھڑا ہو گیا! اُس نے ایک ہاتھ سے کشتی کی رسّی کو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے سر کا رومال اُتارا، اور مجنونانہ جوش سے اُسے فضا میں ہلایا! وہ مسرّت سے بدمست معلوم ہوتا تھا۔ نشۂ تاریکی سے گویا سرشار ہو کر وہ باآوازِ بلند بولا۔

ہم اب آزاد ہیں۔

آزاد! آزاد!! آزاد!!! و—— ساری جامۂ پیشہ ٹولی سے صداہائے بازگشت اُٹھیں۔

"ہُرّے" سردار پھر چلّایا۔ بقیہ جتھے نے اس نعرے کی بھی ہم نوائی کی۔

شور و شغب کا یہ طوفان بے تمیزی تشکیل دیا تھا کہ کشتی کے دوسرے سرے سے اک سنگین و متین آواز اٹھی۔

خاموش! خاموش!"

سب دم بخود ہو گئے اور اُس طرف تکنے لگے۔ کہن سال حکیم کشتی کے مستول کے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ جانبین کی آنکھیں چار ہونے پر اُس کی زبان سے دوسرا پیام سنائی دیا۔

سنو سنو!

سارے اہلِ کشتی ہمہ تن گوش ہو گئے۔ اُس وقت اک پُر اسرار گھمّی کی واضح آواز سیلِ تاریکی میں سے ہوتی ہوئی گوش زد ہوئی۔

(۷)

ہا ہا ہا، کپتان نے قہقہہ مارا۔ گھنٹی! کیا خوب! اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی کہ خشکی قریب ہے۔

حکیم کی مضبوط، وزن دار آواز گونجی "جی نہیں!"

مگر کیوں نہیں جناب! کپتان نے حریفانہ پوچھا۔ ضرور یہی بات ہے، وہ مدعیانہ بولا۔

ہرگز نہیں! حکیم نے اپنی تردید کی توثیق مزید کی

تو کیا یہ گھنٹی کسی ساحل سے نہیں بجی! کپتان نے متحیرانہ استفہام کیا۔

عزیزِ من! یہ گھنٹی سمندر بجا رہا ہے! حکیم نے بالآخر اس رازِ سربستہ پر سے

پردہ اٹھایا۔

سب کانپ گئے۔

عورتوں کی سراسیمگی اور مایوسی دیدنی تھی۔

اس اثنا میں حکیم اپنی جگہ سے ہلا۔ اُس نے اپنی دراز قامت کو طویل سٹول سے جدا کیا۔ معاً گھنٹی کی اک اور صدا سینۂ بحر سے اٹھی! حکیم نے اس اعجوبۂ بحری کی تشریح و توجیہہ یوں شروع۔

پورٹ لینڈ اور جزائر آبنائے انگلستان کے درمیان ایک موقع پر کاگ کا ایک کندہ پڑا ہوا ہے جو اک آلۂ انتباہ کا کام دیتا ہے! کاگ کا یہ کندہ اک زیرِ آب جزیرے کی کمر سے بوسیلۂ اک زنجیر کے ہمرشتہ کر دیا گیا ہے۔ اس زنجیر میں اک گھنٹی بندھی ہوئی ہے۔ جب آبی تموج اس کاگ کو اُچھالتا ہے تو یہ گھنٹی بجتی ہے۔

یہ ہے اس نوائے غیب کی شانِ نزول! آیا خیال شریف میں!

سامعین غرقِ حیرت ہو کر رہ گئے ــــــ خشکی و تری، فرازِ کوہ اور قعرِ بحر کے اسرار کے ہمہ دانِ عالم اس بڈھے کے اِن "اخبار بالغیب" پر!

حکیم ذرا ٹھہرا، کہ ہوا کا اک غیر معمولی طور پر تند جھونکا گزر جائے۔ لیکن اسی مختصر وقفے کے دوران میں گھنٹی نے ایک دفعہ اور اپنے وجود کا اعلان کیا۔ حکیم نے اپنی بقیہ تقریر اس طرح جاری کی۔

شمالی مغربی ہوا کے طوفان میں جب یہ گھنٹی سننے میں آئے تو اُسے اک "سازِ موت" سمجھنا چاہیئے! اس لئے کہ کاگ کا موقع ایسا واقع ہوا ہے کہ اگر کوئی جہاز صحیح سمت میں جا رہا ہو تو گھنٹی سنائی نہیں دینی چاہیئے۔ کیونکہ ہوا کا رُخ برعکس سمت میں ہوگا۔ جس کی وجہ سے گھنٹی کی آواز کو اُس سے پرے لے جانا چاہیئے۔ پس گھنٹی کا بجنا اور سُننا ہماری غلط روی کا اطلاع نامہ ہے! ہماری راست روی کا تقاضا یہ تھا کہ اگر ہم گھنٹی کی جائے نصب سے بالکل متصل ہو کر بھی گزرتے۔ تب بھی اُس کی آواز ہمیں نہ سُنائی دیتی: الغرض گھنٹی کی آواز خطرے کا الارم ہے۔

اس وقت گھنٹی پھر بجی، اور حکیم کے استدلال کی صحت پر مہر تصدیق ثبت کی۔

تہذیب

بے باکی و عریانی تہذیب کا جوہر ہے　　وہ ہے سو وہ فیشن ہے یہ ہے سو یہ نیچر ہے

آپس میں لڑانا بھی اک عقل کا جوہر ہے　　اِس کام میں لوگوں کی تنخواہ مقرر ہے

کیوں اس قدر آخر وہ تہذیب سے باہر ہیں　　درخواست تو عاشق کی قانون کے اندر ہے

ہر وقت نئے جھانسے، ہر روز نئے وعدے　　اتوار کو منگل ہے، منگل کو سنیچر ہے

پوچھو رہِ الفت میں حالت نہ مرے دل کی
اس سست روی پر بھی غیرت دہ موٹر ہے

(احمق پھپھوندوی)

خدا کی عدالت میں ایک مغرور انسان

سید ابوتمیم فریدآبادی

وہ چھ فٹا انسان سینہ تانے ہوئے اور آنکھیں باری تعالیٰ کی طرف لگائے بڑی دلیری سے سپاہیانہ چال میں ماتھے پر شکنیں ڈالے آ رہا تھا۔

خدا نے پوچھا۔ کیا یہ وہی انسان ہے"؟ فرشتوں نے جواب دیا۔ خداوند یہ وہی انسان ہے۔

پھر خدا نے اس کی طرف دیکھکر کہا "کیا تو گنہگار نہیں ہے؟

وہ خاموش رہا خدا نے پوچھا۔ کیا تو نے کبھی جھوٹ نہیں بولا؟

اُس نے کہا "کئی مرتبہ"

"کیا تو نے غیبت نہیں کی"

"کی تھی"

ایک فرشتہ نے پوچھا۔ کیا تو نے ہم جنسوں کے ساتھ دھوکے بازی نہیں کی۔

اُس نے فرشتہ کو بہت بُری طرح گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "کی تھی"

پھر دوسری سمت فرشتہ سوال کرنے کے لئے کھڑا ہوا اور گردن جھکا کر باری تعالیٰ سے عرض کی "خداوندا، اس سے دریافت کیا جائے کہ یہ جوا کھیلتا تھا یا نہیں"

اُس انسان نے اس کی طرف فوراً پلٹ کر کہا "ہاں، ہاں، میں کھیلتا تھا، مگر تفریح طبع کے لئے نہ کہ دولتمند بننے کے لئے۔

دربار میں اُس کی گرجتی آواز سے سناٹا چھا گیا۔ کامل سکوت۔

یہ منظر اب بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔

تمام فرشتے اور ایک انسان خدائے تعالیٰ کی عدالت میں:

ایک فرشتے نے دبی زبان میں کہا۔ ظاہر اور باطن کے جاننے والے پروردگار اس خودسر انسان سے دریافت کیا جائے کہ کیا کبھی یہ لہو و لعب کی محفلوں میں اپنے دوستوں کے ہمراہ شریک نہیں ہوتا تھا۔

اُس انسان نے کس قدر دلیر وہ انسان تھا۔ پھر اُسی طرح تڑپ کر جواب دیا۔ ہاں، ہاں میں شریک ہوتا تھا"

باری تعالیٰ نے فرمایا پھر تو اس قدر مغرور کیوں ہے؟"

وہ انسان سجدے میں گر گیا۔ سجدے سے سر اٹھا کر اُس نے کہا "خدایا تجھے سب کچھ معلوم ہے" لیکن اگر تیری مصلحت یہی ہے کہ میں اپنے خودسر ہونے کی وجہ ان سب فرشتوں کے سامنے بیان کروں تو ————

اُس نے چاروں طرف فرشتوں کی طرف دیکھا اور اکڑی ہوئی گردن اور تنی ہوئی شکنوں اور مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے یوں گویا ہوا "اے خدا اور اس کے پاک فرشتو میں نے اپنی تمام زندگی میں ایک مرتبہ بھی خدا سے بغاوت نہیں کی۔ کسی ہستی کو خدا کا شریک نہیں ٹھہرایا۔

اب اُس کی زبان میں لکنت پیدا ہوتی جا رہی تھی اور وہ سنبھل سنبھل کر تقریر کر رہا تھا: میں کسی مٹی کے ڈھیر کے آگے نہیں جھکا۔ میں نے کسی انسان یا حیوان کو خدا تک پہنچنے کا وسیلہ نہیں بنایا"

میں نے اپنے ماں باپ کی پوری طرح فرمانبرداری کی اور خدا کے نام پر جان دینے کو بہترین طریقۂ موت سمجھا۔

یہ کہکر اُس نے مجمع پر پھر نگاہِ بے التفات ڈالی جس رعونت سے وہ آیا تھا اُسی رعونت کے ساتھ اُس کے قدم واپس جا رہے تھے ———— فاتحانہ انداز میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑا بھاری بوجھ سر سے اتار کر آ رہا ہے، ابھی وہ دربار سے باہر نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ میری آنکھ کھُل گئی۔

جمیل و ریحانہ

امام اکبر آبادی

جمیل جتنا حسین تھا، اتنا ہی غیر معمولی بہادر سپاہی بھی۔ اپنی بیوی ریحانہ سے شدید ترین محبت کرتا تھا۔ مگر اس سے زیادہ وطن سے۔ ہلکی پھیکی، اور مرجھائی ہوئی چاندنی میں اُس وقت جب کہ سہانی رات کا آخریں حصہ خاموشی و سکوت سے لبریز ہوتا ہے۔ اُس وقت جبکہ ننھے ننھے تارے مرجھائے ہوئے پھولوں کی طرح بیجان ہونے لگتے ہیں، اور اُس وقت جب کہ آسمان پر جوئے شیر کی روانی شروع ہوتی ہے۔ جمیل و ریحانہ اپنے خیمے سے باہر بیٹھے ہوئے معروف راز و نیاز ہیں۔

کیسا اچھا سہانا وقت ہے۔ جمیل نے کہا۔

ریحانہ (جس کی حسین آنکھوں میں رات کی بیداری نے رنگِ حنا بھر دیا تھا) اس کے جواب میں ایک خوفناک انگڑائی لی اور کہا۔ سامنے کی پہاڑیاں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا وجود اپنے اندر ایک مستقل عزم کا سبق پنہاں رکھتا ہے۔ مگر آہ ہانپتے ہوئے اور کپکپاتے ہوئے تشنہ سورج کی پیاس اُسی وقت بجھتی ہے، جب کہ ان پہاڑیوں کے دامن سپاہیوں کے خون سے تر ہو جاتے ہیں اور اس کی کرنیں اِن میں ڈوب جاتی ہیں۔

جمیل۔ آنے والی جنگ عربی لشکر کے لئے بڑی خوفناک ہے۔

ریحانہ۔ کیوں؟

جمیل۔ دشمن کی فوج دو لاکھ چالیس ہزار ہے اور ہماری صرف چالیس ہزار۔

ریحانہ۔ (شجاعانہ انداز کے ساتھ سر کے دراز گیسوؤں کو جھٹکا دے کر) پرواہ نہیں، غیبی امداد ہمارے ساتھ ہے۔

جمیل (افسردگی کے ساتھ) مجھے تم سے شدید محبت ہے۔

ریحانہ۔ (وحشت زا نگاہوں کے ساتھ) علیٰ ہذا۔

~~~~~~~~~~

نمودِ صبح کے آثار شروع ہو گئے۔ سورج کے پرّاں بازو آسمان پر پھیل گئے اور اُس کی سنہری کرنوں نے قریب کی تمام پہاڑیوں کو روشن کر دیا۔ احرارِ عرب عبادتِ الٰہی سے فارغ ہو کر جنگی طیاریوں میں معروف ہو گئے اور دفعتہً آگ اور خون کا کھیل شروع ہو گیا۔ دشمن کی تمام فوج عربی لشکر پر ٹوٹ پڑی اور اس کے میمنہ کو منتشر کر دیا۔ کچھ وقفہ تک جنگ جاری رہی۔ بالآخر بھوکے، پیاسے اور بے سروسامان عرب بہادروں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہاں تک کہ یہ اپنے حرم کے خیموں تک ہٹتے چلے گئے۔

~~~~~~~~~~

مہرِ نیمروز کی شعاعیں اب دمشق کے ریگستانوں کے ذروں کو آتش پارے بنانے لگیں، نسوانی حرارت اپنے نیم شکست خوردہ احرار کی وجہ سے قہر و غضب میں مبدل ہونے لگی۔ اور جنگی حالات رومی عیسائیوں کے حق میں فیصلہ کرنے لگے، کہ دفعتہً گروہِ نسواں نے اپنے غیرت آفریں اور برق پاش الفاظ سے ہزیمت خوردہ احرار میں ایک نوع کی روح پھونک دی۔ اور اسی کے ساتھ خیموں کی میخیں اور تلواریں لے کر دشمن پر اس طرح جھپٹا جس طرح کوئی بھوکا شیر اپنے شکار پر جھپٹتا ہے یا جس طرح کوئی سخت و شدید طوفان بڑے سے بڑے اور مضبوط سے مضبوط درخت کو اُس کی جگہ سے اُکھاڑ پھینکتا ہے۔ عربی لشکر نے یہ حالت دیکھکر برق تاسرعت

کیساتھ پیش قدمی کی ۔ اور آن کی آن میں جنگ کا نقشہ بدل دیا ۔

~~~~~~~~~~

عرب فاتحین جب رات کو اپنے خیموں کی طرف پلٹے تو دیکھا کہ چند سپاہی جمیل کی لاش لا رہے ہیں ۔ لاش کا منہ کفن سے ڈھک کر خیمے کے اندر رکھ دی ۔

~~~~~~~~~~

ریحانہ پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا ۔ مگر کوئی آنسو اس کی آنکھ سے جاری نہ ہوا ۔ یہ حالت دیکھکر اس کی ایک سہیلی نے دوسری کے کان میں آہستہ سے کہا "اس کے سر پر موت منڈلا رہی ہے ۔ اس کو رونا چاہیئے " چنانچہ دوسری نے جمیل کی بہادری کی تعریف شروع کر دی ۔ اور تیسری نے اس کے حسن و کشیدہ قامتی کا مرثیہ پڑھا ۔ مگر ریحانہ اب بھی نہ روئی ۔

چوتھی نے ایک سرد آہ کے ساتھ نہایت نرم دھیمی آواز میں اپنی کپکپاتی ہوئی زبان سے کہا " آہ بہادر شہید کیسا محبت اتنا سپاہی تھا " مگر ریحانہ کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ آیا ۔

پانچویں نے ایک چیخ ماری اور کہا " آہ مرنے والا اپنی بیوی کا کیسا سچا دوست تھا ، اور غنیم کے لئے کتنا شریف دشمن " مگر اب بھی اس کی آنکھیں خشک تھیں ۔

اب جمیل کے ایک دوست نے اس کے چہرے سے کفن ہٹا دیا اور سب نے جب بہادر شہید کو دیکھ کر ریحانہ پر نظریں ڈالیں تو اس کی دونوں آنکھیں شیشے کی طرح چمکیلی اور ساکت پائیں ۔

دفعتہً اُن میں سے ایک بہادر ضعیفہ اُٹھی ، دیکھا تو ریحانہ کا مرمریں جسم سرد تھا اور بے روح ۔

~~~~~~~~~~

بازیافت

(ٹیگور کی ایک کہانی کا ترجمہ)

شاعرِ اعظم تلسی داس خیالات میں غرق گنگا کے کنارے اس ویران جگہ میں ٹہل رہے تھے ، جہاں لوگ مُردوں کو جلاتے ہیں ۔

اُنھوں نے ایک عورت کو دیکھا جو عروسی لباس پہنے اپنے شوہر کی لاش کے پیروں کے پاس بیٹھی تھی ۔

اُنھیں دیکھ کر وہ اُٹھی ، پرنام کیا اور بولی " مالک ! مجھے اپنی دعاؤں کے ساتھ اجازت دیجئے کہ میں اپنے پتی سے بہشت میں جا ملوں ۔

کیوں بیٹی اس قدر جلدی کیوں ؟ تلسی داس نے پوچھا ۔ کیا یہ دنیا بھی اسی کی نہیں جس نے بہشت بنائی ؟ "

" لیکن مجھے بہشت کی تو تمنا نہیں " عورت نے کہا " مجھے میرا شوہر چاہیئے "

تلسی داس مسکرائے اور بولے " بچی گھر واپس جا ۔ اور اس مہینہ کے ختم ہونے سے پہلے تو اپنے شوہر کو پا لے گی ۔

عورت خوش خوش بڑی امید دل کے ساتھ واپس چلی گئی ۔ تلسی داس روز اس کے گھر پر جاتے اور اُسے بڑی بڑی باتیں اور بلند خیالات بتاتے یہاں تک کہ اس کا دل عشقِ حقیقی سے معمور ہو گیا ——— ابھی مہینہ مشکل سے ختم ہوا تھا کہ اس کے ہمسائے اس کے پاس آئے اور پوچھنے لگے " تمہیں شوہر مل گیا ؟ "

بیوہ مسکرائی اور بولی " ہاں ——— اُنھوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا " وہ کہاں ہے ؟ "

میرا آقا میرے سینے میں ہے ۔ اب میں اور وہ ایک ہیں ۔ عورت نے جواب دیا ۔

(تمنائی)
ایڈیٹر شمیم پٹنہ
~~~~~~~~~~

کلیم دهلی



آینهٔ وینس



بَربطِ جاں نواز

رنگ میں بھر، اور روپ میں بھر، تو ساز میں بھر آواز میں بھر　　نین میں بھر اور بول میں بھر، تو ناز میں بھر انداز میں بھر

بربطِ جاں میں بھر دے پیم پیارا پیارا پریت کا راگ

مہر و محبت ہو گئی چَنپت، بنیا ہے منجدھار　　پریم کی ڈوری ٹوٹ رہی ہے، کیسے ہوں اُس پار

حرص و حسد میں ڈوبے گیانی ڈوبے آگ

ہند کے پھر پُرکیف اُفق سے الفت کا مہتاب　　اوٹ وفا کی لے کر جھکے دیکھیں شیخ و شاب

جگمگ جگمگ جگمگ جگمگ، جھمکیں ہند کے بھاگ

چھوڑ برہمن پوجا پاٹھی، شیخ مصلّے تہہ کر دے　　پریم کا منتر پھونک دے اُٹھکر ہند نگر میں پے در پے

خانۂ دل میں کوئی نہ پالے بغض و حسد کے کالے ناگ

آپس میں جو، اَن بَن ڈالیں مذہب یا مِلّت پیارے　　پاپ کے جو رستے پر لاویں شیخ و برہمن مت مارے

مذہب، مِلّت، شیخ و برہمن سب کو دیکھو گیانی تیاگ

بھائی، برادر، آپس والے جو گُن دُشمنی کا سِکھلائیں　　جگ بھر سے جو دل برکا دیں آگ تعصب کی بھڑکائیں

اُن کی بُدھی ٹھکرا دیجو رکھیو نا تو ایک سے لاگ

دھرتی ماتا جاگ چکی ہے، جاگ چکا ہے سب سنسار　　جاگ چکی ہستی کی بستی جاتی ہے کر آنکھیں چار

بیچ ڈگر میں سونے والے، بھولے بھالے ساتھی جاگ

(بلقیس جمال)

شواعرُ العرب

(بسلسلۂ ماسبق)

(سید خلیل الرحمٰن اعظمی متعلم جامعہ دہلی)

زمانۂ اسلام کے ابتدائی دور میں عربی شاعری کے اندر وہ رنگ باقی نہیں رہا۔ جو زمانۂ جاہلیت میں تھا۔ اس لئے کہ زمانۂ جاہلیت میں جو قبائل کے درمیان عصبیت تھی، خاندانی تفوق تھا، ذات پات کا فرق اور نسلی امتیازات تھے، اسلام نے ایک ایک کرکے مٹا ڈالے۔ قبائل کی باہم خانہ جنگیاں ختم ہوگئیں اور سارے ملک میں ھل من مبارز کہنے والا کوئی نہ رہا۔ شاعری کا میدان تنگ ہوا۔ اور اُن کی زبان آوری کا سیلاب شعر وسخن کے بجائے خطابت و موعظت کی طرف پلٹ گیا۔ اب اُن کی جادو بیانی، اخلاقی اور معاشرتی تعلیم، قومی اور ملکی اصلاح، حمایتِ دین اور دعوتِ الی الحق میں صرف ہونے لگی جس میں ظاہر ہے کہ عورت کا حصہ قدرتی طور پر کم ہوتا ہے۔

جذباتِ شاعری میں طوفان برپا کرنے والی در اصل تین چیزیں ہیں۔ جنگ۔ موت۔ محبت۔ زمانۂ جاہلیت میں گو عشقیہ شاعری تھی، مگر بہت کم، اُن کی شاعری کا زیادہ حصہ مرثیہ گوئی اور فخریہ شاعری پر مشتمل تھا۔ جو در اصل جنگ میں ناکامی اور کامیابی کے دو نتیجے ہیں۔

اہلِ عرب کی شاعری اور رجز گوئی چونکہ قبائل میں اکثر خونریز جنگ کا باعث بن جایا کرتی تھی۔ اس لئے آنحضرت صلعم کو قطعاً اس سے دلچسپی نہ تھی، آپ سارے ملکِ عرب کو ایک پرچم کے نیچے جمع کرنا چاہتے تھے۔ جس میں اس زمانہ کی شاعری ہمیشہ سنگِ راہ واقع ہوتی تھی۔ اس لئے آپ اس کو سیاسی حیثیت سے بھی کچھ زیادہ پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ شاعر نے اگر کبھی کوئی سب سے اچھی اور سچی بات کہی ہے تو وہ صرف لبید کا یہ قول ہے۔

الا کل شئ ماخلا اللہ باطل" ہاں خدا کے علاوہ سب کچھ جھوٹ ہے

(تاریخ ادب اللغۃ العربیہ جلد اول صفحہ ۱۹۶)

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آنحضرت صلعم شعر گوئی کو کوئی بُری چیز سمجھتے تھے۔ خود آپ نے حضرتِ حسان بن ثابت۔ کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ کو کفارِ مکّہ کا دنداں شکن جواب دینے کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔ آپ مذکورہ بالا حضرات کا کلام سنتے تھے۔ اظہارِ مسرّت فرماتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ یہ اشعار کفارِ مکّہ پر نیزے اور بھالوں سے زیادہ اثر کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرتِ حسّان سے فرمایا۔

اھجہم (یعنی قریشا) فو اللہ	قریش کی ہجو کرو، خدا کی قسم
لھجاؤك علیھم اشد من وقع	تمہاری ہجو اُن پر اُس تیر سے زیادہ
السھام فی غلس الظلام	کاری ہوتی ہے جو اندھیری رات میں کسی پر پڑتا ہے۔
اھجہم ومعك جبریل روح القدس	اُن کی ہجو کرو، روح القدس جبریل تمہارے مددگار ہیں۔

(کتاب العمدہ جلد اول صفحہ ۱۲)

خلفاء راشدین اگرچہ خود اچھے خاصے شاعر تھے، حضرت ابوبکرؓ کا وہ قصیدہ مشہور ہے جو انھوں نے غزوۂ عبیدہ بن حارث میں کہا تھا۔ حضرت عمرؓ اور

حضرت عثمانؓ کے بھی حکمت و موعظت پر بہت سے عمدہ اشعار منقول ہیں۔ حضرت علیؓ تو شاعری اور خطابت کے امام ہی مانے جاتے ہیں۔ آپ کا دیوان بھی مصر و حجاز اور ہندوستان وغیرہ مختلف مقامات پر چھپ چکا ہے۔ تاہم شعر گوئی کو مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر یہ حضرات بھی کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔

اس لئے اس دور میں فخریہ شاعری تو تقریباً مفقود ہو گئی۔ مرثیہ گوئی اور ہجو گوئی بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ اخلاقی شاعری کو البتہ کسی قدر عروج ہوا۔ بہاریہ شاعری کا تو کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ اور ملک کی آب و ہوا اور جائے وقوع کو دیکھتے ہوئے ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ ہاں عشقیہ شاعری جو انسان کے جذباتِ لطیفہ سے تعلق رکھتی ہے البتہ پائی جاتی تھی۔ مگر بہت ہی معصومانہ انداز میں، نہ اس میں وصل و ہجر کی بے بنیاد داستان ہوتی تھی، اور نہ شہوانی خواہشات کے من گھڑت افسانے حتیٰ کہ کسی محبوبہ کا نام لے کر تشبیب کرنا بھی بدتمیزی میں داخل تھا۔ خلفاء راشدین اس معاملہ میں بہت سخت تھے۔ اگر کوئی شاعر ایسی حرکت کرتا تھا تو اس کو دُرّے لگوائے جاتے تھے۔

اسی مقدس عہد کے دو سچے عاشق و معشوق عتبہ بن حباب انصاری اور ریّا بنت الغطریف السلمی ہیں جو حسن و جمال کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ان دونوں کا افسانۂ محبت کا وہ پاک صحیفہ ہے جس کا جواب دنیائے عشق میں تاقیامت نہ ہو سکے گا۔ داستان اگرچہ دلچسپ ہے۔ لیکن طویل ہے اور ہمارے موضوع سے خارج بھی ہے۔ اس لئے ہم اُسے نظر انداز کرتے ہیں۔ اس جگہ پر یکجال ریّا بنت الغطریف کے صرف دو شعر نقل کرتے ہیں جو مرحومہ نے اس وقت کہے تھے جب وہ شادی کے بعد اپنے عاشق دولہا کے ساتھ مع ساز و سامان کے رخصت ہو کر مدینہ جا رہی تھی۔ راستہ میں غریب عتبہ ڈاکوؤں کے ہاتھ سے مارا گیا جیسے وہ کھڑی دیکھ رہی تھی۔

(۱) تصبرت لا انی صبرت وانّما — میں نے صبر کیا۔ مگر یہ صبر اس لئے تھا کہ
اُعلّلُ نفسی انھا بک لاحقۃ — میں اپنی جان کو تمہارے پاس پہنچنے کے لئے بہلا سکوں
(۲) ولو انصفت روحی لکانت الی الردیٰ — اگر انصاف کرے تو میری روح کو ہلاک ہو کر
امامک من دون البریۃ سابقۃ — تمام دنیا سے پہلے تمہارے پاس پہنچنا چاہئیے۔

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۲۱۴)

نازنین ریّا نے یہ کہا اور ایک چیخ مار کر اپنے عاشقِ زار عتبہ کی لاش پر گری اور وہیں جان دے دی۔ یہ قیامت کا منظر تھا، ایک طلسم تھا جس پر ڈاکو اور قافلہ والے سب ہی کھڑے رو رہے تھے۔ روتے روتے جب ذرا اُنھیں ہوش آیا تو اِن شہیدانِ باوفا کی لاشیں اُٹھا کر ایک ہی قبر میں دفن کر دیں۔ کچھ روز کے بعد اُن کی قبر پر ایک درخت اُگا جس کا نام لوگوں نے شجرۃ العروسین رکھا تھا۔ یہ ہے اس خیر القرون کا پاک اور سچا عشق جس کی داستان قیامت تک حسن و عشق کے بڑے بڑے افسانوں کو شرماتی رہے گی۔

خلفاء راشدین کا زمانہ ختم ہوتے ہی بنو اُمیّہ کے عہد میں زمانۂ جاہلیت کی شاعری پھر سے زندہ ہو گئی۔ قبائل میں پھر وہی عصبیت جاہلیہ اور خاندانی تفوق کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور فخریہ شاعری نے دوبارہ جنم لیا۔

امیر معاویہ بڑے سیاسی اور مدبر آدمی تھے۔ اُنھوں نے جب اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہیں تو اُن کو ضرورت محسوس ہوئی کہ قبائل عرب میں پھر وہی عصبیت جاہلیہ اور خاندانی تفوق پیدا کر دیا جائے۔ اہلِ بیت اور انصارِ علیؓ کے خلاف خوب پروپگنڈا کیا جائے۔ تاکہ پھر کوئی سر نہ اُٹھا سکے۔ اس کام کے لئے انھوں نے بڑا روپیہ صرف کیا۔ شعراء کو داد و دہش سے مالا مال کر دیا۔ اُن کی تنخواہیں اور وظیفے مقرر کئے۔ یہاں تک کہ حکومت کے نظم و نسق میں شاعری

کتاب الاغانی جلد چہارم صفحہ ۹۰

کو بڑا دخل ہوگیا۔

امیر معاویہ کو اس میں بڑا ملکہ تھا کہ شعراء میں سے کس کس کو توڑنا چاہیئے۔ اور کن کن کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے، ہر ایسا شخص جو اُن کی حکومت متزلزل کرسکتا تھا امیر معاویہ اُس کا بیت المال سے وظیفہ مقرر کرکے اپنا مقرب بنالیا کرتے تھے جس کا کم از کم یہ اثر ہوتا تھا کہ مخالفت میں زہر اُگلنے والی زبانیں بند رہتی تھیں الاماشاءاللہ

دارمیۃ عہدِ صحابہ کی ایک پُرجوش راست باز اور بڑی زبان آور خاتون تھیں۔ اُنھیں حضرت علیؓ سے جس قدر زیادہ محبت تھی اتنی ہی امیر معاویہ سے نفرت تھی۔ اس لئے امیر معاویہ کو اُنھیں خوش کرنے کی بڑی فکر تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ اُنھیں امیر معاویہ نے بُلوا بھیجا، اور اُن سے کہا "تمہیں معلوم ہے میں نے تمہیں کیوں بلوایا ہے؟ میں آج یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمہیں علیؓ سے کیوں محبت تھی۔ اور مجھ سے کیوں نفرت ہے؟" وہ شیر دل خاتون بولی "مجھے حضرت علیؓ سے اس لئے محبت تھی کہ وہ رعایا کے ساتھ انصاف کرتے تھے۔ حقوق میں مساوات کا خیال رکھتے تھے۔ تم سے اس لئے نفرت ہے کہ تم خلافت کے لئے ایک ایسے شخص سے لڑے جو تم سے زیادہ اس کا مستحق تھا۔ تم نے خونریزی کی، فیصلہ کرتے وقت لوگوں پر ظلم کرتے ہو۔ اور خواہشِ نفسانی کے مطابق احکام جاری کرتے ہو۔"

امیر معاویہ نے جل کر کہا "اسی بغض بھرے ہونے کی وجہ سے تمہارا پیٹ پھول گیا ہے۔" اس پر اس باعزت خاتون کو غصہ آگیا، اُس نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا "اِس صفت میں تو تمہاری ماں مجھ سے زیادہ مشہور تھیں۔" امیر معاویہ نے جھینپ کر کہا، خفا ہونے کی بات نہیں، اچھا بتاؤ تم نے علیؓ کو دیکھا تھا اُنھیں تم نے کیسا پایا؟ اُنھوں نے فرمایا ہاں! میں نے اُن کو دیکھا تھا، اُن کی باتیں بھی سنی تھیں، خدا کی قسم اُن کی باتیں سُن کر دل روشن ہو جاتا تھا، یہی حکومت جس نے تم کو فتنہ میں مبتلا کر رکھا ہے اُن کو مبتلا نہ کرسکی۔ اور یہی دولت جس نے تم کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اُن کو نہ بنا سکی۔

امیر معاویہ یہ کھری کھری باتیں سنکر حیران رہ گئے۔ وہ کہنے لگے "اچھا تم مجھ سے کیا چاہتی ہو، جو مانگو گی دوں گا۔"

انھوں نے کہا "تو پھر سو اونٹنیاں ملنی چاہئیں جن کے ساتھ ان کے بچے بھی ہوں۔ اور چرانے والے بھی۔" امیر معاویہ بولے "اگر میں تمہاری یہ خواہش پوری کردوں تو پھر تم مجھے ویسا ہی سمجھنے لگو گی، جیسا علیؓ کو سمجھتی تھیں۔" اس پر وہ مسکرائیں اور کہا "کیا خوب اُن کے برابر تو کیا، میں تم کو اُن سے کم بھی نہیں سمجھ سکتی۔"

امیر معاویہ نے کہا "خیر لو تم بھی کیا یاد کرو گی۔ علیؓ اگر زندہ ہوتے تو خدا کی قسم وہ اتنے اونٹ تم کو ہرگز نہ دیتے" جس پر وہ ایمان دار خاتون بولیں "بیشک وہ ہرگز نہ دیتے۔ وہ تو مسلمانوں کے بیت المال میں سے اونٹ تو بڑی چیز ہے، ایک رویان بھی نہ دیتے۔"

(دیکھو الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۱۸۹)

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ امیر معاویہ کو زبان آور شعراء کو توڑنے اور اپنا موافق بنانے کا کس قدر خیال تھا، اور اُن کو کس طرح زر و دولت سے خوش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس تمام کد و کاوش کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس زمانے کے شعراء اور خطباء ملک و قوم کے جذبات و احساسات کے مالک تھے، وہ جب چاہتے تھے شاہی مسندیں کو الٹ دیتے تھے، اور جب چاہتے تھے ایوانِ حکومت تاراج کر ڈالتے تھے۔ امیر معاویہ نے اپنی سیاسی ضرورتوں کی بنا پر اس شراب کو دو آتشہ سے سہ آتشہ بنادیا۔ جس سے شاعری کا پھر وہی دور آگیا۔ جو زمانۂ جاہلیت میں تھا۔ مشاعرے کی مجلسیں منعقد ہونے لگیں، شعر و سخن پر تنقیدیں کی جانے لگیں۔ جن میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں نے بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔

خود حضرت سکینہ بنت حسینؓ، عائشہ بنت طلحہ اور اس زمانے کے مشہور شاعر ابو دہبل کی بیوی عمرہ وغیرہ اکثر شعر و سخن کی مجلسیں منعقد کیا کرتی تھیں۔ جن میں مرد بھی بلا تکلف شریک ہوا کرتے تھے۔ اُن کے کلام پر خوب خوب تنقیدیں کی جاتی تھیں، تبصرے ہوتے تھے اور کلام کی خوبی پر دل کھول کر داد دی جاتی تھی۔

---

۵ آداب اللغۃ العربیہ جلد اول صفحہ ۳۵

ایک مرتبہ حضرت سکینہ کی دعوت پر اس زمانہ کے مشہور اساتذہ جریر۔ فرزدق۔ نصیب۔ کثیر اور جمیل جمع ہوئے سب نے باری باری سے اپنا اپنا کلام سنایا، آخر میں بثینہ کے عاشق زار جمیل کے پاس لونڈی آئی۔ اور اس نے کہا، ہماری مالکہ آپ کو سلام کہتی ہیں، اور فرماتی ہیں کہ جب سے میں نے آپ کے اشعار سُنے تھے آپکے دیکھنے کی مشتاق تھی۔

(۱)	الا لیت شعری ھل ابیتن لیلۃً	کاش مجھے علم ہوتا کہ میں وادی القریٰ میں کبھی رات
	بوادی القریٰ انی اذا لسعید	گذاروں گا، میں اس وقت اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتا
(۲)	لکل حدیث بینھن بشاشۃ	اُن کی ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے
	وکل قتیل عندھن شھید	اور اُن کا ہر کشتۂ عشق شہید ہوتا ہے۔

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور مطبوعہ مصر صفحہ ۲۴۶)

اس زمانہ میں گو بہت سی قادر الکلام عورتیں پیدا ہوئیں مگر ان میں جو مرتبہ لیلی الاخیلیہ کا ہے کسی کا نہیں۔ علامہ جرجی زیدان نے بھی لیلی اخیلیہ ہی کو سب پر ترجیح دی ہے۔ اس لئے ہم اسی کے مختصر حالات پر اکتفا کرتے ہیں۔

لیلی الاخیلیہ عبد اللہ بن رحال کی بیٹی ہے۔ وہ اپنے زمانہ کی نہایت ہی پری جمال اور نازک خیال شاعرہ تھی۔ زمانۂ اسلام کی نسوانی شاعری میں اس کا وہی مرتبہ ہے جو زمانۂ جاہلیت میں خنسا کا تھا۔ اس زمانہ کا مشہور شاعر توبہ بن الحمیر العامری کو اس سے عشق تھا۔ پہلے تو چھپ چھپ کر اس سے ملتا رہا۔ لیکن جب فراقِ یار کی تاب نہ رہی تو اس نے لیلیٰ کے والد بزرگوار کے پاس شادی کا پیام بھیجا۔ چونکہ یہ خبر پہلے ہی اُڑ چکی تھی کہ توبہ کو لیلیٰ سے عشق ہے۔ اس لئے اس نے اہل عرب کی رسم و رواج کا خیال کرتے ہوئے اس رشتہ سے انکار کر دیا اور قبیلہ بنی ادلع کے ایک شخص سے اُس کی شادی کر دی۔

توبہ کو اس کی خبر نہ تھی۔ ایک روز حسب معمول رات کی تاریکی میں لیلیٰ سے ملنے گیا۔ دیکھا، تو خلاف معمول اس باعصمت خاتون کے چہرہ سے نقاب الٹا ہوا ہے توبہ کھٹکا اور سمجھا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ لیلیٰ آگے بڑھی اور اس نے رازدارانہ طریقے سے کہا، میں دیر سے تمہاری منتظر تھی۔ لوگ تمہاری تاک میں ہیں، خیریت اسی میں ہے کہ ابھی یہاں سے چل دو۔ محبت کا مارا توبہ جان بچا کر بھاگا۔ مگر ساتھ ہی اس واقعہ کو اس نے بڑے لمبے چوڑے قصیدے میں نظم کر ڈالا جس کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

کنت اذا ما زرت لیلیٰ تبرقعت	میں جب کبھی لیلیٰ کے پاس آتا تھا تو، وہ چہرہ پر نقاب ڈال لیا
فقد رابنی منھا الغداۃ سفورھا	کرتی تھی کل جو میں نے اسکی نقاب الٹی ہوئی دیکھی تو مجھے کھٹکا سا پیدا ہو گیا

لوگ چونکہ عام طور سے اس کے اور لیلیٰ کے پاک تعلقات پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں کرنے لگے۔ اس لئے وہ اسی قصیدہ میں اپنی اور لیلیٰ کی پاک دامنی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

علیَّ دماء البدن ان کان بعلھا	مجھے کفارہ میں اونٹوں کی قربانیاں دینی پڑیں اگر اس کا شوہر
یری لی ذنباً غیر انی ازورھا	بغیر اس کے کہ میں اس سے مل لیتا ہوں میری اور کوئی خطا پا سکے

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۴۶۸)

توبہ بڑا جنگجو اور دلیر نوجوان تھا۔ بہت سے غزوات میں اس نے شرکت کی اور ہمیشہ ظفرمندی و کامرانی کا پرچم اُڑاتا ہوا لوٹا۔ ۸۵ھ میں ایک مرتبہ وہ بُری طرح بنو عوف کے نرغہ میں پھنسا اور مارا گیا۔

لیلیٰ کو جب اس حادثہ کی اطلاع ہوئی تو اس کو دلی صدمہ پہنچا۔ اس کے غم میں اُس نے بہت سے مرثیے کہے۔ جن میں سے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

(۱) اقسمت ارثی بعد توبۃ ھالکاً — میں نے قسم کھائی ہے کہ توبہ کے بعد ہر ہلاک ہونے والے کا مرثیہ
احفل لمن دارت علیہ الدوائر — کہوں گی اور ہر اُس شخص کے لئے جلسۂ تعزیت منعقد کروں گی جس پر مصائب
لعمرک ما بالموت عار علی الفتی — لوٹ پڑے ہوں۔ تمہاری جان کی قسم موت اس نوجوان کے لئے
اذا لم تصبہ فی الحیوۃ المعایر — باعثِ شرم نہیں ہے جس کی زندگی ننگ و عار سے خالی ہو
وما احدٌ حیٌ وان عاش سالماً — کوئی زندہ شخص اگرچہ وہ بالفعل صحیح و سالم ہو ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں
باخلد ممن غیبتہ المقابر — ہے جیسا کہ وہ لوگ جنھیں قبروں نے اپنے آغوش میں غائب رکھا ہے
ومن کان مما یحدث الدھر جازعاً — جس شخص کو زمانہ نے آہ و زاری میں مبتلا کر رکھا ہے۔ کسی
فلا بد یوماً ان یری وھو صابر — نہ کسی روز دیکھا جائے گا کہ اسے صبر آگیا ہے۔
وکل شباب او جدید الی بلی — جوانی اور نئی چیز بوسیدہ ہو کر رہے گی۔ اور ہر شخص خدا کی
وکل امرئ یوماً الی اللہ صائر — طرف لوٹ کر رہے گا۔
وکل قرینی الفۃ لتفرق — دنیا کے تمام عاشق و معشوق جدا ہو کر رہیں گے
شتاتاً وان ضنوا وطال التعاشر — اگرچہ وہ اس میں بخل کریں اور کتنے ہی دن تک زندہ رہیں

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۱۷۴)

لیلیٰ الاخیلیہ بڑی حاضر جواب اور زبان آور شاعرہ تھی۔ علم ادب کے مشہور امام مبردؔ کا قول ہے کہ خنساء اور لیلی الاخیلیہ اپنے اپنے عورتوں سے تو کیا بڑے بڑے استاد زمانہ مردوں سے بھی بازی لے گئیں۔ مگر امام اصمعی لیلیٰ کو خنساء پر ترجیح دیتے تھے۔ لیلیٰ نے امیر معاویہ کا بھی زمانہ دیکھا تھا۔ اور توبہ کے متعلق ان سے بہت دلچسپ باتیں بھی ہوئی تھیں۔ مروان اور عبد الملک بن مروان سے بھی ملی تھی۔ اور اُن کو بھی دنداں شکن جواب دے چکی تھی۔ اسی زمانہ میں ایک مرتبہ والی عراق حجاج بن یوسف ثقفی نے اس سے کہا۔ اب تو تمہاری جوانی گزر گئی۔ سچ بتاؤ تم سے اور توبہ سے کچھ ناجائز تعلقات تھے یا نہیں۔ لیلیٰ نے کہا۔ خدا کی قسم نہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے عشق میں پاکباز رہا۔ صرف ایک مرتبہ خواہشاتِ نفس سے مجبور ہو کر اس نے کچھ ناجائز ارادہ کیا تھا۔ مگر میں نے یہ دو شعر پڑھے جس پر وہ نادم ہو گیا اور پھر کبھی اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔

(۱) وذی حاجۃ قلنا لہ لا تبح لھا — ایک صاحبِ حاجت نے اپنی حاجت ظاہر کی۔ مگر ہم نے اس سے
فلیس الیھا ما حییت سبیل — کہا کہ یہ تمہارے لئے جائز نہیں۔ اور جب تک تم زندہ رہو گے اس پر کامیابی کی راہ نہ پاؤ گے۔

(۲) لنا صاحب لا ینبغی ان نخونہ — میرا ایک شوہر ہے جس کی ہمیں خیانت نہ کرنی چاہئے اور تم بھی
وانت لاخری فارغ وحلیل — ایک دوسری عورت سے وابستہ ہو اور اس کے شوہر ہو

حجاج نے پھر پوچھا۔ اچھا پھر کیا ہوا؟ لیلیٰ نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ اس نے اپنے ایک دوست کو بھیجا اور کہا کہ ہمارے قبیلہ کے پاس کسی ٹیلہ پر چڑھ کر یہ شعر پڑھنا۔

---

[۱] الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۱۱۰ [۲] ادب اللغۃ العربیہ جلد اول صفحہ ۳۰۶

عفا اللہ عنہا ھل ابیتن لیلۃ	خدا اس نازنین کے گناہ معاف کرے، کیا میں کبھی ایسی کوئی
من الدھر لا یسری الیّ خیالھا	رات گذاروں گا جو میرے خیال میں بھی نہیں آتی

جب میں نے یہ شعر سنے تو میں فوراً سمجھ گئی کہ یہ توبہ کا فرستادہ ہے، میں نے بھی یہ شعر کہہ کر فوراً اسے سنا دیا۔

وعنہ عفا ربی واحسن حفظہ	خدا اس کے بھی گناہ معاف کرے اور اس کو اپنی حفاظت میں
عزیز علینا حاجۃٌ لا ینالھا	رکھے اس کی وہ حاجت جو کبھی بر نہ آئے گی ہمیں بہت عزیز ہے

لیلیٰ کی موت کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ اپنے بھائی قتیبہ بن مسلم سے ملنے خراسان گئی۔ واپسی میں توبہ کی قبر کے پاس سے گذری۔ شوہر بھی ساتھ تھا۔ لیلیٰ نے شوہر سے اجازت چاہی۔ اس نے منع کیا۔ لیکن وہ نہ مانی۔ قبر پر پہنچی۔ اور کہا السلام علیکم۔ یا توبہ، جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا میں اس سے پہلے کبھی توبہ کو جھوٹا نہیں سمجھتی تھی۔ کیا یہ توبہ کا قول نہیں ہے ؟

ولو ان لیلیٰ الاخیلیہ سلمت	اگر لیلیٰ اخیلیہ مجھے سلام کرے اور میری یہ حالت ہو کہ مجھ پر
علی ودونی تربۃ وصفائحٌ	خاک کا ڈھیر ہو اور پتھر کی سلیں ہوں۔
لسلمت تسلیم البشاشۃ اوزقی	تب بھی میں اس کو خوشی خوشی سلام کا جواب دوں گا، یا پھر قبر کے
الیھا صدیٰ من جانب القبر صائحٌ	پہلو سے ایک گونج کی آواز بلند ہو گی جو اس کے سلام کا جواب ادا کرے گی
واغبط من لیلیٰ بما لا انالہ	مجھے لیلیٰ کی اس چیز پر رشک ہے جس کو میں نہیں پا سکتا۔ ہاں جو کچھ
الا کل ما قرت بہ العین صالح	بھی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائے وہ اچھی ہے

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۴۴)

یہ اشعار وہ پڑھ رہی تھی کہ توبہ کی قبر سے ایک بہت بڑا الّو نکلا اور لیلیٰ کے اونٹ سے ٹکرایا۔ لیلیٰ محمل سے گری اور وہیں جاں بحق ہو گئی

بنو امیہ کا عہد ختم ہوتے ہی عربی شاعری کا رنگ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ بنو عباس کا دار السلطنت بغداد تھا۔ وہاں کی آب و ہوا، باغات و نزہت گاہیں اور تمام وہ چیزیں جو شاعری میں کبریائی رنگ پیدا کر سکتی تھیں قدرت نے ایک ایک کر کے اس کو ودیعت کر دی تھیں۔ سارے ملک میں گل و سوسن، ریحان ونسترن، نرگس و نسرین اور سرو و چنار کی بہتات تھی جس نے عربوں کی شاعری کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

شعراء عرب جب اپنی حدود چھوڑ کر بغداد کی سدا بہار زمین میں پہونچے تو اُن کے شاعرانہ جذبات بھی وہاں کی آب و ہوا کی اثر انگیزی کی وجہ سے بہت کچھ رنگین اور پُرکیف ہو گئے اور وہ سادگی جو اس سے پہلے اُن کی شاعری کی رُوح تھی جاتی رہی۔ اور اس کے بجائے لطافت و رنگینی، نزاکت و شوخی پیدا ہو گئی اور یہاں کے بہار آفریں اور نزہت خیز مناظر نے ایسا اثر پیدا کر دیا کہ اپنی سادگی خود اُن کو بُری معلوم ہونے لگی۔

عرب کی شاعری میں ہم کو پہاڑوں کی بلندی۔ گھوڑوں اور اونٹوں کی رفتار۔ گرمی کی شدت۔ سفر کی مصیبت۔ مکانوں کی ویرانی، اور باد سموم کے جھونکوں وغیرہ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ لیکن بغداد پہونچ کر اس کا رنگ بھی بدل گیا۔ اس لئے کہ یہاں سارا ملک مرغزار تھا۔ یہاں چپہ چپہ سر سبز و شاداب نظر آتا تھا۔ ذرہ ذرہ آفتاب حسن کی تنویر سے روشن ہو رہا تھا۔ پھر نوخیز ترکوں کے حسن کی معصومیت اس شراب کو دوآتشہ سے سہ آتشہ بنا رہی تھی۔ امراء و سلاطین کے درباروں میں ساقی گری اور مجلس آرائی کی خدمات انھیں شباب پروروں کے سپرد تھیں۔ یہی جلوت و خلوت کے شریک۔ سفر و حضر کے ہمدم تھے۔ اُن کے جمال جہاں

آرائی کی شوخیاں اور حسنِ نظر فروز کی رعنائیاں، عنفوانِ شباب پر آگئی تھیں جن کی طرف اُن کی مدبھری نظریں اُٹھ جاتی تھیں، اس کو بیگانۂ عقل و ہوش ہونا پڑتا تھا۔ اُن کی مستانہ چال قیامت تھی جس سے ہر ہر قدم پر خوابیدہ مفتنے بیدار ہوتے تھے۔

بنواُمیہ کے دَور کے شعرا۔ ان جذبات کی اثرانگیزی سے ناواقف تو نہ تھے۔ مگر یہ رنگینیاں اور سرمستیاں کہاں سے لاتے۔ جو ہمارے اور عشقیہ شاعری کی جان ہیں۔ اُن کا حسن بدویانہ سادگی کا سرمایہ دار تھا۔ شوخی، شرارت، ناز و غمزہ سے ان کا حُسن معرا تھا۔ ان کے عشق و محبت کا مرکز امرد لڑکے نہیں بلکہ قانونِ فطرت کے موافق عورت کی ذات تھی۔ اور وہ بھی پردہ نشین۔ ان کے زمانے میں بھی عشقیہ شاعری زوروں پر تھی۔ تشبیب بھی خوب خوب دل کھول کر کی جاتی تھی۔ مگر ان سب میں بدویت کا رنگ غالب تھا۔

بنواُمیہ کو اپنی عربیت اور بدویت پر ناز تھا۔ وہ ملکِ عرب اور اس کی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ اور اس کے مقابلہ میں تمام دنیا کو حقیر سمجھتے تھے۔ مگر بنو عباس عربی تہذیب اور بدویت کو اپنی گردن کا ایک بدنما طوق سمجھتے تھے۔ اُن کی معاشرت سے متنفر اور اس سے گلوخلاصی چاہتے تھے۔ حتیٰ کہ خلیفہ منصور نے تو یہ طے کر لیا تھا کہ حجازی کعبہ کو توڑ کر ایک عراقی کعبہ قایم کیا جائے، جہاں لوگ حج کیا کریں۔ مگر شکر ہے کہ وہ اپنی اس تجویز میں کامیاب نہ ہوا۔

بنوعباس کے دَور کی ان خصوصیات میں عورتوں نے بھی مردوں کے دوش بدوش حصّہ لیا۔ اور تمام وہ چیزیں جو اس عہد کی خصوصیات سمجھی جاتی تھیں اُن کے کلام میں بھی پائی جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ امرد لڑکوں سے تشبیب کرنا جو اس زمانہ کی مایۂ ناز خصوصیت تھی خواتین کی شاعری کا بھی جزو تھی۔

خود ہارون رشید کی بہن علیہ بڑی دقیقہ رس۔ سخن سنج۔ صاحبِ ذوق اور نامور شاعرہ تھی۔ شعر و شاعری کے ساتھ ہی ساتھ حسن و جمال۔ عفت و عصمت۔ دین داری اور تقویٰ میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ مگر بایں ہمہ اس زمانے کے شاعرانہ دستور کے مطابق ہارون رشید کے دو غلام طل اور رشا اس کے معشوق تھے۔ جن کو مخاطب کرکے وہ ہمیشہ طبع آزمائی کیا کرتی تھی۔

رشا کو مخاطب کرکے اس نے جو نظمیں کہی ہیں اُن میں سے بعض میں رشا کے بجائے اُس نے زینب کا نام ڈال دیا ہے۔ مگر طل کو تو اُس نے ہر جگہ صاف نام لے کر مخاطب کیا ہے۔

طل سے اس کو بہت زیادہ محبت تھی۔ اُس کی شان میں اُس نے بہت سے اشعار کہے ہیں۔ جن میں سے چند شعر درج ذیل ہیں۔

یا رب انی قد عرضت بھجرۃ	خداوندا میں اس کے ہجر میں مبتلا کر دی گئی ہوں
فالیک یشکو ذاک یا رباہ	بارالہا، میں تجھی سے اس کی شکایت کرتی ہوں
مولاۃ سوء تستھین بعبدھا	ایک نالائق مالکہ ہے جو اپنے غلام کے مقابلہ میں اپنے کو حقیر
نعم الغلام وبئست المولاۃ	سمجھتی ہے، وہ غلام اچھا ہے خود مالکہ نالائق ہے۔
طلٌ ولکنی حرمت نعیمہ	وہ طل ہے، اگر خدا نے مجھ پر مہربانی کی بارش نہ کی تو میں اس کی
ووصالہ ان لم یغثنی اللہ	نعمتِ وصال سے محروم رہوں گی۔

تاریخ تمدن الاسلامی جلد دوم صفحہ ۳۰

(۴) یارب ان کانت حیاتی ھکذا — خدایا اگر میری زندگی اسی طرح میرے لئے وبال جان

ضرا علی فما ارید حیاتہ — رہی تو میں ایسے جینے سے باز آئی۔

(کتاب الاغانی جلد نہم صفحہ ۸۴)

ہارون رشید کو اس کی اطلاع ہو گئی تو اس نے علیہ کو بلا کر قسم لی کہ آیندہ وہ کبھی اس کا نام زبان پر نہ لاوے گی، علیہ نے وعدہ کرلیا اور وہ چلی گئی ایک مرتبہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی تلاوت قرآن میں مشغول تھی جب وہ اس آیت پر پہنچی فَاِنْ لَمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ. تو بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا فالذی منعنا ہ امیرالمؤمنین ۔

خوش قسمتی سے ہارون رشید اس وقت کہیں کھڑا سن رہا تھا۔ اس پر اس جملہ کا بڑا اثر ہوا۔ سیدھا اس کے کمرہ میں چلا گیا۔ اور اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر بولا " میں نے طل تمہیں کو دے ڈالا، اب تم جو چاہو کرو "

ہارون رشید کو علیہ سے بڑی محبت تھی۔ اس کو سفر و حضر میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور اس کے آرام و آسائش کا بڑا خیال رکھتا تھا۔

ایک مرتبہ وہ ملک رے گیا، تو علیہ بھی ساتھ تھی۔ جب وہ مقام مرج پہنچی، تو اس نے یہ شعر کہے۔

(۱) ومغترب بالمرج یبکی لشجوہ — مرج کے قریب پہنچنے والا غم والم کے آنسو بہا رہا ہے ۔

وقد غاب عنہ المسعدون علی الحب — اور محبت میں کامیاب ہونے والے نظروں سے اوجھل ہیں

(۲) اذا ما اتاہ الرکب من نحو ارضہ — جب کوئی سوار وطن کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ اس کے پاس

تنشق یستشفی برائحۃ الرکب — جاکر سونگھتا ہے کہ شاید بوئے وطن آئے ۔

(الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور صفحہ ۳۵۰)

ہارون رشید نے جب یہ شعر سنے تو سمجھ گیا کہ وطن کی یاد علیہ کو ستا رہی ہے۔ اس نے فوراً اسے واپس پہنچانے کا حکم دیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ کسی ضرورت سے شہر رقہ گیا۔ عجلت میں علیہ ساتھ نہ جاسکی، وہاں پہنچکر اس نے علیہ کو بلوا بھیجا۔ جب وہ محمل میں بیٹھکر روانہ ہوئی تو اس وقت اس نے یہ شعر کہا۔

(۱) لولا الرجاء لمن املت رویتہ — اگر اس شخص سے امیدیں وابستہ نہ ہوتیں جس کے دیدار کی تمنی ہوں

ماجزت بغداد فی خوف وتغذیر — تو میں بغداد سے اس خوف و خطر کی حالت میں روانہ نہ ہوتی۔

علیہ شاعری کے علاوہ علم موسیقی میں بھی بڑا کمال رکھتی تھی۔ اور اپنے ہی شعروں میں اپنی ذہانت اور طباعی سے ایسی دھنیں قائم کرتی تھی کہ جو سنتا تھا اپنا سر دھننے لگتا تھا۔

لیکن باوجود ان تمام مشاغل کے وہ بڑی دیندار۔ پرہیزگار اور پابند صوم وصلوٰۃ تھی شاعری میں باوجودیکہ عاشقانہ مضامین نظم کرتی تھی۔ اور کھلے ہوئے صاف صاف لفظوں میں تشبیب کرکے زور طبع دکھایا کرتی تھی۔ مگر کسی شخص کو کبھی اس کی عصمت و عفت، پاکبازی و پاکدامنی میں شک و شبہ نہیں ہوا، وہ خود کہا کرتی تھی۔ کہ " یہ سب کچھ محض تفنن طبع کے لئے کرتی ہوں "

ایک دفعہ ہارون رشید ایک کنیز کے دام محبت میں پھنسکر عیش و طرب کے مزے اڑا رہا تھا۔ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر خزانہ لٹا رہا تھا۔ کہ اس کی خبر علیہ کو پہنچی، اس نے فوراً دو شعر کہے۔ اور اپنی کنیزوں کو اس کا سر تیار کر گوا یا۔ جسے سن کر ہارون رشید مبہوت ہوگیا۔ اور اپنی بیجا حرکت پر انتہا سے زیادہ نادم ہوا۔ وہ شعر

یہ تھے۔

(۱) منفصل عنی و ما — اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ مگر
قلبی عنہ منفصل — میرا دل اس سے جدا نہیں ہوتا۔

(۲) یا قاطعی الیوم لمن — اے آج مجھے چھوڑنے والے بتا تو سہی
نویت بعدی ان تصل — کہ اب تو نے میرے بعد کس سے ملنے کا ارادہ کیا ہے۔

(کتاب الاغانی جلد نہم صفحہ ۸۸)

افسوس دولت عباسیہ کا آفتاب ڈھلتے ہی شاعری بلکہ تمام علوم و فنون کا خاتمہ ہوگیا ۶۱۶ھ میں چنگیز خاں نے تاتار سے نکل کر خراسان سے شام تک تمام ملک برباد کر دیئے۔ سینکڑوں ہزاروں شہر خاک میں مل گئے۔ زمین و آسمان میں سناٹا چھاگیا۔ مدینۃ العلم بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ اور کم و بیش چالیس پچاس لاکھ آدمیوں کا خون بہہ گیا۔ مغلوں کی اس تباہ کاری نے لوگوں کے دلوں کو بجھادیا۔ اور طبیعتوں کو مضمحل کردیا۔ جس کا اثر تمام علوم و فنون کے ساتھ شعر و شاعری پر بھی بہت بُرا پڑا۔ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے خانہ نشین ہوگئے۔ اور اپنا وقت تصنیفات و تالیفات میں صرف کرنے لگے۔ اور عربی شاعری کا وہ رنگ جو دولت عباسیہ میں تھا ہمیشہ کے لئے فنا ہوگیا۔

عہد مغلیہ کے سلاطین و امراء کو اس سے کچھ دلچسپی نہ تھی۔ ان کے درباروں میں کسی عالم یا فاضل کو تقرب ہوتا تھا تو محض اس لئے کہ وہ اس عہد کی تاریخ مرتب کریں۔ جنگی کارنامے ضبط تحریر میں لائیں۔ یا علمی۔ ادبی۔ سیاسی اور مذہبی کتابیں تصنیف کریں اور بس۔

اس عہد میں چونکہ علوم بغداد۔ بخارا۔ رے۔ قرطبہ، اشبیلیہ وغیرہ سے منتقل ہوکر، قاہرہ۔ اسکندریہ۔ دمشق۔ حمص۔ تونس وغیرہ میں آگئے تھے۔ اس لئے یہاں کے باشندوں میں خال خال شعر و سخن کا چرچا باقی تھا۔ مگر عربی شاعری کا وہ عہد شباب جو دولت عباسیہ میں تھا ایسا فنا ہوا کہ آج تک نہ لوٹا اس لئے ہم اسی دور کے حالات پر اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

زمانۂ اسلام سے عہد عباسیہ تک کی مشہور شاعرہ خواتین میں عاتکہ بنت عمرو بن نفیل، خولہ بنت الازور الکندی عمرہ بنت درید بن الصمہ، خزانہ بنت خالد بن جعفر، ام حکیم بنت قارظ، ہند بنت زید بن مخزمۃ الانصاریہ، عریب بنت جعفر البرمکی، لیلیٰ بنت طریف، حمدہ بنت زیاد، نظیفۃ الحلاجیہ، حفصہ بنت حماج الرکونیہ، حمدونیہ بنت عیسیٰ، حفصہ بنت حمدون، عائشہ بنت احمد، زہون الغرناطیہ، الشاعرۃ الغسانیہ، الشبلیۃ الاندلسیہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن کی شاعرانہ نازک خیالی اور ادبیانہ بذلہ سنجی سے ملک و قوم ہی نہیں بلکہ اُس زمانہ کے سلاطین بھی لطف اندوز ہوتے تھے، اور اُن کی شاعری اور زبان آوری کی ساری دنیا میں دھوم تھی۔

شواعر عرب کے حالات اور اُن کے اشعار تاریخ و سِیَر کی کتابوں کے علاوہ کتاب الاغانی، کتاب الشعر والشعراء، طبقات الشعراء، محاضرات الادباء، کتاب المنظوم والمنثور، کتاب الصناعتین، کتاب العمدہ، المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر وغیرہ ادب کی کتابوں میں بھی جستہ جستہ ملتے ہیں، مگر زمانہ حال کی مصری ادیبہ سیدہ زینب بنت علی العاملی کی کتاب "الدر المنثور فی طبقات ربات الخدور" صنف نسواں کے علمی و ادبی خدمات پر بہترین تصنیف ہے، اسمیں خواتین عرب کے حالات بہت کچھ تفصیل سے ملتے ہیں، جسمیں وہ بھی شامل ہیں جنکو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی لیکن افسوس ہے کہ ان جواہر پاروں کا ذخیرہ اسقدر بکھرا ہوا ہے کہ انکو یکجا کرکے ایک سلک میں پرونا ہفتوں نہیں مہینوں کی فرصت کا محتاج ہے جو تعلیمی مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ میرے لئے از بس مشکل ہے، انشاء اللہ آیندہ کسی فرصت میں اس موضوع پر کچھ زیادہ بحث کرنے کی کوشش کرونگا، واللہ المستعان،

رواداری

اے رواداری نقیبِ کاروانِ ارتقا!
اے رواداری تمدن کے لئے نشوونما

اے رواداری علمبردارِ اخلاقِ وسیع
اے رواداری نشاں افرازِ اوصافِ وسیع

اے رواداری علوئے طبع کی روحِ رواں
ہمت، و مردانگی، و ضبط، و خودداری کی جاں

سخت مشکل سے بھی مشکل کام کرجاتی ہے تو
اک اداسے دشمنوں کو رام کرجاتی ہے تو

زہر کے ساغر ترے ہاتھوں میں جامِ انگبیں
سامنے تیرے ہیں قاتل کی بھی آنکھیں شرمگیں

وصل کردیتی ہے تو اس ذات کو اُس ذات سے
موہ لیتی ہے دلوں کو اپنی میٹھی بات سے

ہرادائے دل شکن رہتی ہے تجھ سے دور دور
خودستائی، خودنمائی، تمکنت، کبر و غرور

آتش افشاں کوہ سے کرتی ہے پیدا آبشار
"سنگ و آہن میں اُترجاتی ہے تیری نرم دھار"

ٹوٹ جاتا ہے تری تحریک سے سازِ نفاق
زمزموں میں تیرے کھوجاتی ہے آوازِ نفاق

تیری شانِ گفتگو کا ہے دلوں پر اقتدار
تیری طرزِ ہمکلامی سے ٹپکتا ہے وقار

تیرے ہاتھوں سے ہے بنیادِ حکومت پائدار
قلعہ ہے تو بادشہ کا، اور رعایا کا حصار

دوڑتا ہے جن کی نبضوں میں رواداری کا خون
بزمِ عالم میں نہیں ہوتیں وہ قومیں سرنگوں

جس کے دل میں روشنی تیری ہے دانا ہے وہی
جس کی آنکھوں میں ترا جلوہ ہے بینا ہے وہی

تیری مئے سے ہے اگر خالی کسی دل کا ایاغ
کیفِ انسانی سے ایسے دل کو حاصل ہو فراغ

اے رواداری ہے تو انسانِ کامل کا خمیر
اے رواداری بشر کا اوّلِ مافی الضمیر

فیض گر پاتے نہ تجھ سے آب و آتش، خاک و باد
پیکرِ انساں میں ناممکن تھا ان کا اتحاد

انبیائے ماسلف دیتے رہے تیرا سبق
ہر کتابِ آسمانی کا ہے تو پہلا ورق

تیرے دکھلائے ہوئے رستہ پہ چلنے کا مآل
رُوح کی تابش، فروغِ ایماں کا، عرفاں کا کمال

ایک ہے خالق کی مشرک اور موحّد پر نگاہ
لطف کی یکساں ہے مسلم اور ملحد پر نگاہ

اولیا سے، اصفیا سے، انبیا سے سیکھ لے
سیکھنے والے! رواداری خدا سے سیکھ لے

رضا نقوی

دو پیکر

سید احسن ایم - اے (علیگ)

(۱)

ملکہ کے حکم سے اس ملک کے تمام آئینے توڑ ڈالے گئے تھے - اور آئینہ کا صرف نام باقی رہ گیا تھا - دیوار پر لٹکانے کا آئینہ، چھوٹا آئینہ، آرسی کا آئینہ - غرضیکہ ہر قسم کے آئینہ رکھنے کی سخت ممانعت تھی - اگر کسی کے یہاں ایک ٹکڑا بھی اس شیشے کا نظر آ گیا جس میں انسان اپنا چہرہ دیکھ سکتا تو بغیر اس امتیاز کے کہ وہ لوگ کون تھے اس گھر کے تمام افراد کو تہہ تیغ کرنے کا حکم تھا - یہ کیوں؟ وجہ اس کی یہ تھی کہ ملکہ اس درجہ بدصورت تھی کہ ایک حبشن بھی اس کے مقابلے میں دعوائے حسن کر سکتی تھا - اور نہ صرف اس خیال سے کہ وہ دوبارہ اپنے چہرے کو دیکھنے نہ پائے بلکہ جذبۂ رقابت کے باعث کہ ملک کی دوسری حسین عورتیں بھی اپنے اپنے حسن سے ناواقف رہیں اس نے آئینوں کو نیست و نابود کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا - حسین عورتوں کو اپنے چہروں کے عکس دیکھنے سے باز رکھنے کے لئے ملکہ نے یہاں تک احکام جاری کئے تھے کہ تمام جھیلوں اور تالابوں کے کناروں پر پتھر اس طریقہ سے نصب کئے گئے تھے کہ کوئی ہستی اس کے اندر جھانک کر اپنا چہرہ نہ دیکھ سکتی تھی - اور کوئیں تو وہاں کے اتنے گہرے تھے کہ ان میں جھانکنا بالکل ناممکن تھا - اور پانی نکالنے کے ڈولوں کی ساخت بھی اس قسم کی تھی کہ پانی اُن میں ٹھہر نہ سکتا تھا جس کی وجہ سے چہرے کا عکس دیکھنا عبث تھا - ان سخت گیریوں کا اثر مملکت حسن کی ملازموں پر بہت گہرا پڑا تھا -

(۲)

لیکن ملکۂ حسن 'یاسمین' پر ان سختیوں نے کچھ اثر نہ کیا - کیونکہ اس کو اپنے حسن کی داد کافی ملتی تھی اور یہی وہ چیز ہے جو ایک حسینہ آئینے میں دیکھ کر حاصل کرتی ہے - 'یاسمین' کا عاشق جب اُس کے حسن کی تعریف کرتا تھا تو وہ پھولوں نہ سماتی لیکن اس کی اس خوشی میں ایک غم پنہاں تھا وہ یہ کہ اگر ملکہ کے کانوں تک اس کے حسن کی خبر پہنچ گئی تو پھر اُس کی خیر نہیں - کیونکہ جذبۂ رقابت اس درجہ کارفرما تھا کہ دوسروں کی خوشی کو ملیامیٹ کر دینا بھی ملکہ کا فرض عین ہو گیا تھا - اور 'یاسمین' سے ملکۂ مملکت کو ویسے بھی ازلی نفرت تھی کیونکہ وہ بھی تو 'ملکۂ حسن' تھی -

(۳)

شادی سے کچھ دن پہلے کا ذکر ہے کہ یاسمین اپنے پائیں باغ میں ٹہل رہی تھی کہ ایک بڑھیا اُس کی طرف آئی اور بہت عاجزی سے بھیک مانگی - یاسمین کو اس کی صورت دیکھ کر ترس آ گیا - اور اس نے بڑھیا کو کچھ دلوانے کے لئے کسی خادمہ کو آواز دی ہی تھی کہ بڑھیا چیخ مار کر گر پڑی -

"خیر تو ہے؟ بڑی بی" یاسمین نے متحیر ہو کر دریافت کیا -

"میں کیا بتاؤں سرکار!" بڑھیا نے اپنی لاٹھی کا سہارا لیتے ہوئے کہا -

"کچھ تو بتاؤ" یاسمین نے اصرار کیا -

"میں نے دنیا کی سب سے بدصورت چیز ابھی دیکھی ہے" بڑھیا نے سانس اوپر لیتے ہوئے کہا۔

"وہ کون ہے؟"

"خطا معاف ہو تو بتاؤں"

"نہیں نہیں۔ تم ضرور بتاؤ"۔

"میری پیاری رانی۔ وہ تم ہی ہو۔ اتنی عمر میری ہونے کو آئی لیکن سرکار ایسی صورت میں نے بھلا کاہے کو دیکھی تھی" بڑھیا نے جواب دیا۔

"تو کیا تمہارا مطلب ہے کہ میں بدصورت ہوں" یاسمین نے چیخ چیختے ہوئے کہا۔

"اور کیا اتنی بدصورت کہ میں نہیں کہہ سکتی۔

بڑھیا جو درحقیقت ایک کٹنی تھی اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ملکہ کی بھیجی ہوئی تھی' یہ الفاظ کہہ کر روانہ ہوگئی۔

(۴)

نوجوان نے لاکھ کوشش کی کہ 'یاسمین' کو سمجھائے اور بڑھیا کے کہے ہوئے کو غلط ثابت کرے لیکن یاسمین کی ایک رٹ ہے کہ لگی ہوئی ہے یعنی یہ کہ "میں تو بدصورت ہوں"۔ اور جب شادی کے لئے تعین تاریخ پر وہ مصر ہوا تو یاسمین بولی۔

"اب ایسی صورت میں مجھ سے شادی کرکے کیا کروگے؟ میں نہیں چاہتی کہ تم ایک بدصورت کے ساتھ اپنی زندگی خراب کرلو"

اب کیا کیا جائے؟ بڑھیا کو جھٹلانے کی صرف ایک ترکیب رہ گئی تھی کہ 'یاسمین' کو اس کی شکل دکھائی جائے۔ سو وہ کیسے ہو۔ آئینہ کیا۔ وہاں تو کوئی چمکدار چیز ہی نہ تھی جس میں کوئی اپنی شکل دیکھ سکے۔ اور ملکہ کے ڈر کے مارے کسی کو رکھنے کی جرأت بھی نہ تھی۔

"میں تو اب دربار میں فریاد لے کر جاؤں گا" نوجوان نے پریشان ہوکر کہا۔ "ملکہ خواہ کتنی ہی جابر کیوں نہ ہو مجھے امید ہے کہ اس کو میری حالت زار پہ رحم آجائے گا"

(۵)

"کیا معاملہ ہے؟" ملکہ نے دریافت کیا۔ "یہ کون لوگ ہیں اور کس بات کی فریاد لے کر آئے ہیں"

"جہاں پناہ ایک بیکس و بیچارہ دربار میں اپنی مصیبت بیان کرنے آیا ہے"

"ہمیں زیادہ پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو معاملہ ہو جلد بیان کرو"

"حضور عالیہ! ہم پہ رحم کیا جائے"

"لیکن تمہاری مصیبت میں میں کس طرح کام آسکتی ہوں؟"

"اگر دربار سے ایک آئینہ دیکھنے کی اجازت ------

"تم کو آئینے کا ذکر کرنے کی جرأت کیسے ہوئی" ملکہ نے گرجتے ہوئے کہا۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سرکار خطا معاف پہلے میری فریاد تو سن لی جائے۔ بعد میں غصہ کیا جائے۔ اس خاتون کو جس کو آپ اپنے سامنے دیکھتی ہیں اپنے متعلق عجب وہم ہوگیا ہے۔ یہ سمجھتی ہے کہ یہ بہت ہی بدصورت ہے ----"

"تو کیا یہ غلط ہے؟" ملکہ فوراً بول اٹھی۔ اور چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ "اس کا یہ خیال بالکل درست ہے۔ مجھے تو اس سے زیادہ بدصورت شکل دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی"

یاسمین کا تو یہ الفاظ سنتے ہی گویا دم نکل گیا۔ اور اپنی بدصورتی کا اس کو پورا یقین ہوگیا۔ کیونکہ ملکہ نے بھی بڑھیا کے بیان کی تصدیق کردی تھی۔ وہ اس صدمہ کو برداشت نہ کرسکی اور دربار کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ لیکن نوجوان ملکہ کے الفاظ پر آسانی سے ایمان لانے والا نہ تھا۔ اس نے غصے سے جل کر کہا۔

"یا تو ملکہ پاگل ہے۔ یا اس جھوٹ بولنے میں کوئی راز ہے"

اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ درباریوں نے لپک کر اس کی گردن ناپی اور خوب جھنجھوڑا۔ ملکہ نے فوراً اشارہ کیا اور دو جلاد چمکتی ہوئی تلواریں کھینچ کر سامنے آگئے۔ "اڑا دو اس کی گردن"۔ ملکہ نے نوجوان کی

طرف اشارہ کیا۔

جیسے ہی جلّادوں نے اپنی تلواریں اُٹھائیں دو ہیبت ناک چیخوں سے دربار گونج گیا۔

یاسمین نے بغیر اس خیال کے کہ وہ کہاں ہے۔ آہستہ آہستہ اپنی آنکھ کھولی اور جیسے ہی چمکدار تلواریں اُس نے اپنے خوبصورت چہرے کا عکس دیکھا فرطِ خوشی سے بیتاب ہو کر اُس کے منہ سے ایک نعرۂ مسرت بلند ہوا۔

دوسری آواز ملکہ کی تھی۔ یہ آواز موت کو لبیک کہنے کے لئے تھی۔ چمکدار تلواریں اپنا ہیبت ناک چہرہ دیکھتے ہی وہ سہم گئی اور مارے خوف اور شرم کے اُس کا دم نکل چکا تھا۔

(ماخوذ)

موجِ حیات

شکایت اختروں کی شکوہ ہائے آسماں کب تک
ہو دستِ غیر میں فرزندِ آدم کا جہاں کب تک

بنائے گنبدِ گردوں سے بالاتر جہاں اپنا
دلِ انساں ہو محبوسِ جہانِ دیگراں کب تک

بہشتِ نور کی طالب ہے میری روح آزادی
یہ زنجیرِ نظامِ آفتاب و کہکشاں کب تک

فضائے عالمِ لاہوت ہے جولاں گہِ انساں
گِلِ ناسوت میں اندیشۂ سود و زیاں کب تک

ستارے کہتے ہیں تاریک اور خاموش راتوں میں
رہے گا آدمی زادوں کا یہ خوابِ گراں کب تک

محبّت کی ضیا سے ظلمتیں کافور ہوتی ہیں
عداوت کی گھٹاؤں میں تلاشِ روح و جاں کب تک

تو مسجودِ ملائک ہے خدا معبود ہے تیرا
رہیگا تیرا کعبہ ماسوا کا آستاں کب تک

عقاب و جُرّہ و شاہیں صفت پرواز پیدا کر
مثالِ قمری و کبک و کبوتر ناتواں کب تک

شعاعِ مہرِ اُمید و یقیں ہے خنجرِ مرداں
یہ ظلماتِ غم و اندوہ میں آہ و فغاں کب تک

حصولِ کامرانی ہے جہاں میں زورِ بازو سے
یہ قلبِ نیم جاں کب تک، یہ چشمِ خونفشاں کب تک

کرو رنگینیٔ خوں سے بہارِ جاوداں پیدا
جوانانِ چمن! یہ شکوۂ جورِ خزاں کب تک

منیرؔ ایمان کی شمشیر سے کٹتی ہیں زنجیریں
اسیرِ کفر و مایوسی و حرمان و گماں کب تک

محمد اکبر منیرؔ ایم۔ اے

فرنسا کا شاہکار

مولانا عظیم برنی

سب کچھ میرے پاس رہا مگر کیا فائدہ ہوا میں اُکتا چکا تھا اور ضرورت بھی نہ تھی اس لئے کہ وقت میری کامیابی کا منتظر نہیں رہ سکتا میرے لئے وہ دن گزر گئے جب نازنین لڑکیاں دامن کہسار میں پھولوں کے تاج رکھے بنفشے اور گیندے کی روشوں پر نظر آتیں اور ایسا معلوم ہوتا کہ بہار کی دیوی نے اپنا نرم ونازک دوپٹہ سبزہ وآبشار پر ڈال دیا ہے۔ مارچ کی آمد وادی کو گلپوشش بنا دیتی۔ لاے کے جنگلوں سے بہہ کر آنے والے صاف اور اتھلے چشموں کے پاس سنگ مرمر کے نظر فریب قلعے کے نیچے بتحانوں کے حرم والی مہجبینیں نزاکت آفریں دوشیزہ لڑکیاں گلاب کی شاخیں ہاتھ میں لے کر نرم اور ساکت رقص کرتیں۔ فرشتوں کے پروں کی ڈھیلی آستینیں اُن کی سیمیں کلائیوں کے چمکتے جادو کو فضا میں پھیلا دیتیں گویا یہ مرٹل کے گھنے درختوں میں اُترنے والے پریوں کے قافلے تھے اُنھیں میں روزا بھی نظر آتی۔ دیکھنے والے کہہ اُٹھتے "یہی ہے نظر کی گہرائیوں میں کھویا ہوا ستارہ' یہی ہے آسمان کے بہشتی نگارخانے کا شاہکار"

بیمار فرف یہ کہکر خاموش ہوگیا۔ اُس کا دوست جو ایلپس کی وادیوں میں سیر کرتا ہوا آج ہی قیدرا کی مختصر بستی میں وارد ہوا تھا قریب کی صندلی پر بے خبر بیٹھا تھا۔ اسی معمولی عمارت کے وسط میں سپید پتھر سے تراشا ہوا "بُت" حسن وصنعت کا کمال ظاہر کر رہا تھا' معلوم ہوتا تھا کہ عالم کے تمام نغمے اسی مرقع سے پھوٹ نکلے ہیں۔ یہ تجلی کا وہی سرچشمہ ہے جس پر نظر پتھر ہو جائے۔

"میں آپ کی کیا خدمت بجا لاؤں؟" آرک نے کہا۔

"کچھ نہیں یہی میرا انجام ہے کہ مایوس چہرہ لئے ازل کی سیاہی میں چھپ جاؤں یا آج کا دن جو اور دنوں کی طرح چمک سے معمور ہے میری نظر اور میری زندگی کا آخری خواب بنجائے۔ مجھے اب کمال اور محبت کے کسی اداشناس سے غرض ہی کیا ہو سکتی ہے۔ میں ایک سنگتراش کے گھر پلکر جوان ہوا۔ "روزا" کاؤنٹ الیرا کی بیٹی فردوسی تختہ ہائے گل کی شاہزادی کا خیال کرتا دل پاش پاش ہو جاتا اور تصور کے معطر چشمے بہہ نکلتے۔ میں نے بتگری سیکھی اور محبت میں کامل ہوگیا۔ اونچی برفانی چوٹیوں کے سائے میں اُن پتھروں کے قریب جن میں کوئی آواز نہیں ہوتی۔ تسکین دل پاتا۔ کبھی بے چینی بڑھ جاتی اور وفا کے خیال میں خون دل بہانے لگتا۔ مجھے کرب دل کی تکلیف نہ تھی۔ میری حالت عشق اور غم عشق کی حدوں سے گزر چکی تھی۔ شام کی تیز شفق آسمان پر سونا اُچھالتی۔ خوشی کی ساعت کامرانی یک لخت آجاتی اور میں روزا کو اس طرح دیکھتا جیسے افق پر نظر آنے والے پہلے ستارے کو دیکھتے ہیں۔ اور ایک مرتبہ ہر نقش میں لفظ مسرت پڑھ لیتا۔ بسیرا لینے والے طائر محبت کی آواز کو زبان پر تولتے نظر آتے اور نظارے کی حیرت شادمانی کے طوفان میں ڈوب جاتی۔ رفتہ رفتہ تاریکی بڑھتی اور اُس وقت "جنت ارضی کی حور۔ روزا" مجھ پر رخصت کی افسردہ نگاہ ڈال کر چل دیتی۔ وحشت وجبل کا سناٹا میرے قلب میں اُتر جاتا۔ اور بیکراں عالم کی تنہائی

کے سوا میرے اندر حیات ہوتی نہ موت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ اے عشق تو نے کیا دکھا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرے برابر عجیب چیز خیال پیش نہیں کر سکتا تو عقل اور علم دونوں سے زیادہ پُر تاثیر ہے۔ میں نے تیری مختلف رنگینیوں سے ہدایت حاصل کی۔ تو اپنے شاغل کی تصویر میں طلسم بنا کر دکھاتا ہے۔ اگر تجھے میرے پاس مہمان ہونا یاد ہے تو جواب دے کہ حسین روزا نے میری اور اپنی زندگی کے آخری دن کیا کہا تھا؟ کہ "کاؤنٹ البرا کے مقبوضہ ہوئے ایک دن نے مجھے ہمیشہ کے لئے تجھ سے جدا کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے اور میں نے بھی دائمی وفا کا جس کا اوقار نام موت ہے" عہد کر لیا ہے۔ کاش میں اُسے باز رکھ سکتا۔ دوسرے ہی دن اُس نے روما کی جبین پر نقش محبت ثبت کر دیا۔ آہ میں! بیمار کی آنکھوں میں جلی اشک لرزاں تھے۔

"تمہیں آرام کی ضرورت ہے" اجنبی نے اپنے آنسو پاک کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہمیشہ کے آرام کی آخری سانس جس کا بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں میری چھوٹی کیاری کے پھول جو سرما کے ظالم اور برف کے طوفان میں کثرت سے گر رہے ہیں۔ یہ میری حیات کے آخری لمحات ہیں جو مجھ سے علیٰحدہ ہوتے جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ اس کمزور ہستی کی چیستان کو عشق سے حل کرنا چاہا لیکن ممکن نہ ہوا۔ زندگی کے افسانے میں حسن کی وفا کا بیان پڑھا۔ درد کے مسائل مطالعہ کئے۔ ایک طرف شعلوں سے زیادہ سوزاں محبت کے قصّے تھے۔ اور دوسری طرف موت کا ابہام۔ کائنات حقیقت کی ہنوائی پر چل رہی ہے جس کا دوسرا نام عشق ہے۔ اب یہ گفتگو بیکار ہے کیونکہ روزا موجودات میں شامل نہیں آہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اس دُنیا سے رخصت ہوگئی تو میں نے طے کر لیا کہ زمین پر اُتر آؤں اور اس کا ایک یادگار بُت کمال سعی صرف کر کے بناؤں میں نے اپنی زندگی کا پورا کام ختم کر لیا ہے۔ یہ سامنے وہی پاک مجسمہ ہے جو ہستی کی بلندی پر نصب ہے اور اپنا ہی عکس جمال دیکھتا ہے۔

بیمار کے آنسو تیزی کے ساتھ بہہ نکلے اور پھر کبھی کوئی حرف اُس کی زبان سے نہیں سنا گیا۔ بائیسویں صدی گزرنے کے بعد اب سنہری بالوں والی عورتیں جن کی سیاہ، لمبی اور گھنی پلکیں رخساروں پر سایہ ڈالتی ہیں، عہد کے مجبوں کو عبور کر کے آتی ہیں اور وادی ایلپس کے یادگار مجسمے کے سامنے حریر کے فرش پر رقص کرتی ہوئی اظہار ہدایہ کی رسم ادا کرنے کے لئے یہ گیت جو عظمت محبت کے لئے وقف کر دیا گیا ہے مندی اور شیریں آوازمیں گاتی ہیں۔

"تازہ کار محبت کو زمانہ بوسیدہ نہیں کر سکتا کیونکہ ہر قرن اس کا عہد تجدید ہوتا ہے، کہسار کا جنگلی گلاب ہمارا دامن تھام لیتا ہے تاکہ ہم وادی کے سب سے حسین گلاب "روزا" کو نہ بھول جائیں، چاند طلوع ہوتا ہے بڑھتا رہتا ہے اور اُس کے ساتھ سمندر کی موجیں بھی چھوٹی کشتیاں چلانے والے ملّاح سفر میں پُر اسرار گیت گایا کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ہمارا اعزاز محبت یاد رکھیں گے۔

اے وطن کے ساتھیو! کیا تم "روزا" کے صاحب جبروت مجسمے سے متاثر نہیں ہو؟

یہی وہ ستارہ ہے جو شام کو سب سے پہلے طلوع ہوتا ہے۔
اور سپیدۂ سحر میں سب کے بعد جگمگایا کرتا ہے۔



نقد و نظر

"نئے افسانے"

از سید حسن ریاض۔ دفتر "نوید" لکھنؤ قیمت عہ

سید حسن ریاض صاحب، ملک کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ آپ پہلے ہندوستان کے سب سے زیادہ لائق اور تجربہ کار ایڈیٹر سید جالب دہلوی کے مشہور اخبار "ہمدم" لکھنؤ کے ایک زمانہ تک سب ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ اور اس کے بعد ہفتہ وار "نوید" کی زمامِ ادارت بھی آپ کے ہاتھوں میں رہ چکی ہے۔

آپ کا محبوب مشغلہ صحافت و سیاست ہے۔ اور ان دونوں سے جو وقت بچ رہتا ہے وہ آپ افسانہ نگاری میں صرف کرتے ہیں۔

آپ کے افسانوں کی یہ ایک نہایت نمایاں خصوصیت ہے کہ اُن میں ہندوستانی سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے معاملات۔ معمولات، اعمال اور جذبات کی سچی تصویریں اور صحیح نقشے ہوتے ہیں۔

آپ افسانے کو افسانے کی خاطر لکھتے ہیں۔ افسانہ لکھتے وقت آپ کے پیشِ نظر ملک کی اصلاح یا قوم کی خدمت کا کوئی تخیل نہیں ہوتا، اور یہی وجہ ہے کہ آپ کے افسانوں میں آورد نہیں پائی جاتی، بلکہ آمد ہوتی ہے، یہ اور بات ہے کہ آپ کے میلانات اور رجحانات بے قصد و ارادہ آپ کے افسانوں میں وہ رُوح بھر دیتے ہیں جس سے ملک کی اصلاح اور خدمت کے چشمے خود بخود پھُوٹ نکلتے ہیں۔

وہ شاعر یا ادیب جو اپنی نظم و نثر کو بنا، اصلاح یا خدمت پر رکھتے ہیں آورد میں مبتلا ہو کر حقیقی شعریت و ادبیت سے محروم ہو کر رہ جاتے ہیں اور اُن کی نظم و نثر میں الہامی کیفیتوں کا پتا نہیں چلتا۔ ہم حسن ریاض صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ وہ صحیح ترین راستے پر گامزن ہیں اور اپنے افسانوں کے ذریعے سے بلا قصد ملک کی وہ خدمت کر رہے ہیں جو دوسرے قصد کے باوجُود نہیں کر سکتے۔

ہم چونکہ اُن کے ہر افسانے پر فرداً فرداً نقد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس لئے اس وقت اتنا ہی لکھنا کافی ہے۔

ادارہ کلیم

نشاط (لائل پور)

ایڈیٹر الطاف مشہدی سالانہ چندہ سے فی کاپی ۸ر

اس وقت "نشاط" کا مئی نمبر ہمارے پیشِ نظر ہے۔ ہم بڑی بیباکی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پرچہ تقریباً ہر اعتبار سے درخورِ اعتنا اور شایانِ توجہ ہے۔

اس کے مدیر جناب الطاف مشہدی ہیں۔ جو پہلو میں ایک حساس دل اور سر میں ایک سوچنے والا دماغ رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ رسالہ مضامین کے اعتبار سے بلند اور سبق آموز ہے۔ ہم اردو داں طبقہ سے بزور سفارش کریں گے کہ وہ اس پرچے کی قدر افزائی کر کے ایک ایسے ماہنامے کو فروغ دینے کا باعث بنیں جو ہمیں اُبھارنے کی سعی کرتا ہے۔

رہنمائے تعلیم (لاہور)

سالانہ چندہ صہ
قیمت فی پرچہ عہ ر

"رہنمائے تعلیم" کا "دل نمبر" جو ملک کے مشہور و معروف غزل گو جناب ضمیر حسن خاں صاحب دل شاہجہاں پوری کے حالات اور کلام پر مشتمل ہے۔ نہایت ہی حسن ترتیب اور کافی دیدہ دری کے ساتھ شائع کیا گیا ہے جس میں حضرت اثر لکھنوی، جناب نیاز فتحپوری اور حضرت احسن مارہروی کے مضامین خاص طور سے پڑھنے کے قابل ہیں۔

حضرت دل شاہجہانپوری ایک نہایت اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ ہیں، اور ایسا پاکیزہ دل رکھتے ہیں جس میں شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اور جو ان تمام شرمناک اور ادنیٰ قسم کے جذبات سے قطعی طور پر معریٰ ہے جو آج کل کے غزل گو حضرات میں پائے جاتے ہیں اور جن کی بدولت ہمارے ملک کی ادبی فضا مکدر و مرطوب رہا کرتی ہے۔

حضرت دل کا خلوص عصر حاضر کی شبنم میں ڈھلا ہوا بظاہر تابناک اور بباطن سیاہ خلوص نہیں ہے، بلکہ وہ ایک حقیقی اور واقعی شے ہے جس پر بجا طور سے ناز کیا جا سکتا ہے۔

اس موقع پر نفس غزل گوئی پر بحث کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا لیکن حضرت دل کے کلام کے باب میں اس قدر ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ آپ ہندوستان کے اُن معدودے چند متغزلین میں سے ہیں جن کا کلام زبان، روانی، متانت، اور بلندی کے لحاظ سے بیحد قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ہم مجھمی چند صاحب ودیارتھی کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اُنھوں نے ایک نہایت اچھے فرض کو ادا کر کے یہ ثابت کر دیا کہ زندہ مشاہیر کی یوں قدر کی جاتی ہے۔

رسالہ شاہکار کا سالنامہ

اڈیٹر پروفیسر تاجور
نائب ایڈیٹر محمود جاوید ایم اے
مقام اشاعت لاہور

قیمت سالنامہ ۱۲ر
سالانہ چندہ چھ روپے

سرزمین پنجاب کو جن ادبی رسائل پر فخر و ناز کرنے کا حق ہے، اُن میں سے ایک رسالہ شاہکار بھی ہے۔ شاہکار اپنے ناظرین کو کبھی مایوس کرنا نہیں جانتا، وہ بیش بہا پُر از معلومات، مضامین کے ساتھ پاکیزہ افسانے، جن میں، اکثر لطیف چاشنی کے ساتھ ساتھ حسن تحریر بھی قابل دید پیش کرتا ہے حصۂ نظم میں بھی قادر الکلام شعرا کا کلام بہم پہنچاتا ہے۔ چنانچہ مارچ و اپریل ۳۶ء کا مشترکہ نمبر جو سالنامے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اپنی تمام ظاہری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ مشہور ادیبوں اور شعرا کے مضامین اور کلام آپ اس میں پائیں گے۔

اس ضخیم سالنامے میں سہ رنگی اور یک رنگی سب ملا کر بارہ تصاویر ہیں۔ جن میں سے "سہاگن" کی تصویر قابل داد اور "وادیٔ گلفروش" کی قابل دید ہے۔ ہم حیران ہیں کہ پنجاب کے زاہدانہ احساسات کے حامل ناقد "وادیٔ گلفروش" میں "حوا" کی گل اندام برہنہ حسن فروش بیٹی کی سہ رنگی تصویر کو دیکھکر کیا کچھ نہ برہم ہوگئے۔ جو حال ہی میں کلیم پر اسی جرم میں تبرا کر چکے ہیں۔

پروفیسر اعجاز اکبرآبادی کا مضمون "جدید اردو شاعری کی خصوصیات" اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے سفرنامے کا ورق قابل داد مضامین ہیں۔

شمیم

مقام اشاعت پولس منزل
اگزیبیشن روڈ پٹنہ

قیمت سالانہ ۲؎ ر
قیمت فی پرچہ ۳ر

پٹنہ بہار سے ہمارے مشہور ادیب دوست، تمنائی صاحب کی ادارت میں یہ رسالہ نکلنا شروع ہوا جو ۸۰ صفحات پر اپریل سے نکلنا شروع ہوا ہے حضرت تمنائی نے جس انداز سے اس کا آغاز کیا ہے اگر وہ اس کے معیار کو اسی حد تک قایم رکھ سکے تو کہنا چاہیئے کہ شمیم ہندوستان کے اُن مشہور ادبی رسائل میں سے ایک ہوگا جن کا شمار انگلیوں پہ ہو سکتا ہے۔ جس پر ہم اپنے دوست حضرت تمنائی کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ اردو ادب کے ہر مرکز سے بلند معیار ادبی رسائل نکالے جائیں۔ تاکہ اردو

ادب کی خدمت ہو سکے۔

تمنائی صاحب کو چھپائی اور کتابت کی طرف مزید توجہ فرمانے کی ضرورت ہے۔

معیار

ایڈیٹر قاضی عبدالودود — قیمت سالانہ للعہ

مقام اشاعت۔ بانکی پور پٹنہ — فی پرچہ بارہ آنے

انجمن ترقی اردو شاخ پٹنہ کی زیر سرپرستی یہ رسالہ ۱۰۰ صفحات پر نکلنا شروع ہوا ہے۔ رسالہ اردو اورنگ آباد دکن کے بعد ہماری زبان میں یہ دوسرا رسالہ ہے جس میں خالص ادبی شان نظر آتی ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ معیار نے جو معیار اپنی اولین اشاعت میں پیش کیا ہے وہ اس کو برابر قایم رکھ سکے گا؟ ادبی علمی تحقیقی مضامین کے علاوہ نہایت بلند پایہ فسانے بھی نظر آتے ہیں۔

ہم انجمن ترقی اردو کی کوشش پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے آرزومند ہیں کہ معیار کے صفحات اردو ادب کی خدمت اس معیاری شان سے کر سکے جو اُس نے اپنی اولین اشاعت میں پیش کی ہے۔

شباب مشرق

مدیر ڈاکٹر محمد یوسف خیال

مقام اشاعت۔ عارف پبلشنگ ایجنسی — سالانہ دو روپے

۱۰۳ سنٹرل ایونیو کلکتہ — فی پرچہ دو آنے

۴۰ صفحات کا یہ رسالہ کلکتے سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ گو سرزمین بنگال اردو زبان کے ترقی کے لئے سرزمین شور کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شور زمین کو سرسبز کرنے کے لئے کسی کوشش کی ضرورت نہیں۔ شباب مشرق کا اجرا اسی کوشش کے مرادف ہے۔ جس پر ہم کارکنان شباب مشرق کو مبارکباد دیتے ہیں۔ شباب مشرق گو اب بھی اعلیٰ درجے کے رسائل کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ لیکن پھر بھی کوشش اور کاوش کی شدید ضرورت ہے۔ مضامین اعلےٰ پائے کے ہیں۔ حصۂ نظم ذرا کمزور ہے۔ وہ معیار جو حصۂ نثر پیش کرتا ہے حصۂ نظم میں گر گیا ہے۔ خادمانِ ادب اور بالخصوص کلکتے والوں کو اس کی ایسی مدد کرنی چاہئے کہ جس سے شباب مشرق دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر سکے۔ کیونکہ کلکتہ ہندوستان کے اکثر مایۂ ناز ادیبوں کا مستقر کہلانے پر نازاں رہا ہے۔ بنگال میں اردو ادب کے ساتھ جس قدر بے نیازی برتی جاتی ہے وہ قابلِ افسوس ہے۔

علی گڑھ میگزین

مدیر۔ سید جاں نثار حسین اختر — مقام اشاعت۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جامعہ اسلامیہ علی گڑھ کا یہ رسالہ کئی سال سے نہایت بے قاعدہ نکل رہا ہے کبھی سال میں ایک دو دفعہ نکلتا ہے۔ کبھی تین چار دفعہ طلبائے مسلم یونیورسٹی کے رسالے کا اس قدر بے قاعدہ اور بد انتظامی سے نکلنا مسلمانوں کے طریقۂ کار کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب مسلم یونیورسٹی کے طلبا اور عمال ایک ادبی رسالہ بھی باقاعدہ نہیں نکال سکتے جس کے لئے روپیہ کا انتظام ہمیشہ آسانی سے ہوتا ہے تو پھر یہ توقع رکھنا کہ مسلمانوں کے یہ "نا خدا" جن سے قوم کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں۔ آگے چل کر کوئی بھی قومی یا ملی کام سرانجام دے سکیں گے۔ خیالی گھوڑے دوڑانے کے مرادف ہے۔

علی گڑھ میگزین کا اپریل نمبر یہ دیکھکر ضرور مسرت ہوتی ہے کہ گو انتظام کرنے میں بے پروائی برتی جاتی ہے۔ لیکن میگزین مذکور کے سب مضمون نگار قابل اور بلند پایہ ہیں۔

دوسری زبانوں کے ترجمے اس قدر صاف اور شستہ زبان میں کئے گئے ہیں کہ وہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتے۔ ادبی تحقیقاتیں جن مضامین میں ہیں وہ مضمون نگاروں کے شوق و جستجو کے آئینہ دار ہیں۔ غرض اس رسالے میں سوائے انتظام کے فقدان کے تمام وہ خوبیاں موجود ہیں جو دوسرے بلند پایہ معیاری رسائل کو حاصل ہیں جس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہم اگر کرنے پر آئیں تو سب کچھ کر سکتے ہیں۔ مگر کیا کہیں ہمارا کچھ کرنے کو دل بہت کم چاہتا ہے۔

ریاست میسور شاہراہِ ترقی پر

ہندوستان کی سینکڑوں ریاستوں میں دو چار ہی ریاستیں ایسی ہیں جو اپنی رعایا نوازی کا ثبوت دے رہی ہیں۔ اور اُن میں ریاست میسور کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ بھوکے کو کھانا کھلا دینا اُس کی بھوک کا علاج نہیں کیونکہ اُسے پھر بھی بھوک لگے گی۔ اس کا اصل علاج یہی ہے کہ اس بھوکے کے لئے روزی کا ذریعہ بہم پہنچایا جائے۔ مہاراجہ میسور کی رعایا پروری اس سے ظاہر ہے کہ اُن کی ریاست میں بڑے بڑے کارخانے برابر قایم ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے لئے پیٹ بھرنے کی صورتیں پیدا کی جا رہی ہیں۔

ہم ریاست میسور کے حکمراں کی روشن خیالی اور اس کے دیوان سر مرزا محمد اسمٰعیل کی نبض شناسیٔ زمانہ پر اپنی حقیر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اور توقع رکھتے ہیں کہ ہندوستان کی دیگر ریاستیں میسور سے سبق لے کر اس کے نقشِ قدم پر چلیں گی۔ اور اپنی فاقہ کش رعایا کے لئے رزق کا سامان بہم پہنچانے کی صورت نکالیں۔ رعایا کی بہبودی کے لئے ریاست میسور میں متعدد کارخانے کھولے جا رہے ہیں چنانچہ ہم ریاست کے دو عظیم کارخانوں کا مختصر حال ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کرتے ہیں

میسور سپن سلک ملز لمیٹڈ بنگلور گورنمنٹ میسور نے یہ ریشم کا کارخانہ جاری کیا ہے جس کا پراسپکٹس اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ مل کا اولین مقصد یہ ہے کہ ردی ریشم سے دھاگہ تیار کیا جائے۔ ہندوستان اس قسم کا دھاگہ بڑی مقدار میں باہر سے درآمد کر رہا ہے۔ ہمارے مل تقریباً ۵ لاکھ پونڈ ردی ریشم سے ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ عمدہ ریشمی دھاگا تیار کریں گے۔ اور اتنی مقدار موٹے دھاگے کی تیار ہو سکے گی جس سے خوبصورت کپڑے کوٹ کے تیار ہو سکیں گے۔ یورپ اور جاپان کے کارخانوں میں تجربہ کیا جا چکا ہے۔ اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دیسی ردی ریشم سے جو دھاگا تیار کیا جائے گا وہ مضبوطی، چمک، اور رنگینی میں دوسرے ممالک کے دھاگے کے مقابلہ میں بہتر ہوگا۔ تمام اخراجات اور ڈیوٹی ادا کرنے کے بعد خالص نفع ۱۰ فیصدی دیا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ ہر پونڈ کا اضافہ زائد فائدہ رہے گا۔ یہ وہ ڈیوٹی ہے جو کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے ریشم کی صنعت کے تحفظ کی خاطر خاص طور سے لگائی ہوئی ہے۔

میسور گورنمنٹ کو اس کمپنی کی کامیابی کا کامل یقین ہے۔ گورنمنٹ نے کارخانوں کا انتظام مناسب تحفظ کے ساتھ اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اس کمپنی کے ڈائرکٹر مشہور صاحبِ اثر اور اعلیٰ لیاقت کے کاروباری آدمی ہیں۔ کمپنی کے کام کو باقاعدہ رکھنے کے لئے گورنمنٹ میسور نے اپنے منیجر اور افسر بھی مقرر کئے ہوئے ہیں۔ یہ کمپنی مشین لگانے کے لئے انگلستان کے ایک بہت قدیم فرم کو آرڈر دے رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی انتظام کیا ہے کہ ایک نہایت تجربہ کار منیجر یورپ سے بلائیں جو مال کی تیاری کا ذمہ دار ہو اور ہندوستانیوں کو کام بھی سکھائے۔ بدیں حالات کمپنی کی کامیابی بالکل یقینی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی امکانات ہیں جن کو بتدریج ترقی دی جا سکتی ہے۔ ہم گورنمنٹ میسور کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اُس نے اپنی مدد دے کر اس کارخانے کو جاری کرایا ہے جس سے بے روزگاری ایک حد تک کم ہو جائے گی۔

دیوان بہادر کے آر۔ سری نواس آئنگر جو کہ ریٹائرڈ ممبر ہیں اس کمپنی کے چیرمین ہوں گے۔ اور مسٹر شمس الدین خاں منیجر ہوں گے۔ یہ دونوں حضرات تجربہ کار افسرانِ ریاست میں جن کی انتظامی قابلیت و تجربہ کاری اور کاروباری معاملہ فہمی یقیناً اس کمپنی کی کامیابی کی ضامن ہے۔

میسور تجارتی اور صنعتی معاملات میں تمام ہندوستان کی ریاستوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اور جس کا ایک ٹریڈ کمشنر لندن میں بھی ہے۔ میسور میں انتظامی معیار نہایت بلند ہے اور اسی باعث میسور گورنمنٹ اس قابل ہو سکی ہے کہ اُس نے متعدد صنعتی کارخانے جاری کئے ہیں جو سب کے سب دیوانِ میسور سر مرزا محمد اسمٰعیل کی قابلانہ رہنمائی کے تحت نہایت معقول منافع کے ساتھ چل رہے ہیں۔ "انڈین فنانس" ۱۶ مئی ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں تحریر کرتا ہے!

"ہم لوگ برٹش ہندوستان میں کبھی ختم نہ ہونے والے مباحثوں میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارا اقتصادی لائحہ عمل ہو یا نہ ہو۔ اور ہو تو کیا ہو۔ ریاست میسور اقتصادی لائحہ عمل کو زیرِ عمل لے آئی ہے"

یہ بھی سر مرزا اسمٰعیل کی جاں فشانیوں اور دلچسپیوں کا نتیجہ ہے کہ صنعتی کارخانے جاری کئے جا رہے ہیں اور کامیابی سے چل رہے ہیں۔ اس صنعتی ترقی کے باعث مہاراجہ میسور کا نام ہندوستان کے گھر گھر میں مشہور ہو رہا ہے۔ اس کمپنی کے متعلق ضروری معلومات میسور سپن سلک مل لمیٹڈ بنگلور کے منیجر سے مل سکتی ہیں۔

دی بھدراوتی پیپر مل لمیٹڈ میسور یہ کمپنی بھی ابھی حال ہی میں جاری ہوئی ہے اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ سرمایہ لگانے والی پبلک کو اس کے حصے اتنی تعداد میں نہ مل سکے جتنے وہ چاہتے تھے۔ پراسپکٹس کے شائع ہوتے ہی تمام حصص فروخت ہو گئے۔ ریاست میسور نے کامل تحقیقات کے بعد کاغذ کا یہ کارخانہ جاری کیا ہے اس سے ہندوستانی پبلک کو سرمایہ لگانے کا ایک نادر موقعہ مل جائے گا۔

صرف ریاست میسور ہی ایسی ریاست ہے جو صنعتی پیش قدمیوں میں تمام ہندوستان سے آگے بڑھی ہوئی ہے۔ اگر دیگر تمام ریاستیں اور برٹش انڈیا ریاست میسور کی پیروی کریں تو ان کی تمام اقتصادی مسائل اور تکالیف کا حل نکل آئے۔ سر مرزا اسمٰعیل نہ صرف ایک ہردلعزیز دیوان، ایک تجربہ کار سیاست داں، اور ایک عقلمند منتظم ہیں۔ بلکہ صنعت و حرفت کے بھی بڑے ماہر ہیں۔ چنانچہ ریاست میسور میں اور کارخانوں کے علاوہ کاغذ کے کارخانے بھی کھولے جا رہے ہیں۔ جن کو خاطر خواہ کامیابی ہوگی۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل وجوہات ہیں۔

(۱) حکومت میسور اس کارخانے سے مناسب قیمت پر کاغذ ایک بڑی تعداد میں خریدے گی۔

(۲) حکومت میسور اس کارخانے میں سرمائے کا دسواں حصہ لگائے گی۔

(۳) حکومت کارخانے اور ملازمین کارخانے کے لئے زمین مفت دے گی۔

(۴) حکومت بجلی نہایت مناسب اور ارزاں قیمت پر مہیا کرے گی۔

(۵) میسور آئرن اینڈ سٹیل ورکس اس کمپنی کو ٹرامویز اور ریلوے لائن کی قسم کی تمام سہولتیں بہم پہنچائے گی۔

(۶) میسور آئرن ورکس مل اور اس کے درمیان گاڑیوں میں مال لے جانے کا کام نہایت مناسب معاوضے پر انجام دے گا۔ اور لوہار خانے کی آسانیاں۔ طبی اور تعلیمی سہولتیں بھی بہم پہنچائے گا۔

ان تمام سہولتوں اور آسانیوں کی موجودگی میں اس کارخانے کی کامیابی روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے۔

مزید معلومات

کیلئے میسور گورنمنٹ کے ڈیولپمنٹ ڈیپارٹمنٹ میسور گورنمنٹ بنگلور کو لکھیے

شوکت تھانوی کی چار تصانیف

موجِ تبسم — دو روپے
بحرِ تبسم — دو روپے
سیلابِ تبسم — دو روپے
طوفانِ تبسم — دو روپے

ان سے کوئی ایک
مفت
حاصل کرنا چاہتے ہیں

ترکیب استعمال اسی وقت مبلغ ہے چندہ سالانہ

سرپنچ

اور ہر بابت محصول ڈاک، کتاب ذریعہ منی آرڈر بنام منیجر سرپنچ جرنلس روانہ کردیجے اور انہیں سے کوئی ایک کتاب مفت طلب فرمایئے جلدی منی آرڈر روانہ فرمایئے ورنہ پھر یہ موقع نہ ملے گا۔ اس طرح گویا آپ دو روپے سے نفع میں رہیں گے۔ **منیجر سرپنچ جرنلس لکھنؤ**

اگر آپ

پاکیزہ افسانے جو حقیقت کے عکس ہوں۔ عالمانہ **مقالات** جو مسائل حیات، قدرت اور کائنات کے متعلق اہل فکر حضرات کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہوں۔ بلند پایہ **مضامین** جن میں دورِ حاضرہ کی معاشرتی اور سیاسی کشمکشوں پر سنجیدگی اور بالغ نظری سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ کیف آور **نظمیں** جو آپ کے احساسات عالیہ کو اکسا دیں۔ رنگین **غزلیں** جو محبت کے لطیف اور نازک جذبات سے پُر ہوں، **سب کچھ** دیکھنا چاہتی ہیں تو جلدی کیجئے کیونکہ

شمیم

کے ایک پرچہ سے بھی محروم رہنا بہت بڑی ادبی بدقسمتی ہے!
ادب و انشا کے اس نادر ماہنامے کی ادارت حضرت تمنائی کے سپرد ہے

چندہ سالانہ سے/ چندہ ششماہی عہ/ قیمت فی پرچہ ۴/

المشتہر **منیجر شمیم اگزبیشن روڈ پٹنہ**

حسین بننا کس قدر آسان ہوگیا ہے

میسور صندل سوپ

یہ چہرے کے رنگ کو تر و تازگی، نرمی، اور صحت آمیز شگفتگی بخشتا ہے
اس کے مسامات میں اتر جانے والے بالائی کے سے مالا مال جھاگ چہرے



کی جلد کو تمام آلودگیوں سے پاک کردیتے ہیں۔ کیونکہ میسور صندل سوپ میں میسور کے شہرہ آفاق روغن کی آمیزش ہوتی ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ تمام حسین و جمیل خواتین "میسور صندل سوپ" کا استعمال کرتی ہیں، اس لئے کہ انھیں یہ بھید معلوم ہوچکا ہے کہ یہ صابون ان کے حسن و جمال کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

میسور صندل سوپ ہر دوکان دار سے مل سکتا ہے

گورنمنٹ سوپ فیکٹری بنگلور

طبی و صحافتی دنیا میں بہترین اضافہ

رسالہ معین الشفا لاہور

زیرادارت جناب حاذق الہند حکیم سید ظفریاب علی صاحب لاہور

یہ ماہوار رسالہ جو حفظ صحت مرداں۔ نسواں اور اطفال پر بڑی تحقیق و تدقیق سے صحیح معلومات پیش کرے گا اور صدری مجربات جو کہ سینوں میں محفوظ تھے خدمت خلق کے لئے بلا بخل پبلک کے سامنے پیش کرے گا۔ رسالہ کا عملہ ذی علم حضرات پر مشتمل ہے۔ رسالہ اپنی صوری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے نہایت دلچسپ اور جاذب توجہ ہے۔ کتابت۔ طباعت دیدہ زیب ہے۔ طب یونانی اور ویدک کی ترقی اور پنجاب کے معتمد طبیبوں اور ویدوں کی جماعت کا حامی رسالہ ہے اور طب مشرق و مغرب پر پوری متانت اور سنجیدگی سے محاکمہ کرے گا۔ اطبا اور وید صاحبان اور یونانی طب کے بہی خواہان سے عرض ہے کہ خریداری سے جلد مطلع فرمائیں۔ رسالہ جون کے آخر میں پیش خدمت ہوگا —— ان جملہ محاسن کے باوجود قیمت صرف عمر

المشتہر منیجر رسالہ معین الشفا لاہور۔ کشمیری بازار

جملہ بہی خواہان کھیل کی خدمت میں

ولایتی ہائی وڈ ٹینس ریکٹ	آٹھ روپے فی عدد
پیلے عمدہ بیڈمنٹن ریکٹ	بارہ آنے فی عدد
ڈائی ٹی یا ۱۸ پیس کروم فٹ بال	تین روپے آٹھ آنے فی عدد
ایضاً یا ۱۳ پیس ۱۱ وال بال	دو روپے فی عدد
فورس ہینڈل کرکٹ بیٹ	دو روپے چار آنے فی عدد

مزید ہر قسم کے کھیل کا سستا مال مہیا ہوسکتا ہے

ہر مال کی گارنٹی ہوگی

منیجر ریگل آرٹس سوسائٹی سیالکوٹ شہر

عورتوں کا بہترین اور سب سے سستا

رسالہ لیلیٰ

دور جدید

جو پہلے نیرنگ خیال بک ڈپو لاہور سے شائع ہوتا تھا

اب

اب ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی سے بہترین صورت میں شائع ہوتا ہے سالانہ چندہ صرف تین روپیہ۔ بذریعہ منی آرڈر۔ بذریعہ وی پی سے علاوہ محصول فی پرچہ ہر ماہ حجم ۸۶ صفحات، تصویر آرٹ ۱۔ فوٹو بلاک تصویر ۴ عدد۔ سائز نہایت خوبصورت

ادارہ۔ نگران۔ مصورہ سید فرید جعفری پھلی شہری۔ آنریری اڈیٹر حکیم حیدر یوسف حسن صاحب چیف اڈیٹر نیرنگ خیال لاہور۔ ایڈیٹرس۔ بیگم عبدالحفیظ لکھنوی۔ معاونین وزیر بیگم ضیار (لاہور) آمنہ دیوی پریاگی مس اختر حسین (الہ آبادی) شوکت دولہن (لکھنؤ) گوہر اقبال حور (میرٹھ) مس محمودہ غیاث۔ بی اے (شملہ) مس شکنتلا دیوی (بنارس)

خط و کتابت کا پتہ

منیجر رسالہ لیلیٰ دہلی

سُکھ سنچارک کمپنی متھرا کا

انگوری منقاؤں سے تیار کردہ

سُکھ سنچارک دراکشاسو

جسم کو طاقتور بنانے گوشت و خون بڑھانے چہرہ پر رونق لانے، دست صاف ہوکر بھوک بڑھانیوالی خوش ذائقہ دوا۔ قیمت چھوٹی بوتل عہ بڑی عگہ۔ ہمارا ہی ایک دراکشاسو ایسا ہے جس کی ۱۵۲ اخباروں نے تعریف لکھی ہے۔ طلب فرمانے پر نمونہ اور فہرست مفت روانہ کی جاتی ہے۔

سُکھ سنچارک کمپنی متھرا کی

ادویات

سدھا سندھو کف، کھانسی ہیضہ، دمہ، شول، سنگرہنی، اتیسار وغیرہ کی خوش ذائقہ و خوشبودار دوا۔ قیمت ۸ر

دَدروج گج کیسری داد کی سب سے اچھی دوا قیمت ۴ر

بال سدھا دُبلے اور کمزور بچوں کو طاقتور بنانے والی دوا قیمت بارہ آنے

سب دوا فروشوں کے پاس ملتی ہیں

دنیائے ادب میں ایک تازہ ترین اضافہ

خمارستان

کیا ہے؟

یہ اساتذۂ حال کے گلِ سرسبد۔ نظم و نثر کے لاثانی قلمکار۔ وجدانیت کے حقیقی معجز نگار۔ جہان استاد، افسر الشعراء حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی کا تازہ شاہکار ہے۔ یہ دراصل اُن جمالیات کا مجموعہ ہے جن سے آج تک نثر عاری تھی۔ یہ وہ مضامین ہیں، جنھیں شمس العلماء مولانا آزاد۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ علامہ شبلی نعمانی کے بعد ہندوستان کا لٹریچر آج تک نہ پیش کرسکا۔ خمارستان قلعۂ معلی کی ٹکسالی اردو اور شستہ و رفتہ بولی سے آراستہ ہے۔ صاحبانِ ذوق کی ضیافتِ طبع کے لئے شائع کی جارہی ہے

اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

ابھی سے اپنا اسم گرامی خریداروں کی فہرست میں لکھوا لیجے۔

مینیجر کلیم بک ڈپو گلی کندلہ کشان فتح پوری دہلی

نئے افسانے

پندرہ افسانے ایک جلد میں، سب طبع زاد۔ نئے عاشقانہ گویا نثر میں غزلیں۔ مگر زندگی کی سچی تصویریں ہیں جن میں نہ بناوٹ ہے نہ مبالغہ ہے۔ بالکل زندگی کی طرح بے ساختہ۔ برجستہ، لاأبالی، اُمنگ بھری۔ تم ذرا کوئی افسانہ شروع کرو۔ بس اسی میں گم ہو جاؤگے۔ وہ سچ مچ تمہیں ہوتا ہوا معلوم ہوگا اور تم اپنے آپ کو اس میں شریک سمجھوگے۔ کردار تمہیں واقعی چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے ہوئے معلوم ہونگے۔ اُن کے جذبات کی گرمی تمہیں محسوس ہوگی۔ طرزِ بیان لطیف۔ نازک۔ جادوانہ۔ ادبیت کی ساری زینتوں سے آراستہ۔ دنیا کے کسی بڑے مصنف کے افسانوں سے مقابلہ کیجے برابر رہیں گے۔ اب یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اردو میں اچھے افسانے نہیں ہیں۔

مصنفہ سید حسن ریاض سابق اڈیٹر ہمت و نوید

نئے افسانے قیمت فی جلد ایک روپیہ چار آنے مع محصولڈاک عہ

مینیجر دی نیشنل پبلشنگ بیورو (دفتر اخبار نوید) لکھنؤ

انشائے لطیف

ادیب العصر حضرت لطیف الدین احمد اکبرآبادی کے افسانے

اردو ادب میں صاحبِ "نالۂ رنگ" کا نام محتاجِ تعارف نہیں اور افسانہ نویسی کا جو معیار ل احمد نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ تنہا ایک مثال ہے۔ اُن کا افسانہ علم و حکمت، جذبات واردات اور نفسیاتِ حسن و عشق کے نازک ترین اشارات کا حامل ہوتا ہے۔ اُن کا طرزِ انشاء، شعریت اور تفلسف اردو ادب میں مستقل اضافات ہیں۔

ل احمد صاحب کے افسانے بلاشائبہ تقلید ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ انشائے لطیف ل احمد صاحب کے پندرہ شہ پاروں کا مجموعہ ہے جو اکثر نگار اور دیگر مجلاتِ علمیہ ادبیہ میں طبع ہوکر مقبولیتِ دوام حاصل کرچکے ہیں، اس لئے اگر آپ کو سلاست و نفاستِ زبان کے ساتھ نفسیاتِ شباب اور جذباتِ حسن و عشق کی صحیح نقاشی سے کوئی خاص لگاؤ ہے اگر آپ ادب و شعریت کا ذوقِ سلیم رکھتے ہیں تو اس مجموعہ میں آپ کو اپنی طلب و تشنگی کے لئے مکمل سامان سیرابی نظر آئے گا۔ طباعت و کتابت روشن و بہترین ہونے کے ساتھ کراؤن سائز پر تقریباً ڈھائی سو صفحات کی ضخامت نفیس جلد اور قیمت صرف عہ علاوہ محصول۔

نغمات

نثر کی شاعری

اردو ادب میں جناب ل احمد کی تنہا وہ ہستی ہے جس نے حسن و عشق کی واردات اور نفسیات کو انتہائی مطالعۂ فکر کے ساتھ اپنی ذاتی تاثرات و تکیفات کے ماتحت شعریت طریقی یا موسیقیت شعر کی صورت میں صفحاتِ سادہ کو فردوسِ خیال بنا دیا ہے۔ اس مجموعہ میں جناب لطیف کے ساٹھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے شامل ہیں جسے نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفریں کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب بھی مکمل ترتیب و تہذیب کے بعد زیرِ طباعت ہے اگر آپ اپنی زبان کی نزاکت و لطافت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کے خریداروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرا دیجے۔ قیمت صرف عہ علاوہ محصول

مینیجر کلیم بک ڈپو گلی کندلہ کشان فتح پوری دہلی

قسم

بوئے لبِ گلرنگ جوانی!

دِل و دماغ کی قوت

اور

دیگر طبّی فوائد کیساتھ

اگر حقیقت میں مہکتی ہوئی سانس بجائے خود کوئی نعمت ہے اور لبوں سے منہ اندھیرے کھلتی ہوئی کلیوں کی سی خوشبو کا آنا اگر در اصل اپنی جگہ ایک دولت بیدار ہے تو ہم آپ کو مشورہ دیں گے کہ ہمارے کارخانہ کی روپہلی سنہری گولیاں ہمارا لاجواب زردہ اور ہمارا معطر قوام آپ پان کے ساتھ ساتھ ضرور استعمال فرمائیں، اور دیکھیں کہ آپ میں مسیحا نفسی پیدا ہوتی ہے کہ نہیں؟

احمد حسین دلدار حسین تاجر تمباکوئے خوردنی

چوک لکھنؤ

ساغر نظامی کا کلیاتِ نظم و غزل

بادۂ مشرق

وہ تاریخی کتاب جس کے دیباچے مشرقی و مغربی علوم کے ماہرین و سربرآوردہ انشاپردازوں نے تحریر فرمائے ہیں مثلاً بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو۔ مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی مدظلہٗ۔ ڈاکٹر سید محمود ایم اے۔ پی۔ ایچ ڈی بار ایٹ لا۔ امامِ ادب علامہ مولوی عبدالحق (بی اے، علیگ)

گیارہ ابواب قومی۔ مذہبی۔ متصوفانہ۔ منظریاتی۔ روحانی اور رنگا رنگ نظموں پر مشتمل ہیں۔ بارھویں باب میں صرف منتخب غزلیں ہیں۔ ساری کتاب خالص ہندوستانی شاعری کے جدید و پاکیزہ تخیل کی حقیقی تصویر ہے۔ زندگی اور جوانی، حُبِّ وطن اور آزادی کے وہ آتشین لمحات اس کتاب میں پائے جاتے ہیں جن کے اثر نے قوم میں نئی زندگی پیدا کر دی ہے، اس کے باوجود اس کی قیمت چھ روپے علاوہ محصول ہے۔ جو کتاب کے حسن و جمال اور ضخامت کے لحاظ سے بالکل حقیر ہے۔ نہایت سرفرازی سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس وقت تک اردو نظم کی کوئی کتاب حسن و جمال اور اپنے کام کے لحاظ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

منیجر کلیم بک ڈپو گلی کندلہ کشاں فتح پوری دہلی

خریداران کلیم

کی خدمت میں گذارش ہے کہ کلیم نہ پہونچنے کی اطلاع ہر مہینہ کے دوسرے ہفتہ میں ضرور پہنچا دیا کریں۔ ورنہ تعمیل نہیں کی جائے گی۔

(منیجر کلیم)

REGD.NO.L.3694 REGD.NO.L.3694



شعلہ و شبنم

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

کی پُرجوش اور کیف آور نظموں کا مجموعہ

یہ مجموعہ آپ کو آتشکدے کی شعلہ افشانیوں، اسلامی شان و حریت کے
خون کھولا دینے والے واقعات، بادۂ سرجوش کی سیہ مستیوں اور
گلبانگ فطرت کے روح پرور نغموں سے لطف اندوز ہونے کا
موقع دے گا

شاعرِ انقلاب کا آفاقی شاہکار ہے

اور غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے

قیمت تین روپے

خریداری کے لیے فوراً درخواست کیجیے

ملنے کا پتہ

کلیم بک ڈپو گلی کندلہ کشاں فتح پوری دہلی

REGD. NO. L 3694

ایک نفیس مزاج مہارانی



نے اپنے صدر اعظم سے کہا۔ دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کر دو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں تاکہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کر سکوں۔ تعمیل حکم کے لئے فردوس مثال کشمیر، جنت نظیر سوئٹزرلینڈ شباب انگیز تسمانیہ۔ اور گل پاش مرغزاروں میں گل چینی کی گئی —— جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے۔ اور باقی اس قدر مرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی حسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی۔ مہارانی اس خواہش کو پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی۔ کھانا پینا ترک کر دیا مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوا۔ اور وزراء سے مشورہ طلب کیا۔ مہتمم توشہ خانہ نے "**اصغر علی محمد علی**" سے عطر منگوانے کو کہا۔ رائے معقول تھی فوراً عمل کیا گیا جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی پوری بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا۔

اصغر علی محمد علی تاجران عطر، لکھنؤ و دہلی